فتاوی ابن تیمیہ

شیخ الاسلام تقی الدین احمد ابن تیمیہ

جلد-۱۰

سلوک وطریقت

مترجم

ڈاکٹر عبدالکبیر محسن

پرنٹ لائن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمد للہ فتاوی کی بائیس جلدوں کا ترجمہ ہو چکا ہے نمونے کے طور پہ دسویں جلد پیش ہے دعا کریں اللہ اس کی طباعت کے اسباب مہیا فرمائے)

مقدمہ مترجم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيْهِ حَمْداً يَلِيْقُ بِشَأْنِهِ كَمَا يُحِبُّهُ وَ يَرْضَاهُ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَ بَارِكْ عَلىٰ نَبِيِّنَا وَ سَيِّدِنَا وَ الْاَوْلىٰ بِنَا مِنَّا مُحَمَّدٍ بِأَضْعَافٍ مُّضَاعَفَةٍ مِنْ عَدَدِ مَا فِي الْأَمْطَارِ وَ الْبِحَارِ وَ الْأَنْهَارِ مِنَ الْقَطَرَاتِ وَ مَا تُحَرِّكُ قُلُوْبَ الْخَلْقِ مِنَ الْخَفَقَاتِ وَ مَا تَنْفَرِشُ عَلىٰ سُطُوْحِ الصَّحَارِىٰ وَ الْكَوَاكِبِ مِنَ الذَّرَّاتِ وَ مَا مِنْهَا لِلشَّمْسِ فِي الشُّعَاعَاتِ وَ مَا لِلْأَشْجَارِ مِنَ الْوَرَقَاتِ صَلَاةً تَحِلُّ لِيْ بِهَا شَفَاعَتُهٗ فِيْ يَوْمِ الْحِسَابَاتِ ، صَلَاةً لَا يُحْصِيْهَا اِلَّا اَنْتَ وَ صَلِّ عَلىٰ آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ !

أَمَّـا بَـعْـدُ : سالوں قبل ،تقریبا ۱۹۷۰ عیسوی بمقام شام کوٹ شیخاں ،منڈی کنگن پور ضلع قصور۔ جو میری جائے پیدائش ہے۔ والد صاحب شیخ الحدیث مولانا عبدالحلیم مرحوم وہاں کی مرکزی مسجد کے امام ،خطیب اور فاضلِ عربی کی کلاس کے مدرس تھے ، میری عمر کوئی چار پانچ برس ہوگی ، ایک دن والد صاحب نے کہا محسن تمہارا نام بدل کر احمد نہ رکھ دوں؟ میں نے کہا کیوں؟ بولے ایک بہت بڑے امام اور عالم کا نام احمد اور ان کے والد کا نام عبدالحلیم تھا ، میں چند دن اپنے ہمجولیوں سے خود کو احمد کہلواتا رہا اور پھر بات آئی گئی ہوگئی ، لیکن ان کے ساتھ انس سا ہوگیا ، کیا خبر تھی کہ سابقہ مترجمات کے بعد پھر ایک دن میری قسمت یاوری کرے گی اور بچپن سے دل میں نقش اس عظیم امام کے فتاوی کے ترجمہ کی سعادت نصیب ہوگی ، جنوری ۲۰۱۵ عیسوی سے اس کا آغاز کیا ، سابقہ مترجمات کی طرح لفظی اور محاوراتی کے بین بین ترجمہ کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین کو شیخ الاسلام کی حسنِ عبارت کا جلوہ بھی محسوس ہو اور مفہوم کی ادائیگی بھی عمدگی سے ہو جائے ! قرآنی آیات کا اردو ترجمہ مع سورۃ کے نام اور آیت نمبر ذکر کیا ہے ، احادیث کی تخریج نہیں کر سکا ، مگر فتاوی کے جدید عربی ایڈیشن میں احادیث کی تخریج موجود ہے ، ہر جلد کے آخر میں فہرست دی ہے تاکہ مراجعت میں آسانی ہو ، چونکہ یہ سب موضوعات اور مسائل بار بار ان پر استفتاء کی صورت میں پیش کئے جاتے تھے اور شیخ ہر دفعہ پوری تفصیل سے جواب لکھتے لہذا ان فتاوی کی نمایاں صفت بکثرت تکرار ہے البتہ ہر جواب میں سابقہ کی تفصیل کے ساتھ ساتھ نئے نکات نئے اسلوب سے ذکر کرتے ہیں ، عربی کا مقولہ ہے

کہ تکرار فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اور قارئین یہ فائدہ موجود پائیں گے

میرا ایسا رتبہ ومقام نہیں کہ ابن تیمیہ کی علمی جلالت بارے کچھ تبصرہ کروں یہاں میرے قلم کے پر جلتے ہیں، وہ ان معدودے چند اکابر میں سے ہیں جن کے لئے شیخ الاسلام کا لقب استعمال کیا جاتا ہے! صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے بارہ میں جو خیال کیا جاتا ہے کہ اپنی آراء ومواقف پر سختی سے قائم تھے اور مخالفین پر تند وتیز تنقید کے نشتر چلاتے تھے یہ غلط فہمی ہے، بخدا ایسا نہیں، وہ خود تو حنبلی تھے لیکن میں نے ہمیشہ انہیں تمام دیگر مسالکِ اہلِ سنت، شافعیہ، مالکیہ اور حنفیہ کی آراء کا احترام سے ذکر کرتے ہی پایا ہے ائمہ، مشائخ اور اکابرین کا ذکر نہایت توقیر واکرام سے کرتے ہیں اور عموماً ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ رحمہم اللہ اور بسا اوقات رضی اللہ عنہم لکھتے ہیں، فروعی اختلافات کے ذیل میں کسی ایک جگہ بھی مسالکِ اہلِ سنت کے خلاف ان کے قلم سے احترام کا منافی ایک لفظ بھی مکتوب نہیں ہوا اور عالم کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ تھڑ دلا اور فروعی مسائل میں تندخو اور درشت گو ہو

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اسے میرے، میرے والدین، اہل وعیال، مخلص احباب اور میرے اساتذہ کے میزانِ حسنات میں شامل فرمائے، آمین یارب العالمین۔

ڈاکٹر عبدالکبیر محسن

پروفیسر آف عربی گورنمنٹ اصغر مال کالج راولپنڈی۔ پاکستانپ

موبائل نمبر: 03009568896

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِیَّ بَعْدَهٗ (آگے خطبہ مسنونہ ذکر کیا)

امابعد! **یہ اعمالِ قلوب بارے مختصر کلمات ہیں جنہیں مقامات واحوال کا نام دیا جاتا ہے** (بقول مرتب یہ [التُّحْفَةُ العِرَاقِيَّةُ فِی الْاَعْمَالِ الْقَلْبِيَّةِ] کے نام سے موسوم ہے) اور یہ ایمان کے اصول اور قواعدِ دین میں سے ہیں، مثلاً اللہ اور اس کے رسول سے محبت، اللہ پر توکل، اس کے لیے اخلاصِ دین، اس کے لیے شکر، اس کے حکم پر صبر، اس سے خوف، اس سے امیدیں وابستہ کرنا اور ان سب کے توابع ولوازم، یہ سب اہلِ ایمان سے اللہ کے واجب کردہ حق کی حسبِ استطاعت ادائیگی کا مقتضی ہے! تو گزارش یہ ہے کہ یہ اعمال تمام خلق پر واجب ہیں جو فی الاصل ائمہِ دین کے بالاتفاق مامور بہا ہیں، اس ضمن میں **لوگ تین درجات پر ہیں** جیسے اعمالِ بدن میں بھی وہ تین درجات پر ہیں:

اول: ظالم لنفسہ، اور یہ جو ترکِ مامور یا فعلِ محظور کے ساتھ گناہگار اور عاصی ہوا

دوم: مقتصد، جو واجبات کا فاعل اور محرمات کا تارک ہوا

سوم: سابق بالخیرات، جو حسبِ قدرت واجب اور مستحب اعمال ادا کرنے اور محرمات ومکروہات ترک کرنے کے ساتھ تقرّبِ الٰہی کا جویا بنا، مقتصد اور سابق میں سے ہر ایک کے لیے کچھ گناہ سرزد ہوجانا ممکن ہے جو ان سے محو کردئے جاتے ہیں، یا تو توبہ کے ساتھ اور اللہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے اور یا محو کرنے والی حسنات کے ساتھ اور یا مکفّر مصائب کے ساتھ یا ان کے غیر کے ساتھ اور یہ دونوں صنف اللہ کے ان اولیاء میں ہیں جن کا ذکر اس نے اس آیت میں کیا:

(اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ)[یونس : ۶۲] (آگاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) تو اولیاء اللہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ مومن ومتقی ہیں لیکن یہ عام اور خاص کی طرف منقسم ہیں، عام مقتصدین اور خاص سابقین ہیں اور سابقین مثلا انبیاء وصدیقین اعلی درجات والے ہیں، صحیح بخاری کی حضرت ابوہریرہ سے روایت میں نبی اکرم نے ان دونوں قسموں کا تذکرہ کیا ہے، فرمایا اللہ تعالی فرماتا ہے جس نے میرے ولی سے معادات کی اس نے مجھے دعوتِ مبارزت دی اور میرا بندہ فرائض کے بعد مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا تقرُّب پاتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب یہ مقام آجائے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی بصر ہوجاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ پکڑتا ہے اور قدم ہوجاتا ہوں جس کے ساتھ چلتا ہے تو میرے ساتھ ہی سنتا، دیکھتا، پکڑتا اور چلتا ہے (یعنی اس کی ہر حرکت میرے حکم کے تابع ہوجاتی ہے) اب اگر مجھ سے سوال کرے تو ضرور عطا کروں گا اگر مجھ سے طالبِ پناہ بنے تو پناہ گاہ بنوں گا اور کسی شئ سے جسے میں کرنے والا ہوں اتنا متردد نہیں ہوتا جتنا اپنے بندۂ مومن کی روح قبض کرنے سے ہوتا ہوں، اسے موت ناگوار لگتی ہے اور مجھے اس کی یہ ناگواری بری لگتی ہے اور اس سے چارا بھی نہیں

جہاں تک اہلِ ایمان میں سے ظالم لنفسہ تو اس کے ساتھ اس کے ایمان وتقوی کے بقدر اللہ کی ولایت ہے جیسا کہ اس کے فجور کے بقدر اس کا عکس بھی اس کے ساتھ ہے تو ایک شخص مقتضیِ ثواب حسنات اور مقتضیِ عذاب سیآت کا جامع ہوسکتا ہے اور ثواب وعقاب دونوں کا حقدار ہوسکتا ہے، یہ تمام اصحابِ رسول، ائمہِ اسلام اور اہلِ سنت والجماعت کا قول ہے جو قائل ہیں کہ ایسا شخص ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو البتہ خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ ایک دفعہ جو کوئی جہنم چلا گیا وہ اب کبھی اس سے باہر نہ آسکے گا اور اہلِ کبائر کے حق میں رسول یا غیر رسول کو شفاعت کی اجازت نہیں، نہ دوزخ میں جانے سے قبل اور نہ اس کے بعد، تو ان کے نزدیک ایک شخص میں ثواب اور عقاب کا اجتماع نہیں ہوسکتا بلکہ جو ثواب سے نوازا گیا وہ عقاب نہ پائے گا اور جو عقاب دیا گیا وہ ثواب نہ پائے گا، اہل سنت کے ہاں مسلمہ اس اصل کے کتاب وسنت اور اجماعِ سلف کے دلائل کثیر ہیں جو ایک جگہ تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں، اس پر کثیر امور مبنی ہیں لہذا جس کے ساتھ حقیقی ایمان ہے تو لازم ہے کہ اس کے ایمان کے بقدر اس کے ساتھ ان اعمال میں سے کچھ ہو، اگر چہ گناہوں کا مرتکب بھی ہو جیسے صحیح بخاری کی حضرت عمر سے روایت میں ہے کہ ایک آدمی جس کا لقب حمار تھا۔اور یہ نبی اکرم کو (اپنی خوشکن باتوں سے) ہنسایا کرتا تھا- یہ شراب نوش تھا نبی اکرم کئی مرتبہ اس پر حد جاری کر چکے تھے، ایک مرتبہ اسی جرم میں اسے لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی کے منہ سے نکلا اس پر اللہ کی لعنت ہو! کتنی زیادہ مرتبہ اسے اس جرم میں آپ کے پاس لایا گیا ہے؟ آپ نے اسے ٹوکا اور کہا اسے ملعون نہ کہو کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے

تو اس سے وضاحت ہوئی کہ شراب نوشی وغیرہ کے گناہ کا مرتکب بھی اللہ اور رسول کا محبّ ہوسکتا ہے اور اللہ ورسول کی محبت ایمان کی سب سے مضبوط کڑی ہے جیسے کبھی کوئی عابد وزاہد اپنے دل میں موجود بدعت ونفاق کے سبب اللہ و رسول کے ہاں اس وجہ سے ناپسندیدہ ہوسکتا ہے، جیسا کہ صحاح وغیرہ میں حضرت علی اور ابوسعید خدری وغیرہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے خوارج کا ذکر کیا اور کہا تم ان کی نماز کے سامنے اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزوں اور ان کی قراءت کے سامنے اپنی قراءت کو ہیچ جانو گے، وہ قرآن پڑھتے ہوں گے مگر یہ ان کے حلقوم سے متجاوز نہیں ہوگا، اسلام سے یہ اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کردو اللہ کے ہاں روزِ قیامت انہیں قتل کرنے پر ثواب ملے گا، اگر میں نے انہیں پالیا تو عاد کی طرح انہیں قتل کروں گا

تو اسی حکمِ نبوی کے تحت امیر المومنین حضرت علی کی قیادت میں صحابہ کرام نے ان سے لڑائی کی، ان کے ظہور کی نشانی آپ نے یہ بتلائی تھی کہ اس وقت ان کا ظہور ہوگا جب مسلمانوں کے مابین افتراق ہوگا اور وہ دو گروہوں میں منقسم ہوں گے اور جو گروہ ان سے لڑے گا وہ حق سے (بنسبت دوسرے گروہ کے، گویا دوسرا گروہ بھی خالص باطل پر نہیں، بالفاظِ دیگر مطالبات ان کے درست اور جائز تھے البتہ انہیں منوانے کا ان کا طریقہ درست نہ تھا۔ واللہ اعلم) زیادہ قریب ہوگا اسی لیے ائمہِ اسلام مثلا سفیان

ثوری وغیرہ نے کہا کہ ابلیس کو بدعت معصیت سے بڑھ کر پیاری ہے اس لیے کہ عموماً بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی کیونکہ بدعتی کب اقرار کرتا ہے کہ وہ بدعتی ہے اور معصیت کے مرتکب کو توبہ کبھی نصیب ہوجاتی ہے، ان کے قول کہ بدعت سے توبہ نہیں کی جاتی کا مفہوم یہ ہے کہ مبتدِع جو اس امر کو دین بنالیتا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے مشروع نہیں کیا تو اس کی نظروں میں بدعت کو مزین کردیا جاتا ہے اور وہ اسے حسن خیال کرتا ہے لہذا چونکہ حسن خیال کرتا ہے تو توبہ نہیں کرپاتا (الا ما شاء اللہ) جب تک اسے ایسا سمجھتا رہے گا، اس لیے کہ اولِ توبہ یہ علم کہ اس کا فعل برا ہے تبھی توبہ کرے گا یا یہ کہ وہ مامور بہ جس کا تارک ہے۔ یا تو امرِ ایجاب یا امرِ استحباب۔ کو مانے تاکہ توبہ کی طرف آئے لیکن اس سے توبہ کا وقوع ممکن ضرور ہے کہ اللہ اسے ہدایت اور رُشد سے نواز دے اور حق اس کے لیے متبین ہوجائے جیسے بے شمار کفار ومنافقین اور اہلِ بدعت وضلال کو اس کی توفیق ملی بھی ہے اور یہ اسی صورت ہوتا ہے کہ جو حق پر عمل کرتا ہے اللہ اسے وہ حق بھی معلوم کرادے گا جو ابھی اس کے علم میں نہیں ہے جیسے کہا:

(وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ) [محمد : ۱۷] (اور جولوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشتا اور پرہیزگاری عنایت کرتا ہے)

(وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتاً وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا) [النساء : ۶۶-۶۸] (اور اگر یہ اُس نصیحت پر کاربند ہوتے جو انہیں کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔ اور ہم ان کو اپنے ہاں سے اجرِ عظیم بھی عطا فرماتے۔ اور سیدھا راستہ بھی دکھاتے)

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) [الحدید : ۲۸] (مومنو اللہ سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ وہ تمہیں اپنی رحمت سے دگنا اجر عطا فرمائے گا اور تمہارے لئے روشنی کردے گا جس میں چلو گے اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

(اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ) [البقرۃ : ۲۵۷] (جولوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ تعالیٰ ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے)

(قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [المائدۃ : ۱۵-۱۶] (بے شک تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ جس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے راستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا اور ان کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے) کتاب وسنت میں اس کے شواہد کثیر ہیں، اسی طرح جس نے اپنی خواہش کا اسیر بن کر اس حق کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے روگردانی کی جو اس کے پاس ہے تو

یہ اسے جہل وضلال کا وارث کردے گا حتی کہ آخر کار واضح اور ظاہر حق سے بھی اس کا دل اندھا ہو جائے گا جیسے کہا:
(فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ) [الصف : ۵] (تو جب ان لوگوں نے کجروی کی اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دئے)
(فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا) [البقرۃ : ۱۰] (ان کے دلوں میں مرض تھا اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا)
(وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ) [الأنعام : ۱۰۹۔۱۱۰] (اور یہ لوگ اللہ کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں، کہہ دو کہ نشانیاں تو سب اللہ ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کیا معلوم ہے نشانیاں آ بھی جائیں تب بھی ایمان نہ لائیں۔ اور ہم اُن کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے جیسے یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں) یہ استفہام نفی وانکار ہے یعنی تمہیں کیا خبر کہ یہ آیات جب آئیں تو وہ ایمان نہ لائیں گے اور یہ ہم ہیں جو ان کے دلوں اور نظروں کو پھیرتے ہیں جیسا کہ پہلی مرتبہ بھی اس پر ایمان نہ لائے، ان حضرات کی قراءت پر جنہوں نے (اِنَّهَا) کو الف کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے تب یہ اس امر پر جزم ہوگا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے جب یہ آیات آجائیں اسی لیے سعید بن جبیر وغیرہ نے کہا نیکی کا ایک ثواب یہ بھی ہوتا ہے کہ مزید نیکیوں کی توفیق ملتی ہے اور برائی کی ایک سزا یہ بھی ملتی ہے کہ آگے کئی اور برائیوں میں جا پڑتا ہے، صحیحین میں ابن مسعود راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا تم صدق کو لازم پکڑو کہ صدق نیکی کی راہ دکھلاتا ہے اور نیکی جنت کی راہ پر گامزن کرتی ہے اور آدمی ہمیشہ اور مسلسل سچ بولتا اور اس کی طلب کرتا رہتا ہے حتی کہ اللہ کے ہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے اسی طرح جو مسلسل جھوٹ بولتا اور اس کا جویا رہتا ہے وہ آخر کار اللہ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے تو نبی اکرم نے خبر دی کہ صدق وہ اصل ہے جو نیکی کو جبکہ کذب فجور مستلزم ہے، فرمایا:
(اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِيْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِيْمٍ) [الانفطار: ۱۳۔۱۴] (بے شک نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے۔ اور بدکردار دوزخ میں) اسی لئے بعض مشائخ جب اپنے بعض مریدین کو توبہ کرنے کا کہتے اور چاہتے کہ وہ بدک نہ جائیں تو انہیں ہمیشہ سچ بولنے کا حکم دیتے، اسی لئے دین کے مشائخ اور ائمہ کی کلام میں صدق اور اخلاص کا ذکر کثیر ملتا ہے حتی کہ وہ کہتے ہیں جو سچ نہیں بولتا انہیں کہہ دو کہ خود کو میرا مرید نہ کہیں اور کہتے تھے سچ بولنا زمین میں اللہ کی تلوار ہے، کسی شئ پر یہ نہ رکھی جائے گی مگر اسے کاٹ ڈالے گی، یوسف بن اسباط وغیرہ کا قول ہے کہ کوئی بندہ اللہ کے ساتھ صادق نہ بنا مگر اللہ نے اس پر اپنا فیض کیا، اس کی امثال کثیر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ صدق اور اخلاص ایمان واسلام کی تحقیق ہیں، اسلام کا اظہار کرنے والے مومن اور منافق کی طرف منقسم ہیں اور دونوں کے درمیان فارق صدق ہے، نفاق کی اساس جس پر وہ مبنی ہے کذب ہے، اسی لیے جب اللہ تعالی نے ایمان کی حقیقت

ذکر کی تو اسے صدق کے ساتھ منعوت کیا جیسے اس آیت میں:

(قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا) إلى قوله : (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ) [الحجرات : ۱۴-۱۵] (دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔۔۔مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے لڑے)

(لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ) [الحشر : ۸] (ان مفلسانِ تارک الوطن کے لئے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج کر دیئے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور اللہ اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں) تو خبر دی کہ دعوائے ایمان میں صادق وہ اہلِ ایمان ہیں جن کے ایمان میں کوئی شک وشبہ لاحق نہیں اور جو مال وجان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور اسی بات کا اللہ نے اولین وآخرین سے عہد اور میثاق لیا تھا چنانچہ فرمایا:

(وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ) [آل عمران : ۸۱] (اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اُس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اُس کی مدد کرنی ہوگی اور پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اُس اقرار پر میرا ذمہ لیا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا، فرمایا کہ تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں) ابن عباس کہتے ہیں اللہ نے ہر نبی سے یہ میثاق لیا تھا کہ اگر اس کی زندگی میں حضرت محمد ﷺ مبعوث کر دیے گئے تو وہ آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی نصرت کریں گے اور نبیوں کو حکم دیا کہ یہی عہد ومیثاق وہ اپنی امتوں سے بھی لیں، فرمایا:

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ) [الحديد : ۲۵] (ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کریں اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور لوہا پیدا کیا اس میں خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کرلے بے شک اللہ قوی غالب ہے) تو ذکر کیا کہ اس نے کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے اور انصاف کا بول وبالا کرنے کے لیے لوہا اتارا ہے اور تا کہ اللہ ظاہر کرا دے کہ کون اس کے رُسل کی مدد وحمایت میں کمر بستہ ہوتا ہے! کتاب اور لوہا اگرچہ انزال میں باہم مشترک ہیں لیکن مانع نہیں کہ ہر ایک وہاں سے نازل ہوا

ہو جہاں سے دوسرا نہیں، اس طور کہ کتاب اللہ کے ہاں سے نازل ہوئی ہے جیسے کہا:

(الٓـرٰ کِتٰـبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ) [هود: ۱] (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور اللہ حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں) اور:

(وَاِنَّکَ لَتُـلَـقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ) [النمل: ٦] (اور تمہیں قرآن حکیم وعلیم کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے) جبکہ لوہا پہاڑوں سے نازل ہوا جہاں اللہ نے اس کی تخلیق کی ہے، اسی طرح آیتِ برّ جو کہ دین کا جماع (یعنی لبِ لباب) ہے، میں صادقین کا وصف کرتے ہوئے کہا:

(لَیْـسَ الْبِـرَّ اَنْ تُـوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِوَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْـکِتٰـبِ وَالنَّبِیّٖنَ) إلی قوله : (وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ)[البقرة: ۱۷۷] (نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں ۔۔۔ اور یہی ہیں جو ڈرنے والے ہیں) جہاں تک منافقین تو اللہ تعالی نے متعدد آیات میں انہیں کذب کے ساتھ موصوف کیا، مثلا:

(فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ) تَثْبِیْتًا (ابھی گزری)

(اِذَا جَـآءَ کَ الْـمُـنٰـفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ) [المنافقون: ۱] (جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ یقیناً اس کے رسول ہو لیکن اللہ ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں)

(فَـاَعْـقَبَهُـمْ نِـفَـاقًـا فِـیْ قُـلُـوْبِهِـمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْـلَفُوا اللّٰهَ مَاوَعَدُوْهُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ)[التوبة: ۷۷] (تو اللہ نے اس کا انجام یہ کیا کہ اس روز تک کے لئے جس میں وہ اللہ کے روبرو حاضر ہوں گے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا اس لئے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے) قرآن میں اس کا نحو کثیر ہے! یہ جاننا چاہیے کہ صدق اور تصدیق کا اقوال واعمال دونوں میں وجود ہے جیسے ایک صحیح حدیث میں فرمایا ابن آدام پر زنا سے اس کا حصہ لکھ دیا گیا ہے جس کا وہ لامحالہ ارتکاب کرے گا تو آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظربازی ہے، کان بھی زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا (گانوں اور فحش وغیرہ کی) سماعت ہے، ہاتھوں کا زنا بطش ہے (یعنی اخذ، زیادتی، غصب) پاؤں کا زنا (غلط مقامات کی طرف) چلنا ہے، دل میں تمنا اور اشتہا پیدا ہوتی ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے (یعنی اسے عملی جامہ پہناتی ہے) کہا جاتا ہے: (حَـمَـلُوْا عَلَی الْعَدُوِّ حَمْلَةً صَادِقَةً) (لفظی ترجمہ: انہوں نے دشمنوں پر سچا حملہ کیا، یعنی دل وجان سے) جب ان سے پختہ عزم کے ساتھ لڑائی کی ہو اور: (فُلَانٌ صَـــادِقُ الْـحُـبِّ) (جب مخلص محبت کرنے والا ہو، خالی

دعویٰ نہیں) اسی لیے صادق سے مراد اپنے ارادہ وقصد اور طلب میں صادق لیا جاتا ہے اور منافق مومنِ صادق کی ضد ہے اور یہ جو اپنی خبر میں یا اپنے عمل میں کاذب ہو اپنے عمل میں مرائی (یعنی ریاکاری کرنے والے) کی طرح ہے، فرمایا:

(اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ) [النساء : ۱۴۲] (منافق (اپنے تئیں) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، وہ انہیں دھوکے میں ڈالنے والا ہے اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر لوگوں کو دکھانے کیلئے) جہاں تک اخلاص تو وہ اسلام کی حقیقت ہے کیونکہ اسلام کا مطلب اللہ کے لیے ۔ نہ کہ اس کے غیر کے لیے ۔ استسلام (سرِ تسلیم خم کرنا) ہے جیسے کہا:

(ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا) [الزمر : ۲۹] (اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی آدمی شریک ہیں بدخو اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا غلام ہے، بھلا دونوں کی حالت برابر ہے؟) الآیۃ، تو جس نے اللہ کے لیے استسلام نہ کیا اس نے استکبار کیا اور جو اللہ کے لیے بھی اور اس کے کسی غیر کے لیے بھی مستسلم ہوا اس نے شرک کیا اور کبر وشرک اسلام کے منافی ہیں اور اسلام شرک اور کبر کی ضد ہے، یہ (یعنی باب اَسْلَمَ يُسْلِمُ) لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے جیسے کہا:

(اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)[البقرة : ۱۳۱] (جب اُن سے اُن کے رب نے فرمایا کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں) اور کہا:

(بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ)[البقرة : ۱۱۲] (کیوں نہیں! جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) قرآن میں اس کی امثال کثیر ہیں، اسی لیے راس الاسلام (یعنی اسلام کا نقطۂ آغاز) کلمہِ شہادت (لا الہ الا اللہ) ہے اور اس کے ماسوا کی عبادت کا ترک ہے اور یہ اللہ وحدہ کی عبادت کو متضمن اور اس کے ماسوا کی عبادت کا ترک ہے اور یہ اسلامِ عام ہے اولین وآخرین سے جس کے سوا اللہ تعالیٰ کوئی اور دین قبول نہ کرے گا جیسے کہا:

(وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ)[آل عمران : ۸۵] (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا)

(شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) [آل عمران : ۱۸۔۱۹] (اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی، اُس غالب حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ دین تو اللہ کے نزدیک

اسلام ہے) یہ جو ہم نے ذکر کیا اس امر کا ایضاح کرتا ہے کہ دین کی اصل فی الحقیقت علوم واعمال سے باطنی امور ہیں اور یہ نہ ہوں تو ظاہری اعمال کا کچھ نفع نہیں جیسے مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے اسلام علانیہ ہے جبکہ ایمان دل میں ہوتا ہے، اسی لئے حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا حلال بین اور واضح ہو چکا اور حرام بھی اور ان کے درمیان متشابہ امور ہیں جنہیں کثیر لوگ نہیں جانتے تو جو شبہات سے بچا اس نے اپنے دین وعصمت کو محفوظ رکھا اور جو شبہات میں واقع ہوا وہ حرام میں جا واقع ہوا اس چرواہے کی طرح جو (ممنوعہ) چراگاہ کے آس پاس اپنا ریوڑ چراتا ہے اور عین ممکن وقریب ہے کہ اس کا ریوڑ اس چراگاہ میں چلا جائے، ہر بادشاہ کی اپنی خاص چراگاہ ہوتی ہے ! خبردار رہو کہ اللہ کی چراگاہ اس کے محرمات ہیں اور سنو ! جسم میں ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، سن لو یہ دل ہے، ابو ہریرہؓ کہتے ہیں دل بادشاہ اور دیگر اعضاء اس کے لشکری ہیں، اگر بادشاہ خوش وخرم اور تندرست ہے تو اس کے ارکان ولشکری بھی خوش وخرم ہوں گے اور اگر وہ نادرست ہے تو یہی معاملہ اس کے لشکریوں کا ہوگا۔

فصل

یہ **باطنی اعمال** مثلاً اللہ سے محبت، اس کے لیے اخلاص، اس پر توکل اور اس سے راضی رہنا وغیرہ ہر خاص وعام کے حق میں مامور بہ ہیں، کسی کے لیے ان کا ترک محمود امر نہیں چاہے کتنا بڑا اس کا مقام ہو، جہاں تک حزن (یعنی نیکی اور پارسائی سمجھ کر اداس اور حزین شکل بنائے رکھنا) تو نہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور نہ اس کے رسول نے، بلکہ کئی مواضع میں اس سے نہی وارد ہے اگر چہ امرِ دین کے ساتھ اس کا تعلق ہو، جیسے کہا:

(وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ)[آل عمران : ۱۳۹] (اور کمزور نہ پڑنا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے)

(وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ) [النمل : ۷۰] (اور ان پر غم نہ کرنا اور نہ ان چالوں سے جو یہ کہہ رہے ہیں تنگ دل ہونا)

(اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا) [التوبة : ۴۰](اس وقت اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے)

(وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ) [یونس : ۶۵](اور ان لوگوں کی باتوں سے آزردہ نہ ہونا)

(لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ) [الحديد : ۲۳](تاکہ جو تم سے رہ گیا اس کا غم نہ کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اتراؤ نہیں) اور اس کی امثال کثیر ہیں، اس لیے کہ یہ کسی منفعت کا جالب اور کسی مضرت کا دافع نہیں لہذا اس

میں کوئی فائدہ نہیں اور اللہ بے فائدہ چیزوں کا حکم نہیں دیتا، ہاں البتہ غمگین اور افسردہ رہنے والا اس وجہ سے گناہ گار نہ ہوگا اگر اس کے ہاں حزن کے ساتھ کوئی محرم امر مقترن نہیں جیسے پریشانیوں اور مصائب پر حزن کا شکار ہونا جیسے آنجناب نے فرمایا بے شک اللہ تعالی آنکھ کے آنسو اور دل کے حزن پر مواخذہ نہ کرے گا البتہ اس پر۔ اور زبان کی طرف اشارہ کیا۔ ضرور مواخذہ کرے گا یا پھر رحم کردے گا، ایک حدیث میں آپ کے یہ الفاظ مروی ہیں (جو اپنے بیٹے ابراہیم کی شیر خوارگی میں وفات پر کہے تھے) آنکھ آنسو بہارہی ہے اور دل حزین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جس سے رب راضی ہو، اسی سے یہ آیت ہے:

(وَتَـوَلّٰـی عَـنۡهُمۡ وَقَالَ یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ فَهُوَ کَظِیۡمٌ)[یوسف : ۸۴] (پھر اُن کے پاس سے چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہائے افسوس یوسف اور رنج والم میں ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور ان کا دل غم سے بھر رہا تھا) کبھی حزن کے ساتھ وہ کچھ مقترن ہوتا ہے جس پر حزین کو ثواب دیا جاتا ہے اور وہ قابلِ تعریف ٹھہرتا ہے تو اس جہت سے وہ محمود ہے، نہ کہ حزن کی جہت سے جیسے دین میں لاحق کسی مصیبت اور پریشانی اور مسلمانوں کے عمومی مصائب پر حزین ہونا، تو یہ اپنے دل میں موجود حبِ خیر اور بغضِ شر اور اس کے توابع کی وجہ سے محمود ہے لیکن یہ حزن اگر کسی مامور بہ مثلاً صبر وجہاد اور ترکِ منفعت اور جلبِ مضرت کا سبب بنے تب یہ منہی عنہ ہے وگرنہ صرف حزن کی جہت سے اس پر کوئی گناہ لازم نہ ہوگا، اسی طرح اگر حزین رہنے سے دل میں ضعف اور طبیعت میں ایسا اضمحلال طاری رہنے لگے کہ اللہ ورسول کے اوامر کی بجا آوری سے سست پڑ جائے تو وہ اس جہت سے مذموم ہوگا اگرچہ کسی اور جہت سے محمود ہو اور جہاں تک اللہ کے لیے محبت، اس پر توکل اور اس کے لیے اخلاص وغیرہا تو یہ سب خیرِ محض ہیں اور یہ نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین میں سے ہر ایک کے حق میں محبوب حسنہ ہے اور جو کہے کہ یہ مقامات تو عوام کے لیے ہیں نہ کہ خواص الناس کے لیے تو اس کی بات درست نہیں، اگر اس کی مراد خواص کا ان سے خروج ہو، ان سے کبھی کوئی صاحبِ ایمان خارج نہیں ہوسکتا بلکہ ان سے خروج کرنے والا تو کافر اور منافق ہے، بعض حضرات نے اس ضمن میں ایسی کلام کی ہے جس کا غلط ہونا ہم واضح کر چکے ہیں اور کہ یہ ان مقامات کی تحقیق میں تقصیر ہے، ایک جگہ اس پر مفصل بحث کی ہے یہ اس کا محل نہیں

لیکن ان مقامات کے ضمن میں لوگ خصوص اور عموم کی طرف منقسم ہیں تو خواص کے لیے ان کا خاص اور عوام کے لیے ان کا عام ہے، اس کی مثال کہ انہوں نے کہا: توکل قوت کی طلب میں نفس سے مناضلت (یعنی مقابلہ کرنا) ہے اور خواص اپنے نفس سے مناضل نہیں ہوتے اور کہا: متوکل اپنے توکل کے ساتھ امور میں سے کسی امر کا طالب ہوتا ہے جبکہ عارف ان امور کا ان کی فروع سمیت شاہد ہوتا ہے تو وہ کسی شئ کا طالب نہیں ہوتا، تو کہا جائے گا جہاں تک اول تو یہ توکل دنیوی مصالح میں توکل سے اعم ہے تو متوکل اپنے دل، دین، زبان کی حفاظت اور اپنے ارادوں میں اللہ پر متوکل ہوتا ہے اور یہ اس کی طرف اہم الامور ہے اسی لیے ہر نماز میں یہ کہہ کر رب سے مناجات کرتا ہے:

(اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ)[الفاتحة : ۴] (اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) جیسے کہا:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) اور:

(عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ)[هود: ۸۸] (میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں)

(قُلْ هُوَ رَبِّىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ) [الرعد: ۳۰] (کہہ دو وہی تو میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اُسی پر بھروسا کرتا ہوں اور اُسی کی طرف میرا رجوع ہے) تو اس نے عبادت اور توکل کے مقامات کے مابین جمع کیا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں پورے دین کے جامع ہیں اسی لیے بعض سلف نے کہا اللہ نے تمام سابقہ آسمانی کتابوں (کے نچوڑ) کو قرآن میں جمع کر دیا اور قرآن کا سارا علم مفصل (طویل) سورتوں میں اور مفصل کا پورا علم (اور نچوڑ) سورۃ الفاتحہ میں جمع کر دیا ہے جبکہ سورۃ فاتحہ کا سارا علم اس آیت میں مجموع ہے: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) یہ دونوں کلمے نہایت جامع ہیں، ایک اللہ کے لیے اور ایک بندوں کے لیے جیسا کہ مسلم کی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کر دیا ہے، ایک حصہ میرے لیے اور ایک اس کے لیے اور میرے بندے کے لیے جو اس نے مانگا، بندہ جب کہتا ہے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) تو اللہ کہتا ہے: (حَمِدَنِىْ عَبْدِىْ) (میرے بندے نے میری حمد کی) بندہ کہتا ہے: (الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) تو اللہ کہتا ہے: (اَثْنٰى عَلَىَّ عَبْدِىْ) (میرے بندے نے میری ثناء کی) بندہ کہتا ہے: (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) تو اللہ کہتا ہے: (مَجَّدَنِىْ عَبْدِىْ) (میرے بندے نے میری تمجید کی) بندہ کہتا ہے: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) تو اللہ فرماتا ہے یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھوں آدھ ہے اور میرے بندے کے لیے وہ جس کی اس نے طلب کی، پھر بندہ کہتا ہے:

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ) (ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ کہ جن پر غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ بنے) تو اللہ کہتا ہے یہ سب میرے بندے کے لیے اور میں نے اس کی طلب پوری کی، تو رب تعالیٰ کے لیے نصف ثناء وخیر ہے جبکہ بندے کے لیے جو نصف ہے وہ اس کی دعا اور طلب تو جو رب تعالیٰ کے شایانِ شان اس کی بھی یہ سورۃ جامع ہے اور جو بندوں کو چاہیے اس کی بھی یہ جامع ہے، صحیحین میں حضرت معاذ بن جبل راوی ہیں کہ میں ایک دفعہ گدھے پر نبی اکرم کا ردیف تھا تو کہا اے معاذ کیا جانتے ہو اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کی اللہ ورسول ہی اعلم ہیں، فرمایا اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی شئ کو شریک نہ بنائیں اور کیا جانتے ہو اگر بندے یہ کریں تو اللہ پر ان کا کیا حق ہے؟ عرض کی اللہ ورسول اعلم ہیں، فرمایا کہ انہیں عذاب نہ دے، عبادت ہی وہ غایت ہے جس کے لیے اللہ نے بنی نوعِ آدم کی تخلیق کی ہے اللہ کے امر، محبت اور اس کی رضا کی جہت سے جیسے کہا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) [والذاريات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں) اسی کے ساتھ رسل بھیجے اور کتب نازل کیں اور یہ ایسا اسم ہے جو اللہ کے لیے کمالِ حب اور

اس کی انتہاء اور کمالِ ذل اور اس کی انتہاء کا کا جامع ہے، ذل سے خالی محبت اور حب سے خالی ذل عبادت نہ ہوگی، عبادت وہی جو ان دونوں امر کے کمال کی جامع ہو، لہذا عبادت درست نہیں مگر اللہ کے لیے، عبادت کی منفعت بندے ہی کے لیے ہے اللہ تو عالمین سے غنی ہے البتہ یہ اس کے لیے اس کی اس سے محبت اور اس کی اس پر رضا کی جہت سے ہے، اسی لیے اللہ کو بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی صحرا میں اپنی سواری کو گم پانے والے ۔جس پر اس کا سامانِ خورد ونوش تھا ۔ کے اچانک مل جانے کی فرحت اور خوشی ملتی ہے جبکہ وہ تلاش میں تھک ہار کر موت کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ اس دوران آنکھ لگ گئی جب کھلی تو سواری اس کے پاس کھڑی تھی تو جو خوشی کا عالم اس کا ہوگا بندے کی توبہ پر اللہ کی خوشی اس سے سوا ہوتی ہے، اس سے کئی امورِ جلیلہ متعلق ہیں جن کا ایک جگہ ہم نے شرح وبسط سے بیان کیا ہے

توکل اور استعانت بندے کے لیے ہے، اس لیے کہ یہی وہ وسیلہ وطریق ہے جس کے ساتھ عبادت سے وہ اپنے مطلوب ومقصود کو پالیتا ہے تو استعانت دعا اور سوال کرنے کی مانند ہے، طبرانی نے کتاب الدعاء میں روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ عزوجل کہتا ہے : اے ابن آدم یہ چار امور ہیں، ایک میرے لیے خاص ہے، ایک تمہارے لیے خاص ہے، ایک میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور چوتھا امر تمہارے اور میری خلق کے درمیان مشترک ہے، جو میرے لیے خاص ہے وہ یہ کہ تو میری ہی عبادت کرے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، جو تیرے لیے ہے وہ یہ کہ تمہیں تمہارے عمل کا اس وقت بدلہ دوں جب تمہیں اس کی اشد ضرورت ہوگی اور جو میرے اور تیرے درمیان مشترک ہے وہ یہ کہ تم دعا کرو اور میں قبول کروں اور آخری یہ کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک رکھو جو تو پسند کرے کہ وہ تمہارے ساتھ روا رکھیں، اس کا اللہ کے لیے اور دوسرے کا بندے کے لیے ہونا ابتداءً محبت اور رضا کے تعلق کے اعتبار سے ہے تو بندہ ابتداءً ہر اس چیز کو پسند کرتا اور اس کا ارادہ کرتا ہے جسے اپنے حال کے مناسب سمجھتا ہے اور اللہ تعالی ہر اس کو پسند کرتا ہے اور اس پر راضی ہے جو اس کی رضا میں غایتِ مقصودہ ہے اور اس کے لیے بالتبع وسیلہ کو پسند کرتا ہے وگرنہ جتنے بھی مامورات ہیں ان کا نفع بندوں پر ہی عائد ہے اور یہ سب اللہ کو پسند اور وہ ان پر راضی ہے، اس پر جس نے ظن کیا کہ توکل مقاماتِ عوام سے ہے وہ یہ سمجھا ہے کہ توکل کے ساتھ طلب نہیں جاتی مگر دنیا کے حظوظ (یعنی مفادات) کی، یہ غلط ہے بلکہ دینی امور میں توکل کرنا اعظم ہے اور توکل ان دینی امور سے ہے جن کے بغیر واجبات اور مستحبات تام ومکمل نہیں ہوتے اور ان سے بے رغبتی کرنے والا ان اشیاء سے بے رغبتی کرنے والا ہے جو اللہ کو پسند ہیں اور وہ ان پر راضی اور ان کا آمر ہے

مشروع زہد ان امور واشیاء سے بے رغبتی کرنا جن کا دارِ آخرت میں نفع نہ ہوگا اور یہ فضول مباح جن کے ساتھ اللہ کی اطاعت پر کوئی مدد حاصل نہیں ہوتی جیسے مشروع ورع اور تقوی اس شئ کا ترک ہے جو آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے او

ر یہ محرمات اور شبہات کا ترک کہ جن کا ترک ان امور کے ترک کو مستلزم نہیں ہوتا جن کا کرنا ان سے ارجح ہو، مثلاً واجبات، لیکن جو بذاتِ خود دارِ آخرت میں نافع یا ان پر معین ہوں جن کا آخرت میں نفع ہوگا تو ان سے زہد (یعنی بے رغبتی) دین سے نہیں بلکہ ایسا کرنے والا اس آیت کا مصداق ہے:

(یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ)[المائدة : ۸۷](مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اُن کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) جیسا کہ مباحات فضول امور کے ساتھ اشتغال مشروع زہد کے منافی ہے اور اگر ان کے ساتھ کسی فعلِ واجب یا ترکِ محرم سے مشغول ہوا تو وہ گناہ گار ہوگا وگرنہ کم از کم مقرّبین کے درجہ سے گر کر مقتصدین کے زمرہ اور درجہ میں تو ضرور ہوگا، نیز توکل اللہ کو محبوب، پسند اور ہمیشہ مامور بہ ہے اور جو اس صفت کا حامل ہو وہ مقربین کو چھوڑ کر مقتصدین کے فعل کے ساتھ مشغول نہیں ہوسکتا، تو یہ ان کے قول کہ متوکل اپنے حظوظ کا طالب ہوتا ہے، کے تین جوابات ہیں اور جہاں تک ان کا قول کہ امورِ کائنات سے فارغ ہوا جا چکا ہے تو یہ اس کی نظیر ہے جو ان کے بعض نے دعا بارے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ مطلوب اگر مقدر ہے تو بغیر دعا کے بھی حاصل ہوجائے گا اور اگر مقدر نہیں تب دعا کرنے سے بھی نہیں ملے گا، یہ قول شرعاً اور عقلاً فاسدترین اقوال میں سے ہے

اسی طرح ان حضرات کا قول جو کہتے ہیں توکل اور دعا کے ساتھ کسی منفعت کا جلب اور کسی مفسدت کا دفع نہیں ہوتا بلکہ یہ محض ایک عبادت ہے اور حقیقتِ توکل تفویضِ محض کی حقیقت کے بمنزلہ ہے اگرچہ اس کے قائلین میں بعض مشائخ بھی ہیں مگر یہ غلط ہے، اسی طرح یہ قول بھی کہ دعا محض ایک عبادت ہے تو یہ اقوال اور جو ان جیسے دیگر ہیں، سب کی جامع ایک اصل ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات نے ظن کیا کہ امور کا مقدر و مقضِیّ ہونا مانع ہے کہ ہم ان مقدر اسباب پر توقف کریں جو بندے سے ہوں، یہ اس حقیقت سے ناآشنا ہوئے کہ اللہ تعالی امور کو عباد اور غیرِ عباد کے افعال میں سے ان اسباب کے ساتھ مقدر اور مقضی کرتا ہے جنہیں ان کے ساتھ معلق کیا ہوا ہے، لہذا ان کے اس قول کا طرد (یعنی اسے ضابطہ بنالینا) کلی طور پر اعمال کی تعطیل کا موجب بنے گا، نبی اکرم سے اس اصل کے بارے میں کئی دفعہ پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا۔ جیسا کہ صحیحین میں عمران بن حصین سے مروی ہے۔ کہ کہا گیا یا رسول اللہ کیا اہلِ جنت اور اہلِ نار (اب) معلوم شدہ ہیں؟ فرمایا ہاں، عرض کی پھر عمل کس لیے؟ فرمایا ہر ایک کو انہی اعمال کی توفیق ملتی ہے جن کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے، صحیحین میں حضرت علی راوی ہیں کہ ہم نبی اکرم کے ہمراہ ایک جنازہ میں تھے (آگے یہی جو سابق الذکر حدیث میں ذکر ہوا) اس موقع پر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی:

(فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی) [واللیل : ۵-۱۰] (پس جس نے دیا اور پرہیزگاری کی۔ اور اچھائی کی تصدیق

کی۔اس کو ہم آسانی دیں گے۔اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا۔اور اچھائی کی تکذیب کی۔اسے تنگی میں ڈالیں گے) اسے اصحابِ صحاح وسنن اور اہلِ مسانید نے بھی نقل کیا ہے ترمذی نے نقل کیا کہ نبی اکرم سے سوال ہوا ادویہ جو ہم استعمال کرتے ہیں، کی بابت کیا خیال ہے اور دم اور دیگر حفاظتی واحتیاطی تدابیر، کیا یہ تقدیر سے کسی شئ کا رد کرسکتی ہیں؟ فرمایا یہ سب تو تقدیر کا حصہ ہیں، اس مفہوم کی متعدد احادیث ہیں تو نبی اکرم نے تبیین کی کہ (اللہ تعالی کے) علم وکتاب کا سعید اور شقی بارے تقدُّم اس امر کے منافی نہیں کہ ذی سعادت کی سعادت اس کے اعمال صالحہ کے ساتھ اور ذی شقاوت کی شقاوت اس کے اعمالِ بد کے ساتھ ہو کیونکہ اللہ تعالی کو تمام امور کا پہلے سے علم ہے اور اس نے سب کچھ لکھ رکھا ہے، اس کے علم میں ہے کہ سعید اعمالِ صالحہ کے ساتھ سعید اور شقی اعمالِ بد کے ساتھ شقی ہوگا تو جو (تقدیر کے مطابق) سعید ہے اس کے لیے اعمالِ صالحہ میسر کر دئے جاتے ہیں اور وہ اسی طرف رواں دواں ہیں اور یہی اللہ کی کونی مشیت ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا:

(وَلَا يَـزَالُـوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ)[هود: ۱۱۸۔۱۱۹] (وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔مگر جن پر تمہارا رب رحم کرے) جہاں تک اللہ کی محبت ورضا سے جس کے لیے وہ پیدا کئے گئے ہیں اور وہ اس کا دینی ارادہ جس کے موجب کے وہ مامور ہیں تو یہ اس آیت میں مذکور ہے:(وَمَـا خَـلَـقْـتُ الْـجِنَّ وَالْاِنْـسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) اللہ نے اپنی کتاب میں درج ذیل میں سے ہر ایک میں وہ کچھ بیان کر دیا ہے جو امرِ دینی اور اللہ کی محبت ورضا اور اس کے امرِ شرعی کے موافق ہے،کلماتِ:امر،ارادہ، اذن،کتاب،حکم،قضاء،تحریم اور ان کا نحو،اس کی مثال کہ اس نے امرِ دینی بارے کہا:

(اِنَّ الـلّٰـهَ يَـاْمُـرُ بِـالْـعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَيَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ) [النحل: ۹۰](اللہ تمہیں انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے)

(اِنَّ الـلّٰـهَ يَـاْمُـرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَهْلِهَا) [النساء: ۵۸] (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو) اور امرِ کونی بارے کہا:

(اِنَّمَآ اَمْرُهٗ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ)[يس: ۸۲] (اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہوجاؤ تو وہ ہو جاتی ہے)

(وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْـلِكَ قَـرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ) [الإسراء: ۱۶] (اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو فسق پر مامور کر دیا پھر اُس پر حکم ثابت ہوگیا) اس آیت بارے دو میں سے ایک قول پر ارادہ دینیہ بارے کہا:

(يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ) [البقرة: ۱۸۵](اللہ تعالی تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا)

(يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ) [النساء : ۲۶] (اللہ چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تمہیں اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے)

(مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ) [المائدة : ۶] (اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے) کونی ارادہ بارے کہا:

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ) [الأنعام : ۱۲۵] (تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اُس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے) حضرت نوح نے اپنی قوم سے کہا تھا:

(وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ) [هود: ۳۴] (اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے تو میری خیر خواہی تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتی) اذنِ دینی بارے کہا:

(مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ) [الحشر : ۵] (کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو اللہ کے حکم سے تھا اور مقصود یہ تھا کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے) کونی بارے کہا:

(وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) [البقرة : ۱۰۲] (اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے) قضائے دینی بارے کہا:

(وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ) [الإسراء : ۲۳] (اور تمہارے رب کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) ای اَمَرَ (یعنی اس کا امر ہے) کونی بارے کہا:

(فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ) [حم السجدة : ۱۲] (پھر دو دن میں سات آسمان بنانے کا کام کیا) حکمِ دینی بارے کہا:

(اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ) [المائدة : ۱] (تمہارے لئے چار پائے جانور حلال کر دیئے گئے ہیں بجز اُن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں مگر حالتِ احرام میں شکار کو حلال نہ جاننا اللہ تعالیٰ جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے)

(ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ) [الممتحنة : ۱۰] (یہ اللہ کا حکم ہے جو تم میں فیصلہ کئے دیتا ہے) کونی سے متعلق

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے کا قول ذکر کیا:

(فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْٓ اَبِیْٓ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ) [یوسف : ۸۰] (تو جب تک والد صاحب مجھے حکم نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں یا اللہ تعالیٰ میرے لئے کوئی اور تدبیر کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے)

(قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ) [الأنبياء : ۱۱۲] (کہا اے میرے رب! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہمارا رب بڑا مہربان ہے اسی سے ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو مدد مانگی جاتی ہے) تحریمِ دینی بارے کہا:

(حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ) [المائدة : ۳] (تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا گیا ہے)

(حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ الخ) [النساء : ۲۳] (تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں الخ) الآیۃ، تحریمِ کونی کے بارے کہا:

(فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ) [المائدة : ۲۶] (پس وہ ملک ان پر چالیس برس تک کیلئے حرام کر دیا گیا، زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے) فرمایا:

(وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ) [المعارج : ۲۴-۲۵] (اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے۔ مانگنے والے کا اور نہ مانگنے والے کا) کلماتِ دینیہ بارے کہا:

(وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ) [البقرة : ۱۲۴] (اور جب اللہ نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورا اترے) کونی کلمہ بارے کہا:

(وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا) [الأعراف: ۱۳۷] (اور بنی اسرائیل کے بارے میں اُن کے صبر کی وجہ سے تمہارے رب کا نیک وعدہ پورا ہوا) اسی سے صحاح، سنن اور مسانید کی یہ روایت کہ نبی اکرم اپنے استعاذہ میں یہ کلمات کہا کرتے تھے: (اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ) تو یہ کونی کلمہ ہے جس سے کوئی شیٔ اس کی مشیت اور تکوین سے خارج نہیں! جہاں تک کلماتِ دینیہ تو فجار نے اس کی معصیت کے ساتھ ان کی مخالفت کی ہے، یہاں مقصود یہ ہے کہ نبی اکرم نے واضح کر دیا ہے کہ اچھے یا برے عواقب جن کے لیے لوگوں کی تخلیق ہوئی، کے مناسبِ حال اعمال میسر کر دئے جاتے ہیں جن کی رو سے لوگ ان عواقب تک جا پہنچتے ہیں، یہ تمام مخلوقات کے لیے ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام انسانوں اور حیوانات کو ارحام میں پیدا کرتا ہے اور اس کا سبب نر اور مادہ کا ملاپ بنایا جس کے نتیجہ میں رحم میں دو پانی

باہم مل جاتے ہیں، اگر کوئی آدمی کہے میں توکل کرتا ہوں اور اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت نہ کروں گا (بلکہ شادی ہی نہ کروں گا) اگر میرے مقدر میں اولاد لکھی ہے تو وہ ایسے ہی ہو جائے گی تو سب اسے احمق کہیں گے بخلاف اس کے کہ جب جماع کرے اور عزل کرے تو اس صورت میں اگر اللہ کی مشیت حمل ٹھہرنے کی ہو تو عزل کرنا اس کے لیے مانع نہ ہوگا کہ تب اس کے اختیار اور مرضی کے بغیر بھی پانی اندر خارج ہو جائے گا، اسی سے صحیحین کی ابوسعید خدری کی روایت، کہتے ہیں ہم غزوہ بنی مصطلق میں نبی اکرم کے ہمراہ چلے، قیدی خواتین ہاتھ لگیں ہم نے ان سے قربت کرنا چاہی اور عزل کو پسند کیا، اس بارے آنجناب سے پوچھا تو فرمایا (مفہوم) یہ کرنا اور نہ کرنا کچھ فائدہ مند نہیں کہ اللہ نے روزِ قیامت تک جسے پیدا کرنا ہے لوحِ محفوظ میں لکھ لیا ہے، مسلم کی حضرت جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ میری لونڈی ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو، فرمایا چاہو تو عزل کرتے رہو لیکن جو مقدر ہے وہ تو ہو کر رہے گا، یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالی اس امر پر قادر ہے کہ بغیر والدین کے انسان کو پیدا کر دے جیسے حضرت آدمؑ کو کیا اور یہ کہ صرف والد سے کرے جیسے حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی چھوٹی پسلی سے پیدا کیا اور کہ صرف ماں سے کرے جیسے حضرت عیسی کو کیا

لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں، **اللہ کی عام روش** وہی ہے جو ذکر کی، اس مقام کا اگرچہ شرائع کے معطلین زنادقہ نے جحد کیا مگر کثیر معظّم مشائخ کو اس دقیق مقام نے اشکال میں ڈالا ان میں سے کئی تقدیر کے ساتھ استرسال (یعنی اس ظن سے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہے جد و جہد ترک) کرتے ہیں اور اس کے اوامر اور نواہی کے غیر محقق ہیں اور اسے وہ تفویض، توکل اور حقیقتِ قدریہ کے ساتھ جریان کے باور کرتے ہیں اور ان کا ظن ہے کہ قائل کا قول کہ بندے کو چاہئے کہ اللہ کے ساتھ غسال کے آگے کسی کی میت کی مانند ہو، امر و نہی پر عمل کرنے کے ترک کو متضمن ہے بلکہ کئی تو اوامر کا ترک اور منہی عنہ کا ارتکاب کرتے ہیں حتی کہ اس کے پاس نور و فرقان کمزور پڑ جاتا ہے جس کے ساتھ وہ تفرقہ کرے اس کے درمیان جو اللہ نے امر دیا اور اسے پسند کیا اور اس پر راضی ہوا اور اس کے درمیان جس سے اس نے نہی کی اور جسے برا سمجھا اور اس کے فاعل پر ناراض ہوا تو یوں ان امور کے مابین تسویہ کیا جن کے مابین اللہ نے تفرقہ کیا ہے جیسے کہا:

(**اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ**) [الجاثیة: ۲۱] (جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہو گے؟ یہ جو دعوے کرتے ہیں بُرے ہیں) اور کہا:

(**اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ**) [ن: ۳۵-۳۶] (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسی تجویزیں دیتے ہو؟)

(**قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ**) [الزمر: ۹] (کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے

دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟)

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ [الفاطر: ۲۲] (اور نہ زندے اور مُردے برابر ہو سکتے ہیں اللہ جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے)

اور ان کی امثال دیگر آیات، حتیٰ کہ ان کے غالی لوگوں کا معاملہ اس نہج تک پہنچا کہ وہ نبوی الٰہی فرقانی شرعی مامور کے امر جس پر کتاب وسنت دال ہیں، کے درمیان اور عالمِ وجود میں ان احوال کے مابین تمیز سے اعراض کرنے لگے جو کفار اور فجار کے ہاتھوں جاری ہوتے ہیں تو وہ وجہِ جمع کے شاہد بنے اس جہت سے کہ اس دنیا میں سبھی کچھ اللہ کی قضاء وقدر اور ربوبیت اور اس کے ارادہ عامہ کی رو سے ہوتا ہے اور سب اہلِ کائنات اس کی مِلک میں داخل ہیں اور وہ اس وجہ سے فرق کے شاہد نہ بنے جس کی رو سے اللہ نے اپنے مومنین اولیاء اور اور اپنے اعداء کافرین کے درمیان تفریق کی ہے، اہلِ طاعت جو اس کے امرِ دینی کی اطاعت کرتے ہیں اور اہلِ معصیت جو اس کے امر کو نہیں مانتے اور اس میں یہ بعض اشیاخ سے منقول مجمل کلمات یا ان کی بعض غلطات سے استشہاد کرتے ہیں، یہ اصلِ عظیم ہے اور ان بڑے امور سے ہے جن پر اللہ کے طریق کے اہلِ ارادت کی راہ کے سالکین کو نہایت توجہ دینے کی ضرورت ہے جو ان لوگوں کی ارادت پر ہیں جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں کیونکہ اس میں سستی کرنے اور اسے نظر انداز کرنے کے سبب ان میں سے کثیر طوائف پر کفر، فسوق اور عصیان سے وہ کچھ داخل ہوا جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے حتیٰ کہ یہ اس بغی وعدوان پر معاون بن گئے جو اہلِ ظلم وعلو کی طرف سے زمین پر مسلط کیا گیا، ان لوگوں کی مانند جو اپنے قلوب کے ساتھ اہلِ فساد میں سے ان حضرات کی معاونت کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں جو ظلم وسرکشی پسند کرتے ہیں، یہ گمان کرتے ہوئے کہ اگر ان کے لیے ایسے احوال ہوں جن کے ساتھ اس میں اثر انداز ہوں تو وہ اللہ کے اولیاء میں سے ہوں گے کہ دلوں کے لیے وہ اعظم تاثیر ہوتی ہے جو ابدان کے لیے نہیں ہوتی لیکن اگر قلوب صالح ہیں تو ان کی تاثیر بھی صالح اور مثبت ہوگی اور اگر قلوب فاسد ہیں تو ان کی تاثیر بھی فاسد ہوگی تو کبھی احوال کی تاثیر اللہ کے ہاں محبوب اور کبھی اسے ناپسند ہوتی ہے، فقہاء نے اس شخص پر بھی قصاص لاگو کرنے کے وجوب پر کلام کی ہے جو کسی کو فی الباطن قتل کرے (یعنی جادو وغیرہ سے)

یہ حضرات اپنے بواطن وقلوب کے ساتھ امرِ کونی کا استشہاد کرتے ہیں اور اپنے میں سے کسی کے لیے حاصل مجرد خرقِ عادت (یعنی خلافِ معمول/ مافوق العادت والفطرت) امر کو کشف شمار کرتے ہیں جو اسے ہوتا ہے یا ایسی تاثیر کے ساتھ جو اس کے ارادہ کے موافق ہو اپنی کرامت باور کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ فی الحقیقت یہ کرامت نہیں بلکہ اہانت ہے اور یہ کہ کرامت لزومِ استقامت کا نام ہے او راللہ اپنے بندے کو اس سے بڑی کرامت عطا نہیں کرتا کہ وہ اللہ کے پسندیدہ امور میں اس کی موافقت کرے اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اس کے اولیاء سے موالات اور اس کے دشمنوں سے معادات کرے اور ایسا کرنے والے اللہ کے اولیاء ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا:

(اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ) [یونس : ۶۲] (آ گاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) اگر یہ صرف واجب امور میں موافقت کرنے والے ہیں تو مقتصدین ہیں اور اگر واجبات کے ساتھ اسے محبوب امور میں بھی (یعنی جو واجب نہیں مگر اسے پسند ہیں مراد نفل عبادت) تو یہ مقرّبین میں سے ہیں کیونکہ ہر واجب محبوب تو ہے مگر ہر محبوب واجب نہیں ہوتا، جہاں تک وہ جس کے ساتھ اللہ اپنے بندے کو سرّاء (یعنی خوشحالی اور کشائش) میں سے کسی امر کے ساتھ آزمائے، خرقِ عادت یا اس کے غیر کے ساتھ یا ضراء (تنگی اور بدحالی) کے ساتھ آزمائے تو یہ بندے کی اپنے رب پر کرامت کی وجہ سے نہیں اور نہ اس کے اس پر ہوان (ہلکا ہونے) کی وجہ سے بلکہ کبھی وہ لوگ بھی اس کے ساتھ سعید ہوتے ہیں جب وہ اس میں اس کی اطاعت کریں اور وہ لوگ شقی ہوجاتے ہیں جب انہوں نے اس میں اس کی نافرمانی کی، فرمایا:

(فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ) [والفجر: ۱۵۔۱۶] (مگر انسان جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا) اسی لیے **ان امور میں لوگ درج ذیل تین اقسام پر ہیں**:

۱۔ ایک جن کے خرقِ عادت کے ساتھ درجات مرتفع ہیں جب وہ اس کا استعمال اللہ کی اطاعت میں کریں

۲۔ وہ جو اس کے ساتھ اللہ کے عذاب کا نشانہ بن جاتے ہیں جب انہوں نے اس کا استعمال اللہ کی معصیت میں کیا جیسے بلعام وغیرہ

۳۔ وہ جن کے حق میں یہ مباحات کے بمنزلہ ہوتی ہے، اول قسم حقاً مومنین ہیں جو سیدِ اولادِ آدم نبیِ آخر الزمان کے متبع ہیں، ان کے خوارق اس حجت کے لیے ہوتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کے دین کی اقامت ہوتی ہے یا کسی ایسی ضرورت کے تحت جس کے ساتھ یہ اللہ کی طاعت پر استعانت کر رہے ہیں، اس اصل میں کثرتِ غلط کی وجہ سے نبی اکرم نے تقدیر کے ساتھ استرسال کرنے سے نہی کی ہے بندے کے لیے نافع امور کی بجا آوری کرنے کی حرص کے بغیر، چنانچہ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے فرمایا قوی مومن ضعیف مومن سے بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور دونوں میں خیر ہے، جو تجھے نفع دے اس کی حرص کر اور اللہ سے مدد کا خواہاں بن اور اگر کوئی پریشانی لاحق ہو تو یہ مت کہو کاش میں یہ کر لیتا تو یہ ہوتا لیکن کہو اللہ نے جو مقدر کیا اور وہی ہوتا ہے جو اس کی مشیت ہو، اگر اور کاش شیطان کے عمل کی کنجی ہے

سنن ابو داود میں ہے کہ دو آدمی اپنا کوئی جھگڑا لے کر نبی اکرم سے تصفیہ کرانے آئے، آپ نے بیانات سن کر ایک کے حق میں فیصلہ کر دیا تو دوسرے نے کہا: (حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ) آپ نے فرمایا بے شک اللہ عجز پر ملامت کرتا ہے، تم دانائی کو لازم پکڑو، اگر کسی معاملہ میں بے بس ہو جاؤ تو کہو: (حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ) تو یوں نبی اکرم نے بندۂ مومن کو

حکم دیا کہ وہ نافع امر کی حرص رکھے اور اللہ سے استعانت کرے اور یہ اس قولہ کے مطابق ہے: (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) نافع کی حرص اللہ کی طاعت اور اس کی عبادت ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر نافع کیا شئ ہوسکتی ہے اور ہر جو طاعت پر مددگار بنے وہ بھی طاعت ہے اگر چہ مباح کی جنس سے نہ ہو، ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے حضرت سعد سے فرمایا تم کوئی خرچ نہ کرو گے جس کے ساتھ تم اللہ کی رضا کے طالب ہو مگر اس کی وجہ سے تمہارے درجہ ورتبہ میں اضافہ ہوگا حتی کہ وہ لقمہ بھی جو تم اپنی زوجہ کے منہ میں دو، تو خبر دی کہ اللہ عجز پر ملامت کرتا ہے جو دانائی کی ضد ہے اور یہ مامورات جن کے کرنے کا حکم ہے میں تفریط کرنا کہ یہ فعل کے لئے مقارن قدرت کے منافی ہے اگر چہ سابق تقدیر کے یہ منافی نہیں جو امر اور نہی کی مناط ہے، وہ استطاعت جو موجبِ فعل ہوتی ہے وہ اس کے مقارن ہوتی ہے اور یہ موزوں نہیں ہوتی مگر اپنے مقدور کے لیے جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا:

(مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ)[هود: ۲۰](یہ نہیں سن سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے)

(وَكَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا) [الكهف: ۱۰۱](اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے) جہاں تک وہ استطاعت جس کے ساتھ امر اور نہی متعلق ہیں تو کبھی اس کے ساتھ فعل مقترن ہوگا اور کبھی نہیں ہوگا جیسے اس آیت میں کہا:

(وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا) [آل عمران: ۹۷](اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اُس کا حج کرے) اور نبی اکرم کا حضرت عمران بن حصین سے یہ کہنا: کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر اس کی طاقت نہ پاؤ تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی نہ ہو تو پہلو کے بل ہو کر، **تو اس مقام میں لوگ ان چار اقسام میں منقسم ہیں:**

(۱) جو امر و نہی اور عبادت وطاعت کی طرف رب تعالی کی الوہیت کے شاہد بن کر دیکھتے ہیں، وہ رب جس کی عبادت کا انہیں حکم دیا گیا ہے، یہ قضاء وقدر اور توکل واستعانت کی جانب نہیں دیکھتے، یہ کثیر متفقہہ اور متعبدہ کا حال ہے تو یہ اپنے حسنِ قصد اور اللہ کی حرمات اور شعائر کی تعظیم کی خور کھنے کے باوجود ان پر ضعف وعجز اور خذلان غالب ہوتا ہے اسی لیے اللہ کے ساتھ استعانت، اس پر توکل، اس کی طرف رجوع اور اس سے دعا کرنا انسان کو قوی بناتا ہے اور امور کو اس پر آسان کرتا ہے، اسی لئے بعض سلف نے کہا جسے یہ بات اچھی لگے کہ وہ قوی ترین انسان بن جائے تو وہ اللہ پر توکل کرے، صحیحین میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی اکرم کی تورات میں یہ صفت بیان کی گئی ہے: (اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِداً وَ مُبَشِّراً وَ نَذِیْراً وَ حِرْزاً لِلْاُمِّیِّیْنَ، اَنْتَ عَبْدِیْ وَ رَسُوْلِیْ، سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ وَلَا صَخَّابٍ بِالْاَسْوَاقِ وَلَا یَجْزِی بِالسَّیِّئَةِ السَّیِّئَةَ وَ لٰكِنْ یَجْزِی بِالسَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ وَ یَعْفُوْ وَ یَغْفِرُ وَ لَنْ اُقَیِّضَهٗ حَتّٰی اُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ فَاَفْتَحُ بِهٖ اَعْیُناً عُمْیاً وَآذَاناً صُمّاً وَ قُلُوْباً غُلْفاً بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) (شاہد، مبشر، نذیر، امیین یعنی عربوں کے لئے پناہ گاہ، اللہ کا بندہ اور

رسول،متوکل،تندخو اور درشت مزاج نہیں، اور نہ بازاروں میں شورشرابہ کرنے والے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے بلکہ اچھائی سے،عفو درگزر کرنے والے، وفات سے قبل ایک بکھری قوم کو کھڑا کر جائیں گے، میں۔اللہ۔ان کے ساتھ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھول دوں گا کہ اللہ کی وحدانیت کا اعلان کریں گے) اسی لئے مروی ہے کہ حاملینِ عرش نے عرش کے حمل کی طاقت اپنے ورد (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) کے ساتھ کی ہے،صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا یہ(یعنی لاحول الخ) جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے،فرمایا:

(وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ) [الطلاق : ۳](اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا)اور:

(اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ) إلى قوله :(فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ)[آل عمران : ۱۷۳-۱۷۵] (ان سے لوگوں نے آ کر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے لئے جمع کیا ہے تو اُن سے ڈروتو اُن کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔تو اگر تم مومن ہوتو اُن سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا) بخاری میں ابن عباسؓ سے قولہ :(وَقَالُوْا حَسْبُنَا الخ) بارے مروی ہے کہ یہ کلمات حضرت ابراہیم خلیل نے کہے جب انہیں آگ میں ڈالا گیا اور حضرت محمد نے کہے جب لوگوں نے ان سے کہا:(اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ الخ)

(۲) دوسری قسم وہ جو حق تعالی کی ربوبیت اور اس کی طرف افتقار کے شاہد ہیں اور وہ اس کے ساتھ استعانت تو کرتے ہیں مگر اپنی اغراض اور مفاد پرستی پر،اس کے امر ونہی اور رضا وغضب اور محبت کی حقیقت کو مدِنظر رکھے بغیر، یہ کثیر درویشوں اور متصوفہ کا حال ہے اس لیے یہ کثیر اوقات ان احوال پرعمل کرتے ہیں جن کے ساتھ یہ وجودِتصرف کرتے ہیں اور اس کا قصد نہیں کرتے جو رب تعالی کو پسند اور محبوب ہے اور کثیر اوقات یہ غلط فہمی کا شکار بن جاتے اور ظن کرتے ہیں کہ اس کی معصیت اللہ کی مرضات ہے تو یہ امر ونہی کی تعطیل کی طرف عائد ہوتے اور اسے حقیقت کا نام دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قدری حقیقت کے ساتھ استرسال (یعنی اسے مدِنظر رکھنا) واجب ہے امری اور دینی حقیقت کی مراعات کئے بغیر جو ظاہراً اور باطناً رب کی مرضات،محبت اور اس کے امر ونہی پہ مشتمل ہے، یہ کثیر اوقات اپنے احوال کا سلب کرتے ہیں اور کبھی ایک نوعِ معاصی وفسوق میں پڑ جاتے ہیں بلکہ ان میں سے کثیر اسلام سے مرتد بن جاتے ہیں اس لیے کہ عاقبت تو تقوی (والوں) کے لیے ہی ہے اور جو شخص اللہ کے امر ونہی کے پاس وقوف نہ کرے وہ متقین میں سے نہیں تو یہ بعض اس میں جا واقع ہوتے ہیں جس میں مشرکین واقع ہوئے،کبھی بدعت میں جسے یہ شریعت خیال کرتے ہیں اور کبھی امری تقدیر کا سہارا لینے میں،اللہ تعالی نے سورۃ اَنعام اور سورہ اَعراف میں مشرکین کی ذم کے ضمن میں ذکر کیا کہ انہوں نے دین میں نت نئی چیزوں کا ابتداع کر دیا اور انہیں شریعت کا درجہ دے دیا ہے چنانچہ کہا:

(وَإِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ) [الأعراف: ۲۸] (اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور اللہ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے، کہہ دو اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا حکم نہیں دیتا) اس امر پر بھی ان کی ذم کی کہ اسے حرام کر دیا جسے اللہ نے حرام نہیں کیا اور اسے شریعت بنا لیا جسے اللہ نے شریعت نہیں بنایا، اس آیت میں ان کے تقدیر کا سہارا لینے کا ذکر کیا:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْ نَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ) [النحل: ۳۵] (اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم ہی اُس کے سوا کسی چیز کو پوجتے اور نہ ہمارے بڑے ہی اور نہ اُس کے بغیر ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) اس کی نظیر سورہ یٰس، النحل اور الزخرف میں بھی ذکر کی تو ان میں اس کی بھی شباہت بھی ہے اور اس کی بھی

(۳) تیسری قسم اور یہ جنہوں نے اللہ کی عبادت اور اس کے ساتھ استعانت سے اعراض کیا تو یہ ان مذکورین میں سے بدترین قسم ہیں

(۴) چوتھی قسم، یہ قابلِ تعریف لوگ ہیں اور یہ جنہوں نے (اِيَّاكَ نَعْبُدُ الخ) اور: (فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ) کو محقق کیا (یعنی ان کا مصداق بنے) تو اس کے ساتھ اس کی اطاعت پر استعانت کی اور اس امر کے شاہد بنے کہ وہ ان کا الٰہ ہے وہ جو جائز نہیں کہ سوائے اس کے کسی اور کی عبادت کی جائے اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کے ساتھ اور ان کا رب وہ ہے کہ:

(لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ) [الأنعام: ۵۱] (اُس کے سوا نہ تو اُن کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا) اور:

(مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ) [الفاطر: ۲] (اللہ جو اپنی رحمت کھول دے تو کوئی اس کو بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں)

(وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ) [يونس: ۱۰۷] (اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اُس کے سوا اس کا کوئی دُور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنی چاہے تو اُس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں)

(قُلْ اَفَرَءَ يْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ) [الزمر: ۳۸] (کہو بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دُور کر سکتے ہیں یا اگر مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟) اسی لیے علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ اسباب کی طرف التفات شرک فی التوحید ہے اور محوِ اسباب اس طور کہ وہ اسباب ہیں عقل میں نقص ہے اور کلیۃً اسباب سے اعراض شرع میں قدح ہے، مامور بہ توکل وہ ہے جس میں توحید، عقل اور شرع کے مقتضیات باہم مجتمع ہوں، تو

واضح ہوا کہ جس نے ظن کیا کہ توکل عام اہلِ طریق کے مقامات میں سے ہے اس نے شدید غلطی کی، چاہے اس کا شمار اعیان مشائخ میں ہوتا ہو جیسے مصنف (علل المقامات) اور یہ اجل مشائخ میں سے ہیں، انہی سے اس کا اخذ مولف (محاسن المجالس) نے کیا، اس کے قائل کی حجت کا ضعف ظاہر ہے کیونکہ اس کا ظن ہے کہ مطلوب بہ فقط عام لوگوں کا حظ ہے اور یہ ظن کہ تحصیلِ مقصود میں اس کا کوئی فائدہ نہیں اور یہی حال ان حضرات کا ہے جو دعا کو بھی اسی کی طرح باور کرتے ہیں اور یہ ان لوگوں کے بمنزلہ ہیں جنھوں نے مامور بہ اعمال کو بھی اسی طرح قرار دیا جیسے کوئی اپنے پر واجب اسباب جو کہ عبادت اور مامور بہ طاعت ہے، سے (اپنے تئیں) توکل کے ساتھ مشغول ہو جائے تو مامور بہ اسباب جو اس قولہ تعالی: (فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ) میں داخل ہیں، کے ترک میں اس کی غلطی اول کی مامور بہ توکل کے ترک میں غلطی کی مانند ہے جو کہ اس مذکورہ قولہ میں داخل ہے لیکن کہا جائے گا جس کا اللہ پر توکل اور اس سے اس کی دعا مباحات کے حصول میں ہے وہ عامۃ الناس میں سے ہے اور اگر مستحبات اور واجبات کے حصول میں ہے تو وہ خواص میں سے ہے! جیسے جس نے اللہ سے محرمات کے حصول کی دعا کی اور توکل کیا وہ ظالم لنفسہ ہے اور جس نے توکل سے اعراض کیا وہ اللہ اور اس کے رسول کا عاصی بلکہ ایمان کی حقیقت سے خارج ہے تو یہ کیسے خواص کا مقام ہوسکتا ہے؟ فرمایا:

(وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ)[يونس: ۸۴] (اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اگر فرمانبردار ہو تو اُسی پر بھروسا رکھو)

(اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ) [آل عمران : ۱۶۰] (اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے)

(وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ)[إبراهيم: ۱۱] (اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیئے)

(قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ) إلى قوله : (قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ)[الزمر: ۳۸] (کہو بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو ۔۔۔ کہہ دو کہ مجھے اللہ ہی کافی ہے بھروسہ رکھنے والے اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں) اللہ نے (حَسْبِيَ اللّٰهُ) کا کلمہ کبھی جلبِ منفعت اور کبھی دفعِ مضرت میں ذکر کیا ہے تو اول اس آیت میں:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ) [التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے رسول ہمیں دے دیں گے) الآیۃ اور دوم اس آیت میں:

(اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ الخ) (ابھی گزری) اور اس آیت میں:

(وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ)[الأنفال : ۶۲] (اور اگر

یہ چاہیں کہ تمہیں فریب دیں تو اللہ تمہیں کفایت کرے گا وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مسلمانوں سے تقویت بخشی) یہ رضاو توکل اس کے امر کو متضمن ہے اور رضا اور توکل تقدیر کو گھیر لیتے ہیں تو توکل اس کے وقوع سے قبل اور رضا اس کے وقوع کے بعد ہے، اسی لیے نبی اکرم نماز میں یہ دعا (بھی) پڑھا کرتے تھے:(اَللّٰھُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَیْبَ وَ بِقُدْرَتِكَ عَلَی الْخَلْقِ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاةُ خَیْراً لِیْ وَ تَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاةُ خَیْراً لِیْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ خَشْیَتَكَ فِی الْغَیْبِ وَ الشَّھَادَةِ وَ اَسْاَلُكَ کَلِمَةَ الْحَقِّ فِی الْغَضَبِ وَ الرِّضَا وَ اَسْاَلُكَ الْقَصْدَ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنیٰ وَ اَسْاَلُكَ نَعِیْماً لَا یَنْفَدُ وَ اَسْاَلُكَ قُرَّةَ عَیْنٍ لَا تَنْقَطِعُ اَللّٰھُمَّ اَسْاَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَ اَسْاَلُكَ بَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ اَسْاَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلیٰ وَجْھِكَ وَ اَسْاَلُكَ الشَّوْقَ اِلیٰ لِقَائِكَ مِنْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اَللّٰھُمَّ زَیِّنَّا بِزِیْنَةِ الْاِیْمَانِ وَ اجْعَلْنَا ھُدَاةً مُھْتَدِیْنَ) (اے اللہ تجھے تیرے علمِ غیب اور خلق پر تیری قدرت کا واسطہ مجھے تب تک زندہ رکھ جب تک میری حیات میں میرے لئے خیر ہو اور جب وفات میرے لئے بہتر ہو تو مجھے فوت کر لینا، اے اللہ میں غیب وحاضر میں تجھ سے تیری خشیت کا سوال کرتا ہوں اور رضا وغضب میں حق بات کہنے کا اور غریبی وامیری میں میانہ رو رہنے کا، اور ایسی نعمت کا جو کبھی ختم نہ ہو اور آنکھ کی ٹھنڈک کا جو منقطع نہ ہو، اے اللہ میں تقدیر پر رضا کا طالب ہوں اور موت کے بعد اچھی زندگی کا اور تیرے چہرے کے دیدار کی لذت کا اور تیری ملاقات کے شوق کا بغیر ضرر رساں تنگی کے اور گمراہ کن فتنہ کے اے اللہ ہمیں ایمان کے ساتھ مزین فرما اور ہمیں ہادی اور مہدی بنا) اسے احمد اور نسائی نے حضرت عمار بن یاسر سے روایت کیا، لیکن جو قبل از قضاء ہو وہ رضا پر عزم ہے نہ کہ حقیقتِ رضا، اسی لیے مشائخ کی ایک جماعت وقوع بلاء سے قبل عزم علی الرضا کے عامل تھے جب اس کا وقوع ہو جاتا ہے تو ان کے عزائم متزلزل ہو جاتے ہیں جیسے اس کا نحو صبر وغیرہ میں واقع ہوا جیسے کہا:

(وَلَقَدْ کُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ)[آل عمران : ۱۴۳] (اور تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے پس تم نے اُس کو آنکھوں سے دیکھ لیا) اور:

(یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ) [الصف : ۲-۴] (اے ایمان والو تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟۔ اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں پرے جما کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں) یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صحابہ کرام نے کہا اگر ہمیں پتہ لگ جائے کہ اللہ کو کون سے اعمال زیادہ پسند ہیں تو ہم وہ کریں تو اللہ نے جہاد کی آیت نازل کی تو بعض کو یہ ناگوار لگا اس لیے آدمی کو برا لگتا ہے کہ بلاء ومصیبت کے لیے متعرض ہو بایں طور کہ اپنے نفس پر وہ کچھ واجب کرے جو شارع نے واجب نہیں کیا

مثلاً کوئی عہد و پیمان اورنذر وغیرہ یا کسی عہدے کا طالب بنے یا مثلا ایسے علاقہ میں جہاں طاعون پھیلا ہوا ہے جائے، جیسا کہ صحیحین میں متعدد اسانید کے ساتھ مروی ہے کہ نبی اکرم نے نذر ماننے سے منع کیا اور کہا وہ خیر نہیں لاتی البتہ اس کے ساتھ بخیل سے کچھ مال نکالا جاتا ہے، صحیحین میں ہے کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن سمرہ سے کہا عہدے کی طلب نہ کرو (یعنی مانگ کر کوئی عہدہ نہ لو) اگر مانگ کر لیا تو تم اس کے سپرد کر دئے جاؤ گے اور اگر بن مانگے کوئی عہدہ مل جائے تو (اللہ کی طرف سے) تمہاری اس پر مدد کی جائے گی اور اگر کسی بات کی قسم اٹھاؤ پھر اسے توڑ دینے میں بہتری سمجھو تو توڑ دو اور قسم کا کفارہ دے دو

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ **اگر کسی علاقہ میں طاعون کی وبا پھوٹنے بارے سنو** تو ادھر کا رخ نہ کرو اور اگر کسی جگہ یہ وبا پھوٹ پڑے اور تم وہیں ہو تو اس سے فرار چاہتے ہوئے وہاں سے نہ نکلو، انہی دونوں کی نقل کردہ ایک روایت میں ہے دشمن سے مڈھ بھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگتے رہو لیکن اگر یہ نوبت آجائے تو صبر کرو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے، ان جیسی احادیث مقتضی ہیں کہ انسان کے لیے مناسب نہیں کہ ان امور کی سعی کرے جو اس پر کئی اشیاء کو واجب اور کئی کو حرام کر دیں پھر وہ پورا نہ اتر سکے جیسے کثیر لوگ کئی امور پر اللہ سے عہد و پیمان کرتے ہیں اور ان کی غالب اکثریت اس پر پورا نہیں اتر سکتی، انسان پر جب کوئی ابتلاء آئے تو اسے صبر او رحوصلہ سے کام لینا چاہیے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور دل چھوٹا نہ کرنا چاہئے تا کہ اس کا شمار صاحبِ ایقان اور فرائض و واجبات ادا کرنے والوں میں سے ہو اور اس سب میں صبر کی بہت ضرورت ہوتی ہے لہذا بالاتفاق ادائے واجبات اور ترکِ محذورات پر صبر کرنا (یعنی لگے رہنا) واجب ہے اس میں مصائب پر صبر کرنا بھی شامل ہے اور یہ کہ جزع فزع نہ کرے اسی طرح اللہ کے منع کردہ امور میں نفسانی خواہشات کی اتباع سے صبر، قرآن میں نوے سے زائد مقامات میں اللہ نے صبر کا ذکر کیا ہے، کئی آیات میں اسے نماز کے ساتھ مقرون کیا، مثلا:

(اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ)[البقرة : ۱۵۳] (صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

(وَاَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) [هود: ۱۱۴] (اور دن کے دونوں کناروں اور رات کی چند ساعات میں نماز پڑھا کرو کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں یہ ان کے لئے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں- اور صبر کئے رہو کہ اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

(فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا) [طٰه: ۱۳۰] (پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کرو)

(فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ) [الغافر: ۵۵] (پس صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرو) الآیۃ، امامت فی الدین کو صبر ویقین سے موروث (یعنی اس کا نتیجہ) قرار دیا جب کہا:

(وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ) [الم السجدۃ: ۲۴] (اور اُن میں سے ہم نے پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے جب وہ صبر کرتے تھے اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے) تو دین سب کا سب حق بارے علم اور اس پر عمل ہے اور عمل کے ضمن میں صبر ضروری ہے بلکہ طلبِ علم بھی صبر کا محتاج ہے جیسے حضرت معاذ بن جبل نے کہا تھا کہ اللہ کے لئے طلبِ علم عبادت ہے اور اس کی معرفت خشیت اور اس کی سعی وجستجو جہاد ہے اور اوروں کو اس کی تعلیم صدقہ ہے اور اس کا مذاکرہ تسبیح ہے، اسی سے اللہ معرفت اور اس کی عبادت ہوگی اور اسی کا نام توحید ہے، اللہ علم کے ساتھ اہلِ علم کا درجہ بلند کرتا ہے اور انہیں لوگوں کا مقتدا اور ائمہِ ہدایت بنا دیتا ہے! تو علم کی طلب اور تلاش کو جہاد قرار دیا اور جہاد میں صبر لازم امر ہے اسی لیے کہا:

(وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ) [والعصر: ۱۔۳] (عصر کی قسم۔ کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے)

(وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِی الْاَيْدِیْ وَالْاَبْصَارِ) [ص: ۴۵] (اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے) علمِ نافع ہی اصل ہدایت ہے جبکہ عمل بالحق رشاد ہے، اول کی ضد ضلال اور ثانی کی ضد غیّ ہے تو ضلال بغیر علم عمل کرنا اور غیّ اتباعِ ہویٰ ہے، فرمایا:

(وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی) [والنجم: ۱۔۲] (تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارا ساتھی نہ راستہ بھولا اور نہ بھٹکا ہے) تو ہدایت کا حصول ونیل نہیں ہوتا مگر علم کے ساتھ اور رشاد کا نیل نہیں ہوتا مگر صبر کے ساتھ، اسی لیے حضرت علی نے کہا: آگاہ رہو کہ صبر کا ایمان میں وہ رتبہ ہے جو جسم میں سر کا ہے، اگر سر کاٹ دیں تو جسم بے کار رہے پھر آواز بلند کی اور کہا خبردار اس کا کوئی ایمان نہیں جس کے پاس صبر کا مادہ نہیں، جہاں تک رضا تو احمد کے اصحاب وغیرہم سے علماء ومشائخ نے رضا بالقضاء بارے تنازع کیا کہ آیا یہ واجب ہے یا مستحب؟ دو قول ہیں، اول پر یہ مقتصدین اور ثانی پر مقربین کے اعمال سے ہے! عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ رضا عزیز ہے لیکن صبر مومن کا سہارا ہے، مروی ہے کہ نبی اکرم نے ابن عباس سے کہا تھا: اگر کر سکو کہ اللہ کے لئے رضا مع الیقین کے عامل بنو تو ضرور ایسا کرو، اگر اس کی استطاعت نہ پاؤ تو (جان لو کہ) ناپسندیدہ باتوں پر صبر کا مظاہرہ کرنے میں خیرِ کثیر ہے، اسی لیے قرآن میں وارد نہیں مگر اہلِ رضا کی مدح نہ کہ اس کا ایجاب اور یہ رب کے اپنے بندے کے ساتھ صادر افعال ومصائب مثلاً مرض، فقر اور زلزال میں رضا بالقضاء کا مظاہرہ کرنا جیسے کہا:

(وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ) [البقرة : ۱۷۷] (اور سختی اور تکلیف میں اور کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی ہیں جو ڈرنے والے ہیں)

(اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا) [البقرة : ۲۱۴] (کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی مشکلیں تو پیش آئی ہی نہیں اُن کو سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ ہلا دیئے گئے) تو باساء اموال، ضراء ابدان اور زلزال قلوب میں، جہاں تک اللہ کے اوامر پر رضا تو اس کی اصل واجب ہے اور یہ ایمان سے ہے جیسا کہ نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث میں کہا: اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمدؐ کے نبی ہونے پر راضی ہوا اور یہ محبت کے توابع میں سے ہے جیسا کہ آگے ذکر کریں گے، فرمایا:

(فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)[النساء : ۶۵] (تمہارے رب کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اُس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اُس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے)

(وَلَوْاَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا الخ) (کچھ قبل گزری)

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ) [محمد : ۲۸] (یہ اس لئے کہ جس چیز سے اللہ ناخوش ہے یہ اس کے پیچھے چلے اور اس کی خوشنودی کو اچھا نہ سمجھے تو اس نے بھی ان کے اعمال کو برباد کر دیا)

(وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ) [التوبة : ۵۴] (اور ان کے خرچ کے قبول ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ انہوں نے اللہ سے اور اس کے رسول سے کفر کیا اور نماز کو آتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اور خرچ کرتے ہیں تو ناخوشی سے) اول نوع سے جو احمد اور ترمذی وغیرہما نے حضرت سعد کے حوالے سے نبی اکرم سے نقل کیا کہ فرمایا ابن آدم کی سعادت سے ہے کہ وہ اللہ سے استخارہ کرے اور اپنی قسمت پر راضی رہے اور اس کی شقاوت سے ترکِ استخارہ اور قسمت پر ناخوش رہنا ہے! جہاں تک کفر و فسق اور عصیان جیسی منہیات پر رضا، تو اکثر علماء قائل ہیں کہ ان کے ساتھ رضا مشروع نہیں جیسے ان سے محبت بھی مشروع نہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر راضی نہیں اور نہ وہ ان سے محبت کرتا ہے اگر چہ انہیں مقدر اور مقضِیّ کیا ہے جیسے کہا:

(وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ)[البقرة : ۲۰۵] (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا)

(وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ) [الزمر : ۷] (اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا)

(وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ) [النساء : ۱۰۸] (جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا تو ان کے ساتھ ہوتا ہے) بلکہ وہ ان پر ناراض ہے جیسے کہا: (ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ الخ) ایک گروہ قائل ہے کہ ان پر رضا اس جہت سے ہے کہ یہ خلق کی رو سے اللہ کی طرف مضاف ہیں جبکہ یہ ناپسندیدہ اس جہت سے ہیں کہ فعلاً اور کسباً یہ بندوں کی طرف مضاف ہیں، یہ سابق الذکر قول کے منافی نہیں بلکہ دونوں ایک ہی اصل کی طرف عائد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کے تحت ہی اشیاء کو مقدر کیا ہے تو یہ اس حکمت کے اعتبار سے محبوب اور مرضیّ ہیں، کبھی یہ فی نفسہا مکروہ و مسخوط ہوتی ہیں کیونکہ ایک شئ میں دو وصف جمع ہو سکتے ہیں کہ ایک کی رو سے وہ محبوب اور دوسرے کی رو سے نامحبوب ہو! جیسے ایک صحیح حدیث (قدسی) میں ہے کہ میں کسی شئ بارے اس قدر متردد نہیں ہوا جسے میں کروں جتنا اپنے بندۂ مومن کے نفس کو قبض کرنے کے بارے میں ہوتا ہوں، اسے موت ناگوار لگتی ہے جبکہ مجھے اس کی یہ ناگواری بری لگتی ہے اور اس سے چارہ بھی نہیں! لیکن جو اس رضا بالقضاء کا قائل ہوا جو اللہ کا وصف اور اس کا فعل ہے نہ کہ مقضیّ پر رضا جو کہ اس کا مفعول ہے تو یہ اس کی طرف سے مقصود کلام سے خروج ہے تو بات اس رضا بارے نہیں ہو رہی جو رب تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اس کی صفات اور افعال سے! موضوعِ بحث دراصل اس کے مفعولات کے ساتھ رضا ہے، اس سے متعلقہ کلام ہم نے ایک جگہ ذکر کی ہے

رضا اگرچہ قلوب کے اعمال میں سے ہے تو اس کا کمال حمد ہے حتیٰ کہ بعض حضرات نے حمد کو رضا کے ساتھ ہی مفسر کیا ہے اسی لیے کتاب وسنت میں ہر حال پر اللہ کی حمد وارد ہے اور یہ اس کی قضاء کے ساتھ رضا کو متضمن ہے، حدیث میں ہے جنت میں داخل ہونے کی اولین دعوت ان حمادین کو دی جائے گی جو سراء اور ضراء (یعنی تنگی ترشی) میں اللہ کی حمد کرتے ہیں، مروی ہے کہ جب آنجناب کو کوئی خوشی ملتی تو فرماتے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ) (اللہ کی حمد کہ جس کے فضل و کرم سے ہی اچھے کام کرنا ممکن ہوتا ہے) اور جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو کہتے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ) (ہر حال پر اللہ کی حمد ہے) مسند احمد میں حضرت ابوموسی اشعری سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا: ب کسی کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے تم نے میرے بندے کا بچہ قبض کر لیا؟ کہتے ہیں جی ہاں، فرماتا ہے تم نے اس کے دل کا ثمرہ (جگر کا ٹکڑا) قبض کر لیا؟ کہتے ہیں جی ہاں، فرماتا ہے اس پر میرے بندے نے کیا کہا تھا؟ عرض کرتے ہیں اے اللہ تیری حمد کی اور انا للہ پڑھا تو اللہ کہتا ہے میرے بندے کے لیے جنت میں ایک محل بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو! ہمارے نبی اکرم (صَاحِبُ لِوَاءِ الْحَمْد) ہیں (حمد کے علم والے) اور آپ کی امت کا لقب حمادین ہیں جو سراء وضراء میں اللہ کی حمد کرتے ہیں، ضراء پر حمد کے دو مشہور موجب ہیں: اول، بندے کا یہ جاننا کہ اللہ اس کا حقدار اور لنفسہ اس کا مستحق ہے کہ اس نے کی عمدہ خلقت کی اور اچھے سانچے میں ڈھالا اور وہ علیم، حکیم اور خبیر و رحیم ہے، دوم، اس کا یہ جاننا کہ اللہ کا اپنے بندۂ مومن کے لیے (کسی امر کو) پسند کرنا خود اس کے پسند کرنے سے بہتر

ہے! جیسے مسلم وغیرہ نے روایت نقل کی ہے کہ اللہ کی بندہِ مومن کے لیے ہر قضاء میں اس کے لیے خیر ہے اور یہ سوائے مومن کے کسی کے لیے نہیں، اگر اسے خوشی ملے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور اگر اسے ضراء ملے تو صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے، جو ابتلاء پر صبر اور سراء پر شکر کرتا ہے، فرمایا:

(اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ) [سبأ : ۱۹] (اس میں ہر صابر وشاکر کے لئے نشانیاں ہیں) قرآن کے چار مقامات میں ان دونوں صفتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن جو بلاء پر صبر اور رخاء (یعنی خوشحالی) پر شکر نہیں کرتا تو لازم نہیں کہ قضاء اس کے لیے خیر ثابت ہو، اسی لیے اسے جس نے مومن کے لیے مقضی (یعنی مقدر) معاصی پر اس کا ایراد کیا، دو جواب دئے گئے ہیں:

ا۔ایک کہ یہ اسے متناول ہے جو بندے کو (قدرتی طور سے) پہنچے نہ کہ جو وہ خود کرے جیسے اس آیت میں کہا:

(مَآ اَصَابَكَ مِن حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ) [النساء : ۷۹] (تمہیں جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے) یعنی جو خوشی اسے ملے (وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ) [النساء : ۷۹] (اور جو نقصان پہنچے وہ تمہارے نفس سے ہے) یعنی دکھ اور جیسے یہ آیت:

(وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ)[الأعراف: ۱۶۸] (اور ہم آسائشوں اور تکلیفوں سے ان کی آزمائش کرتے رہے تاکہ پلٹ آئیں) یعنی سراء اور ضراء کے ساتھ اور کہا:

(وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ) [الأنبياء: ۳۵] (اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں)

(اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا) [آل عمران : ۱۲۰] (اگر تمہیں آسودگی حاصل ہو تو اُن کو بُری لگتی ہے اور اگر رنج پہنچے تو خوش ہوتے ہیں) تو حسنات اور سیآت سے یہاں مراد مسار اور مضار ہیں، پھر طاعات اور معاصی ان کے ساتھ مراد لیے جاتے ہیں

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ صبور وشکور مومن کے حق میں ہے اور گناہوں سے ایمان میں نقص در آتا ہے تو بندہ جب توبہ کرے تو اللہ اسے پسند کرتا ہے، کبھی توبہ کے ساتھ اس کا درجہ مرتفع ہوتا ہے، بعض سلف کا قول ہے کہ توبہ کے بعد حضرت داود غلطی سے قبل کے داود سے بہتر تھے تو جس کے لیے تو بہ مقضی ہوئی وہ ایسے جیسے سعید بن جبیر نے کہا بندہ کئی دفعہ نیکی کرتا ہے مگر اس کی وجہ سے آگ میں داخل ہوتا ہے اور برائی کرتا ہے مگر اس کی وجہ سے جنت کا حقدار بن جاتا ہے، اس کی صورت یہ بنے گی کہ نیکی کی مگر اس پر اترایا اور خود پسندی کا شکار ہوا، دوسری طرف برائی کی مگر ہر لحظہ اس کا خیال رہا اور توبہ واستغفار میں لگ گیا، صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا: (اَلْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ) (اعمال کا مدار خاتمہ پر ہے) **مومن جب کوئی بدی کرے تو اس کی سزا اس سے درجِ ذیل دس اسباب سے دور ہوسکتی ہے:**

۱۔ توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں

۲۔ استغفار کرے تو اسے مغفرت مل جائے

۳۔ ایسی نیکیاں کرے جو اس بدی کا محو کر دیں کیونکہ (جیسا کہ قرآن میں کہا) حسنات سیآت کو ختم کر ڈالتی ہیں

۴۔ اس کے مومن بھائی اس کے لیے دعا کریں اور اس کی زندگی میں اور بعد از وفات اس کے لیے استغفار کریں

۵۔ یا اس کے لیے اپنے اعمال کا ثواب اہداء کریں (یعنی ایصالِ ثواب) وہ جن کے ساتھ اللہ اسے نفع دے

۶۔ اسے نبی اکرم کی شفاعت نصیب ہو جائے

۷۔ اللہ اسے دنیا میں ایسے مصائب سے مبتلا کرے جو اس کی سیآت کا کفارہ بن جائیں

۸۔ یا برزخ میں صعقہ (یعنی مکمل بے ہوشی کہ روزِ قیامت ہی آنکھ کھلے) کے ساتھ مبتلا کرے تو یہ اس کی سیآت کا کفارہ ہو جائے

۹۔ یا عرصاتِ محشر میں اس کی ابتلاء کرے اس کے ان اہوال کے ساتھ جو سیآت کا کفارہ بن جائیں

۱۰۔ یا اس پر اپنا رحم کر دے

تو جسے ان دس میں سے کچھ بھی نصیب نہ ہوا وہ نہ ملامت کرے مگر اپنے آپ کو جیسے ایک حدیث قدسی میں ہے ''اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جن کا میں حساب رکھ رہا ہوں پھر تمہیں ان کا پورا بدلہ (جزا و سزا) دوں گا تو جو خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو اس کا غیر پائے وہ سوائے اپنے نفس کے کسی کو ملامت نہ کرے، تو جب مومن جانتا ہے کہ قضاء اس کے لیے خیر ہے اگر وہ صبار و شکور بنے یا اس نے اللہ سے استخارہ کیا تھا اور جانتا تھا کہ اس میں انسان کے لیے بہتری ہوتی ہے تو گویا وہ اس پر راضی ہوا ہے جو اس کے لیے خیر ہے، حضرت علی کا ایک قول ہے کہ اللہ اپنے فیصلے مقدر کرتا ہے تو جو راضی ہوا اس کے لیے (اللہ کی) رضا اور جو ناراض ہوا اس کے لیے اللہ کی ناراضی ہے تو اس میں رضا اور استخارہ (یعنی خیر کی طلب) ہے، رضا بعد از قضاء اور استخارہ قبل از قضاء ہوتا ہے اور یہ ضراء اور صبر سے اکمل ہے اسی لیے اُس میں رضا کا اور اس میں صبر کا ذکر کیا پھر جب قضاء مع الصبر اس کے لیے خیر ہے تو قضاء مع الرضا کیوں نہ ہوگی؟ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ (حقیقی) مصیبت زدہ وہ ہے جو ثواب سے محروم کیا گیا، مسندِ شافعی میں نقل کردہ ایک اثر میں ہے کہ جب نبی اکرم کی وفات ہوئی تو ایک قائل کو سنا گیا جو کہہ رہا تھا: اے آلِ بیتِ نبوی! بے شک اللہ میں ہر مصیبت سے عزاء (یعنی تسلی اور پرسہ) اور ہر فوت ہونے والے سے خلف (یعنی بدل) ہے، پس اللہ پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید باندھو کہ مصاب وہ ہے جو ثواب سے محروم رہا

اسی لیے کبھی رضا کے منافی حزن کا حکم نہیں دیا گیا حالانکہ اس میں کوئی فائدہ نہیں تو کبھی اس میں مضرت ہو سکتی ہے لیکن یہ قابلِ نظر اندازی ہے، اگر اس کے ساتھ وہ کچھ مقترن نہیں جو اللہ کو ناپسند ہے البتہ میت پر بطورِ شفقت و ترحُّم رونا حسن اور مستحب ہے،

یہ رضا کے منافی نہیں بخلاف اس پر اس وجہ سے رونا کہ اس کا اس سے حظ و فائدہ اب فائت ہوا، اسی سے آپ کے اس قول کا جب آپ (اپنے بیٹے حضرت) ابراہیم کی وفات پر روئے، معنی معلوم ہوا کہ یہ (آنسو) تو رحمت ہیں جسے اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں کرتا ہے اور اللہ اپنے انہی بندوں پر رحم کرے گا جو رُحماء (یعنی ترس اور رحم کھانے والے) ہیں تو یہ رونا اس کے رونے کی طرح نہیں جو اس وجہ سے رو رہا ہے کہ اب اسے مرحوم کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اس سے اسے جو کچھ مل رہا تھا وہ اب منقطع ہوا، فضیل بن عیاض کا ایک بیٹا فوت ہوا تو وہ ہنس دئے اور کہنے لگے میں نے دیکھا کہ یہ اللہ کی قضاء ہے تو چاہا کہ اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کروں لیکن بہر حال رضا بالقضاء اور اللہ کی حمد کرنے کے ساتھ ساتھ میت پر از روئے رحمت رونا جیسے نبی اکرم کا حال ہوا، اکمل ہے جیسے کہا:

(ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ) [البلد: ۱۷] (پھر ان لوگوں میں بھی ہوا جو ایمان لائے اور صبر کی نصیحت کی اور شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے) تو اللہ تعالی نے صبر اور رحمت کی تواصی کا ذکر کیا ہے، لوگ چار اقسام ہیں: بعض میں قسوت (یعنی درشت مزاجی) کے ساتھ صبر ہوتا ہے، بعض میں جزع (یعنی اضطرابی کیفیت) کے ساتھ ترس اور نرم دلی اور بعض میں قسوت اور جزع کا امتزاج اور ان سب سے محمود وہ مومن جو مصیبت پر صبر کرے اور لوگوں پر ترس کھائے، اس باب کے مصنفین میں سے ایک گروہ نے ظن کیا ہے کہ راضی باللہ ہونا اس کی محبت کے توابع میں سے ہے اور یہ دراصل ماخذِ اول پر متوجہ ہوتا ہے اور یہ رضا اس کے بنفسہ اس کا استخارہ رکھنے کی رو سے بندے کے اپنے حظ سے محروم ہونے سے قطع نظر بخلاف ماخذِ ثانی کے اور وہ یہ اس کے اس جاننے کی رو سے کہ مقضی اس کے لیے خیر ہے پھر محبت اس سے جبکہ رضا اس کی قضاء سے متعلق ہے لیکن اس مصنف نے جو کہا اس کی تقریر میں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ سے محبت کی دو انواع ہیں: ایک، اس کی ذات سے محبت اور دوم، اس کے احسانات کی وجہ سے اس سے محبت

اسی طرح **حمد کی بھی دو انواع ہیں**: ایک، اس کی حمد اس پر جس کا وہ بذاتِ خود مستحق ہے اور دوم، بندے پر اس کے احسانات پر اس کی حمد تو رضا کی دو انواع محبت کی دو انواع کی مانند ہیں، جہاں تک اس پر اور اس کے دین اور اس کے رسول پر رضا تو یہ محبت کے حظ سے ہے اسی لئے آپ نے ایمان کا ذائقہ چکھ لینے کا ذکر کیا جیسے محبت میں ایمان کی حلاوت کے وجود کا ذکر کیا ہے اور یہ دونوں صحیح حدیثیں اس میں اصل ہیں جو وجد اور شرعی وایمانی ذوق کے ضمن میں ذکر ہوا، نہ کہ بدعی وضلالی، تو صحیح مسلم میں مروی ہے کہ آپ نے کہا جو اللہ کے رب ہونے، محمد کے رسول الخ (ابھی گزری) صحیحین کی ایک روایت میں ہے: تین چیزیں ہیں جس میں وہ ہوں گی اس نے ایمان کی حلاوت پالی کہ اللہ اور اس کا رسول اسے تمام ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، اللہ والوں سے محبت کرتا ہو اور کفر میں واپس جانا اس طرح برا جانے بعد اس کے کہ اللہ نے اسے اس سے نجات دی جیسے آگ میں پھینکے جانے کو برا سمجھتا ہے، محبت کے بارے میں عرض ہے کہ:

فصل

اللہ اور رسول سے محبت اعظم ایمانی واجبات اور ایمان کے بڑے اور جلیل القدر قواعد میں سے ہے بلکہ یہ دین وایمان کے اعمال میں سے ہر عمل کی اصل اور اساس ہے جیسے اس کی تصدیق کرنا اقوالِ ایمان ودین میں سے ہر قول کی اصل ہے، عالمِ وجود میں ہر حرکت کا مصدر محبت ہے، یا تو محمود محبت اور یا مذموم محبت! جیسا کہ ہم نے قاعدہِ محبت میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو کبار قواعد میں سے ہے، تو تمام دینی اور ایمانی اعمال کا مصدر محمود محبت ہے اور اس محمود محبت کی اصل اللہ تعالی سے محبت ہے کہ مذموم محبت سے صادر عمل اللہ کے ہاں صالح عمل شمار نہیں ہوتا، تمام دینی وایمانی اعمال کا مصدر اللہ کی محبت ہے، اللہ تعالی وہی عمل قبول کرتا ہے جس کے ساتھ اس کی رضا کا قصد کیا گیا ہو جیسا کہ صحیح میں ہے کہ فرمایا اللہ تعالی کہتا ہے میں شرک سے اغنی الشرکاء ہوں تو جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے غیر کو شریک کیا تو میں اس سے بری ہوں اور وہ سارے کا سارا اسی شریک کے لیے ہے، صحیح کی ایک حدیث میں ان تین قسم کے بندوں کا ذکر ہے جن پر سب سے پہلے آگ بڑھکائی جائے گی اور یہ ریا کار قاری، ریا کار مجاہد اور ریا کار صدقہ کرنے والا، اللہ کے لیے اخلاصِ دین ہی وہ دین ہے کہ جس کے سوا اللہ کوئی دین قبول نہیں اور اسی کے ساتھ اس نے اولین وآخرین رسل کو مبعوث کیا اور کتب نازل کیں اور اسی پر ائمہِ اہلِ ایمان متفق ہیں اور یہی دعوتِ نبوی کا خلاصہ ہے اور یہ قرآن کا وہ قطب ہے جس پر اس کی چکی گھوم رہی ہے، فرمایا:

(تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ) [الزمر: ۱] (اس کتاب کا اتارا جانا اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے) اس سورۃ کی اکثر آیات کا یہی مضمون ہے جیسے کہا:

(قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ) [۱۱] (کہہ دو کہ مجھ سے ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کو خالص کر کے اس کی بندگی کروں) إلی قوله: (قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ) [۱۴] (کہہ دو کہ میں اپنے دین کو خالص کر کے اللہ کی عبادت کرتا ہوں)

(اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ) [۳۶] (کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں؟ اور یہ تم کو ان لوگوں سے جو اس کے سوا ہیں ڈراتے ہیں)

(قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ) الآية [۳۸] (کہو بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دُور کر سکتے ہیں یا اگر مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟)

(اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَعْقِلُوْنَ)[۴۳] (کیا انہوں نے اللہ کے سوا اور سفارشی بنا لئے ہیں؟ کہو کہ خواہ وہ کسی چیز کا بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ سمجھتے ہی ہوں) إلی قوله: (وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ

اشْـمَـأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ) [۴۵] (اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب ان کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں)

(قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّىْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ) [۶۴] (کہہ دو کہ اے نادانو! تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی پرستش کرنے لگوں؟)

(بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ) [۶۶] (بلکہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور شکر گزاروں میں رہو) قصہ آدم وابلیس میں ایک جگہ شیطان کا یہ قول ذکر کیا:

(فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ)[ص: ۸۲] (کہ مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا) تو اللہ نے جواب دیا:

(اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ)[الحجر: ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں ہاں بُری راہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑے) اور کہا:

(اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ) [النحل : ۹۹۔ ۱۰۰] (کہ جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں اُن پر اُس کا کچھ زور نہیں چلتا ۔اس کا زور اُنہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں اور اس کے سبب شریک مقرر کرتے ہیں) تو واضح کیا کہ شیطان کا داؤ انہی پر چلتا ہے جو غیر مخلص ہیں اسی لئے حضرت یوسفؑ کے قصہ میں کہا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[یوسف ۲۴] (یوں تا کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے) شیطان کے اتباع اصحابِ نار ہیں جیسے کہا:

(لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [ص : ۸۵] (میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا) ایک جگہ کہا:

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ) [النساء : ۴۸] (اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے) یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو توبہ کئے بغیر مر گئے اسی لیے شرک کی تخصیص کی جبکہ اس کے ماسوا کو اپنی مشیت کے ساتھ مقید کیا تو خبر دی کہ وہ غیر تائب کے لیے شرک کا گناہ تو قطعاً معاف نہ کرے گا جبکہ شرک سے دیگر گناہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو نہ کرے! جہاں تک اس کا یہ فرمان:

(قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا) [الزمر:

۵۳] (کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے) تو یہ تائبین کے حق میں ہے اسی لیے تعمیم اور اطلاق کیا، آیت کے سیاق اور شانِ نزول سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے، اللہ نے کئی مقامات میں ارشاد کیا ہے کہ اولین وآخرین اسی کے مامور تھے جیسا کہ اس سورۃ میں کہا جسے حضرت ابی (بن کعب) پر قراءت کرنے کا حکم دیا تھا اور یہ بطورِ خاص ان تک اس سورۃ کا ابلاغ اور انہیں اس کا اسماع تھا تو فرمایا:

(وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ) [البينة : ۴-۵] (اور اہلِ کتاب جوفرقہ بندی میں نہ پڑے مگر واضح دلیل کے آ جانے کے بعد۔اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر) اور یہی کلمہ (لا الہ الا اللہ) کی حقیقت ہے، اسی کے ساتھ تمام رسل مبعوث ہوئے، فرمایا:

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ) [الأنبياء: ۲۵] (اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو)

(وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ) [الزخرف : ۴۵] (اور جو اپنے رسل ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کرلو کیا ہم نے الرحمٰن کے سوا اَور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے؟)

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل : ۳۶] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو) تمام رسل نے اپنی دعوت وتبلیغ کا آغاز اسی اصل سے کیا جیسے حضرت نوح نے کہا:

(اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ) [الأعراف: ۶۵] (اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) اسی طرح حضرات ہود، صالح اور شعیب اور دیگر سب انبیاء، ہر ایک نے یہی کہا اور بالخصوص افضل الرسل دو حضرات انبیاء جنہیں اللہ تعالی نے مقامِ خلت پر فائز کیا، ایک حضرت ابراہیمؑ اور دوم ہمارے نبی حضرت محمدؐ، تو یہ وہ اصل ہے جس کی اللہ نے ان کے ہاتھوں تبیین کی، اس میں ان کی تائید کی اور ان کے ذریعہ اس کا نشر کیا تو ابراہیم وہ امام ہیں جن کے بارے میں کہا:

(اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا)[البقرة : ۱۲۴] (میں تمہیں لوگوں کا امام بناؤں گا) اور ان کی ذریت میں نبوت، کتاب اور رسل کیے تو اہلِ نبوت رسالت ان کی آل سے ہیں جن پر اللہ نے برکت کی، فرمایا:

(وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ) [الزخرف : ۲۶-۲۸] اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن

چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں ۔ ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا - اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تاکہ وہ رجوع کریں) تو یہ کلمہ اللہ کے لیے کلمہِ اخلاص ہے اور یہ ماسوائے اس کے ہر معبود سے اظہارِ براءت ہے جیسے صاحبِ یٰس کا قول نقل کیا:

(وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ)[یٰس : ۲۲۔۲۳] (اور مجھے کیا ہے کہ میں اس کی پرستش نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔کیا میں ان کو چھوڑ کر اَوروں کو معبود بناؤں اگراللہ میرے حق میں نقصان کرنا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے) حضرت ابراہیم کے قصہ میں ستاروں کی پوجا کرنے والوں کی گمراہی کا بیان کرنے کے بعد ان کا اعلانِ توحید ذکر کرتے ہوئے کہا:

(فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)إلی قوله : (وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا)[الأنعام : ۷۸۔۸۱] (پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے کہ لوگو! جن چیزوں کو تم (اللہ کا) شریک بناتے ہو میں اُن سے بیزار ہوں۔ میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔۔۔ بھلا میں اُن چیزوں سے جن کو تم شریک بناتے ہو کیونکر ڈروں جب کہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہو جس کی اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی) انہوں نے یہ بھی کہا تھا:

(اَ فَرَءَ یْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ)[الشعراء : ۷۵۔۷۸] (تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو؟۔تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی۔وہ میرے دشمن ہیں لیکن اللہ رب العالمین۔جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے ہدایت دیتا ہے) اور کہا:

(قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ)الآیۃ، [الممتحنة : ۴] (تمہارے لئے ابراہیم اوران کے رفقاء میں اسوہ حسنہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اوران سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں) ہمارے نبی وہ ہیں جن کے ساتھ اللہ نے اپنے دینِ خالص دینِ توحید کی اقامت کی اور اہلِ شرک کا قلع قمع کیا جو فی الاصل مشرک تھے اوران کا بھی جو اہلِ کتاب میں سے کافر تھے،مسند احمد وغیرہ میں مروی ایک حدیث میں ہے مجھے قیامت سے آگے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے تاکہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جائے اور میرا رزق میرے نیزے کی چھاؤں میں ہے اور میرے امر کی مخالفت کرنے والوں کی

قسمت میں ذلت وصغار لکھ دیا گیا ہے اور جس نے کسی قوم کی مشابہت کی وہ انہی میں سے ہوا، قبل ازیں توحید کو متضمن آیات کا ذکر ہوا (بعض کا آگے بھی ذکر کیا پھر لکھا) فی الجملہ یہ سورتیں: الانعام، الاعراف، النور، آلِ طسم، آلِ حم، آلِ المر اور مفصل سورتیں اور دیگر مکی سورتیں اور اس طرح مدنی سورتوں میں بھی کثیر مواضع پر اس اصلِ دین اور قاعدہِ دین کا واضح بیان ہوا حتی کہ اخلاص کی دونوں سورتوں میں، جو (قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ) اور: (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد) ہیں، نبی اکرم تطوع (یعنی غیر فرض) نماز مثلاً طواف کی دو رکعتوں، فجر کی سنتوں اور مغرب کی سنتوں میں، عموماً انہی دونوں سورتوں کی قراءت فرمایا کرتے تھے، یہ توحید کو متضمن ہیں، جہاں تک (قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ) تو یہ عملی ارادی توحید کو متضمن ہے اور یہ قصد وارادہ کے ساتھ اللہ کے لئے اخلاص دین، عموماً مشائخِ تصوف اس کے ساتھ تکلم کرتے ہیں، اور جہاں تک سورۃ الاخلاص تو یہ قولی عملی توحید کو متضمن ہے جیسے صحیحین میں حضرت عائشہ سے ثابت ہے کہ ایک صحابی اپنی (ہر رکعتِ) نماز میں (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد) پڑھا کرتے تھے (یعنی کسی اور سورۃ یا آیات کی قراءت کے ساتھ ساتھ اسے بھی پڑھنا معمول بنالیا تھا) آپ نے کہا اس سے پوچھو ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا اس لیے کہ یہ رحمٰن کی صفت ہے اور مجھے پسند ہے کہ اس کی قراءت کروں، فرمایا اسے خبر دو کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے، یہ سورۃ اللہ کے اس وصف کو متضمن ہے جو اہلِ تعطیل اور اہلِ تمثیل کے قول کی نفی کرتا ہے اور اسی کی رو سے مسائلِ ذات میں یہ معتمد علیہ اصل کی حیثیت اختیار کرگئی ہے جیسا کہ ایک جگہ اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ائمہ کے اس پر اعتماد کا ذکر کیا مع اس کے جو (الاحد الصمد) کی تفسیر میں جسے یہ متضمن ہے جیسا کہ نبی اکرم اور صحابہ وتابعین سے اس کی تفسیر منقول ہے اور جو اس پر ادلہ کی دلالت ہے

لیکن یہاں مقصود عملی توحید ہے اور یہ اللہ کے لیے اخلاصِ دین اگرچہ یہ دونوں انواع باہم مرتبط ہیں تو جہمیہ اہلِ تعطیل اور مشبہہ اور اہلِ تمثیل میں سے کوئی نہیں مگر اس میں عملی شرک کی ایک نوع پائی جاتی ہے کیونکہ اس بارے ان کے قول کی اصل اللہ اور اس کی خلق کے درمیان شرک وتسویہ ہے، یا اس کے اور معدومات کے مابین جیسے معطلہ اس کے اور معدومات کے درمیان ان سلبی صفات میں تسویہ کرتے ہیں جو نہ مدح کو اور نہ ثبوتِ کمال کو مستلزم ہیں یا اس کے اور ناقص موجودات کے مابین صفاتِ نقص میں تسویہ کرتے ہیں اور جیسا کہ تسویہ کرتے ہیں جب یہ اور ممثلہ میں سے ان کی مضاہات کرنے والے اثبات کریں اس کے اور مخلوقات کے درمیان ان کے حقائق میں حتی کہ کبھی انہیں معبود کے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں تو یوں اپنے رب کے برابر ٹھہراتے اور اس کے لیے اَنداد بناتے ہیں اور مخلوقات کو رب العالمین کی برابری کی سطح پر بنالینے کے مرتکب ٹھہرتے ہیں، یہود بھی کثیر اوقات خالق کو مخلوق کے برابر کرتے تھے اور تمثیل کے مرتکب ٹھہرتے تھے حتی کہ اللہ کو عجز، فقر، بخل اور ان کے نحو نقائص کے ساتھ موصوف کیا جن سے اللہ کی تنزیہہ واجب ہے اور جو کہ اس کی خلق کی صفات ہیں، اسی طرح کا کام نصاریٰ نے بھی کیا جنہوں نے مخلوقات میں نعوتِ ربوبیت اور صفاتِ الوہیت کردیں اور ان کے لیے وہ کچھ مجوّز کیا جو صرف خالق تعالیٰ کا استحقاق ہے

اسی سے اللہ نے ہمیں حکم دیا کہ (نماز کی ہر رکعت میں) اس سے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کی دعا کریں، ان کا راستہ جن پر اس نے انعام کیا نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین میں سے نہ کہ جن پر اس کا غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے، نبی اکرم نے ایک حدیث میں وضاحت کی کہ **یہود مغضوب علیہم اور نصاریٰ ضالین ہیں** اور اس امت میں ان دونوں کی مشابہت رکھنے والے لوگ موجود ہیں، فرمایا تم سابقہ لوگوں کی روش و عادات کی ہو بہو اتباع کرو گے حتی کہ اگر وہ گوہ کے بل میں بھی داخل ہوئے تو تم بھی اس میں داخل ہو گے، صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ یہود ونصاری ؟ فرمایا پھر کون؟ یہ متفق علیہ روایت ہے تو جب دینی عملی توحید کی اصل اللہ کے لئے اخلاصِ دین ہے اور یہ صرف اکیلے اللہ ہی کا ارادہ کرنا تو لنفسہ مرادشیٔ لذاتہٖ محبوب ہوا کرتی ہے اور یہ کمالِ محبت ہے لیکن اکثر مقامات میں مطلوب اسمِ عبادت کے ساتھ مسمی مذکور ہوا ہے جیسے کہا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) [والذاريات: ٥٦] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں)

(يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ) [البقرة : ٢١] (اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا) اور ان کی امثال، اور عبادت کمالِ حُب اور اس کی انتہا کو متضمن ہے نیز ذل کے کمال اور انتہا کو بھی تو جس محبوب کی تعظیم نہ کی جائے اور نہ اس کے لیے ذل اختیار کیا جائے وہ معبود نہ ہوگا اور وہ معظم جس سے حب نہ کی جائے معبود نہ ہوگا، اسی لیے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة : ١٦٥] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) تو بیان کیا کہ مشرک وہی ہیں جو اللہ کے ماسوا کو انداد بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی وہ اللہ سے کرتے ہیں جبکہ جو اہلِ ایمان ہیں وہ ان کی اپنے بتوں کے ساتھ محبت سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں اس لیے کہ مومنین اعلم باللہ ہیں اور محبت علم کی تابع ہوتی ہے لہذا مومنین نے اپنی ساری محبت اللہ کے لیے کی ہوئی ہے (جو اخلاص ہے) جبکہ ان مشرکین نے محبت کا کچھ حصہ غیر اللہ کے لیے بھی وقف کیا ہوا ہے اور یوں اللہ کے اور اس کے انداد کے درمیان شرک وتسویہ کر رہے ہیں اور معلوم ہے کہ اہلِ ایمان کی روش اکمل ہے، اللہ تعالی نے اس کی مثال بیان کرتے ہوئے کہا:

(ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) [الزمر: ٢٩] (اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی آدمی شریک ہیں بدخو اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا غلام ہے، بھلا دونوں کی حالت برابر ہے؟ الحمدللہ بلکہ اکثر لوگ نہیں جانتے) اس محبت میں اطلاق اور عموم ہے تو

مومن اللہ، اس کے رسل وانبیاء اوراس کے مومن بندوں سے محبت کرتے ہیں اور یہ سب ان کی اللہ سے محبت کا ہی مظہر ہے اگرچہ جس طرح کی محبت اللہ سے کی جاتی ہے اس کا کوئی اس کا غیر مستحق نہیں اسی لیے اللہ تعالی سے محبت کا ذکر عبادت، انابت اوراس کے لیے تبتُّل کے ساتھ ہوا جو اسی کے لیے مختص ہے تو یہ سب اسماءاللہ تعالی کی محبت کو متضمن ہیں پھر جیسا کہ بیان ہوا اس کی محبت اصلِ دین ہے اور واضح ہے کہ دین کا کمال اس کے کمال اور دین کا نقص اس کے نقص کا مرہونِ منت ہے، فرمایا راس الامر (یعنی محور) اسلام ہے، اس کا ستون نماز اوراس کی کوہان (مرادنمایاں شناخت) اللہ کی راہ میں جہاد ہے تو خبر دی کہ جہاد سنامِ عمل کا ذروۃ ہے اور یہ اس کا اعلیٰ واشرف حصہ (یعنی چوٹی) فرمایا:

(اَ جَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَايَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللّٰهِ ---) إلى قوله : (اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ)[التوبة : ۱۹۔۲۲] (کیاتم نے حاجیوں کو پانی پلانا اورمسجدِ حرام کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے؟ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ---کچھ شک نہیں کہ اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے) جہاد اور اہلِ جہاد کے فضائل میں نصوص کثیر ہیں، ثابت ہے کہ یہ بندے کا افضل ترین تطوُّع (نفلی عبادت) ہے، جہادِ کامل محبت کی علامت اور دلیل ہے، فرمایا:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ) الآية، [التوبة : ۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اورعورتیں اور خاندان کے آدمی ---الخ) الآیۃ محبین محبوبین کی صفت یہ بیان کی کہ وہ اہلِ ایمان کے لیے نرم رو اورنرم گفتار اور کفار کے لیے ترش رو ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں گھبراتے تو محبت جہاد کے لیے مستلزم ہے اس لیے کہ محبّ ہر اسے پسند کرتا ہے جو اس کے محبوب کو پسند ہے اوراس کی رضا میں اس کی رضا ہوتی ہے اور جن باتوں سے وہ ناخوش ہوا ان سے یہ بھی ناخوش ہوتا ہے، جن سے وہ موالات یا معادات کرے ان سے یہ بھی کرتا ہے، وہ سب چیزوں میں محبوب کی موافقت کرتا ہے، جب اہلِ ایمان کا اللہ کی نسبت یہ وطیرہ ہے تو اللہ کا بھی ان کی نسبت یہی وطیرہ ہوگا جیسے **ایک دفعہ نبی اکرم نے حضرت ابو بکر صدیق سے صحابہ کی ایک جماعت کے بارے میں کہا** جن میں صہیب (رومی) بھی تھے : شائدتم نے انہیں ناراض کر دیا اگرتم نے انہیں ناراض کیا ہے تو اپنے رب کو بھی ناراض کر دیا، اس پر وہ ان سے مخاطب ہوئے اے میرے بھائیو کیا میں نے تمہیں ناراض کیا ہے؟ وہ گویا ہوئے نہیں اے ابو بکر،، اللہ آپ کو معاف کرے، دراصل واقعہ یہ ہوا کہ ان کے پاس سے ابوسفیان بن حرب کا گزر ہوا تو وہ بولے تلواریں اللہ کے دشمنوں کے خون سے پیاسی رہ گئی ہیں اس پر جنابِ ابو بکر نے ان سے کہا کیا آپ لوگ یہ بات سردارِ قریش سے کہہ رہے ہو؟ ابو بکر نے یہ واقعہ نبی اکرم کے گوش گزار کیا تو آپ نے سابق الذکر بات کہی اس لیے کہ ان صحابہ نے مذکورہ بات اللہ کے لیے کمال غضب کے عالم میں کہی تھی کیونکہ اللہ ورسول کے لیے ان کی موالات اور ان کے دشمنوں کے لیے ان کی معادات کامل تھی

اسی لیے ایک صحیح روایت (حدیثِ قدسی) میں ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ مسلسل میرا تقرُّب حاصل کرتا جاتا ہے حتی کہ ایک وقت آتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں جب یہ مرحلہ ومقام آجائے تو میں اس کا کان ہوجاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اس کی بصر بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے، قدم بن جاتا ہوں جس کے ساتھ چلتا ہے (یعنی اس کا ہر قول وفعل میرے تابع ہوجاتا ہے) اب اگر مجھ سے مانگے تو ضرور عطا کروں گا، پناہ کا طالب بنے تو پناہ دوں گا اور میں کسی شئ سے تردد نہیں کرتا جسے میں نے کرنا ہوتا ہے جیسے اپنے بندہ مومن کی جان قبض کرتے وقت کرتا ہوں، اسے مرنا ناگوار لگتا ہے اور مجھے اس کی یہ ناگواری بری لگتی ہے اور اس سے چارہ بھی نہیں، تو اللہ تعالی نے بیان کیا کہ وہ تردد کرتا ہے اس لیے کہ تردد (کا مطلب) دو ارادوں کا باہم تعارض ہے اور وہ سبحانہ تعالی پسند کرتا ہے جو اس کے بندۂ مومن کو پسند ہے اور ناپسند کرتا ہے جو اسے ناپسند ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے تو وہ بھی کرتا ہے کیونکہ کہا: (وَ اَنَـا اَکْـرَهُ مُسَـاءَ تَهٗ) موت اللہ تعالی کی قضا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ فوت ہوتو اسے تردد کا نام دیا پھر واضح کیا کہ اس سے چارا نہیں اور یہ مامور بہ محبوب ومرضی اور منہی عنہ مکروہ ومبغوض میں (محبّ اور محبوب کا) اتفاق واتحاد ہے، اسے نوعی وصفی اتحاد کہا جاسکتا ہے، یہ دو ذاتوں کا اتحاد نہیں کہ یہ محال اور ممتنع ہے اور اس کا قائل کافر ہے اور یہ نصاری اور غالی رافضہ اور نساک مثلا حلاجیہ ونحوہم کا نظریہ ہے، یہ کسی شئ میں اس کی عین کے ساتھ اتحادِ مقید ہے

اور جہاں تک اتحادِ مطلق جو کہ اہلِ وحدت الوجود کا قول ہے جن کا زعم ہے کہ وجودِ مخلوق عین وجودِ خالق ہے تو یہ صانع کی تعطیل اور اس کا جحد ہے اور یہ ہر شرک کا جامع ہے تو جیسے اتحاد کی دو انواع ہیں اسی طرح حلول کی بھی دو انواع ہیں! بعض لوگ بعض اشخاص میں مقید حلول کے قائل ہیں جبکہ ایک گروہ کائنات کی ہر شئ میں اللہ تعالی کے حلول کا قائل ہے، یہ جہمیہ ہیں جو کہتے ہیں اللہ کی ذات ہر جگہ میں ہے، دنیوی محبت میں فنا ہوچکے بعض مصطلمین (یعنی جو حالوں بے حال ہوچکے ہوں) کے لیے کبھی یہ امر واقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنے نفس اور اپنی حب سے غائب ہوجاتے ہیں اور اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر سے، اپنے معروف کے ساتھ اپنی معرفت سے اور اپنے موجود کے ساتھ اپنے وجود سے، حتی کہ ہر طرف انہیں اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے تو وہ اپنے شعور کے زوال، اپنی عقل کے نقص اور اپنے سکر (یعنی حالتِ مدہوشی اور حالتِ وجد) میں خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ خود (یعنی خود ان کا نفس وجسد) اپنا محبوب ہے (میں رانجھا رانجھا کردی آپے ای رانجھا ہوئی) جیسے مذکور ہے کہ کسی کا محبوب دریا میں گر پڑا تو اس کے پیچھے اس کے محبّ نے بھی چھلانگ لگا دی اس نے کہا میں تو گر پڑا تھا تم نے چھلانگ کیوں لگائی؟ بولا: (غِبْـتُ بِكَ عَـنِّـيْ فَـظَـنَـنْـتُ اَنَّكَ اِنِّیْ) (یعنی میں تیرے ساتھ خود سے غائب ہوا۔ خود فراموشی کی کیفیت ہے۔ حتی کہ گمان کیا کہ تو میں ہوں) تو بلاشبہ یہ خطا اور ضلال ہے لیکن اگر یہ قوتِ محبت وذکر کی وجہ سے ہے بغیر اس کے کہ کسی محظور سبب (یعنی شراب یا کوئی اور نشہ کرنے کی وجہ سے) اس کی ہوش زائل ہوئی ہے تب وہ

اپنی زوالِ عقل وہوش میں معذور ہے اور اس حال میں جو کچھ منہ سے نکالے قابلِ مواخذہ نہ ہوگا جیسے **عقلائے مجانین بارے کہا گیا ہے** کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ نے عقول واحوال عطا کئے تھے تو ان کی عقول کو تو سلب کر لیا مگر ان کے احوال باقی رکھے اور (بما سلب) (یعنی جو سلب کیا اس کے بدلے) (ما فرض) (یعنی فرائض) کا اسقاط کر دیا (یعنی اب وہ مکلّف نہیں رہے)

لیکن اگر زوالِ ہوش وخرد کا سبب کوئی محظور امر ہے تب یہ شخص معذور باور نہ ہوگا اگرچہ اصح القولین کی رو سے اس کے کفر کا حکم نہ لگایا جائے گا جیسے اصح القولین کے مطابق اس حالت میں اس کی دی ہوئی طلاق بھی واقع نہ ہوگی اگرچہ حکم (یعنی قاضی کے دیئے فیصلہ) میں مشہور نزاع ہے، ہم نے اس پر ایک جگہ مبسوط بحث کی ہے اور اس بارے کہ کس کا حکم تسلیم کیا جائے گا اور کس کا نہیں؟ اس ضمن میں ایک قاعدہ ہے، بہر حال وہ فنا جو اپنے صاحب کو اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار کر دے ناقص حال ہے اگرچہ اس کا صاحب غیر مکلّف ہے، اس طرح کا حال صحابہ کرام میں سے کسی پر طاری نہیں ہوا جو اس امت کے افضل لوگ ہیں اور نہ ہمارے نبی اکرم پر جو افضل الرسل ہیں اگرچہ ان حضرات کے لیے حضرت موسیٰ کو لاحق ہوئے صعقہ (یعنی کوہِ طور پہ جب بے ہوش ہو گئے تھے) سے ایک نوع کا تعلق ہے! دراصل بعض تابعین اور ان کے بعد والوں پر الوہی واردات کے وقت زوالِ ہوش وعقل عارض ہوا ہے اگرچہ تام اور کامل محبت محبوب کی کلی موافقت کو مستلزم ہے، اس کی ہر پسند اور ناپسند اور اس کی ولایت وعداوت میں، معلوم امر ہے کہ جس نے اللہ سے واجب محبت کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس کے اعداء کو مبغوض رکھے گا تو جس طرح اللہ کو مجاہدین پسند ہیں اسے بھی ہوں گے، فرمایا:

(اِنَّ اللّٰـهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ) [الصف : ۴] (بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں پرے جما کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں) تام اور کامل محبت میں کسی ملامت گر کی لوم وملامت اثر نہیں کرتی بلکہ یہ اس محبت کو برقرار رکھنے میں مہمیز کا کام دیتی ہے جیسا کہ کثیر شعراء نے اس نکتہ پر طبع آزمائی کی ہے، یہ لوگ اہلِ ملامِ محمود ہیں اور انہیں اللہ کو۔ جو کہ ان کا محبوب ہے۔ پسند امور واشیاء کو محبوب رکھنے میں کسی ملامت کا خوف، ڈر اور پرواہ نہیں لیکن اس فعل پر ملامت جو اللہ کو ناپسند ہے یا اسے محبوب فعل وشیٔ کے ترک پر تو یہ برحق ملامت ہے اور اس ملامت پر صبر محمود امر نہیں بلکہ حق کی طرف رجوع کر لینا باطل پر ڈٹے رہنے سے بہتر ہے، اسی سے ان (فرقہ) ملامتیہ جو ایسے افعال کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں اور اس بارے کسی لائم کی ملامت کی انہیں پرواہ نہیں، کے درمیان اور ان ملامتیہ کے درمیان فرق حاصل ہوتا ہے جو ایسے افعال کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں اور وہ اس پر ملامت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔

فصل

جب محبت ہر دینی عمل کی اصل اور اساس ہے تو خوف ورجا وغیرہما محبت کو مستلزم اور اس کی طرف راجع ہیں تو راجی اور طامع دراصل اپنے ہاں محبوب میں، نہ کہ اپنے ہاں مبغوض میں طمع رکھتا ہے اور خائف خوف سے بھاگتا ہے تاکہ محبوب کو پالے، اللہ کا ارشاد ہے:

﴿أُولَـٰٓئِكَ الَّـذِيْـنَ يَـدْعُـوْنَ يَبْتَـغُـوْنَ اِلٰـى رَبِّهِـمُ الْـوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ الآیۃ [الإســراء : ۵۷] (یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں ہوخود اپنے رب کے ہاں ذریعہ تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کون اُن میں زیادہ مقرب ہے اور اُس کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں اور اُس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں) اور کہا:

﴿اِنَّ الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَالَّـذِيْـنَ هَـاجَـرُوْا وَجَـاهَـدُوْا فِىْ سَبِيْـلِ الـلّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ [البقرة : ۲۱۸] (جو لوگ ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کیلئے وطن چھوڑ گئے اور جنگ کرتے رہے وہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں)

رحمت ہر خیر کے لیے جبکہ عذاب ہر شر کے لیے جامع اسم ہے، دارالرحمۃ الخالصۃ جنت اور دار العذاب الخالص دوزخ ہے! جہاں تک دنیا تو یہ دارِ امتزاج ہے تو رجاء اگر چہ دخولِ جنت کے ساتھ متعلق ہے لیکن جنت ہر نعیم کے لیے جامع اسم ہے اور اعلیٰ ترین نعیم اللہ کے چہرہِ اقدس کا دیدار ہے جیسے مسلم میں عبدالرحمٰن بن ابولیلیٰ عن صہیب سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اہلِ جنت کے جنت میں داخل ہوجانے کے بعد ایک منادی ندا دے گا اے اہلِ جنت اللہ کے ہاں تمہارے لیے ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے، کہیں گے وہ کیا؟ کیا ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا؟ کیا ہمیں آگ سے نجات نہیں دے دی؟ فرمایا تو حجاب ہٹایا جائے گا تو وہ رب تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو انہیں لگے گا کہ اس سے بہتر کوئی شیٔ انہیں عطا نہیں کی اور یہ ہے (زِيَادَةٌ) (جس کا ذکر اس آیت میں ہوا: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ)

اس سے کسی **قائل کے اس قول میں اشتباہ** زائل ہوا کہ: میں نے تیری عبادت تیری جنت کے شوق اور تیرے جہنم کے خوف سے نہیں کی بلکہ تیرے دیدار کے شوق میں، تو اس قائل اور اس کے اَتباع نے ظن کیا کہ جنت کے مسمّی میں داخل نہیں مگر اکل وشرب اور لباس ونکاح اور سماع وغیرہ امور ہی جن میں مخلوقات کے ساتھ تمتُّع ہے جیسا کہ اس پر اس سے ان جہمیہ نے موافقت کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا انکار کرتے ہیں یا وہ جو اس کا اقرار تو کرتے ہیں مگر زعم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نفسِ رؤیت کے ساتھ تمتع نہیں ہوسکتا جیسا کہ متفقہہ کے ایک گروہ نے کہا تو یہ متفق ہیں کہ جنت اور آخرت کے مسمّی میں داخل نہیں مگر تمتع بالمخلوقات ہی، اس لئے بعض مشائخ نے غلط طور پر کہا جب یہ آیت سنی:

﴿مِنْكُمْ مَّـنْ يُّـرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ [آل عمران : ۱۵۲] (بعض تو تم میں سے دنیا کے طلبگار تھے اور بعض آخرت کے طالب) کہ: (اَيْـنَ مَنْ يُرِيْدُ اللّٰهَ) (یعنی اللہ کا ارادہ کرنے والا کہاں ہے؟) ایک اور نے یہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَـرٰى مِـنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة : ۱۱۱] (اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لئے ہیں عوض میں اُن کیلئے جنت ہے) سن کر کہا جب نفوس واموال کے بدلے جنت ہے تو اس کا دیدار کیوں؟ یہ سب ان کے اس ظن کی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کا حصہ نہیں! تحقیق یہ ہے کہ جنت ہر نعمت کی جامع ہے اور اس کی

سب سے اعلیٰ نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے اور اس نعمت کا حصول بھی جنت میں ہوگا جیسا کہ نصوص نے اس کی خبر دی ہے جبکہ اہلِ نار اپنے رب سے محجوب ہوں گے ! بہرحال یہ قائل اگر اپنے قول کا عارف ہے تو اس کا قصد یہ ہے کہ اے اللہ اگر تو نے جنت اور دوزخ پیدا نہ بھی کئے ہوتے تو بھی واجب تھا کہ تیری عبادت کی جاتی اور تیرا تقرّب اختیار کیا جاتا اور تیرا دیدار ہوتا، یہاں جنت سے اس کا مقصود وہ جس میں مخلوق متمتع ہوگی

جہاں تک ذی حیات کا اصلاً بغیر حب وارادہ کے عمل تو یہ ممتنع ہے اگر چہ بعض غلط روش والے نساک (یعنی زُہاد) اس کے متخیل ہیں، ان کا ظن ہے کہ بندے کا کمال یہ ہے کہ اصلاً ہی اس کے لیے کوئی ارادہ باقی نہ رہے، اس لیے کہ اس نے حالِ فناء میں تکلم کیا ہے اور فانی جو اپنے محبوب کے ساتھ مشتغل ہوا، کے لیے ارادہ ومحبت ہے لیکن اسے اس کا شعور نہیں تو محبت کا وجود ایک شئ ہے اور ارادہ دوسری شئ اور ان کا شعور ایک دیگر شئ تو جب انہیں اس کا شعور نہ ہوا تو اس کے انتفاء کا ظن کیا اور یہ غلط ظن ہے تو بندے بارے کبھی متصور نہیں کہ وہ کوئی تحرُّک کرے مگر حب، بغض اور ارادہ (کی تحریک) سے، اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ اصدق الاسماء حارث اور ہمام ہیں تو ہر انسان کے لیے حرث (کھیتی، یعنی دارِ عمل وجد وجہد) ہے اور یہ اس کا عمل اور ہر انسان کے لیے ھم ہے اور یہ اصلِ ارادہ، لیکن کبھی دل کے ساتھ اللہ کی ایسی محبت قائم ہوتی ہے جو اس کی اطاعت کا داعیہ بنتی ہے اور ایسا اس کا اجلال اور اس سے حیا ہوتی ہے جو اسے اس کی معصیت سے روکتی ہے، جیسے حضرت عمر نے کہا تھا صہیب (رومی) اچھا آدمی ہے کہ یہ اگر اللہ سے خائف نہ بھی ہو تو اس کی معصیت نہ کرے یعنی اب تو اسے اللہ کا خوف بھی ہے (تو کیونکر معصیت کا مرتکب ہو) تو اللہ کے لیے ان کے دل میں اکرام واجلال کے جذبات اس کی معصیت سے انہیں مانع ہیں

تو راجی اور خائف کا جب خوف ورجا رب کے اس سے احتجاب کے ساتھ تعذُّب اور اس کے اس کے لیے تجلّی کے ساتھ تنعُّم سے متعلق ہو تو معلوم امر ہے کہ یہ اس کے لیے اس کی محبت کے توابع سے ہوگا کہ محبت ہی تجلّی کی محبت اور احتجاب سے خوف کھانے کی موجب بنی ہے اور اگر اس کے خوف ورجا کا تعلق کسی مخلوق کے ساتھ تعذُّب اور تنعُّم سے ہے تو اس کی بھی طلب دراصل اللہ کی عبادت کرنے کے ساتھ ہی ہے جسے اس کی محبت مستلزم ہے پھر جب یہ اللہ کی محبت کی حلاوت پالے تو اسے ہر محبت سے زیادہ میٹھی پائے گا اسی لیے اہلِ جنت کا اس کے ساتھ اشتغال ہر شئ سے اعظم ہوگا جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اہلِ جنت تسبیح کے اس طرح ملہم ہوں گے جیسے سانس لینے کے (یعنی تسبیح ان کی سانسوں میں شامل ہوگی) یہ اللہ کے ذکر ومحبت کے ساتھ ان کے غایتِ تنعُّم کا بیان ہے تو کسی مخلوق کے ساتھ تعذیب سے خوف اور اس کے لیے رجا اللہ کی محبت کی طرف اسے ہانکے گی جو کہ اصل ہے، یہ سب اصلِ محبت پر مبنی ہے تو کہا جائے گا کتاب وسنت مومن بندوں کی محبت کے ساتھ ناطق ہیں جیسے یہ آیات:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرۃ : ۱۶۵] (لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں)

(يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ) [المائدة : ۵۴] (جن کو وہ دوست رکھتا اور اسے وہ دوست رکھتے ہیں)

(اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ) [التوبة : ۲۴] (تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے) صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا تین خصلتیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں گی اس نے ایمان کی حلاوت پالی کہ اللہ اور اس کا رسول اسے سب ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، اہل اللہ سے محبت کرے اور مرتد ہونے کو اس طرح برا جانے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے! بلکہ اللہ کی محبت کی وجہ سے نبی اکرم سے محبت بھی واجب ہے جیسے کہا: (اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ) اور جیسے صحیحین میں مروی ہے کہ فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے ولد، والد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں، بخاری میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ مجھے ہر شئ سے بڑھ کر محبوب ہیں ماسوائے میری جان کے، تو فرمایا نہیں اے عمر حتی کہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی بڑھ کر محبوب ہو جاؤں! تو وہ بولے واللہ اب آپ مجھے میرے جان سے بھی بڑھ کر محبوب ہیں اس پر آپ نے کہا: ہاں اب اے عمر

اسی طرح **آپ کے صحابہ اور آپ کے اہلِ قرابت سے محبت** جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا ایمان کی نشانی انصار سے محبت اور نفاق کی نشانی انصار سے بغض ہے اور فرمایا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بغض نہیں کرسکتا، حضرت علی راوی ہیں کہ مجھے نبی اکرم نے کہا کہ مجھ (یعنی حضرت علی) سے محبت نہ کرے گا مگر مومن اور مجھ سے بغض نہ کرے گا مگر منافق، سنن میں ہے کہ آپ نے حضرت عباس سے کہا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے لوگ جنت نہ جاسکیں گے حتی کہ وہ اللہ کی خاطر آپ لوگوں سے اور میرے اہلِ قرابت سے محبت نہ کریں یعنی بنی ہاشم، ابن عباس سے مرفوعا مروی ہے کہ آنجناب نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کہ اس نے تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے اور مجھ سے اللہ کی محبت کی وجہ سے محبت کرو اور میری خاطر میرے اہلِ بیت سے بھی محبت کرو! جہاں تک رب تعالی کی بندے سے محبت تو فرمایا:

(وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا) [النساء : ۱۲۵] (اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا)

(يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ) (ابھی گزری)

(وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ) [البقرة : ۱۹۵] (بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

(وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ) [الحجرات : ۹] (اور انصاف سے کام لو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

(فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ) [التوبة : ۴] (تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو اسے پورا کرو، اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے)

(فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ)[التوبة : ۷] (اگر وہ قائم رہیں تو تم بھی اپنے قول و اقرار پر قائم رہو بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے)

(اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ) (کچھ قبل گزری)

(بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ)[آل عمران : ۷۶] (ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور (اللہ سے) ڈرے تو اللہ متقین کو دوست رکھتا ہے) جہاں تک واجبات اور ظاہری و باطنی مستحبات میں سے وہ اعمال جن سے اللہ محبت کرتا ہے تو وہ کثیر و معروف ہیں اسی طرح ان کے اہل سے اس کی محبت اور یہ اس کے متقی اولیاء ہیں، یہ محبت حق ہے جیسا کہ کتاب و سنت اس کے ساتھ ناطق ہیں امت کے سلف ائمہ، اہلِ سنت و حدیث اور تمام متبع مشائخ دین اور ائمہِ تصوف اس موقف کے حامل ہیں کہ اللہ تعالی لذاتہ حقیقی محبت کے ساتھ محبوب ہے بلکہ یہ تو اکمل ترین محبت ہے تو یہ جیسے اس نے کہا:(وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ) اسی طرح اس کی بھی اپنے مومن بندوں سے محبت حقیقی محبت ہے، جہمیہ نے طرفین سے حقیقتِ محبت کا انکار کیا ہے یہ زعم کرتے ہوئے کہ محبت نہیں ہوتی مگر محبّ اور محبوب کے درمیان کسی مناسبت کی وجہ سے اور قدیم (یعنی اللہ تعالی کی ذات) اور محدَث (یعنی انسان کی ذات) کے درمیان ایسی کوئی مناسبت نہیں جو محبت کی موجب ہو، اسلام میں اس نظریہ کا اولین مبتدِع جعد بن درہم تھا، یہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں، اسی پاداش میں امیرِ عراق خالد بن عبداللہ قسری کے ہاتھوں واسط شہر میں عین عیدِ قربان کے روز قتل ہوا، اس نے (خطبہِ عید میں) کہا اللہ آپ لوگوں کی قربانیاں قبول کرے، جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں جعد بن درہم کو قربان کرنے والا ہوں کیونکہ اس کا زعم ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل نہیں بنایا اور نہ اس نے حضرت موسیٰ سے کلام کی ہے، اس سے اس مذہب کا اخذ جہم بن صفوان نے کیا اور اس پر علماء سے مناظرے کئے، جہمیہ کا فرقہ اسی کی طرف منسوب ہے، یہ امیرِ خراسان سلم بن احوز کے ہاتھوں قتل ہوا پھر یہ عمرو بن عبید معتزلی کے اتباع کی طرف منتقل ہوا اور مامون عباسی کے دور میں اس کا خوب ظہور ہوا (اور اس کی سرپرستی اسے حاصل رہی) حتی کہ اس نے ائمہِ اسلام کو آزمائش میں ڈالا اور ان نظریات کو قبول کرنے کا کہا

ان کے اس نظریہ کی اصل مشرکین، براہمہ اور متفلسفہ کے صابئین اور اہلِ کتاب کے مبتدعین سے ماخوذ ہے جو زعم کرتے ہیں کہ رب کے لیے اصلاً ہی کوئی ثبوتی صفت نہیں، یہ لوگ خلیل اللہ حضرت ابراہیم کے اعداء ہیں اور ستاروں کے یہ پجاری ہیں انہوں نے ستاروں اور عقول وغیرہا کے لیے ہیکل بنائے ہوئے تھے، ان کے بقول حضرت ابراہیم حقیقت میں خلیل اللہ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ نہیں ہو سکتے اس لیے کہ خلت کمالِ محبت ہے جس میں محبّ مستغرق ہوتا ہے جیسے کہا گیا:

قَدْ تَخَلَّلْتُ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّيْ   وَبِذَا سُمِّيَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلاً

(یعنی تم مجھ میں یوں گھل اور رچ بس گئے ہو جیسے روح بدن کے ہر حصہ اور پور پور میں ہے اسی لئے تو خلیل کو خلیل کہتے ہیں) اس کے

لیے شاہد جوصحیح میں ابوسعید نبی اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا اگر میں نے اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو ابو بکر کو اپنا خلیل بناتا لیکن تمہارا صاحب اللہ کا خلیل ہے،ایک روایت میں ہے میں ہر خلیل کی خلت سے براءت کا اعلان کرتا ہوں، اگر زمین والوں ۔۔۔۔۔ الخ۔ ایک روایت میں ہے اللہ نے مجھے اسی طرح اپنا خلیل بنالیا ہے جیسے حضرت ابراہیم کو بنایا تھا تو آپ نے واضح کیا کہ آپ کے لیے موزوں نہیں کہ مخلوقین میں سے کسی کو اپنا خلیل چن لیں کہ اگر یہ آپ کے لیے ممکن ہوتا تو حضرت ابو بکر اس کے احق الناس تھے اور اس کے باوصف آپ کئی اشخاص سے محبت کرتے تھے جیسے آپ نے حضرت معاذ سے کہا تھا:(وَاللّٰـهِ اِنِّیْ لَاُحِبُّكَ) (بخدا میں تم سے محبت کرتا ہوں) یہی بات آپ نے انصار سے بھی کہی، زید بن حارثہ آپ کو بہت پیارے تھے اسی طرح ان کے بیٹے اسامہ بھی اور کئی اور، **ایک دفعہ عمرو بن عاص نے آپ سے پوچھا** آپ کو سب سے زیادہ کون محبوب ہے؟ فرمایا عائشہ، کہا مردوں میں سے؟ فرمایا عائشہ کے والد، اپنی بیٹی فاطمہ سے کہا تھا تمہیں اس سے محبت نہیں جس سے مجھے ہے؟ کہنے لگیں کیوں نہیں؟ فرمایا پھر عائشہ سے محبت کرو، حضرت حسن بارے کہا اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر اور اس سے بھی جو اس سے محبت کرے، اس کی امثال کثیر ہیں تو کئی اشخاص سے محبت کے ساتھ اپنے آپ کو موصوف کیا اور ساتھ میں کہا میں ہر ایک خلیل کی خلت سے براءت کا اعلان کرتا ہوں تو اس سے معلوم ہوا کہ خلت مطلق محبت سے اخص ہے اس طور کہ یہ محبت کے کمال سے ہےاور محبّ میں رچ بس گئی ہے، حتی کہ ایسا محبوب لذاتہ محبوب ہوتا ہے نہ کہ کسی اور شئ کی وجہ سے کیونکہ جو اپنے غیر کسی شئ کی وجہ سے محبوب ہوتا ہے وہ محبت میں اس غیر سے موخر ہوتا ہے اور کمال محبت (جو کہ خلت ہے) سے ہے کہ وہ شرکت قبول نہیں کرتا تو اس میں کمالِ توحید اور کمالِ حب ہے،خلت مزاحمت کے منافی ہے اور یہ محبوب کو لذاتہ محبوب بنا دیتی ہے،جس میں اس کا غیر اس کا مزاحم نہیں ہوتا اور یہ محبت صرف اللہ ہی کے لئے ہے اور ہر جو اس کے غیر سے محبت کرتا ہے اگر وہ بحق محبوب ہے تو اس سے اسی کی خاطر اور اس کی وجہ سے ہی محبت کرتا ہے! ہر جس سے اس کے کسی غیر کی وجہ سے (نہ کہ لذاتہ) محبت کی جائے تو اس کی محبت باطل ہے، پس دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے مگر جو اللہ تعالی کے لیے ہو

جب خلت کا یہ معاملہ ہے تو معلوم امر ہے کہ جس نے اس امر کا انکار کیا کہ اللہ تعالی لذاتہ محبوب ہو تو وہ اس کی مخاللت کا بھی منکر ہے، اسی طرح اگر اس کی اپنے بندوں میں سے کسی سے محبت کا انکار کرتا ہے تو وہ اس امر کا بھی منکر ہے کہ وہ کسی کو اپنا خلیل بنائے اسی طرح حضرت موسی سے اس کی تکلیم کے وہ اس وجہ سے منکر ہیں کہ ان کے نظریہ میں اس کے ساتھ کسی صفت یا کسی فعل کا قیام نہیں ہوسکتا تو جیسے یہ اس بات کے منکر ہیں کہ وہ حیات، قدرت، علم، استواء یا آنے اور نازل ہونے کے ساتھ متصف ہو تو اس طرح ہی اس کے تکلم یا تکلیم کے بھی منکر ہیں تو یہ ان کے نظریہ کی حقیقت ہے،(كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ) [البقرة : ۱۱۸] (اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی انہیں کی سی باتیں کیا کرتے تھے، ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں)

لیکن جب اسلام ظاہر اور قرآن متلو ہے اور کسی مسلمان کے لئے اس کا جحد ممکن نہیں تو یہ اللہ کے اسماء میں الحاد اور کلم کی ان کے مواضع سے تحریف کرنا شروع ہوئے، تو بندوں کی اس کے ساتھ محبت کرنے کی یہ تاویل کی کہ اس سے مراد ان کی اس کیلئے طاعت یا اس کی طرف تقرُّب سے محبت ہے اور یہ عظیم جہل ہے کیونکہ متقرِب کی متقرّب الیہ سے محبت اس کی ذات سے محبت کی تابع اور اس کی فرع ہے تو جو کسی شیٔ سے محبت نہ کرے اس کی طرف تقرب سے بھی اسے محبت نہ ہوگی کیونکہ تقرب تو ایک وسیلہ ہے اور وسیلہ سے محبت مقصود سے محبت کے لیے تابع ہے تو ممتنع ہے کہ محبوب شیٔ کی طرف وسیلہ تو محبوب ہو لیکن وہ شیٔ محبوب نہ ہو جو مقصود بالوسیلہ ہے، اسی طرح عبادت اور اطاعت، جب مطاع و معبود بارے کہا جائے کہ یہ اس کی اطاعت اور عبادت سے محبت کرتا ہے تو یہ محبت دراصل اس سے اس کی محبت کی تبع اور فرع ہے وگرنہ جس سے محبت نہ ہو اس کی اطاعت اور عبادت سے بھی محبت نہ ہوگی اور جو اپنے غیر کے لیے کام نہیں کرتا مگر کسی عوض کی خاطر جو اس سے حاصل کرے یا دفعِ عقوبت کے لیے تو وہ اس کے لیے معاوض اور مفتدی تو ہوگا لیکن محبّ نہیں اور یہ نہ کہا جائے گا کہ یہ اس کا محبّ ہے اور نہ اسے اس کی اطاعت اور عبادت سے محبت کے ساتھ مفسر کیا جائے گا تو مقصود سے محبت اگرچہ وسیلہ سے محبت یا غیر محبت کو مستلزم ہو تو یہ مقتضی ہے کہ اسے دو لفظوں کے ساتھ تعبیر کیا جائے: محبتِ عوض اور محبتِ عمل سے خالی ہونا، جہاں تک اللہ کی محبت تو اس کے لیے مجرد عوض کی خاطر محبت سے کوئی تعلق نہیں، تم دیکھتے نہیں کہ جس نے کسی طے شدہ اجرت پر کسی مزدور کو رکھا تو مجرد اس وجہ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اسے اس سے محبت ہے بلکہ کئی دفعہ ضرورت کے تحت ایسے کو بھی اجرت پر رکھا جاتا ہے جس سے کسی حال اسے محبت نہیں ہوتی بلکہ کئی دفعہ تو اس سے نفرت ہوتی ہے، اسی طرح جس نے کسی عمل کے ساتھ اپنے آپ کو کسی معذِب کے عذاب سے بچالیا تو یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اس کا محبّ ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس کا مبغوض ہوسکتا ہے! تو معلوم ہوا کہ اللہ نے جو اپنے مومن بندوں کا وصف کیا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں تو ممتنع ہے کہ اس کا معنی و مراد فقط یہ ہو کہ یہ مجرد عمل کی محبت ہے جس کے ساتھ یہ بعض اغراض کو حاصل کرلیں بغیر اس کے کہ اصلاً ہی ان کا رب ان کا محبوب نہ ہو، نیز عبادت کا لفظ محبت مع الذل (یعنی محبوب کے سامنے بچھ بچھ جانے) کو متضمن ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا اسی لیے **دل کی کسی بشر کے لیے محبت کئی طبقات پر ہے:**

اولاً علاقہ، یہ دل کا محبوب سے تعلق، صبابہ، یہ دل کا اس کی طرف انصباب (اُمڈنا/ میلان) پھر غرام، یہ حبِ لازم ہے پھر عشق، اور آخری رتبہ ہے: تتیُّم اور یہ محبوب کے لیے تعبد (بندگی) متیم معبود ہے، تیم اللہ یعنی عبداللہ، تو محبّ اپنے محبوب کے لیے ہمیشہ مذلل، ذاکر اور متعبد رہتا ہے نیز اس کی طرف انابت کا اسم بھی محبت کا مقتضی ہے اسی طرح اس جیسے دیگر اسماء بھی جیسا کہ گزرا، نیز اگر ان کا کہنا حق ہو کہ یہ مجاز ہے اس وجہ سے جو اس میں حذف و اضمار ہے، تو مجاز کا اطلاق تبھی ہوتا ہے جب مراد کی توضیح کرنے والا کوئی قرینہ موجود ہو اور معلوم ہے کہ کتاب وسنت میں اللہ کے محبوب ہونے کی کہیں نفی موجود نہیں اور یہ کہ محبوب اعمال ہیں نہ دلالتِ متصلہ

اور نہ منفصلہ میں، بلکہ نہ عقلی رو سے ہی، نیز مجاز کی علامات میں سے اس کی نفی کے اطلاق کی صحت ہے تو واجب ہے کہ یہ اطلاقِ قول صحیح ہو کہ اللہ نہ محبت کرتا ہے اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہے (جبکہ ایسا نہیں) جیسے ان کے امام جعد بن درہم نے اطلاق کیا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل نہیں بنایا او نہ اس نے حضرت موسیٰ سے کلام کی اور معلوم ہے کہ یہ بالا جماع غلط بات ہے، تو اس امر پر اجماع کی دلالت ہوئی کہ یہ مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ملحوظ رہے کہ اللہ تعالی نے اس آیت میں اپنی محبت اور اپنے لیے عمل کی محبت کے درمیان تفرقہ کیا ہے: (اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ) (کچھ قبل گزری) جیسے اس آیت میں اپنی اور اپنے رسول سے محبت کے مابین تفرقہ کیا: (اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ) تو اگر اس کی محبت سے مراد عمل کی محبت ہو تو یہ لا حاصل تکرار ہو یا خاص کے عام پر عطف کے باب سے ہو اور یہ دونوں ہی اس ظاہر کلام کے برخلاف ہیں جس کی طرف مصیر جائز نہیں مگر تبیینِ مراد کی دلالت کے ساتھ اور جیسے یہ جائز نہیں کہ اس کی محبت کو مجرد اس کے رسول کی محبت کے ساتھ مفسر کیا جائے اسی طرح اس کے لیے مجرد عمل کے ساتھ بھی اسے مفسر کرنا جائز نہیں، اگر چہ اس کی محبت اس کے رسول اور اس کے لیے عمل کرنے سے محبت کو بھی مستلزم ہے

اور نیز شیٔ کی محبت کے ساتھ اس کی اطاعت سے مجرد محبت سے تعبیر کرنا۔ نہ کہ اس کے نفس کی محبت سے۔لغوی لحاظ سے غیر معروف ہے نہ حقیقۃً اور نہ مجازاً تو اس پر کلام کو محمول کرنا تحریفِ محض ہے، ہم نے کئی مقامات میں جہاں کبار قواعد کا ذکر ہو اطے کیا ہے کہ جائز نہیں کہ کوئی غیر اللہ لذاتہ مراد و محبوب ہو جیسے یہ بھی ممکن نہیں کہ غیر اللہ بذاتہ موجود ہو بلکہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے، ایسا جو مستحق ہو کہ اس سے اس کی ذات کے لئے محبت کی جائے اور اس کی لذاتہ تعظیم ہو، کمالِ محبت و تعظیم! ہر مولود فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اللہ سبحانہ تعالی نے دلوں کو اس امر پر فطر کیا ہے کہ ان کے محبوبات و مرادات میں کوئی ایک ایسا نہیں جس کی طرف وہ کاملاً مطمئن ہوں اور وہ ان کا منتہا بنے ماسوائے اللہ وحدہ کے، انسان کو جس قدر من چاہا طعام، لباس اور منظور، مسموع اور ملموس مل جائے وہ اپنے آپ سے پاتا ہے کہ اس کا دل اس کے سوا کا بھی طالب ہے (یعنی صدائے ھل من مزید لگا تا ہی رہتا ہے) اسی لئے کہا:

(اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)[الرعد: ۲۸] (اور سن رکھو کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے) ایک صحیح حدیث میں عیاض بن حمار نبی اکرم سے راوی ہیں کہ اللہ تعالی نے فرمایا میں نے اپنے بندوں کو حنفاء پیدا کیا مگر شیطانوں نے ان پر اپنا تسلط جمالیا اور ان پر وہ کچھ حرام کیا جو میں نے حلال کیا تھا اور انہیں شرک پر لگا دیا، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا ہر مولود فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے مگر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی (اور مجوسی وغیرہ) بنالیتے ہیں جیسے چوپایہ صحیح وسالم الاعضاء بچہ جنتا ہے، کیا تم ان میں کوئی کان کٹا پاتے ہو؟ پھر ابو ہریرہ نے کہا اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو:

(فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ) [الروم: ۳۰] (تو تم ایک طرف

کے ہوکر دین پر سیدھا منہ کیئے چلے جاؤ، اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی میں تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے) نعوتِ کمال میں سے ہر جس کی محبت پر دل مفطور ہیں اللہ ان کا زیادہ حقدار اور اہل ہے اور ہر جو اس کے غیر میں کوئی قابلِ محبت امر ہے وہ اسی سبحانہ سے ہے، وہ مستحق ہے کہ حقیقت وکمال پر محبت کیا جائے، بندے کی اپنے رب سے محبت کا انکار فی الحقیقت اس کے الہ ومعبود ہونے کا انکار ہے جیسے بندے سے اس کی محبت کا انکار اس کی مشیت کے انکار کو مستلزم ہے اور یہ اس کے رب وخالق ہونے کے انکار کو مستلزم ہے اور یہی اہلِ تعطیل وجود کے نظریہ کا نتیجہ وثمرہ ہے اسی لیے ہم سے قبل کی دو عظیم ملتیں (یہودیت اور نصرانیت) اپنے پاس موجود حکم پر متفق ہیں جو حضرات موسیٰ وعیسیٰ سے ان تک منقول ہوئیں اور ان میں عظیم ترین وصیت یہ ہے کہ تم اپنے پورے دل، عقل اور قصد کے ساتھ اللہ سے محبت کرو اور یہ ملتِ ابراہیم حنیفیت کی حقیقت ہے جو کہ تورات، انجیل اور قرآن کی شرائع کی اصل ہے، اس کا انکار حضرت ابراہیم خلیل کے اعداء مشرکین صابئین سے ماخوذ ہے اور ان فلاسفہ متکلمین، متفقہین اور مبتدعین سے جنہوں نے ان کی موافقت کی، اس کا ظہور اسماعیلیہ کے باطنی قرامطہ کے ہاں بھی ہوا، اسی لیے امام الحنفاء حضرت خلیل نے کہا تھا:

(اَفَرَءَیْتُمْ مَّا کُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُ کُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ) (کچھ قبل یہ آیات گزریں) اور:

(لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ)[الأنعام : ۷۶](مجھے غائب ہوجانے والے پسند نہیں) اللہ تعالیٰ نے کہا:

(یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ)[الشعراء : ۸۸-۸۹] (جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ مگر جو شخص اللہ کے پاس پاک دل لے کر آیا) یعنی شرک سے خالی اور سلیم، جہاں تک ان کا قول کہ کیا قدیم اور محدَث کے درمیان باہمی محبت کی کوئی مناسبت ہے؟ تو یہ بات حق ہے اگر مناسبت سے ان کی مراد یہ ہو کہ ان کے مابین توالُد نہیں اور اگر مناسبت سے ان کی مراد وہ جو ناکح اور منکوح، آکل اور ماکول وغیرہ کے درمیان ہوتی ہے تو یہ بھی حق ہے اور اگر ان کی مراد یہ ہو کہ ایسی مناسبت جو اس امر کی موجب ہو کہ ان میں سے ایک محبّ وعابد اور دوسرا محبوب ومعبود ہو تو یہی تو مسئلہ کی جڑ ہے تو اس کے ساتھ احتجاج مطلوب پر مصادرت (یعنی شدت سے طلب کرنا) ہے اور اس میں منع کافی ہے، پھر کہا جائے گا بلکہ محبتِ کاملہ کی مقتضی کوئی مناسبت نہیں مگر وہ مناسبت جو خالق اور مخلوق کے مابین ہوتی ہے، وہ خالق کہ جس کے سوا کوئی الہ نہیں وہ آسمان میں بھی الہ ہے اور زمین میں بھی اور اس کے لیے آسمانوں اور زمین میں مثَلِ اعلیٰ ہے، ان کے نظریہ کی حقیقت دراصل اللہ کے معبود ہونے کا انکار ہے اسی لیے اس مسئلہ پر ان متکلمین صوفیہ کے ایک گروہ نے ان کی موافقت کی جو منکر ہیں کہ اللہ فی الحقیقت محبّ ہو، تو یہ حضرات اس کے محبوب ہونے کے مقر لیکن محبّ ہونے کے منکر ہیں اس لیے کہ یہ متصوف بنے اور متکلمہ کے کئی نظریات سے متأثر ہوئے تو صوفیہ سے انہوں نے

محبت بارے ان کا مذہب اخذ کیا اگرچہ اس میں اپنی طرف سے بھی کئی باتیں خلط کیں، اصلاً یہ انکار معتزلہ اور جہمیہ میں سے ان کے امثال کا قول ہے اور جہاں تک رب تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت تو یہ اس کے شدید ترین منکر ہیں، **اس کے منکرین دو طرح کے لوگ ہیں:**

ا۔ ایک جو اسے ان نفس المفعولات کے ساتھ متأوّل کرتے ہیں جن سے بندہ محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کو اس کی نفسِ خلق باور کرتے ہیں

۲۔ وہ لوگ جو ان مفعولات کے لیے اسے اس کا نفسِ ارادہ قرار دیتے ہیں، اس بارے ہم نے صفات اور قدر کی بحث میں تفصیلی بات کی ہے، یہ اس کا محل نہیں

معلوم امر ہے کہ کتاب وسنت اور امت کے سلف کا اتفاق اس امر پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے مامورات خواہ واجبات ہوں یا مستحبات، سے محبت ہے وہ ان کے کرنے پر راضی اور خوش ہوتا ہے اگرچہ یہ موجود نہ ہوا، اور اس امر پر کہ کبھی وہ ان امور کے وجود کا مرید ہوتا ہے جو اس کے ہاں مبغوض اور اس کی ناراضی کا سبب ہیں مثلاً فسق وکفر، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ)(وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ) یہاں مقصود بندوں کی اپنے الہ سے محبت کا ذکر ہے، واضح ہو چکا کہ یہی اعمال ایمان کی اصل ہے اور امت کے سلف صحابہ وتابعین میں سے کسی کا اس میں اختلاف نہیں، وہ سب اس محبت کو اس کے ساتھ تحریک دیتے تھے جو اللہ نے مشروع کیا ہے کہ اس کے ساتھ شرعی عبادات کی انواع کو تحریک دی جائے جیسے ایمانی عرفان اور فرقانی سماع، فرمایا:

(وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ) [الشوری : ۵۲] (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو) آخرِ سورۃ تک، پھر مرورِ ایام سے معتزلہ وغیرہم سے متکلمین کے ایسے گروہ ظاہر ہوئے جو اس محبت کے منکر بنے اور بعض متصوفہ ایسے ہوئے جنہوں نے اسے سماعِ حدیث کی کئی (غیر شرعی) انواع کے ساتھ تحریک دینا چاہی مثلاً تغبیر (اہلِ بغداد نے ذکر بالجہر اور سماع کی محفلوں کو یہ نام دیا ہوا تھا) اور سماعِ مکاء وتصدیہ (یعنی ہاؤ ہو اور قوالیوں کی محافل) تو ایسے اقوال اور اشعار کا سماع کرنے لگے جن سے اس جنسِ حب کو تحریک ملے جو ہر دل میں موجود حب کو متحرک کرے، ایسی جو ہر نوع کی حب کو تحریک دے چاہے وہ اوثان کی محبت ہو یا صلبان (صلیب کی جمع، نصاریٰ پر تعریض ہے) کی یا اخوان، اوطان، مُردان (جن لڑکوں کی ابھی داڑھی مونچھ نہیں اُگی) اور نسوان کی اور جیسے یہ رحمٰن کی حب کو بھی تحریک دے لیکن جو مشائخ اس کے لئے حاضر ہو سکتے ہیں وہ اس کیلئے مکان، امکان اور خلان کی شرط لگاتے تھے اور کئی دفعہ اس کے لیے ایسے شیخ کو مشترط کرتے کہ جو شیطان سے حارس (چوکیدار) بنے! پھر ان کے غیر نے اس سلسلہ میں توسع اختیار کیا حتیٰ کہ معاصی کی کئی انواع کی طرف جا نکلے بلکہ فسوق بلکہ کئی تو کفرِ صریح تک جا پہنچے اس طور کہ ایسے اشعار پر وجد میں آنے لگے جن میں کفر والحاد ہے اور اسی کے بحسب ان کے لیے احوال پیدا ہوئے جیسا کہ مشرکین

اور اہلِ کتاب کے عُباد کے لیے ان کی عبادات اپنے حساب سے احوال پیدا کرتی ہیں، محققینِ مشائخ کا موقف یہ ہے جیسا کہ جنید نے کہا: (مَنْ تَكَلَّفَ السَّمَاعَ فُتِنَ بِهٖ وَ مَنْ صَادَفَهُ السَّمَاعُ اِسْتَرَاحَ بِهٖ) (یعنی جس نے کوشش کر کے سماع کیا [یعنی اس کا دلداہ ہوا] وہ فتنہ میں پڑا اور جس نے اتفاقاً کہیں سماع کر لیا وہ آرام میں ہوا) مطلب یہ کہ اس محدَث سماع کے لیے باقاعدہ اجتماع منعقد کرنا (محفلیں منعقد کرنا) مشروع نہیں اور نہ یہ مامور ہے اور نہ اسے دین کا حصہ اور تقرب کا ذریعہ بنالیا جائے، تقرب (کے طرق) اور عبادات وہی ہیں جو رسل صلوات اللہ علیہم سے اخذ کی گئیں تو جس طرح حرام وہی جو اللہ نے حرام کیا تو دین بھی وہی جو اللہ نے مشروع کیا، فرمایا:

(اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ) [الشوریٰ : ۲۱] (کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا) اسی لیے کہا:

(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ) [آل عمران : ۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا) تو اللہ سے ان کی محبت کو اپنے رسول کی اتباع کا موجب بنایا اور رسول کی اتباع کو اپنی ان سے محبت کا موجب کہا، ابی بن کعب کا قول ہے: تم اس راستہ اور سنت کو لازم پکڑے رکھو، جو کوئی اس راستہ اور سنت پر ہو کہ اللہ کا ذکر کرے تو اللہ کے خوف سے اس کی جلد کانپ جائے تو اس سے اس کی خطائیں جھڑ جائیں گی جیسے درخت سے سوکھے پتے جھڑتے ہیں اور کوئی اس راہ اور سنت پر نہ ہوگا مگر وہ خلوت میں اللہ کو یاد کرے تو اس کی آنکھیں بھیگ جائیں تو کبھی آگ اسے نہیں چھوئے گی اور اس راستہ اور سنت میں اقتصاد (یعنی حسبِ استطاعت دھیمے انداز میں چلتے رہنا) خلافِ سبیل وسنت اجتہاد (یعنی محنت کرنے اور خود کو تھکا لینے) سے بہتر ہے! پس حرص کرو کہ تمہارے اعمال۔ چاہے اقتصاداً ہوں یا اجتہاداً۔ انبیاء کے منہاج اور ان کی سنت پر ہوں، اس پر ایک جگہ مفصل بات کی ہے

تو اگر یہ مامور بہ اور مستحب ان اشیاء میں سے ہوتا جن کے ساتھ معبود محبوب کے لیے قلب کی اصلاح ہوتی ہے تو اس کے حق میں بالضرور شرعی دلائل ہوتے اور معلوم امر ہے کہ ان تینوں قرونِ فاضلہ میں جن کے بارے میں نبی اکرم نے کہا کہ سب سے بہتر میرا عہد جس میں میری بعثت ہوئی پھر جو اس کے بعد اور پھر جو اس کے بعد ہے، یہ نہ تھا، نہ حجاز میں اور نہ شام، یمن، عراق، مصر اور خراسان میں، اہلِ خیر و دین میں سے **ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو دلوں کی اصلاح کے لیے اس طرح کے مبتدَع سماع کی محفل سجاتا ہو،** اس کے برعکس ائمہ نے تو اسے مکروہ کہا ہے مثلاً امام احمد و دیگر نے، حتیٰ کہ شافعی نے اسے زنادقہ کے اِحداث میں سے شمار کیا جب کہا میں نے بغداد میں ایسی شیٔ دیکھی ہے جس کا زنادقہ نے احداث کیا ہے اور وہ اسے تغبیر کا نام دیتے ہیں اس کے ساتھ وہ لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں (یعنی بجائے تلاوت سنانے سننے کے اس کام پر لگا رکھا ہے) ہاں اگر کوئی بطورِ خاص یہ

نہ سنے اور نہ قصد واہتمام سے اس پر کان لگائے تو ائمہ کے بالاتفاق اس پر کوئی حکم مترتب نہ ہوگا، نہ نہی اور نہ ذم کا لہذا ذم اور مدح دراصل استماع پر مترتب ہے، نہ کہ سماع پر، تو قرآن کا مستمع (یعنی نیت اور قصد سے تلاوت سننے والا) ثواب کا حقدار ہے جبکہ بغیر قصد اور ارادہ کے اس کا سامع قابلِ ثواب نہیں کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے، اسی طرح جو منہی مَلا ہی ہیں تو اگر کوئی بلا قصد ان کا استماع (یا مشاہدہ) کرے تو یہ اس کے لیے ضار نہ ہوگا، اگر کوئی ایسا شعر سنے جو اس کے بعض حال کے مناسب ہے اور اس سے اس کا محمود ساکن متحرک اور اس کا محبوب مقیم اور منزعج (جز بز) ہوا یا اس نے بطورِ مثال اسے پڑھا تو یہ قابلِ گرفت نہیں (جیسے دینی مدارس کے نصاب میں ابوتمام کا حماسہ اور دیوانِ متنبّی اور دیگر شعراء کے عشقیہ اشعار شامل ہیں مگر وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ وسائل ہیں) اور یہ محمود اور حسن اس کے دل کی حرکت ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے اور یہ اللہ کے ہاں پسندیدہ فعل کرنے اور اسے ناپسند فعل کے ترک کو متضمن ہے (گویا جن نظموں اور اشعار کے سننے اور سنانے سے ایمان تازہ ہو اور جذبہ ایمانی کو مہمیز لگے ان میں حرج نہیں) جیسے کسی کے کانوں میں یہ شعر پڑا: (کُلَّ یَوْمٍ تَتَلَوَّنُ غَیْرُ ھٰذَا بِكَ اَجْمَلُ) (تم روزانہ بدل جاتے ہو؟ اس کا غیر تمہارے لئے یہ اچھا ہوگا)

تو اس سے اپنے مناسبِ حال اشارہ اخذ کیا تو اشاراتِ قیاس اعتبار اور ضرب الامثال کے باب سے ہیں، مسئلہ سماع ایک وسیع الاطراف موضوع ہے جس پر ہم نے ایک جگہ تفصیل سے بات کی ہے! یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ مریدین کے لیے مطلوبہ مقاصد ایمانی، قرآنی، نبوی، دینی اور شرعی سماع کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے ہیں جو کہ نبیوں عالموں، اہلِ معرفت اور مومنین کا سماع ہے، فرمایا:

(**اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ ۔۔۔خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِیًّا**) [مریم : ۵۸] (یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے فضل کیا اولادِ آدم میں سے۔۔۔تو یہ سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے) اور کہا:

(**اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا**) إلى قوله : (**وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا**) [الإسراء : ۱۰۷۔۱۰۹] (جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے جب وہ ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔۔۔اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں روتے جاتے ہیں اور اُس سے اُن کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے)

(**وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ**) [المائدة : ۸۳] (اور جب اس کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوئی تو تم دیکھتے ہو کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی)

(**اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ**

يَتَـوَكَّـلُوْنَ)[الأنفـال : ۲] (مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اُس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں)

(اَللّٰـهُ نَـزَّلَ اَحْسَـنَ الْـحَدِيْـثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ) [الزمر : ۲۳] (اللہ نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں، کتاب باہم ملتی جلتی اور دہرائی جاتی ہیں جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں) الآیۃ، جیسے اس دینی، شرعی، ایمانی اور قرآنی سماع پر متوجہ ہونے والوں کی مدح کی اسی طرح اس سے اعراض کرنے والوں کی ذم کی جیسے کہا:

(وَمِـنَ الـنَّـاسِ مَـنْ يَّشْتَـرِيْ لَهْـوَ الْـحَدِيْـثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا) إلى قوله : (وَاِذَا تُتْـلٰى عَـلَيْـهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ) [لقمٰن : ۶-۷] (اور لوگوں میں بعض ایسا ہے جو بیہودہ حکایتیں خریدتا ہے تاکہ بے سمجھے اللہ کے رستے سے گمراہ کرے اور اس سے ہنسی کرے یہی لوگ ہیں جن کو ذلت والا عذاب ہوگا۔ اور جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اکڑ کر منہ پھیر لیتا ہے گویا اُن کو سنا ہی نہیں جیسے اس کے کانوں میں بوجھ ہے تو اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو) اور کہا:

(وَالَّـذِيْـنَ اِذَا ذُكِّـرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا) [الفرقان : ۷۳] (اور وہ کہ جب ان کو رب کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے)

(فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ)[المدثر: ۴۹-۵۱] (ان کو کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں- گویا گدھے ہیں جو بدکے جا رہے ہے۔ **تیراندازوں** سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں)

(اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ)[الأنفال : ۲۲] (بے شک اللہ کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے) اور کہا:

(وَقَالَ الَّـذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ) [حم السجدة : ۲۶] (اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو اور شور مچا دیا کرو تاکہ تم غالب رہو) قرآن میں اس کا مثل کثیر ہے! تو یہ تھا امت کے سلف، نیک مشائخ اور ائمہ جیسے صحابہ وتابعین اور بعد والے مشائخ کا سماع، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، یوسف بن اسباط، حذیفہ مرعشی اور ان جیسوں کا (نہ کہ قوالیاں اور صوفیانہ کلام) حضرت عمر اکثر ابوموسی اشعری سے یہ کہہ کر تلاوتِ قرآن کی فرمائش کرتے تھے: اے ابوموسی ہمیں اپنے رب کی یاد کراؤ، وہ قرآت شروع کرتے اور صحابہ کرام وغیرہم سنتے اور روتے! صحابہ کرام جب کہیں جمع ہوتے تو اپنے میں سے کسی سے کہتے کہ قرآن کی تلاوت کرو اور باقی سنتے، صحیح میں ہے کہ نبی اکرم کا

حضرت عائشہؓ کے ہمراہ رات کو ابوموسیٰ کے گھر سے گزر ہوا، وہ اس وقت تہجد میں قرآن پڑھ رہے تھے، آپ کھڑے سنتے رہے اور فرمایا اسے مزامیر آل داود میں سے ایک مزمار عطا کیا گیا ہے، آپ نے صبح انہیں بتلایا کہ رات میں گزرا تو تمہیں قراءتِ قرآن میں لگا پا کر کھڑا سنتا رہا، انہوں نے عرض کی اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ آپ سن رہے ہیں تو مزید سجا اور سنوار کر پڑھتا، ایک حدیث میں ہے: (زَيِّنُوا الْقُرآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ) (اپنی آوازوں سے قرآن کو مزین کرو) اور فرمایا اللہ اچھی آواز والے قاریِ قرآن کی آواز پر اس سے زیادہ کان لگاتا ہے جتنا کوئی موسیقی اور راگ کا دلدادہ گانے پر کان لگائے، ایک روایت میں (بجائے عمومی انداز سے قاری کے ذکر کے) نبی کا ذکر ہے جو عمدہ آواز والا ہے اور باآوازِ بلند ترنم سے قرآن پڑھتا ہے، ایک حدیث میں کہا: (لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ) (ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کی تلاوت ترتیل۔ اچھی آواز سے۔ نہ کی)

اس **(قرآنی) سماع** کے لیے عظیم مواجید، کریم اذواق، مزید معارف اور جسیم احوال ہیں جو بیان نہیں ہو سکتے اور نہ انہیں احاطۂ تحریر میں لانا ممکن ہے جیسے قرآن میں تدبر اور تفہم سے مزید علم و ایمان عطا ہوتا ہے جس کا کوئی بیان احاطہ نہیں کرسکتا، یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں کہا ہے: (قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ الخ) (گزری) سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ عہدِ نبوی میں بعض حضرات نے ادعاء کیا کہ وہ اللہ کے محبّ ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو بیان کیا کہ اللہ سے محبت رسول کی اتباع کو موجب ہے اور رسول کی اتباع کا نتیجہ اللہ کی ایسے بندے سے محبت کرنے کی شکل میں نکلے گا اور اللہ نے اپنی محبت کا ادعاء کرنے والوں کا اس محبت کے ساتھ امتحان لیا ہے کیونکہ دعوی اور چیز ہے اور عمل اور چیز، منقول ہے کہ ذوالنون مصری کے پاس کچھ لوگوں نے مسئلہ محبت بارے کلام کی تو کہا یہ باتیں بند کرو ایسا نہ ہو کہ لوگ سنیں اور اس کا دعوی کریں (اور پورا نہ اتر پائیں) بعض کا قول ہے جس نے اللہ کی صرف محبت کے ساتھ عبادت کی (یعنی زبانی کلامی) وہ زندیق ہے اور جس نے اکیلے خوف کے ساتھ اللہ کی عبادت کی وہ خارجی ہے اور جس نے اکیلے رجاء کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ مرجئ ہے اور جس نے حب، خوف اور رجا تینوں کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ موحد مومن ہے اور یہ اس لیے کہ مجرد حب میں نفوس انبساط کی خو پر چلتے ہوئے اپنی اہواء میں توسع اختیار کر لیتے ہیں جب اللہ کی خشیت ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی حتی کہ یہود و نصاری نے اتراتے ہوئے کہہ دیا تھا:

(نَحْنُ اَبْنَاؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) [المائدۃ: ۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) مدعائے محبت میں شریعت کی ایسی مخالفت موجود ہوتی ہے جو اہلِ خشیت میں نہیں ہوتی اسی لیے اس آیت میں اس کے ساتھ خشیت کو مقرون کیا:

(هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ادْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ) [ق: ۳۲۔۳۴] (یہی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہر رجوع لانے والے حفاظت کرنے والے سے۔ جو اللہ سے بن دیکھے ڈرتا ہے اور رجوع کرنے والا دل لے کر آیا۔ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ یہ ہمیشہ رہنے کا دن

ہے) سنت میں تصنیف کرنے والے مشائخ عقائد کے ضمن میں بغیر خشیت بکثرت دعوائے محبت کرنے والوں اور اس میں خوض والوں کی مجانبت کا بھی ذکر کرتے ہیں اس وجہ سے جو اس کی وجہ سے ایسا فساد ہوا جس میں متصوفہ کے کئی لوگ واقع ہوئے اور جو ان میں اعتقاد واعمال کی خرابی واقع ہوئی جو بعض حضرات کی بالکلیہ ہی متصوفہ کے طریقہ کی اصل کے انکار کی موجب بنی حتی کہ منحرفین دوطرح کے لوگ ہوئے، ایک صنف جو قائل ہوئے کہ حق تصوف بھی ہے اور باطل تصوف بھی اور دوم جو حق وباطل سب کے منکر بنے جیسا کہ اہلِ کلام وفقہ کے کئی طوائف نے یہ موقف اختیار کیا

درست یہ ہے کہ جو اس میں کتاب وسنت کی موافقت ہے اس کا اقرار کیا جائے اور جو کتاب وسنت کے برخلاف باتیں ہیں ان کا انکار کیا جائے، فرمایا:(**قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ الخ**) تو ظاہراً اور باطناً نبی اکرم کی سنت اور شریعت کا اتباع ہی اللہ تعالی کی محبت کا موجب ہے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد، اس کے اولیاء سے موالات اور اس کے اعداء سے معادات اس کی حقیقت ہے جیسے ایک حدیث میں ہے: (اَوْثَقُ عُرَى الْاِيْمَانِ اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِيْ اللّٰهِ) (ایمان کی سب سے مضبوط کڑی اللہ کی خاطر محبت اور نفرت کرنا) ایک حدیث میں ہے جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے بغض کیا، اللہ کے لیے عطا کیا اور اللہ کے لیے روکا اس نے ایمان کا استکمال کر لیا، کثیر مدعیانِ محبت دوسروں سے بڑھ کر سنت کی اتباع، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ سے دور ہیں اس کے باوجود ان کا ادعاء ہے کہ وہ طریقِ محبت میں دوسروں سے اکمل ہیں اپنے اس زعم کی وجہ سے کہ اللہ کے لیے محبت کے طریق میں نہ غیرت ہوتی ہے اور نہ اللہ کے لیے غیض وغضب کرنا (بلکہ سب سے محبت) یہ کتاب وسنت کے مدلول کے برخلاف ہے اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت اللہ تعالی فرمائے گا میری خاطر محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ مجھے اپنے جلال کی قسم آج میں انہیں اپنا سایہ عطا کروں گا جب میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں تو قولہ:(اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ الخ) اس کی نشاندہی ہے جو دلوں میں اللہ کا اجلال اور اس کی تعظیم ہے مع اس کی خاطر باہمی محبت کے، اسی کے ساتھ وہ اس کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہوئے نہ کہ ایسے لوگ جو اپنے دلوں میں ضعفِ ایمان کے باعث اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے نہ بنے، انہی کے بارے میں ایک حدیث میں ہے:(حَقَّتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِي وَ حَقَّتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَحَقَّتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَ حَقَّتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ)(میری خاطر محبت کرنے والوں، ساتھ بیٹھنے والوں، ایک دوسرے سے ملنے والوں اور میری خاطر ایک دوسرے کا خیال رکھنے والوں کو میری محبت نصیب ہوئی) اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کا تعلق رکھنے والوں بارے کثیر احادیث ہیں

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت میں ہے کہ **سات قسم کے بندے ہیں جنہیں اللہ تعالی اپنا سایہ عطا فرمائے گا** جس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا: عادل حکمران، وہ شخص جس کی جوانی اللہ کی عبادت میں پروان چڑھی، وہ شخص جس کا دل مساجد میں معلق ہے (نماز پڑھ کر) نکلے تو چین نہ آئے حتی کہ پھر مسجد میں چلا جائے، دو ایسے آدمی جو اللہ کی محبت پر جمع

ہوئے اور اسی پر جدا ہوئے، وہ شخص جس نے صدقہ کیا اور ایسا مخفی رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ کیا ہے اور وہ شخص جسے خلوت میں اللہ کی یاد آئی تو اس کی آنکھیں بھرآئیں اور ایسا شخص جسے ایک خوبصورت اور حسب ونسب والی عورت نے دعوت دی تو کہا میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، محبت کی اصل اللہ تعالی کی معرفت ہے اور اس کے لیے دو اصول ہیں ایک : جسے عامہ کی محبت کہا جاتا ہے جو اللہ کے اپنے بندوں پر احسان کی رو سے ہے، اس اصل پر اس محبت کا کوئی منکر نہیں کہ قلوب اپنے ساتھ احسان کرنے والے سے محبت اور اساءت کرنے والے سے بغض کرنے پر مجبول ہیں اور اللہ بالحقیقت اپنے بندوں کے لیے منعم ومحسن ہے، وہ تمام نعم کے ساتھ متفضّل ہے اگرچہ یہ کسی واسطہ کے ساتھ ملیں تو واسطے اور وسیلے اسی نے بنائے ہیں، وہ مسبب الاسباب ہے لیکن یہ محبت اگر درحقیقت دل کے لئے خود اللہ کے ساتھ محبت کی طرف جاذب نہ بنے تو فی الحقیقت بندے نے محبت نہ کی مگر اپنے نفس سے، اسی طرح ہر جس نے کسی شئ سے محبت کی اس کے اپنے ساتھ احسان کی وجہ سے تو درحقیقت اس نے محبت نہ کی مگر اپنے آپ سے اور یہ مذموم نہیں بلکہ محمود ہے، اسی محبت کی طرف نبی اکرم نے اپنے اس فرمان میں اشارہ کیا جب کہا:(اَحِبُّو اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ بِہٖ مِنْ نِعْمَۃٍ وَ اَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰہِ وَ اَحِبُّوْا اَھْلِیْ بِحُبِّیْ) (اللہ سے محبت کرو اس رو سے جو اس نے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں اور مجھ سے اللہ کی وجہ سے محبت کرو اور میرے اہلِ بیت سے میری وجہ سے) اس محبت پر اقتصار کرنے والے نے اللہ کی جہت سے اس امر کی معرفت نہ کی جو اسے اس کی جانب سے محبت کا مستوجب بنائے ما سوائے اس کے اپنے پر احسان کرنے کے اور یہ جیسے بعض نے کہا کہ اللہ کی حمد دو انواع پر ہے : ایک وہ جو کہ شکر ہے اور یہ نہیں ہوتی مگر اس کی نعمت پر اور دوم وہ جو اس کی مدح وثناء اور اس سے محبت ہے اور یہ ان صفات کی وجہ سے جن کا اللہ سبحانہ اپنے آپ کے لئے مستحق ہے تو اسی طرح حب ہے

تو اس میں اصلِ ثانی اس سے اس وجہ سے محبت کرنا جس کا وہ اہل ہے اور یہ اس کی محبت ہے جس نے اللہ کی ایسی معرفت حاصل کی کہ جس کی وجہ سے وہ محبت کئے جانے کا مستحق ہے، وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں جن کی رو سے اللہ کی معرفت ملتی ہے ان میں سے جن پر اس کے اسماء وصفات دال ہیں مگر وہ اس وجہ سے محبت کاملہ کا مستحق ہے حتی کہ اپنے سب مفعولات کی جہت سے بھی کیونکہ اس کی طرف سے ہر نعمت فضل اور ہر نقمت (یعنی سزا اور آزمائش) عدل ہے لہذا مستحق ہے کہ ہر حال پر وہ قابلِ حمد ہو چاہے سراء ہو یا ضراء اور یہ اعلی واکمل ہے اور یہ خواص کی محبت ہے! یہی ہیں جو اس کے چہرہِ اقدس کے دیدار کے طالب ہوں گے اور اس کے ذکر ومناجات کے ساتھ متلذذ ہیں اور یہ ان کے لیے اس سے بڑھ کر ہے جو مچھلی کے لیے پانی کی حیثیت ہے حتی کہ اگر ان کے لیے اس سے انقطاع لاحق ہو تو ایسے الم سے دوچار ہوں جسے سہہ نہیں سکتے اور یہی سابقین ہیں جیسا کہ مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم کا حمدان نامی ایک پہاڑ سے گزر ہوا تو کہا چلتے رہو یہ حمدان ہے، مفردین سبقت لے گئے ،عرض کی

یا رسول اللہ مفردون کون ہیں؟ فرمایا اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد وخواتین، دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا :(اَلْـمُسْتَهْتِـرُوْنَ بِـذِكْرِ اللّٰهِ يَضَعُ الذِّكْرُ عَنْهُمْ اَثْقَالَهُمْ فَيَأْتُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِفَافاً) (اللہ کے ذکر کے خوگر قیامت کے روز ہلکے پھلکے آئیں گے، یہ ذکران سے [گناہوں کے] بوجھ ختم کردے گا) مستہتر سے مراد جو کبھی ذکر کرنے میں کوفت کا شکار نہیں ہوتا اور نہ تھکتا ہے بلکہ ذکر میں وہ آسودہ اور خوش رہتا ہے، ہارون بن عنترہ عن ابیہ عن ابن عباس سے روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے عرض کی اے رب تیرا کون سا بندہ تجھے زیادہ محبوب ہے؟ کہا جو میرا ذکر کرتا ہے اور مجھے بھولتا نہیں، عرض کی کون اعلم ہے؟ فرمایا جو لوگوں کے علم کی اپنے علم کی طرف طلب کرے تاکہ ایسا کلمہ پائے جو اسے ہدایت کی رہنمائی دے یا ردیٰ (گناہ) سے اسے باز رکھے، کہا تیرا کون سا بندہ اَحکم ہے؟ فرمایا جو اپنے آپ پر بھی اس طرح کا فیصلہ لگائے جو اپنے غیر پر لگاتا ہے اور اپنے غیر کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے! تو اس حدیث میں حب، علم اور عدل کا ذکر ہے اور یہ خیر کا خلاصہ (اور لبِ لباب) ہے

یہ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کی محبت کے باب میں وہ گمان وظن کرنے کی ضرورت نہیں جو اس کے غیر کی محبت کے ضمن میں کہا جاتا ہے، تجنی (یعنی زیادتی) ہجر اور بغیر کسی سبب کے قطع تعلقی وغیرہ ان امور میں سے جن میں کئی لوگوں کو لغزش لگی حتیٰ کہ وہ اس کی حب میں اسی کی جنس کے ساتھ تمثل کرتے ہیں جس کے ساتھ اس کی حب میں کرتے ہیں جو بغیر کسی جرم کے قطع تعلقی اور بے گانگی اختیار کرتا ہے یا اپنی طرف متقرب سے دور ہو (یعنی لوگوں کی باہمی محبت پر قیاس کرتے ہیں) اس غلطی میں کئی مصنفین واقع ہوئے ہیں حتیٰ کہ ان کی کلام کا مضمون اللہ پر حجت کی اقامت ہے حالانکہ اللہ کے لیے بالغ حجت ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے اپنے دل میں مجھے یاد کیا میں بھی اپنے دل میں اسے یاد کرتا ہوں اور جس نے برسرِ مجلس میرا ذکر کیا تو میں اس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور جو بالشت بھر میرے قریب ہوا میں گز بھر اس سے قریب ہوتا ہوں اور جس نے گز بھر میرا قرب حاصل کیا میں باع (یعنی دو بازو کے پھیلاؤ کے) بھر اس سے قریب ہوتا ہوں اور جو چلتا ہوا میری طرف آیا میں دوڑتا ہوا اس کی طرف آتا ہوں، بعض آثار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا ذکر کرنے والے میرے ہم مجلس ہیں اور میرا شکر کرنے والے میرے ملاقاتی ہیں اور میرے اہلِ طاعت میرے اہلِ کرامت ہیں اور میں تو اپنی معصیت کرنے والوں کو بھی اپنی رحمت سے مایوس نہ کروں گا، اگر تو بہ کرلیں تو میں ان کا حبیب بن جاؤں گا اس لیے کہ اللہ توابین سے محبت کرتا ہے اور اگر تو بہ نہ کی تو میں ان کا طبیب ہوں، انہیں مصائب میں مبتلا کروں گا تاکہ معائب سے انہیں پاک کردوں، فرمایا:

(وَمَـنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا) [طٰه : ۱۱۲] (اور جو نیک کام کرے گا اور مومن بھی ہوگا تو اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا) مفسرین نے کہا ظلم یہ ہے کہ اس کے کھاتہ میں دوسروں کی سیآت ڈال دی جائیں اور ہضم یہ ہے کہ اس کی حسنات میں سے کچھ اس کے نامہ اعمال میں شامل نہ کی جائیں، فرمایا:

(وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ)[النحل : ۱۱۸] (اور ہم نے اُن پر کچھ ظلم نہیں کیا بلکہ وہی اپنے آپ پرظلم کیا کرتے تھے) حضرت ابو ذر سے مروی ایک صحیح حدیث میں ہے نبی اکرم نے کہا اللہ تعالی فرماتا ہے اے میرے بندو میں نے اپنے آپ پرظلم کوحرام کیا ہے تو تمہارے درمیان بھی اسے حرام کرتا ہوں، اے بندو ایک دوسرے پرظلم نہ کرنا، تم سب گمراہ ہو مگر جسے میں ہدایت دوں پس مجھ سے ہدایت مانگو تمہیں دوں گا، اسے میرے بندو تم سب بھوکے ہو مگر جسے میں کھلاؤں پس مجھ سے طعام مانگو تمہیں کھلاؤں گا، اے بندو تم سب ننگے ہو مگر جسے میں پہناؤں پس مجھ سے لباس مانگو تمہیں پہناؤں گا، اے میرے بندو تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں اور مجھے پروا نہیں پس مجھ سے گناہوں کی بخشش مانگتے رہو میں معاف کردوں گا، اے بندو تم کبھی بھی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ تم مجھے کوئی نفع دے سکتے ہو، اے میرے بندو اگر تمہارے اگلے پچھلے، تمہارے انس وجن سب کے سب تم میں سے متقی ترین شخص کی مثل بن جائیں تو اس سے میری بادشاہی میں کچھ اضافہ نہ ہوگا اور اگر یہ سب فاجر ترین شخص کی مثل بن جائیں تو اس سے میری بادشاہی میں کچھ کمی نہ آئے گی

اے میرے بندو اگر تمہارے اول وآخر اور تمہارے انس وجن ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور ہر کوئی جو چاہے مجھ سے مانگے اور میں سب کی طلب پوری کردوں تو اس سے میری بادشاہی میں کوئی کمی نہ آئے گی مگر اتنی ہی جیسے کوئی سمندر میں سوئی ڈال کر نکالے تو جتنی اس سے سمندر میں کمی آئے گی، اے میرے بندو میں تمہارے اعمال کا تمہارے لیے حساب رکھ رہا ہوں پھر تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا تو جو خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو اس کا غیر پائے وہ سوائے اپنے آپ کے کسی کو ملامت نہ کرے، اسی سے جو بخاری نے شداد بن اوس سے اپنی صحیح میں روایت کیا کہ نبی اکرم نے فرمایا سید الاستغفار یہ کلمات ہیں :

(اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) (اے اللہ تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی الہ نہیں اور میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے عہد اور وعدہ پہ ہوں اپنے حسبِ استطاعت، میں اپنے فعل کے شر سے تیری پناہ کا طالب ہوں اپنے پر تیری نعمت کا مقر ہوں پس میری مغفرت فرما کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کی معافی نہیں دے سکتا) فرمایا جس نے ایقان کے ساتھ نمازِ فجر کے بعد اسے پڑھا پھر اسی دن فوت ہوگیا تو وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے ایقان کے ساتھ نمازِ مغرب کے بعد اسے پڑھا پھر اسی رات فوت ہوگیا تو وہ جنت میں داخل ہوا، تو بندہ ہمیشہ اللہ کی نعمتوں کے سائے میں جیتا ہے لہذا اسے مسلسل شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے اور ہر گناہ کے وقت استغفار کا محتاج ہے، بندے کی یہ دونوں حالتیں اس کا لازمہ ہیں، نہ اللہ کی نعمتوں کی کوئی انتہا ہے (سانس کی آمد ورفت بھی تو اس کی بڑی نعمت ہے) اور نہ بندے کی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کی کوئی انتہاء ہے لہذا ہر وقت اسے توبہ واستغفار اور شاکر رہنے کی ضرورت ہے اسی لیے سیدِ اولادِ آدم امام المتقین

حضرت محمد تمام احوال میں استغفار کرتے رہتے تھے، بخاری کی نقل کردہ ایک صحیح روایت میں فرمایا اے لوگو اپنے رب کی طرف توبہ کرنے والے بنو، میں ایک دن میں ستر سے زائد مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں، مسلم کی روایت میں ہے کہ میرے دل میں بھی کئی دفعہ خیالات کی بھرمار ہوجاتی ہے اور میں دن میں سومرتبہ استغفار کرتا ہوں، عبداللہ بن عمر کہتے ہیں ہم ایک ہی مجلس میں نبی اکرم کے استغفار کو شمار کرتے تھے، آپ (رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ) سوسومرتبہ کہتے اسی لیے خواتیم الاعمال میں استغفار مشروع ہے، فرمایا: (وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ)[آل عمران : ۱۷] (اور اوقاتِ سحر میں گناہوں کی معافی مانگا کرتے ہیں) بعض کا قول ہے: رات کا نماز کے ساتھ احیاء کیا پھر جب وقتِ سحر ہوتو استغفار کا حکم دئے گئے، صحیح میں ہے نبی اکرم جب نماز سے پھرتے تو تین مرتبہ استغفار کرتے (یعنی اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کہتے) پھر کہتے: (اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ) فرمایا:

(فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِالْحَرَامِ) إلی قوله : (وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌرَّحِیْمٌ) [البقرۃ : ۱۹۸۔۱۹۹] (پس جب تم عرفات سے واپس آ ؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔۔۔اور اللہ سے بخشش مانگو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے) اللہ نے اپنے نبی کو بعد اس کے کہ تبلیغِ رسالت کردی اور اس کی راہ میں جہاد کا حق ادا کردیا اور اللہ کے دین کا بول بالا کردیا حکم دیا:

(اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُوَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا) [النصر : ۱۔۳] (جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح ہوئی۔اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں۔ تو پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے) آپ توحید واستغفار کے ساتھ دین کے قوام تھے جیسے اللہ نے کہا:

(الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا) [ھود : ۱۔۳] (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور اللہ حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کردی گئی ہیں۔کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور میں اس کی طرف سے تمہیں ڈر سنانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو اور اس کے آگے توبہ کرو وہ تمہیں ایک وقت مقرر تک متاعِ نیک سے بہرہ مند کرے گا) اور کہا :

(فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْہِ وَاسْتَغْفِرُوْہُ) [حم السجدۃ : ٦] (تو سیدھے اسی کی طرف رہو اور اسی سے مغفرت مانگو) اور کہا:

(فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) [محمد : ۱۹] (پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا

کوئی معبود نہیں اور اپنے لئے استغفار کرو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے بھی) ایک حدیث میں ہے کہ شیطان کہتا ہے میں نے لوگوں کو ذنوب کے ساتھ ہلاک کر ڈالا جبکہ انہوں نے لا الہ الا اللہ اور استغفار کے ساتھ مجھے ہلاک کر دیا، حضرت یونس نے یوں کہا:

(لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) [الأنبياء : ٨٧] (تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بے شک میں قصور وار ہوں) نبی اکرم جب سوار ہوتے تو اللہ کی حمد کرتے پھر تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے پھر کہتے: (لَا اِلٰـــــهَ اِلَّا اَنْـــــتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ)- وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ سَلَّمَ

شیخ الاسلام کی ایک تحریر:

فصل: دلوں کے مرض اور ان کی شفا بارے

خطبہ مسنونہ کے بعد، اللہ تعالی نے منافقین بارے کہا:

(فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا) [البقرة : ١٠] (ان کے دلوں میں مرض ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا) اور کہا:

(لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِی الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ) [الأنبياء : ٥٣] (تاکہ جو شیطان ڈالتا ہے اُس کو اُن لوگوں کیلئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں ذریعہ آزمائش ٹھہرائے)

(لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا) [الأحزاب : ٦٠] (اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو بُری بُری خبریں اڑایا کرتے ہیں سے باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن)

(وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا) [المدثر: ٣١] (اور اہلِ کتاب اور مومن شک نہ لائیں اور اس لئے کہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور کافر کہیں کہ اس مثال سے اللہ کا مقصود کیا ہے؟)

(قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ) [يونس: ٥٧] (تمہارے پاس رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنوں کیلئے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے)

(وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا) [الإسراء : ٨٢] (اور ہم قرآن سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کیلئے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے)

(وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ) [التوبة : ١٤-١٥] (اور مومنوں کے سینوں کو شفا بخشے

گا۔اور ان کے دلوں سے غصہ دُور کرے گا) بدن کا مرض اس کی صحت وصلاح کا عکس ہے، یہ فساد اور خرابی ہے اس کی رو سے اس کے ادراک اور طبیعی حرکت میں خرابی درآتی ہے تو یا تو اس کا ادراک ختم ہوجاتا ہے مثلاً اندھا پن اور بہرا پن اور یا وہ اشیاء کا ان کی حقیقت کے برخلاف ادراک کرنے لگتا ہے مثلا کہ میٹھا کڑوا پائے اور مثلاً ایسی اشیاء کا تخیل کرے جن کا خارج میں وجود نہ ہو! جہاں تک اس کی طبعی حرکت کا فساد وخرابی تو مثلاً کہ اس کی قوتِ ہاضمہ کمزور پڑ جائے یا ان غذاؤں سے کراہت محسوس کرنے لگے جو انسانی حیات کی بقاء کے لیے لازمی ہیں اور ان اشیاء کو پسند کرنے لگے جو نقصان دہ ہیں اور اس کے بحسب پھر اس کے لیے آلام حاصل ہوں لیکن اس مرض کے ساتھ اس کی موت وہلاکت واقع نہیں ہوتی بلکہ اس میں فی الجملہ ارادی حرکت کے ادراک پر ایک نوعِ قوت ہے تو اس سے بدن میں الم کا حصول ہوجاتا ہے یا تو فسادِ کمیت کے سبب یا فسادِ کیفیت کے بسبب،تو اول یا تو نقصِ مادہ ہے تب اسے غذا کی ضرورت ہے یا پھر اس کی زیادت ہے تب استفراغ (یعنی اضافی قوت کے اخراج) کامحتاج ہے اور ثانی جیسے حرارت اور برودت میں قوت جو حدِ اعتدال سے خارج ہو تب دواؤں سے اس کا علاج کرنا ہوگا۔

فصل

اسی طرح دل کی مرض ہے جو ایک نوعِ فساد ہے جو اس کے لیے حاصل ہوتا ہے جس کی رو سے سے اس کا تصور اور ارادہ فاسد ہوجاتا ہے تو صورتوں کا فساد اس کے لیے عارض شبہات کی بناء پر، حتی کہ اسے حق نظر نہیں آتا یا وہ اسے اس کی حقیقت کے برخلاف دیکھتا ہے، ارادہ کی خرابی اس طرح کہ وہ حقِ نافع سے بغض اور باطلِ ضار سے محبت کرنے لگتا ہے اسی لیے کبھی مرض کو شک وریب کے ساتھ مفسر کیا جاتا ہے جیسے مجاہد اور قتادہ نے قولہ:(فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَرَضٌ) کی تفسیر میں کہا:(اَیۡ شَكٌّ) اور کبھی شہوتِ زنا کے ساتھ جیسے قولہ:(فَیَطۡمَعَ الَّذِیۡ فِیۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ) [الأحزاب : ۳۲] (کہ مبادا وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے طمع لگا لے) کی تفسیر میں کہا گیا،اسی لیے خرائطی نے (اعتلال القلوب) کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی،اعتلال یعنی مرض اور اس سے ان کی مراد شہوت کی بیماری ہے مریض کو اس کی ایسی ایذاء ہے جو تندرست کو نہیں تو اسے معمولی سردی،گرمی اور ذرا سی مشقت بھی نقصان دیتی ہے اور اسی جیسے امور جن پر وہ مرض کے سبب اپنے ضعف کی وجہ سے قوی نہیں ہوتا، فی الجملہ مرض مریض اور اس کی قوتوں کو کمزور کردیتا ہے اب اس میں وہ کچھ سہنے کی تاب نہیں ہوتی جو ایک قوی وتندرست آدمی میں ہوتی ہے،صحت کی حفاظت بالمثل ہے جبکہ وہ بالضد زائل ہوجاتی ہے جبکہ مرض اپنے سبب کے مثل کے ساتھ قوی ہوتا جاتا اور اپنی ضد کے ساتھ زائل ہوتا ہے تو جب مریض کے لیے اس کے مرض کے سبب کا مثل حاصل ہو تو اس کے مرض میں اضافہ ہوجاتا اور اس کی قوت کا ضعف بڑھ جاتا ہے حتی کہ بسا اوقات اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے اور اگر اس کے لیے وہ کچھ حاصل ہو جس سے قوت کی تقویت اور مرض کا ازالہ ہو تو نتیجہ اس کے بالعکس ہوگا

دل کی مرض ایک الم ہے جو دل میں حاصل ہوتی ہے مثلا غالب آئے دشمن سے غیظ، تو اس سے دل کو الم ہے، فرمایا

:(وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ) تو ان کی شفاء دل میں حاصل الم کے زوال کے ساتھ ہے، کہا جاتا ہے:(فُلَانٌ شُفِيَ غَيْظُهٗ) (یعنی فلاں کا غصہ دور ہوا) اور مثلاً:(فِي الْقَوْدِ اِسْتِشْفَاءُ اَوْلِيَاءِ الْمَقْتُوْلِ) (قصاص میں مقتول کے لواحقین کے غم و غصہ کا دفع ہے) ونحوہ، تو یہ غم، غیظ اور حزن سے شفاء یعنی خلاصی ہے، یہ سب آلام نفس میں حاصل ہوتے ہیں اور اسی طرح شک اور جہل ہے جو دل کے لیے مولم ہے، نبی اکرم نے ایک موقع پہ فرمایا تھا:(هَلَّا سَأَلُوْا اِذَا لَمْ يَعْلَمُوْا فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعَيِّ السُّوَالُ) (جب علم نہ تھا تو کیوں نہ پوچھ لیا؟ کہ عجز کی شفا سوال ہے) کسی شئ میں شاک اس بارے مرتاب ہے، اس کا دل متألم ہوتا ہے تا آنکہ اسے علم ویقین حاصل ہو، اس عالم بارے جو مبینِ حق جواب دے کہا جاتا ہے: (قَدْ شَفَانِيْ بِالْجَوَابِ)(یعنی شافی جواب سے نوازا) مرض موت سے کمتر ہے تو دل جہلِ مطلق کے ساتھ مرجاتا ہے جبکہ ایک نوعِ جہل کے ساتھ بیمار ہوجاتا ہے تو اس کے لیے موت مرض، حیات اور شفاء کی حالتیں ہیں، اس کی حیات وموت اور مرض وشفاء بدن کی ان حالتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، دل بیمار ہوجاتا ہے جب اس پر کوئی شبہ وارد ہو اور شہوت اس کے مرض کو قوی کرتی ہے اور اگر اس کے لیے حکمت وموعظت حاصل ہو تو یہ اس کی صلاح وشفاء کے اسباب سے ہے، فرمایا:

(لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ) [الحج : ۵۳] (تا کہ جو شیطان ڈالتا ہے اُس کو اُن لوگوں کیلئے جن کے دلوں میں بیماری ہے آزمائش ٹھہرائے) اس لیے کہ یہ ان کے نزدیک شبہ کا مورِث بنا، سنگ دل اور نرمی سے خالی تو ان کے دل مرض کے سبب ضعیف ہو چکے ہیں تو اس حال میں شیاطین کا القاء ان کے لیے بڑی آزمائش ثابت ہوتا ہے ان کے قلوب ایمان سے قاسی تھے تو وہ ان کے لیے فتنہ بنا، فرمایا:

(لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ) [الأحزاب : ٦٠] (اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو بُری بُری خبریں اڑایا کرتے ہیں سے باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے) جیسے کہا:

(وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ) (ابھی گزری) ان کے دل (ابھی) مردہ نہیں ہوئے جیسے کفار ومنافقین کے ہو چکے اور نہ ہی انہیں صحیح کہا جا سکتا ہے جیسے خالص مومنین کے قلوب ہیں بلکہ ان میں شبہات اور شہوات کی امراض ہیں، اور اسی طرح:(فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ) یہ شہوت کی مرض ہے، قلبِ صحیح کے لیے اگر کوئی عورت متعرض ہو تو وہ اس کی طرف التفات نہ کرے گا بخلاف شہوت کی بیماری میں مبتلا دل کے کہ وہ اپنے ضعف کی وجہ سے اس کی طرف مائل ہوگا لہٰذا حکم ہوا کہ (عورتیں اپنی) آواز کو درشت رکھیں تا کہ ایسے بیمار دل والے لوگ کسی طمع میں نہ رہیں، قرآن صدور کی بیماریوں کے لیے شفاء اور اکسیر کا درجہ رکھتا ہے اور ان کے لیے جن کے دلوں میں شبہات وشہوات کے امراض ہیں تو اس میں ایسی بینات ہیں جو حق کی باطل سے پرکھ کرتی ہیں تو علم

تصور وادراک کے لئے مفسد شبہ کے امراض کا ازالہ کرتا ہے اور نتیجۃً یہ اشیاء کو ان کی حقیقت پر ہی دیکھنے لگے گا اور اس میں ترغیب اور ترہیب اور ان قصص کے ساتھ جن میں عبرت کا سامان ہے جو دل کی درستی کی موجب ہیں، نیز حکمت اور موعظتِ حسنہ ہے تو دلوں میں نافع امور کی ترغیب اور ضار سے بے رغبتی کا مادہ پیدا کرتا ہے تو دل رشاد کا محبّ اور غیّ (گمراہی) کا مبغض بن جاتا ہے بعد اس کے کہ غیّ کا مرید اور رشاد کا مبغض تھا، تو قرآن فاسد ارادات کا موجب بننے والے امراض کا ازالہ کرتا ہے حتی کہ دل درست ہو جاتا ہے تو یوں اس کا ارادہ بھی درست ہو جاتا ہے اور اس فطرت کی طرف پلٹ آتا ہے جس پر اسے مفطور کیا گیا جیسے علاج سے بدن اپنی طبیعی حالت کی طرف پلٹ آتا ہے، قرآن اور ایمان سے وہ غذا ملتی ہے جس سے اس کا تزکیہ ہوتا ہے جیسے بدن کو جب موزوں اور موافق غذا ملے تو وہ نموّ پاتا اور تقویت حاصل کرتا ہے تو دل کی زکاۃ بدن کی نماء کی مثل ہے، لغت میں زکاۃ (کا معنی) نماء (یعنی بڑھوتی) اور زیادت فی الصلاح ہے (یعنی درستگی میں اضافہ) کہا جاتا ہے: (زَكَا الشَّيْءُ إِذَا نَمَا فِي الصَّلَاحِ) تو دل محتاج ہے کہ متربی (یعنی روز بروز اچھائی میں آگے بڑھے) تو نتیجہ میں نمو پائے اور اس کی درستگی میں اضافہ ہو حتی کہ وہ کامل اور صالح ہو جائے جیسے بدن محتاج ہوتا ہے کہ اسے موزوں غذائیں ملیں تا کہ اس کی مناسب نشوونما ہو، اس کے ساتھ ساتھ نقصان دہ موانع کا ازالہ بھی ضروری ہے تو بدن نمو نہیں پاتا مگر ایسی اشیاء کے اعطاء کے ساتھ جو اس کے لیے نافع ہیں اور ان اشیاء کو اس سے دور کر کے جو اس کے لیے ضار ہوں اور یہی معاملہ دل کا ہے تو اس کی زکاء و نماء اور صلاح تبھی تام ہوگی جب اس کے لیے نافع کا حصول اور ضار کی اس سے دوری ہوگی

دیگر اشیاء مثلاً زراعت کی نشوونما کا بھی یہی ضابطہ ہے اسی طرح فواحش اور معاصی کے ترک کے ساتھ بھی دل زکاء پاتا ہے تو یہ بدن میں موجود ردی اخلاط (یعنی نقصان دہ رطوبتوں) کے بمنزلہ ہیں اور جیسے کھیتی میں جھاڑ جھنکاڑ ہو تو جب بدن ان ردی اخلاط سے متفرغ کر دیا جائے جیسے (سنگی کے ذریعہ فاسد اور) زائد خون نکال دیا جاتا ہے تو قوتِ طبیعیہ متخلص اور مستریح ہو جاتی ہے تو بدن نمو پاتا ہے، اسی طرح دل ہے جس کی نمو اور صلاح حصولِ نافع اور دفعِ ضار کے ساتھ ہے، جب صدقہ گناہوں اور خطاؤں کو اس طرح مٹا ڈالتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دے تو دل اس کے ساتھ زکاء پاتا ہے اور اس کی زکاۃ گناہوں سے اس کی طہارت پر ایک معنی زائد ہے، اللہ نے فرمایا:

(خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا) [التوبة : ۱۰۳] (ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کر لو کہ اس سے تم اُن کو پاک اور پاکیزہ کرتے ہو) اسی طرح فواحش اور معاصی کا ترک بھی دل کی زکاۃ ہے تو معاصی بدن کے ردی اخلاط کی مثل ہوتے ہیں، بدن کے ان سے استفراغ سے طبیعی قوت متخلص و مستریح ہو جاتی ہے جو بدن کی نماء کا باعث بنتا ہے اسی طرح جب بندہ ذنوب سے تائب ہو تو دل اپنی تخلیطات (آلودگیوں) سے مستفرغ ہو جاتا ہے، جب اچھے اور برے اعمال کا اختلاط ہو تو گناہوں سے

تائب ہونے کی صورت میں دل کی قوت اور اس کا ارادہ اعمالِ صالحہ کے لیے متخلص ہوجاتا ہے اور ان فاسد حوادث سے مستریح ہوجاتا ہے جو اس میں تھے، تو خلاصہِ کلام یہ ہے کہ دل کی زکاۃ اس طور پر ہے کہ وہ (اچھائی میں) بڑھے اور کمال کی طرف مرتقی ہو، فرمایا:

(وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا) [النور: ۲۱] (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہوسکتا)

(وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ) [النور: ۲۸] (اور اگر یہ کہا جائے گا لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے)

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا) [والشمس: ۹-۱۰] (کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک رکھا۔ اور جس نے اسے آلودہ کیا وہ خسارے میں رہا)

(وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى) [عبس: ۳] (اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرے)

(فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى) [والنازعات: ۱۸-۱۹] (اور کہو کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہوجائے؟۔ اور میں تجھے تیرے رب کا راستہ بتاؤں تا کہ تجھ کو خوف ہو) تو اگر چہ تزکیہ کی اصل نماء، برکت اور خیر کی کثرت ہے مگر اس کا حصول شرک کے ازالہ سے ہوتا ہے اسی لیے تزکّی دونوں کا جامع ہے نیز فرمایا:

(وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ) [حم السجدة: ۶-۷] (اور مشرکوں کے لئے ہلاکت ہے۔ جو زکاۃ نہیں دیتے) اور یہ توحید اور ایمان جس کے ساتھ دل پاکیزہ بنتا ہے تو یہ دل سے حق تعالی کے ما سوا کے لئے نفیِ الوہیت اور دل میں حق کی الوہیت کے اثبات کو متضمن ہے اور یہ (لا الہ الا اللہ) کی حقیقت ہے اور اس کی اصل ہے جس کے ساتھ دلوں کی زکاۃ ہے، تزکیہ (کا معنی) شئ کو زکی بنانا، یا تو اس کی ذات میں اور یا اعتقاد اور خبر میں جیسے کہا جاتا ہے: (عَدَّلْتُهٗ) جب تم نے اسے فی نفسہ عادل باور کیا یا لوگوں کے اعتقاد میں، فرمایا: (فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ) [والنجم: ۳۲] یعنی اپنے نفس کی زکاۃ کی خود ہی خبر نہ دیتے پھرو کہ وہ بہت متقی، پرہیزگار اور نیک ہیں اور یہ اس قولہ کا غیر ہے: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا) اسی لئے اس کے بعد کہا: (هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى) ام المؤمنین حضرت زینب کا اصل نام بَرۃ تھا تو کہا گیا: (تُزَكِّيْ نَفْسَهَا) (یعنی خود کا تزکیہ کرتی ہیں/ نیک سمجھتی ہیں) اس پر نبی اکرم نے تبدیل کر کے زینب کر دیا، جہاں تک قولہ:

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ) [النساء: ۴۹] (کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے) یعنی جسے زا کی بنائے اور اس کی زکاۃ کی خبر دے جیسے مزکی (یعنی تزکیہ کرنے والا/ اچھے چال چلن کی ضمانت دینے والا) گواہوں کی زکاۃ کی خبر دیتے ہوئے ان کے عادل

ہونے بارے آگاہ کرتا ہے، عدل اعتدال ہے اور اعتدال قلب کی صلاح ہے جیسے ظلم اس کا فساد اور خرابی ہے اسی لیے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کو (قرآن میں) (ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ) کہا گیا اور ظلم خلافِ عدل ہے، ایسے شخص نے خود کے ساتھ عدل اور انصاف نہیں کیا بلکہ ظلم کیا تو دل کی صلاح عدل میں اور اس کا فساد ظلم میں ہے، بندہ جب اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے تو وہ ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی، اسی طرح جب عدل کرے تو وہ عادل بھی ہے اور معدول علیہ بھی تو اسی سے عمل ہے اور اس کو ہی اس کا فائدہ، جزا اور ثمرہ ملنا ہے اچھا عمل کرے گا تو اچھا بدلہ پائے گا اور برا عمل کرے گا تو اسی طرح کا بدلہ ہوگا، فرمایا:

(لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ) [البقرة : ۲۸۶] (کوئی اچھے کام کرے گا تو اُس کو اُن کا فائدہ ملے گا اور بُرے کرے گا تو اُسے اُن کا نقصان پہنچے گا) عمل کا اثر خارج سے قبل دل میں ہوتا ہے، نفع ہو یا ضرر یا صلاح تو اس کی صلاح اس کے لیے عدل سے کام لینا اور اس کا فساد اس پر ظلم کرنا ہے، فرمایا:

(مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا) [حم فصلت: ۴۶] (جو نیک کام کرے گا تو اپنے لئے اور جو بُرے کرے گا تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا) اور:

(اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا) [الإسراء : ۷] (اگر تم نیکی کرو گے تو اپنی جانوں کیلئے کرو گے اور اگر اعمالِ بد کرو گے تو وبال بھی تمہاری ہی جانوں پر ہوگا) بعض سلف کا قول ہے کہ نیکی کا دل میں ایک نور ہوتا ہے اور بدن میں قوت، چہرے پر رونق، رزق میں فراخی اور لوگوں کے دلوں میں نیک آدمی کی محبت ڈال دی جاتی ہے جبکہ برائی اور گناہ کے لئے دل میں ظلمت، چہرے پر سیاہی، بدن میں کمزوری اور رزق میں کمی ہوتی ہے اور خلقِ خدا کے دل میں ایسے کے لیے نفرت ڈال دی جاتی ہے، فرمایا:

(كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ) [والطور: ۲۱] (ہر شخص اپنے اعمال میں پھنسا ہوا ہے)

(كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ) [المدثر: ۳۸] (ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے)

(وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا) [الأنعام : ۷۰] (اور اس کے ذریعے سے نصیحت کرتے رہو تا کہ کوئی اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت میں نہ ڈالا جائے، اللہ کے سوا نہ تو کوئی اُس کا دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا اور اگر وہ ہر چیز معاوضہ دینا چاہے تو وہ اُس سے قبول نہ ہو، یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے) تُبْسِل اَیْ (تَرْتَهِنُ، تُحْبَسُ وَتُؤْسَرُ) جیسے جسم جب بیماری سے صحیح اور تندرست ہو جائے تو کہا جاتا ہے: (اِعْتَدَلَ مَزَاجُهٗ) (معتدل مزاج ہوا) مرض دراصل مزاج کی بے اعتدالی اور بگڑنے کا نام ہے البتہ یہ بھی ہے کہ اخلاط سے سالم اعتدالِ محض کی کوئی سبیل نہیں لیکن درجہ بدرجہ جو ہو، تو اسی طرح دل کی صحت اور صلاح عدل میں اور اس کی مرض زیغ، ظلم اور انحراف میں ہے، ہر شئ میں عدلِ محض علماً اور

عملاً ناممکن ہے لیکن درجہ بدرجہ، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اَمثل ہے، طریقہ سلفیہ کو طریقہِ مُثلیٰ کہا گیا ہے، قرآن میں ہے:

(وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ) [النساء : ۱۲۹] (اورتم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز عدل نہیں کرسکو گے) اور کہا:

(وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَانُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) [الأنعام : ۱۵۲] (اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق) اللہ تعالی نے رُسل مبعوث کئے اور کتب نازل کیں تا کہ لوگ قائم بالقسط ہوں اور سب سے اعظم قسط اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرنا پھر لوگوں کے ساتھ عدل کہ ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے پھر خود اپنے آپ پر عدل، ظلم کی تین انواع ہیں ظلم سب کا سب دلوں کی مرض سے ہے اور عدل ان کی صحت وصلاح ہے، امام احمد نے کسی سے کہا تھا اگر تم صحتمند ہوتو کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں مخلوق میں سے کسی سے خوف اگر کھاؤ تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم میں مرض ہے، شرک اور گناہ کا مرض، دل کی اصلاح کی اصل اس کی حیات واستنارت ہے، فرمایا:

(اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا) [الأنعام : ۱۲۲] (بھلا جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اُسے زندہ کیا اور اُس کیلئے روشنی کردی جس کے ذریعے سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے بھلا اُس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو اور اُس سے نکل ہی نہ سکے؟) اسی لیے اللہ نے دلوں کی حیات اور ان کی ظلمت وموت کا کئی مقامات میں ذکر کیا ہے جیسے:

(لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ) [یٰس : ۷۰] (تا کہ اس شخص کو جو زندہ ہو ہدایت کا رستہ دکھائے اور کافروں پر بات پوری ہوجائے)

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ)[الأنفال : ۲۴] (اے ایمان والو اللہ اور اُس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول اللہ تمہیں ایسے کام کیلئے بلاتے ہیں جو تمہیں زندگی بخشتا ہے اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب اُس کے رُوبرو جمع کئے جاؤ گے) اور کہا:

(يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ) [الروم : ۱۹] (وہی زندے کو مُردے سے نکالتا ہے اور مُردے کو زندے سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے) اور اس کی انواع میں سے یہ بھی کہ وہ کافر سے مومن اور مومن سے کافر کا اخراج کرتا ہے، صحیح حدیث میں ہے کہ اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر نہیں کیا جاتا زندہ اور مردے کی سی مثال ہے، صحیح کی ایک روایت میں ہے گھروں میں بھی اپنی نمازوں میں

سے کچھ پڑھا کرو اور انہیں قبریں نہ بنالو، فرمایا:

(وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ) [الأنعام : ۳۹] (اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں، اندھیرے میں) اللہ تعالی نے آیتِ نور اور آیتِ ظلمات ذکر کی چنانچہ کہا:

(اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ) [النور: ۳۵] (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کے مثال ایسی ہے کہ گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل میں ہے اور قندیل گویا موتی کا سا چمکتا ہوا تارا ہے اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے زیتون کہ نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف، اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے نور پر نور) یہ مومنین کے دلوں میں ایمان کے نور کی مثال ہے پھر کہا:

(وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ) [النور : ۳۹۔۴۰] (جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور اللہ ہی کو اپنے پاس پایا تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ یا جیسے گہرے سمندر میں اندھیرے جس پر لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر اور اس کے اوپر بادل ہو غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے اور جس کو اللہ نے روشنی نہ دی اس کیلئے روشنی نہیں) تو اول فاسد اعتقادات اور ان کے تابع اعمال کی مثال، ان کا کرنے والا انہیں نافع خیال کرتا ہے لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے اور اللہ سے اپنے ان برے اعمال کا پورا پورا بدلہ پاتا ہے اور ثانی جہلِ بسیط اور عدم ایمان وعلم کی مثال ہے تو ان کا کرنے والا ظلمات میں ہے جن کا بعض بعض کے اوپر ہے (یعنی تہہ در تہہ) کوئی شئ نہیں دیکھ سکتا، بصر تو ایمان وعلم کے نور سے ہوتا ہے، فرمایا:

(اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ)[الأعراف : ۲۰۱] (جو لوگ پرہیزگار ہیں جب اُن کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور دیکھنے لگتے ہیں) حضرت یوسف کے قصہ میں کہا:

(وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ)[یوسف : ۲۴] (اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انہوں نے اس کا

قصد کیا اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے) یہ ان کے دل میں موجود ایمان کا برہان تھا جس کی وجہ سے اللہ نے ان کا ھمّ بدل دیا اوران کے لیے کامل نیکی لکھ لی اوران کے ذمہ کوئی گناہ لازم نہ کیا جب فعلِ خیر کیا (کہ گناہ سے بچ نکلے) اور گناہ نہ کیا، فرمایا:

(لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ) [إبراهيم : ١](تا کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ)

(اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ) [البقرة : ٢٥٧] (جولوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ تعالیٰ ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں اُن کے دوست شیطان ہیں جو اُن کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں)

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ) [الحديد : ٢٨] (اے مومنو اللہ سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ وہ تمہیں اپنی رحمت سے دگنا اجر عطا فرمائے گا اور تمہارے لئے روشنی کر دے گا جس میں چلو گے) اسی لیے اللہ نے ایمان کے لیے دو مثالیں بیان کی ہیں، ایک پانی کی مثال جس کے ساتھ حیات قائم ہے اور جو اس کے ساتھ جھاگ مقترن ہو اور دوم آگ کے ساتھ جو روشنی کا باعث بنتی ہے اور جو اس کے ساتھ زبد سے مقترن ہو جو اس میں جلایا جاتا ہے، اسی طرح نفاق کے لیے بھی دو مثالیں بیان کیں ایک جب کہا:

(اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ) [الرعد : ١٧] (اُسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کیلئے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے) منافقین بارے کہا:

(مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَاراً فَلَمَّا اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ) [البقرة : ١٧] (ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی جب آگ نے اس کے ارد گرد کی چیزیں روشن کیں تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے) تو آگ جلانے والے کے ساتھ مثال دی جس کی کوشش سے جب آگ بھڑکتی ہے تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور دوسری مثال آسمان سے نازل پانی کی جس میں ظلمات، رعد اور بجلیاں دیکھی جاتی ہیں، اس مثال پر تفصیلی کلام ایک جگہ مذکور میں ہے یہاں مقصود قلوب کی حیات اور اِنارت کا ذکر ہے، ایک دعائے ماثور میں ہے: (اِجْعَلِ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قُلُوْبِنَا وَنُوْرَ صُدُوْرِنَا) (قرآن کو ہمارے دلوں کی بہار

اور ہمارے سینوں کا نور بنا) ربیع اس بارش کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کھیتی اگتی ہے، نبی اکرم کی ایک حدیث ہے: (اِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ حَبَطاً اَوْ يُلِمُّ) (یعنی موسمِ بہار اپنی نباتات کی کثرت کی وجہ سے کئی کا [زیادہ کھانے سے] پیٹ پھلا کر انہیں مار ہی دیتا ہے یا مرنے کے قریب کر دیتا ہے) اور جس موسم میں پہلی بارش نازل ہوتی ہے اسے عربوں نے ربیع کا نام اس بارش کی مناسبت سے دیا جس میں سبزہ اُگے، دیگر اقوام اس موسم کو ربیع کہتی ہیں جو سرما کے فوری بعد آتا ہے چونکہ اس میں پھلوں کے بور نکلتے اور درختوں کے پتے اگتے ہیں، زندہ اور منور دل اپنے میں موجود نور کی وجہ سے سنتا، دیکھتا اور سوچتا ہے جبکہ مردہ دل نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں، فرمایا:

(وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَايَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ)[البقرة: ۱۷۱] (جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے، بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے کہ سمجھ ہی نہیں سکتے)

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَ فَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ) [یونس: ۴۲-۴۳] (اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگر کچھ بھی سمجھتے نہ ہوں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے اگرچہ کچھ بھی دیکھتے نہ ہوں)

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا حَتّٰى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ)[الأنعام: ۲۵] (اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان رکھتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں کہ اُن کو سمجھ نہ سکیں اور کانوں میں بوجھ پیدا کر دیا ہے اور اگر یہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی تو اُن پر ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ جب تمہارے پاس تم سے بحث کرنے کو آتے ہیں تو جو کافر ہیں کہتے ہیں کہ یہ اور کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں) تو خبر دی کہ وہ اپنے قلوب کے ساتھ نہ سمجھتے ہیں نہ اپنے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں اور نہ ہدایت پانے کی ان میں اہلیت ہے تو جب کہا:

(وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ) [حم فصلت: ۵] (اور کہا کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے) تو قلوب، سمع اور ابصار پر موانع کا ذکر کیا جبکہ ان کے اجسام زندہ ہیں جو آوازیں بھی سنتے ہیں اور اشخاص کو بھی دیکھتے ہیں لیکن بدن کی حیات دل کی حیات کے بغیر چوپاؤں کی حیات کی جنس سے ہے، وہ بھی تو

سنتے، دیکھتے، کھاتے، پیتے اور مجامعت کرتے ہیں اسی لیے کہا: (وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَايَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً) تو اس ریوڑ سے انہیں تشبیہ دی جسے اس کا چرواہا خاص آواز نکال کر بلاتا ہے اور یہ بھی تو صرف آواز ہی سنتے ہیں جیسے دوسری آیت میں کہا:

(اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا) [الفرقان : ۴۴] (یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں) اور کہا:

(وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّايَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) [الأعراف: ۱۷۹] (اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کیلئے پیدا کئے ہیں، اُن کے دل ہیں لیکن اُن سے سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بھٹکے ہوئے) مفسرین کی ایک جماعت ان جیسی اور ان آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے عیوب ذکر کئے اور ان کی ذم کی مثلاً:

(وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ) [یونس : ۱۲] (اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دُور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو اُن کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے) بارے کہتی ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہے اور انسان سے یہاں مراد کافر ہے تو ان کی بات سن کر کئی حضرات ظن کریں گے کہ اسلام ظاہر کرنے والوں کے لیے اس ذم اور وعید میں کوئی حصہ نہیں بلکہ اس سے مراد عرب کے مشرکین یا یہود ونصاریٰ اور ترک وہند کے کفار ہیں تو ان آیات سے یہ منتفع نہ ہوں گے جنہیں اللہ نے بندوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا ہے! تو اولاً کہا جائے اسلام ظاہر کرنے والوں میں مومن بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی اور ہر زمانے میں منافق کثیر تعداد میں رہے ہیں اور وہ دوزخ کے درکِ اسفل میں ہوں گے، ثانیاً یہ کہ کبھی کسی آدمی میں نفاق اور کفر کا ایک شعبہ ہوتا ہے اگرچہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو جیسے ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ چار خصلتیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں وہ خالص (یعنی سرتاپا) منافق ہے حتیٰ کہ اسے ترک کردے، وہ چار خصلتیں یہ ہیں: بات بات پہ جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، وعدہ کرے تو توڑ دے اور لڑائی کرے تو گالم گلوچ کرے، ایک صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر سے کہا جب کسی سے لڑتے ہوئے انہوں نے اسے: اے حبشن کے بیٹے کہا، تم میں ابھی جاہلیت باقی ہے جبکہ ابوذر غفاری ایمان کے لحاظ سے صادق ترین لوگوں میں سے تھے، ایک اور صحیح حدیث میں فرمایا میری امت میں چار چیزیں جاہلیت کی رہیں گی: حسب ونسب پر اترانا، انساب میں طعن کرنا، نوحہ کرنا اور ستاروں کے ساتھ بارش

کی طلب کرنا،ایک صحیح حدیث میں فرمایا تم سابقہ اقوام کی سنن و روش کی ہو بہو پیروی کرو گے حتی کہ اگر وہ گوہ کے بل میں بھی داخل ہوئے تو تم بھی ہوگے،عرض کی یہود ونصاری ؟ فرمایا اور کون ؟ ایک حدیث میں فرمایا ہر جو کام سابقہ امم نے کیا میری امت بھی ہو بہو کرے گی،عرض کی روم اور فارس ؟ فرمایا لوگ یہی تو ہیں،ابن ابوملیکہ کہتے ہیں میں نے تیس اصحابِ محمد کو پایا سب اپنے آپ پر نفاق سے ڈرتے تھے،حضرت علی یا حذیفہ سے منقول ہے کہ **قلوب چار طرح کے ہوتے ہیں**:

۱۔قلبِ اجرد (یعنی آلائشوں سے خالی اور مصفا) جس میں چراغ روشن ہے، یہ مومن کا دل ہے

۲۔قلبِ اغلف (بند) یہ کافر کا دل ہے

۳۔قلبِ منکوس (جھکا ہوا اور اوندھا پڑا) یہ منافق کا دل ہے

۴۔ وہ دل جس میں دو مادے ہیں: ایک ایمان کا مادہ اور دوم نفاق کا مادہ،تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں ے نیک اعمال کے ساتھ ساتھ برے اعمال بھی کیئے

اس بحث کے بعد ظاہر ہوا کہ ہر بندہ جو ان آیات سے متفع ہوا جن میں اللہ نے ایمان کا ذکر کیا اس کی خصال کی مدح کی اور کفر کی شاخوں کی ذم کی اور یہ جو ان کے بعض قولہ:(**اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ**)[الفاتحة : ۵] بارے کہتے ہیں کہ مومن کو صراطِ مستقیم کی ہدایت تو ملی ہوئی ہے پھر (بار بار)طلبِ ہدایت میں کیا فائدہ ؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ مراد یہ کہ ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھ، جیسے عرب سوئے ہوئے سے کہتے ہیں:(نَمْ حَتّٰى آتِيَكَ) (سوئے رہو حتی کہ میں آؤں) بعض نے اس کا معنی یہ کیا:(الْزَمْ قُلُوْبَنَا الْهُدىٰ) (ہمارے دلوں میں ہدایت لازم کر) تو ملزوم کو حذف کیا،بعض نے یہ معنی کیا:(زِدْنِيْ هُدىً) وہ یہ سوال اس صراط مستقیم بارے اپنے عدم تصور کی وجہ سے وارد کرتے ہیں جس کی طرف نمازی ہدایت کی طلب کرتا ہے تو اس سے مراد تمام امور میں اللہ کے اوامر پر عمل کرنا اور اس کی منہیات کو ترک کرنا ہے،انسان اگرچہ علی سبیل الاجمال اقرار کرے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور قرآن مجید حق ہے،تو اسے نافع اور ضار اور اوامر ونواہی بارے علم کی زیادہ ضرورت امور کی تفاصیل و جزئیات میں ہوتی ہے اور کثیر اس کے علم میں آئی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن پر عمل نہیں کیا ہوتا

اگر فرض کیا جائے کہ اسے قرآن وسنت کے ہر امر ونہی کی خبر ہو چکی ہے تو قرآن وسنت میں تو امورِ عامہ کلیہ کا ہی ذکر ہوتا ہے ! ہر بندے کے ساتھ فرداً فرداً خاص کا ذکر کرنا ممکن نہیں لہذا اس طرح کے امور میں انسان کو حکم دیا کہ وہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی طلب کرتا رہے،صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اس سب کو متناول ہے، رسول کی لائی تعلیمات کی مفصلاً تعریف کو بھی اور اس کی بھی جو اس کے کلیات اوامر میں داخل ہے اور جو اہم اشیاء ہیں ان پر عمل کو بھی اسی لیے صلحِ حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی سورۃ الفتح میں نبی اکرم کو مخاطب کر کے کہا:

(اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا) [الفتح : ۱] (ہم نے تمہیں فتح مبین عطا کی) حضرات موسیٰ وہارون کے حق میں کہا: (وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) [والصافات: ۱۱۷۔۱۱۸] (اوران دونوں کو واضح کتاب عنایت کی۔اوران کوسیدھا راستہ دکھایا) مسلمانوں نے خبری، علمی، اعتقادی اورعملی امور میں باہم اختلاف رائے تو کیا ہے لیکن سب متفق ہیں کہ محمد رسولِ برحق ہیں اورقرآن بھی تو اگراختلافی امور میں ان میں سے ہرایک کے لیےصراطِ مستقیم کی طرف ہدایت حاصل ہوتو یہ اختلاف بھی نہ ہوتا پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ کے اوامر کےعلم کے باوجود اکثر مسلمان معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں (یعنی عملی کوتاہیاں موجود ہیں) تو اگران اعمال کی نسبت صراطِ مستقیم کی انہیں ہدایت ملی ہوتی تو تمام اوامر کو بجالاتے اورتمام منہیات کا ترک کرتے اوراس امت کے جن افراد کواللہ نے ہدایت دی حتی کہ وہ اس کے متقی اولیاء میں سے ہوئے تو اس کے بڑے اسباب میں سے ہرنماز (بلکہ ہررکعت) میں ان کا یہ دعا کرنا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اللہ کی ہمیشہ ضرورت وحاجت ہے کہ (ہرمسئلہ میں) انہیں صراطِ مستقیم کی رہنمائی دیتا رہے تو اس دعا کے دوام اوراس افتقار کے ساتھ وہ اللہ کے متقی اولیاء بنے، سہل بن عبداللہ تستری کا قول ہے کہ بندے اوراس کے رب کے مابین افتقار سے اقرب کوئی طریق نہیں، اگر ماضی میں اسے ہدایت حاصل ہوچکی ہے (کہ وہ اسلام لے آیا ہے) تو مستقبل میں بھی اس کی طرف ہدایت کا وہ محتاج ہے اور یہی ان مفسرین کےقول کی حقیقت ہے جواس کی تفسیر میں کہتے ہیں:(ثَبِّتْنَا وَاهْدِنَا لَزُوْمَ الصِّرَاطِ) (ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت دے اوراس پر جمائے رکھ) اور وہ بھی جنہوں نے کہا:(زِدْنَا هُدیً) تو یہ ماقبل کومتناول ہے

لیکن یہ سب اس کی طرف سے مستقبل میں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی طلب ہے کیونکہ مستقبل میں کیا ہوگا ؟اس کا علم انسان کونہیں اور وہ مہتدی نہ ہوگا حتی کہ مستقبل میں علم کے ساتھ عمل کرے اور ممکن ہے کہ کبھی مستقبل میں علم حاصل نہ ہو بلکہ دل سے زائل ہوجائے (یعنی یہ امکان موجود ہے) پھرعلم حاصل ہوبھی جائے تو بسا اوقات عمل حاصل نہ ہوگا لہذا لوگوں کومسلسل یہ دعا کرتے رہنے کی ضرورت ہے اسی لیے ہرنماز میں اللہ نے اسے ان پرفرض کیا ہے، اس سے زیادہ کسی دعا کے وہ محتاج نہیں اور جب صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتو نصرت ورزق کا بھی حصول ہوگا اور دیگر سب اسبابِ سعادت کا بھی

جان لوکہ دل اوراس کے غیر کی حیات مجرد حس اورارادی حرکت نہیں یا مجرد علم وقدرت، جیسے نظار کا ایک گروہ اسے اللہ کےعلم وقدرت میں خیال کرتا ہے مثلاً ابوالحسین بصری، ان کا کہنا ہے کہ اس کی حیات بایں طور ہے کہ وہ علم وقدرت رکھتا ہے بلکہ حیات موصوف کے ساتھ قائم صفت ہے اور یہ علم، ارادہ اور اختیاری افعال پر قدرت میں شرط ہے! نیز یہ اس کے لیے مستلزم بھی ہے تو ہر ذی حیات کے لیے شعور، ارادہ اور قدرت کے ساتھ اختیاری عمل ہے اور ہر جس کے لیے یہ ہوں وہ ذی حیات ہے، حیاء حیات سے مشتق ہے تو زندہ دل والا حیّ ہوتا ہے، جس میں حیا ہوتی ہے جوقبائح سے اسے روکتی ہے تو دل کی حیات ان قبائح سے

مانع ہے جو دل کی خرابی کا سبب بنتی ہیں اسی لیے نبی اکرم نے فرمایا حیاء ایمان سے ہے اور کہا حیاء اور عیّ (عاجزی) ایمان کے دو شعبے ہیں جبکہ بذاء (فضول گوئی) اور بڑبولا پن نفاق کے دو شعبے ہیں، حی اسے دور کرتا ہے جو اسے ایذا دے بخلاف میت کے جس میں حیات نہیں، اسے وقح کہا جاتا ہے، وقاحت صلابت ہے (یعنی کھردرا اور ٹھوس ہونا) اور یہ حیات کی رطوبت کے مخالف یبوست تو جب یہ وقح اور یابس ہوگا درشت اور ستے ہوئے چہرے والا تو اس کے دل میں حیات نہ ہوگی جو اس کے حیاء کا اور قبح سے اس کے امتناع کا موجب ہو، خشک اور بنجر زمین کی طرح جس میں چلنے پھرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بخلاف سرسبز زمین کے اسی لیے ذی حیات پر قبح کے ساتھ تأثر ظاہر ہوتا ہے اور اس کے لیے ارادہ ہے جو فعلِ قبیح سے اسے باز رکھتا ہے بخلاف اس وقح کے جو حی نہیں تو اس کے ساتھ حیاء نہیں اور نہ ایمان ہے جو اس سے اسے روکے رکھے تو دل اگر حیّ ہے تو انسان جب اپنی روح کے بدن سے فراق کے ساتھ مرجاتا ہے تو یہ نفس کی اس معنی میں موت ہے کہ وہ بدن سے جدا ہوا، فی الحقیقت یہ اس کی موت نہیں اس معنی میں کہ حیات اس سے زائل ہوئی اسی لیے کہا:

(وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ) [البقرة : ۱۵۴] (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں اُن کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں) حالانکہ بظاہر وہ مُردوں میں داخل ہو چکے اور اس آیت کا مصداق بن چکے:

(كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ) [آل عمران : ۱۸۵] (ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) اور:

(اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ) [الزمر : ۳۰] (تم بھی فوت ہو جاؤ گے اور یہ بھی مرجائیں گے)

(وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ) [الحج : ۶۶] (اور وہی تو ہے جس نے تمہیں حیات بخشی پھر تمہیں مارتا ہے پھر تمہیں زندہ بھی کرے گا) تو یہ جس موت کا اثبات کیا گیا ہے اس موت سے دیگر ہے جس کی نفی کی گئی، مثبت موت روح کا بدن سے فراق ہے اور منفی موت کلی لحاظ سے حیات کا زوال، روح اور بدن دونوں سے اور یہ جیسے نیند موت کی بہن ہے تو اس پر بھی وفات اور موت کا اطلاق ہوا ہے اگر چہ دونوں میں حیات کا وجود تھا اللہ تعالی نے فرمایا:

(اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى) [الزمر : ۴۲] (اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے) نبی اکرم جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ) ایک روایت میں ہے: (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ عَلَیَّ رُوْحِیْ وَعَافَانِیْ فِیْ جَسَدِیْ وَاَذِنَ لِیْ بِذِكْرِهٖ وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلاً) (اللہ کی حمد جس نے مجھے میری روح واپس کی اور

میرے جسم کو صحیح رکھا اور اپنے ذکر کی اذن دی اور بہتوں سے اچھا بنایا) جب سونے کے لیے بستر پکڑتے تو یہ کلمات کہتے :(اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَ اَنْتَ تَوَفَّاھَا لَکَ مَمَاتُھَا وَ مَحْیَاھَا اِنْ اَمْسَکْتَھَا فَارْحَمْھَا وَاِنْ اَرْسَلْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصَّالِحِیْنَ)اور کہتے :(بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیَا)(اے اللہ تو نے میرے نفس کی تخلیق کی اور تو ہی اسے فوت کرے گا تیرے لئے اس کی حیات وممات ہے اگر اسے روک لے تو رحم کرنا اور اگر واپس چھوڑ دے تو حفاظت کرنا جیسے تو اپنے نیک بندووں کی حفاظت کرتا ہے)۔

فصل

دل کے امراض میں سے حسد بھی ہے جیسا کہ بعض نے اس کی تعریف میں کہا: ''یہ ایک اذیٰ ہے جو اغنیاء کے حال بارے علم کے سبب لاحق ہوتی ہے تو جائز نہیں کہ فاضل حاسد ہو اس لیے کہ فاضل اس روش پر چلتا ہے جو جمیل ہوتی ہے، بعض حضرات نے کہا حسد محسود سے نعمت کے زوال کی تمنا کرنا ہے اگر چہ حاسد کو اس جیسی نعمت نہ بھی ملے بخلاف غبطہ (یعنی رشک) کے تو یہ اس کے جیسی نعمت کی تمنا کرنا بغیر اس کے کہ مغبوط سے اس کے زوال کی خواہش ہو! تحقیق یہ ہے کہ حسد محسود کے اچھے حال سے بغض اور کراہت ہے اور یہ **دو انواع ہیں**:

۱۔ ایک مطلقاً اسے عطا ہوئی نعمت کو برا جاننا تو یہ مذموم حسد ہے تو جب اسے مبغوض جانے گا تو جب تک یہ موجود ہے کڑھتا رہے گا اور یہ اس کے دل میں مرض ہے اور اگر اس سے یہ نعمت چھن جائے تو یہ لذت محسوس کرے گا اگر چہ اس کی نعمت چھن جانے کا اسے کوئی فائدہ نہ ہو، لیکن کم از کم اتنا فائدہ اسے ضرور ہوگا کہ اس کے دل کا تألم اور کڑھنا ختم ہوجائے گا لیکن یہ الم لم یزل ہوگی مگر اس کی طرف سے مباشرت کے ساتھ اور یہ راحت ہے اور اس کی شدید ترین حالت اس مریض کی طرح جس کا ایسی دوا کے ساتھ علاج کیا جائے جو وقتی طور پر اس کی تکلیف کو ساکن کردے لیکن مرض باقی رہے تو کسی بندے پر اللہ کی کسی نعمت دیکھ کر اس کا اس سے بغض کرنا مرض ہے، یہ نعمت کبھی محسود کی طرف لوٹ سکتی ہے اور اس سے بڑی بھی اور کبھی اس محسود کی نظیر کسی اور کو اس کے جیسی نعمت مل سکتی ہے یعنی اس کی یہ مرض مسلسل رہے گی (گویا حسد ایک مسلسل بیماری ہے) حاسد کے لیے کسی معین شئ میں غرض نہیں ہوتی، دراصل اس کا نفس اپنے بنی نوع پر ہونے والے انعامات کو دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے، اسی لیے کسی نے اس کی یہ جامع تعریف کی کہ یہ زوالِ نعمت کی تمنا کرنا ہے، جسے کسی پر ہوئی نعمت ناپسند ہے تو دل میں اس کے زوال کی تمنا کرتا رہے گا

۲۔ دوسری نوع کہ کسی شخصِ معین کے اپنے سے فاضل ہونے کو برا جانے تو پسند کرے کہ وہ بھی اس جیسا یا اس سے بھی افضل ہوجائے تو یہ بھی حسد ہے، اسے انہوں نے رشک کا نام دیا ہے، نبی اکرم نے ابن مسعود اور ابن عمر سے مروی متفق علیہ حدیث میں اس پر بھی حسد کے لفظ کا اطلاق کیا ہے چنانچہ فرمایا حسد جائز نہیں مگر دو آدمیوں کی نسبت ایک وہ آدمی جسے اللہ نے حکمت سے نوازا

ہے اور وہ اسے بروئے کار لاتا ہے اور اسے جانتا ہے اور دوم جسے اللہ نے مال عطا کیا اور وہ اسے حق کے کاموں میں خرچ کرتا رہتا ہے، یہ ابن مسعود کی روایت کے الفاظ ہیں، ابن عمر کی روایت میں ہے کہ ایک وہ شخص جسے اللہ نے قرآن عطا کیا اور وہ دن ورات کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور وہ دن رات کی گھڑیوں میں اس سے خرچ کرتا رہتا ہے، اسے بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ ہیں: ایک وہ شخص جسے اللہ تعالی نے قرآن عطا کیا وہ اس کی دن رات تلاوت کرتا رہتا ہے، ایک آدمی نے اسے سنا تو کہا کاش مجھے بھی اس کا مثل حاصل ہو تو میں بھی اس جیسا عمل کروں اور دوم جسے مال۔۔۔۔الخ تو اس حسد کو جس کی آپ نے اجازت دی لوگوں نے غبطہ کا نام دیا اور وہ یہ کہ کسی جیسی حالت کو پسند کرے اور اسے برا لگے کہ وہ اس سے افضل ہو (یعنی اس سے اس حالت کے زوال کی تمنا نہیں کرتا) لیکن چاہتا ہے کہ یہ بھی اس جیسا ہو جائے، اگر کہا جائے پھر اسے حسد کا نام کیوں دیا گیا اسے تو بس یہ پسند ہوا کہ اس پر بھی اللہ تعالی انعام کرے؟

تو کہا جائے گا کہ اس خواہش کا مبدا غیر پر ہوئے انعام کو مدِ نظر رکھنا ہے اور یہ ناپسند کرنا کہ وہ اس سے افضل ہو، اگر اس غیر کا وجود نہ ہوتا تو یہ خواہش اس کے دل میں پیدا نہ ہوتی تو جب اس کا مبدا (اور سبب) اس امر سے کراہت ہے کہ وہ غیر اس سے افضل ہو تو یہ (شکلی اعتبار سے) حسد ہوا اس لیے کہ یہ کراہت ہے جس کے پیچھے محبت ہے لیکن جسے یہ پسند ہو اور اس کی خواہش ہو کہ اللہ اس پر انعام کرے بغیر لوگوں کے احوال کی طرف التفات کئے تو اس میں حسد نامی کوئی شئ نہیں (یعنی نہ جائز حسد اور نہ ناجائز) اسی لیے اکثر لوگ اس دوسری قسم کے حسد میں مبتلا ہوتے ہیں، اسے منافست کا نام بھی دیا جاتا ہے تو دو (یا زیادہ) افراد کسی محبوب ومطلوب امر میں باہم منافست (اور مسابقت) کرتے ہیں ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے وہ حاصل ہو، اور اس کا باعث اور داعیہ اس امر سے کراہت کہ دوسرا اس پر متفضل ہو جیسے دو باہم مقابلہ کرنے والوں میں سے ہر ایک برا جانتا ہے کہ دوسرا اس سے سبقت لے جائے، تنافس مطلقاً مذموم نہیں بلکہ خیر میں اگر ہو تو یہ محمود ہے، قرآن میں ہے:

(اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْکٌ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ) [المطففین : ۲۲۔۲۶] (بے شک نیک لوگ نعمت میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے ہوئے نظارے کریں گے۔ تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔ ان کو خالص سربمُہر شراب پلائی جائے گی۔ جس کی مہر مشک کی ہوگی تو ریس لگانے والوں کو چاہیئے کہ اس میں ریس لگائیں) تو حکم دیا کہ اس نعیمِ آخرت میں تنافس کریں دنیا کی نعیم زائل میں تنافس کرنے کا حکم نہیں دیا اور یہ سابق الذکر حدیثِ نبوی کے موافق ہے جس میں آپ نے حسد سے منع کیا مگر دو قسم کے بندوں سے تو یہ عملِ خیر میں حسد (یعنی رشک) ہے اور اس کے جیسے حال کی تمنا ہے نہ کہ اس حال کے اس سے زوال کی، نفوس اس سے حسد نہیں کرتے جو عظیم تعب ومشقت میں ہو اسی لیے ایسے کا ذکر نہیں مثلاً کوئی منصب دار

جوعلم وعدل کے تقاضوں کے مطابق ذمہ داریاں نباہ رہا ہے اور کتاب وسنت کی رو سے سارے کام انجام دے رہا ہے تو اس کا عظیم درجہ ہے اور یہ عظیم جہاد میں ہے اسی طرح مجاہد فی سبیل اللہ بھی اور یہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے سے افضل ہے اور منفق اور معلم کا عموماً خارج سے کوئی دشمن نہیں ہوتا، اگر فرض کیا جائے کہ ان کے لیے دشمن ہے تو یہ اس سے جہاد کریں گے تو یہ ان کے درجہ کی نسبت افضل ہوگا (مگر چونکہ یہ ایک پر خطر کام میں ہیں لہذا عموماً ان کے ساتھ حسد یا رشک نہیں کیا جاتا) اسی طرح نبی اکرم نے نمازی، صائم اور حاج کا بھی ذکر نہیں کیا اس لیے کہ ان اعمال سے عموماً لوگوں کے لیے وہ نفع نہیں جس کے مدِ نظر لوگ کسی کو قابلِ تعظیم جانیں اور اپنا سردار بنالیں، جو رویہ ان کا تعلیم اور انفاق والے کی نسبت سے ہوتا ہے، حسد اصل میں غیر کو حاصل سیادت اور ریاست کی رو سے ہوتا ہے وگرنہ عموماً عامل سے حسد نہیں کیا جاتا اگر چہ اکل وشرب اور نکاح کے ساتھ اس کا تنعُّم دیگر سے اکثر ہو بخلاف ان دونوں کے تو ان کے ساتھ کثیر حسد ہوتا ہے اسی لیے متبوع اہلِ علم کے درمیان ایسے موجود ہیں جن سے ایسا حسد ہوتا ہے جو ان سے نہیں ہوتا جو ایسے نہیں، اسی طرح انفاق کے سبب جن کے لیے اَتباع ہوں تو ان سے بھی اس پہلو سے حسد ہوتا ہے تو جس طرح معلم قلوب کی قوت کے ساتھ لوگوں کو نفع پہنچا تا ہے اسی طرح یہ ابدان کی قوت کے ساتھ انہیں نفع پہنچا تا ہے اور لوگ ان کے محتاج ہیں جو ان کے دلوں کی اصلاح کرے اور ان کے بھی جو ان کے ابدان کی اصلاح کرے اسی لیے اللہ تعالی نے دو مثالیں بیان کیں، ایک اِس کے اور دوسری اُس کے ساتھ چنانچہ کہا:

(ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْ ءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَىْ ءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِىْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [النحل : ۷۵۔۷۶] (اللہ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کے اختیار میں ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک ایسا شخص ہے جس کو ہم نے اپنے ہاں سے مال طیب عطا فرمایا ہے اور وہ اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتا رہتا ہے تو کیا یہ دونوں شخص برابر ہیں؟ اللہ کیلئے ہی حمد ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اللہ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں سے گونگا ہے کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور اپنے مالک کو دوبھر ہو رہا ہے وہ جہاں اُسے بھیجتا ہے بھلائی نہیں لاتا کیا ایسا اور وہ شخص جو لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستے پر چل رہا ہے دونوں برابر ہیں) اللہ سبحانہ نے یہ دونوں مثالیں اپنی ذاتِ مقدسہ کی بیان کی ہیں اور ان کی جن کی اس کے سوا عبادت کی جاتی ہے تو اوثان نہ تو نافع عمل پر قادر ہیں اور نہ نافع کلام پر، اگر کوئی ایسا مملوک فرض کیا جائے جو کسی شئ پر قادر نہیں اور دوسرا وہ جسے اللہ نے رزقِ حسن دیا ہے اور وہ سراً اور جہراً اس میں سے خرچ کرتا رہتا ہے تو کیا احسان کرنے سے عاجز اور اس پر قادر دونوں ایک برابر ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالی اپنے

بندوں پر احسان کرنے پر قادر ہے اور وہ ہمیشہ ان پر احسان کرتا ہے تو عاجز مملوک کو اس کے ساتھ کیونکہ تشبیہہ دی جاسکتی ہے حتیٰ کہ اسے اس کا شریک بنالیا جائے؟ اور یہ اس کی مثال ہے جسے اللہ نے مال دیا ہے اور وہ رات دن اس میں سے خرچ کرتا ہے! دوسری مثال میں اگر دو شخص ایسے فرض کریں کہ ایک گونگا ہے جسے نہ عقل وفہم ہے اور نہ وہ بول سکتا ہے اور نہ کسی شئ پر قادر ہے اور سراسر اپنے آپ پر بوجھ ہے (یعنی کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا) جہاں اسے بھیجا جائے وہ خیر لے کر نہ آئے (یعنی کوئی کام اس سے نہیں ہو پاتا) تو اس میں کبھی کوئی نفع نہیں اور دوسرا عالم وعادل ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور خود بھی اس پر عمل کرتا ہے تو وہ صراطِ مستقیم پر ہے اور یہ اس کی نظیر ہے جسے اللہ نے حکمت عطا کی اور وہ خود بھی اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے تو یہ مثال بھی اللہ نے اپنے لیے بیان کی ہے، وہ عالم وعادل ہے اور عدل کا آمر ہے قائم بالقسط، صراطِ مستقیم پر ہے جیسے کہا:

(شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآاِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآاِلٰهَ اِلَّا هُوَالْعَزِيْزُالْحَكِيْمُ)[آل عمران : ۱۸](اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی، اُس غالب حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) حضرت ہود نے کہا تھا:

(اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [هود: ۵۶] (بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے) اسی لیے لوگ دارِ عباس (بن عبدالمطلب) کی تعظیم کرتے تھے جہاں حضرت عبداللہ بطورِ معلم بیٹھا کرتے تھے اور ان کے بھائی لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے (یعنی غریبوں کے لیے دسترخوان کھولا ہوا تھا) تو لوگوں میں اس وجہ سے ان کی از حد تعظیم تھی، حضرت معاویہ نے دیکھا کہ لوگ ابن عمر سے حج کے مناسک بارے پوچھتے اور آگہی حاصل کرتے ہیں تو بے ساختہ بولے: واللہ یہ عظیم شرف ہے، حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں منافست کی جیسا کہ صحیح میں انہی سے مروی ہے کہ ایک موقع پر (یہ تبوک جاتے وقت) نبی اکرم نے ہمیں چندہ دینے کا حکم دیا، ان دنوں میری مالی حالت اچھی تھی تو میں نے کہا آج موقع ہے کہ ابوبکر سے سبقت لے جاؤں، کہتے ہیں میں اپنے کل مال کا نصف خدمتِ نبوی میں لے آیا، آپ نے پوچھا اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ عرض کی جتنا لایا ہوں اتنا ہی ان کے لیے چھوڑا ہے، ابوبکر صدیق اپنے پاس موجود سارا مال ومتاع لے آئے، آپ نے پوچھا گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ کہا ان کے لیے میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں، اس پر میں نے کہا میں آپ سے کبھی سبقت نہیں لے جاسکتا تو حضرت عمر کی یہ سوچ مباح منافست سے تھی لیکن صدیقِ اکبر کا حال ان سے افضل تھا کہ وہ مطلقاً ہی منافست سے خالی تھے اور کسی کے حال پر ان کی نظر نہ تھی اسی طرح حدیثِ معراج میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبی اکرم کے حال پر رشک کیا حتیٰ کہ رو دئے، پوچھا گیا آپ کس وجہ سے روئے؟ کہا اس لیے کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث ہوا اس کی امت کے افراد میری امت کے افراد سے زیادہ جنت میں داخل ہوں گے، اسے صحیحین میں نقل کیا، غیر صحیح کی ایک

روایت کے الفاظ ہیں آپ نے واقعہ معراج ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ ہمارا گزر ایک شخص سے ہوا جو بآوازِ بلند کہہ رہا تھا: تو نے اسے (مجھ سے) افضل بنا دیا، فرمایا ہم نے اسے سلام کیا اس نے جواب دیا اور کہا اے جبریل یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ کہا یہ احمد ہیں، کہا نبی امی کو خوش آمدید! جس نے اپنے رب کی رسالت کی تبلیغ کر دی اور اپنی امت کی خیر خواہی کی، فرمایا ہم آگے گئے، میں نے کہا اے جبریل یہ کون تھے؟ کہا یہ موسی بن عمران ہیں، میں نے کہا کس کے ساتھ ناراضی بھری باتیں کر رہے تھے؟ کہا اپنے رب کے ساتھ، میں نے تعجب کیا کہ یوں بآوازِ بلند؟ کہا اللہ تعالی ان کے صدق سے آگاہ ہے (یعنی ذاتی مفاد میں نہیں بلکہ اپنی امت کی فکر اور خیر خواہی میں ایسا کر رہے تھے) حضرت عمر کو حضرت موسی سے تشبیہ دی گئی ہے، ہمارے نبی کا حال حضرت موسی کے حال سے **افضل** ہے، آپ میں اس میں سے کوئی شئ نہ تھی

اسی طرح صحابہ کرام میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح ونحوہ ان امور سے سالم تھے تو یہ ان سے رتبہ میں **افضل** تھے جن کے ہاں منافست اور غیظ تھا (یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت عمر میں منافست کا جذبہ موجود تھا اور وہ ابوعبیدہ سے **افضل** تھے) اگر چہ یہ منافست مباح ہے (مباح کیوں بلکہ یہ رب کے ہاں بہت پسندیدہ ہے حکمیہ انداز میں کہا: **وَ فِیۡ ذٰلِکَ فَلۡیَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ**) اسی لیے ابوعبیدہ مستحق ہوئے کہ اس امت کے امین ہوں (ان کے امین الامت ہونے کی یہ وجہ علم نہیں کہاں سے اخذ کی) کیونکہ اگر موتمن کے نفس میں ان میں سے جن پر اسے امین بنایا گیا کسی شئ کی حرص وطمع نہیں تو وہ دوسروں سے امانت کا زیادہ مستحق ہے اسی لیے عورتوں اور بچوں کا نگران خصی افراد کو بنایا جاتا ہے اور ولایتِ صغری پر اسے امین بنایا جاتا ہے جس کی بابت معلوم ہے کہ وہ ولایتِ کبریٰ پر مزاحم نہ ہوگا اور مال کا امین ونگران اسے بنایا جاتا ہے جس کے بارے میں علم ہے کہ اسے اس سے کچھ اخذ کرنے سے غرض نہیں، خائن کو امین ومحافظ بنانا ایسے ہی ہے جیسے بھیڑیئے کو ریوڑ کا نگران بنا دیا جائے، ایسا شخص اپنے میں موجود حرص اور لالچ کی وجہ سے امانت کا حق ادا نہ کر سکے گا، مسند احمد کی حضرت انس سے روایت ہے کہ ہم ایک دن نبی اکرم کے پاس بیٹھے تھے تو فرمایا **ابھی اس راستے سے ایک جنتی آدمی نمودار ہوگا**، کہتے ہیں تو ایک انصاری شخص آیا جن کی داڑھی سے وضوء کا پانی ٹپک رہا تھا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے تھے اس نے سلام کیا، کہتے ہیں اگلے روز بھی ہم بیٹھے تھے کہ نبی اکرم نے وہی کل والی بات کہی اور پھر یہی انصاری صحابی کل والی حالت میں نمودار ہوئے اور تیسرے روز بھی یہی بات کہی اور یہی آدمی اسی حالت میں آئے

نبی اکرم کے مجلس سے اٹھ جانے کے بعد عبداللہ بن عمرو بن عاص ان صاحب کے پاس گئے اور کہا میرا اپنے والد سے کچھ جھگڑا ہوا ہے اور میں نے قسم کھائی ہے کہ تین دن گھر نہ جاؤں گا اگر آپ مجھے تین دن سونے کو اپنے گھر میں جگہ دے دیں؟ انہوں نے حامی بھر لی، انس کہتے ہیں عبداللہ نے ہمیں بیان کیا کہ انہوں نے تین راتیں ان کے ہاں گزاریں لیکن انہیں رات کو کوئی قیام وتہجد کرتے نہیں دیکھا البتہ جب بھی اپنے بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ کا کچھ ذکر وتکبیر کرتے اور اللہ اکبر کہتے (اور ساری

رات سوئے رہتے) حتیٰ کہ نمازِ فجر کی اذان ہوئی تو نماز کو روانہ ہوئے ، عبداللہ کہتے ہیں البتہ میں نے ان کی زبان سے ہمیشہ خیر کا بول ہی سنا ، تین دن گزر گئے اور قریب تھا کہ میں ان کے عمل کو حقیر جانتا ، میں نے آخر ان سے کہا اسے بندہ خدا میرے اور میرے والد کے مابین کوئی ناچاقی نہیں ہوتی کہ میں بائیکاٹ کر دیتا لیکن میں نے نبی اکرم کو تین مرتبہ کہتے سنا کہ ابھی اس طرف سے ایک جنتی آدمی آئے گا اور تینوں دفعہ آپ ہی آئے تو میں چاہا کہ آپ کا عمل دیکھوں لیکن آپ کو میں نے کوئی زیادہ عمل کرتے نہیں دیکھا ، پھر اس رتبہ کا جو نبی اکرم نے ذکر کیا کیا سبب ہے ؟ وہ بولے عمل تو وہی ہے جو تم نے دیکھ لیا البتہ یہ ہے کہ میں نے اپنے دل میں کبھی کسی مسلمان کو ملی نعمت اور خیر پر حسد نہیں رکھا اور نہ کبھی لالچ کی ہے ، اس پر عبداللہ بولے یہی تو ہے جس نے آپ کو اس رتبہ تک پہنچا دیا ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو ابن عمرو کی یہ بات اس صحابی کے حسد کی تمام انواع (یعنی ان سے بھی جو جائز ہیں) سے خلو پر اشارت کناں ہے ، اس انصاری صحابی کی اس صفت پر اللہ نے بھی قرآن میں تعریف کی ہے چنانچہ کہا :

(وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ) [الحشر : ۹] (اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش وخلش نہیں پاتے اور ان کو اپنے آپ سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو) تو (اُوْتُوْا) سے مہاجرین کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ کسی طرح کا حسد وغیظ روا نہیں رکھتے ، بعض مفسرین نے مالِ فیٔ سے انہیں دیا جانا مراد قرار دیا جبکہ بعض نے فضل وتقدم مراد لیا یعنی نہ انہیں مال عطا کئے جانے پر اور نہ جاہ وحشمت سے نوازے جانے پر کوئی شیٔ محسوس ہوتی ہے ، حسد عموماً انہی دو پر کیا جاتا ہے ، اوس اور خزرج کے مابین دینی منافست موجود تھی ، ایک قبیلہ جب کوئی دینی خدمت انجام دیتا تو دوسرے قبیلہ کی خواہش ہوتی کہ اس طرح کی خدمت کا انہیں بھی موقع ملے تو یہ وہ منافست ہے جو اللہ کے تقرب کا سبب بنتی ہے جیسے کہا : (وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ) جہاں تک وہ حسد جو کلی طور سے مذموم ہے تو اللہ نے یہود کے بارے میں کہا :

(وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ) [البقرة : ۱۰۹] (بہت سے اہلِ کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان کے بعد تم کو پھر کافر بنا دیں حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے) تو حسد کو اس مذکورہ خواہش کا موجب قرار دیا بعد اس کے کہ حق ان کے لیے واضح ہو چکا اس لیے کہ انہوں نے جب دیکھا کہ حق کی اتباع کی وجہ سے مسلمانوں کو وہ نعمت حاصل ہوئی ہے جس سے وہ حق نہ ماننے کی وجہ سے محروم رہ گئے ہیں تو ازرہِ حسد چاہا کہ مسلمان مرتد ہو جائیں ، ایک اور آیت میں کہا :

(اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا) [النساء : ۵۴-۵۵] (یا جو اللہ نے اُن

لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اُس کا حسد کرتے ہیں، تو ہم نے خاندانِ ابراہیم کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنتِ عظیم بھی بخشی تھی۔ پھر لوگوں میں سے کسی نے تو اُس کتاب کو مانا اور کوئی اُس سے رکا رہا تو اُن نہ ماننے والوں کو دوزخ کی جلتی ہوئی آگ کافی ہے) اور کہا:

(قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَومِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ) [الفلق : ۱۔ ۵] (کہو کہ میں صبح کے رب کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔ ہر چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔ اور شبِ تاریک کے شر سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔ اور گنڈوں پر پھونکنے والیوں کے شر سے۔ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے) بعض مفسرین نے ذکر کیا کہ یہ سورۃ یہود کے نبی اکرم سے حسد کرنے پر نازل ہوئی اور اس حسد میں اتنے بڑھے کہ آپ پر (کالا) جادو کرایا، یہ جادو لبید بن اعصم یہودی نے کیا تھا (فتح الباری میں ہے کہ یہ یہودی نہیں بلکہ ان کا حلیف تھا، یہودیوں نے اسے چالیس دینار دے کر آپ پر جادو کرایا) تو حاسد جو کسی پر اللہ کی نعمت سے بغض رکھتا ہے ظالم اور معتدی ہے اور یہ منہی عنہ ہے ماسوائے ان امور کے جو اللہ کی طرف تقرب کا ذریعہ بنیں تو اگر کوئی یہ خواہش کرے کہ اسے بھی وہ نیکی عطا ہو جو دوسرے کو عطا ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے وہ متقرب الی اللہ ہوا ہے تو اس میں حرج نہیں (جیسا کہ گزرا ہے یہ حقیقی حسد ہے ہی نہیں کیونکہ حسد دوسرے سے نعمت کے زوال کی خواہش کرنا ہے جبکہ یہاں زوال نہیں چاہتا بلکہ اپنے لیے بھی اس کا مثل چاہ رہا ہے) لیکن بہر حال دل کا اس سے کلیۃً اعراض کہ کسی کی حالت کو مدِ نظر نہ رکھے افضل ہے پھر اگر اس حسد کے بموجب حاسد نے (محسود کا کچھ نقصان) کیا تو وہ ظالم اور معتدی اور عقوبت کا مستحق ہوگا الا یہ کہ توبہ کر لی اور محسود مظلوم اور صبر و تقوی کا مامور ہے وہ حاسد کی اس ایذاء رسانی پر صبر اور عفو در گزر سے کام لے جیسے کہا: (وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ ـــ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) (تو تم معاف کر دو اور در گزر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجے) حضرت یوسف اپنے بھائیوں کے اپنے ساتھ حسد میں مبتلا کیے گئے جب انہوں نے باہم کہا:

(اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ)[یوسف : ۸] (جب انہوں نے باہم ذکر کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت ہیں کچھ شک نہیں کہ ہمارے ابا صریح غلطی پر ہیں) تو والد (حضرت یعقوب) کے یوسف اور ان کے حقیقی بھائی بنیامین کو زیادہ پسند کرنے کی وجہ سے حسد کا شکار بنے اسی لیے حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو منع کیا کہ اپنا خواب انہیں بیان نہ کریں اور کہا:

(لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ) [یوسف : ۵] (اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا نہیں تو وہ تمہارے حق میں کوئی فریب کی چال چلیں گے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے) پھر ستم اور ظلم یہ کیا کہ ان کے قتل کی منصوبہ بندی کی، آخر کنویں میں ڈال دیا اور پھر بلادِ کفر کی طرف جا رہے قافلہ کے ہاتھ غلام بنا کر

بیچ ڈالا اور وہاں جا کر ان کی یہ ابتلاء ختم نہیں ہوگئی بلکہ کئی قسم کی انواعِ تعذیب سے گزرے، قید میں ڈالے گئے مگر اللہ کی ناراضی پر دنیا کی مشقت اور تعذیب کو ترجیح دی تو وہ مظلوم تھے اس کی جہت سے جس نے اپنی نفسانی خواہش اور فاسد غرض کے لیے ان سے محبت کی تو اس عورت کی اپنی غرض کے لیے ان سے محبت بھی ان پر ظلم تھا اور برادرانِ یوسف کا از رہِ حسد ان سے بغض کرنا بھی ظلم تھا، اس بغض نے انہیں کنویں میں جبکہ اس محبت نے انہیں قید خانہ میں لا پھینکوایا اگر چہ قید خانہ اپنی مرضی سے اختیار کیا تا کہ گناہ سے بچ سکیں اور اس پر ان کا صبر کرنا اختیاری صبر تھا جس کے ساتھ تقویٰ مقترن تھا بخلاف بھائیوں کے ظلم پر ان کے صبر کے تو یہ ان مصائب کے باب سے تھا جن پر جس نے کرام کا سا صبر نہ کیا تو بہائم (چوپاؤں) جیسی بے فکری میں ہوا اور صبرِ ثانی دونوں میں سے افضل صبر ہے اسی لیے کہا:

(اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف : ۹۰] (جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) اسی طرح اگر مومن کو اس کے ایمان پر ایذا دی جائے اور اسے کفر یا فسق یا عصیان پر مجبور کیا جائے اور اگر بات نہ مانے تو ایذا دی جائے مگر اس نے دین چھوڑنے پر ایذا اور عقوبت کو ترجیح دی یا حبس یا جلاوطن (یا زدوکوب) کئے جانے کو جیسے مہاجرین صحابہ کے ساتھ ہوا اور خود نبی اکرم کو کئی طرح کی انواعِ اذیٰ کے ساتھ ستایا گیا مگر آپ نے ہمیشہ اختیاری صبر کیا آپ کو ایذاء اس لیے دی جاتی تھی تا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوجائے اور آپ وہ کچھ نہ کریں جو اپنے اختیار سے کر رہے ہیں اور **یہ صبر حضرت یوسف کے صبر سے اعظم تھا** اس لیے کہ حضرت یوسف سے بے حیائی کی طلب کی گئی اور جب یہ نہ کیا تو حبس کے ساتھ عقوبت دی گئی جبکہ نبی اکرم اور آپ کے صحابہ سے کفر کی طلب کی گئی اور جب ایسا نہ کیا تو قتل اور دیگر انواع کی تعذیب ان پر آزمائی گئی، حبس تو ایک ہلکی سزا ہے وہ بھی آپ کو اور آپ کے بعض صحابہ کو سہنا پڑی جب مشرکین نے آپ کو اور سب بنی ہاشم کو شعب (ابی طالب) میں ایک مدت تک محبوس رکھا پھر ابو طالب کی وفات کے بعد ان کا رویہ مزید سخت ہوگیا اور جب انصار نے آپ کی بیعت کی اور اہلِ مکہ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ کو اور صحابہ کو مدینہ جانے سے باز رکھنے کی ہر ممکن سعی کی حتیٰ کہ ہر ایک کو چھپ چھپا کر ہجرت کرنا پڑی، صرف حضرت عمر اور بعض دیگر نے علی الاعلان ہجرت کی تو یہ سب مصائب اہلِ اسلام نے اللہ ورسول کی اطاعت کا دم بھرتے ہوئے خود اپنے اختیار و مرضی سے برداشت کئے، یہ آسمانی مصائب میں سے نہ تھے جن کے سامنے بندے کا اپنا اختیار نہیں چلتا جیسے حضرت یوسف نے اپنی مرضی سے قید میں جانے کو ترجیح دی تھی اور یہ اشرف النوعین ہے اور اس کے فاعل درجہ میں اعظم ہیں اگر چہ مصائب میں گرفتار کو اس کے صبر و رضا کا ثواب ملتا ہے اور ان کی وجہ سے اس کی خطائیں محو اور مکفّر کی جاتی ہیں تو اپنے اختیار سے اللہ کی طاعت میں آلام وستم سہنے والا بھی اس طرح کے ثواب کا مستحق ہوگا اور ان کی وجہ سے اس کے لیے عملِ صالح لکھا جاتا ہے، فرمایا:

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[التوبة : ۱۲۰] (یہ

اس لئے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جو تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی یا محنت کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے ہیں تو ہر بات پر اُن کیلئے نیک عمل لکھا جاتا ہے) بخلاف ان مصائب کے جو بندے کے اختیار کے بغیر طاری ہوتے ہیں مثلاً مرض، رشتہ داروں کی موت اور چوری ہوجانا وغیرہ تو ان پر انسان ثواب کا حقدار صبر کی وجہ سے بنتا ہے نہ کہ مصائبِ مذکورہ کے حادث ہونے کی وجہ سے لیکن بہرحال مصیبت جیسی بھی ہو انسان کے گناہوں کی تکفیر کا سبب بنتی ہے البتہ ثواب صرف اختیاری اعمال پر ہوتا ہے اور جو ان سے متولد امور ہوں جو ایمان اور اللہ ورسول کی اطاعت کی پاداش میں ایذا دئے جاتے ہیں اور اس سبب ان کے لیے تنگیِ حالات، مرض، حبس، وطن سے فراق اور مال واہل کا ضیاع یا تشدد وستم یا نقصِ مال وریاست وغیرہ حادث ہوتا ہے وہ انبیاء اور ان کے اتباع کے طریقہ پر ہیں، مہاجرین اولین کی مانند تو اس ایذا کے سہنے پر انہیں ثواب ملے گا اور ان کے لیے عملِ صالح لکھا جاتا ہے جیسے مجاہد اس راہ کی سب مشقتوں مثلاً بھوک، پیاس، تھکاوٹ اور دشمن کے غیظ وغضب کا نشانہ بننے کے سہنے پر مُثاب ہوتا ہے اگرچہ یہ سب آثار اس کے ساتھ قائم فعل نہیں لیکن یہ سب اس کے اختیاری فعل سے متسبب ہوتے ہیں، انہی کے لیے متولد کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے،لوگوں نے اس بارے اختلافِ رائے کیا کہ آیا کہا جائے یہ فاعلِ سبب کا فعل ہیں؟ یا انہیں اللہ کی طرف مضاف کیا جائے؟ یا ان کے لیے کوئی فاعل نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ یہ فاعلِ سبب اور دیگر تمام اسباب کے مابین مشترک ہیں اس لیے تو ان کی وجہ سے اس کے لیے عملِ صالح لکھا جاتا ہے

مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ حسد امراضِ نفس میں سے ایک مرض ہے اور یہ اتنا عام ہے کہ قلیل لوگ ہی اس سے محفوظ رہتے ہیں اسی لیے کہا جاتا ہے: (مَا خَلَا جَسَدٌ مِنْ حَسَدٍ) (یعنی کوئی جسد حسد سے خالی نہیں) لیکن کمینہ طبع آدمی اسے ظاہر کردیتا ہے جبکہ شریف شخص اسے پی جاتا ہے، حسن بصری سے کسی نے پوچھا کیا مومن حسد کرتا ہے؟ کہنے لگے تمہارا باپ نہ ہو (یہ عربوں کا عتاب کا ایک روایتی جملہ تھا) تمہیں برادرانِ یوسف یاد نہیں؟ لیکن اگر تم اسے اپنے سینے میں چھپائے رکھو تو یہ تمہیں نقصان نہ دے گا، ہاں اگر ہاتھ یا زبان پر اس کا اجراء کرو تب یہ گناہ ہے تو جو اپنے دل میں کسی کی نسبت حسد کا مادہ پائے اسے چاہیے کہ اب اس کے ساتھ صبر اور تقویٰ استعمال کرے تو اپنے آپ میں اسے مکروہ سمجھے، کثیر لوگ جن کے پاس تدیُّن ہے وہ محسود پر کوئی زیادتی نہیں کرتے اور اس کے خلاف ظالم کی مدد نہیں کرتے لیکن یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ذمہ واجب حق کا قیام نہیں کرتے اگرچہ اپنے سامنے اس کی بدگوئی کرنے والے کی ہمنوائی نہیں کرتے مگر اس کے مَحامد کا بھی ذکر نہیں کرتے اسی طرح اگر کوئی اس کی تعریف کرے تو چپ رہتے ہیں، یہ لوگ اس کے حق میں مامور کے ترک کے مَدین اور اس بارے تفریط اور کوتاہی کے مرتکب ہیں البتہ اس پر زیادتی کرنے میں شریک نہیں، ان کی جزا یہ ملتی ہے کہ خود ان کے ساتھ بھی کبھی یہی سلوک ہوجاتا ہے جس طرح انہوں نے اس محسود کی مدد نہ کی اسی طرح وقت آنے پر کوئی ان کی بھی مدد نہیں کرتا اور ان کی بدگوئیاں سننے پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے!

لیکن جو قول یا فعل کے ساتھ اعتداء کرے وہ قابلِ عقوبت ہے اور جس نے تقوی اور صبر کی روش اختیار کی اور ظالموں کی صف میں شامل نہ ہوا اللہ اسے اس کے تقویٰ کے ساتھ نفع دے گا جیسے حضرت زینب بنت جحش کے ساتھ ہوا، یہ حضرت عائشہ سے فخر و مباہات میں مقابلہ کیا کرتی تھیں اور عورتوں کے ہاں حسد کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بالخصوص سوتنوں میں کہ وہ شوہر کے کسی کی طرف زیادہ التفات کی وجہ سے غیرت کھا جاتی ہیں کیونکہ کئی دفعہ مشارکت کے سبب کسی کے حق میں کوئی کمی بیشی ہو جاتی ہے، اس طرح کا حسد عہدے، ریاست اور مال میں مشارک دو اشخاص کے درمیان بھی کثیر طور سے واقع ہے جب کسی کو زیادہ فائدہ ہو اور کسی کو کم اور نظراء کے درمیان بھی بکثرت اس کا وقوع ہے کیونکہ انہیں برا لگتا ہے کہ دوسرا ان سے فائق اور افضل ہو جائے جیسے برادرانِ یوسف نے حسد کیا اور جیسے حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کا معاملہ ہوا، قابیل کے حسد کرنے کی وجہ یہ بنی کہ اللہ نے ہابیل کی قربانی قبول کر لی تھی اور اس کی نہ کی تھی تو یہ حسد اس وجہ سے تھا جو اللہ نے ہابیل کو ایمان وتقوی کے ساتھ فضیلت دی اور جیسے یہود کا اہلِ اسلام سے حسد، قابیل کو حسد نے ہابیل کے قتل پر آمادہ بنا دیا اسی لیے کہا گیا اولین گناہ اللہ کی جس کے ساتھ معصیت کی گئی تین ہیں: حرص، تکبر اور حسد

تو حرص حضرت آدم سے، تکبر ابلیس سے اور حسد قابیل سے صادر ہوا، ایک حدیث میں ہے تین چیزیں ہیں جن سے کوئی نجات نہیں پا سکتا حسد، بدگمانی اور اور نحوست پکڑنا اور فرمایا میں تمہیں اس سے خلاصی کا طریقہ بتلاتا ہوں، اگر حسد آئے تو بغض نہ کرو، بدگمانی آن گھیرے تو تحقیق کرنے میں نہ پڑو اور نحوست کا خیال آڑے آئے تو پرواہ نہ کرو اور کر گزرو، اسے ابن ابوالدنیا نے حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا، سنن میں مروی ہے کہ تم میں بھی سابقہ امم کی داء سرایت کر چکی ہے: حسد اور بغضاء حالقہ ہے (لفظی معنی: بال مونڈنے والی) یہ نہیں کہ بال مونڈتی ہے بلکہ یہ دین کو مونڈھ ڈالتی ہے، تو یوں اسے داء (بیماری) کہا جیسے ایک حدیث میں بخل کو بھی داء کہا جب فرمایا: (وَ اَیُّ دَاءٍ اَدْوَاُ مِـنَ الْبُـخْـلِ) (بخل سے بڑی بیماری کیا ہوگی) ایک دعائے ماثور کے الفاظ ہیں: (اَعُـوْذُ بِكَ مِـنْ مُـنْـكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَهْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ) (میں تیرے ساتھ برے اخلاق، خوہشات اور امراض سے پناہ مانگتا ہوں) تو ادواء کا اخلاق اور اہواء پر عطف ڈالا، خلق وہ ہوتا ہے جو نفس کا معمول، عادت اور طبیعت بن جائے، فرمایا: **(وَاِنَّكَ لَـعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ) [القلم: ۴]** (اور تم عظیم خلق والے ہو) ابن عباس، ابن عیینہ اور احمد بن حنبل نے اس کی تفسیر میں کہا: (عَلٰی دِیْنٍ عَظِیْمٍ) ابن عباس سے: (عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَامِ) بھی منقول ہے، حسن بصری نے کہا: (اَدَبُ الْقُرْآنِ هُوَ الْـخُـلُقُ الْعَظِیْمُ) (یعنی قرآن کا ادب۔ تعلیم۔ خلقِ عظیم ہے) جہاں تک ہوئی تو کبھی یہ عارض ہوگا اور داء مرض ہے اور یہ دل کا تألم اور اس میں فساد کا ہونا، پہلی حدیث میں حسد کو بغضاء کے ساتھ مقرون کیا اس لئے کہ حاسد کو اولاً کسی غیر پر اللہ کا فضل برا لگتا ہے پھر وہ اسے مبغوض بنا لینے کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ لازم کا بغض ملزوم سے بغض کو مقتضی ہے تو اللہ کی نعمت جب لازم ہے اور وہ اس کے

زوال کا خواہاں ہے اور یہ زائل نہ ہوگی مگر اس کے زوال کے ساتھ تو اس سے بغض کرنے لگا اور اس کے عدم کا خواہشمند بنا، حسد بغی (ظلم وزیادتی) کا موجب بھی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ نے سابقہ امم بارے ہمیں خبر دی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد (بَغْیاً بَیْنَھُمْ) (یعنی ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہوئے) باہم اختلاف کیا تو ان کا یہ اختلاف عدمِ علم کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حق کو جان لیا تھا لیکن ان کے بعض کی بعض پر بغی کی رو سے جیسے حاسد محسود پر بغی کرتا ہے، صحیحین میں حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا ایک دوسرے سے حسد اور بغض نہ کرو اور نہ سازشیں اور نہ مقاطعہ کرو اور اے اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ، کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی سے مقاطعہ کرے کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ ایک طرف اور وہ دوسری طرف نکل جائے اور دونوں میں بہترین وہ ہے جو سلام میں پہل کرے، حضرت انس سے مروی ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ بخدا تم میں سے کوئی مومن نہ ہوگا حتی کہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، فرمایا:

(وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا)

[النساء : ۷۲۔۷۳] (اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ دیر لگاتا ہے پھر اگر تم پر کوئی مصیبت پڑ جائے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی کہ میں ان میں موجود نہ تھا۔ اور اگر اللہ تم پر فضل کرے تو اسی طرح سے کہ گویا تم میں اس میں دوستی تھی ہی نہیں، کہتا ہے کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو عظیم کامیابی حاصل کرتا) تو یہ مبطئون اپنے مومن بھائیوں کی نسبت وہ کچھ پسند نہ کرتے تھے جو انہیں اپنے لیے پسند تھا بلکہ ان پر اگر کوئی مصیبت آتی تو خوش ہوتے کہ وہ اس سے محفوظ ہیں اور اگر اللہ انہیں کسی خوشی اور نعمت سے نوازتا تو اس پر انہیں خوشی نہ ہوتی بلکہ چاہتے کہ کاش ان کے لیے اس سے کوئی حظ ہوتا تو ان کی خوشی اور فرحت کا معیار دنیا ہی دنیا تھی کیونکہ انہیں اللہ، رسول اور دارِ آخرت سے کوئی محبت ورغبت نہ تھی وگرنہ اپنے مومن بھائیوں کی نسبت ان کی روش یہ نہ ہوتی، صحیحین میں عامر سے مروی ہے کہ میں نے نعمان بن بشیر سے سنا اثنائے خطبہ کہہ رہے تھے میں نے نبی اکرم کو فرماتے ہوئے سنا مسلمانوں کی باہمی محبت ومودت اور آپس کی شفقت اور رحم دلی کی مثال جسدِ واحد کی سی ہے کہ اگر کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف لاحق ہو تو سارا جسم بخار اور بیداری کے ساتھ اس کی غمخواری کرتا ہے، صحیحین میں ابوموسی اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا مومن دوسرے مومن کے لیے دیوار کی مانند ہے جس کا بعض بعض کو مضبوط رکھتا ہے، یہ کہتے ہوئے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں ڈالا

لالچ اور بخل امراض ہیں اور حسد بخل سے بھی بدتر ہے جیسے ابوداود کی نقل کردہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا حسد اس طرح نیکیوں کو کھا جاتا ہے جیسے آگ ایندھن کو کھاتی ہے اور صدقہ گناہ کو یوں مٹاتا ہے جیسے پانی آگ کو، اس لیے کہ بخیل اپنے آپ کو محروم رکھتا ہے جبکہ حاسد بندوں پر اللہ کے انعامات سے خار کھاتا ہے اور یہ اسے ناگوار لگتا ہے! کبھی آدمی میں اس شخص

کے لیے اِعطاء ہوتا ہے جواس کی اغراض میں اس کا مدد گار بنتا ہے اور اپنے نظراء کے لیے حسد کا مادہ ہوتا ہے اور کبھی حسد تو نہیں البتہ بخل ہوتا ہے اور شح اس کی اصل ہے، قرآن میں کہا:

(وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [الحشر : ٩] (اور جو شخص حرصِ نفس سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں) صحیحین میں نبی اکرم سے مروی ہے کہ فرمایا شح سے بچو کہ اس نے سابقہ امم کو ہلاک کرڈالا، اس نے انہیں بخل، ظلم اور قطع رحمی پر لگادیا، عبدالرحمٰن بن عوف دورانِ طواف بکثرت یہ دعا کیا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ قِنِیْ شُحَّ نَفْسِیْ) (اے اللہ مجھے میرے نفس کے لالچ سے بچا) ایک شخص نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا اگر میں اپنے نفس کی شح سے بچالیا جاؤں تو ظلم اور قطع رحمی سے بچالیا جاؤں گا اور حسد ظلم اور حق تلفی کا موجب بنتا ہے۔

فصل

بخل اور حسد وہ مرض ہیں جو نفس کے اپنے لیے نافع سے بغض کا موجب بنتے ہیں بلکہ اس کے لیے ضرر رساں حب کے بھی، اسی لیے حسد کو حقد اور غضب کے ساتھ مقرون کیا جاتا ہے، کبھی اس کے ساتھ نفس کا اپنے لیے نافع سے بغض مقترن ہوتا ہے، جہاں تک شہوت اور عشق کی بیماری تو یہ نفس کی اپنے لیے ضار سے حب اور کبھی اس کے ساتھ اس کا اپنے لیے نافع سے بغض بھی مقترن ہوتا ہے، عشق ایک نفسانی مرض ہے جب بدن میں اس کا اثر قوی ہو تو وہ جسم میں مرض بن جاتا ہے، یا تو دماغی امراض میں سے جیسے مالیخولیا، اسی لیے اس بارے کہا جاتا ہے کہ وہ مالیخولیا سے مشابہ وسواسی مرض ہے اور یا بدن کے امراض سے جیسے ضعف اور لاغر پن وغیرہ، یہاں مقصود مرضِ قلب ہے تو یہ نفس کی اپنے لیے ضار سے محبت کی اصل، مریض بدن والے کی مانند جو اپنے لیے ضرر رساں چیزوں کی اشتہاء کرتا ہے اور اگر اسے نہ کھائے تو متالم ہوتا ہے (جیسے ہیروئن کا نشہ کرنے والے) لیکن اگر کھائے تو اس کی بیماری بڑھتی اور شدید ہوتی رہے گی اسی طرح عاشق کو معشوق کے ساتھ اس کا اتصال۔ چاہے مشاہدہ کی صورت میں ہو یا ملامست یا اس کی آواز کے سماع کی شکل میں۔ نقصان دیتا ہے بلکہ اس کے بارے میں سوچنا اور تخیل بھی مگر وہ یہ کیے بغیر رہ نہیں سکتا، اگر اس میں رکاوٹ ڈالی جائے تو متالم اور متعذب (یعنی تکلیف میں) ہوتا ہے لیکن اگر کرنے دیا جائے تو اس کی بیماری بڑھتی رہے گی اور یہ زیادتِ الم کا سبب ہوگا

ایک حدیث میں ہے **اللہ تعالی اپنے بندہِ مومن کو دنیا سے ایسے پرہیز کراتا ہے جیسے تم اپنے مریضوں سے کھانے پینے کا پرہیز کراتے ہو**، وہب کے حوالے سے امام احمد نے کتاب الزہد میں حضرت موسی کی مناجات نقل کی جس میں ہے اللہ تعالی کہتا ہے میں اپنے اولیاء کے دلوں میں دنیا کی نعمتوں اور اس کی آسائشوں کے بارے میں بے رغبتی ڈال دیتا ہوں جیسے شفیق چرواہا اپنے اونٹوں کو خطرے والی چرنے کی جگہوں سے دور رکھتا ہے اور میں دنیا کے سکون وعیش سے انہیں بچاتا ہوں

اور یہ ان کے مجھ پر ہوان (ذلیل اور ہلکا ہونے) کی وجہ سے نہیں لیکن تا کہ میری طرف سے عطا شدہ کرامت سے اپنا پورا حصہ لیں اور اسے دنیا کی آلائشوں سے محفوظ بنالیں، یہ نہ ہو کہ ہوائے نفس اسے بجھا دے، مریض کو شفا تبھی ملے گی جب اس کا مرض زائل ہوگا بلکہ اس کے دل سے اس مذموم محبت کے زوال سے، **عشق کے ذیل میں لوگوں کے دو موقف ہیں**:

۱۔ کہ یہ ارادات کے باب سے ہے اور یہی مشہور ہے

۲۔ کہ یہ تصورات کے باب سے ہے اور یہ تخیل میں فساد ہے اس طور کہ وہ معشوق کا تصور کرتا رہتا ہے کہ اب وہ کیا کر رہا ہوگا یا کس حال میں ہوگا (بقول شاعر: بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے) ان کا کہنا ہے اسی لیے اللہ کو عشق کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاتا اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عشق کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس سے منزہ ہے اور وہ قابلِ تعریف نہ ہوگا جو اس کے بارے میں فاسد خیال کا تخیل کرے، اول موقف والوں میں سے بعض قائل ہیں کہ اللہ کو عشق کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے کیونکہ عشق تام اور کامل محبت کا نام ہے اور اللہ محبت کرتا ہے اور اس کے ساتھ بھی محبت کی جاتی ہے، عبدالواحد بن زید سے منقول ہے کہ کہا میرا بندہ میرا تقرب کرتا ہے، مجھ سے عشق کرتا ہے اور میں اس سے عشق کرتا ہوں، یہ بعض صوفیہ کا قول ہے لیکن جمہور اللہ کے حق میں عشق کے لفظ کا اطلاق نہیں کرتے اس لیے کہ عشق مناسب اور مطلوب حد سے زائد اور افراط کا شکار محبت ہے اور اللہ تعالی کی محبت کی کوئی انتہا نہیں، وہ کسی حد تک منتہی نہیں ہو سکتی کہ اس سے تجاوز نہ کر سکتی ہو

یہ کہتے ہیں عشق مطلقاً مذموم ہے قابلِ تعریف نہیں، نہ خالق کی محبت میں اور نہ مخلوق کی محبت میں کیونکہ یہ محمود حد سے زائد مفرط محبت ہے، نیز عشق کا لفظ عرفِ عام میں انسان کی کسی عورت یا لڑکے سے محبت میں استعمال ہوتا ہے اہل، مال وطن، جاہ وحشمت اور انبیاء وصالحین سے محبت میں اسے استعمال نہیں کیا جاتا اور یہ کثیر اوقات فعلِ محرم کے ساتھ مقرون ہوتا ہے یا تو غیر محرم عورت سے یا لڑکے سے محبت میں، اس کے ساتھ نظر مقترن ہوتی ہے اور حرام لمس اور دیگر کئی محرم افعال! جہاں تک آدمی کی اپنی بیوی یا لونڈی سے ایسی محبت جو حدِ اعتدال سے متجاوز ہو اس طور کہ اس کی خاطر ناجائز فعل کرے اور واجب کا ترک کر دے جیسا کہ یہ کثیر الوقوع ہے حتی کہ اپنی نئی محبت کی خاطر پہلی بیوی کی اولاد پر ظلم کرتا ہے اور اس کے ایسے مطالبات پورے کرتا ہے جو دین و دنیا کے لحاظ سے اس کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں مثلاً حق سے زائد مال دے دینا یا پہلی کو ترکہ سے محروم کر دینا یا فضول خرچی میں پڑ جانا وغیرہ اور یہ اس کے عشق میں جس سے قربت اس کے لیے مباح ہے تو اجنبی عورت اور لڑکوں وغیرہ سے عشق میں کیا حالت ہوگی؟ اس سے ایسی خرابی پیدا ہوتی ہے جس کا اندازہ سوائے رب العباد کے کسی کو نہیں، یہ ان امراض سے ہے جو ایسا کرنے والے کے دین اور اس کی عزت و ناموس کا بیڑا غرق کر ڈالتی ہیں پھر کبھی اس میں پڑ کر اس کے ہوش و خرد جواب دے جاتے ہیں پھر اس کا جسم بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، فرمایا:

(فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهِ مَرَضٌ) [الأحزاب : ۳۲] (تو نرم لہجہ میں باتیں نہ کرو کہ مبادا وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے کوئی طمع لگالے) جس کے دل میں شہوت کا مرض ہو اور ارادہ صورت تو جب مطلوب ذرا جھکاؤ کا مظاہرہ کرے تو مریض کو طمع ہونے لگتی ہے اور طمع ہے جو ارادہ اور طلب کو قوی کرتی ہے اور مرض اس کے ساتھ قوی اور شدید ہوتا ہے بخلاف اس کے کہ جسے مطلوب سے مایوسی ہوتو مایوسی طمع کو زائل کرتی ہے تو ارادہ کمزور پڑ جاتا ہے اور محبت کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان عموماً جس سے مایوس ہو اس کی طلب نہیں کرتا تو اصلاً ہی ارادہ پرعمل نہیں ہوتا بلکہ یہ حدیثِ نفس ہے (یعنی دل کا خیال) الا یہ کہ اس کے ساتھ کلام یا نظر وغیرہ مقترن ہو تب وہ اس کے ساتھ آثم ہوگا لیکن اگر کوئی عشق کے ساتھ ابتلاء میں پڑا مگر عفت اور صبر سے کام لیا تو اس تقوی پر اللہ کے ثواب کا حقدار بنے گا، ایک حدیث میں مروی ہے جس نے عشق کیا اور عفت اور صبر کا مظاہرہ کیا پھر مر گیا تو وہ شہید ہے، یہ یحی قتات کی مجاہد عن ابن عباس سے مرفوع روایت ہے مگر اس میں نظر ہے، یہ قابلِ احتجاج نہیں لیکن بہرحال شرعی ادلہ کے ساتھ معلوم ہے کہ انسان نظر، قول اور عمل کے لحاظ سے محرمات سے عفاف کا مظاہرہ کرے اور چھپائے رکھا اس کا افشاء نہ کیا تاکہ کوئی حرام یا غلط بات منہ سے نہ نکل جائے از قسم مخلوق سے شکوہ یا فحش گوئی یا معشوق سے کوئی طلب، اور اللہ کی اطاعت پر صبر کیا اور اس کی معصیت سے بچا رہا اور عشق کا درد والم دل میں چھپائے رکھا تو اس پر وہ ثواب کا مستحق ہوگا جیسے مصیبت کی الم پر صبر کرنے پر ثواب ہے اور یہ اس فرمانِ خداوندی کا مصداق بنے گا:

(اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) (کچھ قبل گزری) اور اسی طرح حسد کا مرض اور دیگر امراضِ نفوس ہیں، اگر نفس ایسی چیز کے جھانسے میں نہ آئے تو اس فرمانِ الٰہی میں داخل ہو:

(وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى) [عبس : ۴۰-۴۱] (اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور نفس کو خواہشوں سے روکتا رہا۔ اس کا ٹھکانہ بہشت ہے) نفس کو اگر کسی شئ سے محبت ہو تو وہ ہر ممکن طرح سے اس کی حصول کی کوشش کرتا ہے حتی کہ کئی اور امور میں بھی جو سب اسی غایت کے لیے مقامات ہوں تو جس نے مذموم محبت کی یا مذموم بغض کیا اور یہ روش اختیار کی تو وہ آثم ہوا، مثلاً کہ مارے حسد کے کسی سے بغض کیا تو اس کے اس اقدام سے اس شخص کے لیے ایذاء ہے، یا تو اس کے حق کی تلفی کے ساتھ یا اس پر عدوان کرتے ہوئے یا اس کے ساتھ اپنی ہوائے نفس سے محبت کرتے ہوئے تو اس کی خاطر حرام فعل کیا یا کام تو اللہ کے ہاں سے مامور ہی کیا مگر اسے اپنی ہوائے نفس کی خاطر کیا نہ کہ اللہ کے لیے، تو یہ نفوس کے امراض ہیں، انسان کبھی کسی شئ سے بغض رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے کثیر دیگر امور سے بھی بغض کرے گا اور یہ مجرد وہم وخیال سے، اسی طرح کا معاملہ کبھی اس کسی شئ محبت کا ہوتا ہے تو اس وجہ سے کثیر دیگر امور سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور یہ سب وہم وخیال کی رو سے جیسے ایک شاعر نے کہا:

أُحِبُّ لِحُبِّهَا السُّوْدَانَ حَتّٰی أُحِبُّ لِحُبِّهَا سُوْدَ الْكِلَابِ

(میں اس کی محبت کی وجہ سے کالوں سے محبت کرنے لگ گیا ہوں حتی کہ اس کی محبت میں سیاہ کتے بھی اچھے لگنے لگے ہیں) اسے ایک سیاہ فام خاتون سے محبت ہوگئی تھی تو اس کی وجہ سے ہر سیاہ رنگ کی چیز سے محبت کرنے لگا حتی کہ سیاہ رنگ کے کتوں سے بھی، یہ سب دل کا مرض ہے اس کے تصور و ارادہ میں، اللہ سے دعا گو ہیں کہ ہمارے دلوں کو ہر داء سے محفوظ رکھے اور ہم منکرات اخلاق، اہواء اور ادواء سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں، دل کی وجہِ تخلیق یہ ہے کہ وہ اللہ سے محبت کرے، یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انساں کو فطر کیا ہے جیسے نبی اکرم نے فرمایا ہر نومولود فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے تو اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسے چوپایہ صحیح وسالم بچہ جنتا ہے! کیا تم کوئی کان کٹا پاتے ہو؟ پھر ابوہریرہ نے کہا چاہو تو یہ آیت پڑھ لو:

(فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا) [الروم : ۳۰] (اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے) اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا تو اللہ سبحانہ وتعالی نے بندوں کو اپنی محبت اور اپنی وحدہ کی عبادت پر فطر کیا ہے، اگر فطرت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دل اللہ کا عارف، اس کا محبّ اور اس اکیلے کا عابد بنے گا لیکن فطرت کو بیمار اور آلودہ کر دیا جاتا ہے جیسے حدیث میں گزرا، تو یہ سب بوجہ فطرت کی تبدیلی اور اس کی تغییر ہے اگرچہ اللہ کی قضاء وقدر سے ہے، جیسے بدن کو کسی قسم کی معذوری کے ساتھ متغیر کر دیا جاتا ہے پھر اگر اللہ کی توفیق وتیسیر شاملِ حال ہو تو آدمی اپنی فطرت کی طرف پلٹ بھی آتا ہے، تمام رسل اسی فطرت کی تقریر وتائید اور تکمیل کرنے کے لیے مبعوث ہوئے نہ کہ اس کی تغییر وتبدیل کے لیے، اگر دل اللہ وحدہ کی حب میں مخلص ہو تو وہ اصلاً ہی کسی غیر اللہ کی محبت میں مبتلا نہیں ہوتا چہ جائے کہ عشق کرے، اگر کسی کو عشق کی بیماری لاحق ہے تو یہ اس کی اللہ وحدہ سے محبت میں نقص کی وجہ سے ہے، اسی لئے حضرت یوسف چونکہ اللہ وحدہ کی حب میں مخلص تھے تو اس میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہے بلکہ اللہ نے کہا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[یوسف : ۲۴] (یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہیں) جہاں تک عزیزِ مصر کی بیوی تو یہ اور اس کی قوم مشرک تھی اسی لیے عشق میں مبتلا ہوئی، کوئی بھی عشق میں مبتلا نہیں ہوتا مگر توحید وایمان میں اپنے نقص کی وجہ سے وگرنہ جو دل اللہ کی طرف انابت کرنے والا اور اس سے خائف ہو تو اس میں عشق سے پھیرنے والے دو صارف ہوئے: ایک اللہ کی طرف اس کی انابت اور اس سے اس کی محبت تو یہ اسے ہر شئ سے اَلذ واَطیب لگے گا، اگر دل اللہ کی محبت سے لبریز ہے تو اس میں کسی مخلوق کی محبت کی گنجائش ہی نہ ہوگی، اور دوم اللہ سے اس کا خوف، عشق کا مضاد خوف اسے پھیر دے گا، ہر جس نے کسی شئ سے عشق یا غیرِ عشق کے ساتھ محبت کی تو وہ اپنی محبت سے اس کی محبت کے ساتھ اس سے پھیر لیا جائے گا جو اس سے اسے زیادہ محبوب ہے اگر وہ اس کے مزاحم ہے اور وہ اپنی محبت سے حصولِ ضرر کے خوف کی وجہ سے اس سے منصرف ہو جائے گا جو اس حب کے ترک سے اسے ابغض ہے تو

جب اللہ ہر شئ سے بڑھ کر بندے کو محبوب ہو اور ہر شئ سے زیادہ اخوف ہو تو اسے عشق ومزاحمت اسی صورت لاحق ہو سکتے ہیں کہ وہ غفلت میں ہو یا یہ حب وخوف کمزور وناقص ہوں، بعض واجبات کے ترک یا بعض محرمات کے فعل کی وجہ سے کیونکہ اعمالِ طاعت کرنے سے ایمان بڑھتا اور معصیت سے اس میں کمی آتی ہے تو جوں جوں بندہ اللہ کی محبت اور اس سے خوف میں طاعت کے فعل کرے اور معصیت کا ترک کرے تو اللہ سے اس کی محبت اور اس سے اس کا خوف قوی اور شدید ہوں گے اور دل سے غیر اللہ کی محبت اور خوف زائل ہوتا جائے گا، اسی طرح بدن کے امراض ہوتے ہیں تو بالمثل صحت محفوظ رہتی ہے جبکہ مرض بالضد دور ہوتا ہے تو ایمان کے ساتھ دل کی صحت بالمثل محفوظ ہوگی اور یہ جو دل کو علمِ نافع اور عملِ صالح سے ایمان کا وارث بنائے، یہ بندے کے لیے (روحانی) غذائیں ہیں جیسے ابن مسعود سے مرفوع وموقوف دونوں طرح مروی ایک حدیث میں ہے کہ ہر آدِب (یعنی میزبان) اپنے دسترخوان پر مدعوین کا آنا پسند کرتا ہے اور اللہ کا دسترخوان قرآن ہے، گویا یہ لوگوں کے لیے اللہ کی ضیافت کا سامان ہے (آگے کچھ جگہ خالی ہے) مثلاً آخرِ شب، اوقاتِ اذان واقامت، حالتِ سجدہ میں اور نمازوں سے سلام پھیر کر (یعنی ان میں اللہ کی طرف رجوع کرنے اور دعائیں کرنے کی بڑی فضیلت ہے) اور اس کے ساتھ استغفار کو بھی ضم کیا جائے!

جس نے استغفار کیا اور توبہ کی اللہ اسے ایک مقررہ اجل تک متاعِ حَسن سے متمتع فرمائے گا، بندے کو چاہیے کہ دن کے وقت اور سوتے وقت کچھ اذکار کا ورد کرنا اپنا معمول بنالے اور جو موانع وصوارف آڑے آئیں ان پر صبر کرے تو عین قریب ہے کہ اللہ تعالی اپنی روح کے ساتھ اس کی تائید کردے اور اس کے دل میں ایمان لکھ دے، بندے کو چاہیے کہ نمازِ پنجگانہ باطنی اور ظاہری لحاظ سے بااحسن طریق ادا کرنے کی حرص کرے کیونکہ نماز دین کا اہم ستون ہے، اس کی لگام (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) کا ورد ہونا چاہیے تو اس کے ساتھ بوجھ اٹھائے جاتے ہیں اور اہوال برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہوتا اور بلند مقامات واحوال کا حصول ونیل ہوتا ہے، دعاء وطلب سے کبھی نہ اکتائے، بندہ جب تک استعجال نہ کرے اس کی طلب ایک دن ضرور پوری ہوگی، یہ نہ کہے دعائیں کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا قبول ہی نہیں ہوتیں، یہ بات ذہن میں رکھے کہ نصر صبر کے ساتھ اور فرج (کشائش) کرب کے ساتھ ہے اور ہر تنگی کے بعد آخر آسانی ہونا ہی ہوتی ہے، نبی ہو یا غیرِ نبی خاتمہ بالخیر کا حصول صبر ہی کے ساتھ ہوتا ہے، اس تحریر کا اختتام حمد وثناء اور درود وسلام پر کیا۔

فصل (سابقہ بحث کا تتمہ)

ہم نے کئی جگہ ذکر کیا کہ انسان کے حال کی صلاح عدل میں اور اس کی خرابی ظلم میں ہے، اللہ نے اس کی خلقت کے ضمن میں عدل وتسویہ سے کام لیا ہے، انسان کے جسم کی صحت اور اس کی عافیت اس کے اخلاط واعضاء کے اعتدال سے ہے، اس میں اگر انحراف ومیل (یعنی اونچ نیچ اور کوئی کمی بیشی) ہو تو مرض حادث ہو جائے گی، اسی طرح دل کی استقامت، اعتدال، اقتصاد،

صحت اور عافیت اوراس کی اصلاح، یہ سب باہم متلازم ہیں، اللہ تعالی نے اپنی کتابِ مقدس کے متعدد مقامات میں دلوں کی مرض اوران کی شفاء کا ذکر کیا ہے، نبی اکرم کی سنت میں بھی یہ وارد و مذکور ہے جیسے منافقین بارے کہا:

(فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا) [البقرة : ١٠] (ان کے دلوں میں مرض ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا)

(فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ)[المائدة : ٥٢] (تو جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے تم انہیں دیکھو گے کہ ان میں دوڑ دوڑ کے ملے جاتے ہیں)

(وَیَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ وَیُذْهِبْ غَیْظَ قُلُوْبِهِمْ) [التوبة : ١۴۔ ١٥] (اور مومنوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔اوران کے دلوں سے غصہ دُور کرے گا)

(قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ) [یونس : ٥٧] (تمہارے پاس رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماریوں کی شفا آ پہنچی ہے)

(وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ) [الإسراء : ٨٢] (اور ہم قرآن سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کیلئے شفا اور رحمت ہے)

(قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّشِفَآءٌ) [حم فصلت : ۴۴] (کہہ دو کہ جو ایمان لاتے ہیں ان کے لئے ہدایت اور شفا ہے)

(فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ)(ابھی گزری)

(لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِهِمْ) [الأحزاب : ٦٠] (اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو بُری بُری خبریں اڑایا کرتے ہیں سے باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے)

(وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا) [الأحزاب : ١٢] (اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اوراس کے رسول نے تو ہم سے محض دھوکے کا وعدہ کیا تھا)

ایک حدیث میں فرمایا: کیوں نہیں پوچھ لیا جب خود انہیں علم نہ تھا، کہ عی (یعنی عجز) کی شفاء سوال ہے، ہارون الرشید نے امام مالک سے کہا تھا:(اَلْآنَ شَفَیْتَنِیْ یَا مَالِکُ) (اب اے مالک آپ نے مجھے شافی جواب دیا ہے) بخاری میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ آدمی ہمیشہ خیر کے ساتھ رہتا ہے جب تک تقوی پر رہے جب کسی شیٔ کی تفسیر میں شک ہوتو کسی عالم سے پوچھتا ہے تو اسے شفاء ملتی ہے اور قریب ہے کہ ایسے علماء ناپید ہو جائیں، اللہ نے قلوب کی امراض اور شفاء بارے جو ذکر کیا وہ بمنزلہ ان کی موت وحیات سمع و بصر، عقل وصمم اوران کی کی عمیٰ (اندھے پن) کے ذکر کے ہے لیکن مقصود دل کی مرض کی معرفت ہے، اس سلسلہ

میں ہم کہتے ہیں کہ **مرض کی دو انواع ہیں:**

ا۔حس،طبیعی حرکت اور جو اس کے ساتھ ارادی حرکت متصل ہے، کا فساد اور ان دونوں کے فقدان سے الم وعذاب کا حصول ہے، جس طرح حس اور ارادی وطبیعی حرکت کی صحت کے ساتھ لذت ونعمت کا حصول ہے اسی طرح اس کے فساد کے ساتھ الم وعذاب حاصل ہیں اللہ کی بندوں پر کی ہوئی نعمتوں میں لذت وسرشاری ہے،فرمایا:

(ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ) [التكاثر : ۸] (پھر اس روز تم سے نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی) یعنی ان کے شکر بارے تو لذت کا سبب ملائم (یعنی مناسبِ حال) کا احساس جبکہ الم کا سبب منافی کا احساس ہے، لذت اور الم نفسِ احساس وادراک نہیں بلکہ یہ تو اس کا نتیجہ،ثمرہ،مقصود اور غایت ہے،مرض میں الم ہے جس سے چارہ نہیں اگر چہ بعض اوقات راجح معارض کی وجہ سے عارضی سکون مل جائے گا لیکن اس کا مقتضی اور موجب (یعنی جڑ) جب تک قائم ہے تو کسی ادنی سبب سے مرض شدت اختیار کر سکتی ہے مرض میں سببِ الم کا وجود الم ہے اور الم زائل تبھی ہوگی جب راجح معارض موجود ہوگا (یعنی دوا دارو) دل کی لذت اور الم جسم کی لذت والم سے اعظم ہے،میری مراد اس کی نفسانی (روحانی) الم اور لذت،اگر چہ اس میں اس طرح کی الم بھی ہو جاتی ہے جو بدن کے دیگر اعضاء میں بیماری وغیرہ کے سبب حادث ہو، یہ ایک دیگر شئ ہے تو اس لیے دل کی مرض اور شفاء جسم کی مرض اور شفاء سے اعظم ہے،تو کبھی یہ منجملہ شبہات ہوگا جیسے کہا:

(فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ) [الأحزاب: ۳۲] (پس نرم لہجہ میں باتیں نہ کرو کہ مبادا وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے کوئی طمع لگالے) اور جیسے خرائطی نے اس عنوان سے ایک کتاب تالیف کی ہے:(اِعْتِلَالُ الْقُلُوْبِ بِالْاَهْوَاء) (دلوں کا خواہش پرستی کی علت میں مبتلا ہونا) تو منافقین کے قلوب میں دونوں جہت سے مرض موجود ہے: اعتقادات کے فساد کی جہت سے بھی اور ارادات کے فساد کی جہت سے بھی،مظلوم کے دل میں بھی مرض ہے اور یہ جو کسی کے اس پر ظلم وزیادتی کے سبب الم حاصل ہوتی ہے اگر اسے اس کا حق مل جائے تو اس کا دل مشتفی ہو جاتا ہے جیسے کہا:(وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ)[التوبة : ۱۴] (اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔اور ان کے دلوں سے غیظ و غصہ دُور کرے گا) تو دل کا غیظ اس سے دفعِ اذی والم کی خاطر ہوتا ہے جب یہ دور ہو جائے اور وہ اپنا حق وصول کر لے تو اس کا غیظ ختم ہو جائے گا تو اسی طرح انسان جب ایسی حالت میں ہو جائے کہ نہ اپنے کانوں سے سنے، نہ اپنی آنکھوں سے دیکھے اور نہ اپنی زبان سے نطق کرے تو یہ مولم مرض ہے جو کئی مصالح سے اسے محروم اور کئی مضار کی اس کے لیے تحصیل کرے گا،اسی طرح اگر وہ حق بات سننے سے کان بند کر لے،آنکھیں موند لے، دل اس سے پھیر لے اور خیر کی شر اور غیّ کی رَشاد سے پرکھ اور تمییز نہ کرے تو یہ اس کے دل کی بڑی بیماریوں میں سے ہے اور اس کے لیے باعثِ الم ہے جیسے کلی شہوت کے عالم میں ضرورت سے زائد کھانا

تناول کر لینا اور مثلاً مٹی وغیرہ کھانا مرض ہے، اس سے وہ متألم ہوگا جب تک اس کی الم زائل نہ ہو اس اکل کے ساتھ جو اول سے زیادہ الم کا موجب بنے تو وہ اگر کھائے تو بھی متالم ہوگا اور اگر نہ کھائے تو بھی متالم ہوگا، اسی طرح اگر کسی ایسے کی حب میں مبتلا ہو اجسے عشق ونحوہ کا کوئی نفع نہیں، برابر ہے کہ یہ کسی صورت، ریاست یا مال وغیرہ کے لیے ہو تو اگر اس کا محبوب ومطلوب حاصل نہ ہوا تو وہ متالم، مریض، مضطرب اور سقیم ہوگا اور اگر محبوب حاصل ہوا تو اس کی مرض، الم، اضطراب اور سقم اور بڑھے گی جیسے مریض کو جب طعام وشراب برا لگنے لگتا ہے تو الم حاصل ہوتی ہے اور اس حالت پر دوام اس کے لیے زیادہ اور شدید تر الم کا موجب ہوتا ہے حتی کہ اسے مار ڈالے الا یہ کہ نافع شئ اور جس کی اس کی حیات کو ضرورت ہے اس کی کراہت زائل ہو جائے (اور یہ تبھی ہوگا اگر بیماری کا توڑ ہو) تو حاسد شخص کا محسود پر ہوئی اللہ کی نعمت سے بغض مریض کے تندرستوں کے اکل وشرب سے بغض کی مانند ہے حتی کہ وہ انہیں کھاتے پیتے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا، اس کی اپنے حق کو قائم کرنے سے نفرت بیمار کی طعام وشراب سے نفرت کی طرح ہے تو اعتدال اور صحت سے خارج نفس میں حب اور بغض صحت اور اعتدال سے خارج جسم میں اشتہاء اور نفرت کی مثل ہے، دل کا اندھا اور گونگا پن اس امر سے کہ حقائق کو دیکھے اور نافع اور ضار کی پرکھ کرے جسم کے اندھا اور گونگا پن کی طرح ہے اس بات سے کہ وہ مرتب امور کو دیکھے، ان کے ساتھ تکلم کرے اور اپنے لیے نافع اور ضار کے مابین پرکھ کرے اور جیسے اندھا اگر دیکھ سکے تو اس بات کا واجد ہوگا کہ راحت، عافیت اور سرور ایک عظیم امر ہے اسی طرح دل کا اندھا اگر نورِ بصیرت پالے تو حقائق اس کے سامنے عیاں ہوں گے، دل کی بصر اور رویتِ حقائق اور ظاہری آنکھوں کی بصر کے مابین عظیم تفاوت اور فرق ہے جس کا شمار بجز اللہ کے کوئی نہیں کر سکتا، یہاں غرض ان دونوں قسم کی مرض کو ایک دوسرے سے تشبیہ دینا ہے تو ادیان کی طب ابدان کی طب کی مثل اور اس کے نقش پر ہے

حضرت سلمان (فارسی) نے حضرت ابو درداء کو خط میں لکھا کہ مجھے علم ہوا ہے کہ آپ طبیب کی حیثیت سے بیٹھنے لگے ہیں تو خیال رکھنا کسی کو (اپنے علاج سے) سے مار نہ دینا، اللہ نے اپنی کتاب نازل کی جو سینوں (یعنی دل) کے امراض کے لیے شفاء ہے، فرمایا: (وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا) (ابھی گزری) شفاء اسے حاصل ہوتی ہے جو دوا کا قصد کرے اور یہ اہلِ ایمان ہیں جنہوں نے اپنے دلوں کی داء کے ازالہ اور علاج کے لئے قرآن کو دوا بنا لیا، جسم کی مرض حدِ اعتدال سے شہوت اور طبیعی نفرت کے خروج کے ساتھ ہوتی ہے، جہاں تک اس شئ کی شہوت جو حاصل نہیں ہو سکتی یا نافع شہوت کا فقدان اور موزوں ومناسب سے نفور اور ضار سے نفرت کا فقدان اور یہ ادراک اور حرکت کی قوت کے ضعف کے ساتھ ہوگا تو اسی طرح دل کی مرض ہے جس کا سبب حب اور بغض کے جذبہ کا خارج از اعتدال ہو جانا ہے، اسی کو دوسرے لفظوں میں ہوائے نفس کہا گیا، فرمایا:

(وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ) [القصص : ۵۰] (اور اس سے بڑا گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت

چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے لگے)

(بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ) [الروم : ۲۹] (بلکہ ظالم بغیر سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں) جیسے جسم خارج از اعتدال ہوجائے گا جب بنا طبیب کے کہے انسان جسم کی ہر اشتہاء کو پورا کرنے پر لگ جائے (یعنی خود اپنا علاج کرنے لگ جائے اور کسی طرح کا پرہیز نہ کرے) اور یہ دل کے ادراک اور قوت کے ضعف کی وجہ سے ہوتا ہے حتی کہ وہ استطاعت نہیں رکھتا کہ جانے یا نافع اور اپنے لیے سازگار کا ارادہ وطلب کرے اور جیسے جاہل بیمار کبھی اپنے حسبِ اشتہاء کھا پی لیتے ہیں (یعنی بد پرہیزی کرتے ہیں) اور خود کو ناگوار لگنے والی ادویہ پر صبر نہیں کرتے اس وجہ سے جو اس میں ایک نوع (یعنی وقتی) کی راحت ولذت کی تعجیل ہے لیکن اس کا برا نتیجہ انہیں مرض والم کے شدید ہونے کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے، اس ضمن میں افراط کا نتیجہ جان کی تلفی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے تو یہی معاملہ بنی آدم کے ان جہال کا ہے جو خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں اور جو وقتی لذت کے حصول میں استعجال سے کام لیتے ہیں اور ان امور جو ان کے نفوس کو ناگوار لگتے ہیں کا ترک کردیتے ہیں حالانکہ یہ ان کے لیے موزوں اور موافق نہیں تو اس کا نتیجہ انہیں الم اور عقوبات (یعنی شرعی سزاؤں) کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے یا تو اس دنیا میں اور یا پھر آخرت کا عذاب اور نارِ جہنم

تقوی نافع کے فعل واختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ضار سے پرہیز اور اجتناب کا نام ہے، ضار سے اجتناب نافع کے استعمال کو مستلزم ہے اور جو نافع کا استعمال ہے تو کبھی ضار کا استعمال بھی ہوتا ہے تو یوں اس کا صاحب (یعنی ایسا کرنے والا) متقین میں شمار نہیں ہوتا، رہا ضار اور نافع دونوں کا استعمال یا دونوں کا ترک تو عموماً ایسا نہیں ہوتا، بندہ اگر غذا تناول کرنے سے عاجز ہو تو ایسے مواد کو اپنی غذا بنالے گا جو اس کے لیے ضار ہیں حتی کہ اس میں اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے اسی لیے عاقبت اہلِ تقوی ہی کے لیے ہے کیونکہ اپنے لئے ضار اشیاء اور امور سے احتراز اور اجتناب کرتے ہیں تو ان کیلئے عاقبت اور کرامت ہے اگرچہ آغاز میں الم اور مشقت پائیں، اعمالِ صالحہ بجالانے میں مشقت تو ہوتی ہی ہے جیسے کہا:

(كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ) [البقرة : ۲۱۶] (تم پر لڑنا فرض کردیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تمہیں بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگی اور وہ تمہارے لئے مضر ہو) اور مرغوب باطل اعمال کی کثرت کی وجہ سے جیسے اللہ تعالی نے کہا:

(وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى) (ابھی گزریں) اور کہا:

(وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ) [التوبة : ۷] (اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شوکت ہے وہ تمہارے ہاتھ آجائے) لیکن جو بچاؤ نہ کرے اس کا آخر کار برا نتیجہ اور انجام ہوگا، جس نے نافع کو تناول کیا مع معمولی تخلیط کے تو یہ اس شخص

سے اصلح ہے جس نے کامل پرہیز کیا مگر کڑوی کسیلی اشیاء (یعنی ادویہ اور پرہیزی طعام) تناول نہ کیا تو کامل پرہیز لیکن بلا اغتذاء مرض ہے تو اسی طرح وہ جس نے سیآت کا ترک تو کیا لیکن حسنات کا فعل نہ کیا

ہم نے قاعدہِ کبیرہ کے تحت بیان کیا کہ جنسِ حسنات ترکِ سیآت کی جنس سے انفع ہے جیسے جنسِ اغتذاء جنسِ احتماء (یعنی پرہیز) سے انفع ہے اور واضح کیا کہ یہ لنفسہٖ جبکہ وہ لغیرہٖ مقصود ہے، اپنے غیر کی طرف انضمام کے ساتھ اور جیسے مرض کے سبب سے اس کے حصول سے قبل ضروری پرہیز اس سے بچت اور اگر حاصل ہوجائے تو اس کا ازالہ ہے تو اسی طرح دل کے امراض کے ضمن میں بندہ شروع ہی سے حفظانِ صحت کے اصولوں کے خیال رکھنے کا محتاج ہے اور صحت کے اعادہ کا اگر مرض لگ جائے! صحت کی حفاظت بالمثل ہوتی ہے جبکہ مرض بالضد زائل ہوتا ہے تو دل کی صحت کی حفاظت ان میں موجود کے امثال کے استعمال کے ساتھ ہے یا جس سے علم وایمان کو تقویت ملے یعنی ذکر، تفکر اور مشروع عبادات میں سے ضد کے ساتھ یہ زائل اور فاسد ہوگی، شبہات کا ازالہ بینات کے ساتھ ہے، باطل کی محبت کو اس سے بغض اور حق سے محبت کر کے ہی زائل کیا جاسکتا ہے اسی لیے یحیی بن عمار نے کہا **علوم پانچ ہیں:**

۱۔ جو حیاتِ دنیا ہے اور یہ علمِ توحید ہے

۲۔ جو دین کی غذا ہے اور یہ قرآن وحدیث کے معانی کے تذکّر کا علم

۳۔ جو دین کی دوا ہے اور علمِ فتوی، جب بندے کو کوئی مسئلہ درپیش ہو جس میں وہ ایسے ذی علم کا محتاج ہے جس سے اسے شافی جواب ملے جیسے عبداللہ بن مسعود کا قول گزرا

۴۔ وہ علم جو دین کی داء اور مرض ہے اور یہ محدَث (یعنی زمانہِ مابعد کی پیداوار) علمِ کلام

۵۔ وہ علم جو دین کی ہلاکت ہے اور یہ جادو ونحوہ کا علم

جسمِ طبیعی میں مثل کے ساتھ صحت کی حفاظت اور ضد کے ساتھ مرض کا ازالہ ہے، یہی طریقہ دل کی دینی اور شرعی نفسانی امراض کے تدارک اور اس کی صحت کی حفاظت کا ہے نبی اکرم نے فرمایا ہر نومولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے تو اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی وغیرہ بنالیتے ہیں، راوی نے کہا اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو:

(فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا)[الروم : ۳۰] اسے صحیحین میں نقل کیا، قبل ازیں فرمایا:

(وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) إلى قوله : (وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) إلى قوله : (بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ) إلى قوله : (فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) [الروم : ۲۶۔۳۰] (اور آسمانوں اور زمین میں اُسی کے ہیں۔۔اور زمین میں اُس کی شان بہت بلند ہے۔۔مگر جو ظالم ہیں بغیر سمجھے اپنی خواہشوں کے

پیچھے چلتے ہیں۔۔تو تم ایک طرف کے ہوکر دین پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ، اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) تو خبر دی کہ اس نے بندوں کو حنیفاً اقامتِ وجہ پر فطر کیا ہے اور یہ اللہ وحدہ کی عبادت، بغیر کسی کو اس کا شریک بنائے تو یہ دل کے لیے طبیعی، مستقیم اور معتدل فطری حرکت ہے اور اس کا ترک ظلمِ عظیم ہے اور ایسا کرنے والے بغیر علم اپنی اہواء کی پیروی کرتے ہیں، اس فطرت وخِلقت کے لیے۔ اور یہ صحتِ خِلقت۔ ایسی قوت وغذا ضروری ہے جو علماً اور عملاً اسی کی نظیر ہو جس پر یہ مفطور ہے، اسی لیے دین کی تکمیل اور تمامیت منزّل شریعت کے ساتھ مکمل کی جانے والی فطرت کے ساتھ ہوتی ہے اور یہی اللہ کا دسترخوان ہے جیسے ابن مسعود سے مروی حدیث میں گزرا، اس کی مثال بارش کے پانی کی سی ہے جیسا کہ کتاب وسنت میں اس کے ساتھ تمثیل جاری ہوئی ! فطرت کو تبدیل کرنے والے اور دل کو اس کی استقامت سے بدلنے والے بیمار دل والے ہیں، اس کی شفا اللہ کی کتاب میں ہے، مومن کو دنیا میں جو مصائب لاحق ہوتے ہیں وہ جسم کو پہنچنے والے ان آلام کے بمنزلہ ہیں جن سے اس کی صحت بحال ہو اور اس کے فاسد مادے زائل ہوں جیسے ایک حدیث میں ہے کہ مومن کو جو مشقت، تھکاوٹ، پریشانی، غم، حزن اور تکلیف لاحق ہوا حتی کہ کانٹا بھی اگر چبھے تو اللہ اس کے ساتھ اس کی خطاؤں کی تکفیر کردیتا ہے اور یہ اس قولہ تعالیٰ کی تحقیق ہے:(مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ)[النساء : ۱۲۳] (جو شخص بُرے عمل کرے گا اُسے اُسی کا بدلہ دیا جائے گا)

جو اس دنیا میں ان امراض سے پاک وصاف ہوکر صحیح نہ ہو تو آخرت میں اللہ کی طرف سے عذاب کا شکار ہوکر اسے پاک وصاف ہونا ہوگا جیسے وہ شخص جس میں اخلاط (یعنی فاسد مادے) جمع ہوئے اور اس نے اپنے سے ان کے خروج وتصفیہ کے لیے ادویہ استعمال نہ کیں تو ان میں شدت آجائے گی اور آخر اس سے اس کا جانی اتلاف ہوسکتا ہے، ایک اثر میں ہے کہ لوگ جب مریض کے لیے کہتے ہیں اے اللہ اس پر رحم فرما تو اللہ کہتا ہے میں اس [بیماری] کے ساتھ اس پر رحم ہی تو کررہا ہوں، ایک حدیث میں فرمایا بیماری بیمار سے گناہ جھاڑ دیتی ہے جیسے خشک درخت اپنے پتے جھاڑتا ہے اور جیسے جسم کے بعض امراض مثلا طاعون، مبطون اور ذات الجنب (نمونیہ اور اندرونی ورم) کے مرض کی وجہ سے اگر کوئی فوت ہوجائے تو وہ شہید (کے درجہ میں) ہوگا، اسی طرح جو غرق ہونے، جل جانے یا ملبے تلے آکر مرا، تو نفس کے کئی امراض بھی ایسے ہیں کہ اگر انسان نے ان میں صبر کیا اور تقوی کو اپنا شعار بنایا اور عفت میں زندگی گزار کر مرا تو وہ شہید کے درجہ میں ہے ! جیسے فطرۃً کوئی بزدل شخص جس نے قتال وجہاد کے باب میں تقوی اور صبر کا مظاہرہ کیا حتی قتل کردیا گیا (یعنی لڑنے کا خوگر تو نہ تھا مگر حکمِ خداوندی کے تحت میدانِ جہاد میں چلا آیا) تو بخل اور جبن (بزدلی) نفوس کی امراض سے ہیں اگر ان کے پیچھے لگا تو یہ اس کے لیے باعثِ الم ہوں گے اور نہ لگا تو کئی جسمانی امراض کی طرح متألم ہوگا، اسی طرح عشق، تو مروی ہے جس نے عشق کیا مگر عفیف رہا اور کتمان اور صبر سے کام لیا اور اسی کیفیت میں زندگی گزار دی تو وہ شہید کی موت مرا (پہلے

ذکر ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے) تو یہ نفس میں مرض ہے جونفس کو ضار کی طرف دعوت دیتا ہے جیسے مریض کو ضار اشیاء تناول کرنے کی دعوت دی جائے تو اگر اپنی ہوائے نفس کی طاعت کی تو آخرت میں۔اور کئی دفعہ دنیا میں بھی۔اس کا عذاب عظیم ہوگا اور اگر عفت اور کتمان کے ساتھ ہوائے نفس کی نافرمانی کی تو اس کے نفس میں الم و سقم کا حدوث ہوگا اور اگر اس مرض اور خرابی کے سبب موت واقع ہوگئی تو وہ شہید ہے، یہ مرض اسے نارِ جہنم کی طرف بلاتا تھا مگر وہ رکاوٹ بنا رہا تو اگر ان امراض کے ساتھ ایمان وتقوی ہے تو یہ اس حدیثِ نبوی کے بمصداق ہے، فرمایا اللہ کے بندۂ مؤمن کے لیے ہر فیصلہ میں خیر ہے اگر اسے خوشی ملے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور اگر تنگیِ حالات کا شکار ہوا اور صبر کیا تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔والحمد اللہ رب العالمین وصلی الله علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین وسلم تسلیما

شیخ سے قولہ تعالی: (يَـا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ) [البقرة : ۲۱] (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو) بارے سوال ہوا کہ عبادت سے یہاں کیا مراد ہے اور اس کی کیا فروع ہیں اور کیا مجموعی لحاظ سے دین اس میں داخل ہے یا نہیں؟ عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟ آیا یہ دنیا وآخرت میں اعلی ترین مقام ہے یا اس سے اوپر بھی کئی مقامات ہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔

جواب:

الحمد للہ رب العالمین! عبادت ہر اس کے لیے جامع اسم ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے، اقوال ہوں یا ظاہری و باطنی اعمال تو نماز، روزہ حج، سچ بولنا، ادائے امانت، والدین سے حسنِ سلوک، صلہ رحمی، وفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرنا، پڑوسیوں، یتیموں، مساکین، مسافروں، غلام ولونڈی اور چوپاؤں سے حسنِ سلوک اور دعاء وذکر اور تلاوت اور اس طرح کی دیگر عبادات، اسی طرح اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنا، اللہ سے خشیت اور اس کی طرف انابت، اس کے لیے اخلاصِ دین، اس کے احکام پر صبر کرنا، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا، اس کی قضاء وقدر پر راضی ہونا، اس پر توکل کرنا، اس کی رحمت کی امید رکھنا اور اس کے عذاب سے خوف کھانا اور دیگر عبادات، تفصیل یہ ہے کہ اللہ کے لیے عبادت اس کے لئے محبوب غایت اور اسے پسند ہے، اسی غرض کے لیے مخلوق کی تخلیق کی ہے جیسے کہا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) [الذاريات : ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں) اسی کے ساتھ رسل کو مبعوث کیا جیسے حضرت نوح نے اپنی قوم سے کہا تھا:

(اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ) [الأعراف : ۵۹] (اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) یہی بات حضرات ہود، صالح اور شعیب و دیگر انبیاء کرام نے اپنی اپنی قوم سے کہی، فرمایا:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ) [النحل : ۳۶] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو

تو اُن میں بعض ایسے ہیں جن کواللہ نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوئی)

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ) [الأنبياء : ۲۵] (اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو)

(اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ)[الأنبياء : ۹۲] (یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کیا کرو) جیسے ایک جگہ کہا:

(يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ) [المؤمنون : ۵۱] (اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو جو عمل تم کرتے ہو میں ان سے واقف ہوں) اسے رسول کے لیے ان کی وفات تک لازم کیا جیسے کہا:

(وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ) [الحجر:۹۸] (اور اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ موت آ جائے) اسی کے ساتھ فرشتوں اور انبیاء کا وصف کیا چنانچہ کہا:

(وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ) [الأنبياء : ۱۹ ـ ۲۰] (اور جولوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں سب اُسی کے ہیں اور جو اُس کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں۔ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں، نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں)

(اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ)[الأعراف : ۲۰۶] (جولوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے رُوگردانی نہیں کرتے اور اس پاک ذات کو یاد کرتے اور اس کے آگے سجدے کرتے رہتے ہیں) اس سے استکبار کرنے والوں کی ذم کرتے ہوئے کہا:

(وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ) [الغافر : ۶۰] (اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہارے لئے قبول کروں گا جولوگ مجھے پکارنے سے استکبار کرتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے) خلق میں سے اپنے مقرب اور محبوب لوگوں کا وصف اپنے لیے عبودیت کیا تو کہا:

(عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا) [الدهر : ۶] (یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے بندے پئیں گے اور اس میں سے نہریں نکال لیں گے)

(وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا) [الفرقان : ۶۳] (اور اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں) جب شیطان نے بارگاہِ ایزدی میں کہا:

(بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ) [الحجر :

۳۹۔۴۰](جس طرح تو نے مجھے رائندہِ درگاہ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کیلئے آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔ مگر ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں) تو جواب دیا:

(اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ) [الحجر : ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں ہاں بُری راہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑیں) ملائکہ کے اس کے ساتھ وصف میں کہا:

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَنَہٗ) إلی قولہ : (وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ) [الأنبياء : ۲۶۔۲۸] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔۔۔اور وہ اُس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں)

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا) إلی قولہ : (وَکُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا) [مریم : ۸۹۔۹۶] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔اور سب قیامت کے دن اکیلے اکیلے اس کے روبرو ہوں گے) حضرت مسیح جن میں الوہیت کا ادعاء کیا گیا، بارے کہا:

(اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ وَجَعَلْنٰہُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ) [الزخرف : ۵۹] (وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا اور بنی اسرائیل کے لئے ان کو نمونہ بنا دیا) اسی لیے نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث میں فرمایا میری شان میں اس طرح کی مبالغہ آرائی مت کرنا جو نصاری نے عیسی بن مریم بارے کیا، میں تو عبد ہوں پس کہو: اللہ کا بندہ اور اس کا رسول، اللہ کے آپ کی اکمل ترین حالت میں آپ کا عبدیت کے ساتھ وصف کیا جب کہا:

(سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لَیْلاً) [الإسراء : ۱](وہ پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو لے گیا) حالت ایحاء میں کہا:

(فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی) [والنجم : ۱۰] (پھر اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کی) حالتِ دعاء وعبادت میں کہا:

(وَّاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا) [الجن : ۱۹] (اور جب اللہ کے بندے اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو قریب تھے کہ کافر ان کا گھیراؤ کرلیں) تحدی میں کہا:

(وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ) [البقرۃ : ۲۳] (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا، میں کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی بنا لاؤ) تو دین سارے کا سارا عبادت میں داخل ہے، صحیح میں ہے کہ جب حضرت جبریل ایک اعرابی کی شکل میں آنجناب کی خدمت میں آئے اور اسلام بارے سوال کیا تو آپ نے کہا کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو زکاۃ ادا کرو رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو حج کرو، انہوں نے اگلا سوال کیا، ایمان کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور موت کے بعد اٹھائے جانے اور خیر وشر تقدیر پر ایمان کے حامل بنو، کہا احسان کیا ہے؟ فرمایا کہ اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا اسے تم دیکھ رہے ہو، اگر ایسا نہیں (یعنی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی) تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے حدیث کے آخر میں کہا یہ جبریل تھے جو تمہیں

تمہارا دین سکھلانے آئے تھے تو اس سب کو دین قرار دیا، دین خضوع اور ذل کے معنیٰ کو متضمن ہے، کہا جاتا ہے: (دِنْتُـهٗ فَدَانَ) ای: (ذَلَّلْتُهٗ فَذَلَّ) (میں نے اسے ذلیل وخوار کیا تو وہ ہوا) اور (یَدِیْنُ اللّٰہَ) اور (یَدِیْنُ لِلّٰہِ) یعنی اللہ کی عبادت اور طاعت کرتا ہے اور اسی کے لئے خاضع بنتا ہے تو اللہ کا دین اس کی عبادت، طاعت اور اس کے لئے خضوع ہے

عبادت کا اصل معنی ذل ہے، کہا جاتا ہے: (طَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ) جب وہ مذلل ہو کہ قدم اسے روندتے ہوں (یعنی آباد راستہ ہو) لیکن مامور بہا عبادت ذل اور حُب کے معنیٰ کو متضمن ہے، یہ اللہ کے ساتھ غایت درجہ کی محبت کے ساتھ اس کے لئے غایت درجہ کی ذل کو متضمن ہے محبت کا آخری مرتبہ تَتَیُّم ہے جبکہ اس کا پہلا مرتبہ (اَلْعَلَاقَةُ) ہے کیونکہ دل کو محبوب سے تعلق ہو جاتا ہے پھر (اَلصَّبَابَة) کیونکہ دل اس کی طرف منصب (مائل) ہوتا ہے پھر (اَلْغَرَام) اور یہ دل کے لئے حُب لازم، پھر عشق اور آخری مرتبہ تَتَیُّم، کہا جاتا ہے: (تَیَمُ اللّٰہِ) ای (عَبْدُ اللّٰہِ) تو متیم اپنے محبوب کا عبد بنا (یعنی بندہِ بے دام) جو کسی انسان کے لئے خاضع ہوا اپنے اس سے بغض کے ساتھ وہ اس کے لئے عابد نہ کہلائے گا، اور اگر کسی شئ سے محبت کی مگر اس کے لئے خاضع نہ بنا تو بھی اس کا عابد نہ ہوگا جیسے انسان کو اپنے بیٹے اور دوست سے محبت ہوتی ہے، لہذا اللہ کی عبادت کے ضمن میں ان دو میں سے ایک کافی نہیں بلکہ واجب ہے کہ اللہ بندے کو ہر شئ سے بڑھ کر محبوب ہو اور ہر شئ سے اس کے ہاں اعظم ہو بلکہ اللہ کے سوا کوئی بھی تام محبت اور تام ذل کا مستحق نہیں، ہر جس نے کسی غیر اللہ سے محبت کی اس کی محبت فاسد ہے اور بغیر اللہ کے امر کے جس کی تعظیم کی تو اس کی یہ تعظیم باطل ہے، فرمایا:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) [التوبة: ۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے) تو جنسِ محبت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہی ہے جیسے طاعت ہے تو یہ صرف اللہ اور رسول کے لئے ہے اسی طرح ارضاء بھی، فرمایا:

(وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ) [التوبة: ۶۲] (اور اللہ اور اس کے پیغمبر خوش کئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں) جہاں تک عبادت اور جو اس کے مناسب توکل اور خوف ونحوہا تو یہ بھی صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے جیسے کہا:

(قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَانُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا) إلى قوله: (فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ) [آل عمران: ۶۳-۶۴] (کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور

تمہارے درمیان یکساں ہے اُس کی طرف آ ؤ، وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔۔اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم فرمانبردار ہیں) اور کہا:

(وَلَوْاَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ)[التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ہمیں دے دیں گے اور ہمیں تو اللہ ہی کی خواہش ہے) تو ایتاء اللہ ورسول کے لئے ہے جیسے کہا:

(وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا) [الحشر : ۷](اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں باز رہو) اور جو (حَسْب) ہے (یعنی کافی) تو یہ بھی اللہ وحدہ ہے جیسے کہا:

(اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ)[آل عمران : ۱۷۳] (اُن سے لوگوں نے آ کر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے لئے جمع کیا ہے تو اُن سے ڈرو تو اُن کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے) اور:

(يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ) [التوبة : ۶۴] (اے نبی! اللہ تمہیں اور مومنوں کو جو تمہارے پیروکار ہیں کافی ہے) یعنی آپ کو بھی کافی ہے اور ان اہل ایمان کو بھی جنہوں نے آپ کی اتباع کی، جس نے ظن کیا کہ اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ اور اہلِ ایمان آپ کو کافی ہیں (یعنی وَ مَـــنِ اتَّبَـــعَكَ کو لفظِ اللہ پر۔ نہ کہ حَسْبُكَ کی ضمیر پر۔ معطوف کرتے ہوئے) اس نے فحش غلطی کی جیسا ایک جگہ اس پر بسط سے بات کی ہے، فرمایا:

(اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ) [الزمر : ۳۶] (کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں؟) تفصیل یہ کہ عبد سے (مُعَبَّدٌ) مراد ہے وہ جسے اللہ نے معبد اور مذلّل اور مدبر کیا، اس اعتبار سے تمام مخلوقین ابرار ہوں یا فجار، مؤمن ہوں یا کافر، اہلِ جنت ہوں یا اہلِ جہنم، اللہ کے عباد ہیں کیونکہ وہ سب کا رب اور مالک ہے کوئی بھی اس کی مشیت وقدرت سے خارج نہیں، اس کے کلمات تامات سے کوئی بر و فاجر مجاوز نہیں تو جو اس کی مشیت ہے وہی ہوا اگر چہ لوگوں کی مشیت نہ بھی ہو اور اگر اس کی مشیت نہ ہو جبکہ لوگوں کی ہو تو وہ نہیں ہوگا جیسے کہا:

(اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ)[آل عمران : ۸۳] (کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب آسمان وزمین خوشی یا زبردستی سے اللہ کے فرمانبردار ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) تو وہ سبحانہ رب العالمین ان کا خالق، رازق، محیی، مُمیت، مُقلّب القلوب، مصرّف الا مور ہے اس کے سوا کوئی ان کا رب نہیں، نہ کوئی مالک وخالق ہے چاہے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں اور چاہے اسے جانتے ہوں یا ناواقف ہوں البتہ اہلِ ایمان ضرور اس سے واقف اور اس کے مقر ہیں بخلاف اس کے جو اس سے جاہل یا جاحد اور مستکبر ہے، نہ

مقر اور نہ خاضع ہے اپنے یہ جاننے کے باوصف کہ اللہ اس کا رب اور اس کا خالق ہے تو حق کی معرفت اگر اس کے قبول کرنے سے اس کے استکبار اور اس کے انکار کے ساتھ ہو تو یہ اپنے صاحب کے لئے وبال ہے جیسے کہا:

(وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ) [النمل : ۱۴] (اور بے انصافی اور غرور سے ان کا انکار کیا کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے سو دیکھ لو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا)

(وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ) [الأنعام : ۱۱۴] (اور اہلِ کتاب جانتے ہیں کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے برحق نازل کی گئی ہے)

(فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ)[الأنعام : ۳۳] (یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں) اگر انسان معترف ہو کہ اللہ اس کا رب اور خالق ہے اور وہ اللہ کی طرف محتاج و مفتقر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ساتھ متعلق عبودیت کا عارف ہے، یہ اپنے رب سے دعا کرتا، اس کی طرف تضرُّع کرتا اور اس پر بھروسہ کرتا ہے البتہ اطاعت کے ساتھ ساتھ کبھی اس کی معصیت کا بھی مرتکب ہو جاتا ہے، کبھی اس کا اور شیطان و اصنام (اور ہوائے نفس) کا عابد بنتا ہے، اس قسم کی عبودیت اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان تفرقہ نہیں کرتی اور نہ اس کی رو سے انسان مومن بنتا ہے جیسے کہا:

(وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ)[یوسف : ۱۰۶] (اور یہ اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہیں) تو مشرکین اس امر کے مقر تھے کہ اللہ ان کا خالق اور رازق ہے مگر اس کے باوجود غیر اللہ کے عابد تھے، فرمایا:

(وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) [العنكبوت: ۶۱] (اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے زیرِ فرماں کیا؟ تو کہہ دیں گے اللہ نے)

(قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ) إلى قوله : (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ) [المؤمنون : ۸۴۔۸۹] (کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا ہے؟۔ فوراً کہہ دیں گے کہ ایسی بادشاہی تو اللہ ہی کی ہے تو کہو پھر کیوں تم مسحور ہوئے جاتے ہو؟) کثیر متکلمین حقیقت اور اس کے شاہد اس حقیقت کو مانتے ہیں اور یہ کونی حقیقت ہے جس میں اور جس کے شہود و معرفت میں ہر مومن و کافر اور نیک و بد مشترک ہے ابلیس بھی اسی حقیقت کا معترف تھا اور اہلِ نار بھی، ابلیس نے کہا تھا:

(رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ) [ص : ۷۹](اے میرے رب مجھے اس روز تک کہ لوگ اٹھائے جائیں مہلت دے)

(رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [الحجر : ۳۹] (اے رب جس طرح تو نے مجھے رائندہِ درگاہ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کیلئے آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا)

(فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [ص : ۸۲] (کہنے لگا کہ مجھے تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکا تا رہوں گا)
(اَ رَءَ يْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَه ٗ اِلَّا قَلِيْلًا) [الإسراء : ۶۲]
(دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک کی مہلت دے تو میں سوائے قلیل کے اس کی اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا) تو وہ مقر تھا کہ اللہ اس کا رب اور اس کا اور اس کے غیر کا خالق ہے اسی طرح اہلِ نار کہیں گے:
(رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ) [المؤمنون: ۱۰۶] (اے ہمارے رب ہم پر ہماری کمبختی غالب ہو گئی اور راہ سے بھٹک گئے) فرمایا:
(وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا) [الأنعام : ۳۰] اور اگر تم دیکھو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور وہ فرمائے گا کہ کیا یہ برحق نہیں ہے؟ تو کہیں گے کہ کیوں نہیں، اللہ کی قسم) تو جو اس حقیقت اور اس کے مشہود کا کا واقف بنا مگر حقیقتِ دینیہ سے مامور بہ کے ساتھ قائم نہ ہوا جو کہ اس کی ربوبیت اور اس کے اور اس کے رسول کے امر کی طاعت سے متعلق عبادت ہے تو وہ ابلیس اور اہلِ نار کی جنس سے ہوا اگر چہ سمجھے کہ وہ اللہ کے خواص اولیاء اور اہلِ معرفت وتحقیق سے ہے جن کی بابت ان کا گمان ہے کہ ان سے شرعی امر ونہی ساقط ہوجاتے ہیں، وہ شدید ترین اہلِ کفر والحاد سے ہیں اور جس نے ظن کیا کہ حضرت خضرؑ وغیرہ سے امر ساقط ہے اس وجہ سے کہ وہ ارادہ ونحوہ کے مشاہد ہوئے اس کا یہ قول اللہ ورسول کے ساتھ کفر کرنے والوں کے بدترین اقوال سے ہے حتیٰ کہ وہ عبد کے معنی سے دوسری نوع میں داخل ہو اور یہ عبد بمعنی عابد، تو اللہ کے لیے عبادت کرنے والا بنے کہ صرف اسی کی ہی عبادت کرے تو اس کے اور اس کے رسول کے امر کی طاعت کرے اور اس کے مومن ومتقی اولیاء سے موالات اور اس کے اعداء سے معادات کرے، یہ عبادت اس کی الوہیت سے متعلق ہے

اسی لیے **توحید کا عنوان** (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ) ہے بخلاف اس کے جو اس کی ربوبیت کا مقر تو ہو مگر اس کی عبادت نہ کرے یا اس کو بھی اور اس کے ساتھ کسی اور کو بھی الہ مانے تو الہ وہی جسے دل کمالِ حب وتعظیم اور اجلال واکرام اور خوف ورجاء کے ساتھ بندگی کے قابل مانے ، یہی عبادت اللہ کو محبوب اور اس کے ہاں پسندیدہ ہے اسی کے ساتھ اس نے اپنے مصطفٰی بندوں کا وصف کیا ہے اور اسی کے ساتھ رسل کی بعثت کی، جہاں تک عبد بمعنی معبَّد، چاہے لوگ اس کے مقر ہوں یا منکر تو اس میں سبھی مشترک ہیں ان دونوں انواع کے مابین فرق کے ساتھ، اللہ کی عبادت، اس کے دین اور اس کے ہاں محبوب ومَرضی شرعی امر میں داخل دینی حقائق کے مابین اور کونی حقائق کے مابین فرق کو جانا جائے گا، وہ جن میں کافر ومومن اور نیک وبد سبھی مشترک ہیں، وہ جن کے ساتھ جس نے اکتفاء کیا اور دینی حقائق کو نہ مانا تو وہ ابلیس لعین کے اور رب العالمین کے کافروں کے اَتباع میں سے ہوگا اور جس نے بعض امور میں ان کے ساتھ اکتفاء کیا یا خاص مقام وحال میں تو دینی حقائق کی اس کے ہاں نقص کے بحسب اللہ کے ساتھ اس کے ایمان اور اس کے لیے اس کی ولایت میں نقص ہوگا

یہ ایک عظیم مقام ہے جس میں کثیر لوگوں کے ٹھوکر کھائی ہے اور سالکین پر اشتباہ کثیر ہوا حتی کہ کئی اکابر شیوخ کے قدم بھی لڑکھڑا گئے جو تحقیق وتوحید اور عرفان کے مدعی تھے، ان کا شمار صرف اللہ ہی کرسکتا ہے جسے ہر سر وعلن کا علم ہے، اسی طرف شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ (جیلانی) نے اشارہ کیا تھا جیسا کہ ان سے منقول ہے تو بیان کیا کہ کثیر لوگ جب قضاء وقدر تک پہنچتے ہیں تو رک جاتے ہیں، مگر میں نہیں رکا، تو میرے لیے اس میں ایک روزن کھلا ہے تو میں نے حق کے ساتھ، حق کے لیے، حق کی اقدار سے منازعت کی ہے اور مرد وہ جو تقدیر کے لیے منازع ہو نہ کہ جو تقدیر کے لیے موافق ہو! شیخ رحمہ اللہ نے یہ جو ذکر کیا اسی کا اللہ اور اس کے رسل نے حکم دیا ہے لیکن کثیر حضرات نے ٹھوکر کھائی وہ کبھی ان معاصی اور ذنوب کے مشاہد ہوتے ہیں جو کسی پر مقدر ہوتے ہیں بلکہ کفر کے بھی اور اس امر کے شاہد ہوتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی مشیت اور اس کی قضاء وقدر کے ساتھ جاری اور اس کی ربوبیت کے حکم اور اس کی مشیت کے مقتضا میں داخل ہے تو وہ اس کے لیے استسلام، اس کی موافقت اور اس کے ساتھ رضا کو دین، طریقت اور عبادت سمجھتے ہیں تو یوں ان مشرکین کی مضاہات کرتے ہیں جنھوں نے کہا:

(لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ) [الأنعام : ۱۴۸] (اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے) اور کہا:

(اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ) [یس : ۴۷] (بھلا ہم ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا تم تو صریح غلطی میں ہو)

(وَقَالُوْا لَوْشَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ) [الزخرف : ۲۰] (اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کو نہ پوجتے) اگر ان کی قسمت میں ہدایت ہوتی تو جان لیتے کہ ہمیں حکم ہے کہ تقدیر پر راضی ہوں اور ان مصائب میں جو ہمیں پہنچتے ہیں مثلاً فقر، مرض اور خوف اور اس کے موجب پر صبر کریں، فرمایا:

(مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ) [التغابن : ۱۱] (کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے) بعض سلف کا قول ہے کہ یہ وہ آدمی جسے مصیبت پہنچے تو یہ جان کر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے رضا وتسلیم کی روش اختیار کرے، فرمایا:

(مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ) [الحدید : ۲۲-۲۳] (کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں ہے یہ کام اللہ کو آسان ہے۔ تاکہ جو تم سے فوت ہو گیا ہے اس کا غم نہ

کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اتراؤ نہیں) صحیحین میں نبی اکرم سے مروی ہے کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کا باہم مناظرہ ہوا، موسیٰ نے کہا آپ وہ آدم ہو جسے اللہ نے اپنے ہاتھ سے تخلیق کیا، آپ میں اپنی روح پھونکی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور سب اشیاء کے اسماء کی آپ کو تعلیم دی تو کیونکر خود کو اور ہمیں جنت سے نکلوا دیا؟ اس پر حضرت آدمؑ نے جواب دیا تم وہ موسیٰ ہو جسے اللہ نے اپنی رسالت دی اور ہمکلامی کا شرف عطا کیا تو کیا یہ بات میری تخلیق سے قبل مکتوب پائی؟ کہا ہاں، فرمایا تو حضرت آدم ان پر غالب آ گئے

حضرت آدم نے تقدیر کا سہارا نہیں لیا یہ ظن کرتے ہوئے کہ گناہ کا مرتکب تقدیر کا سہارا لے سکتا ہے کہ یہ بات کوئی مسلم وعاقل نہیں کہہ سکتا، اگر یہ عذر ہوتا تو ابلیس، قومِ نوح، قومِ ہود اور ہر کافر کا یہ عذر ہو، اور نہ حضرت موسیٰ نے حضرت آدم کو یہ ملامت گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے کی تھی کہ حضرت آدم نے توبہ کر لی تھی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی لیکن یہ ملامت اس مصیبت کی رو سے کی تھی جو ان کی اس خطا کی پاداش میں انہیں لاحق ہوئی، اسی لیے کہا کیوں خود کو اور ہمیں بھی خلد سے نکلوا دیا؟ تو ان کا جواب تھا کہ ایسا ہونا تو میری تخلیق سے قبل سے مکتوب اور مقدر تھا تو ہر عمل اور اس پر مرتب ہونے والا نتیجہ مقدر ہے اور مقدر پریشانیوں اور مصائب میں استسلام کی روش اختیار کرنا لازم ہے کہ یہ اللہ کے رب ہونے پر رضا کی تمامیت سے ہے، بندے کو گناہ کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے اگر ہو جائے تو استغفار اور توبہ کرنی چاہیے تو لازم ہے کہ معائب سے توبہ کرے اور مصائب پر صبر کرے، فرمایا:

(فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ) [الغافر : ۵۵] (پس صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرو)

(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا) [آل عمران : ۱۲۰] (اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا)

(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ) [آل عمران : ۱۸۶] (تو اگر صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں) حضرت یوسفؑ کا قول ذکر کیا:

(اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف : ۹۰] (جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) اسی طرح بندوں کے ذنوب ہیں بندے پر اس ضمن میں واجب ہے کہ حسبِ قدرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں کفار ومنافقین کے خلاف جہاد کرے اور اللہ کے اولیاء سے موالات اور اس کے دشمنوں سے معادات کرے اور اس کی حب وبغض اللہ کی خاطر ہو جیسے کہا:

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ) إلى قوله : (قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ) [الممتحنة : ۱-۴] (اے مومنو

میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کی پینگیں بڑھاؤ۔۔۔تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء میں اسوہ حسنہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں تمہارے قائل نہیں اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ) اور کہا:

(لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔۔۔ أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ) [المجادلة : ۲۲] (جو لوگ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے-- یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے) اور کہا:

(اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ) [القلم : ۳۵] (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح کر دیں گے؟)

(اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ) [ص : ۲۸] (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کیا ان کو ہم ان کی طرح کر دیں گے جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے؟)

(اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ) [الجاثية : ۲۱](جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہو گے؟ یہ جو دعوے کرتے ہیں بُرے ہیں)

(وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ) [الفاطر : ۱۹-۲۲] (اور اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں۔اور نہ اندھیرا اور روشنی۔اور نہ سایہ اور دھوپ۔اور نہ زندے اور مُردے برابر ہو سکتے ہیں) اور کہا:

(ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا) [الزمر : ۲۹] (اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی آدمی شریک ہیں بدخو اور ایک آدمی خاص ایک شخص کا غلام ہے، بھلا دونوں کی حالت برابر ہے؟)

(ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ) إلى قوله : (هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [النحل: ۷۵-۷۶] (اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کے اختیار میں ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا --- کیا ایسا اور وہ شخص جو لوگوں کو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود سیدھے راستے پر چل رہا

ہے دونوں برابر ہیں؟) اور کہا:

(لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ) [الحشر: ۲۰] (اہلِ دوزخ اور اہلِ بہشت برابر نہیں اہلِ بہشت تو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں) اوران کی نظائر آیات جن میں اللہ تعالی نے اہلِ حق اور اہلِ باطل، اہلِ اطاعت اور اہلِ معصیت، اہلِ بر اور اہلِ فجور، اہلِ ہدایت اور اہلِ ضلال، اہلِ غی اور اہلِ رشاد، اہلِ صدق اور اہلِ کذب کے مابین تفرقہ کیا، تو جو کونی حقیقت کا شاہد تو بنا لیکن دینی حقیقت کا نہیں اس نے ان مختلف اجناس کے مابین تسویہ کیا جبکہ اللہ نے ان کے مابین غایت درجہ تفریق کی ہے اور اس کا معاملہ اس درجہ کو پہنچا کہ اللہ کو بتوں کے برابر کر دیا جیسے اللہ نے ان کے بارہ میں بیان کیا:

(تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) [الشعراء: ۹۷-۹۸] (اور کہیں گے کہ اللہ کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں تھے۔ جبکہ تمہیں رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے) بلکہ ان کے کئی کا معاملہ یہ ہوا کہ اللہ کو ہر موجود کے برابر کر دیا اور جس عبادت واطاعت کا وہ حقدار ہے اس کا ہر موجود کو مستحق گردانا کہ اسے وجودِ مخلوقات قرار دے ڈالا اور یہ رب العالمین کے ساتھ عظیم کفر والحاد ہے، انہیں ان کا کفر اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اپنے عبد ہونے کے شاہد نہیں ہوتے نہ بایں معنی کہ معبّد ہیں اور نہ بایں معنی کہ عابد ہیں اور صورت یہ بنتی ہے کہ وہ خود کو حق باور کرتے ہیں جیسے ان کے طواغیت مثلاً ابن عربی مصنف کتاب فصوص الحکم اور ابن سبعین اور ان کے امثال ملحدین نے یہ افتراء کیا، یہ اس امر کے شاہد کہ وہ عابد بھی ہیں اور معبود بھی، یہ کسی حقیقت کے لیے شہود نہیں، نہ کونی اور نہ دینی بلکہ یہ گمراہی اور کونی حقیقت کے شہود سے عمٰی ہے جب ان لوگوں نے خالق کے وجود کو مخلوق کا وجود قرار دیا اور ممدوح ومذموم وصف کو خالق اور مخلوقت کی نعت وصفت کہا کیونکہ ان کی نظر میں کائنات میں بس ایک ہی وجود ہے (نظریہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کیا ہے)

لیکن جو اللہ اور رسول پر ایمان کے حامل ہیں ان کے عوام بھی اور خواص بھی جو کہ اہلِ کتاب ہیں جیسے نبی اکرم نے فرمایا بے شک لوگوں میں سے اہل اللہ بھی ہیں، عرض کی گئی یا رسول اللہ وہ کون ہیں؟ فرمایا اہلِ قرآن اللہ کے اہل اور اس کے خواص ہیں تو یہ جانتے ہیں کہ اللہ ہر شیَ کا رب، ملیک اور خالق ہے اور خالق تعالی مخلوقات کے لیے مباین ہے، وہ نہ ان میں حلول کئے ہوئے ہے اور نہ کوئی اتحادِ ذات ہے اور نہ اس کا وجود ان کا وجود ہے! نصاری کو اللہ نے کافر قرار دیا کیونکہ انہوں نے صرف اکیلے حضرت مسیح کی بابت حلول واتحاد کا موقف اختیار کیا تو ان کے کفر کا کیا عالم جو تمام مخلوقات میں اس نظریہ کا اجراء کرتے ہیں؟ اور اس کے باوصف جانتے ہیں کہ اللہ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے اور اپنی اور اپنے رسول کی معصیت سے نہی کی ہے اور وہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور نہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی ہے اور خلق کے ذمہ ہے کہ اس کی عبادت کریں تو اس کے امر کو مانیں اور اس پر اس کے ساتھ استعانت کریں جیسے کہا: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) [الفاتحة: ۴] (اے اللہ ہم

تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور اس کی عبادت واطاعت سے مراد حسبِ امکان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس کی راہ میں اہلِ کفر ونفاق کے خلاف جہاد تو وہ اس کے دین کی اقامت میں محنت کرتے ہیں اس کے ساتھ استعانت کرتے ہوئے اور اس کے ذریعہ ہر ممکن حدتک مقدر سیآت کا دفع وازالہ کرتے ہوئے اور شبہات کی جگہوں سے بچتے ہوئے جیسے انسان خود کو لگی اور آگے جا کر لگنے والی بھوک کا مداوا اکل کے ساتھ کرتا ہے اور سردیاں آجائیں تو گرم کپڑوں کا بندوبست کرتا ہے اور اسی طرح ہر مطلوب کے ساتھ ہر مکروہ کو دور کیا جاتا ہے جیسے صحابہ نے آپ سے عرض کی کہ **ان ادویہ کے بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے** جو ہم بغرضِ علاج استعمال کرتے ہیں اور دَم اور دیگر احتیاطی تدابیر بارے؟ کیا یہ اللہ کی تقدیر کو لوٹا سکتی ہیں؟ فرمایا یہ تو خود تقدیر کا حصہ ہیں، ایک حدیث میں ہے دعاء اور بلاء کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو ارض وسماء کے درمیان باہم گتھم گتھا ہو جاتی ہیں (دعا اسے نیچے آنے سے روکنے اور وہ اسے اوپر بارگاہِ قبولیت میں جانے سے روکنے کی سعی کرتی ہے) تو یہ اللہ ورسول پر ایمان کے حاملین اور اللہ کے عابدین کا حال ہے اور یہ سب عبادت سے ہے، یہ جو کونی حقیقت کے شاہد ہیں اور یہ ہر شئ کے لیے اللہ کی ربوبیت، اور اسے یہ اس کے دینی وشرعی امر کی اتباع سے مانع قرار دیتے ہیں گمراہی کے کئی مراتب پر ہیں تو ان کے غالی لوگ اسے مطلق وعام باور کرتے ہیں تو ہر اس کام میں جس میں یہ شریعت کی مخالفت کرتے ہیں تقدیر کا عذر پیش کرتے اور اس کا سہارا لیتے ہیں ان کا قول یہود ونصاریٰ کے قول سے بھی بدتر ہے اور یہ ان مشرکین کے قول کی جنس سے ہے جنھوں نے کہا تھا:

(لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَىْءٍ) (لَوْشَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ) (دونوں آیتیں کچھ قبل گزریں) اہلِ زمین میں ان سے بڑھ کر کوئی تناقض کا شکار نہیں بلکہ جو بھی تقدیر کا سہارا لے وہ متناقض ہے کیونکہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی جو کچھ کرے اسے اس پر برقرار رکھا جائے، پس ضروری ہے کہ ظالم اور زمین میں خرابی پیدا کرنے اور دیگر جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے ہاتھ کو روکا جائے اور تقدیر کا لکھا جان کر چپ نہ رہا جائے وگرنہ ہر طرف افراتفری اور ابتری ہوگی، خود ان پر جب کوئی زیادتی کرے تو اس سے بدلہ لینے کو کوشاں ہوتے ہیں اور اسے تقدیر کا سہارا لینے کی اجازت نہیں دیتے، کیا تقدیر کا سہارا لینا انہی کے لیے جائز ہے اُن کے لیے نہیں؟ اس نظریہ کے حاملین جو کونی حقیقت کے ساتھ احتجاج کرتے ہیں اس قول ونظریہ کا اطراد نہیں کرتے اور نہ (دوسروں کے معاملہ میں) اس کا التزام کرتے ہیں! جب چاہا لاگو کر لیا اور جب چاہا نہ کیا جیسے ان کے بارے میں بعض علماء کا قول ہے کہ اطاعت کے وقت تو میری تقدیر اور معصیت کے وقت تو میرا جبر ہے؟ جو مذہب تمہاری خواہش کے مطابق ہو تم اسی کو اختیار کر لو گے؟ ان میں ایک صنف ایسی ہے جو تحقیق ومعرفت کے مدعی ہیں اور زعم کرتے ہیں کہ امر ونہی اس کے لیے لازم ہے جو اپنے آپ کے لیے فعل کا شاہد بنا اور اس کے لیے صنع کا اثبات کیا لیکن جس کا شہود یہ ہوا کہ اس کے افعال مخلوق ہیں یا وہ ان پر مجبور ہے اور اس میں متصرف اللہ ہی ہے جیسے تمام متحرکات کا وہی محرک ہے تو اس سے امر ونہی اور وعد ووعید

مرتفع ہو جاتے ہیں، کبھی یہ کہتے ہیں جس نے ارادہ کا شہود حاصل کرلیا اس سے تکلیف کا معاملہ ساقط ہوا، ان کے بعض کا زعم ہے کہ حضرت خضر بوجہ اپنے ارادہ کے شہود کے مکلّف نہیں رہے تھے تو یوں یہ عامہ اور ان خاصہ کے درمیان تفریق نہیں کرتے جنہیں کوئی حقیقت کا شہود ہوا تو اس امر کے شاہد بنے کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے اور وہ تمام کائنات کا مدبر ہے، کبھی یہ اس حقیقت کے عالم اور اس کے شاہد کے مابین تفرقہ کرتے ہیں تو اس سے تکلیف کو ساقط قرار نہیں دیتے جو اس پر ایمان والا بنا اور فقط اس کا عالم بنا لیکن ان سے ساقط کرتے ہیں جو اس کے شاہد بنے تو خود کے لیے اصلاً ہی کوئی فعل نہیں دیکھتے اور یہ جبر اور اثباتِ قدر کو اس وجہ پر تکلیف سے مانع قرار نہیں دیتے، اس میں تحقیق، معرفت اور توحید کی طرف منتسب حضرات کے کئی فرقے واقع ہوئے اور اس کا سبب یہ بنا کہ ان کا ذہن یہ بات سمجھنے سے قاصر رہا کہ بندہ اس چیز کا مامور ہو جس کے برخلاف پر قدرت کا وہ حامل ہے جیسے معتزلہ کا اور ان کے نحو قدریہ کا ذہن یہ بات سمجھنے سے تنگ ہوا پھر معتزلہ نے شرعی امر و نہی کا اثبات تو کیا لیکن قضاء وقدر کا نہیں جو کہ اللہ تعالی کا عمومی ارادہ ہے اور بندوں کے افعال کے خالق ہونے کا جبکہ ان حضرات نے قضاء وقدر کا اثبات تو کیا لیکن اس کے حق میں امر و نہی کی نفی کو جو قدر کا شاہد بنے کیونکہ اس کی مطلقاً نفی کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا، ان کا قول معتزلہ کے قول سے بھی بدتر ہے، اسی لیے سلف میں سے کوئی ایک بھی ان کا ہم نوا نہیں، یہ امر و نہی کو محجوبین کے لیے قرار دیتے ہیں جو کوئی حقیقت کے شاہد نہیں بنے اسی لیے جو ان کے خیال میں اس حقیقت کے شہود تک پہنچ چکے ہیں ان سے امر و نہی کو یہ ساقط قرار دیتے ہیں اور انہیں خاصہ باور کرتے ہیں، کئی دفعہ اسی پر اس قولہ تعالی کو متأوَل کرتے ہیں:

(وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ) [الحجر : ۹۸] (اور اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ یقین آ جائے) اور یقین سے مراد اس حقیقت کی معرفت لیتے ہیں، ان کا یہ قول کفر صریح ہے اگر چہ اس کے قائل کئی طوائف کو علم نہیں کہ یہ کفریہ قول ہے، دینِ اسلام سے بالاضطرار معلوم ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر بندے کے لیے لازم ہے جب تک اس کی عقل حاضر ہے، یہ موت تک اس کے ذمہ ہے، کبھی اس سے یہ ساقط نہ ہوں گے، نہ قدر کے اس کے شاہد بننے کے ساتھ اور نہ اس کے بغیر! جو یہ بات نہیں جانتا اس کے لیے اس کی تبیین کی جائے اگر اس کے باوجود امر و نہی کے سقوط کے اعتقاد پر مصر رہے تو قتل کر دیا جائے! اس طرح کے نظریات متاخرین میں کثیر ہوئے ہیں، سلف کے ہاں یہ نظریات معروف نہ تھے، یہ نظریات اللہ اور اس کے رسول کے لیے محادّ (مخالفت اور دشمنی کرنے والا) اس کے لیے معادات اور اس کی راہ سے روکنے والے ہیں اور اس کے رسل کی تکذیب ہیں اور اس کے لئے اس کے حکم میں مضاد ہیں اگر چہ یہ بات ممکن ہے کہ ان نظریات کے حامل بعض افراد اس سے ناواقف ہوں اور ان کا اعتقاد ہو کہ یہی رسول اور اللہ کے متقی اولیاء کا طریق ہے تو وہ اس ضمن میں ان کے بمنزلہ ہیں جو اعتقاد رکھیں کہ نماز ان پر واجب نہیں کیونکہ انہیں حاصل قلبی احوال کی وجہ سے وہ اس سے مستغنی ہیں یا کوئی کہے کہ شراب اس کے لیے حلال ہے اس لیے کہ وہ خواص میں سے ہے جنہیں شراب نوشی کا کوئی نقصان نہیں یا بدکاری اس کے لیے حلال ہے اس لئے کہ وہ سمندر کی

مثل ہو چکا ہے جس میں گندگی جانے سے وہ گدلا نہیں ہوتا، بلاشبہ وہ مشرکین جنہوں نے رسل کی تکذیب کی اللہ کی شرع کی مخالف بدعت اور اللہ کے امر کی مخالفت پر تقدیر کے ساتھ احتجاج کرنے کے مابین متردد ہیں تو ان اصناف میں مشرکین کی مشابہت پائی جاتی ہے، یا تو ابتداع کرتے ہیں یا تقدیر کا سہارا لیتے ہیں یا دونوں کام کرتے ہیں جیسے اللہ نے مشرکوں بارے کہا:

(وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ) (ترجمہ آگے آ رہا ہے) اور کہا:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ) (ابھی گزری) مشرکین کی ابتداع کا ذکر کیا جس کا دین میں انہوں نے احداث کیا کہ بعض حلال چیزوں کو حرام اور بعض حرام چیزوں کو حلال کر لیا اور وہ عبادت (یعنی عبادت کے کئی طور طریقے) جیسے اللہ نے مشروع نہیں کیا، جیسے کہا:

(وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ) [الأنعام : ١٣٨] (اور اپنے خیال سے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتی منع ہے اسے اُس شخص کے سوا جسے ہم چاہیں کوئی نہ کھائے اور چوپائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا منع کر دیا گیا ہے اور بعض مویشی ایسے ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے، سب اللہ پر جھوٹ ہے) آخر سورۃ تک، اسی طرح سورۃ اعراف میں کہا:

(يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ) إلى قوله : (وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ) إلى قوله : (قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ) إلى قوله : (وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ) إلى قوله : (قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ) [الأعراف :٢٧-٣٣] (اے بنی آدم! شیطان تمہیں بہکا نہ دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا دیا تھا- اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور اللہ نے بھی ہم کو یہی حکم دیا ہے، کہہ دو اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا حکم نہیں دیتا بھلا تم اللہ کی نسبت ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ کہہ دو کہ میرے رب نے تو انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر نماز کے وقت قبلہ رو ہوا کرو۔اور کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ کہ اللہ بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پوچھو تو کہ جو زینت اور کھانے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں اُن کو حرام کس نے کیا ہے؟۔ کہہ دو میرے رب نے تو بے حیائی کی

باتوں کو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں)

یہ لوگ کبھی اپنی احداث کردہ بدعت کو حقیقت کا نام دیتے ہیں جیسا کہ تقدیر سے جس کے یہ شاہد ہوتے ہیں اسے بھی حقیقت کا نام دے دیتے ہیں، ان کے نزدیک حقیقت کا طریق وہ سلوک ہے جس کا سالک شارع کے امر و نہی کے ساتھ متقید نہیں بلکہ جو اپنے حسب رائے و مذاق اور جو اس کی نظر میں جچے، یہ مطلقاً ہی قدر کے ساتھ احتجاج نہیں کرتے بلکہ ان کا مستند اپنی آراء واہواء کی اتباع ہے اور اسے وہ حقیقت شمار کرتے ہیں اور اللہ ورسول کے امر کی اتباع کو چھوڑ کر ان کا اس کی اتباع کا حکم جہمیہ و دیگر اہل کلام کی بدعات کی نظیر ہے جو کتاب وسنت کے مخالف اپنے مبتدعانہ اقوال کو عقلی حقائق قرار دیتے ہیں کہ جن کا اعتقاد رکھنا واجب ہے، نہ کہ وہ جن پر سمعیات کی دلالت ہو، پھر یہ یا تو کتاب وسنت کی ان کے مواضع سے تحریف کرتے ہیں یا بالکلیہ ہی ان سے اعراض کرتے ہیں، نہ تو ان میں تدبر کرتے ہیں اور نہ انہیں ان کی فہم ہے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم ان کا معنی اللہ کے سپرد کرتے ہیں ان کے مدلول کے نقیض کا اعتقاد رکھتے ہوئے، اگر ان کے خود ساختہ نظریات وافکار جنہیں یہ عقلیات کہتے ہیں، کا تجزیہ کیا جائے تو وہ جہلیات اور فاسد اعتقادات ہیں اسی طرح دوسرے حضرات جن باتوں کو اولیاء اللہ کے حقائق قرار دیتے ہیں جو فی الحقیقت کتاب وسنت کے برخلاف ہیں ان کا تجزیہ کرنے سے وہ اہواء ثابت ہوتے ہیں جن کی اتباع کرنا اولیاء نہیں بلکہ اعداء اللہ کا کام ہے! ان کی گمراہی کی اصل وجہ اللہ کی جانب سے منزل نص پر اپنے قیاس کو مقدم کرنا اور اللہ کے امر کی اتباع پر ہوائے نفس کو ترجیح دینا ہے، ذوق اور وجد وغیرہ اسی کے بحسب ہوتا ہے جو انسان کو پسند اور محبوب ہو تو ہر محبّ کے لیے اس کی محبت کے بحسب ذوق اور وجد ہے اہلِ ایمان کا ذوق و وجد وہ ہے جس کی نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث میں تشریح کی جب کہا تین خصلتیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں گی تو وہ ایمان کی حلاوت کو پالے گا (وَجَدَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ، اسی سے وجد کی اصطلاح ہے) کہ اللہ اور رسول اسے ہر ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، اہل اللہ سے محبت ہو اور مرتد ہونا اس طرح اسے برا لگے جیسے آگ میں ڈالا جانا، ایک اور صحیح حدیث میں ہے جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمدؐ کے نبی ہونے پر راضی ہوا، اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا (ذاق، اسی سے ذوق کی اصطلاح ہے) جہاں تک اہلِ کفر وبدعت اور اہلِ شہوات تو ہر کوئی اپنے بحسب واجد ہے، سفیان بن عیینہ سے کہا گیا اہل اہواء کا کیا معاملہ ہے کہ انہیں اپنی اہواء سے شدید محبت ہوتی ہے؟ کہنے لگے کیا تم اللہ کا یہ فرمان بھول گئے:

(وَاُشْرِبُوْا فِی قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ) [البقرة : ۹۳] (اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا ان کے دلوں میں رچ گیا تھا) یا اس طرح کی کوئی بات کہی تو بتوں کے پجاریوں کو ان سے پیار ہوتا ہے جیسے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ) [البقرة : ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو

غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اوران سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں)

(فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَ هُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ) [القصص : ۵۰] (پھراگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے اوراس سے بڑا گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے لگے)

(اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی) [والنجم : ۲۳] (یہ لوگ تو محض ظن اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے) اسی لیے یہ لوگ شعر (یعنی قوالیاں اور بھجن) اور اصوات (یعنی راگ اور سر) سننے کے بہت شوقین ہوتے ہیں کیونکہ اس سے ان میں محبتِ مطلقہ بھڑکتی ہے جو اہلِ ایمان کے ساتھ مختص نہیں بلکہ اس میں محبِ رحمان اور محبِ اوثان، محبِ اوطان، محبِ مُردان (یعنی نوجوان لڑکوں پر فریفتہ)، محبِ اخوان اور محبِ نسوان مشترک ہیں (یعنی سفلی جذبات جو ہر انسان کی جبلت میں ہیں) اور یہ وہ ہیں جو اپنے اذواق اور مواجید کی اتباع کرتے ہیں بغیر کتاب وسنت اور سلف کے طریقہ کو معیار بنائے تو رسول جس عبادت وطاعت کے ساتھ مبعوث کئے گئے ان کا مخالف اللہ کے مشروع کردہ دین کا متبع نہیں ہوسکتا جیسے کہا:

(ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ) [الجاثیة :۱۸۔۱۹] (پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے راستے پر کر دیا تو اسی پر چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔ یہ اللہ کے سامنے تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ پرہیزگاروں کا دوست ہے) بلکہ یہ اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی اہوائے نفس کا پیروکار ہے، فرمایا:

(اَمْ لَهُمْ شُرَکٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ) [الشوری : ۲۱] (کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا) اوراس ذیل میں کبھی یہ بدعت پر ہوتے ہیں جسے حقیقت (اور معرفت) کا نام دیتے ہیں اوراسے یہ اللہ کی شرع پر مقدم رکھتے ہیں اور **کبھی یہ شریعت کے برخلاف کونی قدر کو بطورِ حجت پیش کرتے ہیں** جیسا کہ اللہ تعالی نے مشرکین کی بات نقل کی ہے، انہی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو رتبہ میں ان کا اعلی ترین ہے، یہ مشہور فرائض کی ادائیگی کا اور محرمات سے اجتناب کا التزام تو کرتے ہیں لیکن ان اسباب کے ترک کرنے کی غلطی کے مرتکب ہیں جن کے اختیار کرنے کا لوگوں کو حکم دیا گیا ہے اور جو کہ عبادت ہیں، یہ ظن کرتے ہوئے کہ عارف کو جب شہودِ قدر عطا ہو جائے تو وہ ان سے اعراض کرتا ہے ان لوگوں کی طرح جو توکل اور دعاء کو عوام ۔ نہ کہ خواص ۔ کے مقامات خیال کرتے ہیں اس امر پر بناء کرتے ہوئے کہ جو شاہدِ قدر رہا اس نے جان لیا کہ جو مقدر ہے وہ تو بہر صورت ہونا ہے چاہے دعاء وتوکل کرے یا نہیں لہذا اس

کی کوئی ضرورت نہیں، یہ عظیم غلطی ہے، اللہ نے اشیاء کو ان کے اسباب کے ساتھ مقدر کیا ہے (یعنی اسباب بھی تقدیر کا حصہ ہیں) جیسے سعادت اور شقاوت کو ان کے ظاہری اسباب کے ساتھ مقدر کیا ہے، جیسے نبی اکرم نے فرمایا اللہ نے جنت کے اہل بھی پیدا کئے ہوئے ہیں جنہیں تب تخلیق کیا جبکہ ابھی وہ اپنے آباء کی اصلاب میں تھے اور یہ اہلِ جنت والے اعمال کرتے ہیں اور جیسے آپ نے جب صحابہ کو بیان کیا کہ اللہ نے تمام مقادیر لکھ دی ہیں، اس پر کہا گیا یارسول اللہ پھر ہم عمل چھوڑ کیوں نہ دیں اور تقدیر پر تکیہ کریں؟ فرمایا نہیں! عمل جاری رکھو کہ ہر کسی کے لیے وہی کچھ میسر کیا گیا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے، جو اہلِ سعادت میں سے (لکھا جا چکا) ہے اس کے لیے اہلِ سعادت کے سے اعمال میسر کئے جائیں گے اور جو اہلِ شقاوت میں سے (لکھا جا چکا) ہے اس کے لیے اہلِ شقاوت کے سے اعمال میسر کئے جاتے ہیں، تو اللہ نے اپنے بندوں کو جو اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے وہ عبادات ہیں اور توکل عبادت کے ساتھ ہی مقرون ہے جیسے اس آیت میں:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو)

(قُلْ هُوَ رَبِّىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ)[الرعد: ۳۰] (کہہ دو وہی تو میرا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اُسی پر بھروسا کرتا ہوں اور اُسی کی طرف میرا رجوع ہے) اور حضرت شعیب کا قول:

(عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ)[هود: ۸۸] (میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) ان میں سے ایک گروہ کبھی مستحبات کا تارک بن جاتا ہے، واجبات کا نہیں تو اسی کے بقدر ان میں نقص ہے! کئی حضرات اپنے لیے حاصل خارقِ عادت (یعنی غیر معمولی اور مافوق الفطرت) امور مثلاً مکاشفت اور استجابتِ دعوات وغیرہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں تو (اپنے کو پہنچا ہوا اور معرفت والا خیال کر کے حالانکہ معرفت ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ شرع کا مکلّف نہیں رہا) مامور بہ عبادت وشکر وغیرہ کا ترک کر دیتے ہیں تو یہ اور ان جیسے امور سے اہلِ سلوک وتوجہ کو واسطہ پڑتا ہے! نجات وہی پائے گا جو اللہ کے اس امر کا ہمیشہ التزام کرتا رہے جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول کو مبعوث کیا، جیسے زہری نے کہا کہ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ سنت کے ساتھ اعتصام میں ہی نجات ہے اس لیے کہ سنت جیسا کہ امام مالک نے کہا حضرت نوح کے سفینہ کی مثل ہے تو نجات اسی کو ملے گی جو اس پر سوار ہوگا اور جو اس سے پیچھے رہا وہ غرق ہوا عبادت، اطاعت، استقامت اور صراطِ مستقیم وغیرہ کو لازم رکھنا ان سب کا مقصود واحد ہے اور اس کے لیے **دو اصول ہیں**:

۱۔ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے

۲۔ کہ مامور اور مشروع طریقہ سے عبادت کرے، نہ کہ نئے طور وطریقوں (یعنی رسوم واجبات) کے ساتھ، فرمایا:

(فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا) [الكهف: ۱۱۰] (تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے چاہئیے کہ عملِ نیک کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے)

(بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ)[البقرة : ۱۱۲](کیوں نہیں ! جوشخص اللہ کے آ گے گردن جھکا دے اور وہ نیکو کار بھی ہوتو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے)

(وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا)[النساء : ۱۲۵] (اور اُس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکمِ الٰہی کوقبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو تھے اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا) تو عملِ صالح ہی احسان اورفعلِ حسنات ہے،حسنات وہی ہیں جنہیں اللہ اوراس کے رسول نے پسند کیا اور یہ جن کا امر دیا، یا تو امرِ ایجاب یا امرِ استحباب، جو بدعات دین کا حصہ بنالی جائیں جومشروع نہیں تو یہ اللہ ورسول کو پسند نہیں ہیں تو انہیں حسنات اورعملِ صالح قرارنہیں دیا جاسکتا جیسے غیر جائز اعمال بھی مثلا فواحش اورظلم حسنات نہیں اور نہ ہی انہیں عملِ صالح قرار دیا جاسکتا ہے، جہاں تک قولہ:(وَ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا) اور: (بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ) تو یہ اللہ وحدہ کے لیے دین کو خالص کرنا ہے،حضرت عمر کی ایک دعا ہے:(اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِيْ كُلَّهٗ صَالِحاً وَاجْعَلْهُ لِوَجْهِكَ خَالِصاً وَلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِيْهِ شَيْئاً) (اے اللہ میرا سارا عمل صالح بنا اور خالص اپنی رضا کے لئے اور کسی کے لئے اس میں کوئی شئ نہ کر) فضیل بن عیاض نے قولہ:(لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) [الملك: ۲] (تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے) کی تفسیر میں کہا:(اَخْلَصُهٗ وَاَصْوَبُهٗ) (خالص اورصائب ترین) لوگوں نے پوچھا اے ابوعلی اخلص واصوب کیا؟ کہا عمل جب ہوتو خالص مگر صواب نہ ہوتو وہ قبول نہیں ہوتا اور اگر صواب تو ہے مگر خالص نہیں تو بھی وہ قبول نہیں کیا جاتا، خالص یہ کہ وہ اللہ کی خاطر کیا گیا ہو اورصواب یہ کہ سنت کے مطابق ہو،اگر کہا جائے جب وہ سب جسے اللہ پسند کرتا ہے اسمِ عبادت میں داخل ہے تو پھر اس پراس کے غیر کا عطف کیوں ڈالا؟ جیسے یہ آیات:

(اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) اورحضرت نوح کا قول:

(اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ) [نوح : ۳] (اللہ کی عبادت کرو اوراس سے ڈرو اور میرا کہا مانو) اسی طرح دیگر رسل نے بھی یہ کہا، جواب یہ ہے کہ اس کی نظائر موجود ہیں مثلا یہ آیت:

(اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ) [العنكبوت: ۴۵] (بے شک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے) جبکہ فحشاء منکر سے ہے اسی طرح قولہ:

(اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ) [النحل : ۹۰] (اللہ تمہیں انصاف اوراحسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع

کرتا ہے) تو ایتائے ذی القربٰی عدل واحسان سے ہے جیسے فحشاء اور بغی منکر سے ہے، اسی طرح یہ قولہ:

(وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ) [الأعراف: ۱۷۰] (اور جو لوگ کتاب کو مضبوط پکڑے ہوئے ہیں اور نماز کا التزام رکھتے ہیں) تو اقامتِ صلاۃ عظیم ترین تمسک بالکتاب ہے، اسی طرح:

(اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا) [الأنبياء: ۹۰] (یہ لوگ لپک لپک کرنیکیاں کرتے اور ہمیں اُمید اور خوف سے پکارتے تھے) تو رغباً اور رھباً دعا کرنا بھی خیرات سے ہے، قرآن میں اس کی امثال کثیر ہیں، تو اس طرح کا عطف کبھی تخصیص بالذکر کرنے کی غرض سے ڈالا جاتا ہے اس کے معنائے عام اور معنائے خاص کے اعتبار سے مطلوب ہونے کی وجہ سے اور کبھی اسم کی دلالت حالِ انفراد اور حالتِ اقتران کی رو سے متنوع ہوتی ہے تو جب مفرداً ہو تو عام ہوتی ہے اور جب اپنے غیر کے ساتھ مقرون ہو تو مخصوص ہوئی جیسے فقیر اور مسکین کے الفاظ تو جب کسی جگہ یہ مفرداً استعمال ہو جسے اس آیت میں:

(لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) [البقرة: ۲۷۳] (اُن حاجتمندوں کیلئے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں) اور:

(اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ) [المائدة: ۸۹] (دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے) تو اس میں دوسرا بھی داخل ہے اور جب دونوں کو اکٹھے ذکر کیا جیسے اس آیت میں:

(اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ الخ) [التوبة: ۶۰] (زکاۃ تو مفلسوں اور محتاجوں کا حق ہے) تو دونوں کو الگ الگ نوع شمار کیا، کہا گیا ہے کہ عام پر معطوف خاص حالتِ اقتران میں عام میں داخل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس باب سے ہوتا ہے! تحقیق یہ ہے کہ یہ لازم نہیں، قرآن میں ہے:

(مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ) [البقرة: ۹۸] (جو شخص اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے پیغمبروں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا دشمن ہو)

(وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ) [الأحزاب: ۷] (اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے) خاص کا عام کے ساتھ ذکر متنوع اسباب کی وجہ سے ہوتا ہے! کبھی اس لیے کہ اس کے لیے ایسی خاصیت ہے جو عام کی دیگر جزئیات کے لیے نہیں جیسے حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نسبت ہے اور کبھی اس وجہ سے کہ عام میں اطلاق ہوتا ہے، کبھی اس سے عمومی مفہوم مراد نہیں ہوسکتا جیسے اس آیت میں:

(هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ) [البقرة: ۲-۴] (یہ متقین کیلئے ہدایت ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے

ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو کتاب تم پر نازل ہوئی ہے اور جو کتابیں آپ سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں) تو قولہ: (يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ) اس غیب کو شامل ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے لیکن چونکہ اس میں اجمال ہے اس میں اس امر کی دلالت نہیں کہ غیب سے وہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور وہ بھی جو آپ سے قبل نازل ہوا اور کبھی مقصود یہ ہوگا کہ وہ مخبر بہ کے ساتھ ایمان کے حامل ہیں اور وہ غیب ہے اور اخبار بالغیب کے ساتھ بھی اور یہ جو آپ کی طرف اور آپ سے قبل نازل ہوا، اسی باب سے یہ قولہ:

(اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ) [العنكبوت : ۴۵] (یہ کتاب جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کرو اور نماز کے پابند رہو) اور:

(وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ) (ابھی گزری) اور تلاوتِ کتاب (سے مراد) اس کی اتباع ہے جیسے ابن مسعود نے قولہ:

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ) [البقرة : ۱۲۱] (جنہیں ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے) کی تفسیر یہ کی کہ اس کے حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام مانتے ہیں اور اس کے مشابہ پر ان کا ایمان ہے اور اس کے محکم پر وہ عمل پیرا ہیں تو کتاب کی اتباع نماز وغیرِ نماز سب کو متناول ہے لیکن اس کی مزیت واہمیت کی وجہ سے اسے خاص بالذکر کیا اسی طرح حضرت موسیٰ سے یہ کہنا:

(اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ) [طٰه : ۱۴] (بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو) تو لذکرہٖ نماز کی اقامت اس کی عبادت کی غرض سے ہے اسی طرح:

(اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا) [الأحزاب : ۶۹] (اللہ سے ڈرو اور سدید بات کیا کرو) اور:

(اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ) [المائدة : ۳۵] (اللہ سے ڈرتے رہو اور اُس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو)

(اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ) [التوبة : ۱۱۹] (اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو) تو یہ سب امور بھی تقویٰ ہی سے ہیں، اسی طرح قولہ:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) (ابھی گزری) تو توکل اور استعانت اللہ کی عبادت سے ہے لیکن انہیں خاص بالذکر کیا تا کہ متعبد بطورِ خاص ان کا خیال کرے اور ان پر توجہ دے کہ یہ تمام انواعِ عبادت پر مددگار ہے کیونکہ اللہ کی عبادت اس کی طرف سے حاصل معونت کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہ سب واضح ہونے کے بعد ملحوظ ہو کہ مخلوق کا کمال اللہ کے لیے اس کی عبودیت کی تحقیق میں ہے! جوں جوں بندہ عبودیت کی تحقیق میں بڑھتا چلا جاتا ہے اس کے کمال اور درجہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جس نے توھم کیا کہ مخلوق کسی

وجہ سے عبودیت سے خارج ہوسکتی ہے یا یہ کہ اس سے خروج اکمل ہے وہ اجہل اور اضل الناس میں سے ہے، فرمایا:

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ) إلى قوله :(وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ) [الأنبياء: ٢٦۔٢٨] (اور کہتے ہیں کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے، وہ پاک ہے، اُس کے عزت والے بندے ہیں۔۔۔ اور وہ اُس کی ہیبت سے ڈرتے رہتے ہیں) اور کہا:

(وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا) إلى قوله : (وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا) [مريم : ٨٩۔٩٦] (اورانہوں نے کہا کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے۔ اور سب قیامت کے دن اکیلے اکیلے اس کے روبرو ہوں گے) حضرت مسیح بارے کہا:

(اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِ يْلَ) [الزخرف : ٥٩] (وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا اور بنی اسرائیل کے لئے ان کو نمونہ بنا دیا) اور فرمایا:

(وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ) [الأنبياء: ١٩ ـ ٢٠] (اور جولوگ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں سب اُسی کے ہیں اور جو اُس کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے نہ تکبر کرتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں۔ رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں، نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں) اور کہا:

(لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا) [النساء : ١٧٢] (مسیح اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے اور جو شخص اللہ کا بندہ ہونے کو موجب عار سمجھے اور سرکشی کرے تو اللہ سب کو اپنے پاس جمع کر لے گا)

(وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً ۔۔۔ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ)[الأعراف: ٢٠٥۔ ٢٠٦] (اور اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے یاد کرتے رہو۔ جولوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے رُوگردانی نہیں کرتے اور اس پاک ذات کو یاد کرتے اور اس کے آگے سجدے کرتے رہتے ہیں) تو یہ اور اس طرح کی دیگر آیات جن میں اکابر مخلوقات کا عبادت کے ساتھ وصف کیا اور جو اس سے خروج کا دعوی کرے اس کی ذم قرآن کے متعدد مقامات میں مذکور ہے اللہ نے خبر دی ہے کہ اس نے تمام رسل کو اسی کے ساتھ مبعوث کیا ہے چنانچہ کہا:

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ) [الأنبياء: ٢٥] (کئی دفعہ گزری)

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل : ٣٦] (اور ہم نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو) بنی اسرائیل سے کہا:

(يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ)[العنكبوت: ٥٦] (اے میرے بندو! جو ایمان لائے

ہو میری زمین فراخ ہے تو میری ہی عبادت کرو) (سیاق وسباق میں بنی اسرائیل کا ذکر موجود نہیں، اللہ اعلم)

(وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ)[البقرة : ۴۱](اور مجھ سے ڈرتے رہو) اور کہا:

(یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ) [البقرة : ۲۱] (اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بنو)

(قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ) إلی قوله : (فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ) [الزمر : ۱۱۔۱۵] (کہہ دو کہ مجھ سے ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کو خالص کر کے اس کی بندگی کروں۔تو تم اس کے سوا جس کی چاہو پرستش کرو) ہر رسول نے اپنی رسالت کا افتتاح اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دینے سے کیا، حضرت نوح اور بعد کے تمام انبیاء نے کہا تھا:(اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ) [الأعراف : ۵۹] (اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) مسند میں ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا میں قیامت سے آگے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں حتی کہ اللہ وحدہ کی بغیر شریک بنائے عبادت کی جائے اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں کیا گیا ہے اور جو میرے امر کی مخالفت کریں ان کی قسمت میں ذلت وخواری لکھ دی گئی ہے، بیان کیا کہ اللہ کے بندے وہی ہیں جو سیآ ت سے بچتے ہیں، شیطان نے کہا تھا:

(بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَاِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ) [الحجر : ۳۹۔۴۰] (جس طرح تو نے مجھے رائندہِ درگاہ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کیلئے آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔مگر ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں) اللہ نے فرمایا:

(اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ)[الحجر: ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں ہاں بُری راہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑیں) حضرت یوسفؑ کے حق میں کہا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ)[یوسف: ۲۴] (یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہیں) اور کہا:

(سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ) [والصافات : ۱۵۹۔۱۶۰] (یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اللہ اس سے پاک ہے۔مگر اللہ کے مخلص بندے)

(اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ) [النحل : ۹۹۔۱۰۰] (کہ جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں اُن پر اُس کا کچھ زور نہیں چلتا۔اس کا زور اُنہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں اور اس کے سبب شریک مقرر کرتے ہیں) اس کے ساتھ ہر اس کا

وصف کیا جسے اپنی خلق میں سے چنا جیسے کہا:

(وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّار وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ) [ص : ۴۵۔۴۷] (اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے۔ ہم نے ان کو ایک خاص گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا - اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک لوگوں میں سے تھے)

(وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ---۔ نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ)[ص : ۴۱۔۴۴](اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔۔۔ بہت خوب بندے تھے بے شک وہ رجوع کرنے والے تھے) حضرت سلیمان بارے کہا:

(نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ) [ص : ۳۰](اچھے بندے تھے، رجوع کرنے والے) حضرت نوح بارے کہا:

(ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا) [الإسراء : ۳] (ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا بے شک نوح شکر گزار بندے تھے) آنجناب کے حق میں کہا:

(سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ) [الإســـراء : ۱] (پاک ہے وہ ذات جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا) اور:

(وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا) [الجن : ۱۹] (اور جب اللہ کے بندے اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو قریب تھے کہ کافر ان کا گھیراؤ کرلیں)

(وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ) [البقرة : ۲۳] (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا، میں کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنالاؤ)

(فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى) [والنجم : ۱۰] (پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو کی) اور کہا:

(عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ) [الدهر: ٦] (یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے بندے پئیں گے) اور کہا:

(وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا) [الـفرقان : ۶۳](اور اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں) قرآن میں اس طرح کی متعدد مثالیں ہیں۔

فصل

جب یہ واضح ہوا تو معلوم ہے کہ اس باب میں لوگوں کا ایک دوسرے سے عظیم تفاوت ہے اور یہ ان کا **حقیقتِ ایمان**

میں تفاوت اور وہ اس ضمن میں عام اور خاص کی طرف منقسم ہیں اسی لیے ان کے لیے رب کی ربوبیت میں عموم اور خصوص ہے لہذا اس امت میں شرک چیونٹی کے چلنے کی آواز سے بھی اخفیٰ ہے، صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا: (تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ تَعِسَ عَبْدُ الْقَطِيْفَةِ تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِيْصَةِ تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَاِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَ اِنْ مُنِعَ سَخِطَ) (درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو، مال ومتاع کا بندہ ہلاک ہو، جاہ وحشمت کا دلدادہ ہلاک ہو، کوئی اس کا پرسانِ حال نہ ہو، کانٹا چبھ جائے تو اس کا پتہ نہ چلے، اگر عطا کیا جائے تو خوش وگرنہ ناراض) تو اسے اس کا بندہ قرار دیا جو اسے خوش رکھے اور محرومی وفقدان اسے ناخوش رکھے،) تو نبی اکرم نے ایسے شخص کا نام درہم ودینار کا بندہ رکھا اور اس میں جو دعا وخبر ہے اس کا ذکر کیا اور یہ (تَعِسَ وَانْتَكَسَ وَاِذَا شِيْكَ الخ) نقش پاؤں سے کانٹا نکالنے کو کہتے ہیں اور منقاش وہ آلہ جس کے ساتھ کانٹا نکالا جاتا ہے اور یہ اس آدمی کا حال ہے جسے شر پہنچے جو اس سے نکل نہ پایا اور نہ فلاح پائی کیونکہ وہ دولت کا پجاری بن چکا تو نہ مطلوب کا نیل کر سکا اور نہ مکروہ سے خلاصی پاسکا، یہ اس کا حال ہے جو مال کا بندہ بنا، اس کی یہ صفت بیان کی کہ مال ملے تو راضی اور نہ ملے تو ناراض جیسے قرآن میں ہے:

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ) [التوبة: ۵۸] (اوران میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر ان کو اس میں سے مل جائے تو خوش رہیں اور اگر نہ ملے تو جھٹ خفا ہو جائیں) تو ان کی رضا بھی غیر اللہ کی خاطر اور ناراضی بھی غیر اللہ کی خاطر، یہ ان کا حال ہے جو ریاست، سیادت، جاہ وحشمت وغیرہ اہوائے نفوس اور ذاتی اغراض کے متعلقین ہیں کہ مل جائے تو خوش، نہ ملے تو ناراض، خواہشات کے پجاری کا یہی حال ہوتا ہے! فی الحقیقت غلامی اور عبدیت دل کی غلامی اور عبودیت ہوتی ہے تو جس نے دل کو قابو کیا وہ اس کا بندہ ہوا اسی لیے کہا جاتا ہے: (اَلْعَبْدُ حُرٌّ مَا قَنِعَ وَالْحُرُّ عَبْدٌ مَا طَمِعَ) (انسان اگر قانع ہے تو آزاد ہے اور اگر لالچی ہے تو غلام ہے) ایک شاعر نے کہا:

اَطَعْتُ مَطَامِعِىْ فَاسْتَعْبَدَتْنِىْ   وَلَوْ اَنِّىْ قَنِعْتُ لَكُنْتُ حُرًّا

(میں نے اپنی خواہشات کی طاعت کی تو انہوں نے مجھے اپنا بندۂ بے دام بنا لیا اگر قناعت سے کام لیتا تو آزاد ہوتا) کسی کا مقولہ ہے: طمع اور لالچ گردن کا طوق اور پاؤں کی بیڑی ہے اگر گردن کو طوق سے آزاد کرالے تو پاؤں کی بیڑی بھی کھل جائے گی، حضرت عمر کا قول منقول ہے کہ لالچ فقر اور ناامیدی غنیٰ ہے جب کوئی کسی شئ سے مایوس ہو جائے تو اس سے مستغنی ہو جاتا ہے، یہ ہر انسان اپنے آپ میں پاتا ہے کہ جس سے مایوس ہو چکا ہے اس کی طلب نہیں کرتا اور نہ اس کی طمع رکھتا ہے اور نہ اس کا دل اس کی طرف مفتقر ہوتا ہے اور نہ اس کی طرف جسے یہ نصیب ہے لیکن اگر کسی شئ اور امر میں طمع لگائے ہوئے ہے اور امید وابستہ کی ہوئی ہے تو ہر دم دل میں اسی کا خیال رہے گا اور اس کے حصول کا فقیر بنے گا اور اس کی طرف بھی جسے اس کے حصول میں سبب اور مددگار سمجھے یہ مال، جاہ اور صورتوں وغیرہ میں، حضرت ابراہیم نے کہا تھا:

(فَابْتَغُوْا عِنْدَاللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ) [العنکبوت: ۱۷] (پس اللہ ہی کے ہاں سے رزق طلب کرو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُسی کا شکرادا کرو اُسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے) تو بندے کو بہرحال رزق تو چاہیے اور وہ اس کا محتاج ہے لیکن اپنے رزق کو اللہ سے طلب کرے تو اللہ کا بندہ ہوگا، اس کی طرف فقیر محتاج لہٰذا مخلوق سے اس کی طلب فی الاصل حرام ہے صرف ضرورت کے تحت ہی اسے مباح کیا گیا ہے، اس سے نہی میں صحاح، سنن اور مسانید میں کثیر احادیث ہیں جیسے آپ کی یہ حدیث: تمہارا کوئی مسلسل سوالی بنا رہے گا حتی کہ قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے میں گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی اور فرمایا جس نے حاجت نہ ہونے کے باوجود لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا قیامت کے دن اس کے چہرے پر اس کی خراشیں نمایاں ہوں گی اور فرمایا سوال کرنا حلال نہیں مگر قرض میں ڈوبے شخص، بدحال غریب اور بے کس فقیر کے لئے، یہ بھی کہا کہ تمہارا کوئی اپنی رسی لے اور جنگل سے ایندھن اکٹھا کر کے لاکر بازار میں بیچ کر روزی کمائے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، چاہیں تو دیں اور چاہیں تو نہ دیں، ایک حدیث میں فرمایا وہ مال جو تمہارے پاس آجائے اور حال یہ ہو کہ تمہیں اس کی نہ لالچ تھی اور نہ سوال کیا تھا تو اسے قبول کرلو اور جو ایسا نہیں تو اس کے پیچھے اپنے نفس کو نہ لگاؤ تو زبان کے سوال اور دل کی طمع اور لالچ سے منع کیا، ایک صحیح حدیث میں کہا جو استغناء کا مظاہرہ کرے اللہ اسے غنی بنادے گا اور جو اس سے بچے اللہ اسے عافیت دے گا اور جو ہمت کر کے صبر کا پتلا بنا اللہ اسے صبر کی توفیق و ہمت عطا فرمائے گا، کسی کو صبر سے بہتر اور وسیع عطیہ نہیں ملا، آپ نے اپنے خواص اصحاب کو وصیت کی تھی کہ لوگوں سے کسی شیٔ کا سوال نہ کیا کریں، مسند میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق سے (سواری کی حالت میں) چابک گر جاتا تو (خود اتر کر پکڑتے) کسی سے نہ کہتے کہ مجھے یہ پکڑا دو، اور کہتے میرے خلیل (یعنی نبی اکرم) نے مجھے حکم دیا تھا کہ لوگوں سے کسی شیٔ کا سوال نہ کروں، مسلم وغیرہ میں عوف بن مالک سے مروی ہے کہ نبی اکرم سے ایک جماعت کے ہمراہ بیعت کی تو آپ نے سب سے خفیہ اور راز دارانہ انداز میں کہا کہ لوگوں سے کسی شیٔ کا سوال نہ کرنا تو اب ان کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ کسی کے ہاتھ سے چابک گر جاتا تو کسی سے نہ کہتے کہ مجھے یہ پکڑا دو، نصوص کئی مواقع میں صرف خالق سے ہی سوال وطلب کرنے کے امر اور مخلوق سے سوال کی نہی پر دال ہیں، جیسے کہا:

(فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ) [الانشراح: ۷۔۸] (تو جب فارغ ہو تو محنت کیا کرو۔ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو) نبی اکرم نے ابن عباس سے کہا: جب مانگو تو اللہ سے مانگو، جب استعانت کرو تو اللہ کے ساتھ کرو، اسی سے حضرت خلیل کا یہ قول: (فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ) [العنکبوت: ۱۷] یہ نہیں کہا: (فَابْتَغُوْا الرِّزْقَ عِنْدَ اللّٰہِ) کیونکہ ظرف کی تقدیم اختصاص اور حصر کی مشعر ہوتی ہے گویا کہا: (لَا تَبْتَغُوا الرِّزْقَ اِلَّا عِنْدَ اللّٰہِ) قرآن میں ہے:

(وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ) [النساء: ۳۲] (اور اللہ سے اُس کا فضل مانگتے رہو) انسان کے لیے جس طرح رزق وغیرہ کا

حصول ضروری ہے اسی طرح ضار کو اپنے آپ سے دور کرنے کا اور ان دونوں امور میں اس کے لیے مشروع یہ ہے کہ اللہ سے ہی دعا کرے اور اسی سے شکایت کرے جیسے حضرت یعقوب نے کہا تھا:

(اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ) [یوسف : ۸۶] (میں تو اپنے رنج وغم کا اظہار اللہ ہی سے کرتا ہوں) اللہ نے قرآن میں ہجر جمیل، صفح جمیل اور صبرِ جمیل کا ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہجرِ جمیل (عمدہ وجمیل ترک) جو بلا اذی وتکلیف دئے ہجر ہو اور صفحِ جمیل (عمدہ درگزر) جس میں اظہارِ عتاب نہ ہو اور صبرِ جمیل وہی ہوگا جو کرتے ہوئے مخلوق کی نسبت کوئی حرفِ شکایت زباں پہ نہ لائے، امام احمد کی مرض میں انہیں سنایا گیا کہ طاؤس (مشہور تابعی) مریض کے ہائے ہائے کرنے کو مکروہ گردانتے تھے اور کہتے تھے یہ بھی شکوہ ہے، اس پر احمد نے وفات تک کبھی ہائے ہائے نہیں کی، جہاں تک خالق کے سامنے شکوہ وشکایت کے الفاظ منہ سے نکالنا تو یہ صبرِ جمیل کے منافی نہیں، حضرت یعقوب نے: (فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ) [یوسف : ۱۸] (پس صبرِ جمیل ہی کرتا ہوں) کہا اور کہا: (قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ الخ) حضرت عمر نمازِ فجر میں سورہ یونس، سورہ یوسف اور سورۃ النحل پڑھا کرتے تھے ایک دفعہ اثنائے قراءت اس آیت سے گزرے تو اتنا روئے کہ آخری صف تک ان کے رونے اور ہچکیاں لینے کی آواز پہنچی، حضرت موسیٰ کی ایک دعا کے الفاظ ہیں: (اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ اِلَيْكَ الْمُشْتَكیٰ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَ بِكَ الْمُسْتَغَاثُ وَ عَلَيْكَ التُّكْلَانُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ) (اے اللہ تیرے لئے ہی حمد ہے، تیرے سامنے ہی میرا شکوہ ہے تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں اور تجھ پر ہی میرا بھروسہ ہے) اہلِ طائف کے برے سلوک کو برداشت کرتے ہوئے نبی اکرم نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی تھی: (اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ اَللّٰهُمَّ اِلیٰ مَنْ تَكِلُنِيْ؟ اِلیٰ بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَمْ اِلیٰ عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا اُبَالِيْ غَيْرَ اَنَّ عَافِيَتَكَ اَوْسَعُ لِيْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ بِهِ الْكَلِمَاتُ وَ صَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَنْ يَنْزِلَ بِيْ سَخَطُكَ اَوْ يَحِلُّ عَلَيَّ غَضَبُكَ لَكَ الْعُتْبیٰ حَتّٰى تَرْضیٰ فَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ) (اے اللہ میں تیرے سامنے ہی اپنے ضعفِ قوت، قلتِ حیلہ [بے بسی] اور لوگوں پر ہلکے پن کا شکوہ کرتا ہوں، تو کمزور سمجھے گئے افراد کا رب ہے اور میرا رب تو ہی ہے اے اللہ تو کس کے سپرد مجھے کرے گا؟ کسی دور کے بندے کی طرف جو مجھ سے ترش روئی سے پیش آئے یا دشمن کو میرے امر کا مالک بنائے گا؟ اگر تو مجھ پہ ناراض نہیں تو پھر کسی کی کوئی پرواہ نہیں البتہ تیری عافیت میرے لئے اوسع ہے، میں تیرے چہرۂ اقدس کے نور کے ساتھ جس کی رو سے کلمات روشن ہیں اور دنیا وآخرت کے معاملہ کی صلاح ہے اس بات سے پناہ کا طالب ہوں کہ مجھ پہ تیری ناراضی اترے یا تیرا غضب نازل ہو، مجھے تیری رضا درکار ہے، پس کوئی قوت اور حیلہ نہیں مگر تیرے ساتھ ہی)

بندے کی جوں جوں اللہ کے فضل، رحمت اور ضروریات پوری کرنے اور دفعِ ضرورت کے لیے اس سے امید لگانا قوی

ہواس کے لیے اس کی عبودیت اور اس کے ماسوا سے اس کی حریت مضبوط ہوگی تو جس طرح مخلوق میں اس کی طمع اس کے لیے اس کی عبودیت کی موجب ہے تو اس سے اس کی ناامیدی اس کے دل کو اس سے مستغنی کرنے کی موجب ہوگی جیسے کہا گیا ہے جس کسی سے تم مستغنی ہوگے اس کے مثیل ونظیر بن جاؤ گے اور جس سے افضل ہوجاؤ تو اس کے امیر بنو گے اور جس کے محتاج بن جاؤ تو اس کے اسیر ہوجاؤ گے، تو اسی طرح بندے کی اپنے رب میں طمع اور اسی سے امیدیں باندھنا اس کے لیے اس کی عبودیت کا موجب بنے گا اور غیر اللہ سے طلب کرنے سے اس کے دل کا اعراض اور مخلوق سے امیدیں وابستہ کرنا اللہ کے لیے عبودیت سے اس کے دل کے انصراف کا موجب بنے گا، بالخصوص وہ جو مخلوق سے امید تو باندھتا ہے لیکن خالق سے نہیں اس طور کہ اس کا دل اعتماد کئے ہوئے ہے، یا تو اپنی جاہ وحشمت، اَتباع اور اپنے ممالیک پر اور یا پھر اپنے اہل واحباب پر اور یا اموال وذخائر پر یا اپنے سادات وکبراء پر مثلا مالک، باس، شیخ، مخدوم اور پیر وغیرہ، ان میں سے جو فوت ہو چکے یا جو ابھی زندہ ہیں، فرمایا:

(وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا) [الفرقان : ۵۸] (اور اس زندہ پر بھروسہ رکھو جو نہیں مرے گا اور اُس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے خبر رکھنے کو کافی ہے) ہر جس کا دل مخلوقات کے ساتھ معلق ہے کہ وہ اس کی مدد کریں یا اسے رزق دیں یا اسے ہدایت دیں تو اس کا دل ان کے لیے خاضع ہوگا اور اسی بقدر اس میں ان کے لیے عبودیت ہوگی اگرچہ بظاہر خود ان کا امیر یا مدیر یا متصرف بنا پھرتا ہو! تو عاقل حقائق کو مدِ نظر رکھتا ہے نہ کہ ظواہر کو، آدمی کا دل اگر کسی عورت کے ساتھ متعلق ہے چاہے وہ اس کے لیے مباح ہی کیوں نہ ہو (یعنی بیوی اور لونڈی) تو اس کا دل اس کا اسیر ہوتا ہے اور اس کے لیے اس میں حسبِ خواہش تصرُّف ہے اور اسے وہ اپنی انگلیوں پہ نچاتی ہے حالانکہ بظاہر وہ اس کا آقا ہے کیونکہ اس کا شوہر ہے مگر فی الحقیقت وہ اس کا اسیر اور مملوک ہے بالخصوص جب اسے علم ہو کہ وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا اور اس کا عاشق ہے اس حالت میں اس کے بارے میں اس کا رویہ اپنے مقہور غلام کے ساتھ ایک جابر وقاہر حاکم کا سا ہوگا جو اس سے خلاصی پانے کی استطاعت نہیں رکھتا بلکہ اس سے بھی اعظم کہ دل کی اسیری جسم کی اسیری سے اور دل کی غلامی بدن کی غلامی اعظم ہے، جس کا بدن قیدی یا غلام ہے اگر اس کا دل مطمئن ہے تو اسے اس کی پرواہ نہ ہوگی بلکہ خلاصی کی جدوجہد کرسکتا ہے لیکن اگر دل میں خوئے غلامی رچ بس گئی ہے اور وہ اس کا بے دام بندہ بن چکا ہے تو یہ ذل اور اسرِ محض ہے اور عبودیت میں جکڑا ہوا ہے

دل کی عبودیت واسیری پر ہی ثواب وعقاب مترتب ہے تو اگر کافر کسی مسلمان کو قیدی بنالے یا کوئی فاجر کسی کو ناحق غلام بنالے تو اس سے نقصان نہیں اگر وہ اپنے ذمہ عائد واجبات ادا کر رہا ہے اور جو جائز طریق سے غلام بنایا گیا ہے اور وہ اپنے آقا کے حق کے ساتھ ساتھ اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہے تو اس کے لیے دو اجر ہیں، اگر تکلم بالکفر پر مجبور کیا گیا اور اس نے کرلیا جبکہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے تو اس کا اسے نقصان نہیں لیکن جو دل سے کسی غیر اللہ کا غلام اور بندہ بنا تو یہ اس کے لیے نقصان دہ

ہے چاہے بظاہر وہ بادشاہ اور حاکم ہی ہو، تو اصل آزادی دل کی آزادی ہے اور اصل عبودیت دل کی عبودیت ہے جیسے اصل غنیٰ نفس اور دل کا غنی ہونا ہے، یہ تو جو مباح صورت وطریقہ سے اپنے دل کو کسی کا غلام بنالے لیکن جو حرام طریق سے اور صورت سے متعلق ہو کر ایسا کرے، خواہ وہ صورت عورت ہو یا کوئی لڑکا تو یہ ایسا عذاب ہے جس کی نظیر نہیں، یہ لوگ سب سے بڑے عذاب والے اور سب سے کم ثواب والے ہیں، کسی صورت کے عاشق اور بندہ بے دام کے لیے وہ انواعِ شر وفساد جمع ہوتی ہیں جن کا شمار بس اللہ ہی کو ہے، اگر بدکاری سے بچ بھی جائے تو دل کا مسلسل اور ہمیشہ اس کے خیالات سے لبریز رہنا نقصان کے اعتبار سے بدکاری سے کم نہیں، یہ تو سکاریٰ اور مجانین سے مشابہ ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے:

سَکْرَانِ سَکْرُ هَویً وَ سَکْرُ مَلَامَةٍ وَ مَتیٰ اِفَاقَةُ مَنْ بِهٖ سَکْرَانِ

(دوقسم کے نشے ہیں ایک خواہش کا نشہ اور دوم ملامت کا، نشہ میں ڈوبا ہوا کب ہوش میں آتا ہے؟) کسی اور نے کہا:

قَالُوْا جُنِنْتَ بِمَنْ تَهْوٰی فَقُلْتُ لَهُمْ اَلْعِشْقُ اَعْظَمُ مِمَّا بِالْمَجَانِيْنِ

اَلْعِشْقُ لَا يَسْتَفِيْقُ الدَّهْرَ صَاحِبُهٗ وَاِنَّمَا يُصْرَعُ الْمَجْنُوْنُ فِي الْحِيْنِ

(لوگ کہتے ہیں تم تو اپنے محبوب کی وجہ سے مجنوں ہو گئے ہو؟ میں نے کہا عشق جنوں سے بڑھ کر بلا خیز ہے۔ مجنون کو تو کبھی افاقہ ہو جاتا ہے مگر عاشق کو کبھی نہیں) اس ابتلاء وبلا کا سب سے بڑا سبب دل کا اللہ سے اعراض ہے دل اگر اللہ کی عبادت اور اس کے لیے اخلاص کا ذائقہ چکھ لے تو اس سے اَحلیٰ، اَلذ اور اَطیب کوئی شئ نہ لگے گی، انسان محبوب شئ کا ترک نہیں کرتا مگر کسی اور محبوب کے ساتھ جو اس سے بڑھ کر اسے محبوب ہو جائے یا پھر کسی خوف کی رو سے، فاسد محبت سے انسان صرف صالح محبت کے ساتھ ہی چھٹکارا پا سکتا ہے یا پھر ضرر سے خوف کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کے حق میں کہا: **(کَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)** (کچھ قبل گزری) تو اللہ اپنے ہاں پسندیدہ کے ساتھ اپنے بندے سے اس کے صورتوں کی طرف میلان اور ان کے ساتھ تعلق کو پھیر ڈالتا ہے اور اس کے اخلاص کے باوصف اس سے فحشاء کو بھی، اللہ کے لیے عبودیت اور اخلاص کی حلاوت کا ذائقہ چکھنے سے قبل نفس پر شہوات کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے ل لیکن جب دل اس حلاوت سے آشنا ہو جائے اور اس کی جڑ قرار پکڑ جائے تو صرف اسی سے یہ غلبہ ہو گا، فرمایا: **(اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ)** (ابھی گزری) تو نماز میں ہر قسم کی مکروہ (یعنی اللہ کو ناپسندیدہ) شئ از قسم فحشاء ومنکر کا دفع اور تحصیلِ محبوب ہے اور یہ اللہ کا ذکر ہے، اس محبوب کا حصول دفعِ مکروہ سے اکبر ہے، اللہ کا ذکر اس کی عبادت ہے اور دل کی اللہ کے لیے عبادت مقصود بالذات ہے جبکہ اس سے شر کا دور ہونا لغیرہٖ علی سبیل التبع مقصود ہے، دل خلق ہے جو حق کا محبّ، اس کا مرید اور طالب ہے تو جب اس کے لیے ارادہ شر عارض ہوا تو اس کے دفع کا طالب بنا کیونکہ یہ دل کو اس طرح خراب کر ڈالتا ہے جیسے کھیتوں کو ان میں اگی

ہوئیں جھاڑ جھنکار وغیرہ، اسی لیے اللہ نے ارشاد کیا:

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا) [والشمس : ۹-۱۰] (کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک رکھا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا)

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى) [الغاشیة : ۱۴-۱۵] (بے شک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا)

(قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ) [النور : ۳۰] (مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے)

(وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا)[النور : ۲۱] (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہوسکتا) تو اللہ سبحانہ نے غضِ بصر اور حفظِ فرج کو نفس کے لیے ازکیٰ قرار دیا اور بیان کیا کہ ترکِ فواحش نفوس کی زکاۃ (یعنی پاکیزگی) سے ہے اور یہ فواحش، ظلم، شرک اور کذب وغیرہ تمام شرور کے زوال کو متضمن ہے، اسی طرح زمین میں سیادت وعلو کا طالب! تو اس کا دل اس کا غلام بن جاتا ہے جو اس کے حصول پر اس کی مدد کرے اگر چہ بظاہر ان کا امیر ومطاع ہی ہو مگر فی الحقیقت انہی سے اس کی امیدیں وابستہ ہیں اور ان سے خائف بھی رہتا ہے (کہ کہیں وفاداری بدل نہ لیں) تو ساتھ رکھنے کی خاطر بھاری اموال خرچ کرتا ہے اور عہدے دیتا ہے اور (چھوٹی موٹی غلطیاں اور عوام پر ان کی زیادتیاں) نظر انداز کرتا ہے، بظاہر تو رئیس ومطاع ہے لیکن بصیرت کی آنکھ سے دیکھیں تو ان کا مطیع اور عبد ہے

تحقیق یہ ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے لئے عبودیت ہے اور دونوں ہی اللہ کی عبادت کی حقیقت کے تارک ہیں، جب ان کا باہمی تعاون بغیر حق زمین میں علو کے حصول کے لئے ہے تو یہ بمنزلہ ان کے ہے جو بدکاری کرنے یا ڈاکہ مارنے پر ایک دوسرے سے تعاون کریں تو ان میں سے ہر ایک اصل میں اپنی ذاتی خواہش اور غرض کا غلام ہے اور اسی کے لیے سعی کر رہا ہے، اسی طرح طالبِ مال بھی تو اس نے اسے اپنا بندہ اور غلام بنایا ہوا ہے، یہ امور دو انواع ہیں: ایک جس کی طرف بندہ اس طرح محتاج ہے جیسے اکل وشرب اور مسکن ومنکح کا محتاج ہوتا ہے تو اسے وہ اللہ سے طلب کرتا ہے اور اسی کی طرف رغبت کرتا ہے تو اس کا مال جسے اپنی حاجات میں خرچ کرتا ہے اس کی سواری اور اس کی گدی بلکہ اس کے بیت الخلاء کے بمنزلہ ہے جس میں جا کر قضائے حاجت کرتا ہے بغیر اس کے کہ اس کا استعباد کرے (یعنی اس کا بے دام بندہ بنے) تو حالت یہ ہو کہ ہلوع اور جزوع (یعنی گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر کرنے اور جزع فزع کرنے والا) ہو جب کوئی شر چھوئے اور اگر خیر ملے تو منوع (بخیل) بنے

دوم، جس کی طرف بندہ محتاج نہیں تو اس کے ضمن میں مناسب نہیں کہ اس کا دل اس کے ساتھ معلق ہو کر رہ جائے کہ اگر یہ

کیفیت ہوئی تو اس کا بے دام بندہ بن جائے گا اور بسا اوقات غیر اللہ پر اعتماد کرنے والا ہو جائے گا تو اس کے پاس اللہ کے لیے عبادت کی حقیقت نہ ہوگی اور نہ حقیقتِ توکل بلکہ اس میں غیر اللہ کے لیے عبادت کا ایک شعبہ وحصہ اور توکل ہوگا اور یہ نبی اکرم کی سابق الذکر حدیث: (تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ الخ) کا نہایت حقدار بنے گا اور فی الحقیقت یہی ان امور کا عبد ہے، اگر اللہ سے ان کی طلب کرے اور وہ عطا کرے تو خوش اور اگر عطا نہ کرے تو ناخوش، دراصل اللہ کا بندہ وہ ہے جو اللہ کی رضا میں راضی اور اس کی ناراضی میں ناراض ہو، اسے وہ پسند ہوگا جو اللہ ورسول کو پسند ہے اور ہر وہ مبغوض ہوگا جو اللہ ورسول کو مبغوض ہے اور اللہ کے اولیاء سے موالات اور اس کے اعداء سے معادات کرے گا، تو یہی ہے جس نے ایمان کا استکمال کیا جیسے ایک حدیث میں ہے جس نے اللہ کی خاطر حب اور بغض کیا اس نے ایمان کا استکمال کر لیا اور ایک حدیث میں فرمایا ایمان کی کڑیوں میں سے مضبوط تریں کڑی اللہ کی خاطر محبت اور اسی کی خاطر بغض کرنا ہے، صحیح میں ہے تین خصلتیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی، اللہ ورسول اسے ہر ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں، اہل اللہ سے محبت کرے اور کفر میں واپس جانا اسے آگ میں جلنے کی طرح برا لگے، مخلوق سے اس کی محبت بھی اللہ کی خاطر ہے نہ کہ کسی اور غرض کے لیے تو یہ اس کی اللہ سے محبت کا حصہ ہے کیونکہ محبوب کے محبوب سے محبت محبوب کی محبت کی تمامیت سے ہوتی ہے تو جب کسی نے اللہ کے انبیاء اور اولیاء سے اس وجہ سے کہ وہ حق تعالی کے محبوبات کو قائم کرتے ہیں، محبت کی اور اس میں کوئی اور غرض شامل نہیں تو گویا اس نے اللہ کے لیے ان سے محبت کی نہ کہ اس کے غیر کے لیے، فرمایا:

(فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ) [المائدة : ۵۴] (تو اللہ ایسے لوگ لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں) اسی لیے کہا:

(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) [آل عمران : ۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا) تو رسول اسی کا حکم دیتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے اور اسی سے روکتے ہیں جو اسے ناپسند ہے، ان کا ہر فعل اللہ کی رضا کے تابع ہے اور اسی کی وہ خبر دیتے ہیں اللہ جس کی تصدیق کرنا پسند کرتا ہے تو جو اللہ کا سچا محبّ ہے اس پر لازم ہے کہ رسول کی اتباع کرے اور ان کی ہر اِخبار کی تصدیق کرے اور ان کے ہر حکم کو مانے اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ اس سے محبت کرے گا تو اللہ نے اپنے اہلِ محبت کی دو علامتیں بیان کی ہیں: رسول کی اتباع اور اس کی راہ میں جہاد، اس لیے کہ جہاد کی حقیقت ایمان اور عملِ صالح کے حصول میں اجتہاد (یعنی محنت کرنا) ہے جو اللہ کو محبوب ہیں اور جو کفر، فسوق اور عصیان اسے مبغوض ہے اس سے دور رہنا، فرمایا:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ ـ ـ ـ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) [التوبة : ۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی ـ ـ ـ حتی کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے) تو جسے اس کا

اہل و مال اللہ ورسول اور اس کی راہ میں جہاد سے بڑھ کر پیارا اور عزیز ہے اسے آیت میں مذکور دھمکی دی ہے، صحیح میں ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوسکتا حتی کہ میں اسے اس کے ولد، والد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر پیارا نہ ہو جاؤں، صحیح میں ہے کہ حضرت عمر نے ایک مرتبہ عرض کی یارسول اللہ آپ مجھے سوائے میری جان کے ہر شئ سے زیادہ عزیز ہیں، فرمایا نہیں اے عمر حتی کہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں، تو عرض کی بخدا اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں، فرمایا اب اے عمر! تو محبت کی حقیقت تام نہیں ہوگی مگر محبوب کی موالات کے ساتھ اور یہ اسے محبوب کی محبت اور اسے مبغوض سے بغض میں اس کی کامل موافقت، اللہ کو ایمان وتقوی پسند اور کفر، فسوق اور عصیان مبغوض ہیں اور معلوم امر ہے کہ محبت دل کے ارادہ کو تحریک دیتی ہے تو جوں جوں دل میں محبت کا جذبہ قوی ہوگا اسے فعلِ محبوبات کی طلب ہوگی تو جب محبت تام ہوگی تو یہ حصولِ محبوبات میں جازم (یعنی پختہ) ارادہ کو مستلزم ہے! جب بندہ اس پر قادر ہو تو اسے حاصل کرلے گا اور اگر عاجز ہوگا تو جو اور جتنا اس کے بس میں ہے کرے گا مگر اجر اسے (کامل) فاعل کا ہی ملے گا جیسے نبی اکرم نے فرمایا جس نے ہدایت کے کسی فعل کی طرف دعوت دی تو جتنوں نے اس کی بات سے اثر لے کر وہ کام کیا ان کے اجور کی مثل اسے بھی اجر حاصل ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے اجور میں کوئی کمی ہو اور جس نے گمراہی اور بدعت وغیرہ کے کسی کام کی دعوت دی تو جتنوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہ کام کیا تو ان سب کے گناہ کی مثل اس کے بھی کھاتے میں درج کیا جائے گا بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو اور فرمایا مدینہ میں ایسے آدمی ہیں کہ تم (جہاد کیلئے) کسی راستہ میں نہیں چلتے اور کسی وادی کو طے نہیں کرتے مگر وہ تمہارے ہمراہ ہوتے ہیں، عرض کی مدینہ میں رہتے ہوئے؟ فرمایا بوجہ معذوری وہ جانہیں سکتے اور مدینہ میں رکے ہوئے تھے

جہاد کا معنی بذلِ وسع ہے (یعنی حسب طاقت کوشش کرنا) اور یہ حق کو محبوب کے حصول اور اسے مبغوض کے دفع میں قدرت، اگر بندہ قدرت کے باوجود ترکِ جہاد کرتا ہے تو یہ اس کے دل میں موجود اللہ ورسول کی محبت کے ضعف پر دلیل ہے اور معلوم امر ہے کہ محبوبات کا عموماً نیل و وجدان نہیں ہوتا مگر مشقتیں برداشت کرنے کے ساتھ چاہے صالح محبت ہو یا فاسد محبت تو مال، ریاست اور صورتوں کے محبین کو ان کے مطالب واغراض کا حصول نہیں ہوتا مگر ضرر، مشقت اور تھکاوٹ کے ساتھ جو انہیں دنیا میں لاحق ہوتا ہے اور آخرت میں جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے تو اللہ اور اس کے رسول کے محبّ ہونے کا دعوی کرنے والا اگر یہ سب برداشت نہ کرے جو غیر اللہ کسی شئ کے محبّ اپنے محبوب کے حصول میں برداشت کرتے ہیں تو یہ اس کے دعوائے محبت کے ضعف پر دال ہے جبکہ مومن تو ان اہلِ دنیا سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرنے والا ہوتا ہے جیسے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة: ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو

اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) ہاں کبھی محبّ اپنے ضعفِ عقل اور فسادِ تصور کی وجہ سے ایسے طریق کا سالک بن جاتا ہے جو اسے مطلوب تک نہیں پہنچاتا تو اس طرح کا طریق محمود نہیں اگر چہ محبت صالح ومحمود بھی ہو تو کیسے جب محبت فاسد اور طریق غیر موصل ہو؟ جیسے دنیوی اغراض کے محبین اپنے مطلوب کے حصول کے لیے ہر جائز وناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں پھر بھی کئی دفعہ نیلِ اغراض میں ناکام رہتے ہیں لہذا طریق کی جو مطلوب ومحبوب تک پہنچائے بہت اہمیت ہے

یہ واضح ہونے کے بعد، دل میں جوں جوں اللہ کی محبت زیادہ ہوتی جائے گی اس کے لیے عبودیت میں وہ بڑھتا جائے گا اور جوں جوں عبودیت میں ازدیاد ہوگا اللہ کی محبت اور اس کے ماسوا سے حریت میں وہ مزداد ہوگا، دل بالذات دو جہت سے اللہ کی طرف فقیر ومحتاج ہے: جہتِ عبادت سے اور یہ علتِ غائیہ ہے اور استعانت وتوکل کی جہت سے اور یہ علتِ فاعلیہ ہے تو دل صالح ومفلح نہ ہوگا اور نہ ملتذ وسارّ اور نہ طیب وپرسکون اور مطمئن مگر اپنے رب کی عبادت کے ساتھ اور اس کی حب اور اس کی طرف انابت کے ذریعہ، اس کے بغیر چاہے مخلوقات سے تمام قابلِ التذاذ چیزیں اسے حاصل ہوجائیں مگر دلی سکون واطمینان نہ ملے گا کیونکہ اس میں رب کی طرف فقرِ ذاتی ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کا معبود، محبوب اور مطلوب ہے اسی سے اسے حقیقی مسرت، فرحت، لذت، نعمت اور سکون وطمانیت کا حصول ہوگا اور یہ سب حاصل نہ ہوگا مگر جب اسے اللہ کی طرف سے اعانت وتوفیق حاصل ہو، اس کے لیے اس کی تحصیل کی قدرت سوائے اللہ کے کسی کے پاس نہیں، بندہ ہمیشہ (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) کی حقیقت کی طرف مفتقر ومحتاج ہے اگر اسے اس کے محبوب ومطلوب کے حصول پر اعانت حاصل ہو مگر اللہ کے لیے اس کی عبادت اسے حاصل نہ ہو اس طور کہ یہی اس کی غایتِ مراد اور منتہائے مقصود ہے اور یہ قصدِ اول کے ساتھ اس کا محبوب ہے اور اس کے ہر ماسوا سے اس کی محبت اسی کی خاطر ہے اور وہ سوائے اللہ کے کسی شئ کا لذاتہ محبّ نہیں تو جب یہی (جو اس محبت کی غایت ہے) اسے حاصل نہیں تو گویا اس نے لا الہ الا اللہ کی حقیقت کو محقّق نہ کیا اور نہ توحید، عبودیت اور محبت کو اور اس میں نقص وعیب ہوا بلکہ اسی کے بحسب الم، حسرت اور عذاب ہے اگر وہ اس مطلوب میں سعی کرے اور اللہ کے ساتھ استعانت نہ کی اور نہ اس پر توکل کیا اور نہ اس کی طرف افتقار ومحتاجگی ظاہر کی تو یہ اسے حاصل نہ ہوگا کیونکہ اللہ کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، بندہ اللہ کی طرف مفتقر ہے اس طور کہ وہ مطلوب، محبوب، مراد اور معبود ہے اور اس طور کہ وہ مسؤول، مستعان بہ اور متوکل علیہ ہے، وہ سب کا الہ ہے اس کے سوا کوئی الہ ہونے کے قابل نہیں اور نہ رب بننے کا

اللہ کے لیے عبودیت تام نہ ہوگی مگر ان دو کے ساتھ تو جب بندہ کسی غیر اللہ سے لذاتہ محبت کرے یا کسی غیر اللہ کی طرف یہ سمجھ کر التفات کرے کہ وہ اس کی اعانت کرسکتا ہے تو وہ اسی کا عبد بنا جس سے اس نے محبت کی اور اپنی امیدیں باندھیں اپنی اس سے محبت اور رجاء کے بقدر اور اگر سوائے اللہ کے لذاتہ کسی کو اپنا محبوب نہ بنایا، اگر کسی ماسوا سے محبت کی بھی تو اسی کی خاطر کی اور کبھی اللہ کے سوا کسی شئ سے امیدیں وابستہ نہیں کیں اور اگر اسباب کو اختیار کیا تو اس امر کا مشاہد ہو کر کہ یہ بھی اللہ کی تخلیق ہیں اور

اس کی تقدیر کیا حصہ ہیں اور کائنات میں جو کچھ ہے سب کا رب، ملیک اور خالق ایک اللہ ہے اور سب اسی کے مفتقر محتاج ہیں تو اس عقیدہ وایمان کے بقدر اس کے لیے تمامیتِ عبودیت حاصل ہوگی اور اس ذیل میں لوگ متفاوت درجات پر ہیں، ان کی انتہاء وں کا علم اللہ ہی کو ہے تو خلق میں سے اکمل، افضل، اعلی، اللہ کی طرف اقرب، اقوی اوراہدیٰ وہ جو اس وجہ سے اللہ کے لیے عبودیت میں اتم ہے! یہی اس دینِ اسلام کی حقیقت ہے جس کے ساتھ اللہ نے رسل مبعوث کئے اور کتب نازل کیں اور وہ یہ کہ بندہ اللہ کے لیے استسلام کرے نہ کہ اس کے غیر کے لیے اور جو اس کے لیے بھی اور اس کے غیر کے لیے بھی مستسلم ہو وہ مشرک ہے اور جو استسلام سے ممتنع ہے وہ متکبر ہے، صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا جیسے آگ میں (ہمیشہ کے لیے) داخل نہ ہوگا وہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے! تو یہاں تکبر کو ایمان کا مقابل کیا ہے، تکبر عبودیت کی حقیقت کے منافی ہے جیسا کہ صحیح میں نبی اکرم سے مروی ہے کہ کہا اللہ تعالی کہتا ہے عظمت میرا ازار اور کبریاء میری ردا ہے تو جس نے ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی مجھ سے منازعت کی تو اسے میں عذاب دوں گا، اسی لیے نمازوں، اذان اور عیدین کا شعار تکبیر ہے (یعنی اللہ کے لیے کبریائی کا اثبات واعلان، اللہ اکبر) اور اونچی جگہوں مثلاً صفا اور مروہ اور سیڑھیاں چڑھتے اور بلندی کی طرف جاتے وقت اور سوار ہوتے ہوئے اللہ اکبر کہنا مستحب ہے، اسی کے ساتھ حریق (یعنی تکبر کی آگ) بجھے گی خواہ کتنی بڑی ہو، اذان کے وقت شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے (حتی کہ زور سے بھاگنے کی وجہ سے اس کے پدیڑ نکلتے ہیں) فرمایا:

(وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ) [الغافر: ٦٠] (اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہارے لئے قبول کروں گا جو لوگ مجھے پکارنے سے استکبار کرتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے) ہر جس نے اللہ کی عبادت سے استکبار کیا ضروری ہے کہ وہ اس کے غیر کا عابد بنے، انسان حساس متحرک بالارادہ ہے، صحیح میں ہے نبی اکرم نے فرمایا اصدق اسماء حارث اور ہمام ہیں، حارث کاسب اور فاعل ہے جبکہ ہمام ھمّ سے فعال ہے (یعنی مبالغہ کا صیغہ) یہ ارادہ کے آغاز کو کہتے ہیں، انسان کے لیے دائمی ارادے ہیں اور ہر ارادہ کے لیے لازم ہے کہ مراد ہو جو اس کا منتہا ہو! تو ہر بندے کے لیے کسی محبوب مراد کا ہونا لازمی امر ہے جو اس کی حب اور اس کے ارادوں کا منتہا ہو تو جس کا اللہ معبود نہیں اور نہ اس کی حب وارادہ کا منتہا بلکہ وہ اس سے استکبار کرتا ہے تو ضروری ہے کہ پھر غیر اللہ میں سے کوئی اس کا محبوب ومراد ہو جسے اس نے اپنا مستعبد بنا رکھا ہے تو وہ اس کا بے دام بندہ بن جائے گا، مال یا جاہ وحشمت یا صور یا جسے بھی وہ اللہ کے سوا اپنا الہ بنالے مثلاً چاند، سورج، کواکب، اوثان واصنام اور انبیاء وصالحین کی قبور یا فرشتوں اور انبیاء میں سے وہ جنہیں اس نے ارباب بنالیا یا کوئی بھی غیر اللہ جس کی یہ پوجا وعبادت میں لگا ہوا ہے اور جو بھی ایسا ہے وہ مشرک ہے، تو ہر مستکبر مشرک ہے، فرعون تمام خلق میں سب سے بڑا اللہ کی عبادت سے مستکبر تھا اور وہ مشرک تھا، فرمایا:

(وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ) إلی قوله : (وَقَالَ مُوْسٰٓی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ) [الغافر : ۲۳۔۲۷] (اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور دلیلِ روشن دے کر بھیجا۔ موسیٰ نے کہا کہ میں ہر متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں لاتا اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں) آگے کہا:

(کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ) [الغافر: ۳۵] (اسی طرح اللہ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے) اور کہا:

(وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا کَانُوْا سٰبِقِیْنَ) [العنکبوت: ۳۹] (اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی اور اُن کے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ملک میں مغرور ہو گئے اور وہ قابو سے نکل جانے والے نہ تھے) اور کہا:

(اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ) إلی قوله : (فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ) [القصص : ۴۔۴۰] (بے شک فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کر دیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا۔۔۔ تو ہم نے ان کو اور ان کے لشکروں کو پکڑ لیا اور دریا میں ڈال دیا سو دیکھ لو کہ ظالموں کا کیسا انجام ہوا)

قرآن میں اس کا مثل کثیر ہے، درج ذیل آیت میں فرعون کا شرک کے ساتھ وصف ہے:

(وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِهَتَکَ) [الأعراف : ۱۲۷] (اور قومِ فرعون میں جو سردار تھے کہنے لگے کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیجئے گا کہ ملک میں خرابی کریں) بلکہ استقراء (مشاہدہ اور مطالعہ) دال ہے کہ آدمی اللہ کی عبادت سے جتنا استکبار میں اعظم ہو وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے میں بھی اتنا ہی اعظم ہوگا کیونکہ جب بھی اللہ کی عبادت سے استکبار کرے گا اس مراد ومحبوب کی طرف اس کا افتقار بڑھے گا جو مقصود ہے، قصدِ اول کے ساتھ دل کا مقصود، تو یوں وہ اس استعباد کی رو سے مشرک بنا، دل تمام مخلوقات سے مستغنی نہیں ہوسکتا مگر اس طور کہ اللہ کو اپنا مولیٰ سمجھے جس کے سوا کسی کی عبادت نہیں اور نہ استعانت کرے مگر اسی کے ساتھ اور نہ توکل کرے مگر اسی پر اور نہ خوش اور راضی ہو مگر جس میں اللہ کی رضا ہو اور جو اسے محبوب ہو اور نہ برا سمجھے مگر اسے ہی جو رب کو مبغوض ومکروہ ہے اور نہ موالات کرے مگر اس سے جس سے اللہ کو موالات ہے اور نہ معادات کرے مگر اس سے جس سے اللہ کو معادات ہے، اس کا محبوب فقط اللہ ہو (یعنی محبوبِ حقیقی یا بالفاظِ دیگر: لذاتہٖ محبوب) اور نہ کسی شیٔ سے بغض کرے مگر اللہ کی خاطر، عطا کرے تو اللہ کے لیے، روک رکھے تو اللہ کی خاطر! تو جوں جوں اللہ کے لیے اس کا اخلاص قوی ہوگا مخلوقات سے اس کا استغناء اور اللہ کے لیے اس کی عبودیت کامل ہوگی اور

اس کمالِ عبودیت کے فیضان سے کبر اور شرک سے بچا رہے گا، نصاریٰ پر شرک اور یہود پر کبر غالب ہوا، نصاریٰ بارے ارشاد ہوا:

(اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)[التوبة : ۳۱] (انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابنِ مریم کو اللہ کے سوا معبود بنا لیا حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے) یہود بارے کہا:

(اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ) [البقرة : ۸۷] (تو کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آیا جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے اور ایک گروہِ (انبیاء) کو تو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے؟) اور فرمایا:

(سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا)[الأعراف: ۱۴۶] (جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں اُن کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی اُن پر ایمان نہ لائیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیں) اور جب کبر شرک کے لیے مستلزم ہے اور وہ اسلام کی ضد ہے اور ایسا گناہ ہے جس کی اللہ (اگر مشرک بغیر توبہ کے مر گیا) کبھی مغفرت نہ کرے گا، فرمایا:

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا)[النساء : ۴۸] (اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے اللہ کا شریک مقرر کیا اُس نے بڑا بہتان باندھا) تمام انبیاء دینِ اسلام کے ساتھ مبعوث ہوئے، یہ وہ دین ہے کہ اللہ کو اس کے سوا کچھ مقبول نہیں، نہ اولین اور نہ آخرین سے، حضرت نوح نے کہا تھا:

(فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ)[يونس : ۷۲](اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو میں نے تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگا میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمے ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں رہوں) حضرت ابراہیم بارے کہا:

(وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ)[البقرة : ۱۳۰-۱۳۲] (اور ابراہیم کے دین سے کون رُوگردانی کر سکتا

ہے سوائے اس کے جونہایت نادان ہو، ہم نے ان کو دنیا میں بھی منتخب کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ صلحاء میں سے ہوں گے۔ جب اُن سے اُن کے رب نے فرمایا کہ اسلام لے آ ؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں۔اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کواسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی کہ اے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا) حضرت یوسف نے دعا کی تھی :

(رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِـرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ)[یوسف: ۱۰۱] (اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت دی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا میں اور آخرت میں میرا کارساز ہے تو مجھے اپنی اطاعت میں اٹھانا اور اپنے نیک بندوں میں داخل کرنا) حضرت موسیٰ نے کہا:

(يٰقَـوْمِ اِنْ كُـنْـتُـمْ اٰمَـنْـتُـمْ بِـاللّٰـهِ فَـعَـلَـيْـهِ تَـوَكَّـلُـوْٓا اِنْ كُـنْـتُـمْ مُّسْلِمِيْنَفَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا)[یونس : ۸۴۔۸۵](اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اگر فرمانبردار ہو تو اُسی پر بھروسا رکھو۔تو وہ بولے کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا) اور فرمایا:

(اِنَّـآ اَنْـزَلْـنَـا التَّـوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا) [المائدۃ : ۴۴] (بے شک ہم نے ہی تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق انبیاء جو فرمانبردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے)ملکہِ سبا بلقیس کا قول ذکر کیا:

(رَبِّ اِنِّیْ ظَـلَـمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) [النمل: ۴۴] (اے میرے رب میں اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی تھی اور میں سلیمان کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین پر ایمان لاتی ہوں) اور فرمایا:

(وَ اِذْ اَوْحَيْـتُ اِلَـى الْـحَـوَارِيّٖـنَ اَنْ اٰمِـنُـوْا بِیْ وَبِـرَسُـوْلِـیْ قَـالُـوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ)[المائدۃ : ۱۱۱](اور جب میں نے حواریوں کی طرف حکم بھیجا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے تو شاہد رہنا کہ ہم فرمانبردار ہیں)

(اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) [آل عمران : ۱۹] (بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)

(وَمَـنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ) [آل عمران : ۸۵](اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا)

(اَ فَـغَيْـرَ دِيْـنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا) [آل عمران : ۸۳] (کیا یہ اللہ

کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے اللہ کے فرمانبردار ہیں) تو کائنات کے طوعاً اور کرہاً اسلام کا ذکر کیا اس لیے کہ تمام مخلوقات تعبدِ عام کی رو سے اس کے لیے متعبد ہیں چاہے اس کا اقرار کریں یا نہ کریں، وہ سب کے سب مَدِین اور مدبرّ ہیں تو طوعاً اور کرہاً اس کے لیے مُسلم ہیں، اس کی مشیت اور قضاء وقدر سے کسی کے لیے بھی خروج کا یارا نہیں اور کوئی حول وقوت نہیں مگر اسی کے ساتھ، وہی عالمین کا رب اور ان کا ملیک ہے، جیسے چاہے تصرف کرتا ہے وہ سب کا خالق، باریٔ اور مصور ہے، اس کا ہر ماسوا مربوب، مصنوع، مفطور، فقیر، محتاج، معبّد اور مقہور ہے جبکہ وہ واحد قہار، خالق، باری اور مصور ہے اگر چہ اس نے مخلوقات کی تخلیق کو اسباب کے ساتھ مربوط کیا ہے لیکن ان اسباب کا خالق بھی وہی ہے، سبب بھی اسی کی طرف مفتقر ہے جیسے مسبب ہے! مخلوقات میں کوئی مستقل بالفعل سبب موجود نہیں اور نہ دفعِ ضرر کے ساتھ، بلکہ جو بھی سبب ہے وہ ایک اور سبب کا محتاج ہے جو اس کا معاون ہے اور اس کا بھی جو اس سے معارض اور مانع کو دور کرے، وہی اکیلا اپنے ماسوا سے غنی ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے جو اس کا معاون ہو اور نہ کوئی مخالف ومنافی جو اس کا مناویٔ ومعارض ہو، فرمایا:

(قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ [۳۸] (کہو بھلا دیکھو تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو کیا وہ اس تکلیف کو دُور کر سکتے ہیں یا اگر مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو وہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ کہہ دو کہ مجھے اللہ ہی کافی ہے بھروسہ رکھنے والے اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں)

(وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ)[الأنعام : ۱۷](اور اگر اللہ تمہیں کوئی سختی پہنچائے تو اُس کے سوا اس کو کوئی دُور کرنے والا نہیں اور اگر نعمت عطا کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)

حضرت خلیل بارے کہا کہ اپنی قوم سے کہا:

(یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ) إلی قوله : (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ)[الأنعام : ۷۸۔۸۲] (اے میری قوم جن چیزوں کو تم (اللہ کا) شریک بناتے ہو میں اُن سے بیزار ہوں۔۔۔ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا اُن کیلئے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں) صحیحین میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل تو صحابہ کو بڑی پریشانی ہوئی، کہنے لگے ہم میں سے کون ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا اس سے مراد شرک ہے، کیا تم نے ایک عبدِ صالح کا یہ قول نہیں سنا:

(اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ) [لقمان : ۱۳] (بے شک شرک بڑا ظلم ہے) حضرت خلیل مخلص حنفاء کے امام ہیں، ان کی جب بعثت ہوئی تھی تو تمام زمین شرک سے بھری ہوئی تھی، فرمایا:

(وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ)[البقرة : ۱۲۴] (اور جب اللہ نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورا اترے تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ انہوں نے کہا میری اولاد میں سے بھی، فرمایا ہمارا عہد ظالموں کے لئے نہیں ہوا کرتا) تو بیان کیا کہ ان کا عہدِ امامت ظالم کو متناول نہیں تو اللہ کا امر یہ نہیں ہے کہ ظالم امام بنے اور سب سے بڑا ظالم مشرک ہے، فرمایا:

(اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ) [النحل : ۱۲۰] (بے شک ابراہیم امام، اللہ کے فرمانبردار تھے جو یکسو تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے) امۃ وہ معلمِ خیر جس کا اہتمام کیا جائے، جیسے قدوہ وہ ہوتا ہے جسے قائد مانا جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھ دی، آپ کے بعد تمام انبیاء آپ کی ملت کے ساتھ ہی مبعوث کئے گئے، فرمایا:

(ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ) [النحل : ۱۲۳] (پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو یکسو ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے) اور کہا:

(اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ)[آل عمران : ۶۸] (ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جو اُن کی پیروی کرتے ہیں اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے) اور کہا:

(مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)[آل عمران : ۶۷] (ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ) کے ہو رہے تھے اور اُسی کے فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے)

(وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَمَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ)[البقرة : ۱۳۵۔۱۳۶] (اور کہا کہ یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو ہدایت یافتہ بنو گے، ان سے کہہ دو بلکہ دینِ ابراہیم جو ایک اللہ ہی کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اُتری اس پر اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے ملیں اُن پر ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں) صحیح میں ہے نبی اکرم نے فرمایا ابراہیم خیر البریۃ ہیں، پس وہ نبی اکرم کے بعد افضل الانبیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں، صحیح میں متعدد اسانید کے ساتھ ثابت ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ نے

مجھے بھی اپنا خلیل بنایا ہے جیسے حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا اور فرمایا اگر میں نے اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو ابو بکر کو بنالیتا لیکن تمہارا صاحب (یعنی نبی اکرم) اللہ کے خلیل ہیں اور فرمایا مسجد میں کسی کی کھڑکی نہ رہے مگر بند کردی جائے ماسوائے ابو بکر کی کھڑکی کے، اور فرمایا سابقہ امتیں قبور کو مساجد بنالیتی رہیں تم ایسا نہ کرنا، میں تمہیں اس سے روکتا ہوں، یہ سب روایات صحیح میں ہیں، یہ بھی مذکور ہے کہ یہ بات آپ نے اپنی وفات سے چند ایام قبل کہی اور **یہ آپ کی رسالت کے آخری پیغامات میں سے ہے**

تو اس میں آپ کی اللہ کے لیے خلیلیت کی تمامیت کی تحقیق ہے جس کی اصل اللہ تعالی کی بندے اور بندے کی اللہ تعالی سے محبت ہے، جہمیہ کے موقف کے برخلاف اور اس میں رافضیوں کا رد بھی ہے جو حضرت صدیق اکبر کی تنقیصِ شان کرتے ہیں، یہ رافضی قبلہ کی طرف انتساب کرنے والوں میں سے سب سے بڑھ کر اشراک کرتے ہیں، خلت کمالِ محبت ہے جو بندے سے اللہ کے لیے کمالِ عبودیت کو مستلزم ہے اسی طرح رب تعالی سے اپنے ان بندوں کے لیے کمالِ ربوبیت کی جو اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ ان سے کرتا ہے، عبودیت کا لفظ کمالِ ذل اور کمال حب کو متضمن ہے، قلبِ متیّم کی ترکیب تب مستعمل ہوتی ہے جب محبّ اپنے محبوب سے اس حد تک محبت کرے کہ اس کا متعبد بن جائے، تیم اللہ یعنی عبداللہ (اللہ کا بندہ) اس کا حضرت ابراہیم اور ہمارے نبی اکرم کے لیے بدرجہ اتم حصول ہوا اسی لیے اہلِ زمین میں سے کوئی آپ کا خلیل نہ ہوا کیونکہ خلت شرکت کی متحمل نہیں ہوتی جیسے کسی نے کہا:

قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّيْ وَلِذَا سُمِّيَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلاً

(تم روح کی مانند مجھ میں رچ بس گئے ہو اسی لئے تو خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے) بخلاف اصلِ حب کے، ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے حسن اور اسامہ کے بارہ میں فرمایا اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر اور ان سے بھی جو ان سے محبت کریں، عمرو بن عاص نے آپ سے پوچھا لوگوں میں سب سے زیادہ آپ کس سے محبت کرتے ہیں؟ فرمایا عائشہ سے، کہا مردوں میں سے، فرمایا اس کے والد سے، حضرت علی بارے فرمایا تھا (غزوہ خیبر کے موقع پر) کل میں علم اس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے کرتے ہیں، اس کی امثال کثیر ہیں، اللہ نے خبر دی ہے کہ وہ متقین، محسنین، مقسطین، توابین، متطہرین اور صفیں باندھے گویا کہ بنیانِ مرصوص ہیں اللہ کی راہ میں قتال کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، ایک آیت میں کہا:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ [المائدۃ : ۵۴] (تو اللہ ایسے لوگ لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں) اور کہا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (گزری) جہاں تک خلت تو یہ خاص ہے اور بعض حضرات کا قول کہ محمد حبیب اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ ہیں، ان کا ظن ہے کہ محبت خلت سے فائق ہوتی ہے تو یہ ضعیف قول ہے ہمارے نبی بھی خلیل اللہ ہیں جیسا کہ مشہور صحیح روایات میں یہ ثابت ہے اور جو مروی ہے کہ عباس حبیب اور خلیل کے درمیان محشور ہوں گے اور اس کی

امثال روایات تو یہ موضوعات ہیں قابلِ اعتماد نہیں، پہلے ذکر ہوا کہ اللہ سے محبت سے ہے کہ ہر اس شیٔ سے بھی محبت کی جائے جو اللہ کو پسند اور محبوب ہے جیسے صحیحین کی روایت ذکر کی کہ جس میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت ۔۔۔الخ اس لیے کہ کسی شیٔ کی حلاوت کا وجد اس سے محبت کا تابع ہے تو جسے کسی شیٔ سے محبت ہوئی یا اسے چاہا جب اس کے لیے اس کی مراد حاصل ہوئی تو وہ اس سے حلاوت، لذت اور سرور پائے گا، لذت ایسا امر ہے جو ملائم (یعنی سازگار) جو کہ محبوب یا مشتہیٰ ہے، کے ادراک کے فوری بعد حاصل ہوتا ہے، جو حضرات قائل ہیں کہ لذت سے مراد ملائم کا ادراک ہے جیسا کہ بعض اہلِ تفلسف اور اطباء نے یہ کہا، انہوں نے اس میں واضح غلطی کی ہے کہ ادراک تو محبت اور لذت کے درمیان کی چیز ہے، انسان مثلا طعام کی اشتہاء رکھتا ہے تو جب اسے کھالے تو اس کے فوری بعد اس کے لیے لذت کا حصول ہوگا تو لذت شیٔ کی طرف نظر کے تابع ہے، جب نظر پڑتی ہے ملتذ ہوتا ہے، لذت تابعِ نظر ہے نفسِ نظر نہیں اور نہ یہ شیٔ کی رؤیت ہے بلکہ اس کی رؤیت کے بعد حاصل ہوتی ہے، فرمایا:

(وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ) [الزخرف : ۷۱] (اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے) اور اسی طرح ہی وہ سب لذات اور آلام جو نفس کے لیے حاصل ہوتی ہیں اور فرحت اور حزن وغیرہ سے محبوب یا مکروہ امر کی نسبت شعور سے حاصل، نفسِ شعور فرحت یا حزن نہیں تو ایمان کی حلاوت جو اس کے ساتھ حاصل ہونے والی لذت اور فرحت کو متضمن ہے جو ایمان کی حلاوت کا واجد مومن پاتا ہے وہ بندے کی اللہ سے کمال محبت کے تابع (اور اس کا ثمرہ) ہے اور یہ تین امور کے ساتھ ساتھ ہے: اس محبت کی تکمیل، اس کی تفریع اور اس کی ضد اور منافی کا دور ہونا

اس کی تکمیل یہ ہے کہ اللہ ورسول اسے اپنے ہر ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں تو اللہ ورسول کی محبت کے ضمن میں اصلِ حب کے ساتھ اکتفاء نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ اللہ ورسول تمام کائنات سے بڑھ کر اسے محبوب ہوں، اس کی تفریع یہ ہے کہ کسی آدمی سے اگر محبت ہے تو یہ اللہ کی خاطر ہے، دفعِ ضد یہ ہے کہ ضدِ ایمان کو مکروہ جانے تو جب رسول اور اہلِ ایمان سے محبت اللہ کی محبت سے ہے اور رسول اکرم مومنین سے محبت کرتے تھے جنہیں اللہ محبوب رکھتا تھا اس لیے کہ آپ اللہ سے محبت میں اکمل الناس تھے اور سب سے احق تھے کہ اللہ کو محبوب امور واشیاء سے محبت کریں اور اسے مبغوضات سے بغض کریں اور خلت میں تو کسی غیر اللہ کا حظ ونصیب ہی نہیں بلکہ آپ نے کہا اگر میں نے اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو ابوبکر کو بناتا، تو اس سے مطلق محبت پر خلت کے مرتبہ کی فوقیت معلوم ہوئی! مقصود یہ ہے کہ اللہ کے لیے خلت اور محبت اس کی عبودیت کی تحقیق ہے اس میں غلطی اس توھم سے ہوتی ہے کہ عبودیت مجرد ذل اور خضوع ہے نہ کہ اس کے ساتھ محبت بھی ہو، یا کہ محبت میں انبساط یا اِدلال ہے (یعنی محبت پر بھروسہ کرتے ہوئے کچھ ناز ونخرہ دکھلانا) جس کی ربوبیت متحمل نہیں اسی لیے ذوالنون بارے منقول ہے کہ ان کے پاس مسئلہِ محبت میں بحث وتمحیص ہوئی تو کہنے لگے اس موضوع پر خاموش رہو کہ مبادا کچھ نفوس سن لیں تو اس کا ادعاء کرنے لگیں

بعض اہلِ معرفت وعلم نے ان لوگوں کی مجالست کو مکروہ قرار دیا ہے جو بلاخشیت محبت بارے بکثرت کلام کریں، بعض سلف نے کہا جس نے اللہ کی صرف حب کے ساتھ عبادت کی وہ زندیق ہے اور جس نے صرف رجاء کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ مرجئ ہے اور جس نے صرف خوف کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ خارجی ہے اور جس نے حب، خوف اور رجاء تینوں کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ موحد مومن ہے، اسی لیے متاخرین میں ایسے حضرات موجود ہوئے جنھوں نے دعوائے محبت میں انبساط کا مظاہرہ کیا حتی کہ اس نے انہیں ایک نوع کی رعونت کا شکار بنا دیا اور اس دعوی کا جو عبودیت کے منافی ہے اور یہ بندے کو ایک نوع کی ربوبیت میں داخل کر دیتا ہے جو اللہ کے سوا کسی کے لیے مناسب نہیں اور وہ ایسے کئی دعاوی کرنے لگے جو انبیاء ومرسلین کی حد سے بھی متجاوز ہوتے ہیں یا یہ اللہ سے اس کی طلب کرتے ہیں جو ہر وجہ سے مناسب نہیں مگر اللہ ہی کے لیے حتی کہ انبیاء ومرسلین کے لیے بھی مناسب اور موزوں نہیں، اس میں کثیر شیوخ جا واقع ہوئے اور اس کا سبب اس عبودیت کی تحقیق کا ضعف ہے جنہیں رسل نے بیان کیا اور ان کے لائے ہوئے امر ونہی نے اسے محرر کیا بلکہ اس عقل کا ضعف جس کی رو سے انسان اپنی قدر وحقیقت پہچانتا ہے اور جب عقل کم ہو اور دین کا علم زیادہ نہ ہو اور نفس میں محبت ہو تو نفس اپنی حماقت کی وجہ سے اس میں منبسط ہو جاتا ہے جیسے کسی انسان سے محبت کرنے والا آدمی اپنی حماقت وجہل کے ساتھ منبسط ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میں محبّ ہوں لہذا جو کچھ بھی کروں میرا مواخذہ نہ کیا جائے (جیسے کہا جاتا ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے) تو یہ عین ضلال اور بڑی گمراہی ہے اور یہ یہود ونصاری کے قول سے مشابہ ہے جنھوں نے کہا تھا:

﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدة: ۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) اللہ نے جواباً کہا:

﴿قُلۡ فَلِمَ یُعَذِّبُكُمۡ بِذُنُوۡبِكُمۡ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ (کہو کہ پھر وہ تمہاری بداعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے؟ بلکہ تم اُس کی مخلوقات میں سے انسان ہو وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے) تو ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کی تعذیب مقتضی ہے کہ وہ اللہ کو غیر محبوب ہیں اور نبوت کی نسبت کے ساتھ اس کی طرف منسوب نہیں بلکہ یہ مقتضی ہے کہ وہ مربوب ومخلوق ہیں تو جو اللہ کے ہاں محبوب ہے اس کا استعمال اللہ کی محبوبات میں ہوگا، وہ ایسے کام نہ کرے گا جو حق کو مبغوض ہیں اور وہ اس پر ناراض ہوتا ہے جو کبائر کا ارتکاب کرے اور اس پر قائم اور مصر رہے اور توبہ نہ کرے تو اللہ اس پر ناراض ہے اور ایسا شخص اللہ کے ہاں مبغوض ہے اور اللہ کی انسان سے محبت اس کے ایمان وتقوی اور صالحیت کے بحسب ہے! جو ظن کرے کہ گناہوں کا اسے کوئی نقصان نہیں کیونکہ وہ اللہ کا محبوب ہے وہ اس شخص کے بمنزلہ ہے جو زعم کرے کہ زہر کھانے سے اسے کچھ نہ ہوگا

اگر ایسا احمق انبیاء کے واقعات میں تدبر کرے جو اللہ نے قرآن میں بیان کئے ہیں اور جو ان سے توبہ واستغفار کا وقوع

ہو اور جس طرح کی آزمائشیں انہیں پہنچتی رہیں، دراصل ان میں سے ان کے لیے تمحیص اور ان کے حسبِ احوال تطہیر تھی تو اسے گناہوں کے اپنے کرنے والوں کے لئے بعض ضرر کا علم ہوگا اگرچہ کتنے ہی ارفع مقام کے حامل ہوں، اگر مخلوق سے محبت کرنے والا ان کی مصلحت سے واقف نہ ہو اور نہ اس کا مرید (یعنی ارادہ کرنے والا) ہو بلکہ حُب کے مقتضا کے بموجب فعل کرے اگرچہ یہ جہل اور ظلم ہو، تو یہ اس کے محبوب کے اس سے بغض اور نفرت کا سبب بنے گا بلکہ اس سے بڑھ کر اس کی عقوبت اور گوشمالی کرنے کا، **کثیر سالکین اللہ سے محبت کے دعوی میں کئی انواع کے جہل بالدین کے مرتکب ہوجاتے ہیں**، یا تو اللہ کی حدود سے تجاوز یا حقوق اللہ کی تضییع یا ایسے باطل دعوے جن کی کوئی حقیقت نہیں جیسے ان کے بعض کا قول کہ میرے مرید نے اگر کسی کو آگ (یعنی جہنم) میں چھوڑا تو میں اس سے بری ہوں، ایک اور نے کہا میرے کسی مرید نے اگر مومنین میں سے کسی کو آگ میں داخل کر دیا تو میں اس سے بری ہوں تو اول نے اپنے مرید کو کیا کہ وہ سب اہلِ نار کو وہاں سے نکال لے جبکہ ثانی نے اپنے مرید کو کیا کہ وہ اہلِ کبائر کے آگ میں داخل ہونے سے مانع بنے، بعض نے کہا جب قیامت کا دن ہوگا تو میں اپنا خیمہ جہنم کے کنارے لگا لوں گا تا کہ کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے اور دیگر اس قسم کے اقوال جو بعض مشہور مشائخ سے نقل کئے جاتے ہیں! یہ یا تو ان کی طرف غلط طور سے منسوب کئے گئے ہیں یا یہ ان کی غلطی ہے، اس طرح کے اقوال کبھی سکر وغلبہ اور فناء کی حالت میں صادر ہوجاتے ہیں جس میں انسان سے تمییز وشعور ساقط ہوجاتا ہے یا کمزور ہوجاتا ہے حتی کہ کچھ پتہ نہیں چلتا منہ سے کیا نکل رہا ہے، سکر ایک لذت وسرشاری کا عالم ہے لیکن اس میں تمییز وشعور کھو جاتا ہے اسی لئے ان میں سے بعض جب حالتِ صحو میں واپس آئے اور انہیں بتلایا گیا کہ کیا کچھ کہہ رہے تھے تو استغفار کیا، شیوخ میں سے جنہوں نے حب، شوق، لوم، عذل اور غرام کے معانی کو متضمن قصائد واشعار کے سماع میں توسع سے کام لیا ہے یہ ان کا اصل مقصد تھا، اسی لیے اللہ نے محبت کے لیے آزمائش نازل کر رکھی ہے اور محبّ اس کے ساتھ آزمایا جاتا ہے، فرمایا:

(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) [آل عمران : ۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا) تو بندہ اللہ کا محبّ نہ بنے گا مگر جب اس کے رسول کی اتباع کرے اور رسول کی متابعت اور اطاعت عبودیت کی تحقیق ہے، کثیر مدعیانِ محبت رسول کی شریعت اور سنت سے خارج ہوجاتے ہیں اور ایسے ایسے خیالات کا اظہار و ادعاء کرتے ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں حتی کہ ان میں سے کئی اپنے لیے امر کے سقوط اور حرام کے حلال ہونے کا ادعاء کر بیٹھتے ہیں اور دیگر کئی افعال جو شرع کے برخلاف ہیں بلکہ اللہ نے اپنی اور اپنے رسول کی محبت کو اپنی راہ میں کبھی جہاد قرار دیا ہے اور جہاد اللہ کے اوامر سے کمال محبت اور اس کی منہیات سے کمال بغض کو متضمن ہے اسی لیے اپنے محبین ومحبوبین کی صفت میں کہا:

(اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ) [المائدة : ۵۴] (جو مومنوں کے حق میں نرم ہوں گے اور کافروں پر سخت، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت

سے نہ ڈریں گے) اسی لیے اس امت کی اللہ سے محبت سابقہ امم کی محبت سے اکمل ہے اور اللہ کے لیے ان کی عبودیت سابقہ امم کی عبودیت سے اکمل ہے اور اس ضمن میں اس امت کی کامل ترین ذات حضرت محمد کی ذاتِ اقدس ہے اور جو جتنا آپ سے اشبہ ہوگا اتنا ہی اس ذیل میں کامل ہوگا، خالی دعوائے محبت کافی نہیں (بلکہ آپ کی سیرت اور صورت کو اپنانا ہوگا) بعض شیوخ کی کلام میں ہے: محبت ایک آگ ہے جو دل میں ماسوائے مرادِ محبوب کے سب کچھ جلا ڈالتی ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ ساری کائنات کا وجود اللہ کی مراد ہے تو ظن کیا کہ محبت کا کمال یہ ہے کہ بندہ دنیا کی ہر شیٔ سے محبت کرے حتی کہ کفر وفسوق اور عصیان سے بھی جبکہ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہر موجود سے محبت کرے بلکہ محبت صرف اسی سے ہوتی ہے جو محبّ کے ملائم اور اس کے لیے نافع ہو اور جو اس کے منافی اور اس کے لیے ضار ہو اسے وہ مبغوض سمجھتا ہے۔ البتہ اس گمراہی سے انہوں نے اپنی اہواء کی اتباع مستفاد کی ہے تو (نفسانی شہوت کے تحت) جس صورت وریاست اور جاہ وحشمت اور امل اور گمراہ کن بدعات وغیرہ سے بھی محبت کریں، زعم کرتے ہیں کہ یہ اللہ سے ان کی محبت کا مظہر اور اس کا حصہ ہے حالانکہ اللہ کی محبت سے یہ ہے کہ انسان اللہ ورسول کو مبغوض اشیاء وامور سے بغض رکھے اور اپنے نفس ومال کے ساتھ اس کی راہ میں جہاد کرے

ان کی اصلِ ضلال یہ ہے کہ جس قائل نے کہا: محبت ایک آگ ہے جو دل ۔۔۔ الخ اس نے اللہ تعالی کی مراد سے اس کا دینی اور شرعی ارادہ مقصود لیا جو کہ اس کی محبت اور رضا کے معنی میں ہے تو گویا اس نے کہا: اس نے دل سے ماسوائے اس کے جو اللہ کو محبوب ہے سب کو خاکستر کردیا اور یہ معنی صحیح ہے کیونکہ محبت کی تمامیت سے ہے کہ محبت نہ کرے مگر اس سے جو اللہ کو محبوب ہے تو اگر کسی محبوب ومرغوب مال سے محبت کرے گا تو اس کی محبت ناقص ہوگی اور جو اس کی قضاء وقدر (کے فیصلے) ہیں تو ان میں سے ایسے ہیں جو اللہ تعالی کو مبغوض ہیں اور وہ ان پر ناراض ہوتا ہے اور ان سے منع کرتا ہے تو اگر میں اس کے بغض، کراہت اور سخط میں اس کی موافقت نہ کروں تو میں اس کا محبّ نہیں ہوں بلکہ اس کا محبّ ہوں جو اسے مبغوض ہے تو شریعت کی اتباع اور قیامِ جہاد اللہ کی محبت کے اہل اور اس کے اولیاء جو اس کے محبّ اور محبوب ہیں، کے درمیان اور ان کے درمیان جو اللہ کی محبت کے مدعی ہیں اس کی عمومی ربوبیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اعظم فروق میں سے ہے یا ایسے جو شریعت کی مخالف بعض بدعات کو پسند کرتے ہیں تو اللہ سے اس قسم کی محبت کا دعوی یہود ونصاری کے اللہ سے محبت کے دعوی کی جنس سے ہے بلکہ کبھی ان کا دعوائے محبت ان کے دعوائے محبت سے بھی بدتر قرار دیا جانا ممکن ہے اس نفاق کی رو سے جو ان میں ہے جس کی وجہ سے یہ دوزخ کے درکِ اسفل میں ہوں گے جیسا کہ یہود ونصاری کا دعوائے محبت ان کے اس دعوی سے بدتر قرار دیا جاسکتا ہے اس جہت سے کہ ان کا کفر ان کے کفر سے اشد ہے، توراۃ اور انجیل میں اللہ کی محبت سے بعض وہ کچھ ہے جس پر یہ سب متفق ہیں حتی کہ یہ ان کے ہاں ناموس کی اعظم وصایا میں سے ہے چنانچہ انجیل میں ہے کہ مسیح نے کہا: مسیح کی اعظم وصیت یہ ہے کہ اپنے پورے دل، دماغ اور نفس کے ساتھ اللہ سے محبت

کرو، نصاریٰ اس محبت کے قیام کے مدعی ہیں اور ان میں جو زہد وعبادت (یعنی رہبانیت) ہے وہ اسی سے ہے اور وہ اللہ کی محبت سے بری ہیں کیونکہ جو امور اسے محبوب ہیں ان کی اتباع نہ کی بلکہ ایسی روش کے سالک بنے جو اللہ کی ناراضی اور غضب کا باعث بنا اور اس کی رضوان کو ناپسند کیا تو اللہ نے ان کے (صالح) اعمال کا حبوط کر ڈالا:

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ) [محمد : ۹] (یہ اس لئے کہ اللہ نے جو نازل کیا انہوں نے اسے ناپسند کیا تو اللہ نے بھی ان کے اعمال اکارت کر دئے) اللہ کافروں کو مبغوض رکھتا اور انہیں ملعون قرار دیتا ہے، وہ سبحانہ اسے محبوب بناتا ہے جو اس کا محبّ بنے، یہ ممکن ہی نہیں کہ بندہ اللہ کا (صحیح معنی میں) محبّ ہو اور وہ اسے محبوب نہ جانے بلکہ بندے کی اپنے رب سے محبت کے بقدر ہی اللہ کی اس سے محبت ہوتی ہے اگرچہ اللہ کی اپنے بندے کے لیے جزا اعظم ہے، جیسے ایک صحیح حدیثِ قدسی میں ہے کہ جو بالشت بھر میرے قریب ہوا میں بازو بھر اس سے قریب ہو جاتا ہوں اور جو بازو بھر میرے قریب آیا میں باع بھر (یعنی دو بازوؤں کے پھیلاؤ کے بقدر) اس سے قریب ہو جاتا ہوں اور جو چلتا ہوا میری طرف آتا ہے میں دوڑتا ہوا اس کی طرف آتا ہوں، اللہ نے خبر دی ہے کہ اسے متقین، محسنین، صابرین، توابین اور متطہرین محبوب ہیں بلکہ وہ اپنے واجب اور مستحب اوامر کے فاعل کو محبوب بنا لیتا ہے جیسے ایک صحیح حدیثِ قدسی میں ہے کہ بندہ مسلسل نوافل کی ادائیگی کے ذریعہ میرے تقرب کا خواہاں رہتا ہے حتی کہ (آخرکار) میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں، جب یہ مرحلہ آجائے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ۔۔۔۔۔ الخ

کثیر خطا کے مرتکب حضرات جنہوں نے زہد اور عبادت میں بعض شیوخ کی اتباع کی وہ کئی ان امور میں جا واقع ہوئے جن میں نصاریٰ واقع ہوئے تھے مثلاً اللہ کے محبّ ہونے کا دعویٰ اس کی شریعت کی مخالفت کرنے اور اس کی راہ میں مجاہدہ ترک کرنے وغیرہ کے باوجود، یہ دین میں اسی کے نحو کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے تقرب الی اللہ کی سعی کرتے ہیں جس کے ساتھ نصاریٰ نے تمسک کیا تھا مثلاً متشابہ کلام (یعنی رمزیہ کلام) اور ایسی حکایات وواقعات جن کے قائل کا صدق معلوم نہیں، اگر بالفرض قائل صادق بھی ہے مگر وہ معصوم تو نہیں تو انہوں نے اپنے متبوعین (یعنی پیروں اور مشائخ) کو دین کے شارع کی حیثیت دے دی جیسے نصاریٰ نے اپنے قسیسین اور راہبوں کو یہی حیثیت دے رکھی تھی (ان کے حلال کردہ کو حلال اور ان کے حرام کردہ کو حرام مانتے تھے، جیسے قرآن نے ذکر کیا) پھر یہ لوگ انتقاصِ عبودیت کرتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ عبادت کرنا خواص کا کام ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح بارے دعویٰ کیا، یہ ان خواص کے لیے اللہ میں اسی جنس کی مشارکت کا اثبات کرتے ہیں جس کا نصاریٰ نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ بارے اثبات کیا اور کئی اور انواع بھی جن کے ذکر سے بات طویل ہو جائے گی

دینِ حق دراصل اللہ کے لیے ہر وجہ کے ساتھ عبودیت کی تحقیق ہے اور یہ ہر درجہ کے ساتھ اللہ کی محبت کی تحقیق،

عبودیت کی تکمیل کے بقدر ہی بندے کی اپنے رب کے لیے محبت کامل ہوتی ہے اور اگر دل میں غیر اللہ کی محبت ہوگی اور اس کے نقص کے بقدر اس کا نقص ہوگا تو اسی کے بحسب اس میں غیر اللہ کی عبودیت ہوگی، ہر محبت جو اللہ کے لیے نہیں وہ باطل ہے اور ہر عمل جس کے ساتھ اللہ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا وہ باطل ہے، دنیا ملعون ہے اور ملعون ہے جو کچھ اس میں ہے مگر جو اللہ کے لیے ہو (یہ ایک حدیث کا مفہوم ہے) اور اللہ کے لیے وہی کچھ ہوگا جو اسے اور اس کے رسول کو محبوب ہے اور یہی مشروع ہے، ہر عمل جس کے ساتھ غیر اللہ کا ارادہ کیا گیا وہ اللہ کے لیے نہیں، اسی طرح ہر عمل جو اللہ کی شرع کے موافق نہیں وہ اللہ کے لیے نہیں، اللہ کے لیے وہی عمل ہوگا جو ان دونوں اوصاف کا جامع ہو: ایک کہ اللہ کے لیے ہو اور دوم کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے موافق ہو، یہ واجب اور مستحب ہے جیسے کہا:

(فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْلِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا) [الکهف: ۱۱۰] (کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے) عملِ صالح کے بغیر چارہ نہیں اور یہ واجب بھی ہوتا ہے اور مستحب بھی ہے اور لازم ہے کہ یہ اللہ کی رضا کے لیے خالص (نیت کے ساتھ) ہو جیسے کہا:

(بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ)[البقرة: ۱۱۲] (کیوں نہیں! جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) نبی اکرم نے فرمایا جس نے کوئی وہ عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے (یعنی نا قابلِ قبول) فرمایا اعمال کا دارومدار نیات پر ہے اور ہر ایک کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی، تو جس کی ہجرت اللہ ورسول کی طرف ہے (یعنی اس نیت کے ساتھ) اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت اس غرض کے لیے ہے کہ دنیا مل جائے یا کسی خاتون سے شادی کرنے کے لیے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی طرف اس نے کی ہے، یہ دین کی اصل ہے اور اس کی تحقیق کے بحسب ہی دین کی تحقیق ہوگی، اسی کے ساتھ اللہ نے رسل بھیجے، کتب نازل کیں اورا سی کی رسل نے دعوت دی اور اسی پر جہاد کیا اور اسی کا امر و ترغیب دی، یہ دین کا وہ قطب ہے جس پر اس کی چکی گھومتی ہے

شرک نفوس پر غالب ہے اور یہ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس امت میں شرک چیونٹی کے چلنے سے بھی اخفٰی ہے، ایک حدیث میں ہے حضرت ابوبکر نے عرض کی یارسول اللہ ہم **کیسے اس سے نجات پا سکتے ہیں؟** جبکہ وہ چیونٹی کے چلنے سے بھی اخفٰی ہے؟ فرمایا میں تمہیں ایسے کلمات سکھلاتا ہوں اگر وہ کہو تو ہر قسم کے دقیق اور جلیل شرک سے بچتے رہو گے، کہو:

(اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ) (یا اللہ میں میں تیرے ساتھ پناہ

مانگتا ہوں کہ جانتے بوجھتے شرک کروں اور اگر لاعلمی میں ایسی ویسی بات ہو جائے تو استغفار کرتا ہوں) حضرت عمر اپنی دعا میں کہا کرتے تھے :(اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ كُلَّهٗ صَالِحاً وَاجْعَلْهُ لِوَجْهِكَ خَالِصاً وَلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِیْهِ شَیْئاً) (اے اللہ میرا سارا عمل صالح بنا اور خالص اپنی رضا کے لئے بنا، کسی اور کے لئے اس میں کوئی حصہ نہ بنا) کثیر اوقات نفوس میں ایسی خفی شہوات مخالط ہو جاتی ہیں جو اللہ کے لیے ان کی محبت، عبودیت اور اخلاصِ دین کو فاسد کر ڈالتی ہیں جیسے شداد بن اوس نے کہا تھا اے بقایا عرب ! میں تمہاری نسبت سب سے زیادہ ریا کاری اور خفی شہوت کا اندیشہ محسوس کرتا ہوں، ابو داود سجستانی سے کہا گیا خفی شہوت کیا ہے ؟ کہا جاہ وحشمت اور اقتدار کی حب، کعب بن مالک راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا جتنا آدمی کی مال پر حرص اور شرف کا گھمنڈ اس کے دین کو خراب کرتے ہیں اتنی خرابی وہ دو بھیڑیے بھی نہیں کرتے جنہیں بلا روک ٹوک ریوڑ پر جھپٹنے کا موقع ملا ہو، بقول ترمذی یہ حسن وصحیح حدیث ہے اور یہ بین اور واضح ہے تو سلیم الدین میں یہ حرص نہیں ہوتی، دل نے جب اللہ کے لیے عبودیت اور اس کی محبت کا ذائقہ چکھ لیا اور حلاوت پالی تو اس سے بڑھ کر کوئی شئ اسے محبوب اور عزیز نہ ہوگی اسی کی بدولت اللہ تعالی اہلِ اخلاص سے سوء اور فحشاء کو پھیر لیتا ہے جیسے کہا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ)[یوسف : ۲۴](یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہیں) اللہ کے لیے مخلص اس کے لیے عبودیت کا ایسا ذائقہ چکھ لیتا ہے جو اس کے غیر کی عبودیت سے اس کے لیے مانع ہوتا ہے ! تب دل کے نزدیک ایمان کی حلاوت سے بڑھ کوئی شئ الذ، احلیٰ، الین، انعم اور اطیب نہیں ہوتی وہ حلاوتِ ایمان جو اللہ کیلئے اس کی عبودیت، محبت اور اس کے اخلاص دین کو متضمن ہے اور یہ دل کے اللہ کی طرف انجذاب کی مقتضی ہے تو دل میں اللہ کی طرف انابت، خوف اور رغبت ورہبت کے جذبات پیدا ہوں گے جیسے کہا:

(مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِ) [ق : ۳۳] (جو اللہ سے بن دیکھے ڈرا اور رجوع کرنے والا دل لے کر آیا) کیونکہ محبّ کو اپنے مطلوب کے زوال کا خوف اور اپنے مطلوب کے حصول کی امید ہوتی ہے تو اللہ کے بندوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ امید اور خوف کے درمیان رہتے ہیں، فرمایا:

(اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا) [الإسراء : ۵۷] (یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں ہو خود اپنے رب کے ہاں ذریعہ تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کون اُن میں زیادہ مقرب ہے اور اُس کی رحمت کے اُمید وار رہتے ہیں اور اُس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں بیشک تمہارے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے) اور جب بندہ اللہ کے لیے مخلص ہو تو رب اسے اپنے خواص میں شامل کر لیتا ہے تو اس کے دل کو زندہ رکھتا اور اسے اپنی طرف جذب کرتا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان جذبات کے مضاد اور منافی سوء اور فحشاء کو اس سے پھیر لیتا ہے

بخلاف اس دل کے جو اللہ کے لیے مخلص نہ ہوا تو وہ طلب، ارادہ اور حبِ مطلق میں رہتا ہے تو ہر اپنے لیے سائغ (یعنی مناسب اور سازگار) شیٔ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور اپنے نفس کی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے جیسے نازک ٹہنی ہو کہ جس طرف کی ہوا چلے اسی طرف وہ جھک جاتی ہے، اس کی حالت ایک قیدی کی سی ہوتی ہے جو داروغہِ جیل کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہتا ہے، خواہشات کی غلامی میں کبھی کسی کی نا جائز تعریف کرنا پڑتی ہے، کبھی کسی کی طرف سے توہین آمیز رویہ سہنا پڑتا ہے اور کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی کئی کام کرنا پڑتے ہیں، ایسا آدمی حق بات سننے کا روادار نہیں ہوتا اور درہم و دینار کا بندہ بن جاتا ہے، ایک الہ کا در چھوڑا تو بے شمار چوکھٹوں پر جانا پڑا، جو اللہ کے لیے خالص بندہ بنا اس کا دل اپنے رب کے لیے معبّد بنے گا اس طور کہ اللہ اسے تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہو اور وہ اس کے لیے ذلیل وخاضع بنے گا، بصورتِ دیگر اسے تمام کائنات کا بندہ اور غلام بننا پڑے گا اور شیاطین کا اس کے دل پر تسلط ہوگا اور گمراہی اس کی جلیس ہوگی اور سوء وفحشاء کی مختلف انواع میں گرفتار ہوگا، یہ امر ضروری ہے جس میں کوئی حیلہ کا رگر نہیں، دل اگر حنیف، اللہ پر متوجہ اور اس کے ماسوا سے معرض نہیں تو پھر مشرک ہے، فرمایا:

(فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا)[الروم : ۳۰](تو تم ایک طرف کے ہوکر دین پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ) إلی قوله : (كُلُّ حِزۡبٍ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ) [۳۲] (سب فرقے اُسی سے خوش ہیں جو اُن کے پاس ہے) فرعون اور اس کی قوم بارے کہا:

(وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ لَا يُنۡصَرُوۡنَ وَاَتۡبَعۡنٰهُمۡ فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ هُمۡ مِّنَ الۡمَقۡبُوۡحِيۡنَ) [القصص : ۴۱۔ ۴۲] (اور ہم نے ان کو ایسا پیشوا بنایا جو دوزخ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن اُن کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اور اس دنیا میں ہم نے اُن کے پیچھے لعنت لگا دی اور وہ قیامت کے روز بھی بدحالوں میں ہوں گے) اسی لیے اتباعِ فرعون اولاً اس مقام پر آئے کہ اللہ کے محبوبات ومرضیات اور اس کی قضاء وقدر کے مابین تمیز اور پرکھ سے عاری ہوئے بلکہ ان کے مدِ نظر شامل وعمومی مشیتِ مطلقہ ہے پھر آخر الامر میں یہ ہوا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان تمیز ہی کھو دی اور سب کو ایک ہی وجود قرار دے ڈالا، ان کے محققین اس بات کے قائل ہوئے کہ شریعت میں طاعت بھی ہے اور معصیت بھی اور اس میں حقیقت بلا طاعت معصیت ہے اور تحقیق میں نہ طاعت ہے اور نہ معصیت، یہ فرعون اور اس کی قوم کے مذہب کی تحقیق ہے جنہوں نے خالق کا انکار کیا اور اللہ کی اپنے بندے موسیٰ سے تکلیم کا بھی اور اس امر ونہی کا بھی جس کے ساتھ وہ مبعوث ہوئے! جہاں تک حنفاء وانبیاء ابراہیم اور آلِ ابراہیم، تو وہ جانتے ہیں کہ خالق اور مخلوق اور اطاعت اور معصیت کے درمیان فرق کرنا ضروری ہے اور بندہ جوں جوں تحقیق میں مزداد ہو اللہ کے لیے اس کی محبت اور اطاعت اور اس کے غیر کی عبادت وطاعت سے اس کے اعراض میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جبکہ یہ مشرکین ضالین اللہ اور اس کی خلق کے درمیان تسویہ کرتے ہیں، حضرت ابراہیم نے کہا تھا:

(اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمُ الۡاَقۡدَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّىۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ) [الشعراء :

۷۵۔۷۷](تم نے دیکھا کہ جن کوتم پوجتے رہے ہو؟۔تم بھی اورتمہارے اگلے باپ دادا بھی۔وہ میرے دشمن ہیں لیکن اللہ رب العالمین)اور یہ نصاری کی روش پر چلتے ہوئے مشائخ کی کلام میں سے مبہم اور متشابہ کے ساتھ تمسک کرتے ہیں، اس کی مثال فناء کی اصطلاح! **تو فناء کی تین انواع ہیں:**

۱۔ایک،نوع انبیاء واولیاء میں سے کاملین کے لیے فناء

۲۔دوم، اولیاء وصالحین میں سے قاصدین کے لیے

۳۔سوم، ملحد اور مشبہ منافقین کے لیے

جہاں تک اول تو یہ اللہ کے ماسوا کا ارادہ کرنے سے فناء، اس طور کہ محبت نہ کرے مگر اللہ سے، عبادت نہ کرے مگر اس کی، توکل نہ کرے مگر اسی پر اور طالب نہ بنے مگر اسی کا، یہی معنی ہے جو الشیخ ابو یزید کے اس قول کا مقصود قرار دینا واجب ہے جب کہا:(أُرِيْدُ اَنْ لَا أُرِيْدَ اِلَّا مَا يُرِيْدُ) (یعنی: میں چاہتا ہوں کہ ارادہ نہ کروں مگر اسی کا جس کا وہ ارادہ کرے) یعنی اللہ کی مراد، محبوب اور مرضی اور یہ ارادۂ دینیہ کے ساتھ مراد ہے، بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اسی کا ارادہ اور اسی سے محبت کرے اور اسی پر راضی رہے جو اللہ کی مراد، محبت اور اس کی مرضی ہے اور یہ وہ تمام امور جن کا اس نے امر دیا ہے، ایجابی یا استحبابی امر، اور محبت نہ کرے مگر جس سے اللہ کو محبت ہے مثلا فرشتے، انبیاء اور صالحین، یہی قولہ:(اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰـهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) [الشعراء : ۸۹] (مگر جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آیا) کی تفسیر میں ان کے قول:(وَهُوَ سَلِيْمٌ مِمَّا سِوَى اللّٰهِ) یا (مِمَّا سِوَى عِبَادَةِ اللّٰه) کا مطلب ومفہوم ہے، یا(مِمَّا سِوَى اِرَادَةِ اللّٰه، مِمَّا سِوَى مَحَبَّةِ اللّٰه) ان سب عبارات کا لبِ لباب ایک ہے، اس معنی کو فناء کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے یہ اسلام کا اول وآخر اور دین کا ظاہر وباطن ہے، جہاں تک نوعِ ثانی تو یہ شہودِ سویٰ سے فناء ہے، یہ کثیر سالکین کے لیے حاصل ہوتا ہے، وہ اللہ کے ذکر، اس کی عبادت اور اس کی محبت کی طرف اپنے قلوب کے فرطِ انجذاب اور اس امر سے اپنے قلوب کے ضعف کے تحت کہ کسی غیرِ معبود ومقصود کے شاہد ہوں ان کے دل ودماغ میں کسی غیر اللہ کا خیال وتصور تک نہیں آتا بلکہ اس کا شعور تک نہیں ہوتا جیسے قولہ:

(وَاَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوْسٰى فَارِغًا) [القصص : ۱۰] (اور موسیٰ کی ماں کا دل خالی ہو گیا) کی تفسیر میں کہا گیا کہ:(فَارِغاً مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اِلَّا مِنْ ذِكْرِ مُوْسىٰ) (یعنی سوائے موسیٰ کے ذکر وخیال کے ہر چیز سے خالی اور فارغ) یہ حالت کسی بھی حب یا خوف کے معاملہ میں پھنسے ہوؤں کے لیے کثیر طور سے عارض ہوتی ہے، اسی طرح امید کے تحت بھی جو اس کے دل کو ہر شئ سے پھیرے رکھتی ہے اور ہر دم مطلوب ومقصود کا خیال ہی ذہن پر چھایا رہتا اور ہر طرف اسی کا عکس نظر آتا ہے اور اس میں اس قدر مستغرق ہو جاتا ہے کہ کسی اور شئ کا شعور بھی نہیں رہتا، جب اس نوع کے فناء والے پر یہ قوی ہو تو وہ اپنے موجود کے ساتھ اپنے وجود، اپنے مشہود کے ساتھ

اپنے شہود، اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر اور اپنے معروف کے ساتھ اپنی معرفت سے غائب ہوجاتا ہے حتیٰ کہ وہ سب فانی ہوجاتا ہے جولم یکن ہے اور یہ اس کے ماسوا سے معبد مخلوقات اور وہی باقی رہ جاتا ہے جولم یزل ہے اور یہ رب تعالیٰ کی ذات اور مراد بندے کے شہود اور اس کے ذکر میں اس کا فناء اور امر سے کہ وہ اس کا مدرِک یا شاہد بنے! جب یہ قوی ہوجائے تو محبّ ضعیف ہوجاتا ہے حتیٰ اس کی قوتِ تمییز مضطرب ہوجاتی ہے تو کبھی خیال کرتا ہے کہ یہ اس کا محبوب ہے جیسا کہ ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے دریا میں چھلانگ لگادی تو اس کا عاشق بھی اس کے پیچھے کود پڑا، اس نے کہا میں تو گر پڑا تھا تم نے کیوں میرے پیچھے چھلانگ لگادی؟ وہ بولا: (غِبْتُ بِكَ عَنِّيْ فَظَنَنْتُ اَنَّكَ اِنِّيْ) (یعنی میں تیری محبت میں خود کو فراموش کر بیٹھا ہوں، سمجھتا ہوں کہ تو میں ہوں)

اس مقام پر کئی حضرات نے ٹھوکر کھائی ہے اور خیال کیا کہ یہ اتحاد (یعنی اتحادِ ذات) ہے اور محبّ ومحبوب ایک ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ ان کے نفسِ وجود میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، یہ غلط ہے، خالق کے ساتھ اصلاً ہی کوئی شیٔ متحد نہیں ہوسکتی بلکہ کسی بھی شیٔ کا کسی اور شیٔ کے ساتھ اتحادِ ذات نہیں ہوسکتا الا یہ کہ دونوں کی نسبت استحالت (یعنی تبدیلیِ ذات) عمل میں آئے اور سابقہ حیثیت کھودیں اور پھر دونوں کے اتحاد سے ایک تیسری شیٔ کا حصول ہو جو نہ یہ اور نہ وہ ہے، جیسے پانی اور دودھ اور پانی اور شراب وغیرہ کا اتحاد البتہ محبّ اور محبوب مکروہ اور محبوب ارادہ وکراہت میں باہم متحد اور متفق ہوجاتے ہیں، تو اِسے بھی وہی محبوب ہوتا ہے جو اُسے ہوتا ہے اور وہی مبغوض ہوتا ہے جو اسے ہوتا ہے، جس پر وہ راضی یا ناراض اسی پر یہ بھی راضی وناراض ہوتا ہے اور جس سے یہ موالات یا معادات کرتا ہے اسی سے وہ بھی کرتا ہے اور یہ فناء سارے کا سارا نقص ہے، اکابر اولیاء مثلاً ابوبکر وعمر اور سابقین اولین مہاجرین وانصار اس نوع کے فناء میں واقع نہیں ہوئے، چہ جائے کہ وہ جو رتبہ میں ان سے فائق ہیں یعنی انبیاء ورسل، اس طرح کی شیٔ صحابہ کے بعد واقع ہوئی ہے، اسی طرح ہر جو اس نمط سے ہے وہ جس میں عقل وشعور کا غیاب وفقدان ہے اس کے لیے جو دل پر احوالِ ایمان وارد ہوں (وہ بھی عصرِ صحابہ میں واقع نہیں ہوا) صحابہ ایمانی احوال میں اس امر سے اکمل، اقوی اور اثبت تھے کہ ان کی عقول غائب ہوں یا غشی، صعقہ، سکر، فناء، وَلَہ یا جنون کی کیفیات ان پر طاری ہوں، اس طرح کے امور کے مبادی بصرہ کے عابد وزاہد بعض تابعین میں ہوئے، ان میں سے بعض جب قرآن کی تلاوت سنتے تو ان پر غشی طاری ہوجاتی، کئی تو فوت بھی ہوگئے جیسے ابوجہیر ضریر اور قاضیِ بصرہ زرارہ بن ابواوفی، شیوخِ صوفیہ میں سے بعض کے لیے فناء وسکر کی حالت عارض ہوئی تھی جس میں وہ شعور کھو بیٹھے حتیٰ کہ اس حال میں ان کی زبان سے ایسے اقوال صادر ہوئے کہ جب یہ حالت ختم ہوئی (اور انہیں بتلایا گیا) تو اپنی غلطی کو تسلیم کیا جیسا کہ ابویزید، ابوالحسن نوری اور ابوبکر شبلی اور ان کے امثال بارے نقل کیا جاتا ہے

بخلاف ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی اور فضیل بن عیاض کے بلکہ جنید اور ان کے امثال کے بھی برخلاف جو کسی بھی حال میں عقل وشعور کے فاقد نہ بنتے تھے تو ان پر اس طرح کا حال طاری نہ ہوتا تھا، ان کے دل ہمہ وقت اللہ کی محبت، اس کی

ارادت اوراس کی عبادت سے لبریز رہتے تھے، ان کے پاس وسعتِ علم وتمیز تھا کہ وہ امور کا ان کی اصل حالت پر مشاہدہ کرتے تھے بلکہ تمام مخلوقات کو اللہ کے امر کے ساتھ قائم ومدبر بلکہ اس کے لیے مستجیب وقانت دیکھتے اوراس سے تبصرہ وذکریٰ اخذ کرتے اور یہ مشاہدہ ان کے قلوب میں موجود اخلاصِ دین کومہمیز لگاتا اورتوحید کواس کے لیے مجرد کرنے پر اور اکیلے اس کی عبادت پر! یہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے دعوت دی اوراہلِ تحقیق اعیان اور کامل اہلِ عرفان اس کے ساتھ قائم ہوئے اور ہمارے نبی اکرم ان سب سے اکمل اوران کے سرخیل ہیں، اسی لئے جب آپ کوآسمانوں کی معراج کرائی گئی اور وہاں اللہ تعالی کی نشانیوں کا معاینہ ومشاہدہ کیا اورآپ کی طرف کئی انواعِ مناجات کی گئی تو اس کے باوجود آپ کی حالت میں اس طرح کی کوئی کیفیت طاری نہ ہوئی بخلاف حضرت موسیٰ کے کہ (تجلی کا مشاہدہ کرتے ہوئے) بے ہوش ہوگئے تھے

جہاں تک فناء کی نوعِ ثالث تو وہ یہ کہ شاہد بنے کہ کوئی موجودنہیں مگر اللہ اور وجودِ خالق ہی وجودِ مخلوق ہے تو رب اور بندے کے درمیان کوئی فرق نہیں تو یہ اہلِ ضلال و الحاد کا نظریہِ فناء ہے جوحلول و اتحاد کے عقیدہ میں جا واقع ہوئے، اہلِ استقامت مشائخ میں سے جب کسی نے کہا میں غیر اللہ کونہیں دیکھتا یا اس کے نحو عبارت، تو ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ کسی اور کو اللہ کے سوا رب، خالق، مدبر اور الہ نہیں دیکھتے اور کسی اور کی طرف از رہِ محبت یا خوف یا رجاء نہیں دیکھتے کہ نظر ہر دم اسی کو دیکھتی ہے جس کے ساتھ دل متعلق ہوتا ہے تو جس نے کسی شئ سے محبت کی یا کسی سے امید وابستہ کی یا کسی سے خائف ہوا تو اس کی طرف التفات کرتا ہے اور جب دل میں کسی اور کی محبت، امید اور خوف موجود ہی نہیں یا کسی بھی نوع کا تعلق تو دل قصد نہ کرے گا کہ اس کی طرف التفات اور نظر کرے! ہاں مجرد نظر پڑے تو پڑے جیسے راہ میں آئی کوئی دیوار وغیرہ کہ دل اس کے ساتھ متعلق نہیں ہوتا (بس اچٹتی سی نظر) مشائخ صالحین۔رضی اللہ عنہم۔توحید کی تجرید اور پورے دین کے اخلاص کی تحقیق سے کسی شئ کا ذکر کرتے ہیں اس طور کہ بندہ غیر اللہ کی طرف ملتفت و ناظر نہ ہو، نہ اس سے محبت کرتے ہوئے اور نہ خوف اور نہ امید باندھتے ہوئے بلکہ دل مخلوقات (بارے سوچنے) سے کلیۃً ہی فارغ ہو، وہ مخلوقات کی طرف نہ دیکھے مگر اللہ کے نور کے ساتھ تو حق کے ساتھ ہی سنے، دیکھے، پکڑے اور چلے (یعنی اس کا ہر قول وفعل حق کے ارادے کے تابع ہو) تو یہ قلبِ حنیف وتسلیم، موحد، مسلم، مومن، عارف، محقق اورانبیاء ومرسلین کی حقیقت وتوحید کی معرفت والا ہے

اور جو تیسری نوع ہے اور یہ موجود میں فناء تو یہ آلِ فرعون کی تحقیقِ معرفت وتوحید ہے جیسے قرامطہ اوران کے امثال، لیکن وہ نوع جس پر انبیاء کے اَتباع تھے وہ محمود فناء ہے وہ جس کا اہل ان میں سے ہے جن کی اللہ نے تعریف کی اور یہ اس کے متقی اولیاء، مفلح حزب اور غالب جند ہیں، مشائخ کی اس قول سے مراد یہ نہ تھی کہ مخلوقات میں سے جسے میں اپنی آنکھ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں وہ ارض وسماوات کا رب ہے، ایسی بات تو وہی کہے گا جو پرلے درجہ کا جاہل اور گمراہ ہے اپنی عقل کے فاسد ہونے کی وجہ سے یا

پھر فسادِ اعتقاد کی رو سے تو وہ جنون اور الحاد کے درمیان متردد ہے، تمام وہ مشائخ جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے اسی پر متفق ہیں جس پر امت کے سلف اور ائمہ تھے کہ خالق تعالی مخلوقات سے مباین ہے اس کی ذات میں مخلوقات میں سے کوئی شئ نہیں اور نہ مخلوقات میں اس کی ذات سے کوئی شئ ہے اور یہ کہ قدیم کا حادث سے اِفراد اور خالق کی مخلوق سے تمییز واجب ہے، یہ ان کی کلام میں کثیر و عام ہے، انہوں نے دل پر عارض امراض وشبہات بارے کلام بھی کی ہے اور یہ کہ بعض لوگ کبھی وجودِ مخلوقات کے شاہد ہو تے ہیں تو اسے خالقِ ارض وسماء خیال کر لیتے ہیں اپنے دل میں عدم تمییز وفرقان کی وجہ سے، اس شخص کے بمنزلہ جو سورج کی شعاع کو دیکھے تو خیال کرے یہ وہی آسمان والا سورج ہے! وہ کبھی فرق اور جمع بارے بھی تکلم کرتے ہیں اور اس ضمن میں ایسی ملفَّت (غیر محتاط) عبارات استعمال کر جاتے ہیں جو اس کی نظیر ہوتی ہیں جو فناء میں داخل ہوا، تو بندہ جب مخلوقات میں تنوع اور کثرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا دل ان کے ساتھ متعلق باقی رہ جاتا ہے، یا محبت یا خوف اور یا پھر رجاء کے جذبہ کے تحت تو جب وہ جمع کی طرف منتقل ہو تو اس کا دل اللہ کی توحید اور اس کی وحدہ لاشریک لہ عبادت پر مجتمع ہوگا تو مخلوقین کی طرف التفات کے بعد اللہ کی طرف اس کا دل ملتفت ہوا تو اپنے رب کے لئے اس کی محبت، خوف، رجاء اور استعانت ہوئی اور اس حال میں کبھی اس کے دل کو مخلوق کی طرف نظر کا یارا نہیں رہتا کہ خالق اور مخلوق کے مابین تفرقہ کرے تو کبھی یہ خلق سے نظر اور قصداً اعراض کرتا ہوا حق پر مجتمع ہوگا اور یہ فناء کی نوعِ ثانی کی نظیر ہے

لیکن اس کے بعد دوسرا فرق ہے اور وہ یہ کہ اس امر کا شاہد بنے کہ مخلوقات اللہ کے ساتھ قائم اور اس کے امر کے ساتھ مدبَّر ہیں اور وہ ان کی کثرت کے اللہ کی وحدانیت کے ساتھ معدوم ہونے کا شاہد ہو اور یہ کہ رب تعالی مصنوعات کا رب، ان کا الہ، خالق اور مالک ہے تو یہ اللہ پر اپنے دل کے اجتماع کے ساتھ اس کے لئے اخلاص، محبت، خوف، رجاء، استعانت اور توکل کا فاعل بنتا ہوا اور اسی کی خاطر موالات اور معادات کرنے والا بنے اور خالق اور مخلوق کے درمیان فرق کو مدنظر رکھے اور دونوں کے مابین تمییز روا رکھے، یہ مخلوقات کے تفرق، تنوع اور کثرت کا شاہد ہے اس شہادت کے باوصف کہ اللہ ہر شئ کا رب مالک اور خالق ہے اور اس کے سوا کوئی الہ نہیں تو یہ ہے صحیح اور مستقیم شہود اور یہ دل کے علم، اس کی شہادت، ذکر اور معرفت میں واجب ہے اس کے تمام احوال میں اور یہی لا الہ الا اللہ کی گواہی کی تحقیق ہے تو وہ اپنے دل سے حق کے ماسوا کی الوہیت کی نفی کرتا ہے اور حق کی الوہیت اس کے دل میں نقش ہو جاتی ہے تو وہ مخلوقات سے ہر شئ کی الوہیت کا نفی کرنے والا اور رب العالمین کے لئے اس کا اثبات کرنے والا بنا جو ارض وسماوات کا رب ہے اور یہ دل کے اللہ پر اجتماع اور اس کے ماسوا کی مفارقت کو متضمن ہے تو یہ اپنے علم، شہادت اور اپنی معرفت میں ارادہ اور خالق اور مخلوق کے درمیان محبت میں فرق کرنے والا ہوگا اس طور کہ اللہ بارے عالم، اس کا ذکر کرنے والا اور اس کی معرفت والا ہوا اور ساتھ ساتھ اس کی اپنی خلق سے مباینت، اس کے ان سے انفراد اور اس کے توحُّد کا عالم بنا، نیز اس کا محبّ، معظم، عابد، راجی، خائف اور اس کی خاطر دوستی اور دشمنی کرنے والا، اس کے ساتھ استعانت اور اسی پر بھروسہ کرنے والا، اس کے غیر کی عبادت سے ممتنع او

رغیر سے کسی طرح کی امید نہ رکھنے والا،خوف نہ کھانے والا اور توکل نہ کرنے والا بنا اور دیگر امور جو اللہ کی الوہیت کے خصائص میں سے ہیں،سب کو چھوڑ کر ایک الہٰ کی الوہیت کا اقرار کرنا اس کی ربوبیت کے اقرار کو متضمن ہے تو تب صحیح معنی میں یہ موحد بنے گا

اس کی تبیین یہ امر کرتا ہے کہ افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے جیسا کہ ترمذی اور ابن ابوالدنیا نے مرفوعاً نبی اکرم کا قول نقل کیا ہے کہ افضل ذکر لا الہ الا اللہ اور افضل دعا الحمد للہ ہے،مؤ طا وغیرہ میں طلحہ بن عبداللہ بن کثیر سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا میں نے اور مجھ سے قبل کے انبیاء نے افضل ترین کلمہ یہ کہا ہے:(لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ) اور جس نے زعم کیا کہ یہ تو عوام کا ذکر ہے اور خواص کا ذکر اسمِ مفرد ہے یعنی (اللہ اللہ اللہ) جبکہ خواص الخواص کا ذکر اسمِ مضمر ہے (یعنی ھُو،ھُو،ھُو) وہ ضال اور غالط (یعنی غلطی کا شکار) ہے،ان کے بعض کا اس پر اس قولہ سے احتجاج:

(قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ)[الأنعام : 91] (کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں) واضح ترین غلطی ہے تو یہاں یہ اسم جوابِ استفہام کے ساتھ امر میں مذکور ہے اور یہ قولہ:

(قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّهُدًی لِّلنَّاسِ)[الأنعام : 91] (پوچھو جو کتاب موسیٰ لے کر آئے تھے اُسے کس نے نازل کیا تھا؟ جو لوگوں کیلئے نور اور ہدایت تھی) تو جواب میں کہا:(قُلِ اللّٰهُ) تو یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ما قبل از استفہام کا مدلول ہے جیسا کہ اس کی نظائر میں تم کہتے ہو:(مَنْ جَارُهٗ؟) (اس کا پڑوسی کون ہے؟) تو وہ کہے گا:(مثلا)(زَيْدٌ) اور جہاں تک اسمِ مفرد،مظہراً ہو یا مضمراً تو یہ تام کلام نہیں اور نہ جملہ مفیدہ ہے اور نہ اس کے ساتھ ایمان اور نہ کفر اور نہ امر و نہی متعلق ہے،سلف میں سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ رسول پاک نے اسے مشروع کیا اور نہ دل بنفسہ مفید معرفت اور حالِ نافع دیتا ہے،وہ تو تصورِ مطلق دیتا ہے جس پر کسی نفی یا اثبات کا حکم نہیں لگایا جا سکتا تو اگر اس کے ساتھ دل کی معرفت اور اس کے حال سے وہ مقترن نہ ہو جو بنفسہ مفید ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں،شریعت وہی اذکار مشروع کرتی ہے جو بنفسہ مفید ہیں،نہ کہ وہ جن کا فائدہ ان کے غیر کے ساتھ حاصل ہو،اس ذکر پر مواظبت کرنے والے بعض حضرات کئی قسم کے الحاد اور کئی انواع کے نظریہ اتحاد میں جا واقع ہوئے جیسا کہ ایک جگہ اس پر تفصیل سے بحث کی ہے

اور جو بعض شیوخ سے ذکر کیا جاتا ہے کہ کہا مجھے خوف آتا ہے کہ نفی اور اثبات کے درمیان فوت نہ ہو جاؤں،تو یہ ایسا حال ہے جس میں اس صاحبِ حال کی اقتداء نہ کی جائے گی، یہ غلط سوچ ہے جس میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اگر بندہ اس حال میں فوت ہو تو وہ فوت نہ ہوا مگر اپنے ایک قصد اور نیت پر اور اعمال کا دار و مدار نیات پر ہے اور ثابت ہے کہ نبی اکرم نے مرتے ہوئے کو (لا الہ الا اللہ) کی تلقین کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا جس کی آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوئی وہ جنت میں داخل ہوا تو اگر جو آپ نے ذکر کیا وہ محذور ہوتا تو مرنے والے کو اس کی تلقین کرنے کا حکم نہ دیتے کہ مبادا اس کے اثناء ہی اس کی موت واقع ہو جائے بلکہ (اس اندیشہ سے بچنے کی غرض سے) اسے اسمِ مفرد کی تلقین کرنے کا حکم دیتے،اسم مفرد (یعنی صرف اللہ اللہ کہتے رہنا) کے

ساتھ ذکر سنت سے اَبعد، بدعت میں اَدخل اور شیطان کے اِضلال سے اَقرب ہے تو جس نے کہا: (یَا ھُوَ یَا ھُوَ) یا (ھُوَ ھُوَ) اور اس طرح کا کوئی اور کلمہ (اب تو مزید ترقی ہوگئی، میرے ایک بریلوی کولیگ نے عقیدت مندانہ انداز میں بتلایا کہ فلاں مسجد میں ایک بزرگ کو یہ ذکر کرتے سنا [ہَ - ہُ - ہِ] یعنی لا الہ کی ہائے منصوب، الا اللہ کی ہائے مرفوع اور رسول اللہ کی ہائے مکسور) تو یہ ضمیر عائد نہیں مگر اس پر جس کا دل تصور کر رہا ہے اور دل کبھی مہتدی اور کبھی ضال ہوگا، مصنفِ فصوص (یعنی ابن عربی) نے ایک کتاب (کتاب الھُو) کے نام سے لکھی ہے، ان کے بعض کا زعم ہے کہ قولہ:

(وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ) [آل عمران : ۷] (اور اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) کا معنی ہے کہ اس اسم جو کہ (اَلْھُوَ) ہے کی تاویل سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور کہا گیا کہ یہ اگرچہ ان میں سے ہے جن پر مسلمانوں کا اتفاق ہے بلکہ سب عقلاء کا کہ یہ واضح ترین باطل میں سے ہے مگر کئی حضرات اس کے قائل ہیں، میں نے ایک مرتبہ ایسے ایک شخص سے کہا اگر معنی وہی ہوتا جو تم کہہ رہے ہو تو عبارت یوں ہوتی: (وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَ ھُوَ اِلَّا اللّٰهُ) یعنی ضمیر الگ سے ہوتی (نہ کہ متصل)

پھر کثرت سے کہا جاتا ہے کہ (اللہ، اللہ) اسمِ مفرد کے ساتھ ذاکرین قولہ: **(قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ الخ)** کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اس اسمِ مفرد کا ذکر کریں، یہ باتفاق اہلِ علم غلط ہے، قولہ (قُلِ اللّٰهُ) کا معنی (جیسا کہ گزرا) یہ ہے کہ اللہ ہی وہ ہے جس نے کتاب اتاری جو موسیٰ لے کر آئے، اسے لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت بنا کر (یعنی وہ سب جس کا ذکر اس سے قبل کی آیت میں بصورتِ استفہام ہوا، اس کی تقویت اللہ کی ہاء پر پیش سے ہوتی ہے، اگر ان حضرات کا معنی درست ہوتا تو ہاء پر زبر ہوتی) یہ ان لوگوں کا رد تھا جو کہتے تھے اللہ نے کسی بشر پر کبھی کوئی شئ نازل نہیں کی تو اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:

(مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی الخ) اس کی مزید وضاحت اس سے ملتی ہے جو سیبویہ (مشہور نحوی) نے ذکر کیا کہ عرب قول کے ساتھ کلام کو تو نقل کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ اسے نقل نہیں کرتے جو قول تھا، تو قول کو نقل و بیان نہیں کرتی مگر تام کلام یا جملہ اسمیہ یا جملہ فعلیہ، اسی لئے وہ (اِنَّ) کے الف پر زیر دیتے ہیں اگر قول (یعنی قال یقول کے باب کے کسی لفظ) کے بعد ذکر ہو تو قول کے ساتھ اسم بیان نہیں کیا جاتا اور اللہ تعالی نے کسی کو اسمِ مفرد کے ذکر کا حکم نہیں دیا اور نہ مسلمانوں کے لئے مفرد مجرد اسم کا ذکر مشروع کیا گیا ہے، اسمِ مفرد (کا زبان سے کہہ دینا) باتفاق اہلِ اسلام ایمان کا افادہ نہ دے گا (یعنی جب تک قبولِ اسلام کرتے وقت پورا کلمہ نہ پڑھے مسلمان نہ بنے گا) عبادات میں سے کسی شئ میں یہ مامور بہ نہیں اور نہ مخاطبات میں سے کسی شئ میں، اسمِ مفرد پر اقتصار کرنے والے کی نظیر جو ذکر کیا گیا کہ ایک اعرابی کا گزر ایک موذن سے ہوا جو (اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدا رَّسُوْلَ اللّٰهِ) (لام پر) زبر کے ساتھ کہہ رہا تھا تو وہ بولا یہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ تو ان کا اسم ہوا، پھر خبر کہاں ہے جس کے ساتھ جملہ مکمل ہو؟ (کیونکہ [اِنَّ] کا اسم منصوب اور خبر مرفوع ہوتی ہے تب جملہ مکمل ہوگا، موذن نے جب رسولَ اللہ پڑھا تو یہ جملہ مکمل نہ ہوا) قرآن میں جو کہا:

(وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا) [المزمل : ٨] (تو اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ) اور:

(سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى) [الأعلىٰ : ١] (اپنے رب جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو)

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى)[الأعلى:١٤ـ١٥](بے شک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہوا۔اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا)

(فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ)[الواقعة : ٩٦] (پس تم اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کرتے رہو) وغیرہا تو یہ اس اسم کے مفرداً ذکر کرنے کو مقتضی نہیں کیونکہ سنن میں ہے کہ جب قولہ:(فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ) نازل ہوا تو فرمایا اسے اپنے رکوع میں کرلو اور جب قولہ:(سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى) نازل ہوا تو فرمایا اسے اپنے سجود میں کرلو تو جو عبارت رکوع اور سجود کے لئے مشروع کی گئی وہ (اسم مفرد نہیں بلکہ) یہ ہے:(سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم) اور (سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلىٰ) صحیح میں ہے کہ آپ رکوع میں:(سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم) اور سجدہ میں:(سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلىٰ) کہا کرتے تھے تو رب کے اسم اعلی کے تسبیح تام اور مفید کلام کے ساتھ ہے جیسے صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا قرآن کے بعد افضل کلام چار کلمات ہیں اور وہ قرآن میں مذکور ہیں:(سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ،لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) اور (اَللّٰهُ اَكْبَرُ) صحیح کی ایک اور (بخاری کی آخری) روایت میں ہے:(كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ)

صحیحین میں ہے آپ نے فرمایا جس نے روزانہ سو مرتبہ یہ ذکر کیا:(لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ) اللہ شام تک اس کے لئے شیطان سے حفاظت لکھ دے گا اور اس سے افضل عمل کوئی نہ لائے گا مگر جو یہی کہے یا اس سے زیادہ مرتبہ کہے اور جس نے روزانہ سو مرتبہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ) کا ورد کیا اس کی خطائیں مٹا دی جاتی ہیں اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں، موطا وغیرہ میں مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا افضل ترین کلمہ (ورد) جو میں نے اور سابقہ انبیاء نے کہا وہ ہے::(لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ الخ ـ وہی جو اوپر گزرا) سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ فرمایا افضل ترین ذکر (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) اور افضل ترین دعا (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) ہے، ذکر و دعا کے باب میں اس طرح کی احادیث کثیر ہیں اسی سے قرآن میں جو ذکر ہوا:

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) [الأنعام: ١٢١] (اور جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اُسے مت کھاؤ) اور:

(فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ) [المائدة : ٤] (اور وہ بھی حلال ہے جو تمہارے لئے ان شکاری جانوروں نے روکے رکھا

ہو) تو یہ اسم نحویوں کے دو اقوال میں سے اظہر قول کے مطابق یا اسمیہ ہے اور تقدیر کلام ہے: (ذَبْحِیْ بِسْمِ اللّٰہِ) یا فعلیہ اور تقدیر کلام ہے: (اَذْبَحُ بِسْمِ اللّٰہِ) اسی طرح قاری کا قول: (بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) تو اس کی تقدیر ہے: (قِرَاءَ تِیْ بِسْمِ اللّٰہِ) یا (اَقْرَأُ بِسْمِ اللّٰہِ) بعض حضرات نے یہ تقدیر ذکر کی: (اِبْتِدَائِیْ بِسْمِ اللّٰہِ) یا (اَبْتَدِئُ بِسْمِ اللّٰہِ) اول احسن ہے اس لئے کہ فعل کلہ (بِسْمِ اللّٰہِ) کا مفعول ہے نہ کہ مجرد اس کی ابتداء جیسے اس قولہ میں مضمر کو مظہر کیا:

(اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ) [العلق: ۱] (اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا) اور قولہ:

(بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا) [ھود: ۴۱] (اللہ کا نام لے کر اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے) اور نبی اکرم کے اس فرمان میں: (مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيَذْبَحْ مَكَانَهَا أُخْرىٰ وَ مَنْ لَمْ يَكُنْ ذَبَحَ فَلْيَذْبَحْ بِسْمِ اللّٰہِ) اسی باب سے آنجناب کا اپنے ربیب عمر بن ابوسلمہ سے ایک صحیح حدیث میں یہ کہنا: (سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ) تو مراد یہ کہ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کیا کرو، یہ نہیں کہ مجرد اللہ کہہ لو، اسی طرح صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے عدی بن حاتم سے کہا جب اپنے شکاری کتے کو (شکار پر) چھوڑ و اور تم نے (چھوڑتے وقت) اسم اللہ کا ذکر کیا تھا تو (اس کا مارا ہوا شکار) کھا لو، اسی طرح آپ کا فرمان کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتو داخل ہوتے وقت اللہ کے نام کا ذکر کیا نیز نکلتے وقت اور کھانا کھاتے وقت تو شیطان (اپنے چیلوں چانٹوں سے) کہتا ہے تمہارے لئے اس گھر میں نہ رات گزارنے کی جگہ ہے اور نہ کھانا ہے، اس کی امثال کثیر ہیں، اسی طرح جو اہل اسلام کے لئے ان کی نماز، اذان، حج اور اعیاد میں اللہ کے ذکر سے مشروع کیا گیا وہ جملہ تامہ ہے (نہ کہ فقط اللہ اللہ) جیسے اذان کے کلمات (اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ الخ) اور نماز کی تمام تسبیحات اور تلبیہ کے کلمات: (لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ الخ) تو جو ذکر کسی بھی مناسبت سے ہمارے دین نے ہمارے لئے مشروع کیا وہ تام کلام ہے نہ کہ اسم مفرد، نہ مظہر اور نہ مضمر، لغت میں اسی کو کلمہ کہا جاتا ہے جیسے آپ کا فرمان: (كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ --الخ) ایک حدیث میں کہا: (اَفْضَلُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ قَوْلُ لَبِيْدٍ: اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ) اسی سے یہ قولہ تعالیٰ:

(كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ) [الکھف: ۵] (بڑی سخت بات ہے جو اُن کے منہ سے نکلی ہے) الآیۃ اور قولہ:

(وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا) [الأنعام: ۱۱۵] (اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں) اور اس کے امثال، جہاں بھی کتاب وسنت میں کلمہ کا لفظ مستعمل ہوا بلکہ تمام کلام عرب میں اس سے مراد جملہ تامہ لیا جاتا ہے جیسے عرب حرف کو اسم کے معنی میں استعمال کرتے اور کہتے ہیں: (هٰذَا حَرْفٌ غَرِيْبٌ) یعنی یہ لفظ غریب ہے، سیبویہ نے کلام کو اسم، فعل اور حرف کی طرف تقسیم کیا ہے اور حرف جو کسی معنی کے لئے آئے، ان میں سے ہر قسم حرف کہلاتی ہے البتہ تیسری قسم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ حرف ہے جو کسی معنی کے لئے وارد ہوا ہے، نہ اسم ہے اور نہ فعل! حروف تہجی (ا۔ب۔ت) کو حرف کہا گیا اور یہ اسماء ہیں، حرف کا لفظ ان اسماء اور

ان کے غیر کو متناول ہے جیسے نبی اکرم نے ایک حدیث میں کہا جس نے قرآن کی تلاوت کی تو اس کے ہر حرف کے بدلے اسے دس نیکیاں ملیں گی، میں یہ نہیں کہتا کہ (الم) ایک حرف ہے لیکن الف حرف ہے اور لام حرف ہے اور میم حرف ہے! خلیل نے اپنے اصحاب سے زید کی زاء کے حرف کے نطق بارے سوال کیا تو وہ بولے: (زَای) تو کہنے لگے تم تو اسم لے آئے، حرف تو (زاء) ہے

پھر نحاۃ کی اصطلاح میں لغت میں حرف کے ساتھ یہ مسمّی کلمہ کہلاتا ہے اور حرف کا لفظ اس کے ساتھ خاص ہے جو (بذاتِ خود کوئی معنی دینے کی بجائے) کسی معنی کے لئے آئے جو نہ اسم اور نہ فعل ہے جیسے حروفِ جر وغیرہ! جہاں تک حروفِ تہجی کے الفاظ تو کبھی حرف کے ساتھ لفظ سے نفسِ حرف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی اس حرف کے اسم کے ساتھ، جب یہ اصطلاح عام و غالب ہوئی تو بعض نے توھم کیا کہ عربوں کی لغت میں یہی ہے، ان میں سے بعض لغت میں کلمہ کے لفظ کو مثلاً اسم اور جملہ کے مابین مشترک لفظ باور کرتے ہیں اور صریح لغت میں کلمہ کے لفظ سے نہیں پہچانتے مگر جملہ تامہ کو، یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ اللہ کے ذکر کے ضمن میں مشروع جملہ تامہ ہے، اسی کو کلام کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے اسی سے اس کا واحد کلمہ ہے اور یہ جو نافع قلوب ہو اور اس کی رو سے ثواب، اجر اور اللہ کا قرب حاصل ہو، اس کی معرفت، محبت، خشیت اور دیگر مطالبِ عالیہ اور مقاصدِ سامیہ اور جہاں تک اسمِ مفرد مظہر یا مضمر پر اختصار تو اس کے لئے کوئی اصل نہیں چہ جائے کہ اسے خواص اور عارفین کا ذکر قرار دیا جائے! بلکہ یہ کئی طرح کی بدعات اور ضلالات کا وسیلہ اور اہلِ الحاد اور اہلِ اتحاد کے احوال میں سے فاسد حال کا ذریعہ ہے جیسا کہ اس پر ایک جگہ مفصل بحث کی ہے، دین کا جماع دو اصول ہیں: ایک کہ ہم نہ عبادت کریں مگر اللہ کی اور یہ عبادت صرف مشروع کے ساتھ ہی کریں، نہ کہ خودساختہ طور طریقوں اور بدعات کے ساتھ جیسے اللہ نے فرمایا:

(فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا) (کچھ قبل گزری) اور یہ شہادتین کی تحقیق ہے، شہادۃ ان لا الہ الا اللہ اور شہادۃ ان محمدا رسول اللہ، پہلے حصہ میں اس کے ماسوا کی عبادت کی نفی کی اور دوسرے حصہ میں حضرت محمد کو اس کے دین کا مبلغ مانا، تو ہم پر لازم ہے کہ آپ کی اخبار کی تصدیق اور آپ کے امر کی طاعت کریں، آپ نے ہمارے لئے واضح کر دیا کہ کس طرح سے اللہ کی عبادت کریں اور ہمیں محدثات امور سے منع کیا اور آگاہ کیا کہ یہ گمراہی ہیں، فرمایا:

(بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ) (کچھ قبل گزری) جیسا کہ ہم مامور ہیں کہ خوف نہ کھائیں مگر اللہ سے، توکل نہ کریں مگر اللہ پر، راغب نہ ہوں مگر اللہ کی طرف، استعانت نہ کریں مگر اللہ کے ساتھ اور ہماری عبادت نہ ہو مگر اللہ کے لئے اسی طرح ہم مامور ہیں کہ رسول کی تابعداری کریں اور آپ کو اپنا اسوہ بنا لیں، تو حلال وہی جو آپ نے حلال کیا اور حرام وہی جسے آپ نے حرام قرار دیا اور دین وہی جسے آپ نے مشروع کیا، فرمایا:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ

رٰغِبُـوْنَ) [التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ہمیں دے دیں گے اور ہمیں تو اللہ ہی کی خواہش ہے) تو ایتاء کو اللہ و رسول کے لئے کیا جیسے کہا:

(وَمَـآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا) [الحشر: ۷] (اور جو تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں باز رہو) جبکہ توکل کو صرف اللہ وحدہ کے لئے کیا تو کہا: (وَقَـالُـوْا حَسْبُـنَا اللّٰهُ) یہاں (وَ رَسُـوْلُهٗ) کا لفظ ذکر نہیں کیا جیسے دوسری آیت میں کہا:

(اَلَّـذِيْـنَ قَـالَ لَهُـمُ الـنَّـاسُ اِنَّ الـنَّـاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْــوَكِيْـلُ)[آل عـمـران : ۱۷۳] (اُن سے لوگوں نے آ کر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے لئے جمع کیا ہے تو اُن سے ڈرو تو اُن کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے) اسی کا مثل یہ آیت:

(يٰٓاَيُّهَـا الـنَّبِىُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ)[التوبة : ۶۴] (اے نبی اللہ تمہیں اور مومنوں کو جو تمہارے پیروکار ہیں کافی ہے) یعنی اللہ آپ کو اور مومنین کو کافی ہے جیسے کہا:

(اَلَيْسَ الـلّٰـهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ) [الـزمـر : ۳۶] (کیا اللہ اپنے بندوں کو کافی نہیں؟) پھر کہا:(سَيُـؤْتِيْـنَـا الـلّٰـهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُــوْلُــهٗ) تو ایتاء کو اللہ و رسول دونوں کے لئے کیا اور فضل کا ذکر مقدم کیا اس لئے کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے عطا کرے، وہی ذوالفضل العظیم ہے اپنے رسول اور مومنین پر اسی کا فضل ہے اور کہا: (اِنَّـآ اِلَـى الـلّٰـهِ رٰغِبُوْنَ) تو رغبت کو بھی اللہ وحدہ کی طرف کیا جیسے اس آیت میں بھی:

(فَـاِذَا فَـرَغْـتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ) [الانشراح : ۷۔۸] (تو جب فارغ ہوا کرو تو محنت کیا کرو۔ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو) نبی اکرم نے ابن عباس سے کہا تھا جب مانگو تو اللہ ہی سے مانگو اور جب استعانت کرو تو اللہ ہی کے ساتھ کرو، قرآن کے متعدد مقامات میں یہ معنی و دلالت مذکور ہے تو عبادت، خشیت اور تقوی اللہ وحدہ کے لئے جبکہ طاعت اور محبت اللہ و رسول دونوں کے لئے ہے جیسے حضرت نوح کے اس قول میں ہے:

(اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ) [نوح : ۳] (کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو) اور:

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ) [النور: ۵۲] (اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں) اور اس کی امثال، تو رسل نے اللہ وحدہ کی عبادت، اس کی طرف رغبت اور اسی پر توکل کرنے کا جبکہ اللہ کی اور اپنی طاعت کا حکم دیا تو شیطان نے نصاری اور ان کے اشباہ کو گمراہ کر ڈالا تو انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور رسول کی نافرمانی کی اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار و رُہبان اور مسیح بن مریم کو

ارباب بنالیا تو ان کی طرف راغب بنے اور ان پر توکل کیا اور ان کے سامنے طلبِ حاجات کرنے لگے، اللہ نے اپنے مخلص مومنوں کو صراطِ مستقیم کی راہ دکھلائی، جنہوں نے حق کی معرفت پائی اور اس کی اتباع کی تو وہ مغضوب علیہم نہ ہوئے اور نہ ضالین، اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کیا اور اللہ کے امر اور قضاء کے سامنے سر جھکادئے اور منیب بنے اپنی محبت، امید اور خوف کو اسی کے ساتھ خاص کیا، مانگا تو اسی سے مانگا اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کردئے، اس کے رسل کی طاعت کی، مدد کی، ساتھ دیا، محبت اور موالات کی اور ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کی سنن کو اپنایا تو یہی وہ دینِ اسلام ہے جس کے ساتھ اللہ نے اولین وآخرین رسل وانبیاء کو مبعوث کیا اور اس کے سوا اللہ کوئی اور دین قبول نہ کرے گا اور یہی رب العالمین کے لئے عبادت کی حقیقت ہے، پس اللہ سے التجا ہے کہ اس پر ہمارے قدم ثابت رکھے اور اسی پر ہماری موت واقع ہو، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ ۔

سوال

شیخ سے نبی اکرم کے **اس قول کہ میرے بھائی ذوالنون کی دعا یہ تھی**: (لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) [الأنبیاء: ۸۷] (تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بے شک میں قصور وار ہوں) اور فرمایا کسی مکروب نے ان کلمات کے ساتھ دعا نہ کی مگر اللہ اس کی پریشانی دور کرے گا، اس دعا کا کیا معنی ہے؟ اور یہ (بطور خاص) کرب دور کرنے والی کیونکر ہوئی؟ اور کیا اس کے لئے کوئی باطنی شروط ہیں جب یہ کہی جائے؟ اور دل کے اعتقاد کی اس کے معنی کے ساتھ کیا مطابقت ہے حتی کہ کشفِ ضر کی موجب بنی؟ اور اس میں: (اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) کے ذکر کی کیا مناسبت ہے؟ حالانکہ توحید کشفِ ضر کا موجب ہے اور کیا یہ اعتراف کرنا ضروری ہے یا صرف مستقبل میں نہ کرنے کا عزم اور توبہ ہی کافی ہوگی؟ اور کیا راز ہے کہ ضر کا کشف اور اس کا زوال تب ہوتا ہے جب مخلوق سے وابستہ کی ہوئیں ساری امیدیں اور تعلقات منقطع ہوجائیں، مخلوقین سے امیدیں باندھنے سے کلیۃً دل کے انصراف کا کیا حیلہ ہو؟ اور اللہ سے تعلق جوڑنے کا؟ آیا اس پر مددگار کوئی سبب ہے؟

جواب

الحمد للہ رب العالمین! قرآن میں دعاء ودعوت کا لفظ دو معانی کو متناول ہے: ایک دعا بمعنی عبادت اور دوم دعا بمعنی سوال وطلب، فرمایا:

(فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِیْنَ) [الشعراء: ۲۱۳] (تو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ تمہیں عذاب دیا جائے گا)

(وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ) [المؤمنون: ۱۱۷] (اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کچھ سند نہیں تو اس کا حساب اللہ ہی کے ہاں ہوگا

کچھ شک نہیں کہ کافر کامیابی نہ پائیں گے)

(وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) [القصص : ٨٨] (اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارنا اُس کے سوا کوئی معبود نہیں)

(وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا) [الجن : ١٩] (اور جب اللہ کے بندے اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو قریب تھے کہ کافر ان کا گھیراؤ کرلیں)

(اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا) [النساء : ١١٧] (یہ جو اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں تو مورتوں ہی کی اور پکارتے ہیں تو شیطان سرکش ہی کو)

(لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ) [الرعد: ١٤] (سُودمند پکارنا تو اُسی کو ہے اور جن کو یہ لوگ اُس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی پُکار کو کسی طرح قبول نہیں کرتے مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے تا کہ اُس کے منہ تک آ پہنچے حالانکہ وہ کبھی بھی نہیں آ سکتا)

(وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ) [الفرقان : ٦٨] (اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں پکارتے اور جن جاندار کا مار ڈالنا اللہ نے حرام کیا ہے اُس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریق پر اور بدکاری نہیں کرتے) اسی سورۃ کے آخر میں کہا:

(قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ) [٧٧] (کہہ دو کہ اگر تم نہیں پکارتے تو میرا رب بھی تمہاری کچھ پرواہ نہ کرتا) اس کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے:(لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ اِيَّاهُ) (یعنی تمہارا اسے پکارنا اگر نہ ہو) (اور دوسرا یہ معنی:(لَوْلَا دُعَاؤُهٗ اِيَّاكُمْ) (اس کا تمہیں بلانا) تو مصدر کبھی فاعل اور کبھی مفعول کی طرف مضاف کیا جاتا ہے لیکن فاعل کی طرف اس کی اضافت اقوی ہے اس لئے کہ فاعل کا ہونا ضروری امر ہے اسی لئے اقوی القولین یہ ہے کہ وہ تمہاری پرواہ ہی نہ کرے اگر تم اسے نہ پکارو، کہ اس کی عبادت کرو اور اس سے مانگو، لغت میں صلاۃ کے لفظ کی اصل دعاء ہے، نماز کو معنائے دعا کو اس کے متضمن ہونے کی وجہ سے دعا کا نام دیا گیا اور وہ عبادت وسوال، قولہ:(اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ) کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک کہ میری عبادت کرو اور میرے امر کا امتثال کرو، میں تمہارے لئے مستجیب بنوں گا جیسے کہا:

(وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) [الشوری : ٢٦] (اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کی (دعا) قبول فرماتا ہے) ای يَسْتَجِيْبُ لَهُمْ یہ لغت میں معروف ہے، کہا جاتا ہے:(اِسْتَجَابَهٗ، اِسْتَجَابَ لَهٗ) (یعنی لام کے صلہ کے ساتھ اور بغیر صلہ کے دونوں طرح مستعمل ہے) جیسے شاعر نے کہا:

وَدَاعٍ دَعَا یَا مَنْ یُجِیْبُ اِلَی النِّدَا　　　فَلَمْ یَسْتَجِبْهُ عِنْدَ ذَاكَ مُجِیْبُ

(کتنے ہی دعا کرنے والوں نے پکارا: اے جو پکار کا جواب دے مگر کسی جواب دینے والے نے پکار کا جواب نہ دیا) اور دوسرا معنی یہ کیا گیا: (سَلُوْنِیْ اُعْطِكُمْ) (مجھ سے مانگو میں تمہیں عطا کروں گا) صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا ہمارا رب ہر رات آسمانِ دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے جب رات کا آخری پہر باقی رہ جاتا ہے تو کہتا ہے:(مَنْ یَدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَهٗ مَنْ یَسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهِ مَنْ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَ لَهٗ الخ) تو اولاً لفظِ دعاء کا ذکر کیا پھر سوال اور استغفار کا اور مستغفر سائل ہے جیسا کہ سائل داعی ہے لیکن ذکرِ سائل طالبِ خیر سائل کے بعد دفعِ شر کے لئے ہے اور داعی کے بعد دونوں کا ذکر خاص کے عام پر عطف سے ہے، فرمایا:

(وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ) [البقرة : ۱۸۶] (اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں تو پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں) اور ہر سائل راغب و راہب ہے تو وہ مسئول کے لئے عابد ہے اور جو اس کے لئے عابد ہے وہ راغب اور راہب بھی ہے اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف تو یوں ہر عابد سائل اور ہر سائل عابد ہے! دونوں اسموں میں سے ہر ایک مجرداً مذکور ہونے کے وقت دوسرے کو بھی متناول ہے لیکن جب دونوں کا اکٹھے ذکر کیا جائے تو سائل سے مراد وہ جو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کی طلب کر رہا ہے سوال اور طلب کے صیغ کے ساتھ، اور عابد سے مراد جو امتثالِ امر کے ساتھ اس کی طلب کرتا ہے اگرچہ اس میں سوال کے صیغ نہ بھی ہوں، وہ عابد جو اللہ کی رضا کا ارادہ کرتا ہے اور اس کی طرف نظر کا وہ بھی راجی، خائف اور راغب و راہب ہے، اپنی مراد کے حصول میں راغب اور اس کے فوات سے راہب، فرمایا:

(اِنَّهُمْ كَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا) [الأنبیاء: ۹۰] (یہ لوگ لپک لپک کر نیکیاں کرتے اور ہمیں اُمید اور خوف سے پکارتے) اور کہا:

(تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا) [الم السجدة : ۱۶] (ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں) یہ متصوَر ہی نہیں کہ اللہ کے لئے داعی۔ چاہے دعائے عبادت کر رہا ہو یا دعائے مسئلہ۔ خوف اور طمع کی رغبت و رہبت سے خالی ہو اور جو بعض شیوخ سے ذکر کیا گیا کہ خوف اور رجا کو عوام کے مقامات سے قرار دیا تو ان کی مراد کی یہ تفسیر کی جا سکتی ہے کہ مقربین اللہ کی رضا کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کی طرف نظر کے ساتھ تلذّذ کے قاصد ہیں اگرچہ وہاں ایسی مخلوق نہیں جس کے ساتھ وہ متلذذ ہوں اور یہ اس مطلوب کے حصول کی امید اور اس کے حرمان سے خوف رکھتے ہیں تو یوں یہ خوف اور رجاء سے خالی نہیں ہیں

لیکن ان کا مَرجوّ اورمَخُوف ان کے مطلوب کے بحسب ہے اور ان میں سے جس نے کہا میں نے تیری جنت کے شوق اور تیرے دوزخ کے خوف سے تیری عبادت نہیں کی تو وہ ظن کرتا ہے کہ جنت سے مراد اس کے موجودات کے ساتھ تمتُّع ہے اور دوزخ اس کے لئے اسم ہے جس میں عذاب نہیں مگر مخلوقات کا الم اور یہ ان کی جنت کے مسمّیٰ کی فہم سے تقصیر وقصور ہے بلکہ ہر جو اللہ نے اپنے اولیاء کے لئے تیار کر رکھا ہے وہ جنت سے ہے اور اللہ کا دیدار بھی جنت سے ہے اسی لئے افضل الخلق اللہ سے جنت کا سوال اور آگ سے اس کی پناہ کی طلب کرتے تھے جب آپ نے ایک صحابی سے پوچھا کہ نماز میں کیا دعا کرتے ہو تو انہوں نے جواب دیا مجھے آپ اور معاذ کی طرح حسنِ عبارت تو نہیں آتی مگر میں اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں تو آپ نے کہا ہماری حسنِ عبارت بھی اسی باب سے ہے، اہلِ کلام کے ایک فریق نے اس کلام کے قائل کا انکار کیا ہے یعنی :(اَسْاَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلیٰ وَجْهِكَ) انہوں نے خیال کیا کہ اللہ کے دیدار کے ساتھ تلذُّذ نہیں ہوسکتا اور کوئی نعیم نہیں مگر مخلوق کے ساتھ تو انہوں نے بھی دوسروں کی طرح جنت کا معنی ومفہوم سمجھنے میں غلطی کی البتہ انہوں نے اس کی طلب کی جو طلب کئے جانے کی مستحق ہے اور انہوں نے اس کا انکار کیا، جہاں تک قائم بالنار تو یہ امر ضروری ہے اور جس نے کہا اگر اللہ نے مجھے آگ میں داخل کر دیا تو میں اس پر بھی راضی ہوں تو یہ اس کی جانب سے راضی برضا رہنے کا عزم ہے اور عزائم کئی دفع حقائق کے وجود کے وقت منفسخ ہو جاتے ہیں، یہ بات سمنون جیسے بعض حضرات کی کلام میں واقع ہوئی ہے جس نے کہا تھا:

وَلَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ فَكَيْفَ مَا شِئْتَ فَامْتَحِنِّيْ

(میرے لئے تیرے سوا کسی میں کوئی حظ نہیں تو جیسے چاہے مجھے آزمالے) تو وہ عسر البول (یعنی پیشاب کی بندش) کی بیماری میں مبتلا کیا گیا تو وہ بچوں کے مکاتب کا چکر لگاتا اور انہیں اخروٹ دیتا اور کہتا اپنے کذاب چچا کے حق میں دعا کردو، قرآن میں ہے:

(وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ) [آل عمران : ۱۴۳] (اور تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے پس تم نے اُس کو آنکھوں سے دیکھ لیا) عللِ مقامات میں کلام کرنے والے بعض حضرات نے حب، رضا، خوف اور رجا کو عامۃ الناس کے مقامات سے قرار دیا ہے، شہودِ قدر پر بناء کرتے ہوئے لیکن جو قدر کا شاہد بنا تو اس نے توحیدِ افعال کا شہود کرلیا حتی کہ (اس کی نظر میں) جو نہیں وہ فانی ہوا اور جو لم یزل ہے وہی باقی رہا تو یہ ان امور سے خارج ہے اور یہ کلام حقیقۃً اور شرعاً قابلِ اصلاح ہے

جہاں تک حقیقت تو کوئی ذی حیات متصور نہیں کہ وہ حساس اور اپنے لئے سازگار کا محبّ اور اپنے لئے منافر کا مبغض نہ ہو اور جس نے کہا ذی حیات کے نزدیک تمام مقدورات ایک برابر ہیں تو ایسا شخص دو میں سے ایک آدمی ہے: یا تو متصور ہی نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے بلکہ وہ جاہل ہے اور یا پھر مکابر اور معاند ہے، اگر بالفرض کسی انسان کے لئے حال حاصل ہو تو اس کی عقل زائل

ہو جائے گی چاہے اسے اصطلام (یعنی [ہوش وخرد سے] بیگانہ ہو جانا) کہا جائے یا محو یا فناء یا غشی یا ضعف تو ایسے کا بالکلیہ احساسِ نفس ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے اپنے ملائم اور منافر بارے احساس موجود ہے اگر چہ بعض اشیاء بارے اس کا احساس ساقط ہو مگر کلیۃً ختم نہیں ہوا تو جس نے زعم کیا کہ توحیدِ ربوبیت کا مشاہد مقامِ جمع وفناء میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ کسی فرق کا شاہد نہیں بنتا، وہ غلطی پر ہے بلکہ فرق ضروری ہے اس سے چارہ نہیں! لیکن جب وہ شرعی فرق سے خارج ہوا تو طبعی فرق میں باقی رہا تو وہ اپنی ہوائے نفس کا متبع رہے گا نہ کہ اپنے مولیٰ کا مطیع، اسی لئے جب یہ مسئلہ جنید اور ان کے اصحاب کے مابین واقع ہوا تو انہوں نے ان کے لئے دوسرا فرق ذکر کیا اور وہ مامور اور محظور اور اللہ کے محبوبات اور اس کے مکروہات کے مابین فرق، جامع شہودِ قدر کے باوصف تو وہ قدرِ جامع میں فرق کا شاہد ہوگا اور جس نے مامور اور محظور کے مابین فرق نہ کیا وہ دینِ اسلام سے خارج ہوا، یہ حضرات جو جمع میں تکلم کرتے ہیں بالکلیہ فرقِ شرعی سے خارج نہیں ہوتے اور اگر خارج ہو جائیں تب کفار سے بھی بڑے کافر بن جائیں اور یہ وہ ہیں جو رسل اور غیر رسل کو ایک برابر سمجھتے ہیں پھر وحدت الوجود کے نظریہ کو اپنایا تو خالق اور مخلوق کے درمیان فرق نہ کیا البتہ یہ سب ہی اس الحاد تک منتہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے کئی بعض وجوہ سے فرق کرتے ہیں تو کبھی اللہ ورسول کی طاعت کرتے ہیں اور کبھی ان کی معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں اہل قبلہ کے عصاۃ کی طرح، ان نکات پر ایک جگہ سیر حاصل بحث کی ہے یہاں مقصود یہ ہے کہ دعوت ودعا اِسے اور اُسے دونوں کو متناول ہے، فرمایا:

(وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)[یونس: ۱۰] (اور اُن کا آخری قول یہ کہ اللہ رب العالمین کی حمد ہے)

ایک حدیث میں ہے افضل ذکر لا الہ الا اللہ اور افضل دعا الحمد للہ ہے، اسے ابن ماجہ اور ابن ابی الدنیا نے روایت کیا، ترمذی وغیرہ کی نقل کردہ ایک حدیث میں ہے: میرے بھائی ذوالنون کی دعوت (یعنی پکار اور دعا) (لَآ اِلٰـهَ اِلَّـآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُـنْـتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) تھی، کسی مکروب نے اس کے ساتھ دعا نہیں کی مگر اللہ نے اس کا کرب دور کر دیا تو اسے دعوت کا نام دیا اس لئے کہ یہ دعاء کی دونوں انواع (دعائے عبادت اور دعائے طلب ومسئلہ) کو متضمن ہے! تو قولہ (لَآ اِلٰـهَ اِلَّـآ اَنْتَ الخ) تو حیدِ الوہیت کا اعتراف ہے اور یہ دعا کی ایک نوع کو متضمن ہے تو الٰہ ہی مستحق ہے کہ اس سے دعائے عبادت اور دعائے طلب کی جائے اور قولہ: (اِنِّىْ كُنْتُ الخ) قصور اور کوتاہی کا اعتراف ہے اور یہ طلبِ مغفرت کو متضمن ہے تو طالب سائل کبھی صیغۂ طلب کے ساتھ اور کبھی صیغۂ خبر کے ساتھ سوال کرتا ہے یا تو اپنے وصفِ حال کے ساتھ یا پھر خالی مسئول کے وصف کے ساتھ اور یا دونوں حال کے وصف کے ساتھ جیسے حضرت نوح کا یہ قول:

(رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُـوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔـلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْلِىْ وَتَرْحَمْنِىْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ)[هود: ۴۷] (نوح نے کہا کہ رب میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی مجھے حقیقت معلوم نہیں اور اگر تو

مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا تو میں تباہ ہو جاؤں گا) تو یہ صیغۂ طلب نہیں بلکہ یہ اللہ بارے اِخبار ہے کہ اگر اس نے مغفرت ورحمت سے نہ نوازا تو وہ خسارے میں ہوں گے لیکن یہ خبر سوالِ مغفرت کو متضمن ہے، اسی طرح حضرت آدم کا قول:

(رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ)[الأعراف: ۲۳] (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے) اسی باب سے ہے اور اسی سے حضرت موسیٰ کی یہ پکار:

(رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ) [القصص : ۲۴] (اے میرے رب میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے) تو یہ اپنے حال کا وصف ہے اور ساتھ ساتھ یہ اللہ سے اس سوال وطلب کو بھی متضمن ہے کہ وہ ان کی طرف خیر نازل کرے، ترمذی وغیرہ نے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ فرماتا ہے: جسے تلاوتِ قرآن نے میرے ذکر اور مجھ سے طلب کرنے سے مشغول کر دیا تو میں اسے مانگنے والوں سے بھی افضل اور زیادہ عطا کروں گا (یعنی بن مانگے ہی) بقول ترمذی یہ حسن حدیث ہے، اسے مالک بن حویرث نے بھی روایت کیا، میرا خیال ہے بیہقی نے بھی اسے انہی الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے، سفیان بن عیینہ سے قولہ:(اَفْضَلُ الدُّعَاءِ يَوْمَ عَرَفَةَ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) بارے سوال کیا گیا تو یہ حدیث ذکر کی اور ابن جدعان کی مدح میں امیہ بن ابوصلت کا یہ شعر بطورِ مثال پیش کیا

ءَاَذْكُرُ حَاجَتِیْ اَمْ قَدْ كَفَانِیْ حَبَاؤُكَ إِنَّ شِيْمَتَكَ الْحَبَاءُ

إِذَا اَثْنٰى عَلَيْكَ الْمَرْءُ يَوْمًا كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

(کیا میں اپنی ضرورت کا ذکر کروں یا تیری عطا مجھے کافی ہوگی کہ عطا کرنا تیری عادت اور معمول ہے۔ جب کسی روز کوئی تیری تعریف کر دے تو اسے تعریف کرنے سے [بار بار]تعرض سے یہی کافی ہے) کہنے لگے تو یہ مخلوق ہے جو مخلوق کو اس صفت سے مخاطب کر رہی ہے تو خالق تعالیٰ کا حال کیا ہو؟ اسی باب سے حضرت موسیٰ کی یہ دعائے ماثور:(اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ اِلَيْكَ الْمُشْتَكٰى وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَبِكَ الْمُسْتَغَاثُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ) (ص:۱۲۱ میں گزری) تو یہ خبر ہے جو سوال کو متضمن ہے، اسی طرح حضرت ایوب کی یہ دعا:

(اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) [الأنبياء: ۸۳] (مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے) تو اپنے نفس کا اور اپنے رب کا وہ وصف کیا جو اپنی تکلیف کو دور کرنے کے لئے اس کی رحمت کی طلب کو متضمن ہے تو یہ بھی متضمنِ سوال صیغۂ خبر ہے اور یہ سوال ودعا کے ضمن میں حسنِ ادب کے باب سے ہے تو قائل کا کسی معظم آدمی جس کی طرف وہ راغب ہے سے کہنا: میں بھوکا ہوں، میں مریض ہوں سوال میں حسنِ ادب ہے اگرچہ اس کے قول (اگر کہے): مجھے کھانا دو، میرا

علاج کرو وغیرہ عبارات جو صیغۂ طلب سے ہوں، میں مسئول سے طلبِ جازم ہےتو اول میں اپنے حال کا اظہار اور علی وجہ الذل والافتقار سوال حال کے لئے متضمن اِخبار ہے جبکہ ثانی میں رغبتِ تامہ اور صیغۂ طلب کے ساتھ سوالِ محض ہے اور یہ صیغہ یعنی صیغۂ طلب واستدعاء جب اس کے لئے ہے جس کی طرف طالب محتاج ہے یا اس سے جو اس سے قہرِ مطلوب پر قادر ہے تو یہ علی وجہ الامر کہا جائے گا، یا تو اس وجہ سے جو اس میں طالب کی حاجت ہے اور یا اس وجہ سے جو اس میں نفعِ مطلوب ہے لیکن جب یہ ہر وجہ سے فقیر کی طرف سے ہر وجہ سے غنی کے لئے ہو تو یہ تذلّل، افتقار اور اظہارِ حال کے ساتھ سوالِ محض ہے

حاجت اور افتقار کا وصف سوال بالحال ہے اور یہ علم و بیان کی جہت سے ابلغ اور قصد و ارادہ کی جہت سے اظہر ہے اسی لئے اکثر دعائیں قسمِ ثانی سے ہیں کیونکہ طالب سائل اپنے مقصود و مراد کا متصور ہے تو اس کی طلب اور اس کا سوال کرتا ہے تو یہ سوال مطابقت اور قصدِ اول کے ساتھ ہے اور اس میں تصریح ہے اگر چہ اس میں سائل یا مسئول کے حال کا وصف نہیں ہے، اگر طلب کے ساتھ ساتھ دونوں کے حال کے وصف کو بھی متضمن ہو تو یہ دونوں نوع سے اکمل ہو کیونکہ تب یہ خبر، سوال اور قبولیت کے مقتضی علم کو متضمن ہوگی اور قصد و طلب کو بھی جو کہ نفسِ سوال ہے تو یہ سوال اس کے مقتضی اور قبولیت کو متضمن ہوگا نبی اکرم کے حضرت ابوبکر صدیق سے اس فرمان کی مثل جب انہوں نے عرض کی تھی کہ مجھے کوئی ایسی دعا کی تعلیم دیجئے جس کے ساتھ میں اپنی نماز میں دعا کروں تو فرمایا کہو: (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً كَثِيْراً وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ) اسے صحیحین میں نقل کیا تو اس میں داعی کا اپنے حالِ نفس کا وصف ہے جو مغفرت کی طرف اس کی حاجت کو مقتضی ہے نیز اس کے رب کا وصف بھی جو موجب ہے کہ اس کے مطلوب پر اس کے سوا کوئی قادر نہیں اور اس میں بندے کے اپنے مطلوب بارے سوال کی تصریح بھی ہے اور قبولیت کے مقتضی کا بیان بھی اور یہ رب تعالی کا مغفرت اور رحمت کے ساتھ وصف تو یہ اور اس طرح کی عبارات کامل ترین انواعِ طلب ہیں، کثیر ادعیہ اس کے بعض کو متضمن ہوتی ہیں جیسے حضرت موسی کی دعا:

(اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ)[الأعراف: ۱۵۵] (تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے) تو یہ طلب اور اللہ تعالی کا ایسا وصف ہے جو قبولیت کو مقتضی ہے اور قولہ:

(رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَالْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ) [القصص: ۱۶] (اے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے تو اللہ نے ان کو بخش دیا بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے) تو اس میں بھی حالِ نفس اور طلب کا وصف ہے اور قولہ: (رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ الخ) میں سوال بالحال کو متضمن وصف ہے تو یہ انواع ہیں اور ہر نوع کی اپنی خاصیت ہے، باقی یہ کہا جانا کہ حضرت یونس اور ان کے مشابہ حال والوں کے حال کے مناسب صیغۂ وصف و خبر کیوں ہوا صیغۂ طلب کو چھوڑ کر؟ تو کہا

جائے گا اس لیے کہ مقام مقامِ اعتراف تھا کہ مجھے جو تکلیف پہنچی ہے وہ میرے گناہ کے سبب ہے تو اصلِ شر گناہ ہے اور مقصود دفعِ ضر اور استغفار ہے جو قصدِ ثانی کے ساتھ وارد ہے تو کشفِ ضر کی طلب کا صیغہ ذکر نہیں کیا اس کے استشعار کی وجہ سے (یعنی صراحت سے ذکر کئے بغیر کسی طرح باور کرا دینا) کہ انہی سے تقصیر ہوئی ہے اور اپنی اس تکلیف اور خود کو پہنچنے والے شر کا وہ خود ہی سبب بنے ہیں تو ان کے حال کے مناسب یہی ہوا کہ اس کا ذکر کریں جو اس سبب کا رفع کرے اپنی تقصیر و گناہ کا اعتراف کرنے کے ساتھ، طلبِ مغفرت کا صیغہ ذکر نہیں کیا اس لئے کہ وہ مکروب عبد کے لئے قصدِ ثانی کے ساتھ مقصود ہے بخلاف کرب کے کشف کے تو یہ قصدِ اول کے ساتھ اپنے حالِ وجود میں ان کے لئے مقصود ہے کیونکہ نفس اپنی طبع کے لحاظ سے اسی کی طلب کرتا ہے جس کی اسے فوری ضرورت ہو مثلاً ضرر کا زوال جو اسے اس حال میں لاحق ہو قبل اس کے کہ قصدِ ثانی کے ساتھ اس ضرر کے کشف کی طلب کرے جو مستقبل میں متوقع ہے تو اس مقام میں مقصودِ اول مغفرت اور کشفِ ضر کی طلب تھی تو یہ اپنے قصد و ارادہ میں مقدّم تھا اور اس ضمن میں ابلغ انداز وہی جس کے ساتھ اس کے سبب کے رفع کا نیل ہو تو ایسے کلمات ذکر کیے جو محصلِ مقصود تھے، اس کی مزید وضاحت قولہ (سُبْحَانَكَ) پر کلام سے ہوگی تو یہ لفظ رب تعالی کی تعظیم اور تنزیہہ کو متضمن ہے اور مقام بغیر ذنب ظلم اور عقوبت سے اس کی تنزیہہ ہی کو مقتضی تھا یعنی کہہ رہے ہیں: اے اللہ تو مقدس ہے اور مجھ پر ظلم کرنے اور بغیر ذنب مجھے سزا دینے سے منزہ ہے بلکہ میں ہی ظالم ہوں جس نے اپنی جان پر ظلم کمایا، فرمایا:

(وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ)[الأعراف: ۱۶۰] (اور اُن لوگوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ نقصان اپنا ہی کیا)

(وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ) [هود: ۱۰۱] (اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا)

(وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ) [الزخرف: ۷۶] (اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہی ظلم کرتے تھے)

حضرت آدم نے کہا تھا: (رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا الخ) مسلم میں نبی اکرم کی دعائے استفتاح کے یہ الفاظ مذکور ہیں: (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعاً فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) بخاری میں سید الاستغفار کے نام سے یہ دعائے ماثور مذکور ہے: (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) فرمایا جس نے صبح دم حالتِ ایقان میں اسے کہا پھر اسی دن فوت ہو گیا تو جنت میں داخل ہوا اور جس نے یقین کے ساتھ شام میں اسے پڑھا پھر اسی شب انتقال ہو گیا تو جنت میں داخل ہوا

تو بندے پر ہے کہ اللہ کے عدل و احسان کا معترف بنے تو وہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی کو عقوبت دیتا ہے مگر اس کے گناہوں کی وجہ سے ہی اور وہ ان پر احسان و کرم کرتا ہے تو ہر نقمت اس کا عدل اور ہر نعمت اس کا فضل ہے تو قولہ (لَا اِلٰهَ اِلَّا

اَنْـتَ) میں الوہیت کے ساتھ اس کی انفرادیت کا اثبات ہے اور الوہیت اس کے علم، قدرت، رحمت اور حکمت کے کمال کو متضمن ہے تو اس میں بندوں پر اس کے احسان کا اثبات ہے، الٰہ وہی جو مــــألـوہ ہو (یعنی قابلِ بندگی) اور مالوہ ہی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور یہ استحقاق اس وجہ سے جو وہ ان صفات کے ساتھ متصف ہے جو مستلزم ہیں کہ اس سے غایت درجہ کی محبت کی جائے اور اس کے لئے غایت درجہ کا خضوع کیا جائے اور عبادت کی جائے، عبادت غایتِ ذل کے ساتھ غایتِ حب کو متضمن ہے، قولہ (سُبْـحَـانَكَ) اس کی تعظیم اور ظلم و دیگر نقائص سے اس کی تنزیہہ کو متضمن ہے، تسبیح بارے کہا جاتا ہے کہ وہ نفیِ نقائص کو متضمن ہے، موسیٰ بن طلحہ کے نبی اکرم سے روایت کردہ مراسل میں سے ایک مرسل حدیث میں ہے کہ بندے کا سبحان اللہ کہنے میں اللہ کی ہر سوء سے براءت کا اثبات ہے، نفیِ مدح نہ ہوگی مگر جب وہ ثبوت کو متضمن ہو وگرنہ نفیِ محض میں کوئی مدح نہیں اور اللہ سے نقص اور سوء کی نفی اس کے محاسن اور کمال کے اثبات کو مستلزم ہے اور اللہ کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں اور اسی طرح ہی قرآن کی وہ سب آیات و مقامات جن میں اللہ سے نقص و سوء کی نفی وارد ہے تو یہ اس کے محاسن اور کمال کو متضمن ہے جیسے قولہ:

(اَللّٰـهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ) [البقرۃ : ۲۵۵] (اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ، ہمیشہ رہنے والا، اُسے نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند) تو اونگھ آنے اور نیند طاری ہونے کی نفی اس کی کمالِ حیات و قیومیت کو متضمن ہے اور قولہ: **(وَمَـا مَسَّـنَا مِنْ لُّغُوْبٍ)** [ق : ۳۸] (اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں ہوئی) اس کی کمال قدرت کو متضمن ہے ونحو ذلک! تو تسبیح سوء سے اس کی تنزیہہ اور اس سے نفیِ نقص اس کی تعظیم کو متضمن ہے تو قولہ (سُبْحَانَكَ) میں ظلم سے اس کا تبریہ اور ظلم سے اس کی براءت کی موجب عظمت کا اس کے لئے اثبات ہے، ظالم کسی ضرورت کے تحت یا ازرہِ جہالت ظلم کرتا ہے اور اللہ ہر شیٔ سے غنی ہے اور ہر شیٔ کا علیم ہے، وہ بنفسہٖ غنی اور ہر ماسوا اس کا محتاج ہے اور یہ کمال عظمت ہے نیز اس دعا میں تہلیل اور تسبیح ہے تو قولہ: (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ) تہلیل اور (سُبْـحَانَكَ) تسبیح ہے، صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا قرآن کے بعد افضل ترین چار کلمات ہیں اور یہ چاروں قرآن سے ہیں (سُبْـحَـانَ الـلّٰـهِ، اَلْحَمْدُ للّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اللّٰهُ اَكْـبَـرُ) تحمید تسبیح کے ساتھ مقرون اور اس کے تابع ہے جبکہ تکبیر تہلیل کے ساتھ مقرون اور اس کے تابع ہے، صحیح میں ہے کہ آپ سے سوال ہوا کون سی کلام افضل ہے؟ فرمایا اللہ نے اپنے ملائکہ کے لئے جو چن لی: (سُبْـحَـانَ الـلّٰـهِ وَ بِـحَمْدِهٖ) صحیحین میں ہے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے، میزان میں بہت ثقیل ہوں گے اور رحمٰن کو بہت پیارے ہیں :(سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ) قرآن میں ہے:

(فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ) [النصر : ۳] (پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو) فرشتوں نے کہا تھا: **(وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ)** [البقرۃ : ۳۰] (اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں) ان دونوں میں سے ایک کلمہ تحمید او

دوسرا تعظیم کے ساتھ مقرون ہے، ہم نے ذکر کیا کہ تسبیح میں نفیِ سوء ونقائص ہے جو محاسن وکمال کے اثبات کو متضمن ہے اور حمد محاسن پر ہو تی ہے تو حمد اور تعظیم کے مابین مقرون کیا جیسے جلال واکرام کے درمیان کیا کیونکہ لازم نہیں کہ ہر معظم محبوب اور محمود بھی ہو اور نہ یہ کہ ہر محبوب اور محمود معظم ہو، پہلے گزرا کہ عبادت معنائے حمد کو متضمن کمالِ حب کو متضمن ہے اور معنائے تعظیم کو متضمن کمالِ ذل کو بھی تو عبادت میں اس کی محبت اور محاسن پر اس کی حمد ہے اور اس میں اس کے لئے ذل ہے جو اس کی عظمت وکبریائی سے ناشیٔ ہے تو اس میں اس کا اجلال واکرام ہے اور وہ سبحانہ غایتِ اجلال واکرام کا مستحق ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اجلال سلبی صفات اور اکرام ثبوتی صفات میں سے ہے جیسے رازی وغیرہ نے یہ ذکر کیا اور تحقیق یہ ہے کہ دونوں ثبوتی صفتیں ہیں اور کمال کا اثبات نقائص کی نفی کو مستلزم ہے جیسے اس کا قول:

(اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ) [لقمان: ۲۶] (بے شک اللہ بے پرواہ اور لائقِ حمد ہے) اور حضرت سلیمان کا یہ قول:

(فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ) [النمل: ۴۰] (پس میرا رب بے پروا (اور) کرم کرنے والا ہے) اسی طرح اس کا قول: **(لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ)** [التغابن: ۱] (اس کی سچی بادشاہی ہے اور اسی کی تعریف ہے) تو کثیر ایسے ہیں جن کے لئے مُلک اور غنیٰ تو ہے لیکن وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہیں کیونکہ حمد محبوب محاسن کے ساتھ محمود بارے اِخبار کو متضمن ہے تو یہ ازرہِ محبت محبوب کے محاسن کے ساتھ اِخبار کو متضمن ہے، کثیر جن کے لئے حمد اور محبت سے حظ ونصیب ہوتا ہے ان میں عجز، ضعف اور ذل ہے جو عظمت، غنیٰ اور مُلک کے منافی ہیں تو اول کی ہیبت اور خوف تو ہوگا مگر اس سے محبت نہیں کی جاتی جبکہ اس سے محبت بھی کی جاتی ہے اور اس کی حمد بھی کی جاتی ہے البتہ ہیبت اور خوف نہیں کھایا جاتا اور کمال دونوں وصفوں کا اجتماع ہے جیسے ایک اثر میں وارد ہوا:

(اَلْمُؤْمِنُ رُزِقَ حَلَاوَةً وَهَيْبَةً) (اس کا ترجمہ اقبال نے یوں کیا: ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن) نبی اکرم کے وصف میں کہا گیا کہ جو اچانک آپ کو دیکھتا اسے آپ کی ہیبت آلیتی اور جو پھر آپ کا مجالس اور مخالط بنتا اور اسے آپ کی معرفت مل جاتی تو وہ آپ سے محبت کرنے لگ جاتا، تو تسبیح کو تحمید اور تہلیل کو تکبیر کے ساتھ مقرون کیا جیسے اذان کے کلمات میں ہے پھر دونوں میں سے ہر نوع جب مفرداً مذکور ہو تو دوسری کو متضمن ہوگی تو تسبیح وتحمید تعظیم کو اور یہ جس پر اس کی حمد کی جائے، کو متضمن ہے اور یہ الوہیت کو مستلزم ہے اور الوہیت اس امر کو کہ وہ محبوب ہے بلکہ اس امر کو کہ کمالِ حب کا سوائے اس کے کوئی مستحب نہیں اور حمد محمود بارے ان صفات سے اِخبار ہے جن کی وجہ سے وہ مستحق ہو کہ اس سے محبت کی جائے تو الوہیت کمالِ حمد کو متضمن ہے اسی لئے (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) مفتاحِ خطاب ہے (یعنی بات کا آغاز) حدیث میں ہے کہ ہر اہم معاملہ جس کا آغاز حمد کے ساتھ نہ کیا جائے وہ اجذم (ناقص) ہے اور سبحان اللہ میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا اس کی عظمت کا اثبات ہے اسی لئے حکم ہوا:

(فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ) [الحاقة: ۵۲] (پس تم اپنے عظیم رب کے نام کے ساتھ تسبیح کرو) اور (یہ آیت نازل ہو نے کے بعد) نبی اکرم نے حکم دیا کہ اسے اپنے رکوع میں پڑھا کرو، اسے اہلِ سنن نے روایت کیا، فرمایا جہاں تک رکوع تو اس

میں رب کی تعظیم کے کلمات پڑھو جبکہ سجدوں میں خوب محنت سے دعائیں کیا کرو کہ یہ اس لائق ہیں کہ قبول کی جائیں، اسے مسلم نے روایت کیا تو سجود سے رکوع کو اخص بالتعظیم کیا اور تسبیح تعظیم کو متضمن ہے

تو قولہ (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ) میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ، تعظیم، الوہیت اور حمد ہے جہاں تک قولہ: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ) تو لا الہ الا اللہ میں اس کے محامد کا اثبات ہے تو یہ سب اس کی الوہیت کے اثبات میں داخل ہے اور قولہ: (اَللّٰهُ اَكْبَرُ) میں اس کی عظمت کا اثبات ہے تو کبریائی عظمت کو متضمن ہے لیکن کبریاء اکمل ہے اسی لئے نماز اور اذان کے مشروع الفاظ (اَللّٰهُ اَكْبَرُ) ہیں کہ یہ (اَللّٰهُ اَعْظَمُ) سے اکمل ہے جیسا کہ صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ فرماتا ہے کبریائی میری ردا اور عظمت میری چادر ہے جس نے ان میں سے ایک میں سے کسی ایک میں بھی میری منازعت کی تو اسے میں عذاب دوں گا تو عظمت کو ازار اور کبریائی کو ردا کی مانند کیا اور معلوم امر ہے کہ ردا (ازار سے) اشرف ہے (ردا بالائی جسم اور ازار نچلے حصہ جسم کو ڈھانپتی ہے) تو جب تکبیر تعظیم سے ابلغ ہے تو اس کے لفظ کے ساتھ تصریح کی اور یہ تعظیم کو بھی متضمن ہے، قولہ: (سُبْحَانَ اللّٰهِ) میں سوء سے تعظیم کو متضمن تنزیہہ کے ساتھ تصریح کی گئی ہے تو ان دونوں کلموں: (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ) میں سے ہر ایک جب مفرداً مذکور ہو تو دوسرے کو بھی متضمن ہے جبکہ اکٹھے ذکر کے وقت ہر ایک اپنی خاصیت کا اعطاء کرے گا اور یہ جیسے اسمائے حسنیٰ میں سے ہر اسم کبھی دیگر کے معنی کو مستلزم ہوتا ہے کیونکہ سبھی ذاتِ باری تعالیٰ پر دال ہیں اور ذات دوسرے اسم کے معنی کو بھی مستلزم ہے لیکن یہ لزوم کے ساتھ اور جہاں تک ہر اسم کی اپنی خاصیت اور ذات پر مجموعی دلالت تو یہ بالمطابقت ہے اور دونوں میں سے ایک پر ضمنی دلالت ہے

تو داعی کا (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ) کہنا ان چاروں کلمات کے معنی کو متضمن ہے جن کی بابت ارشاد ہوا کہ قرآن کے بعد یہ افضل ترین کلمات ہیں اور یہ کلمات اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عُلیا کے معانی کو مستلزم ہیں کہ ان میں کمال مدح ہے اور قولہ: (اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) میں اپنے حال کی حقیقت کا اعتراف ہے، بندوں میں سے کسی کو حق نہیں کہ اس وصف سے اپنے آپ کا تبریہ کرے بالخصوص رب تعالیٰ سے مناجات کے مقام میں! صحاح میں مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا کسی کے لئے روا نہیں کہ کہے میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اور فرمایا جس نے کہا میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے جھوٹ کہا تو جس نے ظن کیا کہ وہ یونس بن متی سے بہتر ہے اس طور کہ اس کے خیال میں اس کے ذمہ نہیں کہ اعتراف کرے کہ اپنی جان پر ظلم کیا ہے تو اس نے جھوٹ کہا، اسی لیے سادات الخلائق۔ اور ان کے خاتم حضرت محمدؐ ہیں۔ اس مقام میں اپنے آپ کو حضرت یونس سے افضل قرار نہ دیتے تھے بلکہ وہی بات کہتے تھے جو ابوالبشر حضرت آدم نے کہی۔

فصل

جہاں تک سائل کا قول کہ **یہ دعا کیونکر کشفِ ضر کی موجب ہے؟** تو یہ اس لئے کہ ضر کا کشف نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ جیسے کہا:
(وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ) [یونس : ۱۰۷] (اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اُس کے سوا اس کا کوئی دُور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنی چاہے تو اُس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں) گناہ ضر کا سبب بنتے ہیں اور استغفار اس کے اسباب کا ازالہ کرتا ہے جیسے کہا:
(وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ)[الأنفال : ۳۳] (اور اللہ ایسا نہیں کہ وہ بخشش مانگیں اور اُنہیں عذاب دے) تو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ مستغفر کو عذاب نہیں دیتا، ایک حدیث میں ہے جس نے کثرت سے استغفار کیا اللہ اس کے لئے ہر پریشانی سے چھٹکارا پانے کی سبیل مہیا کر دے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان تک نہ ہوگا، فرمایا:
(وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ) [الشوری : ۳۰] (اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے افعال سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے) تو قولہ:(اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) گناہ کا اعتراف ہے اور یہ استغفار ہے تو یہ اعتراف طلبِ مغفرت کو متضمن ہے اور قولہ:(لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ) توحیدِ الوہیت کی تحقیق ہے، خیر کے لئے کوئی موجب نہیں مگر اللہ کی مشیت تو جو وہ چاہے وہی ہوگا اور جو نہ چاہے وہ نہ ہوگا، رکاوٹ بندے کے گناہوں کی جہت سے ہوتی ہے اور جو بندے کی قدرت سے خارج ہو تو وہ اللہ سے ہے اگرچہ بندوں کے تمام افعال اللہ کی تقدیر سے ہیں لیکن اللہ نے فعلِ مامور اور ترکِ محظور کو نجات اور سعادت کا سبب بنایا ہے تو توحید کی شہادت خیر کے باب کی مفتاح (کنجی) اور گناہوں سے استغفار کرنا شر کے دروازے کو بند کرتا ہے لہذا بندے کے لئے لائق ہے کہ اپنی امید کو معلق نہ کرے مگر اللہ کے ساتھ، اللہ سے یہ خوف نہ کرے کہ وہ اس پر ظلم کرے گا، اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا البتہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں بلکہ اسے یہ خوف ہونا چاہیے کہ وہ اس کی گناہوں کی اسے سزا دے گا اور یہی حضرت علی سے منقول اس قول کا معنی ہے کہ بندہ امید نہ رکھے مگر اپنے رب سے اور خوف نہ کھائے مگر اپنے گناہ سے، ایک مرفوع حدیث میں ہے نبی اکرم ایک بیمار کی عیادت کو تشریف لے گئے، فرمایا اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو؟ کہا اللہ سے مجھے امید ہے اور اپنے گناہوں سے خائف ہوں، فرمایا یہ دو صفتیں کسی بندے کے دل میں جمع نہ ہوں گی اس قسم کے مقام میں مگر اللہ اسے وہ عطا کر دے گا جس کی اس نے امید لگائی ہوئی ہے اور جس سے خائف ہے اس سے اسے امن دے گا

تو لازم ہے کہ امید اللہ ہی سے باندھی جائے، اسے کسی مخلوق سے متعلق نہ کرے اور نہ بندے کی قوت اور عمل کے ساتھ کہ غیر اللہ کے ساتھ امید معلق کرنا شرک ہے، ہاں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امیدیں پوری ہونے کے اسباب مہیا فرماتا ہے لیکن سبب بنفسہ مستقل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کسی معاون کا ہونا اور رکاوٹوں کا دور کیا جانا ضروری ہے اور یہ سب کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر

اللہ کی مشیت کے ساتھ، اسی لئے کہا گیا ہے کہ اسباب کی طرف التفات شرک فی التوحید اور اسباب کا محو نقص فی العقل ہے اور کلیۃً اسباب سے اعراض شرع میں قدح ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا:

(فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ) [الانشراح : ۷۔۸] (پس جب فارغ ہو تو محنت کیا کرو۔ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو) تو حکم دیا کہ اکیلے اس کی طرف ہی رغبت کی جائے، فرمایا:

(وَعَلَی اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ)[المائدة : ۲۳] (اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اگر صاحبِ ایمان ہو) دل اسی پر توکل کرے گا جس سے اس کی امید بندھی ہو تو جس نے اپنی طاقت، عمل، علم، حال، دوست، قرابت دار، پیر، بادشاہ یا مال سے اللہ کی طرف غیر ناظر ہوتے ہوئے امید وابستہ کی اس میں اس سبب پر ایک نوعِ توکل پایا گیا، کسی نے بھی کسی مخلوق سے امید نہ باندھی یا اس پر توکل نہ کیا مگر اس کا گمان خاسر و خائب ہی ہوا اور وہ مشرک ہے، فرمایا:

(وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ) [الحج : ۳۱] (اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرے تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے پھر اُس کو پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کسی دُور جگہ اُڑا کر پھینک دے) مشرکین مخلوق سے خائف ہوتے ہیں اور انہی سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں تو ہمیشہ مرعوب اور خوفزدہ رہتے ہیں جیسے کہا:

(سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا) [آل عمران : ۱۵۱] (ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیں گے کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس کی اُس نے کوئی بھی دلیل نازل نہیں کی) شرک سے خالص کے لئے امن حاصل ہے، فرمایا:

(اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ)[الأنعام : ۸۲] (جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا اُن کیلئے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں) نبی اکرم نے اس آیت میں مذکور ظلم کو شرک کے ساتھ مفسَّر کیا تھا چنانچہ بخاری میں ابن مسعود سے روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کو بہت دھچکا لگا، کہنے لگے ہم میں سے کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کما تا ہو؟ اس پر نبی اکرم نے فرمایا یہ شرک ہے، کیا تم نے ایک مردِ صالح کا یہ قول نہیں سنا:

(اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) [لقمان : ۱۳] (بے شک شرک بڑا ظلم ہے) فرمایا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا) إلی قولہ : (وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ) [البقرة : ۱۶۵۔۱۶۷] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں۔۔۔ اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے) اور فرمایا:

(قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ

يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا) [الإسراء : ٥٦۔٥٧] (کہو جن لوگوں کی نسبت تمہیں گمان ہے اُن کو بلا دیکھو وہ تم سے تکلیف کے دور کرنے یا اُس کو بدل دینے کا کچھ اختیار بھی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں ہو خود اپنے رب کے ہاں ذریعہ تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کون اُن میں زیادہ مقرب ہے اور اُس کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں اور اُس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں بیشک تمہارے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے) لہذا اللہ تعالی اسباب کا ذکر تو کرتا ہے مگر حکم دیتا ہے کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ سب امیدیں اللہ ہی سے باندھی جائیں (میدانِ بدر میں) جب فرشتے اتارے تو فرمایا:

(وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ)[آل عمران : ١٢٦] (اور اس مدد کو تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بشارت بنایا کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو ورنہ مدد تو اللہ ہی کی ہے جو غالب (اور) حکمت والا ہے)

(اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ)[آل عمران : ١٦٠] (اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے اور مومنوں کو چاہیئے کہ اللہ ہی پر بھروسا رکھیں) پہلے ذکر گزرا کہ دعا کی دو انواع ہیں: ایک دعائے عبادت اور دوم دعائے طلب وسوال، دونوں درست نہیں مگر اللہ کے لئے ہی تو جس نے اللہ کے ساتھ اور الہ (بھی) کیا وہ مذموماً اور مخذوماً بیٹھا رہ جائے گا، راجی سائل اور طالب ہے لہذا درست نہیں کہ اللہ کے سوا کسی سے امید وابستہ کی جائے اور کسی غیر اللہ کے سامنے دستِ دعاء وسوال دراز کیا جائے، نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث میں فرمایا جو مال سے تمہارے پاس آئے اور تم سائل اور طمع لگائے ہوئے نہیں تھے تو اسے لے لو اور جو نہیں تو اس کے پیچھے اپنے نفس کو مت لگاؤ تو طمع دل میں اور سوال نوک بر زبان ہوتا ہے، صحیحین میں ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ ہم فاقہ کشی کا شکار بنے، میں نبی اکرم کے پاس سائل اور طالب بن کر آیا تو آپ کو پایا کہ لوگوں کو وعظ کر رہے ہیں اور دوران کلام یہ فرمایا اے لوگو بخدا ہمارے پاس جو مال ہوگا ہم اسے ذخیرہ نہ کریں گے اور جو مستغنی بنے اللہ اسے غنی کرے گا اور جو بچنے میں راغب ہوا اللہ اسے بچائے گا اور جو اپنے آپ کو صبر کا خوگر بنائے گا اللہ اسے اس کی توفیق مرحمت کرے گا، کسی کو صبر سے بہتر اور اوسع عطاء نہیں ملی اور استغناء یہ ہے کہ دل میں کسی سے کوئی امید نہ رکھے کہ اسی کا خیال اور طمع رہے، استعفاف یہ ہے کہ زبان کے ساتھ کسی سے سوال نہ کرے اسی لئے احمد بن حنبل سے جب توکل بارے سوال ہوا تو کہا یہ خلق کی طرف استشراف کا قطع ہے یعنی دل میں یہ خیال ہی نہ ہو کہ کوئی مخلوق فائدہ دے گی یا کسی سے کوئی نفع ملے، کہا گیا اس کی کیا دلیل؟ کہا حضرت خلیل کا قول جب حضرت جبریل نے ان سے کہا تھا (یہ جب انہیں آگ میں ڈالا جانے لگا): کیا میرے لائق کوئی خدمت ہے؟ کہا: (اَمَّا اِلَيْكَ

فَلَا) (جہاں تک تم ،تو نہیں) تو یہ اور اس طرح کی ادلہ واضح کرتی ہیں کہ آدمی نافع کی طلب اور ضار کے دفع میں اپنے دل کو سوائے اللہ کے کسی کی طرف متوجہ نہ کرے اسی لیے حضرت یونس نے حالتِ کرب میں کہا: (لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ الخ)

اس کا مثل جو صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی اکرم کرب اور پریشانی کے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے: (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَ رَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ) تو ان کلمات میں توحید کی تحقیق اور بندے کا اپنے رب سے تألّہ اور امیدوں کا اس وحدہ لاشریک لہ کے ساتھ باندھنا ہے، یہ بظاہر خبریہ الفاظ ہیں مگر طلب کو متضمن ہیں،لوگ اگرچہ اپنی زبانوں کے ساتھ (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ) کہتے ہیں لیکن دل سے مخلص ہوکر یہ کہنا ایک اور ہی حقیقیت کا حامل ہے (بقول حفیظ جالندھری: زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں) توحید کی تحقیق کے بحسب ہی اللہ تعالی کی طاعت کی تکمیل ہوتی ہے،فرمایا:

(اَ فَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ) [الجاثیۃ : ۲۳] (بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے کے اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اب اللہ کے سوا اس کو کون راہ پر لاسکتا ہے) تو جس نے اپنی خواہش کو اپنا الہ بنا لیا تو وہ ذاتی غرض وہویٰ کا بندہ بن بیٹھا، یہی مشرکین کا حال تھا کہ جو چیز انہیں اچھی لگتی اسے ند بنا لیتے اور اللہ کی حب کی طرح اس سے لگاؤ اور محبت رکھتے، اسی لئے حضرت خلیل نے کہا:

(لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ)[الأنعام : ۷۶] (مجھے غروب ہو جانے والے پسند نہیں) ان کی قوم کو صانع کا انکار نہ تھا لیکن وہ اس شئ کی عبادت کرنے لگ پڑے جو انہیں اچھی لگتی اور اسے اپنے لئے نافع اور مفید خیال کرتے مثلاً چاند وسورج اور ستارے اور حضرت خلیل واضح کیا کہ یہ سب آفل ہیں اور آفل اپنے عابد سے غائب ہو جاتا ہے اور حواجب دونوں کے درمیان سد بن جاتے ہیں تو تب نہ وہ عابد کو دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی کلام سن سکتے ہیں اور نہ اس کے حال سے واقف ہوں گے پھر نافع اور ضار بننا چہ معنی دارد؟ اور اس حالت میں کس وجہ سے اس کی عبادت کرے گا؟ بندہ جوں جوں لا الہ الا اللہ کے قول میں اخلاص کو محقق کرے اس کے دل سے اللہ کے ماسوا بارے تألہ کے جذبات ختم ہوتے جائیں گے اور معاصی اور ذنوب اس کا ساتھ چھوڑتے جائیں گے جیسے کہا:

(کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ)[یوسف : ۲۴] (یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہیں) تو ان سے صرفِ سوء وفحشاء کی علت یہ بیان کی کہ وہ اللہ کے مخلص بندوں میں سے تھے وہ جن کے بارہ میں ارشاد ہوا:

(اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ)[الحجر : ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں) شیطان نے کہا تھا:

(فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ) [ص : ۸۲] (مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو بہکا تا رہوں گا) صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جس نے اخلاصِ دل سے لا الہ الا اللہ کہا اللہ نے اسے آگ پر حرام کر دیا تو اخلاص آگ میں دخول کے اسباب کی نفی کرتا ہے تو جو قائلینِ لا الہ الا اللہ میں سے آگ میں داخل ہوا اس نے آگ پر حرام کرنے کا موجب یہ اخلاص محقق نہ کیا بلکہ اس کے دل میں شرک کی ایک نوع تھی جس کے سبب وہ آگ کا ایندھن بنا اور مروی ہے کہ اس امت میں شرک چیونٹی کے چلنے کی آواز سے بھی اخفیٰ ہے اسی لئے بندہ ما مور ہے کہ ہر رکعت میں (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) کہے! شیطان شرک کا امر دیتا ہے اور نفس اس میں اس کی طاعت کرتا ہے تو نفس مسلسل غیر اللہ کی طرف ملتفت رہتا ہے، یا تو اس کے خوف کی وجہ سے اور یا اس سے امید بندھی ہونے کی رو سے تو بندے کو ہمیشہ اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی توحید کی شرک کے شوائب سے خلاصی کرے، ابن ابو عاصم وغیرہ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا شیطان کہتا ہے میں نے لوگوں کو گناہوں کے ساتھ اور انہوں نے مجھے لا الہ الا اللہ اور استغفار کے ساتھ ہلاک کر ڈالا، جب میں نے یہ صورتحال ملاحظہ کی تو انہیں نفسانی خواہشات کے پیچھے لگا دیا اور اب وہ گناہ کرتے ہیں مگر استغفار نہیں کرتے کیونکہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کر رہے ہیں

تو خواہش پرست جو بغیر اللہ کی طرف سے ہدایت کے اپنی خواہش کی اتباع کرتا ہے اس کے لئے ان لوگوں سے نصیب ہے جنہوں نے اپنا الہ اپنی خواہش کو بنا لیا ہے تو اس میں ایسا شرک ہوا جو استغفار سے اس کے لئے مانع بنا لیکن جس نے توحید و استغفار کو محقق کیا تو لازم ہے کہ اس سے شرک کا رفع ہو، اسی لئے ذوالنون نے کہا: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) لہذا اللہ نے کئی مقامات میں توحید کو استغفار کے ساتھ مقرون کیا ہے جیسے اس کا قول:

(فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) [محمد : ۱۹] (پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے لئے استغفار کرو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے بھی)

(اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ) [هود: ۲-۳] (کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور میں اس کی طرف سے تمہیں ڈرسنانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو اور اس کے آگے توبہ کرو)

(وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ) الی قوله : (وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ) [هود : ۵۰- ۵۲] (اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو انہوں نے کہا اے قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الہ نہیں ۔۔ اور اے قوم اپنے رب سے بخشش مانگو اور توبہ کرو) خاتمہ مجلس کی یہ دعا بیان کی: (سُبْحَانَكَ اللّٰهُ وَ بِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ) اگر وہ مجلسِ رحمت تھی تو یہ ایسے جیسے اس پر مہر

ثبت کر دی اور اگر لغو اور فضولیات کی مجلس تھی تو یہ کلمات کفارہ بن گئے، یہ بھی مروی ہے کہ ان کلمات کو وضوء کے آخر میں یہ دعا پڑھنے کے بعد پڑھا جائے: (اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ) اور یہ توحید اور استغفار کو متضمن ہے تو اس کا آغاز وہ دو گواہیاں ہیں جو دین کی اصل اور اس کی اساس اور جماع (یعنی لبِ لباب) ہیں تو سارا دین ان دو گواہیوں میں داخل ہے کہ ان کا مضمون ہے ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور یہ کہ اس کے رسول کی طاعت کریں اور دین سب کا سب اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کے ساتھ اللہ کی عبادت میں داخل ہے! تمام واجبات اور مستحبات اس طاعت میں داخل ہیں، مروی کہ کہے: (سُبْحَانَكَ اللّٰه وَ بِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ) یہ کفارۂ مجلس ہے تو یہ مجلس اور وضوء کے آخر میں مشروع ہے، نبی اکرم جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے نماز کا اختتام سلام سے قبل ان دعائیہ کلمات پر کیا کرتے تھے: (اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَ مَا اَسْرَرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَ مَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدم وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ) اور یہاں دعا کو مقدم کیا اور توحید کے ساتھ اسے ختم کیا اس لئے کہ نماز کے آخر میں دعا کا حکم ہے، ختم توحید کے ساتھ کیا تا کہ نماز کا ختم افضل الامرین کے ساتھ ہو جو کہ توحید ہے بخلاف اس کے جس میں اس کا قصد نہیں کیا گیا تو وہاں توحید کی تقدیم افضل ہے

جنسِ دعا جو کہ ثناء اور عبادت ہو اس دعا سے افضل ہے جو سوال وطلب ہے، اگر کسی خاص جگہ (یعنی مقتضی الحال کے تحت) مفضول کبھی فاضل سے افضل ہو جاتا ہے (یعنی وقتی طور پر) کسی سبب کی رو سے اور کئی اور اشیاء کے مدِ نظر جیسے نماز قراءت سے افضل ہے اور قراءت اس ذکر سے جو ثناء ہے اور ذکر اس دعاء سے افضل ہے جو سوال ہے اس کے باوجود مفضول کے لئے کئی ایسے اماکن، ازمان اور احوال ہیں جن میں وہ فاضل سے افضل ہو جاتا ہے لیکن دین کا اول، اس کا آخر، اس کا ظاہر اور باطن توحید ہے اللہ کے لئے کلی اخلاصِ دین لا الہ الا اللہ کی تحقیق ہے تو مسلمان اگرچہ زبان کے ساتھ اس کے اقرار میں مشترک ہیں لیکن وہ اس کی تحقیق میں اس قدر باہم متفاوت ہیں کہ اس کا ضبط ناممکن ہے حتی کہ ان میں سے کثیر ظن کرتے ہیں کہ توحیدِ مفروض اس امر کا اقرار اور تصدیق ہے کہ اللہ ہر شئ کا خالق اور رب ہے، یہ توحیدِ ربوبیت کے اقرار جو مشرکینِ عرب کو بھی تھا کے درمیان اور توحیدِ الوہیت کے اقرار جس کی طرف رسول اللہ نے انہیں دعوت دی تھی، کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے تو یوں قولی اور عملی توحید کے جامع نہیں بنتے تھے، مشرک اس بات کے قائل نہ تھے کہ اس جہان کے دو خالق ہیں یا اللہ کے سوا کوئی اور رب بھی ہے، ایسا جس نے کوئی شئ الگ طور سے تخلیق کی ہے بلکہ ان کا عقیدہ وہ تھا جو اللہ نے ان آیات میں ذکر کیا:

(وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) [لقمان: ۲۵] (اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور

زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ نے)

(وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ)[یوسف : ۱۰۶] (اوران کے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر شرک کرتے ہیں)

(قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھَآ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ـــ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ) [المؤمنون: ۸۴۔۸۹] (پوچھو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا ہے؟ ۔جھٹ بول اٹھیں گے کہ اللہ کا ۔کہو پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟ ـــ تو کہو پھر کیوں تم مسحور ہوئے جاتے ہو؟) اور وہ اپنے اس اقرار کہ اللہ وحدہ ہی تمام کائنات کا خالق ہے کے باوجود اس کے ساتھ کئی اور آلہہ بنائے ہوئے تھے جنہیں وہ اللہ کے پاس اپنے سفارشی قرار دیتے تھے اور کہتے تھے ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں اور ان سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے تھے محبت،عبادت، دعا اور سوال میں اشتراک اعتقاد اور اقرار میں اشتراک سے دیگر ہے، جیسے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا الخ) تو جس نے کسی مخلوق سے محبت کی اس طرح کی محبت جو وہ خالق سے کرتا ہے تو وہ مشرک ہے اگرچہ مقر ہو کہ اللہ ہی اس کا خالق ہے تو یہ ان کی مثل ہے جنہوں نے اللہ کے سوا انداد بنا لئے تھے جن سے اللہ سے محبت کرنے کی مثل وہ محبت کرتے تھے اسی لئے اللہ اور اس کے رسول نے فرق کیا اس کے درمیان جو اللہ کے لئے کسی مخلوق سے محبت کرے اور اس کے درمیان جو اللہ (سے محبت) کے ساتھ کسی مخلوق سے بھی اس طرح کی محبت کرے تو اول شخص کا حقیقی محبوب اور معبود اللہ ہے جو اس کی محبت و عبادت کا منتہا ہے،اس طرح کی محبت وہ اس کے غیر سے نہیں کرتا لیکن جب جانا کہ اللہ اپنے انبیاء اور صالح بندوں سے محبت کرتا ہے تو اس کی خاطر ان سے محبت کی، اسی طرح جب جانا کہ اللہ کو فعلِ مامور اور ترکِ محظور سے محبت ہے تو خود بھی اس سے محبت کی تو اس کی یہ محبت اللہ سے محبت کے تابع، اس کی خاطر، اس کی فرع اور اسی محبت میں داخل ہے بخلاف اس کے جس نے (اللہ کی خاطر نہیں بلکہ) اللہ کے ساتھ ساتھ کسی مخلوق شئ سے محبت کی اور اسے اللہ کا ند بنا لیا، امید اس سے باندھی اور اس سے خائف ہوا یا اس کی طاعت کی بغیر یہ جانے اور جستجو کئے کہ آیا اس کی طاعت اللہ کی طاعت ہے؟ اور اس کی بابت یہ عقیدہ بنا لیا کہ اللہ کے ہاں اس کے حق میں سفارش کرے گا، بغیر یہ جانے کہ کیا اسے اللہ کی طرف سے اذنِ شفاعت حاصل بھی ہے یا نہیں؟ فرمایا:

(وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ) [یونس : ۱۸] ا(اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ اُن کا کچھ بگاڑ ہی سکتی ہیں اور نہ کچھ بھلا ہی کر سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں) اور فرمایا:

(اِتَّخَذُوْآ اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)[التوبة : ۳۱] (انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا معبود بنا لیا حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے) عدی بن حاتم نے اس موقع پر نبی اکرم سے کہا تھا کہ ہم ان کی عبادت تو نہ کرتے تھے؟ آپ نے جواب فرمایا تھا انہوں نے اپنی طرف سے ان کے لئے بعض امور و اشیاء کو حلال اور بعض کو حرام کیا اور انہوں نے ان کی طاعت کی تھی تو یہ ان کی عبادت ہی تو تھی، فرمایا:

(اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ) [الشورى : ۲۱] (کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا)

(وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا) [الفرقان : ۲۷۔۲۹] (اور جس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹ کاٹ کھائے گا کہ اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے مجھ کو نصیحت کے میرے پاس آنے کے بعد بہکا دیا اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے)

رسول کی طاعت واجب ہے کیونکہ جس نے رسول کی طاعت کی اس نے اللہ کی طاعت کی تو حلال وحرام وہی جو رسول نے کیے اور دین وہی جو رسول نے مشروع کیا اور رسول کے سوا علماء، مشائخ، امراء اور حکام کی طاعت تب واجب ہوگی جب ان کے فرامین اللہ کی طاعت میں ہوں گے تو اس صورت میں یہ حقیقۃً ان کی نہیں بلکہ اللہ ورسول ہی کی طاعت ہے کیونکہ انہوں نے یہی حکم دیا ہے چنانچہ کہا:

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ) [النساء : ۵۹] (اے مومنو اللہ اور اُس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ اختیار ہیں اُن کی بھی) اولی الامر سے قبل (اَطِيْعُوْا) کے لفظ کا اعادہ نہیں کیا بلکہ ان کی طاعت کو رسول کی طاعت میں داخل کیا اور رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے، رسول کی طاعت میں فعل کا اعادہ کیا ہے اولی الامر کی طاعت میں نہیں، تو رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے! جب رسول کسی بات کا حکم دیں تو کسی کے لئے روا نہیں کہ دیکھے آیا اللہ نے اس کا حکم دیا ہے یا نہیں، لیکن جب اولی الامر کوئی حکم دیں تو دیکھنا ہوگا آیا ان کا یہ حکم قرآن وسنت کے برخلاف تو نہیں؟ کیونکہ کبھی وہ اللہ کی معصیت کا حکم بھی دے سکتے ہیں (اور اس صورت میں ان کی طاعت جائز نہیں) تو ہر جو ان کی طاعت کرے وہ اللہ کا مطیع نہیں، ان کی مطلقاً طاعت نہیں کرنی بلکہ دیکھنا ہے کہ کیا ان کے احکام شریعت کے موافق ہیں یا مخالف؟ چاہے اولی الامر علماء ہوں یا امراء وحکام اور اس میں علماء (ائمہ) کی تقلید اور سرایا وغیرہ کے امراء بھی داخل ہیں، اسی روش کو اختیار کرنے

کے ساتھ دین سب کا سب اللہ کے لئے ہوگا، فرمایا:

(وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ) [الأنفال : ۳۹] (اور اُن لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے) نبی اکرم سے پوچھا گیا آدمی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی نیت سے یا (قبائلی و خاندانی) حمیت کے تحت اور ریاکاری کرتے ہوئے بھی لڑتا ہے تو ان میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟ تو فرمایا جس نے اس نیت اور قصد سے لڑائی کی کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو وہ اللہ کی راہ میں ہے پھر کثیر حضرات کسی خلیفہ، عالم، شیخ یا امیر سے ایسی (اندھی عقیدت اور) محبت کرتے ہیں کہ اسے اللہ کا ند بنا لیتے ہیں چاہے کہتے پھریں اللہ کی خاطر ان سے محبت کرتے ہیں تو جس نے کسی غیر رسول بارے یہ وطیرہ اپنایا کہ جو بھی وہ حکم دے اس کی طاعت واجب ہے اگرچہ ظاہر و باہر اللہ و رسول کی تعلیمات کے بر خلاف ہو تو یہ بھی انہیں اللہ کا ند بنا لینے کے مترادف ہے، ان کی یہ روش نصاریٰ کی حضرت مسیح بارے روش کے مشابہ ہے جو ان سے دعا کرتے اور ان کے ساتھ استغاثہ کرتے ہیں گویا انہیں اللہ و رسول کا مقام اور درجہ دے دیا تو یہ وہ شرک ہے جو اپنے اہل کو اس فرمانِ خداوندی کے تحت داخل کرتا ہے: (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا الخ) توحید اور شرک دل کے اقوال اور اعمال دونوں میں ہوتے ہیں اسی لیے جنید نے کہا تھا: توحید دل کا قول اور توکل دل کا عمل ہے، ان کی مراد وہ توحید جو تصدیق ہے تو جب اسے توکل کے ساتھ مقرون کیا تو اسے اس کی اصل بنا دیا اور جب لفظِ توحید مفرداً ہو تو یہ دل کے قول اور عمل کو متضمن ہے اور توکل توحید کی تمامیت سے ہے اور یہ ایمان کے لفظ کی مانند تو اس کا جب مفرداً ذکر ہو تو اس میں باطنی اور ظاہری اعمال داخل ہوں گے اور کہا گیا ایمان قول اور عمل ہے یعنی دل اور زبان کا قول اور دل اور جوارح کا عمل، اسی سے ایک متفق علیہ حدیث میں نبی اکرم کا فرمان کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ۔ یا ستر کہا۔ شاخیں ہیں، اعلیٰ ترین لا الہ الا اللہ اور ادنیٰ ترین راستہ سے ایذا دینے والی چیز کا ہٹا دینا اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے، اسی سے یہ قولہ تعالیٰ ہے:

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ) [الحجرات : ۱۵] (مومن تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے لڑے یہی لوگ سچے ہیں)

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا) [الأنفال : ۲-۴] (مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اُس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جو نماز پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے خرچ

کرتے ہیں۔یہی سچے مومن ہیں)

(اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ) [النور: ۶۲] (مومن تو وہ ہیں جواللہ پراوراس کے رسول پرایمان لائے اور جب کبھی ایسے کام کے لئے جوجمع ہوکر کرنے کا ہو پیغمبرالٰہی کے پاس جمع ہوں تو ان سے اجازت لئے بغیر چلے نہیں جاتے) ایمانِ مطلق میں اسلام بھی داخل ہے جیسے صحیحین کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے عبدالقیس کے وفد سے کہا: میں تمہیں ایمان باللہ کا حکم دیتا ہوں، کیا جانتے ہو ایمان باللہ کیا ہے؟ اس امر کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا اور یہ کہ مالِ غنیمت کا خمس دو،اسی لئے بعض سلف نے کہا ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم مومن نہیں، ہاں جب ایمان کا لفظ عمل یا اسلام کے ساتھ مقرون ہوتب دونوں کے مابین تفرقہ کیا جائے گا جیسے اس آیت میں ہے:

(اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) [البقرة: ۲۷۷] (جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے) اور یہ قرآن میں کثیر ہے جیسے حدیثِ جبریل میں، جب انہوں نے آپ سے الگ الگ، اسلام،ایمان اوراحسان بارے سوال کیا تو فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور محمد رسول اللہ ہیں، نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور حج بیت اللہ کرو! کہا ایمان کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتب، اس کے رسل، بعث بعد الموت اور خیر وشر تقدیر پر ایمان لاؤ، کہا احسان کیا ہے؟ فرمایا کہ اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، اگر یہ نہیں تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے، تو اس نص میں اسلام اور ایمان کے مابین تفریق کی جب دونوں کا اکٹھے ذکر آیا اور جب اس کا اِفراد بالذکر کیا تو اسلام کو ایمان میں داخل کیا، اسی طرح عمل کا لفظ ہے تو اسلامِ مذکور عمل سے اور عملِ ظاہر دل کے ایمان کا موجب اوراس کا مقتضا ہے، جب دل کا ایمان حاصل ہوتو ضرورۃً جوارح کا عمل بھی حاصل ہوگا، دل کے ایمان میں دل کی تصدیق اور دل کا انقیادضروری ہے وگرنہ اگر دل تصدیق کرے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں مگر آپ سے بغض رکھے، حسد کرے اور آپ کی متابعت سے استکبار کرے تو (اس کا مطلب ہوا کہ) اس کا دل مومن نہیں، ایمان اگرچہ تصدیق کو متضمن ہے مگر یہ اس کا مترادف نہیں تو ہر کسی شیٔ کی تصدیق کرنے والے کی نسبت یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ اس کے ساتھ مومن ہے! تو اگر کہے میں تصدیق کرتا ہوں کہ ایک دو کا نصف ہے اور آسمان ہمارے اوپر اور زمین ہمارے نیچے ہے اوراس کے نحو جو لوگوں کے مشاہدہ اور علم میں ہے تو اس کی نسبت یہ نہ کہا جائے گا کہ اس کا ان باتوں پر ایمان ہے بلکہ اس کا استعمال نہ ہوگا مگر اس کے بارہ میں جو امورِ غائبہ میں سے کسی شیٔ کی بابت اِخبار دے جیسے برادرانِ حضرت یوسف نے کہا تھا:

(وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا) [یوسف: ۱۷] (اور آپ ہمارا یقین کرنے والے نہیں) کیونکہ انہوں نے اس امر کی خبر دی تھی جو ان کے والد سے غائب تھی، وہ (آمَنَ لَهٗ) اور (آمَنَ بِهٖ) کے مابین تفرقہ کرتے ہیں تو اول مخبر اور دوم مخبر بہ کی نسبت کہا جاتا ہے جیسے

برادرانِ یوسف نے کہا، اور فرمایا:

(فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ) [یونس : ۸۳] (تو موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم کے چند افراد) ایک جگہ کہا:

(وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ) [التوبة : ۶۱] (اور ان میں بعض ایسے ہیں جو پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے، کہہ دو کہ کان تمہاری بھلائی کے لئے، وہ اللہ کا اور مومنوں کا یقین رکھتا ہے) تو ایمان با اللہ اور ایمان للمومنین کے درمیان فرق کیا اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ آپ مومنین کی تصدیق کرتے ہیں جب وہ آپ کو کسی امر کی خبر دیتے ہیں اور جہاں تک ایمان باللہ تو یہ اس کے ساتھ اقرار کے باب سے ہے، اسی سے فرعون اور اس کے اہلِ دربار بارے اللہ تعالی کا یہ قول: (اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا) [المؤمنون: ۴۷] (کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں) ای: (نُقِرُّ لَهُمَا وَ نُصَدِّقُهُمَا) (یعنی ان کے لئے مقر بنیں اور ان کی تصدیق کریں) اور یہ قولہ:

(اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ) [البقرة : ۷۵] (کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے؟ (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلامِ الٰہی کو سنتے ہیں پھر اسے سمجھ لینے کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدلتے رہے ہیں) اور:

(فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ) [العنکبوت: ۲۶] (تو لوط ان پر ایمان لائے) اور دوسرے معنی سے یہ آیت:

(اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ)[البقرة: ۳] (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

(اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ) [البقرة : ۲۸۵] (رسول اس کتاب پر جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی، سب اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں)

(وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ) [البقرة : ۱۷۷] (ولیکن نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں) یعنی اس کے مقر ہوئے اور قرآن میں اس کا مثل کثیر ہے! یہاں مقصود اس امر کا ایضاح ہے کہ ایمان کا لفظ بعض الاخبار میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ امن سے ماخوذ ہے جیسے اقرار (قرّ) سے ماخوذ ہے تو مومن صاحبِ امن ہے جیسے مقر صاحبِ اقرار ہے تو اس ضمن میں اپنی تصدیق کے بموجب دل کا عمل ضروری ہے تو جب اس بات کا عالم ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے ساتھ آپ سے محبت اور تعظیم مقترن نہیں بلکہ آپ سے بغض وحسد کرتا اور آپ کی اتباع سے استکبار کرتا ہے تو یہ مومن بہ نہیں بلکہ کافر بہ ہے، اسی باب سے ابلیس، فرعون اور اہلِ

کتاب کا کفر ہے جنہیں اس طرح آپ کی معرفت حاصل تھی جیسے اپنی اولاد بارے ہے تو ابلیس نے خبر اور مخبر کی تکذیب نہ کی تھی بلکہ اپنے رب کے حکم سے استکبار اور سرتابی کی تھی، فرعون اور اس کی قوم بارے اللہ نے کہا:

(وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا) [النمل : ۱۴] (اور بے انصافی اور غرور سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے) حضرت موسیٰ نے اس سے کہا تھا:

(لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ) [الإسراء : ۱۰۲] (تمہیں علم ہے کہ آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا ان کو کسی نے نازل نہیں کیا سمجھانے کو) فرمایا:

(اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ) [البقرۃ : ۱۴۶] (جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں) تو مجرد دل کا حق کے بارہ میں علم اگر اس کے ساتھ اس کا اپنے علم کے بموجب عمل مقترن نہیں مثلا دل کی اس کے لئے محبت اور اتباع تو اس کا اسے کوئی نفع نہیں بلکہ روزِ قیامت عذاب کے لحاظ سے سب سے اشد وہ عالم ہوگا جسے اللہ نے اس کے علم نفع نہ دیا، نبی اکرم کی ایک دعا ہے: (اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَنَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَدُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ وَقَلْبٍ لَا يَخْشَعُ) (اے اللہ میں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو، ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو اور ایسے دل سے پناہ مانگتا ہوں جس میں خشیت نہ ہو)

لیکن جہمیہ نے ظن کیا کہ مجرد دل کا علم اور اس کی تصدیق ہی ایمان ہے اور جس کی بابت شرع نے دلالت دی کہ وہ مومن نہیں تو یہ اس کے دل کے عدم علم پر دال ہے، یہ شرعاً وعقلاً بڑی جہالتوں میں سے ہے اور اس کی حقیقت مومن اور کفر کے درمیان تسویہ کی موجب ہے اسی لئے وکیع بن جراح اور احمد بن حنبل وغیرہما ائمہ نے اس وجہ سے ان کے کفر کا اطلاق کیا تو معلوم امر ہے کہ انسان کبھی حق بات سے آشنا ہوتا ہے مگر کسی غرض کے مدِ نظر اس سے بغض کرتا ہے تو حق سے ہر مستکبر لازم نہیں کہ اس سے ناواقف ہو اور تب ایمان کے ضمن میں دل کی تصدیق اور اس کا عمل ہونا ضروری ہے اور یہی سلف کے قول: ایمان قول وعمل ہے کا معنی ومطلب ہے! پھر جب دل تصدیق اور ارادہ کو متضمن محبتِ تامہ کے ساتھ متحقق ہو تو ظاہری افعال کا وجود لازم ہے کہ جازم ارادہ کے ساتھ اگر تام قدرت بھی مقترن ہو تو قطعاً وجودِ مراد لازمی ہے، فعل کا وجود عدم کمالِ قدرت یا عدم کمالِ ارادہ کے پیش نظر ہی منتفی ہوگا وگرنہ اگر یہ کامل ہے تو فعلِ اختیاری کا وجود واجب ہے جب دل اس امر کا تام اقرار کرے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور آپ سے تام محبت ہو تو ناممکن ہے کہ قدرت کے باوجود کلمہ نہ پڑھے، ہاں اگر گونگا پن یا خوف وغیرہ کی رو سے اس سے عاجز ہے تو وہ اس کے ساتھ نطق پر قادر نہیں، ابو طالب اگرچہ واقف تھا کہ محمدؐ رسولِ برحق ہیں اور آپ سے بے تحاشا محبت بھی تھی تو یہ محبت اللہ کی خاطر نہ تھی بلکہ اس وجہ سے کہ آپ اس کے مرحوم بھائی کے بیٹے ہیں تو اس محبت کی اساس قرابت

داری تھی! تو جب آپ کے ظہور (یعنی غلبہ) کو عزیز رکھا تو اس وجہ سے جو اس کے لئے شرف اور ریاست کا حصول ہوگا تو اس کا اصل محبوب ریاست تھی اسی لیے جب بوقتِ وفات اسے تلقین کی کہ کلمہ پڑھ لے تو دیکھا کہ اس کا اقرار اس کے اس دین کا زوال ہے جو اسے عزیز ہے تو گویا اس کا دین اسے اپنے بھتیجے سے زیادہ عزیز تھا تبھی آپ کی بات نہ مانی، اگر آپ سے اس طرح کی محبت ہوتی جیسی ابوبکر کو تھی جن کی بابت اللہ نے کہا:

(وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى) [والليل : ١٧-٢١] (اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس سے بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ اس کا تزکیہ ہو۔ اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے رب الاعلیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے۔ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا) اور جیسے دیگر اہلِ ایمان کو تھی عمر عثمان اور علی وغیرہم کو تو قطعاً کلمہ پڑھ لیتا تو اس کی آپ سے محبت (مَعَ اللّٰہِ) تھی نہ کہ (لِلّٰہِ) اسی لیے ان کا رسول کی نصرت وحمایت میں کھڑے رہنا اللہ کے ہاں درجہِ قبولیت تک نہ پہنچا کیونکہ اسے اللہ کی (اور اس کے دین کی) خاطر نہ کیا تھا اور اللہ وہی عمل قبول کرتا ہے جس کے ساتھ خالص اس کی رضا کا قصد کیا گیا ہو جیسے صدیقِ اکبر بارے کہا: (اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ الخ) یہ ان ادلہ سے ہے جو ثابت کرتی ہیں کہ ایمان اور توحید کے ضمن میں دل کا عمل لازم ہے جیسے دل کی حب، تو لازم ہے کہ اللہ کے لئے اخلاصِ دین کیا جائے اور دین تبھی دین ہوگا جب عمل بھی ہو کیونکہ دین طاعت اور عبادت کو متضمن ہے، اللہ نے اخلاص کی دو سورتیں نازل کی ہیں ایک: (قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ) اور دوسری: (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد) ایک توحید قول وعلم میں اور دوسری توحید عمل وارادہ میں، تو اول میں کہا:

(قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ)[الأخلاص : ١-٤] (کہہ دو اللہ ایک ہے۔ معبود برحق جو بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں) تو حکم دیا کہ اس توحید کے قائل ہوں اور ثانی میں کہا:

(قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ) [الكافرون : ١-٦] (کہہ دو اے کافرو۔ جن کو تم پوجتے ہو ان کو میں نہیں پوجتا۔ اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے۔ اور جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں۔ اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔ تم اپنے دین پر میں اپنے دین پر) تو ایسی بات کہنے کا حکم دیا جو غیر اللہ کی عبادت سے براءت اور اللہ کے لئے اخلاصِ عبادت کی موجب ہے، عبادت کا اصل قصد اور ارادہ ہے، عبادت اگر مفرداً مذکور ہو تو اس میں توکل ونحوہ بھی داخل ہے، اگر اسے توکل کے ساتھ مقرون کیا جائے تو وہ اس کے لئے قسیم ہوگا جیسے ہم نے ایمان کے لفظ بارے ذکر کیا، فرمایا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) [والذاریات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں)

(یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ) [البقرة : ۲۱] (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا) تو یہ اور اس کے نحو میں فعلِ ماموراتِ اور ترکِ محظورات داخل ہے اور توکل اسی سے ہے، ذکر کیا: (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) اس کا مثل قرآن میں کثیر ہے، لفظ کی اپنے عموم اور خصوص میں دلالت اِفراد اور اقتران کے بحسب متنوع ہو جاتی ہے جیسے معروف اور منکر کا لفظ ہے تو کہا:

(كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) [آل عمران : ۱۱۰] (جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم اُن سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو) اور کہا:

(وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ) [التوبة : ۷۱] (اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے)

(یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ) [الأعراف: ۱۵۷] (وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں) تو منکر میں ہر وہ داخل ہے جو اللہ کو ناپسند ہے جیسے معروف میں ہر وہ داخل ہے جو اللہ کو پسند ہے، ایک جگہ کہا:

(اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ) [العنكبوت : ۴۵] (کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے) تو منکر کو فحشاء پر معطوف کیا اور یہاں منکر میں بغی بھی داخل ہے، ایک آیت میں اس کا ذکر الگ کیا تو کہا:

(اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ) [النحل : ۹۰] (اللہ تمہیں انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے) تو یہاں منکر کے ساتھ فحشاء اور بغی کو مقرون کیا، اسی باب سے فقراء اور مساکین کا لفظ ہے! جب دونوں میں سے کوئی مفرداً ذکر ہو تو دوسرا بھی اس میں داخل ہے، اگر دونوں کو اکٹھے ذکر کیا جائے تب دونوں کے مابین فرق ہوگا لیکن وہاں احد الاسمین دوسرے سے اعم ہے اور یہاں ان کے درمیان عموم اور خصوص ہے، تو اللہ وحدہ سے محبت، اس پر توکل اور اس کی خشیت ونحوہا سب اللہ کی توحید میں داخل ہیں، محبت بارے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة : ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو

اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں)

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) [التوبة : ۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبوب ہوں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے)

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ) [النور: ۵۲] (اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں) تو طاعت کو اللہ و رسول دونوں کے لئے جبکہ خشیت اور تقوی کو اکیلے اللہ کے لئے کیا، فرمایا:

(وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ) [التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ہمیں دے دیں گے اور ہمیں تو اللہ ہی کی خواہش ہے)

(فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ) [الانشراح : ۷۔۸] (تو جب فارغ ہوا کرو تو محنت کیا کرو۔ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو) تو تحسُّب (یعنی توکل) اور رغبت کو اللہ وحدہ کی طرف کیا، ان امور پر ایک جگہ تفصیل سے بحث کی ہے! یہاں مقصود یہ ہے کہ قائل کا (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ) کہنے میں الوہیت کا اللہ وحدہ کے لئے افراد ہے اور یہ اللہ کے لئے قولی و عملی تصدیق کو متضمن ہے، مشرکین مقر تھے کہ اللہ ہی ہر شئ کا رب ہے لیکن انہوں نے اس کے ساتھ اور آلہہ بھی بنائے ہوئے تھے تو وہ اللہ کو الوہیت کے ساتھ خاص نہ کرتے تھے، الوہیت کے ساتھ اس کی تخصیص موجب ہے کہ نہ عبادت کی جائے مگر اس کی اور اس کے غیر کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا جائے جیسے کہا: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) انسان کبھی اللہ وحدہ سے سوال او راس پر توکل کا قاصد ہوتا ہے لیکن ایسے امور میں جو اللہ کو پسند نہیں بلکہ وہ انہیں برا سمجھتا اور ان سے منع کرتا ہے تو یہ اگرچہ اپنے سوال اور توکل میں مخلص ہے لیکن اپنی عبادت اور محبت میں مخلص نہیں اور یہ کثیر فاسد تو جہات والوں اور اللہ و رسول کے امر کے مخالف کشوفات اور تصرفات والوں کا حال ہے، ان کی امور پر مدد کی جاتی ہے اور ان میں سے کثیر ان پر اللہ کے ساتھ استعانت کرتے ہیں لیکن جب یہ اللہ و رسول کے امر کے موافق نہیں تو ان کے لئے عاجلہ (یعنی دنیا کے کسی مفاد) سے حظ و نصیب تو حاصل ہوتا ہے مگر ان کی عاقبت بری اور ناخوشگوار ہوتی ہے، فرمایا:

(وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا) [الإسراء : ٦٧] (اور جب تمہیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو جن کو تم پکارتے ہو سب اس کے سوا گم ہو جاتے ہیں پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو! اور انسان ہے ہی ناشکرا)

(وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ) [يونس : ١٢] (اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دُور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا) ایک دوسرا گروہ ہے جو کبھی اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کا قصد کرتا ہے لیکن وہ اس پر توکل اور اس کے ساتھ استعانت کو محقق نہیں کرتے تو انہیں ان کی حسنِ نیت اور جذبہِ طاعت پر تو ثواب ملے گا لیکن اپنے مقصد میں یہ مخذول ہوں گے اسی لیے ایسے کئی گاہے ضعف و جزع اور گاہے عُجب پسندی میں مبتلا کر دئے جاتے ہیں تو اگر خیر سے اس کا مقصود حاصل نہ ہو تو یہ اس کے ضعف کی وجہ سے اور بسا اوقات ان کے لئے جزع حاصل ہوتا ہے، اگر مقصود مل جائے تو یہ اپنے نفس وقوت کی طرف نظر (یعنی اس پر مان) کرتے ہیں اور یوں عجب پسندی کا شکار بنتے ہیں، کبھی اپنے حال کے ساتھ اتراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حصولِ مراد ہوا لیکن خاذل ہوتے ہیں، فرمایا:

(وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ) إلى قوله : (ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)[التوبة : ٢٥ـ٢٧] (اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمہیں مدد دی ہے اور حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے۔۔۔ پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے مہربانی سے توجہ فرمائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے) کثیر اوقات لوگ ریاء اور عجب کے مابین جمع کرتے ہیں تو ریاء اشراک بالخلق کے باب سے ہے جبکہ عجب اشراک بالنفس ہے اور یہ مستکبر کا حال ہے، ریا کار (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) کا محقق (یعنی مصداق) نہیں اور عجب پسندی کا شکار ہے تو جو (اِيَّاكَ نَعْبُدُ) کا مصداق بنا وہ ریا سے نکل گیا اور جو (اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) کا مصداق بنا اسے عجب پسندی سے چھٹکارا ملا، ایک معروف حدیث میں ہے تین مہلک اشیاء ہیں: (شُحٌّ مُطَاعٌ وَ هَوىً مُتَّبَعٌ وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ) (طاعت کی جانے والی لالچ، پیچھے لگانے والی خواہش اور انسان کی خود پسندی) اور ان دونوں سے بدتر وہ ہے جس کی نہ عبادت اللہ کے لئے ہوئی اور نہ استعانت اس کے ساتھ ہوئی بلکہ غیر اللہ کا عابد اور غیر اللہ کے ساتھ مستعین ہے اور یہ دو وجہ سے مشرک ہے، ان میں کئی ایسے ہیں جن کا شرک شیاطین کے ساتھ ہے جیسے شیطانی احوال والے تو یہ وہ افعال بجالاتے ہیں جو شیاطین کو پسند ہیں مثلاً کذب و فجور اور ایسی ادعیہ کے ساتھ پکارتے ہیں جو شیاطین کو پسند ہیں اور ایسے منتر پڑھتے ہیں جن کے شیاطین مطیع ہیں

وہ جن میں اللہ کے ساتھ اشراک ہے جیسا کہ ایک جگہ اس کی مفصل بحث ہوئی

ان لوگوں کے لئے کبھی ایسے ما فوق الفطرت احوال حاصل ہوتے ہیں جنہیں اولیاء کی کرامات سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ در حقیقت یہ جادوگروں اور کاہنوں کے احوال میں سے ہیں لہذا قرآنی ایمانی احوال اور نفسانی اور شیطانی احوال کے مابین تفرقہ کرنا ضروری ہے، جہاں تک چوتھی قسم تو یہ اہلِ توحید ہیں جنہوں نے اللہ کے لئے اپنے دین کو خالص کیا، تو عبادت نہ کی مگر اس کی اور توکل نہ کیا مگر اس پر، مکروب کے (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ) کہنے میں کبھی وہ دونوں میں سے ایک نوع کا استحضار کئے ہوگا نہ کہ دونوں کا تو جس پر اللہ نے اتمام نعمت کیا ہو وہ توحید کو دونوں انواع میں مستحضر کرے گا، مکروب کی ساری توجہ دفعِ ضر اور جلبِ نفع پر لگی ہوتی ہے، تو کبھی وہ (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ) کہتا ہے یہ استشعار کرتے ہوئے کہ اس کے سوا کوئی کاشفِ ضر نہیں اور نہ اس کے سوا کوئی نعمت دے سکتا ہے تو یہ توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ سوال وطلب کا متحضر اور اس پر متوکل ہے اور اس توحیدِ الوہیت سے معرِض جو اللہ کو محبوب اور مَرضی ہے اور وہ اس کا حکم دیتا ہے اور وہ یہ کہ نہ عبادت کرے مگر اس کی اور نہ عبادت کرے مگر اس کی اور اس کے رسول کی طاعت کے ساتھ (یعنی مشروع نہ کہ خودساختہ طریقوں سے) تو جس نے اس کا قولہ: (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْتَ) میں استشعار کیا وہ اللہ کے لئے عابد اور اس پر متوکل ہوا اور اس فرمانِ خداوندی کا ممتثل بنا:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو) اور:

(عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ)[هود: ۸۸] (میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) اور:

(وَاذْكُرِاسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا)[المزمل: ۸۔۹] (تو اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ) پھر اگر اس کا مطلوب محرم ہے تو گناہگار ہوگا اگرچہ اس کی حاجت پوری کر دی گئی ہو اور اگر کسی مباح امر و شئ کا طالب تھا مگر اس کے ساتھ اس کا قصد اللہ کی طاعت وعبادت پر استعانت نہ تھا تو نہ وہ آثم ہوا اور نہ مُثاب، اور اگر ایسی چیز کا طالب تھا جو اللہ کی طاعت وعبادت پر اس کی مُعین بنے اس کے ساتھ استعانت کے قصد سے تب وہ ماجور اور مثاب ہوگا اور یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ العبد الرسول اور ان کے خلفاء کے درمیان اور النبی الملک کے درمیان فرق کیا جائے گا تو ہمارے نبی محترم کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہیں تو نبیِ مَلِک بن جائیں اور چاہیں تو عبد رسول تو آپ نے (حضرت جبریل کے مشورہ پر) العبد الرسول ہونا پسند فرمایا تو عبد رسول وہ جو وہی کام کرے جس کا حکم دیا گیا ہو، تو اس کا سب فعل اللہ کے لیے عبادت ہے، وہ محض عبد ہے اپنے مرسِل کے امر کا منفذ جیسے صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا بخدا میں نہ کسی کو عطا کرتا ہوں (یعنی اپنی مرضی سے) اور نہ کسی سے روکتا ہوں، میں تو قاسم ہوں (یعنی اللہ کا مال تقسیم کرنے والا) جہاں حکم ملے خرچ کرتا

ہوں، آپ کی اپنے قول: میں نہ کسی کو عطا کرتا ہوں الخ سے مراد قدراً اور کوناً اللہ کا اس سے افراد نہ تھا، دراصل آپ کی مراد اللہ کا اس کے ساتھ شرعاً اور دیناً افراد تھا یعنی میں نہیں عطا کرتا مگر اسے جسے عطا کرنے کا مجھے حکم دیا گیا اور اسے عطا نہیں کرتا جسے نہ دینے کا مجھے امر ہوا، تو میں اپنے اِعطاء ومنع میں اللہ کے حکم کا تابع ہوں، آپ صدقات، فیٔ اور غنیمت کا مال اس طرح تقسیم فرماتے تھے جیسے ترکہ اس کے وارثوں کے مابین تقسیم کیا جاتا ہے یعنی حکمِ ربانی کی رو سے ہی، اسی لئے مال کی جب اضافت اللہ ورسول کی طرف کی جائے تو اس سے مراد اللہ اور رسول کی طاعت میں جہاں اسے صرف کیا جانا واجب ہو، یہ نہیں مراد کہ وہ رسول کی مِلک بنا جیسا کہ بعض فقہاء سمجھے اور نہ یہ مراد ہے کہ خلقاً اور قدراً اللہ کے لئے مملوک ہو! تو تمام اموال اسی طرز پر ہیں اور یہ اس قولہ کی مثل ہے:

(قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ)[الأنفال : ١](کہہ دو کہ غنیمت اللہ اور اُس کے رسول کا مال ہے) اور:

(وَاعْـلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ) [الأنفال : ٤١] (اور جان رکھو کہ جو چیز تم غنیمت کے بطور حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا) الآیۃ اور:

(وَمَآ اَفَآءَ اللّٰـهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ --- مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی) [الحشر : ٦۔٧](اور جو اللہ نے اپنے پیغمبر کو ان لوگوں سے دلوایا ہے اس میں تمہارا کچھ حق نہیں کیونکہ اس کے لئے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ ۔۔ جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور قرابت والوں کے لئے ہے) الآیۃ، تو فیٔ کے بارے میں وہ ذکر گیا جو خمس بارے ذکر کیا تو **بعض فقہاء نے خیال کیا کہ رسول کی طرف اضافت مقتضی ہے کہ یہ آپ کی مِلک تھا** جیسے لوگوں کی املاک ہوتی ہیں پھر ان کے بعض نے کہا بدر کی غنائم رسول کی مِلک تھیں، بعض نے کہا فیٔ اور غنیمت کے مال کا چار بٹا پانچ رسول کی ملک تھا جبکہ بعض کا قول ہے کہ رسول خمس کے پانچویں حصہ کے حقدار ہوتے تھے اور بعض قائل ہوئے کہ آپ مالِ فیٔ کے خمس کے پانچویں حصہ کے حقدار ہوتے تھے (یعنی اتنی مقدار میں یہ آپ کی ذاتی مِلک ہوتا تھا) یہ مذکورہ اقوال شافعی، احمد اور ابوحنیفہ وغیرہم کے اصحاب (یعنی مقلدین) کے بعض حضرات کی کلام میں موجود ہیں اور یہ کئی وجوہ سے غلط ہے:

اول: کہ رسول اس طرح ان اموال کے مالک نہ ہوتے تھے جیسے لوگ اپنے اموال کے ہوتے ہیں اور نہ جیسے ملوک اپنی مِلک میں تصرف کیا کرتے ہیں، ان سب کو حق ہے کہ اپنے اموال کو مباحات میں صرف کریں، تو یا تو وہ اپنے مال کا مالک ہوگا لہذا اپنی خاص اغراض میں صرف کرے گا اور یا پھر اس کا ملک (یعنی بادشاہ، حکمران) ہوگا تو بادشاہت کی مصالح میں صرف کرے گا اور یہ ان انبیاء کا حال تھا جو (اَلنَّبِیُّ الْمَلِكُ) تھے جیسے حضرات داوٗدؑ اور سلیمانؑ، فرمایا:

(فَامْـنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ) [ص : ٣٩] (احسان کرو یا روک رکھو، کچھ حساب نہیں ہے) یعنی جسے چاہو عطا کرو اور

جس سے چاہو روک لو، تم پر کوئی حساب نہیں اور ہمارے نبی (اَلنَّبِیُّ الْعَبْدُ) تھے لہذا اسی کو عطا کرتے تھے جسے عطا کرنے کا حکم ملا اور اسے نہ دیتے جسے نہ دینے کا حکم ملا ہوتا تو آپ اموال کو صرف نہ کرتے تھے مگر اللہ کی عبادت اور طاعت میں ہی

دوم: کہ نبی کوئی ترکہ نہیں چھوڑتا کہ وارثوں میں تقسیم ہو، چاہے وہ بادشاہ رہے ہوں، انبیاء بارے مذکور ہوا کہ وہ وارث نہیں چھوڑتے اگرچہ ملوک انبیاء ہوں مگر وہ اس طرح کے مُلاک (مالک کی جمع) نہیں ہوتے جیسے دیگر لوگ ہوتے ہیں! پھر آنجناب تو صفوۃ الرسل اور عبد رسول تھے تو آپ مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟

سوم: نبی اکرم بقدرِ حاجت اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے اور بقیہ سب مال اللہ کی طاعت کے کاموں میں صرف کر دیتے، بچا کر نہ رکھتے تھے، مُلاک کی یہ حالت اور روش نہیں ہوتی بلکہ جو مال بھی آپ کے زیرِ تصرف تھا وہ اللہ کا مال تھا جو اس نے اپنے رسول کی ملک اور دسترس میں دیا ہوا تھا تاکہ آپ اس کے حکم کے تحت اس کی طاعت کے امور میں اسے خرچ کریں تو جو تقسیم آپ کرتے اسے ماننا واجب تھا جیسے دیگر تمام معاملات میں آپ کی طاعت واجب تھی کہ جس نے رسول کی طاعت کی اس نے اللہ کی طاعت کی، آپ اس ضمن میں بھی اللہ کے مبلغ کی حیثیت کے میں تھے، جو اموال آپ تقسیم کرتے تھے وہ دو وجہوں پر تھے: ایک، جس کے مستحق اور مصرف کا تعین کر دیا گیا تھا مثلا مواریث! دوم، جس میں آپ کو صوابدیدی اختیار دیا گیا تھا، اللہ کے جتنے اوامر ہیں ان میں سے بعض شرع کی رو سے محدود و متعین ہیں جیسے نمازِ پنجگانہ، کعبہ کے طواف کے سات چکر وغیرہ اور بعض ایسے تھے جو اپنی مقدار میں مامور کے اجتہاد کی طرف راجع تھے تو وہ اللہ کو پسند مصلحت کے بحسب اس میں کمی بیشی کے مجاز تھے تو ان میں سے کچھ وہ جو متفق علیہ ہیں اور کچھ وہ جن کے بارے میں اختلافِ آراء ہوا جیسے بیویوں کے لئے واجب نان نفقہ کے ضمن میں فقہاء کا باہمی اختلاف کہ کیا شرع نے اسے مقرر کیا ہے یا اس میں عرف مرجع ہے؟ تو لوگوں کے اختلافِ احوال کے مدِ نظر اس میں اونچ نیچ ہو سکتی ہے؟ جمہور فقہاء دوسرے قول پر ہیں اور یہی درست ہے نبی اکرم کے اس فرمان کے پیشِ نظر جو آپ نے حضرت ہند کو دیا کہ بقدرِ کفایت ازروئے عرف تم (شوہر کو بتلائے بغیر اس کے مال سے) لے سکتی ہو، خواتین کے لئے اپنے ایک معروف خطبہ میں کہا: تمہارا نان ونفقہ اور لباس حسبِ عرف ہے، اسی طرح واجب کفارات میں تنازُع ہوا کہ آیا یہ ازروئے شرع مقدر ہیں یا ازروئے عرف؟

تو ان اموال کی تقسیم میں جن کی اللہ اور رسول کی طرف اضافت کی گئی مرجع نبی اکرم کی سنت اور روش ہے بخلاف اس مال کے جس کے مستحقین کا تعین کر دیا گیا مثلا مرحوم کے ترکہ کے وارث (اور زکاۃ کے مصارف) اسی لئے حنین کے موقع پر آپ نے کہا تھا غنیمت کے مال میں میرے لئے تو بس پانچواں حصہ ہی ہے اور وہ بھی تمہاری طرف لوٹا دیا جاتا ہے (یعنی تمہارے کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے) یعنی فقط خمس ہے جس میں معاملہ آپ کی صوابدید اور اجتہاد پر چھوڑا گیا، اسی لئے کہا اسے بھی تمہاری طرف لوٹا دیا جاتا ہے بخلاف غنیمت کے باقی چار بٹا پانچ مقدار کے تو یہ اس غزوہ کے مجاہدین کے لئے تھا، اسی لئے امراء غنائم کو

غانمین پر تقسیم کرتے رہے اور اس کا خمس خلفائے راشدین کو روانہ کر دیا جاتا تھا جو اپنے اجتہاد سے اور حسبِ مصلحت اس کی تقسیم کرتے تھے البتہ باقی چار حصوں کی بابت اللہ ورسول کے حکم کی طلب کرتے جیسے شرعی حدود میں امرِ شرعی کی طلب کرتے تھے، نبی اکرم نے حنین کی غنائم سے مؤلفۃ القلوب کو بھی عطا کیا، بعض نے کہا یہ عطا خمس سے تھی جبکہ ایک قول ہے کہ اصلِ غنیمت سے، اس قول پر آپ نے یہ مسلمانوں کی رضا مندی سے کیا چونکہ اس میں عظیم مصلحت تھی اور جب بعض انصار نے چہ مگوئیاں کیں تو انہیں مطمئن کیا اور پیشکش کی کہ اس کا عوض انہیں دئے دیا جائے! بعض قائل ہیں کہ غنیمت تقسیم سے قبل امام کی مِلک ہے وہ جیسے چاہے تصرف کرے جیسا کہ ایک جگہ اس پر بحث کی ہے، یہاں مقصود بندے کا اللہ کے لئے حالِ محض کا بیان ہے جس کی وہ عبادت کرتا اور جس کے ساتھ وہ استعانت کرتا ہے اور اس آیت کا مصداق بنتا ہے: (**اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ**) یعنی توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت دونوں کا مظہر اگر چہ الوہیت ربوبیت اور ربوبیت الوہیت کو متضمن ہے! تو مفرداً مذکور ہونے کی حالت میں اگر ایک دوسری کو متضمن ہیں تو مانع نہیں کہ اقتران کے وقت ہر ایک اپنے معنی ومفہوم کے ساتھ مختص ہو، جیسے اس قولہ میں:

(**قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ**) [الناس: ۱-۳] (کہو میں لوگوں کے رب کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔لوگوں کا بادشاہ۔لوگوں کا معبودِ برحق) اور: (**اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ**) تو دونوں اسموں کے مابین جمع کیا: اسمِ الٰہ اور اسمِ رب، تو الٰہ وہ معبود جو مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور رب وہ جو اپنے بندے (بلکہ پوری کائنات) کا مربی اور مدبر ہے، اسی لئے عبادت اس کے اسمِ اللہ اور سوال اس کے اسمِ رب کے ساتھ متعلق ہوا تو عبادت وہ غایت ہے جس کے لئے خلق کی تخلیق کی جبکہ الوہیت بھی غایت ہے اور ربوبیت خلق کی تخلیق اور ان کے انشاء کو متضمن ہے تو یہ ان کے ابتدائے حال کو متضمن ہے، نمازی جب کہے: (**اِيَّاكَ نَعْبُدُ الخ**) تو اس نے اس مقصود کے ساتھ ابتدا کی جو غایت ہے اس وسیلہ پر جو کہ ہدایت ہے، تو عبادت غایتِ مقصودہ ہے جبکہ استعانت اس کی طرف وسیلہ، وہ حکمت ہے اور یہ سبب، علتِ غائیہ اور علتِ فاعلیہ کے مابین فرق معروف ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے: (اَوَّلُ الْفِكْرَةِ آخِرُ الْعَمَلِ وَاَوَّلُ الْبُغْيَةِ آخِرُ الدَّرَكِ) (سوچ کا آغاز عمل کی انتہاء ہے اور طلب کا آغاز پالینے کی انتہاء ہے) تو علتِ غائیہ تصور اور ارادہ میں متقدم البتہ وجود میں متأخر ہے تو مومن ابتداءً اللہ کی عبادت کا قصد کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا حصول نہ ہوگا مگر اس کی اعانت کے ساتھ تو کہتا ہے: (**اِيَّاكَ نَعْبُدُ الخ**) اور جب عبادت اس کے اسمِ اللہ کے ساتھ متعلق ہے تو اذکارِ مشروعہ اس کے ساتھ وارد ہوئے مثلاً اذان کے کلمات: (اَللّٰهُ اَكْبَرُ - الخ) کلمہ (اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ) تشہد (اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ) اور جیسے تسبیح وتحمید تہلیل اور تکبیر: سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اللّٰهُ اَكْبَرُ اور جہاں تک سوال (یعنی دعائے طلب) تو کثیراً یہ رب کے اسم کے ساتھ وارد ہے جیسے آدم وحوا کی دعا: (رَبَّنَا ظَلَمْنَا الخ) حضرت نوح کی دعا:

(رَبِّ اِنِّیٓ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡئَلَكَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ) [هود: ۴۷] (اے میرے رب میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی مجھے حقیقت معلوم نہیں) حضرت موسیٰ کی دعا:

(رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡلِیۡ) [القصص: ۱۶] (اے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے) حضرت ابراہیم کی دعا:

(رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ) [إبراهيم: ۳۷] (اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد اس میدان میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس لا بسائی ہے، اے اللہ! تاکہ یہ نماز پڑھیں) ان کی اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کی اجتماعی دعا:

(رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ)[البقرة: ۱۲۷] (اے ہمارے رب ہم سے یہ قبول فرما بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے) اسی طرح یہ دعا:

(رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ)[البقرة: ۲۰۱] (اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت عطا فرما اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ) اور اس کا مثل کثیر ہے، مالک سے منقول ہے کہ کہا میں دعا کرنے والے کے لئے مکروہ گردانتا ہوں کہ کہے: (یَا سَیِّدِیۡ یَا سَیِّدِیۡ، یَا حَنَّانُ، یَا حَنَّانُ) لیکن وہ الفاظ ذکر کرے جو انبیاء نے کئے: (رَبَّنَا، رَبَّنَا) اسے عتبی لے (العتبية) میں نقل کیا، اللہ تعالیٰ نے اولی الالباب بارے کہا:

(اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ)[آل عمران: ۱۹۱] (جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں کہ اے رب تو نے اس کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچانا) الآیات، تو جب بندے کے دل میں قصدِ سوال سابق ہو تو بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمِ رب کے ساتھ دعا کرے اور اگر اسمِ اللہ کے ساتھ دعا کرے جو کہ رب کے اسم کو بھی متضمن ہے تو یہ حسن ہے اور اگر اس کے دل میں قصدِ عبادت سابق ہو تو اسمِ اللہ اولیٰ ہے، جب ثناء کے ساتھ ابتداء کرے تو اسمِ اللہ ذکر کرے اور جب دعا کا قصد کرے تو اسمِ رب کے ساتھ دعا کرے اسی لئے حضرت یونس نے کہا:

(لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ) [الأنبياء: ۸۷] (تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بے شک میں قصوروار ہوں) حضرت آدم نے کہا: (رَبَّنَا ظَلَمۡنَا الخ) دراصل حضرت یونس حالتِ غیظ وغضب میں روانہ ہوئے تھے، فرمایا:

(فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّكَ وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ اِذۡ نَادٰی وَهُوَ مَکۡظُوۡمٌ) [القلم: ۴۸] (پس تم اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہونا کہ انہوں نے پکارا اور وہ غصے میں بھرا ہوا تھا) اور کہا:

(فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ) [والصافات : ۱۴۲] (پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا اور وہ الزام کھایا ہوا تھا) تو ایسا فعل ان سے سرزد ہوا تھا جو قابلِ ملامت تھا (یعنی اللہ کے حکم کا انتظار کئے بغیر قوم سے روانگی) تو ان کے مناسبِ حال یہی تھا کہ رب تعالیٰ کی ثناء سے ابتدا کرتے اور اس اعتراف سے کہ اس کے سوا کوئی الہ نہیں تو وہی مستحق ہے کہ عبادت کیا جائے، کوئی اس کے سوا اس کا اہل نہیں، خواہش کی اتباع نہ کی جائے کہ اتباعِ ہویٰ اللہ وحدہ کی عبادت کا جذبہ کمزور کر دیتا ہے، مروی ہے کہ حضرت یونس عذاب کے آثار آ جانے کے بعد پھر جب (قوم کی توبہ کے نتیجہ میں اور حضرت یونس کو اس کا علم نہ ہو سکا تھا کہ وہ جا چکے تھے) یہ ٹل گیا تو انہیں اس خجالت نے آ لیا کہ قوم انہیں جھوٹا سمجھ رہی ہوگی تو مغاضبت محسوس کی پھر وہ فعل کیا جس کا اقتضاء اللہ کی ذکر کردہ کلام نے کیا تو (لَا اِلٰـــهَ اِلَّا اَنْـــــتَ) سے آغاز کیا اور یہ سب غیر اللہ کی الوہیت سے براءت کو متضمن ہے چاہے اس کا صدور ہوائے نفس سے ہو یا خلق کی طاعت سے یا کوئی غیر، اسی لئے کہا: (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ الخ) انسان یہ اعتراف تب کرتا ہے جب اس کا ظن صحیح ثابت نہ ہوا ہو

جبکہ حضرت آدم نے اولاً اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا اور کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ان کے پاس کوئی ایسا نہ تھا جو اللہ کے مامور بہ کے ارادہ سے ان کا منازِع بنتا ان میں سے جو الوہیت کے مزاحم ہوتے ہیں بلکہ شیطان کے صدق کا ظن کیا تھا جس نے قسمیں اٹھا کر انہیں یقین دلایا تھا کہ میں آپ کے خیر خواہوں میں سے ہوں: (وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ) [الأعراف : ۲۱۔ ۲۲] (اور اُن سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں ۔تو دھوکا دے کر اُن کو کھینچ ہی لیا) تو شیطان کے دھوکہ میں آ گئے اور اس کی چال کا شکار بن گئے جس نے خود کو ان کا بڑا خیر خواہ ظاہر کیا تو جب حقیقت سے پردہ اٹھا تو ان کے حال کے مناسب تھا کہ کہتے: (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا) اس وجہ سے جو ان سے تفریط اور کوتاہی ہوئی نہ کہ ہویٰ وحظ کی وجہ سے جو الوہیت کی مزاحم ہو اور وہ دونوں (یعنی آدم وحوا) اس امر کے محتاج تھے کہ اللہ تعالیٰ اس ربوبیت کے ساتھ انہیں مربوب بنائے جو ان کے قصد وعلم کو کامل کر دے تا کہ اس کے مثل کے ساتھ وہ دھوکہ نہ کھائیں، تو انہوں نے اپنی کوتاہی کے اعتراف کے ساتھ ابتدا کی اور اللہ کے سامنے اپنی یہ حاجت پیش کی جس کے سوا کوئی حاجت براری نہیں کر سکتا اور ذوالنون حقِ الوہیت میں تقصیر کے شاہد ہوئے جو بوجہ ان کی مغاضبت اور اپنی قوم کے نجات پا جانے سے کراہت کے حاصل ہوئی تو اس میں کسی اور شئ سے حب کے فعل میں معارضہ تھا جو اللہ کے لئے ان کی محبت کی تجرید کا موجب بنا اور ان کے اس کے لئے تألُّہ کا تو شروع ان کلمات سے کیا: (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ) تو اس سے نفی کی کہ اپنی ہویٰ (یا کسی بھی غیر اللہ) کو اپنا الہ بنایا ہو، مروی ہے کہ آسمان کی چھت کے نیچے اللہ کے نزدیک خواہشِ نفس سے بڑا کوئی الہ نہیں جس کی پوجا کی جاتی ہو تو حضرت یونس نے اللہ کے لئے الوہیت کی تحقیق کی اور ہوائے نفس کی نفی اور اس کا محو کیا جسے اس کے سوا الہ بنا لیا جاتا ہے تو اب ان کے پاس حق تعالیٰ کی الوہیت سے مزاحم کوئی ارادہ نہ رہا بلکہ اللہ کے لئے دین کو خالص کرنے والے بنے، نیز اس طرح کی حالت جب کسی پر

طاری ہو جائے تو اس میں تقدیر کے لئے ایک نوع کی مغاضبت اور خلق و امر میں ایک نوعِ معارضت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی حکمت و رحمت بارے وساوس، تو بندہ محتاج ہوتا ہے کہ اپنے سے دو اشیاء کی نفی کرے: فاسد آراء کی اور فاسد اہواء کی تو جان لے کہ حکمت اور عدل انہی امور میں ہے جنہیں اللہ کا علم اور حکمت مقتضی ہیں نہ کہ ان میں جنہیں بندے کا علم اور اس کی حکمت مقتضی ہو اور اس کی ہویٰ اللہ کے امر کے تابع ہو اور وہ اس کے مقابلہ میں ہوائے نفس کو اہمیت نہ دے، فرمایا:

(فَلَا وَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا)[النساء : ٦٥] (تمہارے رب کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اُس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اُس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے) مروی ہے کہ فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا حتی کہ اس کی ہویٰ اس کے تابع ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں، اسے ابو حاتم نے اپنی صحیح میں نقل کیا، صحیح میں ہے حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ بخدا اب آپ مجھے میری جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں تو فرمایا ہاں اب اے عمر، صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا تم میں سے کوئی مومن نہیں حتی کہ میں اسے اس کے والد، ولد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں، قرآن میں ہے:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ الخ) (کچھ قبل گزری) تو جب ایمان کا حصول نہیں ہوتا حتی کہ انسان رسول کو فیصل نہ مان لے اور ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کر لے اور اپنی خواہشات کو آپ کی تعلیمات کے تابع نہ کر لے تو اللہ تعالی تو اس سے آگے ہے، تو جس نے خیال کیا کہ فلاں قوم عذاب کی مستحق بن گئی ہے جبکہ اللہ نے ان کی مغفرت کر کے عذاب کو ان سے ٹال دیا ہو اور اسے یہ برا لگا تو یہ یا تو اس ارادہ سے جو اللہ کے حکم کا مخالف ہوا اور یا اس ظن سے جو اللہ کے علم کے برخلاف کیا جبکہ اللہ ہی علیم و حکیم ہے اور جب یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو کہ اللہ ہی علیم و حکیم ہے تو پھر اس کے کسی فعل سے ناگواری محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی اور یہ اس کے امر و خلق میں ہے اور اس کے اوامر میں یہ داخل نہیں کہ اس کے امر و خلق کو برا سمجھیں اور ناراض ہوں، موجودات میں سے جن سے کراہت کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے مثلا کفر، فسوق اور عصیان تو ہمارے ذمہ ہے کہ اس کے امر میں اس کی اطاعت کریں بخلاف اس کے اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے کے اور انہیں عذاب سے نجات دینے کے تو یہ اس کے مفعولات میں سے ہے جن سے کراہت کے ہم مامور نہیں بلکہ یہ اس کے محبوبات میں سے ہیں کیونکہ وہ توابین اور متطہرین کو پسند کرتا ہے تو اس کی کراہت مزاحمِ الوہیت ارادہ کی اتباع کی نوع سے ہے تو ایسا کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ توحیدِ الوہیت کی تحقیق کرے اور کہے: (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اَنْـتَ) ہم پر لازم ہے کہ ہر اس سے محبت کریں جو اسے محبوب ہے اور ہر اس پر راضی ہوں جس سے وہ راضی ہے، اسی کا حکم دیں جس کا وہ دیتا ہے اور اس سے منع کریں جس سے وہ کرتا ہے لہذا

جب تو ابین اسے محبوب ہیں تو ہمیں بھی ہونے چاہئیں، ہم اس کے محبوبات کے مخالف ارادوں کو الہ نہ بنا لیں، اس مقام پر کلام ایک اصل پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کرام ان امور میں معصوم ہیں جن کی وہ اللہ سبحانہ سے خبر دیں اور اس کی رسالات کی تبلیغ میں، اس پر امت کا اتفاق ہے لہذا ہر اس پر ایمان لانا واجب ہے جو وہ دئے گئے جیسا کہ کہا:

(قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ)[البقرة : ۱۳۶۔۱۳۷] (کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اُتری اس پر اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے ملیں اُن پر ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں ۔تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہوتو ہدایت یافتہ ہو جائیں اور اگر منہ پھیر لیں تو وہ (تمہارے) مخالف ہیں اور اُن کے مقابلے میں تمہیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے) اور کہا:

(وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ) [البقرة : ۱۷۷] (ولیکن نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں)

(اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ) [البقرة : ۲۸۵] (رسول اس کتاب پر جو اُن کے رب کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی، سب اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں، ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور کہا ہم نے سنا اور قبول کیا، اے رب ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے) بخلاف غیرِ انبیاء کے تو ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں چاہے کوئی کتنا بڑا اللہ کا ولی ہو، لہذا فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی بھی نبی کی توہین اور گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے البتہ غیرِ انبیاء کے گستاخ کو واجب القتل قرار نہیں دیا، انبیاء کے لئے ثابت اس عصمت کے ساتھ ہی نبوت اور رسالت کا مقصود حاصل ہوتا ہے کیونکہ نبی اللہ سے خبر دیتا ہے اور رسول جسے اللہ نے ارسال کیا، ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں اور نبی و رسول اللہ سے جس چیز کی بھی تبلیغ کریں اس میں بالاتفاق عصمت ثابت ہے، اس ضمن میں کسی خطا کے مستقر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں لیکن آیا یہ ہونا ممکن ہے کہ شیطان کا کوئی القاء وحی کے پیغام میں شامل ہو جائے اور جلد ہی اللہ استدراک کرے اور اس کا القاء ختم کر ڈالے اور اپنے پیغام کو

محکم کردے؟ اس میں دواقوال ہیں،سلف سے ماثور قرآن کی موافقت کرتا ہے اور متاخرین میں سے جنہوں نے اسے ممنوع قرار دیا (یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں) انہوں نے سورۃ النجم میں منقول اس اضافہ میں طعن کیا ہے:(تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلىٰ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجىٰ) ان کے بقول یہ روایت ثابت نہیں ہے جو اسے ثابت کہتے ہیں ان کے بقول یہ ان کے کانوں میں شیطان نے القاء کر دیا تھا رسولِ اکرم کی زبان پر یہ کلمات جاری نہ ہوئے تھے لیکن بہرحال اس تقدیر پر بھی سوال وارد ہے،قولہ:

(اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ) [الحج : ۵۲] (مگر جب وہ دعا کرتا تھا تو شیطان اُس کی دعا میں وسوسہ ڈال دیتا تھا) بارے ان متأخرین کا موقف یہ ہے کہ اس سے مراد حدیثِ نفس ہے،اسے ثابت قرار دینے والوں کے نزدیک یہ روایت ثابت اور نا قابلِ قدح ہے اور اگلی ہی یہ آیت اس پر دال ہے:

(لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ) [الحج : ۵۳] غرض (تا کہ جو شیطان القاء کرتا ہے اُس کو اُن لوگوں کیلئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں ذریعہ آزمائش ٹھہرائے بے شک ظالم دور کی مخالفت میں ہیں) کہتے ہیں اس آیت کی تفسیر میں آثار معروف اور کتبِ تفسیر و حدیث میں ثابت ہیں اور قرآن ان کی موافقت کرتا ہے تو اللہ نے جو ذکر کیا کہ وہ شیطان کے القاء کو نسخ کر دیتا اور اپنی آیات کا اِحکام کرتا ہے یہ اس القاء کی نسبت ہوگا جو اس کی آیت میں بالفعل واقع ہوا ہو تا کہ حق کی باطل سے تمییز ہو، تا کہ اللہ کی آیات اپنے غیر کے ساتھ مختلط نہ ہوں اور شیطان کے اس القاء کو ان لوگوں کی آزمائش بنایا جن کے قلوب میں مرض ہے اور جو قسوت سے معمور دلوں والے ہیں اور یہ تبھی ہوگا جب ایسا ہونا ظاہر ہو، لوگ جسے سنیں نہ کہ نفس میں مخفی اور باطن اور نسخ سے اس نوع کے ساتھ جو فتنہ حاصل ہو وہ اس فتنہ کی جنس سے ہے جو دوسری نوع کے نسخ کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اور یہ نوع رسول اکرم کے صدق اور ہوی سے آپ کے بُعد پر دوسری نوع کے نسخ سے اَدل ہے کیونکہ جب آپ نے کسی شئ کا امر دیا پھر اس کے برخلاف کا اور یہ دونوں منجانب اللہ ہیں اور آپ اس میں مصدق ہیں تو جب اپنے نفس سے کہیں کہ ثانی جو ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے اور وہ ناسخ ہے اور جسے اللہ نے منسوخ کر دیا وہ ایسا نہیں تو یہ آپ کے قابلِ صدق و اعتماد اور آپ کے قول کے حق ہونے پر ادل ہے اور یہ جیسے حضرت عائشہ نے کہا تھا اگر حضرت محمدؐ وحی سے کسی شئ کا کتمان کرنے والے ہوتے تو اس آیت کا کتمان کرتے:

(وَتُخْفِىْ فِىْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ) [الأحزاب : ۳۷] (اورتم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ کئے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو) تم دیکھتے نہیں جو باطل کے ساتھ اپنے نفس کو معظم کرتا ہے وہ اپنے منہ سے نکلی ہر بات کی حمایت اور تائید کرتا ہے اگرچہ وہ ظاہر و باہر خطا ہو تو نبی اکرم کا بیان کہ اللہ تعالی اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور شیطان کے القاء کو نسخ کرتا ہے آپ کے صدق

کیلئے تحری (یعنی طلب وجستجو) اور کذب سے آپ کی براءت پر ادل ہے اور یہی مقصود بالرسالت ہے تو آپ صادق ومصدوق ہیں اسی لئے آپ کی تکذیب بلا ریب کفرِ محض ہے

جہاں تک **تبلیغِ رسالت سے غیر متعلق امور میں انبیاء کی عصمت کا معاملہ** تو اس میں اختلافِ آراء ہے کہ کیا یہ عقل یا نقل کی رو سے ثابت ہے؟ کبائر اور صغائر یا ان کے بعض سے عصمت بارے اہلِ علم باہم متنازع ہیں، یا کیا عصمت ان پر اقرار (یعنی جمے اور ثابت رہنے) میں ہے نہ کہ فعل میں؟ یا صرف امورِ رسالت ہی میں انبیاء معصوم تھے؟ اور کیا کفر اور ذنوب سے عصمت قبل از بعثت بھی واجب ہے یا نہیں؟ اس سب پر ایک جگہ مفصل بحث کی ہے، اس سلسلہ میں جمہور کا قول یہ ہے اور یہ سلف سے منقولہ آثار کے موافق ہے کہ ذنوب پر اقرار (یعنی جمے رہنے) سے تو مطلقاً عصمت ثابت ہے اور جو قائل ہیں کہ اقرار ممکن ہے ان کا موقف مردود ہے! تمام قائلینِ عصمت کی اگر ادلہ کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اس قول پر دلالت کرتی ہیں، نفاۃ کی ادلہ ایسے کسی گناہ کے وقوع پر دال نہیں جس پر انبیاء برقرار رہے ہوں، عصمت کے قائلین نے اس امر سے احتجاج کیا کہ انبیاء کی اقتداء کرنا مشروع ہے اور یہ جائز نہیں مگر افعال کا ذنوب ہونا مجوز کر کے اور معلوم امر ہے کہ اقتداء ان کے انہی افعال میں مشروع ہے جن پر وہ قائم اور مستقر کئے گئے نہ کہ جن سے روک دیئے گئے اور جن سے رجوع کر لیا جیسا کہ امر و نہی کے ضمن میں انہی کی طاعت واجب ہے جو منسوخ نہیں کئے گئے تو جو منسوخ ہو گئے انہیں مامور بہ اور منہی عنہ قرار دینا جائز نہیں چہ جائے کہ ان میں رسول کی طاعت اور اتباع واجب قرار دی جائے

ان کی ادلہ میں سے یہ بھی کہ ذنوب کمال کے منافی ہیں، ان سے جن پر نعمت کا اعظام ہوا ان کا ارتکاب اقبح ہے، یا یہ تنفیر کی موجب ہیں اور اس کے نحو ادلہ عقلی، تو یہ تب جب گناہ پر بقاء اور عدم رجوع ہو وگرنہ توبہ نصوح کو اللہ تعالیٰ نہ صرف قبول کرتا ہے مگر پہلے سے بھی بڑا مرتبہ عطا فرماتا ہے جیسے بعض سلف کا قول ہے کہ حضرت داؤد توبہ کے بعد افضل اور خیر ہوئے بنسبت اس مرتبہ کے جو ان کا قبل از توبہ تھا، ایک اور نے کہا اگر توبہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ترین نہ ہوتی تو اپنے ہاں نہایت رتبہ والوں کو وہ لغزشوں میں مبتلا نہ کرتا، صحاح میں حدیثِ توبہ ثابت ہے جس میں ہے اللہ کو بندے کی توبہ سے اس سے بڑھ کر خوشی ہوتی ہے جو اس آدمی کو ہوتی ہے جو صحرا میں تھا کہ اس کا سامانِ خور دونوش وغیرہ سے لدا اونٹ گم ہو گیا، تلاشِ بسیار کے باوجود بھی جب نہ ملا تو وہ موت کے انتظار میں بیٹھ رہا اور اس کی آنکھ لگ گئی پھر جب اٹھا تو اونٹ اس کے پہلو میں کھڑا تھا، فرمایا:

(إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ)[البقرة : ۲۲۲] (بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے)

(إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ) [الفرقان : ۷۰](مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا) صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ (روزِ

قیامت) اللہ تعالیٰ ایک بندے کے صغیرہ گناہ اسے پیش کرے گا اور کبیرہ اس سے چھپا لے گا اور وہ شخص ڈرتا ہوگا کہ اس کے کبیرہ گناہ ظاہر کئے جائیں، اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور تمہارے ہر گناہ کو نیکی سے بدل دیا ہے، اس پر وہ کہے گا اے رب میں نے تو اور بھی گناہ کیے تھے جو مجھے یہاں نظر نہیں آ رہے، اور یہ اس طمع میں کہ اس کے کبیرہ گناہوں کو بھی نیکیوں کے ساتھ بدل دیا جائے اور معلوم رہے کہ یہ اس کا اس تبدیلی کے بعد حال ہے، تو اگر یہ گناہ اس سے واقع نہ ہوئے ہوتے تب تو اس کا حال اعظم اور ارفع ہوتا، بعض سلف جن میں سعید بن جبیر بھی ہیں، نے کہا بندہ کئی دفعہ (اپنے تئیں) نیکی کا عمل کرتا ہے مگر اس کی رو سے آگ میں دخول کا مستحق ہو جاتا ہے اور کئی دفعہ سیئہ کا ارتکاب کرتا ہے لیکن وہ اسے جنت کا حقدار بنا دیتی ہے (اس کی وضاحت یہ کہ) نیکی کرتا ہے اور اس پر اترانے لگتا ہے حتیٰ کہ دوزخ میں جا داخل ہوتا ہے اور برائی کرتا ہے اور پھر مسلسل خائف رہتا، اظہارِ ندامت کرتا اور توبہ کرتا ہے حتیٰ کہ یہ اسے جنت میں لا داخل کرتی ہے، فرمایا:

(وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا) [الأحزاب: ۷۲-۷۱] (اور انسان نے اس [بوجھ] کو اٹھا لیا بے شک وہ نا عاقبت اندیش اور لا پرواہ تھا۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر مہربانی کرے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے) تو ہر انسان کی غایت یہ ہے کہ وہ ان اہلِ ایمان میں سے ہو جنہیں اللہ نے توبہ کی توفیق دی، قرآن، سنتِ صحیحہ اور سابقہ آسمانی کتب میں اس موقف کے موافق اتنی ادلہ ہیں کہ شمار سے باہر ہیں، دوسرے موقف کے حاملین نے ان آثار کی جہمیہ، قدریہ اور دہریہ جیسی تاویلیں کیں جو انہوں نے اسماء وصفات، تقدیر اور نصوصِ معاد کے باب میں کی ہیں اور یہ باطنیہ قرامطہ کی تاویلات کی جنس سے ہیں جن کا باطل ہونا معلوم بالضرورت ہے اور یہ کلم کے ان کے مواضع سے تحریف کی قبیل سے ہے، یہ اپنے تئیں انبیاء کی تعظیم کے قاصد ہیں مگر ان کی تکذیب میں جا واقع ہوئے، ان پر ایمان کے مرید بنے مگر کافر ہو بیٹھے پھر شرعی وعقلی ادلہ اور اجماع کی رو سے معلوم عصمت۔ اور یہ تبلیغ کے ضمن میں عصمت۔ کے ساتھ یہ منتفع نہ ہوئے کیونکہ انبیاء نے جو تبلیغ کی یہ اس کے موجب کے مقر نہ بنے، یہ اس لفظ کے مقر ہیں جس کی تحریف کر ڈالی یا اس ضمن میں یہ ان امیین کی مثل ہیں جو اپنے باطل خیالات اور فہم کو کتاب کے مندرجات باور کرتے تھے اور جس عصمت کا انہوں نے ادعاء کیا اگر یہ ثابت ہے تو یہ اس کے ساتھ منتفع نہیں اور نہ ان کے نزدیک انہیں اس کی ضرورت ہے تو یہ ان کے غیر کے ساتھ متعلق ہے نہ کہ اس کے ساتھ جس پر ایمان لانے کا یہ حکم دئے گئے تو ان کے بعض انبیاء کے بارے میں بغیر اللہ کی جانب سے نازل کسی سلطان کے تکلم کرتے ہیں اور جو ان کی تصدیق و طاعت ان پر واجب ہے انہیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ اسی میں سعادت اور اس کے عکس میں شقاوت ہے، فرمایا:

(فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ) [النور: ۵۴](پس اگر منہ موڑو گے تو رسول پر جو ان کے ذمے ہے اور تم پر ہے جو تمہارے ذمے ہے) الآیۃ، اللہ نے قرآن مین کسی بھی نبی بارے ایسی کوئی شئ ذکر نہیں کی مگر توبہ واستغفار کے ساتھ مقرون کر کے جیسے حضرات آدم وحوا نے کہا: (رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا الخ) (دیگر انبیاء کی قرآن میں مذکورادعیہ ذکر کیں جو کچھ قبل ذکر ہو چکی ہیں) اور جہاں تک حضرت یوسف تو اللہ نے ان کے کسی گناہ کا ذکر نہیں کیا اسی لئے ان کی نسبت توبہ واستغفار کا ذکر بھی نہیں ہوا بلکہ کہا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[یوسف : ۲۴] (یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے ہیں) تو خبر دی کہ ان سے سوء اور فحشاء کو پھیر دیا اور یہ دال ہے کہ ان سے کسی طرح کا سوء اور فحشاء صادر نہ ہوا، جہاں تک قولہ:

(وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰبُرْهَانَ رَبِّهٖ)[یوسف: ۲۴](اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے) تو ھم اسمِ جنس ہے جس کے تحت دو انواع ہیں جیسے امام احمد نے کہا: ھم دو طرح کا ہے ایک: ھمِ خطرات (یعنی خیالات کا کوندا لپکے پھر نکل جائے) اور دوم: ھم اصرار (کہ مسلسل دل میں خیال ہو اور موقع کی تلاش میں رہے) صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا بندہ جب کسی برائی کا ھم (یعنی ارادہ) کرے تو اسے فی الفور لکھا نہیں جاتا اور اگر اللہ کی خاطر اس کا ترک کر دے تو یہ اس کی نیکی شمار کر لی جاتی ہے اور اگر برائی کا ارتکاب کرے تو اس کے کھاتے میں ایک برائی لکھ لی جاتی ہے اور اگر اللہ کے لئے نہیں (بلکہ موقع نہ ملنے کی وجہ سے) ترک کیا تو نہ نیکی اور نہ برائی لکھی جاتی ہے جبکہ حضرت یوسف نے ایک ھم کیا (البتہ ایک تفسیری قول ہے کہ ھم بھی نہ کیا تھا، آیت کا معنی یہ کیا: ھم کر لیتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی) اور اللہ کی خاطر اس کا ترک کر دیا اسی لیے اللہ نے سوء اور فحشاء کو ان سے پھیر دیا اور یہ ان کے اخلاص کی وجہ سے! گویا گناہ کا مقتضی ھم قائم ہوا اور اللہ کی خاطر گناہ سے دل کے انصراف کا موجب اخلاص اس کا معارض ہوا تو یوسف علیہ السلام سے صادر نہ ہوئی مگر نیکی جس پر ثواب عطا ہوا، فرمایا:

(اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ)[الأعراف: ۲۰۱] (جو لوگ پرہیزگار ہیں جب اُن کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور بصیرت اختیار کرتے ہیں) اور جو نقل کیا جاتا ہے کہ مباشرت کے لئے مکمل تیار ہو گئے تھے پھر حضرت یعقوب کی تصویر دیکھی جو (از رہِ تعجب) اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹ رہے تھے اور اس کی مثل خرافات تو یہ بات نہ کتاب میں ہے اور نہ سنت میں، یہ دراصل یہود سے ماخوذ ہے جو انبیاء کی تنقیصِ شان کرنے اور ان کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے، مسلمانوں میں سے جس نے بھی یہ حکایت نقل کی ہے اس کا اخذ اس نے انہی سے کیا ہے، ہمارے نبی پاک سے اس کا ایک حرف بھی منقول نہیں اور قولہ:

(وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَ مَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ) [یوسف : ۵۳] (اور میں اپنے آپ کو پاک صاف

نہیں کہتا کیونکہ نفس امارہ بُرائی ہی سکھا تا رہتا ہے مگر یہ کہ میرا رب رحم کرے) تو یہ عزیزِ مصر کی زوجہ کی کلام ہے جیسا کہ قرآن کی اس پر واضح دلالت ہے، قرآن میں تدبر کرنے والے کو اس بارے کوئی شک نہیں، فرمایا:

(وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ) [یوسف : ۵۴] (بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا مصاحبِ خاص بناؤں گا) الآیات ! تو یہ عزیزِ مصر کی زوجہ کی کلام ہے، یوسف تو اس وقت قید خانہ میں تھے ابھی بادشاہ کے پاس انہیں لایا نہ گیا تھا اور نہ اس نے ان کی بات سنی اور نہ ابھی دیکھا تھا ان کی غیر موجودی میں جب ان کی براءت ظاہر ہوگئی جیسا کہ زوجہ عزیز نے کہا:

(ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ) [یوسف: ۵۲] (یہ اس لئے کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی) یعنی میں نے اپنے سے اس کے حالِ مغیب میں اس کی خیانت نہیں کی اگر چہ اس کے حالِ شہود میں مراودت کی (یعنی فریفتہ کرنے کی کوشش کی) تو تب بادشاہ نے کہا تھا اسے (یعنی حضرت یوسف کو) میرے پاس لاؤ تا کہ میں اسے اپنا مصاحبِ خاص بنالوں، کثیر مفسرین نے کہا ہے یہ حضرت یوسف کی کلام ہے، ان میں سے بعض نے صرف یہی قول ہی ذکر کیا لیکن یہ قول غایتِ فساد میں ہے اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ ادلہ اس کے نقیض پر دال ہیں، ان امور پر ایک جگہ بسط سے بات کی ہے! یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت یونس کا قصہ جس شیٔ کو متضمن ہے جس پر انہیں ملامت کی گئی وہ سب مغفور ہے، اللہ نے اسے حسنات کے ساتھ بدل ڈالا اور ان کا درجہ پہلے سے بھی ارفع کر دیا اور یہ مچھلی کے پیٹ سے خروج کے بعد، فرمایا:

(فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ لَوْلَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) [القلم : ۴۸۔۵۰] (پس اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو اور مچھلی والے کی طرح نہ ہونا کہ انہوں نے پکارا اور وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی تو چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے اور ان کا حال ابتر ہو جاتا۔ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا اور اسے صالحین میں کر لیا) اور یہ بخلاف اس حالت کے جب مچھلی نے انہیں نگلا چنانچہ اس حالت بارے فرمایا:

(فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ) [الصافات: ۱۴۲] (پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا اور وہ الزام کھایا ہوا تھا) تو خبر دی کہ اس حالت میں وہ ملیم تھے اور ملیم جو ایسا فعل کرے جس پر اسے ملامت ہو تو: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الخ) کے بعد (یعنی جب تو بہ قبول ہوئی) ان کی حالت ما قبل حالت سے اعظم اور ارفع ہوگئی اور اعتبار کمالِ نہایت کا ہوتا ہے نہ کہ اس کا جو ابتداء میں ما جرا ہو، اعمال کا دار و مدار ان کے خواتیم پر ہوتا ہے، اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اس کے ماں کے بطن سے نکالا اور تب اسے کسی شیٔ کا علم نہ تھا پھر اسے عالم بنایا تو حالتِ نقص سے اسے حالتِ کمال کی طرف منتقل کیا لہذا حالتِ کمال سے قبل کے حال میں اس سے جو واقع ہوا اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے مجموعی حال کو مدِ نظر رکھنا ہوگا، حضرت یونس اور دیگر انبیاء کا حالتِ نہایت میں حال

اکمل الا حوال تھا، یہیں سے ملائکہ کو انبیاء اور صالحین پر تفضیل کے قائلین کو غلطی لگی جب انہوں نے ملائکہ کے حالِ کمال کا صالحین کے ابتدائی حال کے ساتھ موازنہ کیا اور ان کے نقائص کا اعتبار کیا، اگر جنت میں دخول کے بعد حالِ انبیاء وصالحین کا اعتبار کرتے جب اللہ تعالیٰ کی کامل رضا انہیں حاصل ہوئی اور ان کا ہر نقص و ملام زائل ہوا اور رحمت وسلام کا ان کے لئے حصول ہوا اور ملائکہ ہر باب سے ان پر داخل ہوں گے اور کہیں گے:

(سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ)[الرعد: ۲۴] (اور تم پر سلامتی ہو بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس یہ عاقبت کا گھر خوب ہے) تو یہ غلطی انہیں نہ لگتی اور تمام مخلوقین پر ان کی تفضیل آشکار ہوتی وگرنہ تو ایک وقت تھا کہ ہر انسان نطفہ تھا (بلکہ نطفہ سے قبل بظاہر لاشئ تھا) پھر علقہ بنا پھر مضغہ پھر کہیں جا کر ذی روح ہوا پھر ولید پھر رضیع پھر فطیم پھر اس کی نشو ونما کے لحاظ سے دیگر احوال تو صفاتِ کمال کے ساتھ تو آخر الحال میں متصف ہوتا ہے (جو ہوتا ہے) تو جسے بھی ہر صنف وجیل پر تفضیل دینا ہو یہ مآل کے اعتبار سے ہوگا حصولِ کمال کے وقت

اور جو **بعض حضرات کا ظن ہے کہ جو اسلام پر پیدا ہوا** کبھی کفر نہیں کیا وہ اس سے افضل ہے جو حالتِ کفر میں (یعنی کافر والدین کے گھر) پیدا ہوا پھر اسلام لایا تو یہ درست نہیں بلکہ اعتبار عاقبت کا ہے اور جو ان میں سے اپنی انجام وعاقبت میں اللہ کے لئے اتقیٰ ہوگا وہ افضل ہوگا، معلوم امر ہے کہ سابقین اولین مہاجرین وانصار حالتِ کفر کے بعد اللہ ورسول پر ایمان لائے اور یہ ان سب (مابعد والوں) سے افضل ہیں جو اسلام پر پیدا ہوئے اپنی اور غیر کی اولاد میں سے بلکہ ان میں کئی ایسے تھے جنہوں شر کی معرفت پائی، اس کا ذائقہ چکھا پھر خیر کے عارف بنے اور اس کے ذائقہ سے آشنا ہوئے تو کبھی اس کی معرفت بالخیر اور شر سے محبت اور اس کی معرفت اس سے محبت اس سے اکمل ہوتی ہے جس نے خیر وشر کی معرفت پائی ہی نہیں بلکہ کبھی جو سوائے خیر کے کسی کا عارف نہیں اس کے پاس اگر کبھی شر آئے تو وہ جان نہ سکے گا کہ یہ شر ہے! تو یا تو اس میں واقع ہو جائے گا اور یا اس طرح سے اس کا انکار نہ کرے گا جیسے وہ کرے گا جو اس کا عارف ہوگا، اسی لئے حضرت عمر نے کہا تھا اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹیں گی جب اسلام میں وہ لوگ ہوں گے جو جاہلیت سے آشنا نہیں ہوئے تو اسلام کا کمال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کی تمامیت جہاد فی سبیل اللہ ہے جو معروف میں پروان چڑھا اس کے غیر کا آشنا ہی نہیں تو اندیشہ ہوگا کہ اسے منکر اور اس کے ضرر کا علم ہی نہ ہو اسی لئے شر اور اس کے اسباب سے باخبر کے پاس۔ جب وہ حسنِ قصد والا ہو۔ اس سے احتراز واجتناب اور دوسروں کو بھی روکنے کا وہ جذبہ اور مادہ ہوتا ہے جو اس کے غیر کے پاس نہیں، اسی لئے صحابہ کرام بعد والوں کی نسبت ایمان وجہاد میں اعظم اور زیادہ سرگرم عمل تھے اس وجہ سے جو ان کے پاس خیر وشر کی کمال معرفت اور خیر کی کمال محبت اور شر کا کمال بغض تھا کیونکہ وہ جاہلیت کے احوال سے گزر کر آئے تھے لہذا اسلام، ایمان اور عملِ صالح کے حسن سے اور کفر اور معاصی کے قبح سے بخوبی واقف تھے، اسی

لئے جس نے مثلاً فقر، مرض اور خوف کا ذائقہ چکھا ہو وہ بنسبت اس کے جو کبھی ان سے آشنا نہیں ہوا ان پر اَحرص ہوگا اور اسے زیادہ قدر ہوگی اسی لیے کہا جاتا ہے: (الضِدُّ يُظْهِرُ حُسْنَهُ الضِّدُّ) (یعنی کسی چیز کے حسن کا پتہ اس کی ضد اور عکس سے ہوتا ہے) اور جیسے کہا گیا: (وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ) (اشیاء کا صحیح پتہ اور اندازہ ان کے معاکس اشیاء کو دیکھنے سے ہوتا ہے) حضرت عمر کہا کرتے تھے: (لَسْتُ بِخِبٍّ وَلَا يَخْدَعُنِي الْخَبُّ) (میں فریبی اور دغا باز نہیں لیکن کوئی فریبی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا) تو محمود اور سلیم قلب والا آدمی خیر کا مرید ہوگا شر کا نہیں اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ خیر اور شر کا عارف ہو تو جو شر سے آشنا ہی نہیں تو یہ اس میں نقص ہے اور یہ قابلِ تعریف نہیں

مراد یہ نہیں کہ ہر جس نے کفر اور معاصی کا ذائقہ چکھا وہ اس سے اس بارے اعلم اور اس کے لئے اکرہ (زیادہ برا سمجھنے والا) ہوگا جس نے ان کا ذائقہ نہیں چکھا، یہ امر مطرد (یعنی عمومی ضابطہ) نہیں بلکہ کبھی طبیب بیماروں سے زیادہ امراض کا عالم ہوتا ہے اور انبیاء کرام ادیان کے اطباء ہیں لہذا وہ دلوں کی اصلاح اور افساد کرنے والے امور سے سب کی نسبت زیادہ باخبر تھے اگرچہ انہوں نے شر کا وہ ذائقہ نہ چکھا تھا جو لوگوں نے چکھا لیکن مراد یہ ہے کہ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں شر چکھنے کی وجہ سے اس کی ایسی معرفت اور نتیجۃً اس سے ایسی نفرت ہوتی ہے جو دیگر کو نہیں ہوتی اور یہ جب خیر کی حلاوت سے آشنا ہوتے ہیں تو ان سے بڑھ کر ہوتے ہیں جو صرف خیر سے آشنا ہیں، جیسے کوئی مشرک یا یہودی یا عیسائی تھا اور اسے کفر یہ شبہات اور فاسد اقوال سے بخوبی معرفت ہے پھر اللہ نے اسلام کے لئے اس کا سینہ کشادہ کر دیا اور اس کے محاسن سے اسے روشناس کرا دیا تو یہ بعض ان سے بڑھ کر اس میں راغب اور کفر سے کراہت کرنے والا ہوگا جنہوں نے کفر اور اسلام کی حقیقت کی معرفت نہ پائی بلکہ اس کی بعض حقیقت کی اور اس کی بعض حقیقت سے معرض ہوگا یا اس کی مدح اور اس کی ذم میں مقلد ہوگا (یعنی دیکھا دیکھی اسلام پر چلنے والا) اس کی مثال جس نے بھوک مزا چکھا پھر اس کے بعد سیری سے آشنا ہوا یا بیماری کا مزا چکھا پھر اللہ نے صحت دی یا خوف کے عالم سے گزرا پھر امن عطا ہوا تو اسے اوروں سے بڑھ کر ان چیزوں کی قدر ہوگی اور اسی طرح جو اہلِ بدعت و فجور میں داخل ہوا پھر اللہ نے حق کو اس پر واضح کیا اور اسے توبہ نصوح کی توفیق دی اور جہاد فی سبیل اللہ کا موقع دیا تو اس کا جذبہ اور حق کے لئے اس کی تڑپ اوروں سے بڑھ کر ہوگی، نعیم بن حماد خزاعی کا قول ہے۔ اور یہ جہمیہ کے بڑے ناقد تھے۔ میں ان پر بہت شدید ہوں کیونکہ میں ان سے تھا اور اللہ کا فرمان ہے:

(ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) [النحل: ۱۱۰] (پھر جن لوگوں نے ایذائیں اٹھانے کے بعد ترکِ وطن کیا پھر جہاد کئے اور ثابت قدم رہے، تمہارا رب ان کو بے شک ان کے بعد بخشنے والا رحمت کرنے والا ہے) یہ آیت ان صحابہ کے بارہ میں نازل ہوئی جنہیں مشرکین نے ان کے دین سے فتنہ میں ڈال دیا تھا پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو جان چھڑا کر اللہ و رسول کی طرف ہجرت کی اور جہاد و صبر کیا، عمر بن خطاب

اور خالد بن ولید (اسلام لانے سے قبل) اسلام کے معاملہ میں بڑے سخت تھے لیکن جب اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے تو اب یہی سختی اسلام کے مفاد اور حق میں کرنے لگے اور ان پر متقدم ہوئے جو ان سے پہلے اسلام لا چکے تھے بلکہ ان میں سے کئی تو ایمان اور عملِ صالح میں بھی ان سے کمتر تھے اور خاص طور سے حضرت عمر اپنے ایمان، اخلاص، صدق، معرفت، فراست اور نور میں اکمل اور ہوائے نفس سے ابعد ہوئے اور اللہ کے دین کو سر بلند کرنے میں اعلی ہمت والے ہوئے، سوائے حضرت ابو بکر کے تمام اہلِ اسلام پر مقدم اور فائق تھے تو ثابت ہوا کہ اعتبار کمالِ انتہا کا ہوتا ہے نہ کہ نقصِ ابتدا کا

اسرائیلیات میں ذکر کیا جاتا ہے کہ **اللہ تعالی نے حضرت داوٗد سے کہا** گناہ (یعنی جو تقصیر ان سے سرزد ہوئی) کو تو ہم نے معاف کر دیا مگر وہ (پہلی سی) محبت واپس نہیں آسکتی تو یہ اگر صحیح بھی ہو تو ہمارے لئے شرع نہیں اور ہم اپنے دین کی بناء اس پر نہیں رکھ سکتے، توبہ کے ضمن میں دینِ محمدی نے وہ ضابطہ دیا ہے جو سابقہ کسی دین میں نہ تھا اسی لئے آپ ؐ نے کہا میں نبیِ رحمت اور نبیِ توبہ ہوں اور اللہ نے آپ کے ساتھ وہ آصار واغلال (بندشیں اور قیود) رفع کر دئے جو سابقہ امم پر تھے، قرآن میں کہا: (اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ) (ابھی گزری) اور خبر دی کہ اللہ بندے کی توبہ سے اس سے بڑھ کر خوش ہوتا ہے جس کی سواری گم ہو گئی تھی پھر مل گئی تو جب اللہ کی توبہ پر فرحت کا یہ عالم ہے اور یہ اس کی محبت ہے تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ پہلی سی محبت نہ ہو گی؟ جبکہ وہ غفور، وَدود اور فعال لما یرید ہے لیکن اس کی وُدومحبت اس کے بحسب ہے جو بندہ توبہ کے بعد اس کے تقرب کی سعی کرے تو اگر وہ پہلے سے بڑھ کر حق تعالی کے محبوبات کو بجا لائے تو یقیناً اللہ کی اس سے مودت بھی پہلے سے بڑھ کر ہو گی کیونکہ جزا اور بدلہ عمل کی جنس سے ملتا ہے اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (یہ قرآنی آیت ہے: وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ) صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالی فرماتا ہے جس نے میرے کسی ولی سے معادات کی اس نے مجھے جنگ کرنے کی دھمکی دی اور بندہ میرے فرائض کو ادا کرنے کی مثل کے ساتھ میرا تقرب حاصل نہیں کر سکتا (یعنی جتنا تقرب فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے اسے ملتا ہے اس کی مثال نہیں) اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ساتھ میرا تقرب پاتا رہتا ہے حتی کہ ایک وقت آتا ہے کہ میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں، جب اسے یہ مقام مل جائے تو پھر میں اسکا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ سنتا ہے اس کی آنکھ۔ الخ (کئی دفعہ گزری) اور معلوم امر ہے کہ انبیاء کے بعد افضل اولیاء سابقین اولین مہاجرین وانصار ہیں اور وہ سب کفر وشرک اور معاصی کا مزا چکھ چکے تھے پھر اللہ نے انہیں اسلام کی دولت سے نوازا اور جب فرائض کے بعد نوافل کا التزام کیا تو اللہ تعالی کے محبوب بن گئے، فرمایا:

(عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) [الممتحنة : ۷] (عجب نہیں کہ اللہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تم دشمنی رکھتے ہو دوستی پیدا کر دے اور اللہ قادر ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے) یہ ان مشرکین بارے نازل ہوئی جنہوں نے اللہ ورسول سے معادات کی مثلا اہلِ احزاب جیسے ابوسفیان بن حرب، ابوسفیان بن حارث،

حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ اور کئی دیگر، تو یہ سب اللہ ورسول سے معادات کرنے کے بعد ان سے موالات اور مودت کرنے والے بنے اور یہ اس ضمن میں باہم متفاوت تھے عکرمہ، سہیل اور حارث بن ہشام ابوسفیان بن حرب و نحوہ سے مودت میں اعظم تھے، صحیح میں ہے کہ والدہ حضرت معاویہ ابوسفیان کی زوجہ ہند نے کہا یا رسول اللہ ایک وقت تھا کہ روئے زمین پر کوئی اہلِ خیمہ آپ کے اہلِ خیمہ سے بڑھ کر مجھے مبغوض نہ تھے اور اب حالت یہ ہے کہ آپ کے اہلِ خیمہ سے زیادہ معزز اور محبوب کوئی اہلِ خیمہ نہیں، اور معلوم امر ہے کہ محبت اور مودت جو اہلِ ایمان کے مابین ہے وہ دراصل اس محبت کے تابع ہے جو انہیں اللہ سے ہے تو ایمان کی مضبوط ترین کڑی اللہ کی خاطر محبت اور اس کی خاطر بغض ہے اور اللہ کے لئے حب کمالِ توحید سے ہے اور اللہ کے ساتھ (کسی اور سے بھی حقیقی) محبت شرک ہے، فرمایا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا) [البقرۃ: ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں) تو یہ مودت جو رسول و مومنین کے مابین اور ان کے مابین جو مشرکین میں سے ان کے معادی تھے اللہ کی خاطر اور اس کی وجہ سے تھی، جو اللہ سے محبت کرے اللہ اس سے کرتا ہے تو اللہ کی ان سے یہ محبت و مودت ان کی توبہ کے بعد ہوئی کیونکہ انہوں نے بھی اللہ سے محبت اور مودت کی لہذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ توبہ کے نتیجہ میں مغفرت تو مل جائے گی مگر محبت نہیں، اگر کوئی کہے یہ تو کافر تھے جنہیں پتہ ہی نہ تھا کہ جن امور میں وہ پڑے ہوئے ہیں وہ حرام امور ہیں بلکہ یہ جہال تھے بخلاف اس کے جس نے جانتے بوجھتے حرام کام کیا تو اس کا جواب دو وجہ سے ہے: ایک، کہ معاملہ اس طرح نہیں بلکہ کثیر کفار جانتے تھے کہ محمد رسولِ برحق ہیں لیکن حسد اور تکبر کی وجہ سے آپ سے معادات کی، ابوسفیان نے تو وہ کچھ اخبارِ نبوت سنی تھیں جو ان کے غیر نے نہیں سنی تھیں مثلاً جو انہوں نے امیہ بن ابوصلت سے اور جو بادشاہِ روم ہرقل سے سنا اور اپنے اندر کی بات بتلائی کہ انہیں ہمیشہ سے یقین تھا کہ نبی اکرم کا امر عنقریب غالب آئے گا حتی کہ اللہ نے ان کے دل میں اسلام کو داخل کر دیا اور انہیں شروع میں یہ ناگوار لگا تھا، ان سے یرموک کے موقع اور دیگر کئی مواقع پر وہ کچھ سنا گیا تھا جو ان کے حسنِ اسلام اور اس عظیم عداوت کے بعد اللہ ورسول سے ان کی محبت پر دال ہے، قرآن میں ہے:

(وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ --- يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا) [الفرقان: ۶۸ ـ ۷۰] (اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں پکارتے ---تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا) تو جب اللہ سیآت کو حسنات سے تبدیل کر دیتا ہے تو حسنات تو اللہ کی ان سے محبت کی موجب ہیں، سیآت کی حسنات کے ساتھ یہ تبدیلی اسی کے ساتھ مختص نہیں جو پہلے کافر تھا پھر اسلام قبول کیا، فرمایا:

(اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا) [النساء: ۱۷] (اللہ انہیں لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں پھر

جلد توبہ کر لیتے ہیں پس ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ مہربانی کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا حکمت والا ہے) ابو العالیہ کہتے ہیں میں نے صحابہ کرام سے اس آیت بارے سوال کیا تو انہوں نے کہا ہر جس نے اللہ کی نافرمانی کی وہ جاہل ہے اور ہر جس نے موت سے قبل توبہ کر لی اس نے (مِنْ قَرِيْبٍ) توبہ کر لی (یعنی اس قرآنی آیت کا مصداق بنا اور بر وقت توبہ کر لی)

دوم، کہ جو ایک سے دوسرے تائب اور اللہ کی تائبین سے محبت کے ضمن میں فرق ذکر کیا گیا ہے اس کے لئے کوئی اصل نہیں بلکہ کتاب وسنت دال ہیں کہ اللہ تمام توابین سے محبت کرتا ہے اور ان کی توبہ پر خوش ہوتا ہے چاہے انہیں علم ہو کہ جو انہوں نے کیا وہ گناہ تھا یا نہ ہو! جسے اسے بات کا علم ہو کہ اس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے پھر اس نے توبہ کر لی تو ضروری ہے کہ اپنے مذموم وصف کو محمود کے ساتھ بدل لے، اگر پہلے حق اس کی نظروں میں مبغوض تھا تو اب اسے محبوب کر لے، اگر پہلے وہ باطل کا دلدادہ تھا تو اب اس سے نفرت کرے تو تائب کا حق کی معرفت، محبت اور اس پر عمل اور باطل سے بغض اور اجتناب کی روش کو اختیار کرنا ان امور میں سے ہے جو اللہ کو پسند اور محبوب ہیں اور اللہ کی محبت بھی اسی کے بحسب ہوتی ہے جو بندہ اس کے محبوبات کو اپناتا ہے تو جتنا اس میدان میں سرگرم ہوگا اسی قدر وہ حق تعالیٰ کو پیارا اور اس سے قریب ہوگا اور جتنی اس کی اس محبت میں شدت اور قوت ہوگی اسی کے بحسب اللہ کی اس سے محبت ہوگی بلکہ اللہ اس کی سیآت کو حسنات میں بدل ڈالے گا اس لئے کہ اس نے بھی اپنی مذموم صفات کو محمود صفات کے ساتھ بدل ڈالا ہے کیونکہ جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے لہذا یہ اسرائیلی روایت قابلِ اعتماد نہیں لگتی اور اس کے ساتھ اس کے شبہ کا جواب ملا جو کہتا ہے اللہ نے اسی کو ہی نبی بنا کر مبعوث کیا ہے جو قبل از نبوت بھی معصوم تھا، یہ بات رافضی وغیرہ کئی حضرات کرتے ہیں

اسی طرح جو قائل ہے کہ اللہ نے اسی کو ہی نبی بنایا ہے جو نبوت سے قبل مومن تھا تو انہیں یہ توھم لگا ہے کہ ذنوب نقص وعیب ہوتے ہیں اگرچہ توبہ کر لی ہو اور یہی ان کی غلطی کا سبب ہے تو جس نے ظن کیا کہ توبہ نصوح کرنے کے باوجود تائب ناقص اور عیب دار رہے گا وہ عظیم غلطی کا شکار ہے تو وہ ذم وعقاب جو اہلِ ذنوب کو لاحق ہے تائب کے لئے اس میں سے کوئی شئ بھی حاصل نہیں لیکن یہ تب اگر جلدی سے (قرآنی الفاظ میں: مِنْ قَرِيْبٍ) توبہ کر لی لیکن اگر تاخیر کر دی تو عین ممکن ہے کہ گناہ کی کچھ سزا اور وبال بھگتنا پڑے (یعنی دنیا میں) انبیاء کرام توبہ کرنے میں تاخیر نہ کرتے تھے (یعنی تھوڑی بہت کوتاہی یا خلافِ اولی کام ہو جانے کی صورت میں) توبہ واستغفار کی طرف مسارعت اور مسابقت کرتے، وہ تاخیر کرنے اور گناہ پر برقرار رہنے سے معصوم ہیں اور جس نے کچھ وقت تاخیر کی اللہ نے اس کی اس حال کے ساتھ تکفیر کر دی جس میں اسے مبتلا کیا جیسے حضرت یونس کے ساتھ ہوا، یہ اس مشہور قول پر کہ ان کا القاء بعد از نبوت تھا لیکن جنہوں نے اسے قبل از نبوت قرار دیا تب اس کی حاجت نہیں، کفر اور گناہوں سے تائب کبھی ان سے افضل ہو جاتا ہے جو اس میں واقع نہیں ہوئے، اللہ نے حضرت برادرانِ یوسف بارے خبر دی جو ان سے گناہ سرزد ہوئے اور وہ اسباط ہیں جن کا تذکرہ قرآن کے متعدد مقامات میں ہوا، فرمایا:

(فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ)[العنکبوت: ۲۶] (پس ان پر لوط ایمان لائے اور (ابراہیم) کہنے لگے کہ

میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں) تو لوط حضرت ابراہیم پر ایمان لے آئے تھے پھر اللہ نے انہیں قومِ لوط کی طرف نبی بنا کر بھیجا، حضرت شعیب کے قصہ میں کہا:

(قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ)[الأعراف: ۸۸] (اُن کی قوم میں جولوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے اے شعیب! ہم تمہیں اور جولوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اُن کو اپنے شہر سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ، اُنہوں نے کہا خواہ ہم بیزار ہی ہوں) اور فرمایا:

(وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ) [إبراهيم: ۱۳-۱۴] (اور جو کافر تھے انہوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیں گے یا ہمارے مذہب میں داخل ہو جاؤ تو اللہ نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ہلاک کردیں گے۔ وراُن کے بعد تمہیں اس زمین میں آباد کریں گے یہ اُس شخص کیلئے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کرے) جب ظاہر ہوا کہ اعتبار کمالِ نہایت کا ہے تو اس کمال کا حصول توبہ اور استغفار کے ذریعہ ہوتا ہے! توبہ ہر انسان پر واجب ہے اولین وآخرین پر بھی واجب تھی جیسے کہا:

(لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا)[الأحزاب: ۷۲] (تا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر مہربانی کرے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے) اللہ نے آدم اور نوح اور خاتم الرسل نبی اکرم تک مابعد انبیاء کی توبہ بارے ذکر کیا، آنجناب پر آخری نازل ہونے والی آیات یا آخری نازل ہونے والی آیات میں سے سورۃ النصر ہے:

(اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا) [النصر: ۱-۳] (جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور فتح ہوئی۔ اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج درفوج اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں۔ تو پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے) صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم بکثرت رکوع اور سجود میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ) کہتی ہیں آپ قرآن کی (سورۃ النصر کی) تاویل میں یہ کرتے تھے (یعنی عمل پیرا کرتے ہوئے) اس سے قبل آپ پر یہ آیت نازل ہو چکی تھی:

(لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ) [التوبة : ۱۱۷] (بے شک اللہ نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر باوجود اس کے کہ اُن میں بعضوں کے دل جلد پھر جانے کو تھے، مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کیساتھ رہے پھر اللہ نے اُن پر مہربانی فرمائی بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا (اور) مہربان ہے) بخاری میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے اے لوگو اپنے رب کی طرف توبہ کرلو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں دن میں ستر سے زائد مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں، مسلم میں اغر مزنی راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا میرے دل میں بھی کئی دفعہ خیالات کی بھرمار ہوجاتی ہے اور میں دن میں سوسو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، سنن کی ابن عمر سے روایت میں ہے کہ ہم ایک ہی مجلس میں نبی اکرم کی زبانِ مبارک سے استغفار کے کلمات کا شمار کیا کرتے تو آپ کئی دفعہ سو مرتبہ یہ کلمات کہا کرتے تھے: (رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ)

صحیحین میں ابوموسیٰ راوی ہیں کہ نبی اکرم یہ دعا بھی کیا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَاِسْرَافِيْ فِيْ اَمْرِيْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ هَزْلِيْ وَجِدِّيْ وَ خَطَئِيْ وَعَمَدِيْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) (اے اللہ میری خطا، جہل اور اپنے امر میں میرا اسراف معاف فرما اور جس بھی میری لغزش کو تو جانتا ہے، اے اللہ ہنسی مذاق میں اور سنجیدگی میں جو بھول چوک ہوئی اسے معاف فرما، یہ سب مجھ میں ہوسکتی ہیں اے اللہ اگلی پچھلی، علانیہ اور پوشیدہ سب تقصیرات کو معاف فرما، جو بھی تیرے علم میں ہیں، تو ہی مقدم اور موخر ہے اور ہر شئ پر قادر ہے) صحیحین کی ابو ہریرہ سے روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تکبیر (اولی) اور قراءت کے درمیان جب سکوت کئے ہوتے ہیں تو کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا میں کہتا ہوں: (اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالثَّلْجِ وَالْمَاءِ وَالْبَرَدِ) (اے اللہ میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اتنی دوری کر جیسی مشرق اور مغرب کے مابین ہے، اے اللہ مجھے اس طرح گناہوں سے صاف کر جیسے سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے، اے اللہ میری خطائیں برف، پانی اور اولوں سے دھوڈال) مسلم وغیرہ میں ہے کہ انہی جیسے کلمات رکوع سے اٹھ کر (قومہ میں) بھی پڑھتے، مسلم میں حضرت علی سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم دعائے استفتاح میں یہ کلمات پڑھا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ إِلَّا اَنْتَ أَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَعَمِلْتُ سُوْءًا فَاغْفِرْ لِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اَنْتَ اِهْدِنِيْ لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا إِلَّا اَنْتَ) مسلم میں

ہے کہ آپ سجدوں میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے: (اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ کُلَّہٗ دِقَّہٗ وَجُلَّہٗ وَعَلَانِیَتَہٗ وَسِرَّہٗ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ) (اے اللہ میرے سب چھوٹے بڑے، اول آخر اور ظاہر اور خفیہ گناہ معاف فرما) سنن کی حضرت علی سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم کے پاس سواری لائی گئی تاکہ سوار ہوں تو آپ نے اللہ کی حمد کی اور یہ آیت پڑھی:

(سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ)[الزخرف: ۱۳-۱۴] (وہ پاک ہے جس نے اس کو ہمارے زیر فرماں کر دیا اور ہم میں طاقت نہ تھی کہ اس کو بس میں کر لیتے۔ اور ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) پھر اللہ اکبر کہا اور حمد کی پھر یہ کلمات کہے: (سُبْحَانَکَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) پھر آپ ہنس پڑے اور فرمایا رب تعالی اپنے بندے سے خوش ہوتا ہے جب وہ اغفرلی کہتا ہے، فرماتا میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی گناہوں کی مغفرت نہیں کرتا، قرآن میں ہے:

(وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) [محمد: ۱۹] (پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے لئے استغفار کرو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے بھی)

(اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ) [الفتح: ۱-۲] (ہم نے تم کو فتح مبین عطا کی۔ تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے) صحیحین کی حدیثِ شفاعت میں ہے کہ حضرت مسیح کے پاس جب لوگوں کا وفد آئے گا تو وہ کہیں گے محمد کے پاس جاؤ کہ وہ ایسے بندے ہیں اللہ نے جن کے اگلے پچھلے قصور معاف فرما دئے ہیں (یعنی دنیا ہی میں اللہ نے انہیں اپنی کامل رضا مندی کا سٹرٹیفکیٹ جاری کر دیا تھا) صحیح میں ہے کہ آپ (تہجد میں) اتنا طویل قیام فرماتے حتی کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، عرض کی گئی آپ کیوں یہ کرتے ہیں جبکہ اللہ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں تو فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ کتاب وسنت کی اس باب میں نصوص کثیر و متظاہر ہیں، اسی طرح صحابہ اور تابعین اور علماء کے آثار بھی لیکن منازعین ان نصوص کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو جہمیہ اور باطنیہ کی تاویلات کی جنس سے ہیں جیسے کئی اس موضوع پر کتب تالیف کرنے والوں نے کہا اور تدبر کرنے والے پر مخفی نہیں کہ یہ فاسد اور کلم کی ان کے مواضع سے تحریف کے باب سے ہیں جیسے آیت: (لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ) کی یہ تاویل کہ متقدم سے مراد حضرت آدم کی غلطی اور متاخر سے مراد آپ کی امت کی خطائیں ہیں، یہ معلوم البطلان قول ہے اور اس کی کئی ادلہ ہیں:

۱۔ آدم علیہ السلام کی توبہ اللہ نے قبل اس کے کہ انہیں زمین پر اتارا جائے قبول کر لی تھی چہ جائے کہ حدیبیہ کے سال جس میں یہ مذکورہ آیت نازل ہوئی چنانچہ فرمایا:

(وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیْہِ وَھَدٰی) [طٰہٰ: ۱۲۱-۱۲۲] (اور آدم نے اپنے رب کے حکم

کے خلاف کیا تو بے راہ ہو گئے۔ پھر ان کے رب نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ دکھلائی)

(فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ) [البقرة : ۳۷] (پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے) اور ذکر کیا کہ انہوں نے ان کلمات کے ساتھ دعا کی تھی:

(رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَ اِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَ تَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ)[الأعراف: ۲۳] (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے)

۲۔ کہ کہا جائے تمہارے نزدیک آدم منجملہ موارِدنزاع ہیں اور منازع کے نزدیک اس امر کی ضرورت نہیں کہ ان کے گناہ کی مغفرت کی جائے کیونکہ وہ بھی نبی ہیں اور جس نے کہا انبیاء سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا وہ یہ بات آدم و محمد تمام انبیاء صلوات اللہ علیہم بارے کہتا ہے

۳۔ اللہ تعالی کی یہ روش نہیں کہ جس نے گناہ نہیں کیا اس کے لئے بھی کوئی گناہ کر دے کہ وہ قائل ہے:

(وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی) [الإسراء : ۱۵] (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) تو ممتنع ہے کہ حضرت محمد کی طرف حضرت آدم یا آپ کی امت یا کسی اور کا گناہ مضاف کیا جائے (کیونکہ کہا: مِنۡ ذَنۡبِكَ) جبکہ اللہ کا قانون یہ ہے:

(فَاِنَّمَا عَلَیۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ) [النور: ۵۴] (تو جو ان کے ذمے ہے وہ انہی پہ ہے اور تم پر ہے جو تمہارے ذمے ہے) اور فرمایا:

(فَقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ) [النساء : ۸۴] (پس تم اللہ کی راہ میں لڑو تم اپنے سوا کسی کے ذمہ دار نہیں ہو) اگر ایسا کرنا جائز ہو تو یہ بھی جائز ہو کہ آپ کی طرف انبیاء کے گناہ مضاف کر دئے جائیں اور کہا جائے کہ (لِیَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ الخ) سے مراد تمام انبیاء اور سابقہ امم کے گناہ ہیں کیونکہ آپ روزِ قیامت تمام خلائق کے لئے شفاعت کریں گے اور آپ تمام اولادِ آدم کے سردار ہیں، فرمایا: (اَنَا سَیِّدُ وُلۡدِ آدَمَ وَلَا فَخۡرَ وَآدَمُ فَمَنۡ دُوۡنَهٗ تَحۡتَ لِوَائِیۡ یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ اَنَا خَطِیۡبُ الۡاَنۡبِیَاءِ اِذَا وَفَدُوۡا وَاِمَامُهُمۡ اِذَا اجۡتَمَعُوۡا) لہذا حضرت آدم کو کیوں مختص کیا جائے کہ صرف انہی کا گناہ حضرت محمد کی طرف مضاف کیا گیا تو اگر ان کی تاویل ماننا ہے تو کیوں نہ سب خلقِ خدا کے گناہ آپ کے لئے قرار دئے جائیں؟ اگر کہے اللہ نے تمام امم کے گناہ معاف نہیں کئے تو کہا جائے گا یہ کس نے کہا کہ آپ کی ساری امت کو معاف کر دیا گیا؟

۴۔ آپ کے اور مومنین کے ذنب کے مابین اس آیت میں تمییز کی گئی ہے: (وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ) تو مومنین کا گناہ آپ کا گناہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

۵۔ صحیح میں ثابت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ یہ تو آپ کے لئے، ہمارے لئے کیا ہے؟ تو

اللہ نے یہ آیت نازل کی:

(هُوَالَّذِیٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ) [الفتح : ۴] (وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی تا کہ ان کے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھے) تو دلالت ملی کی رسول اور سب اہلِ ایمان جا نتے تھے کہ قولہ:(لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ الخ) آپ کے ساتھ مختص ہے نہ کہ آپ کی امت کے ساتھ

۶۔ اللہ نے آپ کی تمام امت کے گناہ معاف نہیں کئے بلکہ ثابت ہے کہ آپ کی امت کے بعض لوگ اپنے گناہوں کی سزا بھگتیں گے، یا تو اس دنیا میں اور یا آخرت میں، یہ بالتواتر منقول ہے، صادق ومصدوق نے اس کی خبر دی ہے اور امت کے سلف اور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے اور یہ امر مشاہد ہے، اتنی مثالیں ہیں کہ احاطہِ شمار سے باہر ہیں، قرآن میں کہا:

(لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِهٖ)[النساء : ۱۲۳] (نہ تو تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر! جو شخص بُرے عمل کرے گا اُسے اُسی کا بدلہ دیا جائے گا) استغفار اور توبہ کبھی ترکِ افضل پر بھی ہوتا ہے تو جو افضل حال کی طرف منتقل کیا گیا وہ اب سابقہ حال سے تائب ہوتا ہے لیکن ذم اور وعید صرف گناہ پر ہی ہوتی ہے۔

فصل

جہاں تک سائل کا قول کہ کیا مجرد عقیدہِ توحید کے ساتھ گناہگار ہونے کا اعتراف غفران اور گناہوں سے صادر کربت کے کشف کا موجب ہے یا ابھی کسی اور شئ کی بھی ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ توحید کے ساتھ موجبِ مغفرت مامور بہ توبہ ہے (اور آئندہ سے نیک چال چلن کا عزم اور عمل) تو شرک کے بارے کہا کہ بغیر توبہ اس کی مغفرت نہ ہوگی، فرمایا:

(اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ) [النساء : ۱۱۶] (اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا) یہ قرآن میں دو جگہ کہا ہے، شرک کے علاوہ تمام گناہ توبہ سے بھی معاف ہو جاتے ہیں اور اگر توبہ نہ کی تو اب ان کا معاملہ مشیتِ الٰہی کے ساتھ معلق ہے جیسے کہا:

(قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا) [الزمر : ۵۳] (کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے) تو یہ توبہ کرنے والوں کے حق میں ہے، اسی لئے تعمیم اور اطلاق کیا اور حتماً کہا کہ وہ تمام گناہ معاف کر دے گا، اسی آیت میں کہا:(وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ) تو ماسوائے شرک کا استثناء کیا اور اسے اپنی مشیت کے ساتھ معلق کیا تو جب شرک کی مغفرت نہ ہوگی مگر توبہ کے ساتھ جبکہ دیگر کی تائب کے لئے معافی ہے اور کبھی بغیر توبہ کے بھی، جس کے لئے چاہے معاف کر دے تو گناہ کا اعتراف اگر توبہ کو بھی متضمن ہے تب تو یہ موجبِ مغفرت ہے اور اگر مغفرت ہوگئی تو عقوبت بھی زائل ہوئی کہ

مغفرت گناہ کے شر سے بچاؤ کا ذریعہ ہے! بعض حضرات قائل ہیں کہ غفر ستر ہے (یعنی چھپا لینا) ان کے بقول مغفرت اور غفار کی وجہ تسمیہ ہی یہ ہے کہ اس میں ستر کا معنی ہے، اللہ کے اسم (اَلْغَفَّارُ) کو (سَتَّار) کے ساتھ مفسر کیا، یہ غفر کے معنی میں تقصیر ہے تو مغفرت کا معنی: (وِقَایَةُ شَرِّ الذَّنْبِ) ہے (گناہ کے شر سے بچاؤ) اس طور کہ اب گناہ کی پاداش میں اسے سزا نہ بھگتنا ہوگی! جہاں تک مجرد ستر تو یہ اس امر کے مانع نہیں کہ اسے سزا بھگتنا پڑے جو ظاہراً یا باطناً گناہ پر معاقب ہوا تو اس کا مطلب ہوا کہ اسے مغفرت حاصل نہیں ہوئی، مغفرت کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو گناہ کیا تھا اس کی عقوبت نہ بھگتی، ہاں کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آزمائش وابتلاء اس کے اجر میں اضافہ کا سبب بنتی ہے تو یہ مغفرت کے منافی نہیں

اور اسی طرح جب توبہ کی تمامیت سے ہو کہ اب حسنات کرے تو **کئی حضرات توبہ میں تمامیتِ توبہ کو مشترط کرتے ہیں**، کبھی کوئی خیال کرتا ہے کہ وہ تائب ہو چکا لیکن وہ تائب نہیں ہوا ہوتا بلکہ تارک ہوتا ہے اور تارک غیرِ تائب ہے، کبھی کوئی گناہ سے اعراض کر لیتا ہے اس وجہ سے کہ اس کے دل میں اس کا خیال نہیں آیا یا اس کا موقع نہیں ملا، یا کسی غیر دینی سبب کی رو سے اس کا گناہ کرنے کا ارادہ منتفی ہوا تو یہ توبہ نہیں بلکہ (توبہ میں) اس امر کا اعتقاد ضروری ہے کہ یہ سیئہ ہے اور اس کا کرنا برا ہے کیونکہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے اور وہ اللہ کی خاطر (نہ کہ کسی اور وجہ سے) اسے چھوڑے، نہ کہ کسی مخلوق کی رغبت یا رہبت کی وجہ سے، توبہ عظیم ترین حسنات میں سے ہے اور حسنات میں اللہ کے لئے اخلاص اور اس کے امر کی موافقت مشروط ہے جیسے فضیل بن عیاض نے آیت:
(لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) [هود: ٧] (تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے) کی تفسیر میں کہا تھا: (اَخْلَصُهٗ وَاَصْوَبُهٗ) لوگوں نے کہا اے ابوعلی اخلص واصوب سے کیا مراد ہے؟ تو کہا عمل اگر خالص ہے مگر صائب نہیں تو وہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں اور اگر صائب ہے مگر خالص نہیں تب بھی عند اللہ مقبول نہیں، خالص یہ ہے کہ اللہ کے لئے ہو اور صواب یہ ہے کہ سنت کے مطابق ہو، حضرت عمر اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اے اللہ میرا سارا عمل صالح بنا اور خالص اپنی رضا کے لئے بنا، کسی اور کے لئے اس میں کوئی حصہ نہ بنا، توبہ پر ایک جگہ تفصیل سے بات کی ہے

جہاں تک اللہ کے لئے علی وجہ الخضوع گناہ کا اعتراف بغیر انقطاع کے تو یہ بھی مجرد استغفار سے ہے جس کے ساتھ توبہ نہیں اور یہ اس شخص کی مانند جو اللہ سے یہ دعا تو کرتا ہے کہ اے اللہ میرا گناہ معاف فرما مگر اس سے توبہ نہیں کی (یعنی توبہ یہ ہے کہ آئندہ سے نہ کرنے کا اللہ سے عہد کرے، استغفار تو سابقہ کئے ہوئے گناہ کی معافی کی درخواست ہے) اور یہ اللہ کی رحمت سے ناامیدی اور قنوطیت ہے اس کے لئے مغفرت ہو جانے پر قطع نہ کیا جائے گا کیونکہ اس نے مجرد ایک دعا کی ہے، صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا کوئی دعا کرنے والا نہیں جو ایسی دعا کرے جس میں اثم اور قطع رحمی نہ ہو مگر اس کے لئے تین میں سے ایک امر ہے: یا تو فوری اس کی دعا قبول کر لی جائے یا اس کی مثل ثواب اس کے نامہِ اعمال میں درج کر لیا جائے اور یا پھر اس کے بقدر شر اس سے دور کر لیا جائے، عرض کی گئی یا رسول اللہ پھر تو ہمیں

کثرت سے دعائیں کرنی چاہیں، فرمایا اللہ اکثر ہے! تو اس طرح کی دعا کے ساتھ کبھی مغفرت حاصل ہوسکتی ہے اور کبھی نہیں تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور شر کا پھیر دیا جانا ہو یا کسی اور خیر کا حصول ہو تو یہ نافع ہے (یعنی رائیگاں نہیں) جیسے دیگر ہر دعا ہے

بعض علماء کا قول کہ استغفار مع الاصرار (یعنی گناہ بھی کرتے رہنا اور مسلسل استغفار بھی کرتے رہنا) کذابین کی توبہ ہے تو یہ جب مستغفر علی وجہ التوبہ (یعنی توبہ کے بطور اور توبہ سمجھ کر) استغفار کرتا ہو یا مدعی ہو کہ اس کا استغفار توبہ ہے اور وہ اس کے ساتھ تائب ہے تو بلا شبہ اگر گناہ جاری ہیں تو وہ تائب نہیں بنا کہ توبہ اور اصرار باہم ضدین ہیں، اصرار توبہ کا مضاد ہے البتہ توبہ کے بغیر استغفار کا مضاد نہیں، قائل کا کہنا کہ **آیا گناہوں کا استحضار ضروری ہے؟** تو اس کا جواب کئی اصول پر مبنی ہے:

(ا) کسی ایک گناہ سے توبہ کسی اور گناہ پر لگے ہونے کے باوجود صحیح ہے، جب اس گناہ سے توبہ کا مقتضی دوسرے سے توبہ سے مقتضی سے اقوی ہے یا ایک سے مانع اشد ہے، یہی سلف وخلف کے ہاں معروف قول ہے، اہلِ کلام کی ایک جماعت کا موقف ہے مثلا ابو ہاشم کہ ایسی توبہ صحیح نہیں، ان کے بقول اس لئے کہ توبہ کا باعث اگر اللہ کی خشیت نہیں تو وہ صحیح توبہ نہیں اور خشیت تمام۔نہ کہ بعض۔ ذنوب سے مانع ہے قاضی ابویعلی اور ابن عقیل نے یہی موقف امام احمد سے بھی ایک روایت کے بطور نقل کیا کیونکہ مروذی نے نقل کیا ہے کہ ان سے ایسے شخص بارے پوچھا گیا جس نے بدکاری سے توبہ کر لی ہے لیکن نظر بازی نہیں چھوڑی تو کہنے لگے یہ کون سی توبہ ہوئی، جریر بن عبداللہ کہتے ہیں میں نے نبی اکرم سے اچانک نظر پڑ جانے بارے پوچھا تو فرمایا (اس کی تلافی یہ ہے کہ) اپنی نظر پھیر لو، احمد اور تمام ائمہ سے صحتِ توبہ کا قول ہی معروف ہے، اس سوال کے جواب میں احمد کی مراد یہ تھی کہ یہ عمومی توبہ نہیں کہ جس کے سبب تائبین سے مطلق توبہ کا حصول ہو، یہ مراد نہ تھی کہ اس کا گناہ کبائر پر مصر کے گناہ کی طرح ہے کہ ان کے متواتر نصوص اور ثابت اقوال اس کے منافی ہیں، امام کی کلام کو اس امر پر محمول کرنا کہ سب کو ملا کر دیکھا جائے اور یہ کہ اس کا بعض بعض کا مصدِق ہے اس امر سے اولی ہے کہ تناقض پر محمول کیا جائے بالخصوص جب دوسرا قول مبتدَع ہو، کسی سلف سے معروف نہیں، احمد کہا کرتے تھے ایسے مسئلہ میں تکلم کرنے (بحث وتمحیص) سے بچو جس میں تمہارے لئے امام نہ ہو (یعنی قبل ازیں کسی نے وہ بحث نہ کی ہو) فتنہ کے ایام میں کہا کرتے تھے میں وہ بات کیسے کہوں جو کہی نہیں گئی، احمد کی سنت و آثار کے لئے قوتِ رغبت اور اتباع اور اس کے برخلاف کی کراہت معروف ومتواتر ہے ہر خاص وعام جو ان کے احوال سے واقف ہے یہ جانتا ہے اور جو ذکر کیا کہ خشیت تو عموم کی موجب ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عین ممکن ہے بندہ ایک گناہ کی قباحت سے واقف ہو دوسرے کی قباحت سے نہیں تو توبہ تو اسی سے کرے گا جس کی قباحت سے واقف ہے

نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی قباحت سے واقف ہو لیکن اس کی ہوائے نفس ایک گناہ میں اس پر غالب ہوئی دوسرے میں نہیں تو اِس سے توبہ کی اُس سے نہیں جیسے کوئی بعض واجبات کی ادائیگی کرتا ہے اور بعض کی نہیں تو بہر حال جو توبہ کی ہے وہ اس

سے قبول ہے، دراصل معتزلہ کے لئے ایک فاسد اصل ہے، حکم میں انہوں نے خوارج سے موافقت کی ہے اگر چہ اسم میں ان کی مخالفت کی تو کہا اہلِ کبائر دوزخ میں مخلد ہیں وہاں سے نکل نہ پائیں گے، نہ شفاعت کے ذریعہ اور نہ کسی اور وسیلہ سے، ان کے نزدیک ممتنع ہے کہ ایک آدمی عذاب بھی بھگتے اور ثواب کا حقدار بھی ہو اس لئے کہ ان کے بقول کسی ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب تمام نیکیوں کا حبوط کر ڈالتا ہے لیکن صحابہ اور اہلِ سنت والجماعت کا موقف ہے کہ اہلِ کبائر آخر کار (اپنی اپنی سزا بھگت کر) جہنم سے نکل آئیں گے اور انہیں شفاعت کا فائدہ ہوگا اور ایک کبیرہ گناہ تمام نیکیوں کا حبوط نہیں کرتا لیکن اکثر اہلِ سنت کے ہاں کبھی کبیرہ گناہ اپنے مقابل نیکی کا حبوط کر دیتا ہے جیسے توبہ تمام برائیوں کا حبوط کر ڈالتی ہے تو کبیرہ کا مرتکب اگر حسنات لائے جن کے ساتھ اللہ کی رضا کا طالب بنا ہے تو اللہ تعالی ان پر اسے ثواب سے نوازے گا اگر چہ کبیرہ گناہ کی رو سے وہ عقوبت کا مستحق بنا ہو! قرآن سارق، زانی اور اہلِ ایمان کے باہمی قتل وقتال کے درمیان اور کفار کے حکم کے درمیان اسماء اور احکام میں فرق کرتا ہے، نبی اکرم کی سنتِ متواترہ اور صحابہ کرام کا اجماع اس پر دال ہے جیسا کہ ایک جگہ اس پر مبسوط بحث ہوئی ہے اور اس پر علماء کے ہاں قولہ:

(اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ)[المائدة: ۲۷] (اللہ پرہیزگاروں ہی کی قبول فرمایا کرتا ہے) کے ضمن میں اختلافِ آراء ہے تو خوارج اور معتزلہ کے قول پر نیکی قبول نہیں کی جاتی مگر اس سے جو مطلقاً تقوی اختیار کرے تو کسی ایک بھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے، مرجئہ کے نزدیک بس شرک نہ کرتا ہو تو انہوں نے اہلِ کبائر پر بھی اسمِ متقین کا اطلاق کیا ہے، اہل سنت و جماعت کے نزدیک ہر وہ عمل قبول ہے جس میں عامل اللہ سے ڈرا اور جسے اللہ کے لیے خالص اور اس کے امر کے موافق ہو کر کیا تو جس نے کسی بھی عمل کے ضمن میں یہ روش اختیار کی اس کا وہ عمل قبولیت سے نوازا گیا اگر چہ کسی اور عمل کے ضمن میں وہ عاصی ہو اور جس عمل کے ضمن میں تقوی اختیار نہ کیا اور خالص اللہ کے لئے اور اس کی شرع کے موافق نہ کیا وہ قبول نہ ہوا اگر چہ کسی اور عمل یا اعمال کے ضمن میں وہ متقی اور مخلص ہی ہوا ہو، بعض ذنوب سے توبہ کرنا اور بعض سے نہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی مامور بہا بعض حسنات کرے اور بعض نہ کرے بشرطے کہ جس کا ترک کر رہا ہے وہ اس کی صحت میں شرط نہ ہو جسے کر رہا ہے، جیسے اعمال میں ایمان مشروط ہے جیسے کہا:

(وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا) [الإسراء: ۱۹] (اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو، ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوتی ہے)

(مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً)[النحل: ۹۷](جو شخص نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہوگا تو ہم اُس کو پاک زندگی سے زندہ رکھیں گے)

(وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ) [البقرة: ۲۱۷] (اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا اور کافر ہی مرے گا

تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے) اصلِ ثانی یہ ہے کہ جس کے لئے ذنوب ہیں تو اس نے بعض سے توبہ کر لی اور بعض سے نہ کی تو یہ توبہ اس کی مغفرت کی مقتضی بنی جس سے کی ہے اور جس سے نہیں کی وہ ابھی باقی ہے اور اس کا اس کے ضمن میں حکم غیر تائب کا ہے نہ کہ تائب کا، مجھے اس ذیل میں کسی اختلافِ رائے کا علم نہیں مگر صرف اس کافر بارے جو اسلام لے آیا تو اس کا اسلام لانا کفر سے توبہ کرنے کو متضمن ہے (یعنی الگ سے توبہ کرنے کی اسے ضرورت نہیں) تو اس کے اسلام کی رو سے اس کا کفر مغفور ہوا اور کیا اس کے وہ گناہ بھی معاف کر دئے گئے جو اس نے حالتِ کفر میں کئے اور اسلام لا کر (الگ سے) ان سے تائب نہ ہوا؟ اس میں دو معروف قول ہیں :ایک کہ اس کے سبھی گناہ معاف ہو گئے اور یہ نبی اکرم کے اس اطلاقِ قول کی وجہ سے: (اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ) (اسلام اپنے سے سابقہ۔ گناہوں کا۔ ہدم کر دیتا ہے [یعنی مٹا ڈالتا ہے]) اسے مسلم نے نقل کیا پھر یہ آیت پیشِ نظر رہے: (قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ) [الأنفال : ۳۸] (ان۔کفار۔ سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ اُنہیں معاف کر دیا جائے گا) دوم کہ اسلام کی وجہ سے اس کی کامل مغفرت نہ ہوئی بس وہی گناہ معاف کئے جائیں گے جن سے وہ توبہ کرے گا، اگر اسلام قبول کر کے بھی کفر وشرک تو نہیں لیکن کئی اور کبائر گناہ پر پہلے کی طرح لگا ہوا ہے تو اس میں اس کا وہی حکم ہے جو اہلِ کبائر مسلمانوں کا ہے، اصول ونصوص اسی قول پر دال ہیں چنانچہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم سے حکیم بن حزام نے کہا یا رسول اللہ! کیا جاہلیت میں کئے گناہوں کی وجہ سے ہمارا مواخذہ ہوگا؟ فرمایا تم میں سے جس نے اسلام لا کر اچھے اعمال کئے اب جاہلیت کی بداعمالیوں پر اس کا مواخذہ نہ ہوگا لیکن جس نے اسلام میں بھی اساءت کی روش اختیار کی اس کی موجودہ اور سابقہ بداعمالیوں کی پکڑ ہوگی، تو یہ نص دال ہے کہ حالتِ کفر میں کئے اعمال کا مواخذہ صرف اسی سے مرفوع ہوگا جو اسلام میں آ کر پابندِ شرع مسلمان بنا نہ کہ اس سے جو ویسے کا ویسا ہی رہا البتہ کفر اور شرک کا ترک کر دیا لیکن ان گناہوں سے تائب نہیں ہوا، قولہ: (قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا الخ) دال ہے کہ کسی شئ سے رک جانے والے کا سابقہ وہ گناہ معاف کر دیا جاتا ہے، اس سے یہ دلالت نہیں ملتی کہ جن سے باز نہیں آیا وہ بھی معاف کر دئے جاتے ہیں اس لئے کہ کسی سے یہ کہنے والا: (اِنِ انْتَهَيْتَ غَفَرْتُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ) (اگر باز آ جاؤ تو سابقہ معاف کر دوں گا) اور اس طرح کا کوئی جملہ اگر بولا ہے تو عند الاطلاق اس سے یہی مفہوم ہے کہ خاص اس امر سے اگر تم باز آ گئے تو جو ماضی میں یہ امر کیا ہے اس کی بخشش ہو گئی، مطلقاً تمام گناہوں جن سے وہ باز نہیں آیا، کی مغفرت مراد نہیں، جہاں تک یہ حدیث کہ اسلام تمام ما قبل کا ہدم کر ڈالتا ہے، ایک روایت میں :(يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهٗ) کا لفظ ہے تو یہ بات آپ نے اس وقت کہی تھی جب حضرت عمرو بن عاص اسلام قبول کرنے مدینہ آئے اور بیعت کرتے وقت شرط پیش کی کہ ان کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں، اس پر آپ نے ان سے کہا تھا اے عمرو کیا جانتے نہیں

اسلام ما قبل کا ہدم کر ڈالتا ہے اور توبہ بھی ما قبل کا ہدم کر ڈالتی ہے اور ہجرت بھی ما قبل کا ہدم کر ڈالتی ہے اور معلوم امر ہے کہ توبہ اسی گناہ کی مغفرت کی موجب بنتی ہے جس سے توبہ کی ہے، یہ نہیں کہ تمام ذنوب کی مغفرت کی موجب بنے (الا یہ کہ مطلق توبہ کی ہو کہ اے اللہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اور یاد رہے کہ اس میں آئندہ نہ کرنے کا عہد اور عزم بھی شامل ہوتا ہے)

اصلِ ثالث یہ ہے کہ انسان کبھی کسی خاص گناہ کا استحضار کرتا ہے تو اس سے توبہ کرتا ہے اور کبھی وہ مطلق توبہ کرتا ہے، کوئی خاص گناہ اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتا تو اگر اس کی نیت عمومی توبہ کی ہو تو یہ اس کے تمام گناہوں کو متناول ہوگی اس لئے کہ عمومی توبہ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کے عمومی عزم کو متضمن ہوتی ہے اسی طرح ہر محظور (جو قبل ازیں کیا) پر عمومی ندامت کو بھی، ندامت کی بابت چاہے کہا جائے کہ وہ اعتقادات کے باب سے ہے یا ارادات کے باب سے، یا کہا جائے کہ وہ ان آلام کے باب سے ہے جو کسی ضار فعل کی وجہ سے نفس کو لاحق ہوتے ہیں تو جب دل محسوس کرے کہ ضار فعل کیا ہے تو اس کے لئے یہ معرفت ہوئی کہ اس کا یہ فعل سیآت سے تھا اور یہ بابِ اعتقادات سے ہے اور جو فعل کیا اس کی کراہیت ارادات کے باب سے ہے پھر اس کی رو سے جو اذیٰ وغم لاحق ہوئے یہ آلام کے باب سے ہے جیسا کہ فرح وسرور لذات کے باب سے ہیں نہ کہ اعتقادات وارادات کے باب سے، جن متفلسفہ اور ان کے متبعین نے کہا کہ لذت ملائم کا یہ ادراک کہ وہ ملائم ہے اور الم منافر (یعنی جو مناسبِ حال نہیں) کا ادراک اس طور کہ وہ منافر ہے تو یہ رائے صحیح نہیں! تو لذت اور الم دو حالتیں ہیں جو ملائم اور منافر کے متعقب ہیں (یعنی نفسِ ادراک نہیں بلکہ اس ادراک کے بعد والی حالت) تو اپنے لئے ملائم سے محبت مثلاً مرغوب طعام کی سی ہے جس کے لئے تین احوال ہیں: (۱) حُب! جیسے طعام کی اشتہاء (۲) ادراکِ محبوب، جیسے طعام تناول کرنا اور (۳) اس کے ساتھ حاصل لذت (اور سیری) تو لذت اشتہاء اور ذائقہ سے مغایر ایک امر ہے بلکہ یہ مشتہی کے ذوق کے لئے حاصل (اور اس کا نتیجہ) ہے نہ کہ بعینہ وہی اور اسی طرح مکروہ ناپسندیدہ ہے مثلاً ضرب لگانا تو اس کی کراہت ایک شیٔ ہے اور اس کا حصول ایک دیگر شیٔ اور اس کے ساتھ حاصل تکلیف تیسری شیٔ، اسی طرح وہ نعیم وسرور جو اللہ والے عارفین کو اس معرفت کی رو سے حاصل ہوتی ہے تو اللہ سے ان کی محبت ایک شیٔ ہے پھر ذکرِ محبوب سے جو حاصل ہوتا ہے وہ ایک دیگر شیٔ ہے پھر اس کے ساتھ حاصل لذت امرِ ثالث ہے اور بلا شبہ حب محبوب بارے شعور کے ساتھ مشروط ہے جیسے اشتہاء مشتہیٰ بارے شعور کے ساتھ مشروط ہے لیکن لذت میں مشروط شعور محبت میں مشروط شعور سے دیگر ہے تو اس ثانی کو ادراک، ذوق، نیل، وجد اور وصال کے الفاظ سے ذکر کیا جاتا ہے جن کے ساتھ محبوب کے ادراک سے تعبیر کیا جاتا ہے چاہے وہ بالباطن ہو یا بالظاہر، پھر یہ ذوق لذت کو مستلزم ہے اور لذت ایک ایسا امر ہے جس کا باطناً اور ظاہراً احساس ہر ذی حیات کو ہوتا ہے، ایک صحیح حدیث میں ہے فرمایا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمد کے نبی ہونے پر راضی ہوا، صحیحین کی ایک روایت میں ہے تین چیزیں ہیں جس میں وہ ہوں گی اس نے ایمان کی حلاوت پالی: جسے اللہ ورسول ہر ما سوا سے بڑھ کر محبوب

ہوں، جو اہل اللہ سے محبت کرے اور جو ارتداد کو اس طرح برا سمجھے جیسے ہر کوئی آگ میں جانے کو برا سمجھتا ہے

تو واضح کیا کہ ایمان کا ذائقہ وہی چکھتا ہے جو اللہ، اسلام اور محمدؐ پر راضی ہے، اسی طرح جو دوسری حدیث کے حوالے سے ذکر ہوا تو یہ حب ایمان کے لئے ہے اور کفر سے کراہت ایمان کی حلاوت کو مستلزم ہوئی جیسے پہلی حدیث میں مذکور رضا ایمان کا ذائقہ چکھنے کو اور یہی لذت ہے، یہ نفسِ تصدیق نہیں اور نہ دل میں حاصل معرفت اور محبت بلکہ یہ اس کا ماحصل، ثمرہ اور لازمہ ہے، یہ سب امور باہم متلازم ہیں، تو لذت پائی نہ جائے گی مگر حب اور ذوق کے ساتھ وگرنہ جس نے کسی شیٔ سے محبت کی لیکن کبھی اس کا ذائقہ نہ چکھا وہ کبھی اس کی لذت نہ پائے گا جیسے کسی کو کسی طعام کی اشتہاء تو ہو مگر کبھی اسے چکھا نہ ہو اور اگر ایسی چیز کو چکھے جس سے اسے محبت نہیں تو بھی لذت کا واجد نہ ہوگا، تو جب کسی شیٔ سے حب اور ذوق مجتمع ہو تو اس کے بعد لذت نصیب ہوگی اور اگر کسی شیٔ سے بغض اور بغیض شیٔ کا چکھنا حاصل ہو تو الم حاصل ہوگا تو جو گناہ کو مبغوض سمجھتا ہے اور اس کا ارتکاب نہیں کرتا اسے ندامت نہ ہوگی اور جو اسے مبغوض نہیں سمجھتا وہ اس کے ارتکاب پر نادم نہ ہوگا، اگر کر لیا اور پھر جانا کہ یہ اس کے ہاں مبغوض اشیاء میں سے ہے اور ضار ہے تو بھی نادم ہوگا، مسند میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا ندامت توبہ ہے، جب یہ واضح ہوا تو جس نے عمومی توبہ کی تو یہ اس کے تمام گناہوں کی مغفرت کی مقتضی بنی اگرچہ اعیان ذنوب کا استحضار نہ ہو، الا یہ کہ اس عموم کے موجب تخصیص کا معارض آڑے آئے مثلاً کہ بعض ذنوب کا اگر اس نے استحضار کیا ہوتا تو ان سے تائب نہ ہوا ہو، ان کے لئے اپنے قوی ارادہ کے مدِ نظر یا اپنے اس اعتقاد کی رو سے کہ وہ حسن ہیں قبیح نہیں تو ایسے گناہ اس کی عمومی توبہ میں داخل نہ ہوں گے لیکن اگر وہ مستحضر ہوں اور تائب ان سے بھی توبہ کی نیت کئے ہو تب وہ بھی شامل ہوں گے

جہاں تک **مطلق توبہ** وہ یہ کہ مجمل توبہ کرے مثلاً کہے یا اللہ میری توبہ! تو یہ ہر گناہ سے توبہ کو مستلزم نہیں تو یہ سبھی گناہوں کے اس میں دخول کی موجب نہ ہوگی مگر اس سے مانع بھی نہ ہوگی، مطلق لفظ کی مثل لیکن یہ توبہ موزوں ہے کہ کسی معین گناہ کے غفران کا سبب ہو جیسا کہ اس امر کے لئے بھی کہ تمام گناہوں کے غفران کا سبب ہو بخلاف عمومی توبہ کے تو یہ غفرانِ عام کے لیے مقتضی ہے جیسا کہ یہ عمومی لحاظ سے سب گناہوں کو متناول ہے! کثیر لوگ توبہ کرتے وقت استحضار نہیں کرتے مگر بعض متصف بالفاحشہ گناہوں کا یا ان کے مقدمات کا یا زبان اور ہاتھ سے کی ہوئی بعض زیادتیوں کا، عین ممکن ہے کہ وہ بعض ان امور کا تارک رہا ہو جو ایمان کی شُعَب اور اس کے حقائق میں سے باطناً اور ظاہراً اللہ نے اس پر واجب کی ہوں اور یہ ضرر کے اعتبار سے اس سے سرزد بعض فواحش سے اعظم ہوں کیونکہ اللہ نے کئی ایمانی حقائق کا امر دیا ہے جن کے ساتھ انسان حقاً مومنین میں سے ہو جاتا ہے تو ان کا نفع بعض ظاہری ذنوب سے اعظم ہے جیسے اللہ اور رسول سے محبت، تو یہ فعلی حسنات میں سے عظیم ترین ہے حتیٰ کہ صحیح کی ایک روایت میں ہے کہ عہدِ نبوی میں ایک شخص تھا لوگ جسے حمار کے لقب سے یاد کرتے تھے، وہ شراب نوشی کا عادی تھا اور جب بھی اس جرم میں نبی اکرم کے پاس لایا جاتا

آپ اس پر (شرعی) حد جاری کرتے، جب بار بار ایسا ہوا تو ایک موقع پر کسی کی زبان سے نکلا: کتنا ملعون آدمی ہے کہ بار بار مار کھاتا ہے پھر بھی باز نہیں آتا، اس پر نبی اکرم نے فرمایا اسے ملعون مت کہو کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، تو باوجود شراب نوشی کے عادی ہونے کے آپ نے اسے ملعون کہنے سے منع کیا کیونکہ اس کے دل میں اللہ اور رسول کی محبت ہے حالانکہ آپ نے شراب کے ضمن میں دس لوگوں پر لعنت فرمائی ہے: شراب پر، اس کے عاصر (یعنی نچوڑنے والے) اور معتصر (بوتلوں/ برتن میں بھرنے والے) پر، پینے والے، ساقی، لانے والے، اٹھانے والے، اس پر جس کے لئے اٹھائی گئی، اس کے تاجر پر، اس کے خریدار پر اور اس کے پیسے استعمال کرنے والے پر لیکن مطلق لعن معین شخص کی لعن کو مستلزم نہیں ہوتی وہ جس کے ساتھ کوئی ایسا امر قائم ہو جو اسے دائرہ لعنت میں شامل کرنے سے مانع ہو

اسی طرح **تکفیرِ مطلق اور وعیدِ مطلق کا معاملہ** ہے اسی لئے کتاب وسنت میں وعیدِ مطلق کئی شروط کے ثبوت اور کئی موانع کے انتفاء کے ساتھ مشروط ہے تو بالاتفاق تائب کے ساتھ کچھ بھی گناہ لاحق نہیں، اسی طرح اگر اس نے ایسی نیکیاں کی ہیں جو اس کی برائیوں کا محو کر دیں تو اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا نیز مشفوع لہ اور مغفور لہ کا بھی معاملہ یہی ہے تو توبہ، (ذنوب کا) محو کرنے والی حسنات اور مکفِر مصائب وہ اسباب ہیں جن کی رو سے آخرت کی عقوبات زائل ہو جائیں گی، اسی طرح اس سے بھی جسے عالمِ برزخ میں کچھ سختی کا سامنا کرنا پڑا اور اس سے بھی جسے عرصاتِ محشر میں کچھ شدت وسختی کے احوال واہوال کا سامنا کرنا پڑا، نیز اہلِ مومنین کی دعا بھی انہی مجملہِ اسباب کے ہے مثلاً نمازِ جنازہ اور ماذون شفیع کی شفاعت جیسے سید الشفعاء حضرت محمد کی شفاعت جسے نصیب ہوئی لہذا جس گناہ سے بندہ توبہ کرے اس کا موجب اس سے مرتفع ہو جائے گا اور جس سے توبہ نہیں کی اس پر ان ذنوب والا حکم جاری ہوگا جن سے اس نے توبہ نہیں کی، اگر گناہوں کے سبب کسی طرح کی شدت کا وہ شکار بنے اور بعض سے وہ تائب ہو جائے تو اسی بقدر اس شدت میں تخفیف کر دی جاتی ہے بخلاف ان کے جن سے توبہ نہیں کی، بخلاف عمومی توبہ کرنے والے کے، لوگ اپنے غالب احوال میں عمومی توبہ نہیں کرتے حالانکہ وہ اس کے محتاج ہیں، توبہ ہر حال میں ہر بندے پر واجب ہے اس لئے کہ کمی وکوتاہی سے کوئی بھی خالی اور مبرا نہیں (کس میں یہ طاقت ہے کہ ہر لمحہ شرع کے مطابق بسر کرے) کوئی نہ کوئی ترکِ مامور یا فعلِ محظور (یا خلافِ اولی) کام ہو ہی جاتا ہے

جہاں تک سائل کا یہ کہنا اس امر کا کیا سبب کہ کشائش خلق سے منقطع ہونے کے وقت ہی آتی ہے اور کیسے دل کو دنیاوی علائق سے پھیر کر اللہ سے اس کا تعلق جوڑا جائے؟ تو کہا جائے گا اس کا وسیلہ وسبب توحید کی تحقیق ہے، توحیدِ ربوبیت کی بھی اور توحیدِ الوہیت کی بھی، توحیدِ ربوبیت یہ ہے کہ کوئی خالق نہیں مگر اللہ، تو اس کے سوا کوئی بھی کسی بھی امر کے اِحداث کے ساتھ مستقل نہیں بلکہ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے وہ نہیں ہوتا، اس کا ہر ماسوا اگر کسی سبب کو مقدر کرے تو لازم ہے کہ اس کے لئے کہ کوئی نہ

کوئی معاون وشریک ہواور معوق (رکاوٹ بننے والی) ضد ہوتو اگر اس کے ماسوا کسی سے بندہ کسی بھی امر کے اِحداث کا طالب بنے تو اس سے ایسی شئ کا طالب بنا جس کے ساتھ وہ مستقل نہیں اور نہ اکیلا وہ اس پر قادر ہے حتی کہ اگر بندوں سے ان کے اختیاری افعال میں سے بھی کسی فعل کی طلب کی تو وہ اللہ کی اعانت کے بغیر اس کے کام نہیں آسکتے گویا وہ انہیں ان کا فاعل باور کررہا ہے اس امر کے ساتھ کہ وہ اس میں جازم ارادہ اور تام قدرت کا اِحداث کر دیں گے اور تام قدرت اور جازم ارادہ کے وجود کے وقت مقدور کا وجود واجب ہے (تو یہ کام بندے نہیں کر سکتے بلکہ) یہ صرف اللہ کی ذات ہے کہ جس اکیلے کی مشیت ہر اسے مستلزم ہے جس کا وہ ارادہ کرے تو تمام جہان اس کے دائرہِ مشیت میں ہے، کوئی اس کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتا جبکہ کسی غیر اللہ کا ارادہ ومشیت کسی شئ کو مستلزم نہیں بلکہ انسانوں کے ارادے اس کی مقدور سے خارج امور واسباب کے بغیر عملی جامہ نہیں پہن سکتے، اگر رب کی اسے اعانت حاصل نہ ہوتو اس کی مراد حاصل نہ ہو، اس کے نفسِ ارادہ کا ہی حصول نہ ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ جیسے کہا:

(لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) [کورت: ۲۸۔ ۲۹] (جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے)

(فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا)[الدھر: ۲۹۔۳۰](یہ تو نصیحت ہے سو جو چاہے اپنے رب کی طرف پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ کو منظور ہو بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے) تو مخلوق سے اپنی کوئی امید باندھنے والا دل سے اس سے کسی شئ کا طالب بنا ہوا ہے حالانکہ وہ اس سے عاجز ہے تو یہ اللہ کا اپنے مومن بندوں پر کمالِ نعمت واحسان ہے کہ شرک کے ساتھ ان کے مطالب کا حصول ممکن نہ بنائے حتی کہ ان کے دلوں کو توحید کی طرف پھیر دے پھر اگر بندہ توحیدِ الوہیت پر کاربند رہے تو اس کے لئے دنیوی اور اخروی سعادت حاصل ہوگی اور اگر وہ اس طرح کا بنے جن کی بابت کہا:

(وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)[یونس: ۱۲] (اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دُور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف کے پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو اُن کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں)

(وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا) [الإسراء: ۶۷] (اور جب تمہیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو جن کو تم پکارتے ہو سب اس کے سوا گم ہو جاتے ہیں پھر جب وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو! اور انسان ہے ہی ناشکرا) تو اس کی وحدانیت سے جو اس

کے لئے حاصل ہوا وہ اس پر حجت ہے! جیسے اللہ تعالی نے مشرکین جو مقر تھے کہ وہ ہر شئ کا خالق ہے اس کے باوجود مشرک بنے اور اس کی وحدہ لاشریک عبادت نہ کی، حجت پیش کرتے ہوئے کہا:

(قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ) إلى قوله : (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ)[المأمنون : ۸۴۔۸۹](کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا ہے؟۔۔۔فوراً کہہ دیں گے کہ ایسی بادشاہی تو اللہ ہی کی ہے تو کہو پھر کیوں تم مسحور ہوئے جاتے ہو؟)

(وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ) [العنكبوت: ٦١] (اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے زیرِ فرماں کیا؟ تو کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔تو پھر یہ کہاں الٹے جا رہے ہیں) قرآن کے متعدد مواضع میں یہ مذکور ہے،تو اللہ تعالی کی اپنے مومن بندوں پر تمام نعمت سے ہے کہ انہیں کچھ سختیوں اور تنگیوں میں مبتلا کرے جو اس کی توحید کی طرف ان کا اِلجاء کریں تو اس کے لئے اخلاصِ دین کریں اور اپنی سب امیدیں اسی سے باندھیں کسی غیر اللہ سے کوئی امید وابستہ نہ کریں اور ان کے دل اسی سے متعلق ہوں کسی غیر اللہ کے ساتھ نہیں تو ان کی وجہ سے ان میں توکل اور انابت الی اللہ کا مادہ پیدا ہو اور وہ ایمان کی حلاوت اور اس کا ذائقہ چکھیں اور شرک سے براءت تو اس کی عظیم ترین نعمت ہے مرض،خوف اور قحط سالی کے زوال سے بھی بڑھ کر،اسی طرح حصولِ یسر اور معیشت کی بدحالی کے زوال سے بھی بڑھ کر کہ یہ سب نعمتیں تو بدنی اور دنیوی نعمتیں ہیں جو کفار کو بھی بدرجہ اَتم مل سکتی ہیں بلکہ ملتی ہیں اور یہ جو نعمت ہے اس کا تعلق ہمیشہ قائم و موجود رہنے والے دار و محل سے ہے لہذا کوئی اس کی نظیر نہیں اور ہر مومن کے لئے اس کے ایمان کے بقدر اس میں سے حصہ و نصیب ہے اسی لیے بعض سلف نے کہا: اے ابن آدم جتنا تو اپنے آقا کا دروازہ کھٹکھٹائے گا اتنی ہی زیادہ تیری حاجات پوری کی جائیں گی،بعض شیوخ کا قول ہے کہ مجھے جب اللہ کا در کھٹکھٹانے کی حاجت ہوتی ہے تو ایسی اس کی معرفت کی لذت اور مناجات کی حلاوت ملتی ہے کہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میری یہ حاجت جلد پوری نہ ہو اور یہ اس خیال سے کہ اس اس لذت و حلاوت سے محروم ہو جاؤں گا،اس لیے کہ نفس کو تو اپنی حاجت سے غرض ہے،وہ جب پوری ہو گئی تو وہ اپنے کام پہ لگ جاتا ہے،ایک اسرائیلی روایت میں ہے: اے ابن آدم (حدیثِ قدسی ہے) بلاء میرے اور تیرے درمیان جمع کر دیتی ہے (یعنی ہم دونوں کو اکٹھا کر دیتی ہے) جبکہ عافیت تیرے اور تیرے نفس کے مابین جمع کر دیتی ہے (یعنی پھر تو مجھے بھول جاتا ہے) یہ معاملہ مومن کے لئے باطنی حس کے ساتھ موجود،مذُوق اور محسوس ہے،ہر مومن اس حالت سے آشنا ہے جو ہم نے ذکر کی،تو یہ ذوق اور حس کے باب سے ہے، اس کی معرفت اسے ہی ہوگی جو اس کا ذوق و احساس رکھتا ہے،ذوق کے لفظ کی بابت اگرچہ سمجھا جائے کہ فی الاصل یہ زبان کے ساتھ ذوق (یعنی چکھنے) کے لئے خاص ہے تو ایسا نہیں کہ کتاب و سنت میں اس کا استعمال دال ہے کہ یہ اس سے اعم ہے، یہ ملائم اور منافر کی

بابت احساس کرنے میں بھی مستعمل ہے جیسے احساس کا لفظ عرفِ عام میں حواسِ خمسہ کے ساتھ احساس کرنے میں مستعمل ہے مگر در حقیقت باطن کے ساتھ بھی (جسے چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے) جہاں تک لغت میں تو اس کی اصل رویت ہے جیسے کہا:

(هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا) [مریم : ۹۸] (بھلاتم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا ان کی بھنک سنتے ہو) تو یہاں خوف اور جوع کو مذوق کیا اور ان کی طرف لباس کی اضافت کی تاکہ اشعار ہو کہ بھوک اور خوف اس قدر عام اور کثیر ہوئے اور کامل احاطہ کر لیا جیسے لباس جسم کا احاطہ کرتا ہے بخلاف اس کے کہ الم جس کے مشاعر پر حاوی نہیں ہوئی بلکہ بعض مواضع کے ساتھ مختص ہوئی ہے، فرمایا:

(فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ) [الأحقاف: ۳۴] (پس بوجہ اس کے جو تم انکار کیا کرتے تھے عذاب کے مزے چکھو)

(ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ)[الدخان: ۴۹] (مزا چکھ تو بڑی عزت والا سردار ہے)

(لَايَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى) [الدخان: ۵۶] (پہلی دفعہ مرنے کے سوا موت کا مزا نہیں چکھیں گے)

(ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ)[القمر: ۴۸] (اب آگ کا مزہ چکھو)

(لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اِلَّا حَمِيْمًا وَّ غَسَّاقًا جَزَآءً وِّفَاقًا) [النبأ : ۲۴-۲۶] (وہاں نہ ٹھنڈک کا مزا چکھیں گے نہ پینا۔ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ- بدلہ ہے پورا پورا)

(وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ) [الم السجدة : ۲۱] (اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا دنیا کا عذاب بھی چکھائیں گے شاید پلٹ آئیں) ایک حدیث کے الفاظ ہیں:(ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَباًّ -- الخ) (اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب ہونے -- راضی ہوا) تو ذوق کے لفظ کا استعمال ملائم اور منافر کے ادراک میں کثیر ہے، ایک حدیث میں کہا: (ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ) (تین چیزیں ہیں جس میں وہ ہوں اس نے ایمان کی حلاوت پالی) تو مومن کا اپنے دل میں ایمان کی حلاوت کو پانا اور ایمان کے ذائقہ کو چکھنا ایسا امر ہے جسے ہر وہ پہچانتا ہے جس کے لئے یہ وجد حاصل ہوا اور اس ذوق کے حاملین ایک دوسرے سے متفاوت ہیں تو جو اہلِ ایمان کے لئے حاصل ہے اپنے قلوب کے توحید کی اللہ کی طرف تجرید کے وقت اور اس پر ان کے متوجہ ہونے کے وقت جب اس کے تمام ما سوا کو چھوڑ کر اس کے لئے حنفاء ہو کر اخلاصِ دین کرتے ہیں، کسی بھی شئ سے اگر محبت کریں تو اللہ ہی کی خاطر کرتے ہیں، اس کے سوا کسی پر توکل نہیں کرتے، کسی سے دوستی یا دشمنی کا دم بھرتے ہیں تو فقط اسی کی خاطر، اس کے سوا کسی کے سامنے دستِ سوال وطلب دراز نہیں کرتے، اس کے سوا کسی سے امیدیں نہیں باندھتے، اس کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے، اسی کی ہی عبادت اور اسی کے ساتھ استعانت کرتے ہیں، وہ حق کے پاس بلا خلق اور خلق کے پاس بلا ہوئی ہوتے ہیں، اللہ کے ارادہ کے ساتھ ان سے

اس کے ماسوا کا ارادہ فناء ہو چکا اور اس کی محبت کے ساتھ ماسوا کی محبت اور اس کے خوف کے ساتھ ماسوا کا خوف اور اس سے امید کے ساتھ ماسوا سے امید اور اس سے دعا کے ساتھ ماسوا سے دعا، تو یہ وہ وجد اور ذوق ہے جس کے برابر کوئی وجد و ذوق نہیں اور اس سے آشنا وہی ہوگا جو صاحبِ نصیب ہے اور ہر مومن کے لئے اس سے تھوڑا بہت نصیب ہے اور یہ ہے اس اسلام کی حقیقت جس کے ساتھ اللہ نے رسل مبعوث کیے اور کتب نازل کیں اور یہ قرآن کا قطب ہے جس کے گرد اس کی چکی گھومتی ہے! واللہ سبحانہ اعلم۔

فصل

صوفیہ کی کلام میں جو فناء کی اصطلاح پائی جاتی ہے اسے تین امور کے ساتھ مفسر کیا جاتا ہے:

(۱) دل کا رب کے ماسوا کا ارادہ، اس پر توکل اور اس کی عبادت کرنے سے فناء اور جو دیگر اس کے توابع ولوازم ہیں تو یہ معنی حق اور صحیح ہے اور یہ خالص توحید و اخلاص ہے اور یہ فی الحقیقت دل کی عبادت، اس کا توکل، استعانت، تألّہ، انابت، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی طرف توجہ اور جو اس کے معارف و احوال توابع ہیں، کسی کے لئے اس سے خروج کی سبیل نہیں تو ایسا دل قلبِ سلیم ہے! جس کے بارہ میں کہا:

(اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) [الشعراء : ۸۹] (مگر جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آیا) اور یہ دل کا فاسد اعتقادات، ارادات اور توابع سے سالم ہونا اور یہ وہ فناء ہے کہ بقاء اس کے منافی نہیں بلکہ وہ اور بقاء باہم مجتمع ہیں تو بندہ اللہ کے ماسوا کے ارادہ سے فانی ہوتا ہے اگرچہ وہ اللہ کے ساتھ اور سوا کے ساتھ شاعر ہو (یعنی دل میں اس کا بھی خیال ہو) اور یہ (لا الہ الا اللہ) کا ترجمہ (اور تفسیر) ہے، نبی اکرم یہ کلمات کہا کرتے تھے: (لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ) فی الجملہ یہی دین کا اول و آخر ہے

(۲) دل کا ماسوائے اللہ کے شہود سے فناء تو وہ ارادہ سے جبکہ یہ شہادت سے فناء ہے، وہ غیر کی عبادت اور اس پر توکل کرنے سے فنا ہے جبکہ یہ غیر بارے علم اور اس کی طرف نظر سے فناء ہے، اس فناء میں نقص ہے تو حقائق کا ان کی حقیقت پر شہود اور وہ رب کا اپنے بندوں کے لئے مدبر اور اپنی شرائع کے آمر ہونے کی حیثیت میں شہود ہے اور یہ اس کے وجود یا اس کی صفات میں سے کسی صفت یا اس کے اسماء میں سے کسی اسم کے شہود سے اکمل ہے، اس کے ساتھ فناء اس کے تمام ماسوا کے شہود سے فناء ہے اسی لئے صحابہ کرام کا شہود اکمل تھا اس سے کہ مجملاً حق کے لئے شہود اس کے مفصلاً شہود سے ناقص ہو البتہ اس میں سے کثیر اس امت کے کثیر متاخرین کے لئے عارض ہوا جیسا کہ بعض مثلاً موت، غشی، صیاح (چیخ مارنا) اور اضطراب حقائق کی تجلی کے وقت ان کے لئے عارض ہوتے ہیں اور یہ حقائق کے ان کی حقیقت پر شہود سے دل کے ضعف کی وجہ سے اور فی الجمع تفرقہ اور فی الوحدت کثرت کے شہود سے حتی کہ اس کے امکان بارے باہم اختلاف کیا، ان میں سے کثیر کی رائے ہے کہ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کیونکہ دیکھا کہ جب خلق یا امر کا ذکر کرتا ہے تو خالق و آمر سے مشغول ہو جاتا ہے اور جب نبی اکرم اور آپ کے خلفاء کے ساتھ اس کا معارضہ کیا جائے تو

اختصاص کا ادعاء کرتے ہیں یا جواب دینے سے اعراض کرتے یا تحیر کا شکار بنتے ہیں

اور اس کا سبب یہ ہے کہ تمام خلق کو اس پر قیاس کیا جو اپنے نفس میں پایا، اسی لیے ان کے بعض کا کہنا ہے کہ حق تعالی کی تجلی کے وقت اس کی کلام کا سماع ممکن نہیں، ابن عربی بارے نقل کیا جا تا ہے کہ جب اسے الشیخ شہاب الدین سہروردی بارے بتلایا گیا کہ ان دونوں کے اجتماع کو مجوّز قرار دیتے ہیں تو کہا ہم ان سے شہودِ ذات کی بات کرتے ہیں اور وہ ہمیں شہودِ صفات کی خبر دے رہے ہیں، صواب شہاب الدین کے ساتھ ہے، وہ رب تعالی کے بندوں سے امتیاز کے ضمن میں صحیح العقیدہ تھے، ابن عربی نے در اصل اپنے موقف کی بناء اپنی اس کفریہ اصل پر رکھی کہ حق ممکنات پر فائض وجود کا نام ہے اور معلوم امر ہے کہ اس کے شہود میں خطاب واقع نہیں ہو تا، خطاب تو مقامِ عقل میں ہے (بقول مرتب مولف کی تحریر میں یہ کلمہ واضح نہیں کیونکہ مسودہ میں خرم [شگاف] تھا)

اس نوع کے فناء میں (صاحبِ فناء) کبھی کہہ سکتا ہے: (اَنَا الْحَقُّ، سُبْحَانِیْ) (میں حق ہوں، میری پاکیزگی) یا: (مَا فِی الْجُبَّةِ اِلَّا اللّٰهُ) (جبہ میں نہیں مگر اللہ) کیونکہ وہ اپنے مشہود کے ساتھ اپنے شہود، اپنے موجود کے ساتھ اپنے وجود، اپنے مذکور کے ساتھ اپنے ذکر اور اپنے معروف کے ساتھ اپنے عرفان سے فناء ہو چکا ہے (یعنی اپنی ذات کو کلیۃً فراموش کر چکا ہے) جیسے بیان کیا جا تا ہے کہ ایک شخص کسی کی محبت میں مستغرق تھا تو ایک دن اس کا محبوب دریا میں گر گیا تو اس نے بھی اس کے پیچھے دریا میں چھلانگ لگا دی، اس نے کہا تم نے کیوں چھلانگ لگا دی؟ بولا: (غِبْتُ بِكَ عَنِّیْ فَظَنَنْتُ اَنَّكَ اِنِّیْ) (یعنی: من تو شدم تو من شدی تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری) اس قسم کے مقام میں حالتِ سکر طاری ہو جاتی ہے (یعنی بن پئے آدمی مدہوش اور ہوش وحواس سے بے گانہ ہو جا تا ہے) جس میں ایمان کی حلاوت کے وجود کے ساتھ شعور وتمییز ساقط ہو جاتے ہیں، بعینہ اس طرح جیسے شراب کا نشہ چڑھ جائے (تو آدمی کی جو حالت ہوتی ہے) اور (حسین) صورتوں کے عشق کا جو نشہ ہوتا ہے، اسی طرح کبھی حالتِ خوف یا امید کے ساتھ فناء حاصل ہوتا ہے جیسے حالتِ حب کے ساتھ بھی تو دل بعض حقائق کے شہود سے غائب ہو جا تا ہے اور اسی طرح کے اقوال وافعال صادر ہو جاتے ہیں جو شراب کے نشہ سے مخمور کے ہوتے ہیں، انہیں مشائخ کے شطحات کا نام دیا گیا ہے جیسے ایسے ایک مجذوب نے کہا: میں جہنم کے کنارے اپنا خیمہ گاڑلوں گا الخ اور اس طرح کے دیگر اقوال اور اعمال جو (بظاہر) شرع کے مخالف ہیں، کبھی ان کا فاعل غیر ماثوم ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو کم از کم یہ دشمنوں کے مددگاروں کے معاملہ سے مشابہ ہے اور یہ ایسا جیسے کسی نے کسی صورت کا فریا ظالم کی اعانت کی اور سمجھا کہ وہ اس پر مغلوب ہے، ان حضرات (یعنی شطحات والے مجذوبوں) پر یہ حکم لگایا جائے گا کہ اگر ان کے ہوش وحواس کے ساتھ چھوڑنے کی وجہ کوئی حرام امر نہیں تب جو ان سے محرم (اور مخالفِ شرع) اقوال وافعال صادر ہوں تو ان پر حرج وگناہ نہیں (یعنی ان پر کوئی فتوی نہ لگا دیا جائے یا کوئی سزا یا شرعی حد جاری کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ یہ اب اس حالت میں شرعاً غیر مکلّف ہیں) بخلاف اس کے جس کی اس حالت کا سبب کوئی محرم امر بنا ہے

اور یہ جیسے ہم نے عقلائے مجانین اور مجذوب حضرات بارے کہا، وہ جن کے لئے ایک دائمی مقام ہوا جیسا کہ ان کے لئے بعض اوقات یہ معاملات عارض ہوتے ہیں جیسے بعض علماء نے ایسے شخص بارے کہا جس کی ہوش گم ہوئی حتی کہ واجبات میں سے کسی شئ کا ترک کیا تو ان کا کہنا تھا اگر زوالِ ہوش وشعور کی وجہ کوئی غیر محرم امر ہے مثلاً بوجہ مرض، اغماء یا زبردستی کوئی نشہ آور چیز پلا دی گئی تب وہ غیر آثم ہے لیکن اگر اس کی وجہ شراب نوشی اور دیگر محرم احوال میں سے کوئی حال ہے تب اس ترکِ واجب کی رو سے آثم ہوگا اور یہی حکم فعلِ محرم بارے ہے تو اگر چہ ان پر کوئی جُناح نہیں مگر ان کی اقتداء کرنا جائز نہ ہوگا اور نہ ان کی اس کلام و فعل کو صحیح باور کرنا بلکہ وہ خاصہ میں ظاہری تکالیفِ شرع کے ضمن میں غافل اور مجنون کی مثل ہیں، ان کی بابت ایک عالم کا قول ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ نے عقول اور احوال عطا کئے تھے تو ان کی عقول تو سلب کرلیں اور احوال چھوڑ دئے اور ان سے بوجہ اس سلب کے اپنے فرائض کا اسقاط کر دیا لہٰذا عارفین متفق ہیں کہ حالتِ بقاء اس (یعنی حالتِ سکر) سے افضل ہے اور یہ اشہادِ حق کے ساتھ شہودِ حقائق، جیسے ایک حدیثِ قدسی میں ہے: میرا بندہ مسلسل نوافل کے ساتھ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ مقامِ محبوبیت پر فائز ہو جاتا ہے پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ سنتا ہے۔۔ الخ۔ تو جب ایسا بندہ حق کے ساتھ ہی سنتا اور دیکھتا ہے تو گویا امر کا اس کی عین حقیقت پر سماع کرتا اور حق کا اس کی عین حقیقت پر شہود کرتا ہے، کتابوں میں فناء بارے ہم جو احوال پڑھتے ہیں جیسے شیخ الاسلام کے واقعات وہ اسی نوع کے ہیں البتہ بعض حضرات نے اس کے بعض احکام کے ذیل میں غلطی کی ہے جیسا کہ ایک جگہ میں نے اس پر بحث کی ہے، فی الجملہ یہ فناء صحیح ہے اور یہ عیسویتِ محمدیت میں سے ہے اور یہ اس صعق وصیاح (یعنی غشی طاری ہونا اور چیخ نکلنا) کے مشابہ ہے جو تابعین میں حادث ہوا اسی لئے ان میں کثیر لوگ ایک نوعِ ضلال میں جا واقع ہوتے ہیں اس لیے کہ شہودِ حقائق سے فناء کا مرجع عدم علم وشہود ہے اور یہ وصفِ نقص ہے نہ کہ وصفِ کمال، اس کی تعریف بس اللہ کے ماسوا کے ارادہ کے عدم کی جہت سے کی جائے گی اس لئے کہ مخلوق کا ذکر کبھی اس کا ارادہ کرنے اور اس کے ساتھ آزمائش کا داعیہ ہوسکتا ہے اسی لیے عُبادِ عیسویت (یعنی راہب حضرات) کا غالب عنصر ماسوا بارے عدم علم اور عدم ارادہ و آزمائش میں ہے جبکہ علمائے موسویت کا غالب عنصر علم بالسویٰ اور اس کے ارادہ اور اس کے ساتھ آزمائش میں ہے اور یہ موصوف بالعلم کیے جاتے ہیں لیکن اولین جہل وعدل اور آخرین ظلم کے ساتھ موصوف ہیں اور یہ دونوں باتیں صحیح ہیں، تو جہاں تک حق اور خلق بارے علم اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کا ارادہ کرنا تو یہ محمدیہ کا وصف ہے جو علم وارادہ اور دل کی محمود سلامتی میں کاملین ہیں کیونکہ جہل بذاتہٖ صفتِ مدح نہیں البتہ اس کی رو سے شرور سے سلامتی کے پہلو سے ضرور قابلِ تعریف ہے تو اکثر نفوس جب شر کے عارف ہوئے جس سے انہیں رغبت تھی تو اس کی پیروی کی یا اس سے مشکل یا آزمائش میں پڑے

(۳) وجودِ سوا سے فناء، بایں معنی کہ اللہ کو ہی وجودِ کائنات دیکھے اور کہ اس کے سوا کوئی وجود نہیں نہ اس کے ساتھ اور نہ اس کے غیر کے

ساتھ، یہ قول و حال متاخرین کے اتحاد یہ زنادقہ کا ہے جیسے بلیانی، تلمسانی اور قونوی ونحوہم جو حق کو عینِ موجودات اور حقیقتِ کائنات قرار دیتے ہیں اور یہ کہ اس کے غیر کے لئے کوئی وجود نہیں، نہ کہ اس معنی میں اشیاء کا اس کے ساتھ قیام ہے اور ان کا اس کی رو سے وجود ہے جیسے نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ سچا ترین جملہ جو کسی شاعر نے کہا لبید کا یہ شعر ہے:(اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ)اور جیسے آیت: (کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ) [القصص : ۸۸](اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے)بارے کہا گیا تو اگر ان حضرات کی مراد یہ ہوتی تب تو یہ درست اور صحیح شہود تھا لیکن ان کی مراد تو یہ ہے کہ وہ موجودات کا عین ہے تو یہ بات تو کفر اور ضلال ہے، بسا اوقات اس کے قائلین بعض مشائخ کی کلام میں موجود متشابہ الفاظ کے ساتھ تمسک کرتے ہیں جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح سے مروی بعض متشابہ الفاظ کے ساتھ تمسک کیا، یہ لوگ فاسد قیاس یا فاسد وجد کو اپنا مرجع بنا لیتے ہیں، اس تقسیم پر خوب تدبر کرو کہ یہ صراطِ مستقیم کا بیان ہے۔

فصل

امر و نہی جسے بعض علماء **تکلیفِ شرعی کا نام دیتے ہیں، یہ علم اور قدرت سے ممکن کے ساتھ مشروط** ہے تو اس پر شریعت واجب نہیں جسے علم ہونا ممکن نہیں مثلاً دیوانہ اور بچہ، اسی طرح اس پر بھی جو اس سے عاجز ہے مثلاً جہاد کے ضمن میں اندھا، لنگڑا اور مریض اور جیسے عجز کی صورت میں لازم نہیں کہ ضرور پانی کے ساتھ ہی وضوء کرے یا کھڑے ہو کر نماز پڑھے اور دیگر اعمال جو وہ بوجہ عجز ادا نہیں کر سکتا، چاہے کہا جائے ما لا یطاق (یعنی جس کی کسی انسان کو طاقت نہیں) کی تکلیف جائز ہے یا اس کے عدم جواز کا قول اختیار کیا جائے! بہر حال اس ذیل میں اختلاف نہیں کہ اس عاجز کی تکلیف جس کے لئے فی الحال فعل پر قدرت نہیں شریعت میں غیر واقع ہے بلکہ کبھی شریعت تکلیف کو اس شخص سے بھی ساقط کر دیتی ہے جس میں اداۃِ علم و قدرت کامل نہیں (یعنی کوئی معذوری ہے) اور یہ اس سے تخفیف کرتے ہوئے اور مناطِ تکلیف کا ضبط کرتے ہوئے، اگر چہ اس کی تکلیف ممکن ہو (یعنی بصد مشقت) جیسے کیچڑ اور برستی بارش میں مسجد میں با جماعت نماز کو جانا جیسے بلوغت تک بچہ مرفوع القلم ہے اگر چہ ایسا بچہ ہو جو ذی فہم و شعور ہے لیکن بہر حال اس کی فہم تام تو نہیں ہوئی اور اس لئے کہ لوگوں میں عقل کا ظہور بالتدریج ہی ہوتا ہے اور وہ اس ضمن میں باہم متفاوت ہیں تو جب حکمت خفی اور منتشر ہے تو بلوغت کی قید لگائی گئی

اور جیسے جمہور علماء کے نزدیک حج واجب نہیں مگر اس پر جو زادِ راہ اور سواری کا مالک ہے جبکہ پیدل چل کر پہنچ جانا امکان میں ہے مگر بصد مشقت اور جیسے مسافر پر روزہ رکھنا واجب نہیں اور یہ اس سے تخفیف کرتے اور اسے سہولت دیتے ہوئے اگر چہ یہ اس کے امکان اور بس میں ہو (مثلاً ہوائی جہاز میں لاہور جا رہا شخص مجاز ہے کہ اس رخصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزہ نہ رکھے، اسے اس پر واجب قرار نہ دیا جائے گا) اور جیسے ایسی بیماری کی وجہ سے وہ واجبات ساقط ہو جاتے ہیں جن سے بیماری کے بڑھنے یا شفا یابی میں تاخیر کا اندیشہ ہو اگر چہ ان کا کرنا ممکن ہی ہو لیکن یہ مواضع ان میں سے ہیں جن میں شرائع باہم مختلف ہوئی

ہیں تو کبھی اللہ کسی شریعت میں مشقت والے واجبات بھی عائد کرتا رہا ہے مگر شریعتِ محمدیہ بارے کہا کہ اس میں وہ آصار واغلال ختم کردیے ہیں جو سابقہ شریعتوں میں تھے بالخصوص بنی اسرائیل پر، اہلِ ایمان کو یہ دعا سکھلائی:

(رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا)[البقرة : ۲۸۶](اے ہمارے رب اگر ہم سے بھول چوک ہوگئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا، اے اللہ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا) اور جیسے کہا:

(يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ) [البقرة : ۱۸۵](اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا)

(مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ) [المائدة : ۶](اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنی چاہتا)

(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ) [الحج : ۷۸] (اور تم پر دین میں تنگی نہیں کی)

(يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا)[النساء : ۲۸] (اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے) نبی اکرم نے اعرابی کے قصہ میں (جس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کر دیا تھا) صحابہ کرام سے کہا تھا تمہیں آسانیاں بہم پہنچانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے تنگیاں کرنے والے نہیں، معاذ اور ابوموسیٰ سے کہا (جب انہیں یمن روانہ کیا) آسانیاں دینا تنگیاں نہ کرنا، ایک حدیث میں فرمایا: (اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ) (یہ دین آسان ہے، کوئی دین پر غالب آنے [کہ جان مشقت میں ڈالتے ہوئے بساط سے زیادہ عبادات کرے] کی کوشش نہ کرے گا مگر دین اس پر غالب آئے گا) اور فرمایا اپنے آپ پر دین کے معاملہ میں سختیاں نہ کرو تو اللہ بھی تم پر سختی کرنے لگے گا، کچھ لوگوں نے اپنے آپ پر سختی اور تنگی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی، گرجا گھروں اور کنیساؤں میں انہی کے بقایا موجود ہیں (یعنی راہب) تو اللہ نے رہبانیت اختیار کرنا ان پر عائد نہ کیا تھا، اس کا ابتداع خود انہوں نے کر لیا، ایک حدیث میں فرمایا اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے اور فرمایا میں روزہ رکھتا ہوں، شادیاں بھی کر رکھی ہیں اور گوشت سے بھی پرہیز نہیں تو جس نے میری روش سے احتراز کیا وہ مجھ سے نہیں اور فرمایا اللہ کو پسند ہے کہ اس کی دی ہوئی رخصتوں کو قبول کیا جائے جیسے اسے یہ امر ناپسند ہے کہ اس کی معصیت کی جائے، یہ بھی کہا مجھے حنیفیتِ سمحہ دے کر مبعوث کیا گیا ہے! جہاں تک انسان کا مامور بہ کا مرید یا کارِہ ہونا تو یہ شرائع میں قابلِ التفات نہیں بلکہ نہ امرِ عاقل کے ہاں بلکہ انسان اپنی ہویٰ کی مخالفت کا مامور ہے، ارادہ ہی اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان فارق ہے جیسے کہا:

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا) [الإسراء :

۱۸۔۱۹](جوشخص دنیا کا خواہش مند ہوتو ہم اس میں سے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر اُس کیلئے جہنم کو مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ بُرے حال میں رائندہ ہوکر داخل ہوگا۔اور جوشخص آخرت کا طلبگار ہواور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو، ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوتی ہے)اور فرمایا:

(تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا) [القصص : ۸۳] (وہ آخرت کا گھر، ہم نے اُسے اُن لوگوں کیلئے کر رکھا ہے جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے)

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا) [هود: ۱۵] (جولوگ دنیا کی زندگی اوراس کی زیب وزینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دیدیتے ہیں) الآیۃ، اور کہا:

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ) [الأنعام : ۵۲] (اور جولوگ صبح وشام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اُس کی ذات کے طالب ہیں) اوراس کی نظائر کثیر ہیں، یہ اصول کتاب وسنت اور علماء و عارفین کی کلام میں مفصَّلاً مذکور ہیں یہاں غرض ان کی تقریر نہیں اصل مقصود ایک دیگر شئ ہے وہ یہ کہ جب تکلیف اس تمکنِ علمی کے ساتھ مشروط ہوجس کی اصل عقل ہے اور فعل پر قدرت کے ساتھ تو ہم کہیں گے ان دونوں میں سے ہر ایک کبھی محظور اور غیر محظور اسباب کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے تو جب شراب نوشی یا بھنگ وغیرہ کے ساتھ اپنے ہوش گم کرلے تو اس بناء پر اس کے ترکِ واجبات اور فعلِ محرمات کا اثم زائل نہ ہوگا، جب (ان حرام اشیاء کی وجہ سے طاری) نشہ اس کا سبب بنا بخلاف اس حال کے کہ غیر محرم کسی سبب سے اس کے ہوش وحواس گم ہوئے ہوں مثلاً بوجہ مرض، بے ہوشی، خوف یا غیر محرم مشروب پینے کی وجہ سے مدہوش ہوا ہو یا مثلاً زبردستی شراب پلا دی گئی ہوتو اب اس کے ذمہ گناہ نہیں اور جہاں تک احمد اوران حضرات کے مطابق جو قائل ہیں کہ ایک دن ورات کی نمازوں کی قضاء ضروری ہے اس کے ذمہ نمازوں کی قضاء تو یہ سوئے ہوئے یا ناسی کے ذمہ وجوبِ قضاء کی نظیر ہے، دونوں پر گناہ نہیں (یعنی اس وجہ سے گناہ گار نہیں ہوگئے) جیسے نبی اکرم نے فرمایا سونے کی حالت میں تفریط نہیں، تفریط تو اس صورت ہے کہ جاگ رہا تھا (پھر بھی سستی کی) فرمایا جو نماز سے سوتا رہ گیا یا یاد ہی نہ رہا وہ جب یاد آئے پڑھ لے، یہی اس کا وقت ہے اوراس کا یہی کفارہ ہے، اسی طرح بندے کی قدرت تو اگر مثلاً اپنے پر حج واجب ہو جانے کے بعد سستی کی حتی کہ مال ضائع کر بیٹھا تو حج اس کے ذمہ رہے گا، اسی طرح محرمات کے استحلال میں، فرمایا:

(فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)[الأنعام : ۱۴۵] (پس اگر کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے تو تمہارا رب بخشنے والا مہربان ہے) تو محظور سبب کے ساتھ ضرورت جڑی ہے ان کے ساتھ محرمات کی اباحت کی طلب نہ کی جائے گی بخلاف اس ضرورت کے جو غیر محظور سبب کے ساتھ جڑی ہو، علماء نے سفرِ معصیت کر

نے والے کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ بھی سفر کی رخصتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ شافعی اور احمد کے نزدیک نہیں اٹھا سکتا تو وہ احوال جو عبادِ اہلِ معرفت اور زہاد پر وارد ہوتے ہیں وہ جوان کے ہوش وخرد اور علم کے زوال وفقدان کا موجب بن جائیں حتی کہ اس کی حالت مجنون، مولہ (یعنی حد سے زیادہ غمگین کہ عقل مغلوب ہوگئی) سکران اور سوئے ہوئے کی سی ہو جائے یا اس کی قدرت کا زوال کا جو باعث بنیں حتی کہ اسے عاجز کر دیں یا اس مضطر کی مانند جس سے قول وفعل بغیر اس کے ارادہ واختیار کے صادر ہوتے ہیں تو زوالِ عقل وقدرت کبھی واجبات کی ادائیگی سے اس کے عجز کا موجب بن سکتے ہیں اور کبھی محرمات میں اس کے وقوع کا تو ان کے بارہ میں کہا جائے گا کہ اگر اس کا سبب غیر محرم کوئی امر ہے تب اس ترکِ حسنات اور فعلِ محرمات میں ان پر کوئی دوش نہیں لیکن ان امور میں جو شریعت سے خارج ہوں ان کے اقوال اور افعال میں ان کی اتباع جائز نہیں اور نہ یہ کہ ہم ان کی ذم کریں بلکہ کبھی یہ قابلِ مدح وتعریف ہوں گے اگر اپنے اقوال وافعال سے (اس حالت میں بھی) شریعت کی موافقت کریں گے اور جن امور میں شرع نے انہیں معذور قرار دیا ہے ان میں یہ قابلِ ملامت باور نہ کئے جائیں گے اور اس کا زوال محرم سبب کے ساتھ ہے تب یہ ذم وعقاب کا مستحق ہے اگر کسی واجب کا ترک یا حرام کا فعل کیا

اول کی مثال جو مشروع وجہ وطریقہ پر قرآن کا سماع کریں تو **ایسا وجد طاری ہو** کہ جس سے ایسی محبت، خوف یا رجاء منسلک ہو جائے کہ اس کے تحمل کی طاقت نہ رہے حتی کہ موت واقع ہو جائے یا بے ہوشی طاری ہو یا عظیم چیخ مارے یا بے حال ہو جائے (آپے میں نہ رہے) تو اس کے نتیجہ میں نماز چھوٹ جائے یا کسی کا نقصان کر بیٹھے تو یہ اس سب میں (شرعا) معذور ہے تو یہ اس حال میں ان عقلائے مجانین ومولہین کے بمنزلہ ہے جن پر عارضی جنون طاری ہوا حالانکہ وہ صالحین اور اہلِ معرفت میں سے ہیں یا تو اس وارد حالت کی وجہ سے یا اس کے برداشت کرنے میں ان کے دل کے ضعف کی وجہ سے اور یا مزاج بگڑنے سے اور قوتِ خلط (یعنی تلوّث اور آلودگی) کی رو سے یا کسی جن کا سایہ ہونے کی وجہ سے تو یہ جیسا کہ ہم تک امام ابو محمد مقدسی کا قول پہنچا جب ان سے اس بارے سوال ہوا تو کہا یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ نے عقول واحوال عطا کیے تو ان کی عقول سلب کر لیں اور احوال باقی رہنے دئے اور ان مسلوبہ کے بعوض ان سے فرائض کا اسقاط کر دیا

اسی لئے یہ اور سابق الذکر صنف تابعین اور بعد والوں میں موجود تھے بالخصوص بصرہ کے عُباد میں، ان میں ایسے بھی ہوئے کہ قرآن کی تلاوت کا سماع کرتے ہوئے ان کی وفات واقع ہوگئی مثلا زرارہ بن ابوافی اور ابوجہیر ضریر وغیرہما، جہاں تک صحابہ تو ان کا حال اس امر سے اکمل تھا کہ ان میں کوئی مجنون یا مصعوق (مجذوب ودیوانہ) ہو جبکہ ان میں بعض ایسے ہیں کہ اس پر اللہ کے ذکر، توحید اور محبت کا ایسا غلبہ ہوا کہ مذکور، محبوب، مشہود اور معبود کے ساتھ اس کے سب ما سوا سے غائب ہو گیا جیسے بعض عشاق اپنے معشوقین میں ایسے گم اور فنا ہو جاتے ہیں کہ کسی اور کی انہیں خبر نہیں ہوتی تو اس حال میں ان میں سے کوئی کہہ اٹھتا ہے: (اَنَا الْحَقُّ) (سُبْحَانِیْ)

(مَا فِی الْجُبَّةِ اِلَّا اللّٰہُ) بعض پر حالِ رجا ورحمت کا غلبہ ہوا حتی کہ کہا میں جہنم کے کنارے اپنا مصلیٰ بچھالوں گا تو جس کسی نے ایسی بات اپنے ہوش وحواس کے زوال کے اس حال میں اپنے منہ سے نکالی اس طور کہ وہ سکران یا مولّہ کی مانند ہوا اور سبب یہی جو مذکور ہوا، نہ کہ کوئی غیر شرعی سبب تو اس پر کوئی گناہ نہیں (لہذا اس پر پکڑ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ شرعاً غیر مکلّف ہے)

ثانی کی مثال جو کبھی مکاء وتصدیہ کی محافل میں کثیر اہلِ سماع کے لئے حاصل ہوتا ہے تو کبھی ایسے اشعار پڑھنے لگتے ہیں جو مخالفِ شرع ہوتے ہیں اور ایسی اصوات کے ساتھ جو شرع میں جائز نہیں تو اس دوران زوالِ ہوش وخرد کا بعض پر یہ عالم طاری ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے کو قتل تک کر ڈالتے ہیں یا ظاہراً اور یا باطناً ہمت وقلوب کے ساتھ، نیز یہ حالت شریعت کے واجبات کے ترک، مومنین پر اعتداء اور انہیں ضرر پہنچانے کا موجب بنتی ہے، اسی طرح کبھی ان میں سے اعتقادات واعمال میں غیر شرعی عبادات کے سالک بن جاتے ہیں تو یہ عبادات اور اعمال ان پر ایسے قوی اور قاہر احوال طاری کرتے ہیں کہ ترکِ واجب اور فعلِ محرم کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ جو کوئی شراب کے نشہ میں دھت ہو کر غل غپاڑہ کرے، جب حالتِ صحو لوٹ آنے پر انہیں اس سب کارستانی سے آگاہ کیا جائے تو جواب ملتا ہے میں تو مغلوب الامر تھا، کوئی وارد مجھ پر وارد ہوا جس نے یہ سارے کام کرائے، یہ کفار کے مددگاروں میں سے کثیر کا حال ہے اور ان کا جو کفار اور ظالموں کے دست وبازو بن جاتے ہیں اور اہلِ احوال میں سے مسلمانوں اور مومنین پر اعتداء کرتے ہیں اور پھر عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ مغلوب اور بے بس تھے، یہ سب کام تو ان سے کروائے گئے تھے

تو کہا جائے گا جہاں تک تمہاری عقل کا زوال حتی کہ ایسے ہو گئے کہ اللہ کے امر ونہی کے غیر فاہم بنے اور تمہاری قدرت کا زوال حتی کہ ان افعال پر مضطر ہوئے اور اگر تم اس میں سچے ہو تو اولاً اس کا سبب تمہاری تفریط اور عدوان ہے حتی کہ تم مجانین اور سکاریٰ کے حال میں ہوئے تو تم شرابی کے بمنزلہ ہو جس پر مے نوشی کرنے کی وجہ سے نشہ طاری ہو کیونکہ اصوات وصور کے نشہ اور شراب کے نشہ کے مابین کوئی فرق نہیں، یہ اجسام اور نفوس کا نشہ ہے جبکہ یہ ارواح کا نشہ ہے تو اگر نشہ کا سبب محظور ہو تو دینِ اسلام میں وہ معذور باور نہ ہو گا اسی لئے یہ احوال انہی میں واقع ہوتے ہیں جن میں نصرانیت ہو جس کی رو سے وہ حالتِ سکر کی طرف مائل ہوتے ہیں جیسے نصاری کے ہاں شراب، اصوات اور صورتوں کا نشہ ہے لہذا یہ سب عالمِ گمراہی میں ہیں، جہاں تک تمہارا یہ کہنا کہ تمہیں اس سب کا حکم ملا تو ذرا بتلاؤ تو کس جہت سے؟ کیا دینی کلمات کی جہت سے یا کونی کلمات کی جہت سے؟ تو اول جیسے یہ قولہ:

(اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ) (گزری) اور:

(هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ) [الجمعة: ۲] (وہی تو ہے جس نے بے کتاب قوم میں انہی میں سے رسول بھیجا) اور:

(لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ) [الحدید: ۲۵] (ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا) اور ثانی اس قولہ کی مثل:

(اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا) [الإسراء : ۱۶] (تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں کوفسق پر مامور کر دیا)
(بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ) [الإسراء : ۵] (ہم نے اپنے سخت لڑائی لڑنے والے بندے تم پر مسلط کر دئے)
(اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ) [مریم : ۸۴] (ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے) تو اگر کہو اول جہت سے تو یہ کتاب وسنت کے برخلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے اور اگر ثانی جہت سے اقرار کرو تو یہ بات صحیح ہے لیکن یہ کفار اور منافقین از قسم ابلیس، فرعون اور نمرود کا حال ہے اور ان تمام کا جنہوں نے کونی اوامر کی طاعت کی اور قدری ارادہ کے تابع ہوئے اور شرعی اوامر سے اعراض کیا اور دینی ارادہ پر واقف نہ ہوئے! تو اس اصل پر خوب تدبر کرو کہ یہ بہت نافع ہے، اس کے ساتھ شرع کے مخالف احوال منکشف ہوتے اور لوگوں کے معذور اور موزور کی طرف انقسام کی وضاحت ہوتی ہے، نیز مسطور علی صاحبہ اور مغفور لہ کی طرف انقسام بھی، غیر اہلِ عبادات وزہادات سے عقل وصحو، اغماء، سکر، جنون، اضطرار اور اختیار کے ضمن میں صادر احوال کے بمنزلہ تو ملوک، امراء، علماء، پیشواؤں، مشائخ اور دراویش کے احوال اس قاعدہ شریفہ میں مشترک ہیں اور ان میں شریعت فرقان کی رو سے حکم لگاتی ہے جب اس کے ساتھ یہ بھی ضم کیا جائے کہ جو صاحبانِ احوال سے علمی کشف اور قدری تاثیر کا صدور ہو، وہ ان کی ولایت کیلئے مستلزم نہ ہوگا بلکہ صلاح کے لیے بھی نہیں بلکہ صاحبِ ایمان ہونے کے لئے بھی نہیں کیونکہ کبھی یہ کافر، منافق، فاسق اور عاصی کی جنس میں بھی ہونا ممکن ہے، اللہ کے حقیقی اولیاء وہ ہیں جن پر کوئی خوف نہیں اور نہ کسی قسم کے حزن کا وہ شکار ہوتے ہیں اور یہ جو اہلِ ایمان وتقویٰ ہیں تو اللہ کی ولایت اور احوال کے درمیان تفرقہ کیا ہے جیسے خلافت (علی منہاج) نبوت اور جنسِ بادشاہی کے مابین کیا ہے اسی طرح اس علم کے درمیان جس کا وارث انبیاء نے بنایا اور جنسِ کلام کے درمیان تو ان دونوں انواع کے مابین خصوص وعموم ہے، آدمی کبھی اللہ کا ولی ہوگا اور ساتھ میں صاحبِ حال وکشف اور ذی تاثیر بھی اور کبھی ولی تو ہوگا مگر اس کے لئے بدرجۂ کمال یہ حال نہ ہوگا اور یہ بھی کہ ان احوال میں سے کوئی شئ اس کے لئے ہو مگر وہ اللہ کا ولی نہ ہو جیسا کہ کبھی نبی کا خلیفہ مطاع ہو اور کبھی مستضعف، کبھی جبار ومطاع جس کے لئے نبوت سے کوئی شئ نہیں اور کبھی عالم ہو مگر متکلم نہیں، ایسی کلام کے ساتھ جو انبیاء کی کلام کے مخالف ہو اور کبھی کلامِ انبیاء کے ساتھ متکلم ہو۔

فصل

جانو کہ اس قدر وغیرہ میں **علوم وعبادات سے متعلقہ اکثر بدعات کا ظہور اس امت میں عہدِ خلفائے راشدین کے اواخر میں ہوا** اور نبی اکرم نے اس امرِ واقع کی پیشین گوئی فرما دی تھی جب کہا تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلافِ کثیر دیکھے گا پس تم میری سنت کو تھامے رکھنا اور میرے بعد خلفائے راشدین مہدیین کی سنت وروش کو اور معلوم امر ہے کہ جب حکام سیدھی راہ پر گامزن رہیں جن کا حکم نفوس واموال میں نافذ العمل ہے تو عوام بھی سیدھے رہیں گے جیسا کہ بخاری کی روایت کے

مطابق حضرت ابوبکر نے اس احمسی خاتون کو جواب میں کہا تھا جس نے ان سے پوچھا: (مَا بَقَاؤُنَا عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ الصَّالِحِ؟) (یعنی ہماری یہ شان وشوکت کب تک قائم رہے گی؟) تو کہا جب تک حکمران سیدھے راستہ پر رہیں گے، ایک اثر میں ہے: دو اصناف ہیں اگر وہ درست اور صحیح رہیں تو لوگ بھی درست اور صحیح رہیں گے، ایک علماء اور دوسری امراء کی صنف، اہلِ کتاب اور اہلِ حدید (یعنی لشکری) جیسا کہ اس پر یہ آیت دال ہے: (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا الخ) (ابھی گزری) اور یہی دونوں گروہ اولوا الامر ہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا:

(اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ) [النساء: ۵۹] (اللہ اور اُس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ اختیار ہیں اُن کی بھی) اور انہی کی جہت سے فساد کا وقوع ہوتا ہے جیسا کہ ایک مرفوع حدیث میں مذکور ہوا جسے صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں **تمہاری نسبت سب سے زیادہ خوف** عالم کی لغزش، منافق کے قرآنی حوالوں کے ساتھ جدال اور گمراہ کن امراء و حکام سے رکھتا ہوں، تو ائمہ مضلون کہا اور یہ امراء ہیں جبکہ عالم اور مجادل علماء ہیں لیکن ان میں سے ایک صحیح العقیدہ ہے مگر لغزش کا شکار بنا جیسا کہ اہل سنت والجماعت کے ائمہ فقہاء سے اس کا وقوع ہوا اور دوم جیسے متفلسفہ اور متکلمین جو قرآن کی متشابہات آیات کے ساتھ مجادلہ کرتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ اللہ کی آیات سے منسلخ (یعنی دُور) ہیں، ان کے ساتھ ان کا احتجاج دراصل دفعاً للخصم ہے (یعنی فریقِ مخالف کو چپ کرانے کے لئے) نہ کہ ان آیات کے ساتھ رہنمائی لینے کی غرض سے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے، اسی لئے کہا: (جِدَالُ مُنَافِقٍ بِالْقُرْآنِ) (منافق بحث کرتے ہوئے قرآن کے بہت حوالے دے گا) تو سنت اور اجماع سے یہ شبہات دور ہوتے ہیں، دل میں علماً اور حالاً ایمان سے قائم دین ہی اصل ہے جبکہ ظاہری اعمال فروع ہیں اور یہ کمالِ ایمان ہے (یعنی اصل اپنی فروع سے مل کر کامل ہوتی ہے)

تو دین سب سے پہلے اپنے اصول پر مبنی ہوگا اور اپنی فروع کے ساتھ کامل کیا جائے گا جیسے مکہ میں اللہ نے اصولِ توحید کا انزال کیا اور ان امثال کا جو عقلی مقاییس ہیں اور قصص، وعد اور وعید کا پھر مدنی دور میں جب اسلام نے قوت حاصل کر لی جمعہ، جماعت، اذان، اقامت، جہاد، صیام، خمر، زنا اور جوا وغیرہ کی تحریم اور دیگر واجبات اور محرمات جیسی فروع کو نازل کیا تو اس کے اصول اپنی فروع کی امداد اور اثبات کرتے ہیں جبکہ فروع ان اصول کا اِکمال اور ان کی حفاظت کرتی ہیں تو جب نقصِ ظاہر کا وقوع ہو تو ابتداءً یہ فروع کی جہت سے ہوتا ہے اسی لئے آپ نے فرمایا تم اپنے دین میں سب سے پہلے امانت کو مفقود پاؤ گے اور سب سے آخر میں نماز کو! مروی ہے کہ فرمایا سب سے قبل امانت کے ساتھ حکم بالامانت کا رفع ہوگا، حکم سے مراد امراء، ولاۃ الامور (یعنی سرکاری ملازمین اور مختلف عہدے داروں) کا عمل (یعنی یہ اپنی ذمہ داریاں انجام نہ دیں گے اور خیانت۔کرپشن۔ان میں سرایت ہوجائے گی) جیسے قرآن نے کہا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء : ۵۸] (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو) جہاں تک نماز تو یہ اولین فرض ہے اور یہ ایمان و دین کے اصول میں سے ہے، شہادتین کے ساتھ مقرون تو اس کا ضیاع اور ذہاب آخر میں ہوگا (یعنی آخر کار ظاہری علامت اور نام کے بھی مسلمان نہ رہیں گے) فرمایا اسلام کی ابتداء غریبانہ حالت میں ہوئی اور ابتداء کی مانند ہی آخر یہ غریبانہ حالت میں ہو جائے گا، پس غرباء کے لئے طوبیٰ (خوشخبری) ہو تو خبر دی کہ اس کا عود (یعنی آخری حال) بھی اس کے آغاز کی طرح ہوگا

جب عہدِ خلفائے راشدین کا اختتام ہوا اور بادشاہت آ گئی تو امراء میں نقص کا ظہور ہوا تو لازم تھا کہ اہلِ علم و دین میں بھی اس کا ظہور ہو تو حضرت علی کے دور کے آخر میں خوارج اور رافضیہ کی بدعت کا ظہور ہوا کہ یہ امامت اور خلافت سے متعلق تھی اور اس کے اثرات اعمال اور شرعی احکام سے اس کے توابع میں بھی ہوئے، **حضرت معاویہ اگرچہ بادشاہ تھے لیکن ان کی بادشاہی رحم دلی کی بادشاہی تھی، جب ان کا دور ختم ہوا اور یزید کی امارت آئی تو اس میں کئی فتنے وقوع پذیر ہوئے** مثلاً عراق میں حضرت حسین کی شہادت کا فتنہ اور مدینہ میں جنگِ حرہ کا فتنہ پھر مکہ کو محاصرے میں لیا، جب ابن زبیر نے اپنے قیام کا اعلان کیا، پھر یزید کی موت کے بعد امت تقسیم ہو گئی، حجاز میں ابن زبیر تھے، شام میں بنو امیہ کا غلبہ رہا اور عراق میں مختار بن ابو عبید ثقفی وغیرہ نمودار ہوئے اور یہ سب عصرِ صحابہ کے اواخر میں، ابھی ابن عباس، ابن عمر، جابر بن عبداللہ اور ابوسعید خدری وغیرہ صحابہ بقیدِ حیات تھے کہ قدریہ اور مرجئہ کی بدعات کا ظہور ہوا تو ان صحابہ وغیرہم نے شد و مد سے ان کا انکار کیا اور ساتھ ساتھ خوارج اور روافض کی بدعات کا بھی، اس زمانہ میں عام طور پر قدریہ اور مرجئہ بندوں کے اعمال بارے کلام کرتے تھے، ان کی کلام کا محور طاعت و معصیت، مومن و فاسق، وعد وعید اور اسماء واحکام کے کئی مسائل تھے ابھی رب تعالیٰ اور اس کی صفات کو موضوعِ کلام نہ بنایا تھا، اس کا آغاز صغار تابعین کے اواخر زمانہ میں ہوا اور یہ بنی امیہ کی حکومت کے آخری ایام تھے، قرنِ ثالث کی ابتدا تبع تابعین کا زمانہ، اکثر کبار صحابہ تو عہدِ خلفائے راشدین کے اختتام کے ساتھ ہی انتقال کر چکے تھے، اہلِ بدر میں سے چند حضرات ہی باقی تھے جبکہ اکثر کبار تابعین اور صغار صحابہ ابن زبیر اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں انتقال کر چکے تھے جبکہ اکثر کبار تبع تابعین بنی امیہ کے آخری ایام اور بنی عباس کے اوائل دور میں انتقال کر چکے تھے، اب اکثر حکام اور عہدے دار عجم تھے اور عربوں کا نفوذ کافی حد تک ختم ہو چکا تھا پھر اس دور میں فرس، ہند اور روم (و یونان) کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور نبی اکرم کی پیشین گوئی پوری ہوئی کہ جھوٹ عام ہو جائے گا حتیٰ کہ آدمی خود کہتا پھرے گا مجھے گواہ بنا لو لیکن کوئی اسے گواہ بنانا منظور نہ کرے گا، قسم اٹھائے گا حالانکہ اس سے قسم اٹھوانے کا مطالبہ نہ کیا گیا ہوگا، اس دور میں تین نمایاں اشیاء کا ظہور ہوا: رائے کلام اور تصوف نیز تجہم حادث ہوا اور یہ نفیِ صفات اور اس کے بالمقابل تمثیلی نظریہ کا ظہور ہوا

تو رائے کو زیادہ تر اہلِ کوفہ بروئے کار لائے کہ یہی اس کے باشندوں پر غالب تھا پھر یہ بھی کہ ان میں غالب تشیُّع بھی تھا اور روایت میں کثرتِ کذب لیکن دوسری طرف یہاں ابھی کثیر اہلِ علم وصدق اور اہلِ سنت وفقہ اور اہلِ عبادت موجود تھے لیکن مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ روایتِ حدیث میں کثرتِ کذب کا ظہور اہلِ کوفہ میں ہوا نیز فقہ میں کثرتِ آراء کا اور اصول میں تشیع کا جبکہ زیادہ تر اہلِ کلام وتصوف بصرہ میں تھے تو وہاں حسن (بصری) اور محمد بن سیرین کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد عمرو بن عبید، و اصل بن عطاء اور اہلِ کلام واعتزال سے ان کے پیروکار ظاہر ہوئے اور احمد بن علی ہجیمی ظاہر ہوا (بقول مرتب میزان الاعتدال میں اس کا نام احمد بن عطاء ہجیمی بصری زاہد مذکور ہے) جو عبد الواحد بن زید کا اور عبد الواحد ہذا حسن کا شاگرد تھا اور متصوفہ میں سے جو اس کے پیروکار بنے، اس نے صوفیہ کے لئے خانقاہ (دویرۃ کا لفظ ذکر کیا جو دار کی تصغیر ہے یعنی ٹھکانہ) بنائی اور یہ **اسلام کی اولین خانقاہ ہے**، عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ ان حضرات کو (الفقریۃ) کا نام دیتے تھے (یعنی درویش) یہ اس خانقاہ میں جمع ہوتے تھے، انہوں نے دین کی اکثر جزئیات کے ساتھ تمسک کرنے کے باوصف محدَث علمِ کلام سے ایسا طریق ابتداع کر لیا تھا جس کے ساتھ تدین (اورتعبد) کرتے تھے، عمومی لحاظ سے یہ مشروع تعبد کے عامل تھے اور ان کے لئے سماع وصوت سے ایک حال ہوا جو اس طریقہ سے ان پر طاری ہوتا تھا کہ اس دوران بسا اوقات کوئی مر جاتا یا اس پر غشی کا دورہ پڑ جاتا، اسی طرح کلام وحروف میں ان کے لئے ایک حال ہوا حتی کہ اس کی رو سے یہ ایسی تفکیر کی طرف خارج ہوئے جس نے انہیں تحیُّر میں لا واقع کر دیا

اِن کے امر کی اصل: کلام جبکہ اُن کے امر کی اصل: ارادت تھی، یہ کلام سے توحید مراد لیتے تھے اور اپنے آپ کو موحدین کہتے تھے جبکہ وہ ارادت سے توحید مراد لیتے اور خود کو اہلِ توحید وتجرید کا نام دیتے تھے، میں نے قبل ازیں ان قواعد بارے ایک تحریر لکھی ہے جو اہلِ کلام ونظر اور اہلِ ارادت وعمل کے طریقوں میں انحراف سے واقع ہوا جب وہ رسول کی متابعت کے ساتھ مقترن نہ ہوا جیسا کہ میں نے قاعدہ کبیرہ میں ایضاح کیا تھا کہ علم، ہدایت اور دین کی اصل اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان ہے اور تمام اقوال واحوال میں اس کا استصحاب لازم امر ہے، قول اور امر میں اہلِ مدینہ (میں سے ان طریقوں کے سالک حضرات) ان سے اقرب تھے، یہ ہوئی، روایت، رائے، کلام اور سماع میں بصری اور کوفی گروہوں کے سے انحراف کا شکار نہ بنے اگر چہ ان کے بعض کے ہاں ایک نوعِ انحراف ہوا لیکن بہر حال یہ (کتاب وسنت سے) اقرب رہے، جہاں تک شامی تو ان کی اکثریت مجاہدین اور قلبی اعمال والے تھے اور بصری صوفیہ کی نسبت مشروع حال کی طرف اقرب تھے اسی لئے تم پاؤ گے کہ کلام اور تصوف کی کتب فی الاصل بصرہ میں نکلیں، معتزلہ کے متکلمین بھی ان کے بصری ائمہ تھے جیسے ابو ہزیل علاف، ابوعلی جبائی اور اس کا بیٹا ابو ہاشم، ابوعبداللہ اور ابوحسین بصری اسی طرح کلابیہ اور اشعریہ کے متکلمین جیسے عبداللہ بن سعید ابن کلاب، ابوالحسن اشعری اور ان کے تلمیذ ابوالحسن باہلی اور قاضی ابوبکر باقلانی وغیرہم، اسی طرح متصوفہ اور ان حضرات کی کتب جنہوں نے تصوف کا حدیث اور کلام کے ساتھ خلط کیا جیسے حارث بن اسد محاسبی، ابوالحسن بن سالم، ابوسعید اعرابی اور ابو

طالب مکی کی کتب بغداد، خراسان اور شام کے بعض حضرات بھی ان کے مشارک ہوئے لیکن غرض یہ ہے کہ اصول وہیں سے ہیں

جیسا کہ علمِ نبوت قرآن اور ایمان سے ہے اور جو فقہ، حدیث اور اعمالِ قلوب سے اس کے توابع ہیں، ان کا خروج وظہور ان امصار میں ہوا جنہیں جمہور صحابہ کرام نے اپنی جائے سکونت بنالیا تھا اور یہ حرمین (مکہ اور مدینہ) عراقین (یعنی کوفہ اور بصرہ) شام، باقی سب امصار ان کے تبع تھے تو قرائے سبعہ، ائمہ اہل الحدیث اور ان میں سے اثبت ترین اہلِ مدینہ اور اہلِ بصرہ تھے اور کاذب بھی، اہلِ شام میں کاذب کثیر نہ تھے اور نہ قراءت وحدیث میں ان کے ہاں کبار ائمہ ہوئے، اسی طرح ائمہ اور فقہاء بھی نہ ہوئے تو مالک اہلِ مدینہ اور ثوری اور ابوحنیفہ وغیرہما اہلِ کوفہ کے عالم ہیں، ابن جریج وغیرہ اہلِ مکہ سے، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید اہلِ بصرہ سے اور اوزاعی اور ان کے ہم طبقہ شام میں تھے، کہا گیا ہے کہ مالک نے اپنی مؤطا حماد بن سلمہ کی کتاب کی طرز پہ ترتیب دی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابن جریج کی کتاب اس سے قبل تھی پھر شافعی اگرچہ اصلاً مکی ہیں لیکن وہ اہلِ حدیث کے طریقہ پر فقیہ بنے، اپنے شہر کے ساتھ متقید نہ ہوتے ہوئے اور اسی طرح امام احمد تو اگرچہ ان کے اجداد کا تعلق بصرہ سے تھا مگر وہ بھی اہل الحدیث کے طریقہ پر متفقہ ہوئے، کسی خاص شہر کے ساتھ متقید نہ ہوتے ہوئے جیسا کہ عبداللہ بن مبارک، اسحاق بن ابراہیم (ابن راہویہ) محمد بن اسماعیل بخاری اور دیگر خراسانی محدثین اور اسی طرح ان شہروں کے ائمہِ زہاد وعباد جیسا کہ ابوالفرج ابن جوزی نے ان کا ذکر (صفوۃ الصفوۃ) میں کیا

تو مشروع علم ونسک کا اخذ صحابہ کرام سے کیا جائے گا، ان کے بعد ظاہر ہونے والے طریقوں کو اصل نہ بنایا جائے گا اگرچہ ان کے صاحب کو معذور باور کیا جائے بلکہ ماجور اجتہاد یا تقلید کی وجہ سے، تو جس نے علم میں کلام کی بناء کتاب وسنت کے اصول وفروع اور سابقین سے منقولہ آثار پر رکھی وہ طریقِ نبوت کو پہنچا، اسی طرح جس نے ارادت، عبادت، عمل اور اعمال کے اصول و فروع سے متعلقہ سماع، قلبی احوال اور بدنی اعمال کی بناء ایمان وسنت اور اس ہدی پر رکھی جس پر حضرت محمدؐ اور آپ کے صحابہ تھے اس نے طریقِ نبوت کو پالیا اور یہی ائمہِ ہدی کا طریق ہے! تم امام احمد کو پاؤ گے کہ جب انہوں نے اصولِ سنت کا ذکر کیا تو کہا: یہ اس کے ساتھ تمسک جن پر نبی اکرم کے صحابہ تھے، انہوں نے نبی اکرم اور صحابہ وتابعین سے ماثور تفسیر پر کتب لکھیں اسی طرح کتبِ حدیث بھی اور انہی پر اپنے علمی اصول وفروع میں اعتماد کیا حتی کہ خلیفہِ وقت متوکل عباسی کو اپنے ایک خط میں لکھا: میں سوائے اس کے جو کتاب اللہ، حدیثِ رسول یا آثارِ صحابہ وتابعین میں ہے کسی اور شیٔ پر کلام کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ایسی کلام کو محمود سمجھتا ہوں

اور اسی طرح **زہد، رقاق اور احوال کا معاملہ** تو احمد نے اپنی کتاب (الزھد) میں انبیاء صلوات اللہ علیہم سے منقول آثار پر ہی اعتماد کیا ہے پھر صحابہ وتابعین کے طریق پر، ان کے بعد والوں کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح طلبِ علم کے لئے ان کا وصف جس میں ہے کہ وہ نبی اکرم پھر صحابہ اور پھر تابعین سے جو کچھ منقول ہے، لکھے ان سے ایک قول یہ بھی ہے کہ تابعین کے ضمن میں تمہیں اختیار ہے، ان

کی کلامی کلام، فقہی رائے، کتبِ صوفیہ اور صوفی سماع بارے بھی کلام ہے جس کے بیان کرنے کی یہ جگہ نہیں، اس کی تحریر تفصیل کی محتاج ہے اور یہ کہ کن احوال میں اسے استعمال کیا جانا چاہیے تو یہ ہماری ذکر کردہ اس اصل پر مبنی ہے کہ کبھی حسنات کے ساتھ سیآت مقترن ہو جاتی ہے، یا تو مغفورہ یا غیر مغفورہ اور کبھی سالک کے لئے مشکل یا ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خالص مشروع طریق پر چلے مگر کسی نہ کسی محدَث نوع کے ساتھ علماً اور عملاً مشروع طریق کے ساتھ غیر قائم ہونے کی وجہ سے تو اگر نورِ صافی حاصل نہیں بایں وجہ کہ نہیں پایا جاتا مگر وہ نور جو غیر صافی ہے تو انسان ظلمت ہی میں باقی رہے گا تو مناسب نہیں کہ آدمی نکتہ چینی کرے اور اس نور سے روکے جس میں ظلمت ہے الا یہ کہ ایسا نور حاصل ہو جائے جس میں ظلمت نہیں وگرنہ کتنے ایسے ہیں جنہوں نے جب اس سے عدول کیا تو (دیکھا دیکھی) کلیۃً ہی نور سے نکل گئے جب دیکھا کہ لوگوں کے طرق میں ظلمت ہے

میں نے اس قاعدہ کی اس لئے تقریر کی ہے تاکہ سلف اور علماء کی طرف سے کسی شئ کی ذم کو اس محل پر محمول کیا جائے اور جانا جائے کہ شرعاً مامور بہ کمال خلافتِ نبوت سے عدول کی وجہ کبھی علماً اور عملاً ترکِ حسنات کی تقصیر ہوگی اور کبھی علماً وعملاً فعلِ سیآت کا عدوان اور ہر دو امر کبھی بوجہ مغلوبیت اور کبھی مع القدرت ہوتے ہیں، تو اول کبھی عجز وقصور اور کبھی قدرت و امکان کے ساتھ ہوتا ہے اور ثانی کبھی حاجت وضرورت کے ساتھ اور کبھی غنیٰ و سِعت (کشائش) کے ساتھ اور دونوں میں سے ہر ایک یعنی کمالِ حسنات سے عاجز اور بعض سیآت کی طرف مضطر معذور ہے، تو اللہ تعالی کہتا ہے:

(فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) [التغابن : ١٦] (پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو)

(لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا)[البقرة : ٢٨٦] (اللہ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)

(وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) [المؤمنون : ٦٢] (اور ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) نبی اکرم نے فرمایا جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو حسبِ استطاعت بجالایا کرو، قرآن میں ہے:

(وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ) [الحج : ٧٨] (اور تم پر دین میں تنگی نہیں کی)

(يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ) [البقرة : ١٨٥] (اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا)

(فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ)[البقرة : ١٧٣] (پس جو ناچار ہو جائے اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد سے باہر نہ نکل جائے اُس پر کچھ گناہ نہیں)

(وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ)[الأحزاب : ٥] (اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں) یہ ایک عظیم اصل ہے اور وہ یہ کہ علماً اور عملاً حسنہ کی فی نفسہا معرفت ہو، چاہے وہ واجب ہو یا مستحب اسی طرح سیئہ کی بھی علماً، عملاً اور قولاً، محظور ہو یا غیر محظور، اگر غیر محظور کو تم سیئہ کا نام دو اور دین حسنات اور مصالح کی تحصیل اور سیآت اور مفاسد کی تعطیل

ہے اور کثیر اوقات فعلِ واحد یا شخصِ واحد میں دونوں امر جمع ہو جاتے ہیں تو ذم، نہی اور عقاب کبھی اس کی طرف متوجہ ہوں گے جس کا ان میں سے ایک متضمن ہے لیکن اس سے غافل نہ ہوا جائے جو اس میں دوسری نوع سے ہے جیسا کہ مدح، امر اور ثواب اس کی طرف متوجہ ہوں گے جس کا ان میں سے ایک متضمن ہے مگر اس سے غافل نہ ہوا جائے گا جو اس میں دوسری نوع سے ہے! کبھی آدمی بعض بدعی و فجوری سیآت کے ترک کی رو سے ممدوح ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ اس سے مسلوب ہوتا ہے جس کی رو سے اس کا غیر ممدوح ہوا، بعض سنیہ بر یہ حسنات کے فعل کی رو سے تو یہ موازنہ اور معادلہ کا طریق ہے! جو اس کا سالک بنا وہ اس قسط (یعنی عادلانہ روش) کے ساتھ قائم ہوا جس کے لئے اللہ نے کتاب اور میزان کو نازل کیا۔

فصل

پھر متقدمین جنہوں نے **رائے، کلام اور تصوف وغیرہ کے طریق** وضع کئے وہ اسے کتاب وسنت اور آثارِ (صحابہ و تابعین) کے ساتھ خلط کرتے تھے کیونکہ وہ ان سے قریب العہد تھے اور ابھی آثارِ نبویہ کے انوار ہر سو روشن اور ظاہر تھے اور ان کے لئے عظیم برہان تھی، اگرچہ بعض لوگوں کے پاس یہ ظلمتِ غیر (مثلاً یونانی و ہندی فلسفہ وغیرہ) کے ساتھ مختلط ہو گئے تھے، جہاں تک متاخرین تو ان میں سے کثیر نے متقدمین نے جو وضع کیا تھا اسے بالائے طاق ڈال دیا مثلاً جن متأخرین نے فنِ کلام میں کتابیں لکھیں انہوں نے صرف مبتدَع اصول کا ہی ذکر کیا اور کتاب وسنت سے اعراض کیا اور انہیں یا تو دوفروع بنا لیا یا پھر مجملاً ان کے ساتھ ایمان والے بنے یا معاملہ انہیں ایک نوعِ زندیقیت کی طرف لے گیا، متقدم متکلمین متأخرین متکلمین سے بہتر تھے اسی طرح جنہوں نے رائے (اور قیاس) بارے کتب تالیف کیں تو انہوں نے سوائے اپنے متبوع (امام، جس کے وہ مقلد تھے) اور ان کے تلامذہ کے کسی اور کی رائے ذکر نہ کی اور کتاب وسنت کی نصوص کا اپنے متبوع کی رائے پر وزن کیا (یعنی رائے کو مقدم کیا اور اس کے مطابق ان نصوص کی تاویل کی) جیسے ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد وغیرہم کے کثیر اصحاب نے کیا (یعنی تقلیدانہ، نہ کہ محققانہ روش پر چلے)

اور یہی روش تصوف اور زہد کے مصنفین نے اختیار کی تو انہوں نے اصل (اور معیار) اسے بنایا جو متأخرین زہاد سے منقول ہوا اور طریقِ صحابہ و تابعین سے اعراض کیا جیسے مصنف (الرسالۃ) ابو قاسم قشیری، ابوبکر محمد بن اسحاق کلاباذی، ابن خمیس نے مناقب الابرار میں اور ابوعبدالرحمٰن سلمی نے تاریخ صوفیہ میں کیا البتہ ابوعبدالرحمٰن نے ایک کتاب (سیر السلف) بھی لکھی جس میں اولیاء و صالحین کے واقعات درج کئے اسی طرح خلف صالحین کے واقعات بارے بھی ایک کتاب تالیف کی جس میں قرونِ ثلاثہ کے بعد والوں کے زہد واحوال کے واقعات لکھے، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، ابوسلیمان دارانی اور معروف کرخی وغیرہ اور ان کے بعد والے، اس سے احسن تھا کہ کم از کم وہ کرتے جو ابونعیم اصفہانی نے کتاب (الحلیۃ) میں کیا کہ متقدمین اور متأخرین دونوں گروہوں کا تذکرہ کیا، اسی طرح ابوالفرج بن جوزی نے (صفوۃ الصفوۃ) میں، ابو قاسم تیمی نے (سیر السلف) میں اور ابن

اسد بن موسی نے اپنی کتاب میں، عبداللہ بن مبارک، احمد بن حنبل اور ہناد بن سری کے انداز واسلوب کی پیروی کرنا ممکن نہ ہوا تو اشیاء کے اصول اور ان کے مبادی، دین اور اس کی اصل اور اس کی اصل جو اس میں متولد (علوم وفنون) ہوئے کی معرفت نفع کے لحاظ سے اعظم العلوم ہے کیونکہ اگر انسان ان اشیاء کے حقائق کا اپنے علم کے ساتھ احاطہ نہ کر سکے جن کا وہ محتاج ہے جو اس کے دل میں کسک سی باقی رہے گی، زہاد کے لئے متعدد القاب تھے، شام میں یہ جوعیہ کہلاتے تھے (جوع یعنی بھوک سے ماخوذ) بصرہ میں فقریۃ (فُقرے) اور فکریہ، خراسان میں یہ مغاربہ، صوفیہ اور فقراء (درویش) بھی کہلاتے تھے، صوفیہ کے لفظ میں صوف (یعنی اونی لباس) کی طرف نسبت ہے کیونکہ زہاد زیادہ تر یہی لباس پہنتے تھے، بعض نے کہا یہ صوفہ بن مراد بن اد بن طابخہ کی طرف نسبت ہے جو عربوں کا ایک قبیلہ تھا، یہ کعبہ کے مجاور بنے، ایک قول یہ ہے کہ یہ صُفہ کی طرف نسبت ہے، اس کی بابت کہا گیا کہ تب حق یہ تھا کہ (صــــفية) کہا جاتا اسی طرح جس نے کہا کہ یہ صفا کی طرف نسبت ہے تو اس بابت کہا گیا کہ حق یہ تھا کہ پھر (صَـفَوى) کہا جاتا اگر مقصور پڑھیں تو (صَـفَوِيَّةٌ) کہا جائے اور اگر صفوۃ کی طرف منسوب ہو تو (صفويۃ) کہا جائے! جس نے کہا یہ اللہ کے سامنے صفِ مقدم (یعنی پہلی صف) کی نسبت سے ہے تو اس کی بابت کہا گیا کہ تب حق یہ تھا کہ کہا جاتا: (صَــفِّيَّةٌ) اور بلا شبہ یہ نسبت واضافت کا موجب ہے جب عربی بیت کی جہت سے لفظ کو اس کا حق دیا جائے

لیکن تحقیق یہ ہے کہ ان نسبتوں کا دراصل اشتقاقِ اکبر اور اشتقاقِ اوسط ۔ نہ کہ اشتقاقِ اصغر ۔ کے طریق پر اطلاق ہوا جیسے ابوجعفر نے کہا کہ (العَامـة) عمٰی سے اسمِ مشتق ہے تو انہوں نے اشتراک فی الحروف کی مراعات کی، نہ کہ ترتیبِ حروف کی اور یہ اشتقاقِ اوسط ہے، یا جنسِ حروف میں اشتراک کو مدِ نظر رکھا نہ کہ اس کے اعیان کو اور یہ اشتقاقِ اکبر ہے، اوسط پر کوفی نحویوں کا قول ہے کہ اسم (سِـمَةٌ) سے مشتق ہے اسی طرح اگر کہیں کہ صوفی صفا سے مشتق ہے لیکن اگر کہا جائے کہ وہ (صِـفَةٌ) یا صف سے مشتق ہے تو یہ اشتقاقِ اکبر کی رو سے، اس اسم کو ائمہ کی ایک جماعت نے استعمال کیا مثلا احمد بن حنبل اور ابوسلیمانی دارانی وغیرہما البتہ شافعی سے صوفیہ کی ذم منقول ہے، اسی طرح میرا خیال ہے مالک سے بھی، احمد نے اس کے ساتھ ابوحمزہ خراسانی، یوسف بن حسین رازی اور بدر بن ابو بدر مغازلی کو مخاطب کیا احمد، مالک، شافعی، ابوحنیفہ کے اصحاب اور اہل الحدیث اور عباد کے اہلِ علم کی ایک جماعت نے ان کے طریقہ کی ذم کی جبکہ کئی نے ان کی مدح بھی کی

اس بابت تحقیق یہ ہے کہ یہ ممدوح اور مذموم (دونوں انواع) پر مشتمل ہے جیسے دیگر طرق بھی، اس سے مذموم جو ہے وہ کبھی اجتہادی ہوگا اور کبھی غیر اجتہادی اور یہ اس ضمن میں رائے کے ذیل میں فقہاء کے بمنزلہ ہیں تو رائے کی بھی علماء وعباد میں سے کثیر حضرات نے ذم کی ہے اور جو قاعدہ میں نے ذکر کیا ہے (کہ مثبت پہلو بھی ہے اور منفی بھی) اس سب کا جامع ہے، اس کے ساتھ متسمی حضرات میں بے شمار اولیاء اللہ اور اخیار عباد بھی ہیں جیسا کہ اہلِ رائے میں بے شمار اہلِ ایمان اور اہلِ علم بھی ہیں جن کا

شمار بس اللہ ہی کر سکتا ہے **(یعنی مطلقاً کسی گروہ کو بطور گروہ کے مذموم نہیں ٹھہرانا چاہیے)** ہر طبقہ میں اچھے، برے، معتدل اور غالی لوگ ہوتے ہیں اس سے تمہارے لیے متبین ہوگا کہ دین میں بدعت ہے اگر چہ فی الاصل یہ مذموم ہو جیسا کہ اس پر کتاب وسنت کی دلالت ہے اور اس ذیل میں قولی اور فعلی بدعات ایک برابر ہیں، میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نبی اکرم کے اس فرمان: (كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ) کے عموم پر محافظت متعین اور اس پر عمل واجب ہے اور جن حضرات نے بدعات کو حسن اور قبیح کی طرف تقسیم کیا ہے اور اسے وہ اس امر کا ذریعہ بناتا ہے کہ نہی پر بدعت کے ساتھ احتجاج نہ کیا جائے گا تو اس نے خطا کی ہے جیسا کہ متفقہہ، متکلمہ، متصوفہ اور متعبدہ کے ایک گروہ نے یہ کیا جب انہوں نے مبتدَع عبادات سے روک ٹوک کی اور مبتدع تدیُّن بارے کلام سے اور ادعاء کیا کہ مکروہ بدعت بس وہی ہے جس سے نہی وارد ہے تو حدیث گویا اس مطلب کی طرف عائد ہوئی کہ ہر جس سے نہی ہے یا ہر جو حرام قرار دیا گیا یا ہر جو نصِ نبوت کے مخالف ہے بس وہی گمراہی ہے اور یہ اوضح ہے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں، لیکن درست مفہوم یہ ہے کہ ہر جو دین سے مشروع نہیں وہ گمراہی ہے اور جو بدعت کہلائی اور شرع کی ادلہ کے ساتھ اس کی اچھائی ثابت ہوئی تو اس کے ضمن میں دو میں سے ایک امر لازم ہے: یا تو کہا جائے کہ وہ دینی لحاظ سے بدعت نہیں ہے اگر چہ لغت کے اعتبار سے بدعت ہو جیسے حضرت عمر نے کہا تھا: (نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ) (یہ اچھی بدعت - یعنی روش - ہے) یا کہا جائے یہ عام ہے لیکن راجح معارض کی وجہ سے یہ صورت اس سے مستثنیٰ کر لی گئی جیسا کہ اس کے ماسوا میں یہ مقتضائے عموم پر باقی ہے کتاب وسنت کے دیگر عمومات کی طرح، اس کی میں نے (اپنی کتب)(اِقْتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ) اور (قَاعِدَةُ السُّنَّةِ وَ الْبِدْعَةِ) وغیرہ میں تقریر کی ہے، یا جو کتاب وسنت کی مخالف ہو

یہاں مقصود یہ ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے منہی عنہ **بدعات اور غیر بدعات میں سے جس کی قباحت ثابت ہو جب اس کا صدور کسی شخص سے ہو تو کبھی یہ اس وجہ پر ہوگا جس میں وہ معذور سمجھا جائے گا** یا اجتہاد کی رو سے یا تقلید کی وجہ سے کہ جس میں وہ معذور سمجھا جائے گا اور یا پھر اپنی عدم قدرت کی وجہ سے! جیسا کہ ایک جگہ اس کی تقریر کی، اسی طرح تکفیر اور تفسیق کی اصل کے بیان میں بھی جو اصلِ وعید پر مبنی ہے تو وہ نصوصِ وعید جو کتاب وسنت میں ہیں اور ائمہ کی تکفیر و تفسیق کے ضمن میں نصوص ونحوہا کسی معین کے حق میں اپنے موجب کے ثبوت کو مستلزم نہیں الا یہ کہ شروط پائی جائیں اور موانع منتفی ہوں، اس ضمن میں اصول اور فروع کے مابین کوئی فرق نہیں، یہ عذابِ آخرت کے ذیل میں، تو اللہ کے عذاب، لعنت اور دارِ آخرت میں اس کے غضب کی وعید کا مستحق دوزخ میں خالد ہے یا غیر خالد، اور کفر وفسق سے اس نوع کے اسماء اس قاعدہ میں داخل ہیں چاہے یہ اعتقادی بدعت کے سبب ہو یا عبادی بدعت کے سبب یا دنیا میں کسی فجور کے سبب اور یہ اعمال کا فسق ہے، جہاں تک احکامِ دنیا تو وہ بھی اسی طرح ہیں تو کفار سے جہاد کے ضمن میں واجب ہے کہ قبل ازیں ان تک دعوتِ اسلام کی تبلیغ ہو چکی ہو کیونکہ عذاب کا مستحق وہی ہوگا جس تک رسالت پہنچی اور یہی

فساق کی عقوبت کا معاملہ ہے تو اس کا نفاذ، قیام (اتمام) حجت کے بعد ہی ہوگا۔

فصل (ایک قاعدہ شریفہ جس کی فہم از حد ضروری ہے)

اور وہ یہ کہ گناہوں اور جرائم میں سے جو دین و دنیا میں دوسروں کو اِضرار کے ساتھ واقع ہوا تو اس کیلئے دنیا میں ہماری عقوبت بڑی ہے لیکن جس کے گناہوں کا ضرر خود اسی کی ذات تک محدود رہا تو آخرت میں اس کی عقوبت اشد ہوسکتی ہے اگرچہ دنیا میں ہم (یعنی انتظامیہ) اس کا معاقبہ نہ بھی کر سکے، بندے کا اپنے دین و دنیا میں اضرار (یعنی دوسروں کو ضرر پہنچانا) ظلم ہے تو غیر پر ظلم کرنے والا لامحالہ دنیا میں سزا کا مستحق ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے باز رہیں پھر یہ دو انواع ہیں: ایک لوگوں کے لئے واجب حقوق کی تلفی اور یہ تفریط ہے، دوم ایسے فعل کا ارتکاب جس میں لوگوں کے لئے ضرر ہے اور یہ عدوان ہے، لہٰذا بدعت کے داعی کا معاقبہ ضروری ہے، وہ جو ساکت ہے (یعنی ہے تو بدعتی مگر اس کی دعوت نہیں دیتا اور نہ پرچار کرتا ہے) اس سے محفوظ رہے گا، سزا کا حقدار وہی ہوگا جو بدعت اور منکر کا اظہار کرے وہ نہیں جو اسے چھپائے رکھے، نیز دینی (یعنی اعتقادی) لحاظ سے منافق کی عقوبت سے بھی ہم امساک کریں گے اگرچہ انجام کے اعتبار سے وہ دوزخ کے درکِ اسفل میں ہوگا اور یہ اس لئے کہ اصل یہ ہے کہ عقوبت اللہ تعالی کے فعل سے ہو، وہی ہے جو آخرت میں لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا، کبھی دنیا میں بھی انہیں جزا دے دیتا ہے، جہاں تک ہمارا تعلق تو بندوں کے لئے ہماری عقوبت بقدر اس کے ہوگی جس کے ساتھ ادائے واجبات اور ترکِ محرمات ہو ہمارے حسبِ امکان جیسے نبی اکرم نے فرمایا مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے لڑوں حتی کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، جب یہ کرلیں تو مجھ سے اپنے خون و مال بچالیں گے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے، فرمایا:

(وَقَـاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ)[الأنفال : ۳۹] (اور اُن لوگوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہوجائے)

(وَالْـفِتْـنَةُ اَكْـبَـرُ مِـنَ الْقَتْلِ)[البقرة : ۲۱۷] (اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے) اسی لیے کفار محاربین اور فساق میں سے جس نے قابو میں آنے سے قبل توبہ کرلی تو اس سے وہ عقوبت ساقط ہوجائے گی جو منجانب اللہ ہے تو اگر حربی قابو میں آنے سے قبل اسلام لے آیا تو اس نے اپنا خون، اہل اور مال بچا لیا اسی طرح ڈاکو، زانی، چور اور شرابی اگر قابو میں آنے سے قبل توبہ کرلیں کیونکہ مقصود بالتوبہ حاصل ہو چکا لیکن اگر قابو میں آنے کے بعد توبہ کی تب ساری عقوبت ساقط نہ ہوگی اس لئے کہ اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ کی حدود معطل ہوجائیں اور فساد حاصل ہو اور اس لیے کہ اس کا اسلام صحیح ہے کیونکہ قابو پائے جانے سے قبل اسلام لایا ہے بخلاف اس کے جو قیدی بنالئے جانے کے بعد مسلمان ہوا تو یہ اس کے استرقاق (یعنی غلام بنائے جانے) سے مانع نہ ہوگا اگرچہ اس کا خون محفوظ ہوگیا، اسی قاعدہ پر یہ بھی مبنی ہوگا کہ کبھی بعض کفار اور منافقین بلاعقوبت چھوڑے جاسکتے ہیں اور یہ کہ

آخرت میں ان کا عذاب اشد ہو جب ان کا ضرر دوسروں تک نہ پہنچا ہو جیسے ذمی حضرات اور وہ جنہوں نے اسلام کا اظہار کیا اور دل میں چھپے نفاق کے ساتھ ظاہری طور پر اس کی شرائع کا التزام کیا، اس لئے کہ ان دونوں اصناف نے مسلمانوں سے دین اور دنیا میں اپنا ضرر روک دیا ہے جبکہ آخرت میں کفر و نفاق سے اپنے اکتساب کرنے کے بحسب عذاب بھگتنا ہوگا لیکن جن لوگوں کے کسی فعل اور اقدام سے اسلامی معاشرے کو ضرر لاحق ہوا تو ان کی مضرت کا سدِ باب کرنا ہوگا چاہے یہ انہیں سزا دے کر کیا جائے اگر چہ ایسا کوئی مسلمان فاسق ہو یا عاصی ہو یا پابندِ صوم وصلاۃ لیکن مجتہدِ مخطئ ہو بلکہ صالح یا عالم بھی ہو، اس میں مقدور علیہ اور ممتنع ایک برابر ہیں

مقدور علیہ کی مثال یہ کہ سزا اسی کو ملے گی جس نے زنا، چوری، شراب نوشی اور جھوٹی گواہی کا اظہار کیا اور راستے قطع کرنا وغیرہ (یعنی اگر ان پر جرم ثابت ہو گیا) اس وجہ سے جو ان افعال میں نفوس، اموال اور عزتوں پر عدوان ہے ہاں البتہ آخرت میں (باوجود عذاب بھگتنے کے) فاسق کا حال اہلِ ذمہ کفار کے حال سے بہتر ہوگا اور منافقین کے حال سے بھی کیونکہ کتاب سنت اور اجماع کی رو سے فاسق کافر اور منافق سے بہتر ہے، اسی طرح اسے بھی سزا دی جائے جو ایسی بدعت کا داعی ہو جو لوگوں کے دین وعقیدہ کو خراب کرے اور اسے نقصان دے اگر چہ نفس الامر میں وہ اجتہاد یا تقلید کرنے کے سبب معذور ہو، اسی طرح باغیوں سے قتال بھی جائز ہے اور یہ جنہوں نے کسی سائغ تاویل کی رو سے امام یا غیرِ امام کے خلاف خروج کیا اپنے عدول (یعنی پابندِ صوم وصلاۃ) ہونے کے باوجود البتہ جن علاقوں میں کچھ مدت انہیں استحکام ملا اور وہاں فیصلے صادر کیے ہم انہیں کالعدم قرار نہ دیں گے اور جو جزیہ یا خراج وغیرہ وصول کر چکے اسے برقرار رکھیں گے کہ صحابہ کے بقاء علی العدالت بارے کوئی اختلاف نہیں اور یہ اس لیے کہ سائغ تاویل کے وقت تفسیق منتفی ہو جاتی ہے اور جہاں تک قتال تو جن واجبات کا ان سے ترک ہوا ان کی ادائیگی کی جائے اور جن محرمات کا انہوں نے ارتکاب کیا ان سے باز آیا جائے اگر چہ اس ضمن میں یہ متأوِل تھے، اسی طرح مختلف فیہ نبیذ پینے والے پر بھی ہم حد قائم کریں گے اگر چہ یہ نیک لوگ ہوں

تو غور کرو کیسے لوگوں کو دنیا میں دین یا دنیا میں واجب کے ترک یا واضح محرم کے فعل پر عقوبت دی گئی اگر چہ وہ اس ضمن میں معذور باور کئے گئے، دنیا میں اپنے فعل کے ضرر کے عدم کی رو سے جیسے انتظامیہ (عدالت) کے پاس مقدمہ دائر کر دئے جانے کے بعد توبہ کرنے والے پر بھی حد قائم کی جاتی ہے اگر چہ اس نے توبہِ نصوح کیوں نہ کر لی ہو اور جیسے نبی اکرم کی ایک پیش گوئی ہے کہ کعبہ (میں موجود کچھ لوگوں) کے خلاف ایک لشکر لڑنے آئے گا تو صحراء میں سب اہلِ لشکر دھنسا دئے جائیں گے جبکہ کئی ان میں سے ایسے ہوں گے جنہیں مجبور کر کے لایا گیا ہوگا تو سب اپنی اپنی نیت پر محشور ہوں گے اور جیسے بدر میں لشکرِ کفار میں حضرت عباس جیسے بھی تھے جو مجبوراً ان کے ساتھ شامل ہوئے اور یہ جیسے اگر کفار مسلمانوں کو اپنی ڈھال بنا لیں اور ان کی بیخ کنی ان سب سے لڑے بغیر ممکن نہ ہو تو کبھی دنیا میں شرعی اور قدرتی عقوبات انہیں بھی لاحق ہو جاتی ہیں جو آخرت میں ان کے مستحق نہ ہوں گے

اور یہ ان کے حق میں مصائب کے بمنزلہ سمجھے جائیں گے (جن پر اجر ہے اور گناہوں کی تکفیر ہے) جیسے بعض کی بابت کہا گیا کہ قاتل مجاہد اور مقتول (یعنی جو اس کے ہاتھوں قتل ہوا) شہید ہے

اس پر جو اہلِ سنت کا آخری فرد بھی مامور ہے کہ اہلِ بدعت کے داعی سے قطع تعلقی کرے تو نہ اسے گواہ بنائے اور نہ اس سے روایت کرے، نہ اس سے فتوی لے اور نہ اس کے پیچھے نماز پڑھے تو یہ بھی اسی باب سے ہوسکتا ہے کیونکہ یہ سب اس کے لئے تعزیر اور عقوبت ہے تا کہ لوگ اس کی مدعو بدعت سے باز آجائیں اگر چہ نفس الامر میں وہ تائب یا معذور ہو کیونکہ قطعِ تعلقی سے دو میں سے ایک شئ مراد ہے: یا مہجور ذنوب اور ان کے اصحاب کا ترک اور یا ان کے فاعل کی عقوبت اور سزا، اسی باب سے امام احمد کا ان علماء کا مقاطعہ کرنا جو فتنہ (خلقِ قرآن) میں قید سے قبل (زبان، نہ کہ دل سے) ان گمراہوں کی بات مان گئے تھے اور ان کا بھی جو بعد ازاں تائب ہوئے اور ان کا جو کسی بھی بدعت کا ارتکاب کرے حالانکہ ان میں متعدد حدیث، فقہ، تصوف اور زہد کے ائمہ تھے تو ان کا اور دیگر مسلمانوں کا ان سے یہ مقاطعہ ان کے رتبہ اور فضیلت کی معرفت سے مانع نہیں جیسے ان تین صحابہ کرام کا معاملہ تھا جن کی (غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے پر) توبہ کا معاملہ موخر کیا گیا تھا جب نبی اکرم نے مسلمانوں کو ان سے قطع تعلقی کا حکم دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کے سابقہ فضائل اب طاقِ نسیاں کی زینت بنے حتی کہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے دو تو بدری صحابی ہیں اور اللہ نے اہلِ بدر سے کہا تھا اب جو چاہو کرو کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا پھر ایک کعب بن مالک تھے، نبی اکرم کے شاعر اور اہلِ عقبہ میں سے ایک، تو یہ اصلِ عظیم ہے کہ کوئی دنیوی مشروع عقوبتِ ہجران سے لے کر قتل تک، اس امر سے مانع نہیں کہ عقوبت زدہ عدول یا مردِ صالح نہ ہو جیسا کہ میں نے دنیا کی مشروع اور قدرتی عقوبت کے اور اخروی عقوبت کے مابین (سابقہ سطور میں) فرق واضح کیا ہے! واللہ سبحانہ اعلم۔

فصل

اسی باب سے مناسبت رکھنے والا ان کا یہ قول بھی ہے کہ: **فلاں کے حوالے اس کا حال کر دیا جائے** یا نہ کیا جائے، تو اس میں کثیر نزاع واقع ہوتا ہے ان امور و افعال کی بابت جو کبھی بعض مشائخ، دراویش اور صوفیہ سے صادر ہوتے ہیں، ایسے امور جن کی بابت کہا جائے کہ وہ شریعت کے مخالف ہیں تو جو انہیں منکر خیال کرے اور اس کا عقیدہ ہے کہ منکر کا انکار دین سے ہے وہ ان امور کا انکار اور رد کرے گا اور اس شخص کا بھی اور ان کا بھی جو اس کی نسبت حسنِ ظن رکھیں تو یہ اسے مبغوض، مذموم اور قابلِ عقاب گردانے گا لیکن جو انہیں اہلِ صلاح و زہد میں سے سمجھے وہ ان امور کا انکار نہ کرے گا بلکہ انہیں سائغ یا حسن خیال کرے گا، یا کم از کم ان کی بابت لب کشائی سے پرہیز کرے گا، کبھی ان دونوں صنف کا کوئی آدمی غلو سے کام لے گا کہ مثلاً اگر انکار پر اترا ہے تو اسے ان امور کی رو سے ظاہری ادلہِ شرع کے مدِ نظر مواطنِ اجتہاد میں کافر اور فاسق قرار دیدے اور ثانی صورت میں اس کا اقرار ایسی شئ کے ساتھ اقرار کی طرف خارج ہوگا جو معلوم بالاضطرار ہے کہ رسول ان کے برخلاف کے ساتھ آئے اپنے زعم میں اس کی

اتباع کرتے ہوئے جو حضرات موسیٰ اور خضر کے قصہ سے متشابہ ہے، اول موسویت میں کثیر ہے اور ان میں جو ان میں سے یہودیت کی طرف منحرف ہوئے جبکہ ثانی عیسویت میں اور جو ان میں سے نصرانیت کی طرف منحرف ہوئے، اول کثیر اہلِ علم میں واقع ہے لیکن قسوت اور ہویٰ کے ساتھ مقرون کر کے اور ثانی کا کثیر وقوع ذوی رحمت (راہب مراد ہیں) میں ہے لیکن ضلال و جہل کے ساتھ مقرون کرتے ہوئے، جہاں تک امتِ وسط (یعنی امتِ محمدیہ) ہے تو ان کے لئے علم بھی ہے اور رحمت بھی (یعنی وہ یہودیوں کی طرح عالم اور عیسائیوں کی مانند مہربان ہیں، یہودیوں کی طرح سنگدل نہیں) جیسا کہ اللہ نے اپنی صفت بیان کرتے ہوئے کہا:

(رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا) [الغافر: ۷] (اے ہمارے رب تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے) اور کہا:

(وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ)[الأعراف: ۱۵۶] (اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے) اور کہا:

(اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا) [طٰه: ۹۸] (تمہارا معبود اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے) اسی طرح اس بندے (یعنی حضرت خضر) کا وصف کرتے ہوئے جن سے حضرت موسیٰ سے ملاقات ہوئی تھی کہا:

(اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا) [الکهف: ۶۵] (جسے ہم نے اپنے ہاں سے رحمت دی تھی اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا) اس باب میں قولاً اور فعلاً عدل یہ ہے کہ تسلیمِ حال (یعنی کسی کا حال اسی کے حوالے کرنا) کے دو معانی ہیں:

ایک اس سے رفعِ لوم اس طور کہ نہ وہ مذموم ہو اور نہ ماثوم اور ثانی اس کے فعل پر اس کی تصویب اس طور کہ وہ محمود و ماجور ہو تو اول عدمِ ذم وعقاب اور ثانی وجودِ حمد وثواب، اول میں اللہ کی عدم ناراضی اور عدم عقاب ہے اور ثانی میں اس کی رضا اور ثواب کا وجود ہے اسی لئے تم کثیراً ناراضی اور ذم وعقاب کے اثبات میں منکرین پاؤ گے جبکہ رضا، حمد اور ثواب میں مقرین کو بھی اور یہ دونوں ہی کبھی مخطئ ہو سکتے ہیں اور صواب وسط اور امرِ ثالث میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ نہ حمد ہو، نہ ذم، نہ ثواب اور نہ عقاب

اس کی تفصیل یہ کہ اس سے یہ صادر امر۔ چاہے قول ہو یا فعل۔ جب معلوم ہو کہ یہ کتاب وسنت کے مخالف ہے اس طور کہ یہ باطل قول یا حرام فعل ہو تو دو جگہ میں وہ معذور باور ہوگا: ایک اس کے بارہ میں جاننے سے اس کی عدم قدرت اور دوم مشروع حق ادا کرنے پر اس کی عدم قدرت، اول کی مثال کہ صاحبِ حال مولّہ (مغلوب العقل) اور مجنون ہو جس سے قلم ساقط ہے (یعنی مرفوع القلم ہے) تو اس کی بابت جب کہا جائے کہ اس کا حال اسی کے سپرد کر دیا جائے تو یہ بایں معنی کہ نہ اس کی ذم کی جائے اور نہ کسی عقوبت کا نشانہ بنایا جائے، اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ اس ضمن میں اس کی تصویب کی جائے جیسا کہ تمام مجانین بارے یہ بات کہی جاتی ہے تو یہ صحیح ہے لیکن اگر مراد یہ لی جائے کہ یہ قول (جو اول فول اس نے منہ سے نکالا) درست اور صواب ہے تو یہ خطا

ہے،اسی طرح اگر یہ حال اس سے اجتہاد کی رو سے صادر ہوا جیسے اہلِ علم و دین کے ہاں متنازع فیہ اجتہادی مسائل ہیں تو اس کے ضمن میں اگر کہا جائے کہ اس کا حال اس کے حوالے کر دیا جائے جیسے کہا جاتا ہے: اسے اس کے اجتہاد پر مقر کیا جائے تو یہ اس معنی میں کہ نہ اس کی ذم کی جائے اور نہ کسی سزا کا نشانہ بنایا جائے،تو یہ صحیح ہے تو اس کی تصویب کی دلیل ہونا ضروری ہے وگرنہ غیرِ رسول سے صادر فعل یا قول قائل یا فاعل کی تصویب پر حجت نہ ہوگا،تو جب معلوم ہو جائے کہ یہ اجتہادی خطا ہے تو اس کی تسلیمِ حال اس معنی میں ہے کہ اس سے ذم مرفوع ہے، نہ کہ وہ اس میں درستگی پر ہے، اسی طرح اگر تسلیمِ حال اور اس کے اقرار سے یہ مراد ہو کہ اسے اس کے فیصلہ پر مقر کیا جائے اس کا نقض نہ کیا جائے یا اس کے فتوی پر تو اس کا انکار نہ کیا جائے یا س کی اتباع کے جواز پر ان کے لئے جو اس کے اہلِ تقلید اور اہلِ ارادت ہیں اس طور کہ **قاصرین (یعنی جو خود دینی مسائل اور کتاب وسنت کو نہیں سمجھ سکتے) کے لئے (روا) ہے کہ وہ علماء ومشائخ میں سے ان کی تقلید واتباع کر سکتے ہیں جن کی تقلید واتباع سائغ (یعنی روا)** ہے ان امور میں کہ جن میں ان کے لئے ظاہر نہ ہو کہ وہ خطا ہیں لیکن اس کا بعض حصہ ثانی قسم میں داخل ہوگا جس کا مخالفِ شرع ہونا معلوم نہیں، اس طرح کی صورتحال میں تسلیمِ حال کہ جب اس کا معذور ہونا معروف ہو یا یہ معروف ہو کہ وہ اپنے طریق میں صادق ہے اور یہ معاملہ اس کے اجتہاد کا نتیجہ ہوسکتا ہے تو یہ تین مواضع ہیں جن میں اس کا حال اس کے سپرد کر دیا جائے گا،علم سے اس کے عدمِ تمکن اور حق کے اس پر خفاء کی وجہ سے اس وجہ پر کہ جس کی رو سے اسے معذور باور کیا جائے

ثانی کی مثال اس کی عدم قدرت کہ ایسے احوال اس پر وارد اور طاری ہو جائیں کہ خود پر اسے اختیار نہ رہے تو اپنے کپڑے پھاڑے یا منہ پر دو ہتڑ مارے یا خوفناک طرح سے چیخے یا نہایت مضطرب ہو جائے تو جب معروف ہو جائے کہ اس کا سبب حرام شیٔ نہ تھا اور وہ مغلوب الحال ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے،اگر شک ہو کہ آیا فی الحقیقت مغلوب الحال ہے یا متصنع ہے (یعنی میسنا بنا ہوا ہے) تو صورتحال کی تحقیق کر کے اگر صدق معلوم ہو جائے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اگر اس کا کذب اور تصنُّع معلوم ہو تو اس کا انکار ورد کیا جائے اور اگر شک اور تذبذب ہو تو تسلیم وانکار میں توقف کیا جائے تا آنکہ معاملہ واضح ہو جیسے اس کی نسبت کیا جاتا ہے جس نے کوئی گواہی دی یا جس پر چوری وغیرہ کا الزام لگا تو صوتحال کی تفتیش اور تحقیق کی جائے گی اور کوئی بھی فیصلہ صورتحال واضح ہونے کے بعد ہی کیا جائے گا، اگر معاملہ مشتبہ ہی رہے تو توقف اختیار کیا جائے، مومن کی یہی شان ہے کہ وہ وَقّاف اور متبیّن ہوتا ہے (یعنی جلد بازی میں کوئی حکم اور فتوی نہیں لگاتا) یہی حسن بصری نے کہا تھا، اسی طرح اگر کوئی یہ ظاہر کر کے کہ وہ مغلوب الحال ہو چکا ہے واجبات کا تارک بن جائے اور ان کی ادائیگی پر قادر نہیں کہ مثلاً غشی کی سی کیفیت ظاہر کر کے یا سوتا بن کر نمازِ حاضر نہ ادا کرے جیسے بعض مصعوقین (جن پر غشی طاری ہوئی) پر اللہ کا ایسا خوف یا اس کی محبت وغیرہ طاری ہوتی ہے کہ ہوش وحواس ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو نماز پڑھنا ممکن نہیں رہتا تو جن واجبات کا وہ ترک کر رہا ہے یہ

ان محرمات کی نظیر ہے جن کا وہ ارتکاب کرے تو تسلیم الحال سے اس معنی میں کہ اسے ملامت کا نشانہ نہ بنایا جائے، کبھی یہ حکم لگانا مراد ہوسکتا ہے کہ وہ معذور ہے اور کبھی ترکِ حکم مراد ہوگا کہ وہ مَلوم ہے

یہ ان افعال واقوال کی نسبت جن کی بابت معلوم ہو کہ وہ بلا ریب مخالفِ شریعت ہیں، **بعض مشائخ سے منقول شطحات** (صوفیہ اور مشائخ سے صادر اقوالِ عجیبہ کو یہ نام دیا گیا) کی طرح، مثلا ابن ہود کا قول کہ جب قیامت کا روز ہوگا میں اپنا خیمہ جہنم کے کنارے نصب کرلوں گا اور شبلی کا اپنی داڑھی منڈوا دینا اور کپڑے پھاڑ لینا حتی کہ دو دفعہ انہیں مارستان (یعنی پاگل خانے) میں داخل کرایا گیا تھا اور جو ان کے بعض بارے منقول ہے کہ مریدوں سے کہا (میری وفات کے بعد) اگر کوئی حاجت درپیش ہو تو میری قبر پر آکر میرے ساتھ استغاثہ کرنا اور جیسے ایک نے ایک صالح امام کے پیچھے جمعہ ادا کرنا چھوڑ دیا تھا اس وجہ سے کہ اس نے سلطانِ وقت کے لئے دعا مانگی اور اسے عادل قرار دیا تھا اور ایک اور نے ایک امام کے پیچھے نمازیں پڑھنا چھوڑ دی تھیں کہ اسے کشف ہوا ہے کہ وہ (نماز کے دوران) اپنی سوچوں میں غرق رہتا ہے اور جو عقلائے مجانین بارے قول گزرا کہ اللہ نے انہیں عقول واحوال عطا کئے تھے تو عقول واپس لے لیں اور احوال ان کے پاس باقی رکھے اور مسلوب کے عوض اپنے فرائض کو ان سے ساقط کردیا، اس سب کا جماع (لبِ لباب) یہ ہے کہ ان امور کو کتاب وسنت سے ان کا حق دیا جائے (یعنی ان کی روشنی میں انہیں پرکھا جائے) تو جو کتاب وسنت میں خبر اور امر ونہی وارد ہے اسے مانا جائے اور اس کے مخالف کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائے چاہے کوئی بھی ہو، قرآن وسنت کے برخلاف میں کسی کی اتباع نہ ہوگی چاہے کوئی بھی ہو جیسا کہ اس پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی دلالت ہے اور شریعت نے جسے معذور قرار دیا ہے اسے معذور باور کیا جائے مثلا کہ کوئی مسلوب العقل یا ساقط التمیز یا مجتہدِ مخطیٔ ہو، قولی اجتہاد ہو یا عملی یا کسی فعل اور ترک پر جو مغلوب الحال ہوا اس طور کہ جو فعل اس سے صادر ہوا اس کا رد اس کے لئے ممکن نہ ہوا تو یہ بلا گناہ اس کا فاعل ہے اور جو واجب اس سے چھوٹا اس کا ادا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوا تو یہ بھی بلا گناہ اس کا فاعل ہے، روش یہ ہونی چاہیے کہ کتاب وسنت کے برخلاف کسی قول اور فعل کو مانا نہ جائے گا اور نہ اسے شرع ومنہاج کا درجہ دیا جائے گا بلکہ اللہ کی طرف کوئی راہ نہیں اور نہ کوئی شریعت مگر وہی جو حضرت محمد لے کر آئے

جہاں تک بعض اشخاص جنہوں نے بعض امورِ شریعت کی ان مذکورہ بالا وجوہ پر مخالفت کی تو وہ معذور باور ہوں گے ان کی ذم نہ کی جائے گی اور نہ کسی عقوبت کے سزاوار ٹھہرائے جائیں، سوائے رسول اللہ کے ہر ایک کی بات مانی بھی جاتی ہے اور چھوڑی بھی جاتی ہے، ائمہ میں سے ہر ایک امام کے ایسے اقوال اور افعال ہیں جن پر ان کی تقلید نہ کی جائے گی مگر ان کی اس پر ذم بھی نہ ہوگی (کیونکہ انہوں نے عمداً شریعت کی مخالفت نہیں کی) اور جہاں تک وہ اقوال وافعال جن کی بابت قطعاً معلوم ہو کہ وہ کتاب وسنت کے مخالف نہیں بلکہ وہ موارد اجتہاد میں سے ہے جن میں اہلِ علم وایمان نے باہم

تنازع کیا ہےتو یہ امور کبھی بعض ان حضرات کے نزدیک قطعی ہوں گے جن کے لئے اللہ نے ان میں حق کی تبیین کر دی ہے لیکن اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ لوگوں پر اس کا ماننا لازم کرے جو اس کے لئے تو حق ہونا ظاہر ہوا ہے ان کے لئے نہیں تو یہ ایک وجہ سے قسمِ اول اور دوسری وجہ سے قسمِ ثانی سے کے ساتھ ملتحق ہے

اور کبھی یہ اس کی نظر میں اجتہادی امور ہوں گے تو **ہر مجتہد کا اجتہاد اس کے لئے مسلم ہوگا** اور ان کے لیے بھی جو اس کے مقلد ہیں،نوعی تسلیم اس طور کہ ان پر اس کا انکار نہ کیا جائے جیسے قسمِ اول میں شخصی تسلیم کیا گیا تھا جہاں تک وہ کہ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑا جائے گا تو مثلاً جس کے بارہ میں معروف ہو کہ وہ عاقل ہے اور اس لئے متولِّہ (یعنی میسنے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوانہ)بنا ہوا ہے تا کہ اس سے لوم ساقط ہو جیسے الشیخ احمد بن رفاعی کے کثیر مریدین اور یونسیہ ان محرمات میں جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں اور جو وہ ترکِ واجبات کرتے ہیں، یا جس سے معروف ہو کہ وہ اپنے وجد میں گم اور حالتِ سکر میں بنا ہوا ہے تا کہ اس کے بارہ میں حسنِ ظن ہو اور اسے قابلِ لوم نہ سمجھا جائے ان منکر امور میں جو اس سے واقع ہوں یا اس کی بابت معروف ہو کہ حق اس کے لئے واضح ہوا مگر وہ اپنی خواہشات کا متبع بنا ہوا ہے یا معروف ہو کہ وہ شریعتِ محمدی کے موجب سے انحراف کو مجوز کرتا ہے اور زبان سے کبھی ایسی باتیں نکالتا ہے جو شریعت کے مخالف ہیں یا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ افراد میں سے کئی ایسے بھی ہیں جو رسول سے مستغنی ہو سکتے ہیں یا انہیں حق ہے کہ رسول کی مخالفت کریں یا وہ مخالفِ دین قدرِ محض کے ساتھ چلتا ہے، جیسے بعض کذاب اور گمراہ بیان کرتے ہیں کہ اہلِ صفہ نے کفار کے ساتھ مل کر نبی اکرم سے قتال کیا جب صحابہ کرام منہزم ہوئے (یعنی غزوۂ احد میں)اور کہا ہم اللہ کے ساتھ ہیں، جو غالب آئے ہم اس کے ساتھی ہوں گے اور یہ کہ شبِ اسراء کی صبح نبی اکرم اور اللہ کے مابین ہونے والی گفتگو سنی گئی تھی اور یہ کہ آپ آسمان میں موجود دیکھے گئے حتی کہ آپ کے کندھے سے چادر بھی گری (یعنی اس کا بھی مشاہدہ ہوا) اور یہ کہ آپ نے کچھ راز کی باتیں ایک جگہ زمین میں دبائی تھیں تو وہاں بانسری اُگ آئی تو یہاں سے بانسری کے سُروں میں کچھ راز پنہاں ہوتے ہیں، یا اب بعض افراد ایسے ہیں جن کے لئے آپ کی شریعت سے خروج جائز ہے جیسے حضرت خضر کے لئے امرِ موسیٰ سے خروج جائز تھا کیونکہ وہ ان کی طرف مبعوث نہ تھے جیسے حضرت محمد تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے تو یہ اور ان کے نحو جو حق واضح ہونے کے باوجود شریعت کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کا انکار ورد واجب ہے اس حساب سے جس کے ساتھ وارد ہے ہاتھ، زبان اور دل کے ساتھ (یعنی حسبِ استطاعت)

اسی طرح ان کا بھی انکار کیا جائے جو متقدمین معذورین کے مخالفِ شرع اقوال وافعال کی اتباع کریں کیونکہ جو عذر ان (متقدمین) کے ساتھ قائم ہوا وہ ان کے حق میں منتفی ہے لہذا ان کے لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کی متابعت کرے اور جس کا معاملہ مشتبہ ہوا کہ دونوں میں سے کس قسم سے ہے تو اس کے بارہ میں توقف کیا جائے،حکمران اگر معاف کرنے میں غلطی کریں یہ اس امر سے

بہتر ہے کہ سزا دینے میں غلطی کریں (کہ بے گناہ کو سزا دے دیں) لیکن جس کا کتاب وسنت کا مخالف ہونا واضح ہو اس کے انکار ورد میں توقف نہ کیا جائے، نبی اکرم کا فرمان ہے جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے تو کتاب وسنت سے موجبِ عموم واطلاق شبہات کی رو سے خروج سائغ نہیں اور نہ یہ سائغ ہے کہ شبہات کے ساتھ ذم اور عقوبت کا اجرا ہو اور نہ یہ کہ ان کی رو سے کسی شئ کو حق یا باطل یا صواب یا خطا قرار دے دیا جائے، اللہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت دے ان لوگوں کا راستہ جن پر اس کا انعام ہوا نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین میں سے، نہ کہ ان کا جو مغضوب علیہم ہوئے اور نہ ان کا جو ضالین ہیں

باقی رہا وہ مسئلہ جو عموماً مشتبہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کسی مجہول الحال آدمی سے فی الظاہر مخالفِ شرع کسی امر کا ظہور ہو اور جواز ہو کہ وہ اس میں شرعاً معذور ہو مثلاً کوئی شرع سے خارج ہوا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس میں صادق ہے یا متصنع ہے، یا مثلاً کسی ساتھی کی کوئی شئ بظاہر بغیر اس کی اذن کے لی اور یہ مجوز ہے کہ اسے علم ہو کہ وہ اس کا برا نہ مانے گا تو ایسوں کے بارے میں اگر کہا جائے کہ ان کا انکار کیا جائے گا تو یہ جائز وممکن ہے کہ یہ معذور ہوں اور اگر کہا جائے ان کا انکار نہ کیا جائے گا تو فی الظاہر مخالفتِ شرع پر مجہول الحال کا اقرار لازم آتا ہے تو اس قسم کی صورتحال میں واجب یہ ہے کہ اولاً اس صاحبِ حال سے نرمی کے ساتھ بات کی جائے اور اسے باور کرایا جائے کہ یہ بظاہر یا بباطن منکر امر ہے اور تم اپنے نفس پر اللہ کے امین ہو تو ہمیں اس ضمن میں اپنے حال بارے صاف صاف بتلاؤ یا کم از کم یہ کرو کہ اس کا اظہار نہ کرو کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا اور اس ذیل میں ایسے طریقہ کے سالک بنو جو منکرات کے اقرار پر منتج نہ ہو اور نہ معصومین کو ملامت کرنے پر، ضابطہ یہ ہے کہ جس کے معمولات سے صدق وامانت معروف ہے اسے اس امر پر جس کی بابت نہیں جانتا تھا کہ وہ کذب وحرام ہے مقر کیا جائے لیکن جس سے کذب یا خیانت معروف ہو وہ مجہول پر مقر نہ کیا جائے اور جو مجہول الحال ہو اس کی بابت توقف کیا جائے۔

شیخ کی ایک تحریر حمد وثناء کے بعد:

فصل عبادات میں اور شرعی اور بدعی عبادات کے مابین فرق کے بارہ میں

یہ ایسا باب ہے جس میں کثیر اضطراب ہوا جیسا کہ حلال وحرام کے باب میں بھی کثیر ہوا تو بعض اقوام نے اللہ کی بعض محرمات کو حلال کر لیا جبکہ بعض نے اللہ کے بعض حلال کردہ امور واشیاء کو حرام قرار دے لیا، اسی طرح کچھ اقوام نے ایسی عبادات کا احداث کیا جنہیں اللہ نے مشروع نہیں کیا بلکہ ان سے نہی کی ہے، دین کی اصل یہ ہے کہ حلال وہی جسے اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اور حرام وہی جسے اللہ ورسول نے حرام کیا اور دین وہی جسے اللہ اور اس کے رسول نے مشروع کیا ہے! کسی کو حق نہیں کہ وہ اس صراطِ مستقیم سے خارج ہو جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا ہے، فرمایا:

(وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ)[الأنعام : ۱۵۳] (اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور دوسرے راستوں پر نہ چلنا کہ اللہ کے راستے

سے الگ ہو جاؤ گے ان باتوں کا اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو) ابن مسعود راوی ہیں کہ نبی اکرم نے زمین پر ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچیں پھر فرمایا یہ سیدھی لکیر اللہ کی راہ ہے اور یہ جو دائیں بائیں لکیریں ہیں ان میں سے ہر راہ پر شیطان ہے جو اس کی طرف بلا رہا ہے پھر مذکورہ بالا یہ آیت پڑھی، اللہ نے سورۃ انعام اور اعراف وغیرہما میں مشرکین کی ذم کی ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے وہ اشیاء حرام کر لیں جو اللہ نے حرام نہیں کی تھیں مثلاً بحیرہ، سائبہ اور بعض ان امور کو حلال ٹھہرا لیا جو اللہ نے حلال نہیں کئے تھے مثلاً اولاد کا قتل اور ایسا دین مشروع (ایجاد) کر لیا جس کی اللہ نے اذن نہیں دی، فرمایا:

(اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ) [الشوریٰ : ۲۱] (کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟) اور اسی سے ایسی اشیاء جو محرم ہیں مگر انہوں نے انہیں عبادات کا درجہ لے لیا مثلاً شرک اور فواحش، مثلاً کعبہ کا عریاں ہو کر طواف وغیرہ، حلال و حرام بارے کلام کے لئے دیگر مقامات ہیں یہاں مقصود عبادات ہیں تو ہم کہتے ہیں:

وہ عبادات جن کے ساتھ اللہ کا تقرُّب ملتا ہے بعض ان میں سے اللہ و رسول کے ہاں محبوب اور مَرضیؔ (یعنی پسندیدہ) ہیں یا تو واجب یا مستحب! جیسے صحیح میں ہے نبی اکرم نے حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے کہا کہ میرا بندہ ان کی ادائیگی کے مثل کے ساتھ میرا تقرب نہیں پاتا جو میں نے فرض کئے ہیں اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا تقرب پاتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب اسے محبوب کر لیتا ہوں تو۔۔ الخ۔ اور معلوم ہے کہ نمازوں میں سے بعض فرض ہیں مثلاً نمازِ پنجگانہ اور بعض نفل جیسے قیامِ شب (تہجد) اسی طرح روزے جو بعض فرض ہیں مثلاً ماہِ رمضان کے روزے اور بعض نفل جیسے ہر ماہ کے تین ایام (ایامِ بیض یعنی قمری ماہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخوں) کے روزے اسی طرح مسجد حرام کی طرف سفر (یعنی بغرضِ حج، زندگی میں ایک دفعہ) فرض ہے اور دو مسجدوں مسجدِ نبوی اور بیت المقدس کی طرف نفل ہے اسی طرح صدقہ ہے تو اس میں فرض بھی ہے (مثلاً زکاۃ) اور مستحب بھی اور یہ عفو (یعنی فاضل مال سے کچھ نفلی صدقہ وخیرات کر دینا) جس کا اس آیت میں ذکر ہوا:

(وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ)[البقرة : ۲۱۹] (یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کون سا مال خرچ کریں تو کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو) ایک صحیح حدیث میں ہے نبی اکرم نے فرمایا اے ابن آدم تم اگر زائد مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کر ڈالو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو اور اگر اسے روک رکھو تو یہ تمہارے لیے شر ہو گا اور کفاف پر تم قابلِ ملامت نہیں اور اوپر والا (یعنی دینے والا) ہاتھ نیچے والے (یعنی سائل کے) ہاتھ سے بہتر ہے اور ابتدا ان سے کرو جن کی کفالت تمہارے ذمہ ہے، واجب اور مستحب کے درمیان فرق کی بحث کے لئے ایک اور مقام ہے، یہاں مقصود مشروع عبادات۔ چاہے یہ واجب ہو یا مستحب۔ اور غیر مشروع کے مابین فرق بیان کرنا ہے تو مشروع وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کی طرف تقرب حاصل کیا جاتا ہے اور یہ اللہ کا راستہ جو کہ نیکی،

طاعت، خیر اور معروف ہے اور یہ سالکین کا طریق اور قاصدین و عابدین کا منہاج ہے اس کا ہر وہ سالک ہے جو اللہ سے اس کی ہدایت کا طالب ہے اور زہد وطاعت کے طریق کا سالک ہے اور جسے فقر (درویشی) اور تصوف ونحوہ کہا جاتا ہے

اور بلا شبہ اس میں مشروع نمازیں ۔واجب اور مستحب ۔داخل ہیں اسی طرح مشروع قیامِ شب اور وجہِ مشروع پر تلاوتِ قرآن، اذکار اور شرعی ادعیہ اور جو ان میں سے کسی خاص وقت میں مؤقت ہیں مثلاً صبح وشام کے اذکار اور نوافل اور جو کسی سبب کے ساتھ مرتبط ہیں مثلاً تحیۃ المسجد، سجدہ ہائے تلاوت، سورج اور چاند گرہن کی نماز، نمازِ استخارہ اور جو اس ضمن میں ماثور اذکار وادعیہ ہیں اور اس میں کثیر امور داخل ہیں اور ایسی صفات جن کی تفصیل سے بات طویل ہو جائے گی، اسی طرح شرعی صیام بھی جیسے نصف دہر کے روزے یا اس کے ثلث یا دوثلث یا عُشر کے اور یہ ہر ماہ کے تین روزے، اسی طرح اس میں شرعی سفر بھی داخل ہے جیسے مکہ اور مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصی کا سفر پھر جہاد بھی اپنی اختلافِ انواع پر اور اکثر احادیثِ نبویہ نماز اور جہاد بارے ہیں

دینی عبادات کے اصول : وہ نماز، صیام اور قراءت جن کا ذکر صحیحین کی عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت میں ہے جب آپ ان کے ہاں آئے اور کہا مجھے بیان کیا گیا ہے کہ تم نے کہا ہے میں روزانہ روزہ رکھوں گا اور پوری رات قیام کروں گا اور تین دین میں قرآن ختم کروں گا؟ عرض کی جی ہاں یارسول اللہ! فرمایا نہ کرو کہ سخت مشقت میں ہو جاؤ گے پھر انہیں ہر ماہ میں تین روزے رکھنے کا کہا، عرض کی مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے، آخر کار ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنے پر راضی ہوئے، فرمایا یہ افضل روش ہے اور حضرت داود کا صیام اسی طرز پر تھا جو ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھتے تھے، اسی طرح قیام بھی انہی کا افضل طرز پر تھا کہ آدھی رات تک سوتے پھر اٹھ کر ثلث شب قیام کرتے اور پھر بقیہ سدس سو جاتے اور حکم دیا کہ سات دن میں قرآن ختم کیا کرو، یہ مذکورہ بالا عبادات ہی معروف ہیں، صحیحین میں منقول حدیثِ خوارج میں کہا تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں اور اپنی قراءت کو ان کی قراءت کے آگے ہیچ جانو گے، وہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلقوم سے آگے نہ گزرے گا، دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے تو ان کے غلو کا وصف کیا حتی کہ صحابہ اپنی عبادات کو ان کی عبادت کے مقابلہ میں حقیر جانیں گے، ان خوارج نے بلا فقہ (یعنی بنا سوچے سمجھے) عبادات میں غلو کیا حتی کہ ان کا معاملہ بدعت پر منتج ہوا تو انہیں اسلام سے اس طرح خارج قرار دیا جیسے تیر کمان سے خارج ہو جائے اور کہا انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کرو کہ اللہ کے ہاں روزِ قیامت ان کے قتل پر اجر ہے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے خون کا استحلال کیا اور اپنے (نظریاتی) مخالفین کو کافر قرار دیا، ان کی بابت صحیح احادیث مروی ہیں، امام احمد کہتے ہیں یہ حدیث دس صحیح طرق سے مروی ہے، مسلم نے اسے کاملاً جبکہ بخاری نے اس کا ایک قطعہ تخریج کیا

پھر یہ تینوں اجناس مشروع ہیں لیکن ان سے مشروع مقدار بارے کلام باقی ہے، احمد کی ایک کتاب بعنوان (الاقتصاد

فی العبادۃ) ہے، حضرت ابی بن کعب کا قول ہے سنت میں اقتصاد (میانہ روی) بدعت میں اجتہاد (یعنی غیر مشروع طریقہ سے عبادت کرنے میں نہایت محنت سے کام لینے) سے بہتر ہے، سوائے عیدین، ایامِ تشریق اور پوری رات کے قیام بارے بحث کی گئی ہے کہ آیا یہ مستحب ہے؟ جیسا کہ فقہاء، صوفیہ اور عباد کے ایک گروہ کی یہی رائے ہے، یا یہ مکروہ ہے؟ جیسا کہ اس پر سنت دال ہے اگرچہ یہ جائز ہے لیکن ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنا افضل ہے اور ثلث شب کا قیام افضل ہے! تفصیل کے لئے ایک دیگر مقام ہے کہ یہاں مقصود غیر مشروع اجناسِ عبادات بارے بحث ہے جو متاخرین کے ہاں حادث ہوئیں مثلاً خلوت اختیار کرنا (جسے مراقبہ یا چلے کا نام دیا جاتا ہے) تو یہ شرعی اعتکاف کے مشابہ ہے جبکہ شرعی اعتکاف مساجد ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ نبی اکرم اور آپ کے صحابہ کا یہی فعل تھا، خلوت اختیار کرنے کے ضمن میں بعض حضرات آنجناب کے غارِ حرا میں خلوت گزیں ہونے سے احتجاج کرتے ہیں جو قبل از نبوت کیا مگر یہ احتجاج خطا ہے، نبی اکرم نے جو کام نبوت سے قبل کیا اگر تو وہ آپ کی بعثت کے بعد مشروع ہوگیا تب تو ہم اس میں آپ کی اتباع کے مامور ہیں مگر امرِ واقع یہ ہے کہ نبوت کے بعد آپ نے غارِ حرا کا رخ نہیں کیا اور نہ آپ کے خلفائے راشدین نے ایسا کیا، آپ بعد از نبوت تقریبا تیرہ برس مکہ میں رہے ہیں پھر عمرۃ القضاء کرنے مکہ آئے پھر فتحِ مکہ کے موقع پر تقریبا بیس دن آپ کا قیام رہا پھر آخری دفعہ حجِ وداع کے لے آئے، غارِ حرا قریب ہی تھا مگر آپ نے کبھی پھر اس کا رخ نہ کیا، زمانہِ جاہلیت میں لوگ غارِ حرا میں خلوت گزین ہونے آتے تھے، کہا جاتا ہے عبدالمطلب اولین شخص ہیں جو یہاں آئے کیونکہ ان کے ہاں کوئی شرعی معروف عبادات نہ تھیں جو نبی اکرم نے نبوت ملنے کے بعد متعارف کرائیں تو اب ان شرعی عبادات ازقسم نماز واعتکاف نے غارِ حرا میں تحنُّث (یعنی تعبُّد، غور وفکر) سے مستغنی کر دیا، اس طریقہ سے نماز معروف نہ تھی اسی لئے ابوجہل وغیرہ آپ کو اس سے روکا کرتے تھے جیسے کہا:

(أَرَءَيْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی) إلی قوله : (كَلاَّ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ) [العلق : ۹-۱۹] (بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔۔۔دیکھو اس کا کہانہ ماننا اور قرب حاصل کرتے رہنا) ایک گروہ چالیس دن کے چلے اور خلوت کو از حد معظم قرار دیتا اور اس کی تلقین کرتا ہے، اس ضمن میں یہ حضرت موسیٰ کے کوہِ طور پر چالیس دن کے قیام سے دلیل اخذ کرتے ہیں، مروی ہے کہ حضرت موسیٰ نے ان ایام کے روزے رکھے تھے بعد ازاں حضرت مسیح نے اللہ کے لئے چالیس دن روزے رکھے تھے پھر ان پر وحی آئی تھی تو یہ کہتے ہیں کہ چلے کے بعد خطاب وتنزُّل (یعنی القاء اور الہام) حاصل ہوتا ہے جیسے غارحرا میں خلوت کے بعد آپ پر وحی نازل ہوئی تو حضرت موسیٰ کے اس واقعہ سے حجت اخذ کرنا بھی غلط ہے کہ یہ شریعتِ محمدی سے نہیں بلکہ شریعتِ موسوی سے ہے جیسے ان کے لئے سبت مشروع کیا گیا جبکہ مسلمانوں کے ہاں اس کا تصور نہیں اور جیسے ان کی شرع میں کئی ایسی اشیاء محرم تھیں جو شرعِ محمدی میں حرام نہیں تو یہ منسوخ شرع کے ساتھ تمسک ہے نیز غارِ حرا میں آپ کے

تحنُّث کے ساتھ احتجاج بھی قبل از نبوت آپ کے فعل کے ساتھ احتجاج ہے (پھر وہ جاری بھی نہ رہا) مشاہدہ بتلاتا ہے کہ جو ان بدعی عبادات کا سالک بنتا ہے اس کے پاس شیاطین کی آمد و رفت ہونے لگتی ہے اور ایسوں کے لئے شیطانی تنزُّل اور شیطانی خطاب حاصل ہوتا ہے ایسے بعض کو شیطان ہوا میں اڑاتا ہے، میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو اس امر کے طالب بنے کہ ان کے لئے بھی اس طرح کا تنزل حاصل ہو جو انبیاء کے لئے حاصل ہوا تو اس غرض سے مختلف النوع ریاضتیں کیں اور نتیجۃً شیاطین ان پر ناز ل ہوئے، اس لئے کہ یہ شریعتِ نبوی سے خارج ہوئے جس کے یہ مامور تھے، فرمایا:

(ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ) [الجاثية : ۱۸] (پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے راستے پر کر دیا تو اسی پر چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا) ان میں سے کثیر خلوت کے لئے کسی مکان یا زمان کو محدود نہیں کرتے بلکہ حکم دیتے ہیں کہ انسان فی الجملہ خلوت اختیار کرے پھر اصحابِ خلوات میں سے کئی لوگ شرعی عبادات کی جنس مثلاً نماز، روزہ، قیام اور ذکر کے ساتھ متمسک ہیں جبکہ اکثر غیر مشروع اجناس کی طرف نکل جاتے ہیں تو اسی سے ابو حامد اور ان کے اتباع کا طریقہ، یہ صاحبِ خلوت کو حکم دیتے ہیں کہ فرض پر اضافہ نہ کرے (یعنی صرف فرض ادا کرے) نہ تلاوت کرے اور نہ احادیث کا مطالعہ کرے اور نہ کچھ اور کرے بلکہ کبھی اسے ذکر کا حکم دیتے ہیں پھر کبھی اس سے وہ بات کہتے ہیں جو ابو حامد کہا کرتے تھے کہ عوام کا ذکر تو (لا الہ الا اللہ) ہے جبکہ خواص کا ذکر فقط (اللہ اللہ) ہے اور خاص الخواص کا ذکر (ھو، ھو) ہے (بلکہ: ۂ ۔ ۂ) مظہراً یا مضمراً اسمِ مفرد کے ساتھ ذکر شرع میں بدعت اور قول ولغت کے لحاظ سے خطا ہے کہ اسمِ مجرد تو کلام ہی نہیں ہے، نہ ایماناً اور نہ کفراً

صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا قرآن کے بعد افضل کلام۔ اور یہ قرآن ہی میں ہے۔: (سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ) ہے ایک حدیث میں ہے: افضل ترین ذکر: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) ہے ایک حدیث میں ہے کہ سب سے افضل جو میں نے اور مجھ سے قبل کے انبیاء نے کہا یہ ہے: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) ان کلمات کی فضیلت میں صحیح وکثیر احادیث ہیں، جہاں تک اسمِ مفرد کے ساتھ ذکر تو یہ بدعت ہے مشروع نہیں پھر یہ کوئی قابلِ فہم کلام بھی نہیں اور نہ اس میں ایمان ہے اسی لئے بعض متاخرین جو اس کا حکم دیتے تھے یہ وضاحت کرتے پائے گئے کہ ہمارا قصد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ دل کو ایک معین شئ پر جمع کریں (ارتکاز) تاکہ نفس اس کے لئے تیار ہو جو اس پر وارد ہوگا (یعنی قلبی واردات کے لئے) تو وہ اپنے مرید کو حکم دیتے تھے کہ اس اسمِ مفرد کو کئی مرتبہ کہے جب اس کا دل مجتمع ہو جائے (یعنی پورے طور متوجہ) تو اس پر شیطانی حال کا القاء ہو جاتا اور اسے خیال ہوتا کہ وہ ملاِ اعلیٰ میں ہو چکا ہے اور اسے وہ کچھ عطا کر دیا گیا ہے جو (نعوذ باللہ) شبِ معراج میں حضور کو بھی عطا نہ ہوا تھا اور نہ حضرت موسیٰ کو یومِ طور میں تو اس قسم کا حال ہمارے بعض ہمعصروں کے لئے واقع ہوا ہے

اس سے بھی ابلغ جو کہتے ہیں کہ ہمارا مقصود تو بس نفس کو کسی بھی شیٔ کے ساتھ جمع کرنا ہے اور اس ضمن میں (یَـا حَیُّ) اور مثلا (یَـا جَحْشُ) کہنے میں فرق نہیں، یہ بات ایک شخص نے خود مجھ سے کہی اور میں نے اس کا انکار اور رد کیا تھا، اس کے ساتھ ان کا مقصود یہ ہے کہ نفس مجتمع ہوحتی کہ شیطان اس پر متنزل ہو، ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ جب قصد ہو اور قاصد اور مقصود بھی تو ان سب کو ایک کر دو! تو یوں اول الامر ہی میں مرید کو وحدت الوجود میں داخل کر دیتے ہیں، اور جو ابو حامد اور ان کے امثال ہیں جو اس طریقہ کے آمر ہیں تو انہیں یہ گمان نہ تھا کہ یہ کفر کی طرف لے جا سکتا ہے لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ **بدعت کفر کی ڈاک ہے**، وہ مریدین کو حکم دیتے ہیں کہ اپنے دل کو ہر شیٔ سے فارغ کر لیں اور اس غرض سے مختلف طریقے اختیار کرواتے ہیں مثلا کسی تاریک جگہ سر ڈھانپ کر بیٹھ جانے کو کہتے ہیں اور (اللہ۔اللہ) کہتا رہے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس طریقہ سے اس کا دل ہمہ تن فارغ ہو جائے گا پھر مستعد اور تیار ہوگا تو مطلوبہ معرفت اس پر نازل ہوگی بلکہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے اسی کی جنس سے حاصل ہوسکتا ہے جو انبیاء کے لئے ہوا، ان میں سے بعض کا زعم ہے کہ انبیاء سے بھی (استغفراللہ) بڑھ کر ان پر عطا ہوسکتی ہے، ابو حامد غزالی نے احیاء علوم الدین وغیرہ میں اس طریقہ کی بہت مدح سرائی کی ہے جیسا کہ وہ زہد کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہیں اور یہ ان پر فلسفہ کے بچے کھچے اثرات میں سے ہے تو فلاسفہ مثلا ابن سینا اور اس کے امثال کا زعم ہے کہ انبیاء اور غیرِ انبیاء کے لئے جو بھی ان کے قلوب میں علم کی تحصیل ہوتی ہے وہ دراصل عقلِ فعال سے ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں نبوت اکتسابی ہے تو جب کوئی متفرِغ ہو تو اس کا دل صافی ہو جائے گا اور پھر اس پر اس کی جنس سے فیض ہوگا جو انبیاء کرام پر ہوا، ان کے نزدیک حضرت موسیٰ بن عمران سے (سَـمَـاءِ عَقْلِهٖ) (ان کی عقل کے آسمان) سے کلام کی گئی ہے، خارج سے انہوں نے کوئی آواز وکلام نہ سنی تھی اسی لیے ان کا اعتقاد ہے کہ یہ یا اس سے بھی اعظم حال ان کے لئے بھی واقع ہوسکتا ہے، ابو حامد کہا کرتے تھے کہ انہوں نے بھی اس طرح کا خطاب سنا ہے جیسا حضرت موسیٰ نے سنا تھا اگرچہ وہ مقصود بالخطاب نہ تھے اور یہ سب رسل کے ساتھ ان کے نقصِ ایمان کی وجہ سے ہے اور یہ رسل کی بعض تعلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا، یہ بات جو انہوں نے کہی کئی وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ یہ جسے عقلِ فعال کا نام دیتے ہیں باطل ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں جیسا اس پر ایک جگہ بسط سے بحث کی ہے

۲۔ اللہ تعالی دلوں پر جو القاء کرتا ہے، وہ کبھی فرشتوں کے واسطہ سے کرتا ہے، اگر یہ حق ہو اور اگر کوئی باطل کلام وسوچ ہو تو اس کا القاء شیاطین کے واسطہ سے ہوتا ہے، فرشتے اور شیاطین ذی حیات اور ناطق مخلوق ہیں جیسا کہ انبیاء کی جہت سے، اس کے حق میں کثیر دلائل ہیں اور جیسا کہ اہلِ حقائق میں اس کے مباشر کئی حضرات اس کا ادعاء کرتے ہیں جبکہ ان کا زعم ہے کہ فرشتے اور شیاطین دراصل نفسِ انسانی کے لئے فقط صفات ہیں، یہ نظریہ عظیم گمراہی ہے

۳۔ انبیاء کے پاس فرشتے ان کے رب کی وحی لے کر آئے، کئی سے اللہ نے بذاتِ خود کلام کی، انہیں اپنے قریب کیا اور ندا دی

جیسے حضرت موسیٰ تو یہ جوان کے لئے حاصل ہوا مجرد فیض نہ تھا جیسا کہ ان حضرات کا زعم ہے

۴۔انسان کا دل جب تمام سوچوں سے فارغ اور خالی ہوتو یہ کیسے معلوم ہو کہ اب اس میں جو واقع وحاصل ہو رہا ہے وہ حق ہے، یہ بات یا تو ازروئے عقل یا ازروئے سمع ہی معلوم ہوسکتی ہے جبکہ امرِ واقع یہ ہے کہ ان دونوں جہت سے اس پر کوئی دلالت نہیں ہے

۵۔ سمع وعقل کی رو سے تو یہ بات معلوم ہے کہ دل اگر ہر شئ سے خالی ہوتو وہاں شیاطین اپنا ڈیرہ بنا لیتے ہیں پھر ان کا تنزل شروع ہوتا ہے جیسے کاہنوں پر وہ نازل ہوتے تھے، شیطان کے لئے ابن آدم کے دل میں دخول سے مانع اللہ کا وہ ذکر ہے جس کے ساتھ انبیاء مبعوث ہوئے (یعنی مشروع ذکر) اس سے اگر خالی ہو جائے تو پھر تو شیطان ہی اس کا متولی ہے جیسے کہا:

(وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ‎ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ) [الزخرف : ۳۶۔ ۳۷] (اور جو کوئی اللہ کی یاد سے آنکھیں بند کر لے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔اور یہ ان کو راستے سے روکتے رہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ سیدھے راستے پر ہیں) قرآن نے خبر دی کہ شیطان نے (اللہ تعالیٰ کو چیلنج کرتے ہوئے) کہا تھا:

(فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ‎ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ) [ص : ۸۲۔۸۳] (مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوائے ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں) اس پر اللہ نے فرمایا تھا:

(اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ)[الحجر: ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں ہاں بُری راہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑے) مخلصین وہ ہیں جو اس کی وحدہ عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی شئ کو شریک نہیں بناتے ،اللہ کی عبادت کے طریقے وہی اختیار کرنا ہوں گے جو اس کے رسل نے مسنون ومشروع کئے اور جو ایسا نہ کرے شیاطین اس کے متولی اور قرین بن جائیں گے، یہ ایسا باب ہے جس میں سالکین پر امرِ عظیم داخل ہوا اور ان پر رحمانی احوال اور شیطانی احوال باہم گڈ مڈ ہو گئے اور ان کے لئے اس کی جنس سے حاصل ہوا جو کاہنوں اور جادوگروں کے لئے حاصل ہوتا ہے اور وہ اسے اللہ کے متقی اولیاء کی کرامات خیال کرتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ اس نکتہ پر بسیط بحث کی ہے

۶۔اگر یہ طریقہ حق بھی ہے تو یہ اس کے حق میں جس کے پاس رسول نہیں آئے لیکن جس کی طرف رسول آئے اور انہوں نے ایک طریق پر سلوک کا حکم دیا تو اب جو اسے چھوڑ کر کوئی اور طریق اختیار کرے اور اس کا سالک بنے وہ گمراہ ہے، خاتم الرسل نے اپنی امت کو شرعی عبادات نماز، ذکر، دعا اور قراءت وغیرہ کا حکم دیا ہے مگر یہ حکم کبھی نہ دیا کہ دل کی ہر سوچ سے تفریغ کریں اور پھر انتظار کریں کہ اس میں کس شئ کا القاء ہوتا ہے، اگر بالفرض یہ طریقہ بعض انبیاء کا ہے بھی تو اب شرعِ محمدی کے ساتھ تمام سابقہ شریعتیں منسوخ ہو چکیں اور یہ تو ہے ہی طریقہِ جاہلیہ جو مطلوب تک وصول کا موجب نہیں مگر بطریقِ اتفاق، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی نافع الہام

ڈال دے اور یہ جو ہر ایک کے لئے حاصل ہوتا ہے وہ اس طریق کے لوازم سے نہیں، لیکن جو تفریغ وتخلیہ رسول علیہ السلام لے کر آئے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو ہر اس شئ سے خالی کرے جو اللہ کو پسند نہیں اور اس شئ سے اسے بھر دے جو اللہ کو پسند ہے تو غیر اللہ کی عبادت سے اسے مفرّغ کرے اور اللہ کی عبادت سے اسے بھرے! غیر اللہ کی محبت، خوف، توکل اور رجاء سے خالی کرے اور اللہ کی محبت، خوف، توکل اور رجاء سے اسے بھر دے اور یہ وہ اسلام ہے جو اس ایمان کو متضمن ہے قرآن جسے بڑھاتا اور قوی کرتا ہے نہ کہ اس کے مناقض اور منافی ہے جیسے جندب اور ابن عمر نے کہا ہم نے ایمان کا تعلم کیا پھر قرآن کا کیا تو ایمان میں بڑھ گئے

جہاں تک مجرد شرعی ذکر پر اقتصار مثلا (لا الہ الا اللہ) تو اس کے ساتھ کبھی انسان منتفع ہوسکتا ہے لیکن دیگر کو چھوڑ کر اکیلا یہ ذکر اللہ کی طرف پہنچانے کا طریق نہیں بلکہ بدنی عبادات میں سے افضل ترین عبادت نماز ہے پھر تلاوت پھر ذکر اور پھر دعاء اور مفضول (عبادت) اپنے مشروع وقت میں فاضل سے افضل ہے مثلا رکوع اور سجود میں تسبیح تو (اب) یہ تلاوت سے افضل ہے اسی طرح نماز کے آخر میں دعاء وہاں تلاوت سے افضل ہے! پھر کبھی مفضول عمل میں انسان پر وہ کچھ مفتوح ہو جاتا ہے جو فاضل عمل میں نہیں ہوتا اور کبھی اس کی اِس پر تیسیر ہوتی ہے اُس کی نہیں تو یہ اس کے حق میں افضل سے اس کے عجز کی وجہ سے افضل ہے جیسے بھوکے شخص کو اگر عام شئ (روکھی سوکھی) روٹی بھی میسر ہو تو وہ اس کی نظر میں غیر میسر پراٹھے سے مرغوب ہے کیونکہ اس وقت اس کے نزدیک اہم ترین امر اپنی بھوک کا مداوا ہے

۷۔ ابو حامد اسے اہلِ چین اور اہلِ روم کی دیوار کی تزیین کی نسبت نقش نگاری سے تشبیہ دیتے ہیں کہ روم والوں نے اپنی دیوار کو نہایت آراستہ کیا تھا جبکہ اہلِ چین نے فقط یہ کیا کہ ان کی دیوار کے بالمقابل شیشے کی دیوار کھڑی کر دی اور روم والوں کی دیوار کے سارے نقوش کا عکس ان کی دیوار میں پڑا، یہ فاسد قیاس ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنے جس دل کو مفرغ کیا ہے اس کے بالمقابل کوئی دل نہیں ہے کہ اس کی آراستگی کا عکس اس پر پڑنے لگے جیسے اِس دیوار کا عکس اُس دیوار پر پڑا بلکہ وہ تو قائل ہیں کہ علم نفسِ فلکیہ میں منقوش ہے اور اسے لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے، یہ بات ابن سینا کی تبع میں کہی! ہم نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ جس لوحِ محفوظ کا ذکر اللہ اور اس کے رسول نے کیا ہے وہ نفسِ فلکیہ نہیں، ابن سینا اور اس کے پیروکاروں نے ان الفاظ واصطلاحات کو لیا جو شرع میں وارد ہوئے تو صاحبِ شرع کی مسمیات کے مخالف مسمیات ان کے لئے وضع کر ڈالیں تو ان سے سن کر جاہل آدمی خیال کرتا ہے کہ ان کا ان کے ساتھ قصد بھی وہی ہے جو صاحبِ شرع کا ہے تو یوں ان حضرات نے فلسفہ کا گودا لیا اور اسے شریعت کا لبادہ پہنا دیا اور جیسے الملک، الملکوت، الجبروت، لوحِ محفوظ، شیطان، حدوث اور قدم ونحو ہا الفاظ، ہم نے اتحادیہ پر رد کی اپنی تحریر میں اس کا ایک حصہ ذکر کیا ہے جب ابن سبعین، ابن عربی، ابو حامد اور دیگر ان ملحد فلاسفہ کے اصول (ورؤساء) نے اپنی تحریرات میں وہ کچھ لکھا جس کے ساتھ یہ اللہ ورسول کی کلام کی اس کے مواضع سے تحریف کرتے ہیں، یہی روش باطنیہ قرامطہ نے اختیار کی تھی

یہاں مقصود یہ ہے اگر قلوب پر علوم کا نزول نفسِ فلکیہ کی جانب سے ہوتا جیسا کہ ان کا زعم ہے تب اس ضمن میں ناظر، مستدل اور دل کو مفرغ کرنے والے کے مابین فرق نہ ہوتا لہٰذا اہلِ چین و روم کے نقش کے ساتھ مثال دینا باطل تمثیل ہے، ان اہلِ خلوات میں سے ایسے بھی ہیں جن کے لئے معین اذکار اور معین غذا ہے اور ان کے لئے معروف تنزُّلات ہیں، ابن عربی طائی اور اس کی راہ کے سالک مثلاً تلمسانی نے اس نکتہ پر مبسوط کلام کی ہے اور یہ شیطانی تنزلات ہیں جن کی مجھے بخوبی معرفت ہے اور میں نے متعدد وجوہ سے ان کی پرکھ کی ہے لیکن یہ ان کے بسط کا مقام نہیں یہاں صرف اس پر اشارہ دینا ہی مقصود تھا، خلوت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اہلِ خلوت کو بھوکے، جاگتے اور خاموش رہنے کا بھی حکم دیتے ہیں بغیر شرعی حدود کے بلکہ مطلق جاگنا، بھوکا رہنا اور چپ رہنا جیسا کہ ابن عربی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا اور یہ ان کے لئے شیطانی احوال کے تولُّد کا باعث بنتا ہے ابو طالب نے اس کے بعض کا تذکرہ کیا ہے البتہ ابو طالب باقی اپنے ساتھیوں سے بڑھ کر کتاب وسنت کے ساتھ اعتصام کرنے والا تھا لیکن وہ کثرت سے ضعیف بلکہ موضوع احادیث ذکر کرتا ہے مسبعات کی احادیث کی جنس سے جو (اس کے بقول) حضرت خضر نے نبی اکرم سے روایت کی ہیں، یہ دعوی کذبِ محض ہے اگرچہ اس میں بجز قراءتِ قرآن کے کچھ نہیں، کئی دفعہ یہ بدعی عبادات کا بھی ذکر کرتا ہے، اس کی جنس سے جو بھوکا رہنے کی فضیلت بارے مبالغہ آمیزی کی، اس نے اور ابو حامد وغیرہما نے، منقول ہے کہ وہ روٹی کو تر لکڑی پر لگاتا تو جب خشک ہوتی تو یوں کھانا کم کیا، اسی طرح رات اور دن کے کئی نوافل کا ذکر کیا اور یہ سب خود ساختہ کذب ہے اسی لئے کبھی اس کے ساتھ کئی فاسد خیالات ذکر کرتے ہیں! بہر حال اس کے بسط کی یہ جگہ نہیں، مقصود دراصل بدعی عبادات کی جنس بارے اشارہ دینا ہے اور یہ بدعی خلوات، چاہے کسی وقت کے ساتھ انہیں مقدر کیا جائے یا نہیں اس وجہ سے جو ان میں بدعی عبادات ہیں یا تو ایسی جن کی جنس تو مشروع ہے مگر یہ مقدر نہیں یا ایسی کہ ان کی جنس ہی غیر مشروع ہے، جہاں تک مشروع خلوت، عزلت اور اکیلے رہنا تو بس وہی جس کا امر وارد ہے یا تو امرِ ایجاب یا امرِ استحباب تو اول مثلاً محرم امور سے اعتزال (الگ رہنا) اور ان سے اجتناب کرنا جیسے کہا:

(وَاِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖ) [الأنعام: ٦٨] (اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بیہودہ بکواس کر رہے ہوں تو اُن سے الگ ہو جاؤ یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں) اسی سے حضرت خلیل بارے اللہ کا یہ ارشاد:

(فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا) [مریم: ۴۹] (اور جب ابراہیم ان لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے ان سے الگ ہو گئے تو ہم نے ان کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور سب کو نبی بنایا) اور اہلِ کہف بارے یہ قول:

(وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡكَهۡفِ) [الكهف: ١٦] (اور جب تم نے ان سے اور جن کی یہ اللہ

کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کرلیا ہے تو اب غار میں چل رہو) تو یہ کسی ایسی جگہ نہ تھے جہاں جمعہ و جماعت ہوتی تھی (کہ اسے چھوڑ کر غار میں عزلت نشین ہو گئے) اور نہ وہاں ایسے لوگ تھے جو کسی نبی کی شرع کے عامل و آمر ہوں، اسی لئے تو غار میں پناہ گزین ہوئے، حضرت موسیٰ کا قول ذکر کیا:

(وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ) [الدخان : ۲۱] (اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ) جہاں تک فضول مباحات اور غیر نافع امور میں لوگوں سے اعتزال اختیار کرنا اور یہ بوجہ زہد، تو یہ مستحب ہے حضرت طاؤس نے کہا تھا: (نِعْمَ صَوْمَعَۃُ الرَّجُلِ بَیْتُہٗ یَکُفُّ فِیْہِ بَصَرَہٗ وَ سَمْعَہٗ) (یعنی آدمی کا گھر اس کا عمدہ صومعہ۔معبد/کنیسہ۔ ہے کہ اس کی نظر بھی بچی رہتی ہے اور سماعت بھی) جب انسان کسی علم یا عمل کی تحقیق کا ارادہ کرے تو کسی جگہ خلوت گزین ہو جائے لیکن جمعہ و جماعت نہ چھوڑے تو یہ درست ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم سے سوال ہوا افضل انسان کون ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہے جب بھی جہاد کی پکار کان میں پڑے اس کی طرف دوڑ پڑے اور جان کی بازی لگا دے اور ایسا آدمی جو کسی گھاٹی میں معتزل ہے، نماز قائم کرتا ہے اور زکاۃ ادا کرتا ہے اور خیر میں ہی لوگوں سے میل جول رکھتا ہے، تو یہ دلیل ہے کہ اس کے لئے مال ہے جس کی وہ زکاۃ ادا کرتا ہے، گویا یہ لوگوں کے ہمراہ ہی ساکن ہے اذان و جماعت کا اہتمام کرتا ہے، ایک حدیث میں ہے کسی قریہ یا جنگل دیہات میں تین افراد ہوں اور جماعت کا اہتمام نہ کرتے ہوں تو شیطان ان پر چھا جائے گا اور فرمایا جماعت کو لازم پکڑے رہو کہ بھیڑیا اسی بکری پر وار کرتا ہے جو ریوڑ سے جدا اور دور ہوتی ہے۔

فصل

ان **خلوات کے ساتھ ان کے اصحاب** کبھی ان اماکن کا رخ کرتے ہیں جہاں نہ اذان ہے اور نہ اقامت اور نہ مسجد جس میں نمازِ پنجگانہ کی با جماعت ادائیگی کا انتظام ہو یا تو مہجور ومتروک مساجد یا کوئی اور جگہیں مثلاً غار اور ویران ٹیلے وغیرہ اور قبرستان، بالخصوص کسی ایسے آدمی کی قبر جس کے بارہ میں ان کا حسنِ ظن ہے (کہ نیک آدمی تھا) اور ایسی جگہیں جن کی بابت مشہور ہو جائے کہ وہاں کسی نبی یا مردِ صالح کا کوئی اثر ونشان موجود ہے اسی لئے تو ایسی جگہوں میں (جہاں نہ جمعہ ہے اور نہ جماعت) ان کے لئے شیطانی احوال کا حصول ہوتا ہے جنہیں یہ رحمانی کرامات باور کر لیتے ہیں، بعض خیال کرتے ہیں کہ صاحبِ قبر اس کے پاس آیا ہے حالانکہ اسے مرے ہوئے کثیر سال گزر چکے ہوتے ہیں اور کہتا ہے میں فلاں ہوں اور کئی دفعہ کوئی آ کر کہتا ہے ہمیں جب قبر میں مدفون کیا گیا تو ہم نکل آئے جیسے تونسی کے لئے نعمان سلامی کے ساتھ ہوا، شیاطین کثیر اوقات کسی انسان کی صورت میں متمثل ہو کر خواب یا بیداری میں سامنے آ جاتے ہیں اور کبھی ایسے کے پاس جو عارف نہیں تو کہتے ہیں میں فلاں شیخ یا فلاں عالم ہوں، کئی دفعہ کہتے ہیں میں ابو بکر یا عمر ہوں، کئی دفعہ خواب میں نہیں بلکہ عالم بیداری میں آتے ہیں اور کہتے ہیں میں مسیح ہوں، میں موسیٰ پیغمبر ہوں، میں محمد رسول اللہ

ہوں، اس طرح کے واقعات کئی ایسے لوگوں کو پیش آئے ہیں جنہیں میں جانتا ہوں پھر ایسے زاہد اور صاحبِ ورع وتقوع و دین لوگ بھی ہیں جو مانتے ہیں کہ ہاں انبیاء اپنی صورتوں میں بیداری میں آتے ہیں، ان میں سے کئی کا گمان ہے کہ جب وہ کسی نبی کی قبر کے پاس آتے ہیں تو وہ نبی اپنی قبر سے باہر آ کر اس سے بات چیت کرتے ہیں ! کئی نے دعوی کیا کہ انہوں نے حطیم میں حضرت ابراہیم کو چلتے پھرتے دیکھا ہے، بعض نے ظن کیا کہ نبی اکرم روضہ اقدس سے نکلے اور اس کے ساتھ کلام کی، اسے وہ اپنی کرامت شمار کرتے ہیں، ان میں سے بعض کا اعتقاد ہے کہ اس نے صاحبِ قبر سے کوئی سوال کیا جس کا اس نے جواب دیا

کسی نے لکھا ہے کہ ابن مندہ (مشہور محدث) پر جب کسی حدیث کے ضمن میں کوئی اشکال وارد ہوتا تو روضہ نبوی کے پاس آ کر آپ سے اس بارے پوچھتے تو آپ اس اشکال کو حل کر دیتے تھے، اہلِ مغرب میں سے ایک شخص نے بھی ایسا ادعاء کیا اور اسے اپنی کرامت قرار دیا حتی کہ تنگ آ کر ایسے ایک شخص سے ابن عبد البر نے کہا تم پر افسوس ! کیا تم خود کو سابقین اولین مہاجرین وانصار سے افضل خیال کرتے ہو؟ ان میں سے تو کسی نے ایسا ادعاء نہ کیا تھا، صحابہ کے درمیان کئی امور ومسائل میں اختلاف وتنازع ہوا، کیوں نہ نبی اکرم کی قبر شریف پر آ کر آپ سے پوچھ لیا؟ آپ کی بیٹی فاطمہؓ نے آپ کی میراث بارے تنازع کیا تھا تو کیوں نہ آنجناب سے پوچھ لیا ہوتا اور آپ یہ مسئلہ حل کر دیتے ؟

فصل

انبیاء کرام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان احکام وتعلیمات پر ایمان والے بنیں جو وہ لائے اور یہ کہ ہم ان کی اور ان کی ہدایت وروش کی اقتدا کریں، فرمایا:

(قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ)[البقرۃ : ۱۳۶](کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اُتری اس پر اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں اُن پر اور جو اور پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے ملیں اُن پر ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ)[الأنعام : ۹۰] (یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی تو تم انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو) حضرت محمد خاتم النبیین ہیں آپ کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم ہوا اور آپ کی شرع نے سابقہ سب شریعتوں کو منسوخ کر ڈالا اب اللہ تک پہنچنے کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے محمد رسول اللہ کی کامل اتباع تو جن عبادات کا آپ نے حکم دیا ہے۔ امرِ ایجاب یا امرِ استحباب۔ بس وہی مشروع ہیں اور اسی طرح جن باتوں کی آپ نے ترغیب دی اور ان کے ثواب وفضیلت کا ذکر لیا، یہ کہنا

جائز نہیں کہ یہ مستحب ہے یا مشروع ہے مگر کسی شرعی دلیل کے ساتھ ہی اور یہ بھی جائز نہیں کہ کسی امر کو کسی ضعیف حدیث کی رو سے شریعت ثابت کیا جائے! ہاں اگر صحیح شرعی دلیل کی رو سے کسی عمل کا مستحب ہونا ثابت ہو اور اس عمل کے فضائل میں ضعیف اسانید کے ساتھ روایات ہوں تو یہ عمل جائز ہے (کیونکہ اصل عمل تو صحت کے ساتھ ثابت ہے، مراد یہ کہ فضائل میں ضعیف روایات کے مدِنظر اصل عمل کا ترک نہ کر دیا جائے) تو انہیں روایت و بیان کرنا جائز ہے جب تک یہ علم نہ ہو جائے کہ یہ کذب و وضع ہیں

اس لیے کہ ثواب کی مقادیر غیر معلوم ہیں تو جب ثواب کی مقدار میں کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جس کی بابت اس کا کذب ہونا معلوم نہ ہو تو اسے جھٹلانا جائز نہ ہوگا، امام احمد وغیرہ اس طرح کی احادیثِ فضائل کے ذیل میں رخصت دیتے تھے **لیکن اگر ضعیف حدیث کے ساتھ اس بات کے اثبات کی سعی کریں کہ فلاں عمل شرعی اور مستحب ہے** تو حاشا للہ (یعنی اس سے پناہ) جیسا کہ انہوں نے جب جان لیا ہو کہ فلاں روایت کذب و موضوع ہے تو محدثین اس کے روایت و نقل کرنے کو حلال نہ گردانتے تھے، اگر بیان کرتے تو اس کی شناخت کروانے کی غرض سے کہ یہ کذب ہے کیونکہ صحیح حدیث میں آپ کا فرمان ہے کہ جس نے یہ جان کر بھی کہ فلاں حدیث کذب ہے روایت کی تو وہ احد الکاذبین ہے، نبی اکرم نے جو بھی فعل علی وجہ التعبد کیا وہ عبادت ہے، اس میں آپ کی اقتدا اور تاسی واجب ہے تو جب کسی عبادت کے ساتھ زمان یا مکان مخصص کیا تو یہ سنت ہوئی جیسے رمضان کے آخری عشرہ کی اعتکاف اور مقامِ ابراہیم کی اس میں نماز پڑھنے کے ساتھ تخصیص تو آپ نے کے ساتھ تاسی یہ ہے کہ آپ کے فعل کی مثل کرے اس وجہ پر جو آپ نے کیا اس لئے کہ آپ نے کیا اور یہ اس طور ہوگا کہ آپ کے قصد کی مثل قصد کرے تو جب آپ نے حج، عمرہ اور جہاد کے لئے اسفار کئے ہیں تو ہمارا اس غرض سے سفر کرنا آپ کی اتباع ہوگا اسی طرح جب آپ نے حد کی اقامت کے لئے مارا ہو، بخلاف اس کے جو سفر میں تو آپ کا مشارک ہوا مگر اس قصد میں نہیں جو آپ کا تھا یا ضرب میں مشارک ہے مگر اس کا قصد آپ کے قصد کا غیر ہے تو یہ آپ کا متابع نہیں، اگر اتفاقاً آپ جیسا فعل کر لیا مثلاً کہ دورانِ سفر عین اس جگہ پڑاؤ ڈالا یا کسی درخت کی جڑ میں پانی بہایا یا راستہ کی کسی ایک جانب آپ کی سواری چلی تو آیا ان جیسے افعال میں آپ کی متابعت کرنا مستحب ہے؟ ابن عمر پسند کرتے تھے کہ آپ جیسے یہ افعال کریں! جہاں تک خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ تو انہوں نے ایسی کاوش نہ کی، اس لئے کہ یہ متابعت نہیں کیونکہ متابعت میں قصد کا ہونا ضروری امر ہے تو جب آپ نے یہ افعال قصداً نہ کئے تھے بلکہ اتفاقاً اس کا حصول ہوا ہے تو وہ اپنے قصد میں آپ کا متابع شمار نہ ہوگا، ابن عمر کہا کرتے تھے اگرچہ آپؐ نے ان کا قصد نہ کیا لیکن بہر حال آپ کے جیسے فعل کا اختیار کرنا حسن ہے، جس بھی وجہ پر تھا لیکن مجھے پسند ہے کہ آپ کے جیسا کروں اور یہ یا تو آپ سے شدتِ محبت کے جذبہ کی رو سے اور یا آپ سے مشابہت کی برکت کے حصول کی غرض سے

اسی باب سے فطرانہ میں کھجور کا اخراج اس کے لئے جس کی یہ غذا نہیں، احمد نے اس کے مثل پر ابن عمر کی موافقت کی

ہے اور ابن عمر کی طرح وہ بھی اس طرح کے امور میں ترخیص دیتے تھے، اسی طرح احمد نے ابن عمر کی اتباع میں منبر نبوی پر آپ کے بیٹھنے کی جگہ کے ساتھ تمسُّح (یعنی چھونے) کی رخصت دی، تمسح بالمنبر کے ضمن میں احمد سے دوقول منقول ہیں اشہر یہ کہ مکروہ ہے، جیسے جمہور کا یہ قول ہے، مالک وغیرہ کئی علماء ان امور کو مکروہ قرار دیتے تھے اگر چہ ابن عمر کا فعل ان کے قول کے برعکس تھا مگر اکابر صحابہ ازقسم ابوبکر، عمر اور عثمان وغیرہم نے ایسا نہیں کیا حضرت عمر سے بسندِ صحیح ثابت ہے کہ ایک سفر میں تھے کہ دیکھا لوگ قطار بنا کر باری باری ایک جگہ آتے ہیں اور وہاں نفل پڑھتے ہیں، پوچھا یہ کیا ہے؟ بتلایا گیا کہ اس جگہ نبی اکرم نے نماز پڑھی تھی، کہنے لگے کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے انبیاء کے آثار (مقدسہ) کو مساجد بنا لو؟ تم سے پہلے کی امم اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں، جسے جہاں نماز کا وقت آئے وہ وہیں پڑھ لے وگرنہ چلتا رہے! بہر حال اہلِ علم کے لئے علی غیر وجہ القصد آنجناب کے فعلِ مباحات بارے دو اقوال ہیں کہ آیا ان میں آپ کی متابعت کرنا فقط مباح ہے یا مستحب ہے؟ احمد وغیرہ کے مذہب میں بھی اس ذیل میں دو اقوال ہیں جیسا کہ ایک جگہ اس کی تفصیل دی ہے، ابن عمر اور دیگر صحابہ خاص طور سے ان اماکن کا قصد نہ کیا کرتے تھے جن میں نبی اکرم اترے یا وہاں رات گزار دی مثلا ازواجِ مطہرات کے بیوت اور دورانِ غزوات آپ کی منازل، یہ کلام تو فقط صورتِ فعل میں آپ سے مشابہت کے بارہ میں ہو رہی ہے (یعنی ابن عمر وغیرہ قصدِ تعبد کر کے مدینہ سے ان مقامات کی زیارت کو نہ جایا کرتے تھے بلکہ اگر اتفاقاً انہی راستوں کے راہی ہوتے مثلاً حج وعمرہ کے لیے مکہ جاتے ہوئے تو نبی اکرم کے پڑاوَ ڈالنے کی جگہیں آنے پر آپ کی یاد کو تازہ کرنے کی خاطر۔ نہ کہ اسے سنت وعبادت سمجھتے ہوئے۔ کوشش کرتے کہ عین اسی جگہ اتریں یا نماز پڑیں جہاں نبی اکرم نے نماز پڑھی اور یہ ان کی آپ سے شدتِ محبت وعقیدت کا ایک اظہار تھا، یہ بھی منقول ہے کہ ایک دفعہ پیشاب کرنے کا انداز بنا کر بیٹھے مگر پیشاب کیا نہیں، پوچھنے پر بتلایا کہ مجھے یاد ہے اس جگہ سرورِ کائنات پیشاب کرنے بیٹھے تھے تو یہ ان کی محبت کا انداز تھا، وہ اسے مستحب یا سنت نہ سمجھتے تھے) انہوں نے بقصدِ تعبد ان اماکن کا رخ نہیں کیا، صحابہ متفق ہیں کہ انہی اماکن کی تعظیم کی جائے گی جن کی شارع نے تعظیم کی ہے (اور انہیں شعائر اللہ قرار دیا ہے)۔

فصل

بدعی عبادات کرنے والوں کے لئے شیطان ان عبادات کو مزین کر دیتا ہے (کہ انہیں یہ اچھی لگتی اور نہ کرنے والے گستاخ لگتے ہیں) اور ان کی نظروں میں شرعی سبل مبغوض کر ڈالتا ہے حتی کہ (ان کے مقابلہ میں) انہیں قرآن وحدیث (کی نص بھی اگر پیش کی جائے تو اس) کو مبغوض باور کرتے ہیں تو اس موقع پر یہ قرآن وحدیث سننا اور اس کا ذکر پسند نہیں کرتے، نہ کتاب اور صاحبِ کتاب انہیں اچھا لگتا ہے (بلکہ اسے وہابی قرار دے کر رد کر دیتے ہیں) جیسے نصر باذی نے اہلِ بدعت بارے نقل کیا کہ ان کے ہاں یہ مقولہ مشہور ہوا: (یَدَعُ عِلْمَ الْخِرَقِ وَیَأْخُذُ عِلْمَ الْوَرَقِ) (یعنی خرقہ پوشی۔ درویشی۔ کا

علم چھوڑ کر ورق ۔ کتاب ۔ کے علم کے پیچھے پڑا ہوا ہے) کہتے ہیں میں اپنی الواح (یعنی تختیاں اور کاپیاں) ان سے چھپاتا تھا تو جب میں بڑا ہوا تو وہ میرے علم کے محتاج ہوئے ،اسی طرح سری سقطی نے نقل کیا کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا جب وہاں دوات وقلم دیکھی تو بیٹھنے کی بجائے نکل گیا اسی لئے سہل بن عبداللہ تستری نے کہا تھا: اے صوفیہ کی جماعت تم بیاض (مراد کاغذ) پر سواد (یعنی روشنائی/ سیاہی[یعنی کتاب وقلم]) سے مفارقت نہ کرو، کسی نے اس سے مفارقت نہیں کی مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زندیق بن گیا، جنید کا قول ہے ہم نے یہ علم مبنی بر کتاب وسنت ہی جانا ہے تو جس نے قرآن نہ پڑھا اور حدیث نہ لکھی اس میدان میں اسے مقتدا نہ مانا جائے گا،ان کے کثیر ان لوگوں سے نفور کرتے ہیں جو شرع یا قرآن کا تذکرہ کریں یا اس کے پاس کتاب ہو یا وہ (احادیث ومسائل کی) کتابت کرتا ہو اور یہ اس لئے کہ انہیں پتہ ہے کہ اس جنس میں ان کی طریقت کی مخالفت ہے تو ان کے شیاطین انہیں اس سے بھگاتے ہیں جیسے یہودی اور عیسائی اپنے لڑکوں کو مسلمانوں کے ہاں آنے جانے اور ان کی باتیں سننے سے روکتے ہیں کہ مبادا ان کا اپنے دین بارے اعتقاد بدل جائے اور جیسے قرآن میں مذکور ہوا کہ حضرت نوحؑ کی قوم والے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور چہرے چھپا لیتے تھے تا کہ حضرت نوح کی باتیں نہ سنیں اور نہ ان کی شکل دیکھیں، اللہ تعالی نے مشرکین بارے کہا:

(وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ) [حم فصلت : ۲۶] (اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو اور شور مچا دیا کرو تا کہ تم غالب رہو) اور:

(فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْکِرَةِ مُعْرِضِیْنَ کَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ) [المدثر: ۴۹۔ ۵۱] (انہیں کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں ۔ گویا گدھے ہیں بدکے جا رہے ۔ تیرانداز سے ڈر کر بھاگے ہیں) اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کو بدعی سماع معازف (یعنی موسیقی کے آلات) کا سماع سننے کا از حد شوق ہے، اتنی رغبت سے اس کی محافل میں شرکت کرتے ہیں کہ اس کا عشر عشیر بھی شرعی سماع، اللہ کی آیات (اور نبی اکرم کی احادیث) کے سماع کو اہمیت نہیں دیتے ،اس امر نے بھی انہیں بدکایا ہے کہ انہوں نے کثیر علم وکتاب کے ساتھ اشتغال کرنے والوں کو پایا کہ وہ اللہ کی عبادت اور اس کی راہ کے سالک بننے میں اعراض کرتے اور سستی کا شکار بنے ہیں، یا تو دنیا داری میں پڑ کر یا معاصی کے ساتھ مشغول ہو کر یا پھر بوجہِ جہل اور اس امر کی تکذیب کرتے ہوئے جو اہلِ تألّہ وعبادت کے لئے حاصل ہوتا ہے، تو ان لوگوں کا وجود انہیں علم کے میدان سے متنفر کرنے کا سبب بنا ہے اور فریقین کے درمیان ایک نوع کا تباغض پیدا ہوا جو بعض وجوہ سے اس نفرت اور تباغض سے مشابہ ہے جو اہلِ ملتین (یعنی یہود اور نصاریٰ) کے مابین ہے، یہ ان کے بارہ میں کہتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی شئ نہیں اور وہ ان کے بارہ میں یہی کہتے ہیں (اس بات کو قرآن نے یوں ذکر کیا: وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ

الْیَھُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ [البقرة : ۱۱۳])ان کا خیال ہے کہ اپنی طریقت کے ذریعہ جو کچھ یہ حاصل کر لیتے ہیں وہ اس سے اعظم ہے جو کتب میں حاصل ہوتا ہے (جیسے بلھے شاہ نے کہا: علموں بس کریں او یارا کو الف تینوں درکار) تو ان میں سے کئی کا ظن ہے کہ اسے بلا تلقین (یعنی بلا کسی کے پڑھائے) قرآن ملقّن ہوتا ہے، بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کے لئے یہ حاصل ہوا اور یہ کذب ہے (اس جیسی خود ساختہ کرامات میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہمیشہ یہ سنیں گے کہ ایک شخص کے ساتھ یہ ہوا، فلاں جگہ یہ ہوا، کبھی نہ کہیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ مبادا کوئی امتحان لے لے) ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی ساعتوں میں اللہ کی آیات پڑھیں تو جب اس کا نفس صافی ہوا تو یہ اسے یاد آ گئیں تو ان کی تلاوت کی، کیونکہ ریاضت نفس کو صیقل کر دیتی ہے تو ایسی اشیاء بھی یاد آ جاتی ہیں جنہیں بھول چکا تھا، ان کے بعض کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں (یعنی اہلِ سنت والجماعت) نے اپنا علم نسل درنسل مُردوں سے اخذ کیا جبکہ ہم نے اپنا علم اس زندہ سے اخذ کیا جو کبھی نہیں مرے گا، یہ ہو جاتا ہے (جسے علمِ لدُنّی کہا جاتا ہے مگر سارا علمِ دین اس طرح سے حاصل نہیں ہوتا، یہ تو ایک آدھ شعبہ علم جیسے خوابوں کی تعبیر کا ملکہ حاصل ہو جانا یا کسی آیت کا کوئی مفہوم ذہن میں القاء کیا جانا) لیکن ان میں سے بعض خیال کرتے ہیں کہ اس کی طرف خطاب سے القاء کیا جاتا ہے یا خاطر کے ذریعہ جو بلا واسطہ منجانب اللہ ہے، یہ شیطان کی طرف سے ہونا ممکن ہے اور ان کے پاس کوئی ایسی فرقان نہیں جو رحمانی اور شیطانی القاء کے مابین تفرقہ اور پرکھ کرے تو یہ فارق قرآن اور سنت ہی ہے، تو جو ان کے موافق ہوا وہ حق اور رحمانی اور جو ان کے مخالف ہے وہ خطا اور شیطانی ہے، فرمایا:

(وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ) [الزخرف : ۳۶] (اور جو کوئی اللہ کی یاد سے آنکھیں بند کر لے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے) اور رحمان کا ذکر وہ جو اس نے اپنے رسول پر نازل کیا، فرمایا:

(وَهٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ) [الأنعام : ۱۵۵] (اور یہ کتاب بھی ہم نے ہی اتاری ہے، برکت والی)

(وَمَا هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ) [القلم : ۵۲] (اور یہ اہلِ عالم کے لئے نصیحت ہے)

(فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی) إلى قوله : (قَالَ کَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَکَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی) [طٰه : ۱۲۳-۱۲۶] (پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔۔۔ اللہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج تجھے بھلا دیا جائے گا) اور کہا:

(اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا) [الإسراء : ۹-۱۰] (یہ قرآن وہ رستہ دکھاتا ہے جو سب سے

سیدھا ہے اور مومنوں کو، جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ اُن کیلئے بڑا اجر ہے۔اور یہ بھی کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے)

(وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ)[الشوریٰ : ۵۲۔۵۳] (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نُور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔اللہ کا رستہ جو آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کا مالک ہے اور اللہ کی طرف تمام امور کا پھرنا ہے)

(كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ)[إبراهيم : ۱] (ایک کتاب،اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ،ان کے رب کے حکم سے غالب اور قابلِ تعریف راستے کی طرف)

(فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ)[الأعراف: ۱۵۷](تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جو نُور ان کیساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہی فلاح پانے والے ہیں) پھر ان حضرات نے جب ظن کیا کہ یہ اللہ سے ان کے لئے بلا واسطہ حاصل ہوتا ہے تو یہ خود اپنی نظر میں اتباعِ رسول سے بھی بڑھ کر اہم اور اعظم ہو گئے، ان کا ایک کہتا ہے فلاں کی عطا حضرت محمد کے ہاتھ سے ہے جبکہ میری عطا اللہ سے بلا واسطہ ہے، یہ بھی کہتے ہیں: فلاں کتاب سے اخذ کرتا ہے جبکہ یہ شیخ اللہ سے اخذ کرتے ہیں اور دیگر اس قسم کی باتیں

قائل کا یہ کہنا کہ اللہ سے اخذ کرتا ہے یا اللہ نے مجھے عطا کیا مجمل لفظ ہے! تو اگر اس سے ان کی مراد اعطاء اور اخذِ عام ہے اور یہ کونی خلقی،یعنی اللہ کی مشیت اور قدرت کے ساتھ یہ مجھے حاصل ہوا، تب تو یہ حق ہے مگر اس میں تو سب لوگ اس کے مشارک ہیں اور یہ جس نے کتاب سے اخذ کیا ہے یہ بھی اس اعتبار سے اللہ ہی سے اخذ کیا ہے اور کفار و مشرکین بھی جو کچھ اخذ کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے کرتے ہیں،لیکن اگر مراد یہ ہو کہ یہ جو اس کے لئے حاصل ہوا وہ ان امور میں سے ہے جو اللہ کو پسند اور اس کے ہاں مرضیّ ہیں اور یہ اپنی طرف تقریب ہے اور یہ خطاب جس کا اس کے دل میں القاء ہوا ہے اللہ کی کلام ہے تو یہاں دو طرق ہیں: ایک کہ اس سے کہا جائے تمہیں کہاں سے پتہ چلا کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے شیطان کی جانب سے نہیں؟ کہ اس کا القاء اور وسوسہ ہو کیونکہ جیسا کہ اللہ نے قرآن میں خبر دی کہ شیاطین اپنے اولیاء (یعنی دوستوں) کی طرف القاء اور انزال کرتے ہیں اور مشرکین

کے عباد واہل کتاب میں اور کاہنوں اور جادوگروں ونحوہم میں اس کے کثیر شواہد ہیں، اسی طرح اہلِ بدعت میں ان کی بدعت کے بحسب تو یہ احوال کبھی شیطانی اور کبھی رحمانی ہو سکتے ہیں اور ان کے مابین فرقان وہ ہے جس کے ساتھ اللہ نے حضرت محمدؐ کو مبعوث کیا چنانچہ کہا:

(تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا) [الفرقان : ۱] (وہ بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تا کہ اہلِ جہان کو ڈرانے والا ہو) اسی کے ساتھ اللہ نے حق و باطل، ہدایت وضلال، رشاد وغیّ، طریقِ جنت اور طریقِ جہنم اور اولیائے رحمان اور اولیائے شیطان کے مابین تفرقہ کیا ہے جیسا کہ ایک جگہ تفصیل سے اس پر بات کی ہے، یہاں مقصود یہ ہے کہ ان سے کہا جائے جب ان احوال کی جنس اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان مشترک ہے تو کوئی ایسی دلیل ہونا ضروری ہے جو واضح کرے کہ جو تم لوگوں کو حاصل ہوا ہے وہ حق ہے! دوسرا طریق یہ ہے کہ کہا جائے بلکہ یہ شیطان سے ہے اس لئے کہ یہ اس کے مخالف ہے جس کے ساتھ حضرت محمد مبعوث کئے گئے جس کے حصول کا یہ دعوی کرتا ہے اس میں دیکھا جائے گا اور اس کے سبب میں اور اس کی غایت میں بھی، تو اگر سبب غیر شرعی عبادت ہے مثلاً کہ اسے کہا جائے: اس صنم کو سجدہ کرو تا کہ تمہاری مراد کی تحصیل ہو یا اس صاحبِ صورت کے ساتھ استشفاع کرو یا اس مخلوق کو پکارو، مثلاً کوئی ستارہ، یا استغاثہ کرو یا کسی فرشتہ یا نبی یا شیخ (پیر) سے دعا کرو جس طرح خالق سے دعا کی جاتی ہے، دعائے عبادت یا دعائے سوال وطلب تو وہ اگر یہ بات مانے تو مشرک ہو جائے گا تب اس وسیلہ وسبب سے جو کچھ حاصل ہوا وہ شرک کے ذریعہ سے حاصل ہوا جیسے مشرکین کے لئے حاصل ہوتا ہے، کئی دفعہ ایسے لوگوں کو شیاطین (کسی نہ کسی شکل میں، عموماً کسی بزرگ کی شکل میں) نظر آتے ہیں، کبھی کسی صنم کے اندر سے انہیں مخاطب کرتے ہیں اور بعض امورِ غائبہ کی انہیں خبریں دیتے ہیں یا ان کی بعض حاجات پوری کرتے ہیں تو یہ جو تھوڑا نفع اور فائدہ انہیں پہنچایا اور بدلہ میں ان سے ان کی توحید اور ایمان کو سلب کر ڈالا تو یہ ان کے لئے خسارے کا سودا اور باعثِ ہلاکت ہے جیسے ساحروں بارے قرآن نے کہا:

(وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ) [البقرة : ۱۰۲] (اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش ہیں تم کفر میں نہ پڑو غرض لوگ ان سے وہ سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسا سیکھتے جو اُن کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں کا خریدار ہوگا اُس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بُری تھی کاش وہ جانتے) اسی طرح کبھی اس کا سبب معازف کا سماع ہوسکتا ہے اور

یہ جیسا کہ حضرت عثمان غنی سے منقول ہے کہ کہا شراب سے بچو کہ یہ ام الخبائث ہے، ایک آدمی نے ایک خاتون سے (قرب کا) سوال کیا، اس نے کہا میں نہ کروں گی حتی کہ تم اس بت کو سجدہ کرو، وہ بولا شرک تو میں نہ کروں گا، اس نے کہا یا پھر تم اس لڑکے کو قتل کرو، اس نے کہا یہ خونِ ناحق تو مجھ سے نہ ہوگا، اس نے کہا پھر یہ شراب کا جام پی لو، اس نے کہا ہاں یہ ہلکا ہے تو جب شراب پی لی (تو اس کے نشہ میں دھت ہو کر) لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور عورت سے بھی زنا کر لیا، معازف نفوس کی شراب ہے (نہ کہ روح کی غذا) اس کا نفوس کے ساتھ فعل اس فعل سے اعظم ہے جو بھرے ہوئے جام کرتے ہیں تو جب اصوات کے ساتھ یہ لوگ عالَمِ مدہوشی میں ہو جاتے ہیں (جھومتے ہیں) تو ان میں شرک اتر آتا ہے اور فواحش اور ظلم کی طرف یہ مائل ہو جاتے ہیں اور پھر ہر نوع کی برائی اور منکر کے صدور کی ان سے توقع کی جا سکتی ہے

یہ تین خباثتیں سماعِ معازف (یعنی بدعتی سماع) کرنے والوں میں بکثرت موجود ہیں، جہاں تک شرک تو ان پر غالب ہوا ہے کہ اپنے شیخ یا اس کے غیر سے اتنی محبت کریں جتنی اللہ سے کرتے ہیں اور اس کی محبت پر وجد میں آئیں! جہاں تک فواحش تو گانا زنا کا رُقیہ (یعنی دَم) ہے اور یہ فواحش کے وقوع کے اعظم اسباب سے ہے آدمی، لڑکا اور عورت غایتِ عفت وحریت میں ہوتے ہیں حتی کہ محفلِ سماع وغناء میں حاضر ہوں تو یہاں آ کر ان کے نفوس منحل ہو جاتے اور بے حیائی ان پر سہل ہو جاتی ہے اور فاعل یا مفعول یا دونوں بننے کی طرف میلان ہوتا ہے (یعنی سفلی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں) جیسا کہ شرابیوں کے سفلی جذبات بھڑکتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ اور جہاں تک قتل تو کثیر واقعات ہوئے اور ہوتے ہیں کہ سماع کی ان محافل میں لوگ بے خود ہو کر قتل کر بیٹھتے ہیں، ان کے ہاں ایک مقولہ مشہور ہے کہ اپنے حال (کی قوت) سے اس کا قتل کر ڈالا، اسے یہ صاحبِ حال کی قوت شمار کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ شیاطین ان محافل میں ان کے ہمراہ ہوتے ہیں جو انہیں الٹے کاموں پر انگیخت کرتے ہیں تو جس کی شیطنت اقوی اور عروج پر ہو جائے وہ اس طرح کے فعل کا مرتکب ہو جاتا ہے جیسے شرابیوں کی محفلوں میں کئی دفعہ (نشہ میں دھت ہو کر) اس طرح کا غل غپاڑہ ہو جاتا ہے، لازم نہیں کہ کوئی شخص ہی اس کے ہاتھوں قتل ہو بلکہ کئی دفعہ گھوڑا یا کوئی اور جانور قتل کر دیتے ہیں پھر جس کا وہ گھوڑا تھا وہ اپنے شیخ کے سامنے استغاثہ کرتا ہے اور جوشِ انتقام میں اسے اور اس کے ہمراہیوں کو بھی قتل کر ڈالتا ہے، ایسے واقعات ہمارے سامنے آئے ہیں کہ دس دس بندے قتل کر دئے گئے اور جہال اسے بھی کرامات کے باب سے باور کرتے ہیں (جیسے حالیہ ایام مارچ ۲۰۱۷ میں سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں میں ہوا کہ ایک مزار کے مجاور نے بیس مریدوں کو یکے بعد دیگرے بلا کر پہلے کوئی مشروب پلا کر دھت کیا اور پھر ڈنڈے مار مار کر قتل کر دیا اور جب پولیس نے پکڑا تو کہتا رہا میں انہیں زندہ کر سکتا ہوں)

ان شیطانی احوال اور خبیثانہ واقعات سے بعض عبرت بھی پکڑتے اور بصیرت حاصل کرتے ہیں اور اللہ انہیں راہِ ہدایت پر لے آتا ہے اور ان کی آنکھوں پر پڑا پردہ ہٹ جاتا ہے، میں اوائل عمری میں اہلِ زہد وعبادت اور اہلِ ارادت کی۔ جو کہ اس طبقہ

کے خیار لوگ تھے ۔ ایک جماعت کے ساتھ حاضر ہوا، ایک مکان میں سب جمع تھے انہوں نے پروگرام بنایا کہ محفلِ سماع منعقد کی جائے اور مجھے بھی شریک ہونے کو کہا مگر میں نے انکار کر دیا، اس پر مجھے محفل سے الگ ایک کمرے میں بٹھا دیا اور خود سماع سننے لگے، اس دوران ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوئی تو ایک شیخِ کبیر اپنے حالِ وجد میں میرا نام لے لے کر پکارنے لگا کہ اے فلاں تمہارے پاس عظیم نصیب آیا ہے، آؤ اپنا حصہ وصول کرلو، یہ سن کر میں نے دل میں کہا اور بعد ازاں انہیں بھی بتلایا کہ میں اپنا یہ نصیب تمہارے لئے چھوڑتا ہوں، ہر نصیب جو حضرت محمدؐ بن عبداللہ کے طریق سے نہ آئے اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ان میں سے بعض جو اہلِ معرفت وعلم تھے کے لئے متبین ہو گیا کہ یہ شیطانی احوال تھے جو ان شرکائے محفل پر طاری ہوئے تھے، ان میں سے کئی شراب کے نشہ میں تھے میں نے جو بات سوچی اور بعد ازاں کہی اس کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ اس نصیب، عطا اور ہبہ و حال کا سبب غیر شرعی ہے، یہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے طاعت نہیں اور نہ رسول نے اسے مشروع کیا ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کسی سے کہے آؤ ہمارے ساتھ شراب پیؤ اور ہم تمہیں یہ مال عطا کریں گے یا اس صنم کی تعظیم کرو ہم تجھے یہ منصب عطا کریں گے

کبھی اس کا سبب غیر اللہ کے لئے نذر ہو سکتی ہے مثلاً کسی صنم یا کنیسہ یا قبر یا ستارے یا کسی شیخ کے لئے نذر مان لے اس طرح کی نذور جن میں شرک ہوتا ہے کبھی شیطان اس کی کوئی ضرورت پوری بھی کرسکتا ہے جیسا کہ جادو کے ضمن میں گزرا اور یہ بخلاف اللہ کے لئے نذر ماننے کے! چنانچہ صحیحین میں ابن عمر راوی ہیں کہ نبی اکرم نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا یہ خیر نہیں لا تی (خیر تو مقدر سے ملتی ہے) دراصل اس کے ساتھ بخیل سے اس کے مال کا استخراج ہوتا ہے (یعنی ویسے تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی تو نذر کے بہانے اس کے مال سے کچھ خلقِ خدا کو فائدہ پہنچ جاتا ہے، باقی کسی کام کے پورا ہونے میں اس کا کوئی کردار نہیں) صحیحین کی حضرت ابو ہریرہ سے روایت بھی اس کی مثل ہے، ایک روایت میں ہے نذر ابنِ آدم کو تقدیر کے سامنے ہی لا ڈالتی ہے، تو یہ منہی عنہ نذر جس کا پورا کرنا ضروری ہے اسے ماننے سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی مان لے تب اس کا پورا کرنا واجب ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس نے اللہ کی طاعت کے کسی کام کی نذر مانی وہ اسے پورا کرے اور جس نے معصیت کے کسی کام کی نذر مانی ہو وہ پورا نہ کرے

نبی اکرم نے اس سے اس لئے منع کیا کیونکہ اس میں فائدہ نہیں ماسوائے اس کے التزام کے جو اس نے اپنے ذمہ لیا اور کبھی اسے پورا کرنے پر راضی نہ ہوگا تو گناہ لازم آئے گا اور اگر بلا نذر مانے یہ عبادات کرلے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے، لوگ اس لئے نذریں مانتے ہیں تاکہ ان کے مطالب کی تحصیل ہو تو نبی اکرم نے واضح کیا کہ اس میں نذر کا کوئی کردار نہیں تو یہ حصولِ مطلوب میں سبب نہیں بنتی، ناذر نے جب کہا میں اللہ کے لئے نذر مانتا ہوں کہ اگر اس نے مجھے قرآن کا حفظ کرا دیا تو مثلاً میں اتنے روزے رکھوں گا یا اگر اللہ نے اس مرض سے مجھے شفا دی یا اللہ نے فلاں کے شر سے مجھے بچا لیا یا قرض ادا کرا دیا وغیرہ تو یہ

کروں گا تو یوں اس نے جس عبادت کا التزام کیا اسے اس مطلوب کا عوض بنا دیا ہے اور اللہ سبحانہ اس کی حاجت کو مجرد اس منذور عبادت کی رو سے نہیں پورا کرتا بلکہ وہ اس مطلوب کے ساتھ اپنے بندے پر انعام کرتا ہے تا کہ اسے آزمائے کہ آیا شکرگزار بنتا ہے یا کفرانِ نعمت کرتا ہے؟ اور اس کا شکران کبھی ما مور بہ کے فعل اور منہی عنہ کے ترک کے ساتھ ہوگا اور جہاں تک وہ عبادتِ منذورہ تو وہ اس نعمت کے شکران کے ساتھ قائم نہ ہوگی اور نہ اللہ نے وہ نعمت اسے اس لئے عطا کی تھی کہ وہ بدلہ میں اس کی یہ عبادت کرے، جو پہلے مستحب تھی لیکن اب اس کے نذر ماننے سے واجب ہوگئی ہے اس لئے کہ اللہ نے ابتداءً اس عبادت کو واجب نہیں کیا بلکہ وہ بندے سے راضی ہے کہ فرائض کو ادا کرے اور محارم سے بچے لیکن عین ممکن ہے کہ اس ناذر نے اللہ کے کثیر حقوق کا ضیاع کیا ہو اور اب اس نعمت کی خاطر یہ اس نذر کو پورا کر رہا ہے اور یہ نعمت اس امر سے اجل ہے کہ اللہ اس حقیر منذور کی وجہ سے اسے اس پر کرے

اگر کوئی بھاری بھرکم نذر ہے اور بندہ (یعنی ناذر پہلے ہی سے) اللہ کا مطیع ہے تو وہ اللہ پر اس بات سے اکرم ہے کہ اسے اس کثیر مبذول کے کرنے کا محتاج کرے، بہرحال نذر حصولِ مطلوب میں سبب نہیں ہوتی جیسے دعا ہوتی ہے بلکہ دعا تو اعظم اسباب سے ہے اسی طرح صدقہ بھی ان عبادات میں سے ہے جنہیں اللہ تعالی نے حصولِ خیر اور دفعِ شر کا ذریعہ بنایا ہے جب بندہ ابتداءً ہی اسے کرے (نہ کہ بعدازاں) لیکن جو وہ علی وجہ النذر کرے تو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت میں اس کا کوئی کردار نہیں البتہ اگر بخیل تھا تو نذر مان لینے کی وجہ سے اب یہ کام اس پر واجب ہوا تو اللہ تعالی نذر کی وجہ سے بخیل سے اس کا کچھ مال نکلواتا ہے تو نذر پر اسے وہ عطا کرتا ہے جو اس کے بغیر اسے نہ دیتا واللہ اعلم۔

سوال: اہلِ جنت اور اہلِ نار کا کیا عمل ہے؟

جواب: اہلِ جنت کا عمل ایمان وتقوی اور اہلِ نار کا عمل کفر، فسوق اور عصیان ہے اہلِ جنت کے اعمال اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسل، یومِ آخرت اور خیر وشر تقدیر پر ایمان ہے اور دو گواہیاں: ایک یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور دوم کہ محمد اللہ کے رسول ہیں! پھر نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا اور یہ کہ اس طرح اللہ کی عبادت کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے وگرنہ وہ تو دیکھ ہی رہا ہے، نیز اہلِ جنت کے اعمال میں سے سچ بولنا، امانت ادا کرنا، عہد اور وعدہ پورا کرنا، والدین سے حسنِ سلوک کرنا، صلہ رحمی، پڑوسی، یتیم، مسکین اور غلام و لونڈی اور چوپایوں سے حسنِ سلوک کرنا اور اللہ کے لئے کامل اخلاص، اس پر توکل، اس سے اور اس کے رسول سے محبت، اللہ کے لئے خشیت، اس کی رحمت کا امیدوار ہونا، اس کی طرف انابت، اس کے حکم پر صبر کرنا اور اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا، قرآن کی تلاوت کرنا، اللہ کا ذکر کرنا، اس سے دعا اور طلبِ حاجات کرنا، اس کی طرف رغبت ہونا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اللہ کی راہ میں کفار ومنافقین سے جہاد

اہلِ جنت کے اعمال میں سے یہ بھی کہ جو تجھ سے قطع کرے اس سے بنائے رکھو، جو محروم کرے اسے عطا کرو، جو

زیادتی کرے اسے معاف کر دو تو اللہ نے متقین کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے، وہ جو تنگی ترشی اور خوشحالی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے، اسی طرح تمام امور میں انصاف سے کام لینا اور تمام خلق پر حتی کہ کفار سے بھی اور اس طرح کے دیگر اعمال

جہاں تک اہلِ نار کے اعمال تو مثلاً اللہ کے ساتھ شرک کرنا، رسل کی تکذیب، کفر، حسد، کذب، خیانت، ظلم، فواحش، غداری کرنا، قطع رحمی، جہاد سے بزدلی، بخل، ظاہر و باطن کا ایک جیسا نہ ہونا، اللہ کی رحمت سے مایوسی، اللہ کے مکر سے بے خوفی، مصائب کے وقت جزع وفزع کرنا، فخر کرنا اور نعمت ملنے پر اِترانا اور شوخی مارنا، اللہ کے فرائض کا ترک اور اس کی وضع کردہ حدود سے تجاوز کرنا، اس کی حرمات کا انتہاک (یعنی پامالی) اور اس کو چھوڑ کر مخلوق سے ڈرنا اور مخلوق سے امیدیں باندھنا، مخلوق پر توکل کرنا، ریا کاری سے کام لینا، کتاب وسنت کی مخالفت کرنا، خالق کی معصیت کے کاموں میں مخلوق کی طاعت کرنا، باطل اور ناجائز تعصب سے کام لینا، اللہ کی آیات کے ساتھ استہزاء، حق کا انکار اور جس علم وشہادت (گواہی) کا اظہار واجب ہے اس کا کتمان کرنا، نیز اہلِ نار کے اعمال سے جادوٹونہ کرنا یا کرانا، والدین کی نافرمانی، قتلِ ناحق، یتیم اور سود کا مال کھانا، جہاد سے فرار اور عاقل و پاک دامن بیبیوں پر تہمت دھرنا!
بہرحال دونوں طرح کے ان اعمال کی تفصیل سرِ دست ممکن نہیں لیکن یہ امر مدِنظر رہے کہ اہلِ جنت کے اعمال سب کے سب اللہ اور اس کے رسول کی طاعت جبکہ اہلِ نار کے تمام اعمال اللہ اور اس کے رسول کی معصیت میں داخل ہیں، فرمایا:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾[النساء : ۱۳۔۱۴] (اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کو جنتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی حدوں سے نکل جائے گا اُس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس کو ذلت کا عذاب ہوگا) جہاں تک اس کا قول کہ سالک کے لئے افضل عزلت ہے (یعنی گوشہ نشینی) یا خلطت (یعنی میل ملاپ) تو اگرچہ لوگوں کے درمیان یہ متنازع فیہ مسئلہ ہے، یا تو کلی نزاع اور یا پھر حالی؟ تو حقیقتِ امر یہ ہے کہ کبھی خلطت واجب یا مستحب ہوگی، ایک شخص کبھی مخالطت کا مامور ہے اور کبھی خلوت کا (یعنی حالات کے تحت) ماحصل یہ ہے کہ اگر مخالطت میں بر اور تقوی پر تعاون ہے تو یہ مامور بہ ہے اور اگر اس میں اثم اور عدوان پر تعاون ہے تب یہ منہی عنہ ہے تو عبادات کی جنس مثلاً نمازِ پنجگانہ، جمعہ، عیدین، نمازِ کسوف، نمازِ استسقاء (اور نمازِ جنازہ) وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ اختلاط اللہ و رسول کا حکم ہے اسی طرح حج، کفار اور خوارج کے خلاف جہاد میں اگرچہ قیادت فاجر لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور اگرچہ ان جماعات میں فجار لوگ شامل ہوں، اسی طرح اس طرح کے اجتماعات (یعنی دینی جلسے اور محافل) جہاں ایمان میں اضافہ ہوتا

(اوراس میں تازگی آتی) ہو یا تو یہ منتفع ہو یا نافع

دوسری طرف **بندے کے لئے کچھ ایسے اوقات کا ہونا ضروری ہے** جن میں وہ اپنے آپ کے ساتھ منفرد ہو، دعاء، ذکر، نوافل، تفکُّر، محاسبہِ نفس اور اصلاحِ قلب وغیرہ کے لئے اور ایسے امور جو اس کے ساتھ خاص ہیں جن میں کوئی اور اس کا مشارِک نہیں تو اب اسے خلوت کی ضرورت ہوگی یا تو اپنے گھر میں جیسے طاؤس کا قول ہے کہ آدمی کا گھر اس کا عمدہ صومعہ (یعنی معبد) ہے جہاں اس کی نظر اور زبان محفوظ رہے گی یا پھر کسی اور کے گھر میں (یا کہیں بھی) لہذا مطلقاً عزلت نشین ہو جانا خطا ہے جیسا کہ مطلقاً مخالطت بھی خطا ہے، حسبِ ضرورت انسان کو دونوں کی ضرورت پڑتی ہے اور جس وقت و حال میں دونوں میں سے جو اس کے لئے اصلح ہواس کے لئے نظرِ خاص کی ضرورت ہے اور اسی طرح سبب اور ترکِ سبب کا معاملہ تو جو سبب پر قادر ہواور یہ اسے دینی لحاظ سے اپنے سے انفع سے مشغول نہ کردے تو وہ اس کا مامور ہے اللہ پر توکل کرنے کے ساتھ یہ اس کے لئے اس امر سے بہتر ہے کہ لوگوں سے اخذ کرے اگرچہ اس کی جانب سے سوال وطلب کیے بغیر اس کا حصول ہو تو اس طرح کا سبب اختیار کرنا اللہ کی عبادت ہے اور عبادت پر تو وہ مامور ہے ہی لیکن اگر بغیر صالح نیت کے وہ متسبب ہوا یا اللہ پر توکل نہ کیا تو وہ اِس میں اور اُس میں مطیع ہے اور یہ انبیاء اور صحابہ کا طریق ہے لیکن جو ان فقراء میں سے ہے جو اللہ کی راہ میں روک لئے گئے، جو زمین میں چل پھر کر معاش کمانے کی استطاعت نہیں رکھتے (یعنی طلبِ علم، مسجد کی امامت اور بچوں کو دین و قرآن کی تعلیم دینا وغیرہ کسی وجہ سے) ناواقف بوجہ ان کے تعفُّف (یعنی دستِ سوال دراز کرنے سے پرہیز) کے انہیں مالدار سمجھتا ہے تو یہ حضرات یا تو کسبِ معاش سے عاجز ہوں گے یا قادر تو ہیں مگر بھلائی اور طاعت کے جن کاموں میں لگے ہوئے ہیں انہیں چھوڑنا پڑے گا اور یہ کسب کی نسبت اللہ کے لئے اطوع (زیادہ طاعت گزار) ہیں تو اب ان کے حق میں مشروع انہی اطوع کاموں میں مشغول رہنا ہے اور یہ معاملہ لوگوں کے احوال کے تنوع کے پیشِ نظر متنوع ہے

پہلے گزرا کہ افضل یہی ہے کہ عبادات کی اجناس کے بحسب تنوع کی خو اختیار کرے جیسے جنسِ نماز جنسِ قراءت، جنسِ قراءت جنسِ ذکر اور جنسِ ذکر جنسِ دعا سے افضل ہے لیکن یہ ترتیب حسبِ اوقات بدل بھی جائے گی مثلاً فجر اور عصر کے بعد قراءت، ذکر اور دعا مشروع ہے، نہ کہ نماز پڑھنا (یعنی نفل نماز تو یوں ان اوقات میں یہ افعال افضل بنے) اور کبھی انسان کے ظاہری عمل کی رو سے ترتیب بدل جائے گی مثلاً رکوع اور سجود میں مشروع یہ ہے کہ ذکر و دعاء ہو نہ کہ قراءت، اسی طرح طواف کے دوران بالاتفاق ذکر و دعاء مشروع ہے جبکہ اس دوران (زبانی اور دیکھ کر) قراءت بارے معروف نزاع ہے اور کبھی اختلافِ اماکن کی رو سے ترتیب بدل جاتی ہے مثلاً عرفہ، مزدلفہ اور جمرات کے پاس اور صفا و مروہ کے پاس ذکر و دعاء مشروع ہے نہ کہ نماز ونحوہ

کعبہ میں نو وارد کے لئے طواف نماز (یعنی تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں) سے افضل ہے جبکہ مکہ میں مقیم کے لئے (بطور تحیۃ

المسجد) بنسبت طواف کے نماز افضل ہے اور کبھی جنسِ عبادت کے مرتبہ کے اختلاف کے مدِ نظر تو مردوں کے لئے جہاد حج سے جبکہ عورتوں کے لئے حج جہاد سے افضل ہے اور شادی شدہ خاتون کیلئے اپنے شوہر کی طاعت اپنے والدین کی طاعت سے افضل ہے بخلاف ایمہ (بیوہ) کے تو وہ اپنے والدین کی اطاعت کی مامور ہے، اور کبھی یہ بندے کی قدرت اور اس کے حالِ عجز کے اختلاف کی رو سے مختلف ہوتی ہے تو جن عبادات پر وہ قادر ہے وہ اس کے لئے ان عبادات سے افضل ہیں جن پر وہ قادر نہیں اگر چہ معجوز عنہ کی جنس افضل ہو! یہ ایک وسیع باب ہے جس میں کثیر حضرات غلو سے کام لیتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، بعض حضرات جب کسی عمل کو اپنے حق میں افضل دیکھتے ہیں اپنے لئے کسی مناسبت کی رو سے اور اس کے اپنے قلب کے لئے انفع اور اپنے رب کے لئے اطوع ہونے کی وجہ سے تو چاہتے ہیں کہ تمام لوگوں کے لئے ہی اسے افضل قرار دیں اور انہیں اس کے مثل کا حکم دیں، اللہ نے حضرت محمد کو کتاب وحکمت کے ساتھ مبعوث کیا اور انہیں بندوں کے لئے رحمت و ہدایت کا ذریعہ بنایا، وہ ہر انسان کو اس کا امر دیتا ہے جو اس کے لئے اصلح ہے، تو مسلمان پر واجب ہے کہ وہ دیگر مسلمانوں کا خیر خواہ ہو، ہر انسان کے لئے اس کا قصد کرے جو اس کے لئے اصلح ہے، اس سے واضح ہوا کہ کئی لوگوں کے لئے ان کا تطوع بالعلم ان کے لئے افضل اور کئی کا تطوع بالجہاد اور کئی کا تطوع بالعبادات ازقسم نماز وروزہ ان کی نسبت افضل ہوگا اور مطلقاً افضل وہ ہے جو باطناً اور ظاہراً نبی اکرم کے حال وسیرت سے اشبہ ہو تو خیر الکلام کلام اللہ اور خیر الہدی حضرت محمد کی ہدی ہے۔

شیخ کی ایک تحریر (بقول مرتب یہ: فِیْ اِتِّبَاعِ الرَّسُوْلِ بِصَرِیْحِ الْمَعْقُوْلِ کے مسئلہ پر ہے، یعنی صریح عقل کی رو سے اتباعِ رسول بارے)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً، اَمَّا بَعْدُ:

جانو کہ انس وجن میں سے ہر عاقل اور بالغ پر واجب ہے کہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں جنہیں ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث کیا تاکہ تمام ادیان پر اسے غالب کردے! وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْداً، آپ کی رسالت کل بنی آدم کی طرف ہے انس وجن، عرب وعجم، فرس وہند، بربر وروم اور تمام اصنافِ عجم، اسود وابیض، عجم سے مراد جو غیر عرب اقوام ہیں تو حضرت محمد سب کی طرف رسول ہیں، ہر اس میں جو باطنی وظاہری امور سے دین سے متعلق ہے عقائد وحقائق، طرائق وشرائع تو کوئی عقیدہ نہیں سوائے آپ کے لائے ہوئے عقیدہ کے اور کوئی حقیقت نہیں مگر آپ کی حقیقت اور کوئی طریقت وشریعت نہیں سوائے آپ کی طریقت وشریعت کے، کوئی اللہ، اس کی رضوان، اس کی جنت وکرامت اور ولایت تک نہیں پہنچ سکتا مگر باطناً اور ظاہراً آپ کی متابعت کے ساتھ، اقوال میں اور ظاہری وباطنی اعمال میں اور دل کے اقوال وعقائد

اوراحوال میں نیز زبان کے اقوال اور جوارح کے اعمال میں

اللہ کا ولی وہی ہے جس نے باطناً اور ظاہراً آپ کی اتباع کی، جن امورِغیب کی آپ نے خبر دی ہے ان کی تصدیق کی اور جوخلق پر واجبات فرض کئے ان کی بجا آوری کی اور محرمات کا ترک کیا اور یوں آپ کی طاعت کا التزام کیا، جو ایسا نہیں وہ تو مومن ہی نہیں چہ جائے کہ اسے ولی اللہ سمجھیں چاہے سوقسم کے خرقِ عادت امور اس کے ہاتھوں ظاہر ہوں، طاعت کے کاموں کے بغیر اس کے تمام احوال شیطانی احوال ہیں اور یہی اللہ سے اس کی دوری کا سبب اور اس کے عذاب وسخط سے اسے قریب کر رہے ہیں لیکن جو شرعی لحاظ سے مکلّف ہی نہیں مثلاً نا بالغ اور مجانین جن سے قلم مرفوع ہے تو یہ معاقَب نہیں (جب تک مکلّف نہیں ہوتے) ان پر طاعت میں سے کوئی شئ ہنوز واجب نہیں کہ جس کی رو سے یہ اللہ کے متقی اولیاء ہوسکیں البتہ اپنے آباء کی تبع میں یہ اسلام میں داخل ہیں جیسے کہا:

(وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ) [والطور: ۲۱] اور جولوگ ایمان لائے اوران کی اولاد بھی ایمان میں ان کے پیچھے چلی ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اوران کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنے اعمال میں پھنسا ہوا ہے) لیکن عدم شعور وعقل کے باوصف یہ فی الحال ان میں سے نہ ہوں گے جن کے قلوب میں ایمان کے حقائق، اہلِ ولایت کے معارف اور اللہ کے خواص کے احوال ہیں اس لئے کہ یہ امور عقل وشعور کے ساتھ مشروط ہیں تو جنون عقل، تصدیق، معرفت، یقین، ہدی اور ثناء کا مضاد ہے اور اللہ انہی کو رفعت دیتا ہے جو ایمان لائے اور جنہیں علم عطا ہوا تو مجنون اگرچہ معاقَب نہیں بلکہ آخرت میں مرحومین میں سے ہوگا لیکن وہ اللہ کے مقرب ومقتصد اولیاء میں شمار نہیں کیا جاسکتا، وہ جن کے اللہ تعالی درجات بلند کرتا ہے، جس نے ظن کیا کہ ان میں سے کوئی جو واجبات ادا نہیں کرتے اور محرمات کا ترک نہیں کرتے چاہے عاقل ہو یا مجنون یا مولّہ یا متولّہ اللہ کا ولی اور مقرب ہوسکتا ہے تو اس طرح کے لوگوں کی بابت ایسا اعتقاد رکھنے والا کافر اور دینِ اسلام سے مرتد ہے اور اس امر کا غیر شاہد ہے کہ محمد رسول اللہ ہیں بلکہ وہ آپ کا مکذِب ہے اس لئے کہ آپ نے تو خبر دی ہے کہ اللہ کے اولیاء وہی ہیں جو متقی ہیں جیسے قرآن نے کہا:

(اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ)[یونس: ۶۲-۶۳](آگاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے)

(يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ) [الحجرات: ۱۳] (اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے) اور تقوی یہ ہے کہ آدمی

اللہ کی طاعت کے عمل بجا لائے، اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کی معصیت کا تارک اور اس کے عذاب سے خائف ہو اللہ کا ولی اور مقرب بننے کا طریقہ ادائے واجبات اور ترکِ محرمات ہے نیز ادائے نوافل جیسے حدیثِ قدسی میں ہے (جو متعدد بار ذکر ہوئی) کہ میرا بندہ فرائض کی بجا آوری کی رو سے جو میرا تقرب پاتا ہے اس کی مثل کوئی شئ نہیں اور وہ فرائض کے بعد مسلسل نوافل کے ساتھ میرا تقرب پاتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔۔الخ اسے بخاری نے نقل کیا۔

فصل

اللہ کو محبوب ترین اعمال اور اس کے ہاں اعظم ترین فرائض میں سے نمازِ پنجگانہ کی وقت پر ادائیگی ہے روزِ قیامت نماز کی بابت ہی اولین پُرسش ہوگی، اللہ نے بذاتِ خود شبِ معراج میں اسے فرض کیا اور اس ضمن میں اپنے اور حضرت محمد کے درمیان حضرت جبریل کو واسطہ نہ بنایا، یہ اسلام کا وہ ستون ہے کہ اس کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتا اور یہ تمام امورِ دین میں سے اہم ترین ہے جیسے حضرت عمر اپنے عُمال کو لکھا کرتے تھے کہ میرے نزدیک تمہاری سب سے اہم ذمہ داری اقامتِ نماز ہے، جس نے اس کی محافظت کی اس نے دیگر امورِ دین کی بھی محافظت کی اور جس نے اسے ضائع کیا وہ اس کے ماسوا کی تضییع میں تو اشد ہوگا، صحیح میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا بندے اور شرک کے مابین ترکِ نماز ہے اور فرمایا جو عہد ہمارے اور ان کے درمیان ہے وہ نماز ہے، پس جس نے اس کا ترک کیا اس نے کفر کیا تو جس نے ہر عاقل و بالغ پر اس کے وجوب کا اعتقاد نہ رکھا اور خواتین کے ضمن میں عاقلہ و بالغہ کے ساتھ ساتھ غیر حائض اور غیر نفساء ہونے کی شرط بھی ہے وہ ائمہ مسلمین کے بالاتفاق کافر اور مرتد ہے اگرچہ اعتقاد رکھا کہ یہ صالح عمل ہے اور اللہ کو پسند ہے اور وہ اس پر ثواب دیتا ہے، دوسری طرف کوئی آدمی نماز کا عامل ہے بلکہ تہجد بھی پڑھتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے لیکن ہر بالغ پر اس کے وجوب کا معتقد نہیں وہ بھی کافر و مرتد ہے جب تک یہ عقیدہ نہ رکھے کہ یہ ہر عاقل و بالغ پر فرض ہے

اور جس نے اعتقاد رکھا کہ بعض شیوخ سے، جو عارف، مکاشف اور واصل ہیں یہ ساقط ہے یا اللہ کے کچھ ایسے خواص ہیں جن پر نماز ادا کرنا واجب نہیں بلکہ حضرۃ القدس تک ان کے واصل ہو چکے ہونے کی وجہ سے یہ فریضہ اب ان سے ساقط ہوا (جیسے ہمارے ہاں جہال کا مقولہ ہے کہ پہنچے ہوؤں کی نماز نہیں) یا اس وجہ سے کہ یہ اس سے زیادہ اہم و اولی کام میں مشغول ہیں لہذا یہ ان سے ساقط ہوئی کہ وہ اس سے مستغنی ہیں! یا کہیں کہ اصل مقصود رب کے ساتھ حضورِ قلب ہے (جو نماز کے بغیر اگر مل جائے تو اس کی ادائیگی ضروری نہیں) یا کہیں کہ نماز میں تفرقہ ہے تو بندہ جب اپنی جمعیت میں اللہ کے ساتھ ہے تو اسے نماز کی کیا ضرورت؟ بلکہ نماز سے مقصود معرفت ہے تو جب یہ انہیں حاصل ہے تو اب نماز کی ضرورت نہیں کہ مقصود یہ ہے کہ تمہیں خرقِ عادت حاصل ہو مثلاً فضا میں اڑنا، پانی پر چلنا یا ہوا سے مٹکا پانی سے بھر دینا یا غوطہ لگا کر تہہ سے موتی نکال لانا وغیرہ تو نماز کی کیا حاجت؟ یا اعتقاد رکھے کہ اللہ کے کچھ ایسے خواص بندے ہیں جو نبی اکرم کی متابعت کے محتاج نہیں بلکہ وہ آپ سے مستغنی ہیں جیسے

حضرت خضر حضرت موسیٰ سے تھے، یا کہے ہر جو صاحبِ کشف ہوا اور ہوا میں اڑا یا پانی پر چلا وہ ولی ہے چاہے نماز پڑھے یا نہ پڑھے یا اعتقاد رکھا کہ نماز بغیر وضو کے بھی ہو جاتی ہے، یا یہ مولّہین اور متولّہین اور درویش جو قبرستانوں ،کوڑے خانوں ،طہارت خانوں ،دوکانوں ،سرائے خانوں اور دیگر جگہوں پر ہیں ان کے ذمہ نہ وضوء ہے اور نہ نماز تو جس نے ایسوں کو اللہ کا ولی قرار دیا وہ ائمہ اسلام کے بالا تفاق کافر اور اسلام سے مرتد ہے اگر چہ فی نفسہ وہ عابد وزاہد ہی ہو، راہبوں سے زیادہ عابد وزاہد کون ہے؟ اور وہ نبی اکرم کی لائی کثیر تعلیمات و احکام پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے جمہور رسول اکرم کی اور صحابہ کی از حد تعظیم کرتے تھے لیکن ان کا سب تعلیماتِ نبوی پر ایمان نہ تھا بلکہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا تو کافر قرار پائے جیسے قرآن میں کہا:

(اِنَّ الَّـذِيْـنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُـرِيْـدُوْنَ اَنْ يَّتَّـخِـذُوْا بَيْـنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ اٰمَـنُـوْا بِـاللّٰـهِ وَرُسُـلِهٖ وَلَـمْ يُـفَـرِّقُـوْا بَيْـنَ اَحَـدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْـمًا)[النساء : ۱۵۰۔۱۵۲] (جو لوگ اللہ سے اور اُس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک راہ نکالنی چاہتے ہیں۔وہ بلا شبہ کافر ہیں اور کافروں کیلئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے-اور جو لوگ اللہ اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے صلے عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے) جو مسلوب العقل یا مجنون ہے تو اس کی غایت یہ ہے کہ وہ مرفوع القلم ہے، نہ اس پر کوئی عقاب ہے اور نہ اس کا ایمان، نماز، روزہ اور کوئی عمل صحیح ہے کیونکہ اعمال کی قبولیت عقل وشعور ہونے کے ساتھ مشروط ہے تو جس کے لئے عقل اور شعور نہیں تو اس کی عبادات سے کوئی بھی شئ صحیح نہیں نہ اس کے فرائض اور نہ اس کے نوافل اور جس کے لئے نہ کوئی فرض عمل ہے اور نہ نفل وہ اللہ کے اولیاء میں سے نہیں، اسی لئے کہا:

(اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى) [طٰه : ۵۴] (بے شک ان میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)

(هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ) [والفجر: ۵] (بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں)

(وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ)[البقرة : ۱۹۷] (اور اے عقل والو مجھ سے ڈرتے رہو)

(اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ)[الأنفال : ۲۲] (بے شک اللہ کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے)

(اِنَّـا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰ نًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ) [الزخرف : ۳] (ہم نے اس کو قرآنِ عربی بنایا ہے تا کہ تم سمجھو) تو اللہ نے ان کی مدح وثناء کی ہے جن کے لئے عقل ہے، جو عقل نہیں رکھتے ان کی حمد وثناء نہیں کی اور کبھی ان کا ذکر خیر نہیں کیا بلکہ اہلِ نار بارے کہا:

(وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ) [الملك : ۱۰] (اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے) اور:

(وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ)[الأعراف : ۱۷۹] (اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کیلئے پیدا کئے ہیں، اُن کے دل ہیں لیکن اُن سے سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی بھٹکے ہوئے، یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)

(اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا) [الفرقان : ۴۴] (یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں) تو جس کے لئے عقل نہیں اس کا ایمان اور فرض ونفل بھی صحیح نہیں! جو یہودی یا نصرانی تھا پھر وہ مجنون ہو گیا اور حالتِ جنون میں اسلام لے آیا تو اس کا اسلام صحیح نہیں، نہ باطناً اور نہ ظاہراً جو مومن تھا پھر کفر اختیار کر لیا پھر اس پر حالتِ جنون طاری ہوئی تو اس کا حکم کفار کے حکم کا سا ہے، جو مومن تھا تو مجنون ہوا اسے اس کی حالتِ عقل وشعور کے ایمان (اور اعمال) کا بدلہ ملے گا، جو دیوانہ پیدا ہوا اور جنون جاری رہا اس سے نہ ایمان صحیح ہے اور نہ کفر، مجنون کا حکم طفل کا سا حکم ہے اگر اس کے والدین مسلمان ہیں تو وہ بالا تفاق ان کی تبع میں مسلمان باور ہوگا، اسی طرح اگر اس کی والدہ مسلمان ہے تو جمہور مثلاً ابوحنیفہ، شافعی اور احمد کے نزدیک وہ مسلمان ہے اسی طرح جو اپنے اسلام کے بعد دیوانہ ہوا اس کے لئے والدین کی تبع میں حکمِ اسلام ثابت رہے گا، وہ مجنون جو مسلمان معاشرہ میں پیدا ہوا اس کے لئے والدین یا اہلِ علاقہ کی تبع میں ظاہراً اسلام کا حکم لگایا جائے گا، اس ایمان کی رو سے نہیں جس کے ساتھ وہ قائم ہوا، قیامت کے دن نابالغی اور دیوانگی کی حالت میں فوت ہونے والے مسلمان اپنے والدین کے تبع ہوں گے اور یہ اسلام اس کے لئے اس کے غیر پر مزیت وامتیاز کا موجب نہیں اور نہ اس کی رو سے وہ اللہ کے ان متقی اولیاء میں سے ہوسکتا ہے جو بذریعہ فرائض ونوافل اس کی طرف متقرب ہوتے ہیں، فرمایا:

(يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا) [النساء : ۴۳] (اے مومنو جب تم نشے کی حالت میں ہو تو حتی کہ جو منہ سے کہو سمجھنے لگو نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی حتی کہ غسل کر لو) تو اللہ نے نماز کے قریب بھی ہونے سے منع کیا ہے جب وہ نشہ کی حالت میں ہوں حتی کہ جو کہہ رہے ہیں اس کا علم وشعور رکھیں، علماء کا اتفاق ہے کہ اس آیت کا نزول سورۃ المائدہ کی آیت کے ساتھ شراب کی تحریم کئے جا

نے سے قبل ہوا اور مروی ہے کہ اس کا سببِ نزول یہ ہے کہ ایک صحابی نے ایک دفعہ شراب پی ہوئی تھی تو بعض اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھادی اور یہ شراب کی حرمت اور حالتِ نشہ میں نماز کے قریب جانے کی ممانعت سے قبل تو ان پر قراءت گڑ بڑ ہوگئی تو اللہ نے یہ آیت نازل کی تو جب اللہ نے نشہ جو ابھی حرام نہ تھا، کی صورت میں نماز ادا کرنا حرام کیا ہوا تھا جب تک پڑھنے والا یہ شعور نہ رکھے کہ کیا پڑھ رہا ہے تو معلوم ہوا کہ یہی ضابطہ ہے کہ جب تک نمازی کو عقل وشعور نہ ہو کہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے وہ نماز کے قریب نہ جائے، تو جس کے پاس یہ شعور نہیں اس کے لئے نماز حلال نہیں، اگرچہ اس کی عقل کسی غیر محرم سبب کی رو سے زائل ہوئی ہو لہذا علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس کی عقل زائل ہوئی چاہے کسی بھی سبب سے، اس کی نماز صحیح نہیں تو مجنون کا یہی حکم کیوں نہ ہوگا؟

بعض مفسرین نے لکھا اور یہ ضحاک سے مروی ہے (یعنی اس آیت کی تفسیر میں) کہ تم نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ بوجہ نیند تم سکاریٰ (مدہوش) ہو اور یہ جب کہا جائے کہ آیتِ ہذا بطریقِ اعتبار یا لفظِ عام کے معنی کے شمول کی رو سے اس پر دال ہے وگرنہ کوئی شبہ نہیں کہ آیت کا شانِ نزول شراب کے نشہ کی حالت تھی اور لفظ اس بارے صریح ہے، دوسرا معنی بھی صحیح ہے! صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا جب کوئی رات کو تہجد کے لئے اٹھے اور (نیند کے غلبہ کی وجہ سے) قرآن کی قراءت اس کی زبان پر مشکل ہو رہی ہو تو سو جائے کیونکہ عین ممکن ہے کہ استغفار کرنا چاہتا ہو لیکن غلط لفظ منہ سے نکال لے، ایک روایت میں ہے اگر نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آ رہی ہو تو سو جائے، اس سے علماء نے احتجاج کیا ہے کہ اونگھ سے وضوء نہیں ٹوٹتا کہ اگر ایسا ہوتا تو نماز باطل ہو جاتی یا وضوء دوبارہ کرنے کے لئے نماز سے نکل آنا واجب ہوتا جبکہ نبی اکرم نے اسے تعلیل نہیں بنایا بلکہ کہا غلط لفظ نہ منہ سے نکال لے اور اس کا طرد یہ کہ صحیح کی ایک اور روایت میں ہے فرمایا اس حال میں نماز نہ پڑھے کہ اخبثین (یعنی چھوٹے اور بڑے پیشاب) کی مدافعت کر رہا ہو (یعنی حاجت ہونے کے باوجود روک رکھا ہو کہ نماز پڑھ کے ہی فارغ ہوں گا، یہ عموماً کیا جاتا ہے تا کہ دوبارہ وضوء نہ کرنا پڑے) اور نہ تب جب کھانا سامنے پیش کر دیا گیا ہو اس وجہ سے کہ دل اسی میں مشغول ہوگا (اور خشوع کی کیفیت پیدا نہ ہو سکے گی) ابودرداء کا قول ہے آدمی کی فقاہت سے ہے کہ پہلے اپنی حاجت پوری کرے پھر نماز پر متوجہ ہو جب دل فارغ ہو

تو جب زوالِ شعور و عقل کی حالت میں نماز ادا کرنا ہی حرام ہے اگرچہ یہ کسی مباح سبب سے ہو، جب منہ سے نکلے الفاظ کو اچھی طرح سمجھ نہ رہا ہو تو مجنون اور جو مسمائے مجنون میں داخل ہے، کی نماز بھی جائز نہ ہوگی اگرچہ اسے مولہ کہیں یا متولہ اور معلوم امر ہے کہ نماز افضل العبادات ہے جیسا کہ صحیحین میں ابن مسعود سے مروی ہے، کہتے ہیں میں نے نبی اکرم سے عرض کی کہ اللہ کو کون سا عمل محبوب ترین ہے؟ فرمایا وقت (شروع ہونے) پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون سا؟ فرمایا والدین سے حسنِ سلوک، عرض کی پھر؟ فرمایا جہاد، کہتے ہیں اگر اور پوچھتا تو آپ مزید بھی بتلاتے، صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ افضلِ اعمال اللہ پر ایمان پھر اس کی راہ میں جہاد پھر حجِ مبرور، دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں کیونکہ نماز مسمی ایمان باللہ میں داخل ہے جیسے اس آیت میں بھی داخل ہے:

(وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ) [البقرۃ : ۱۴۳] (اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے) براء بن عازب اور دیگر سلف کہتے ہیں ای: (صَلَاتَکُمْ اِلیٰ بَیْتِ الْمَقْدِسِ) (یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے جو تم نے نمازیں ادا کی ہیں) لہٰذا نماز ایمان کی مانند ہے کسی حال اس میں نیابت نہیں، کوئی کسی کی طرف سے نماز نہیں پڑھ سکتا، نہ عذر کی وجہ سے اور نہ بغیر عذر کے جیسے کوئی کسی کی طرف سے ایمان بھی نہیں لا سکتا اور نہ کسی بھی طور یہ ساقط ہوگی جیسا کہ ایمان بھی ساقط نہ ہوگا بلکہ جب تک سانس کی ڈور چل رہی ہے اور عقل وشعور قائم ہے اور وہ اس بعض افعال کی ادائیگی پر قادر ہے یہ پڑھنا ہوگی اگر بعض افعال کی ادائیگی سے عاجز ہوا تو جن پر قادر ہے وہی ادا کرے گا اور اگر تمام ہی افعال سے عاجز ہوا تو کیا پلکوں کی تحریک کے ساتھ ادا کی جا سکتی ہے اور دل میں اس کے ارکان کا استحضار کرتا رہے؟ (ترتیب کے ساتھ) تو اس میں علما کے دو اقوال ہیں، اظہر یہ ہے کہ یہ غیر مشروع ہے

تو جب معاملہ یہ ہے تو واضح ہوا کہ جس کی عقل نے ساتھ چھوڑا تو اب تمام فرائض ونوافل کی بجا آوری مطلوب نہ رہی اور ولایت تو ایمان وتقوی ہی ہے جو فرائض ونوافل کے ساتھ تقرب کو متضمن ہیں اور اسی سے ولایت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور یہ بوجہ اپنے جنون کے مرفوع القلم ہے تو قابلِ عقاب بھی نہیں جیسے نابالغ اور چوپائے بھی نہیں کیونکہ جب تک یہ حالت قائم ہے وہ شرعاً مکلّف نہیں (**تو ولایت کیسے مل سکتی ہے**) پھر اگر حالتِ جنون طاری ہونے سے پہلے مومن تھا اور صالح اعمال کرتا تھا اور فرائض ونوافل کے ساتھ متقرب ہوتا تھا تو اسے اس ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ثواب ملا جو اس نے قبل ازیں کئے اور اس کے بحسب اللہ کی ولایت اسے حاصل ہے جیسا کہ بوجہ موت یہ سب ساقط نہیں ہو جاتے بخلاف اس کے جو اسلام سے مرتد ہو گیا تو ارتداد گزشتہ تمام نیکیوں کا حبوط کر دیتا ہے، سیآت میں بس ارتداد ہی ہے جس کی رو سے جملہ حسنات برباد اور کالعدم ہو جاتی ہیں جیسے حسنات میں بس واحد توبہ ایسی شیٔ ہے جو اگر کر لے تو گزشتہ تمام سیآت مٹا دی جاتی ہے تو حالتِ جنون میں اب اس کی نسبت پہلے کی طرح کا کتابتِ اعمال کا معاملہ ختم ہوا، اسی طرح بوجہ نشہ یا نیند زوالِ عقل کی حالت میں اگر کسی سیئہ یا سیآت کا ارتکاب کیا تو ان کی کتابت نہ کی جائے گی اس لیے کہ اس حال میں اس کے لئے قصدِ صحیح کا وجود نہیں ہے لیکن ابوموسی کی نقل کردہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جب بندہ مریض ہو جائے یا سفر میں ہو تو اس کے لئے وہی عمل لکھا جاتا ہے جو وہ تندرست اور مقیم ہونے کی حالت میں کرتا تھا، صحیح میں ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر کہا مدینہ میں ایسے لوگ ہیں کہ تم نے کوئی مسافت طے نہیں کی اور کسی وادی سے نہیں گزرے مگر وہ (ثواب کے اعتبار سے) تمہارے ساتھ تھے، عرض کی مدینہ میں ہوتے ہوئے؟ فرمایا ہاں کیونکہ عذر نے انہیں روک رکھا ہے تو یہ جن کی بابت یہ بات کہی اس عمل کے قاصد تھے جو آپ کے ہمراہی صحابہ کر رہے تھے اور اس میں راغب تھے لیکن ازروئے عذرِ شرعی اس سے عاجز رہے تو بمنزلہِ عامل بنے بخلاف اس کے جس کی عقل زائل ہوئی تو اب اس کے لئے قصدِ صحیح نہیں اور

نہ اصلاً کوئی عبادت ہے بخلاف ان کے جن کے لئے قصدِ صحیح موجود تھا جس کی رو سے ان کے لئے وہی ثواب لکھا گیا

لیکن جو حالتِ جنون طاری ہونے سے قبل کافر یا فاسق یا مذنب تھا تو جنون کا یہ حدوث اس کی اس حالت کا یا حالتِ فسق وغیرہ کا مزیل نہ بنے گا، اسی لیے یہود ونصاریٰ کے مجانین انہی کے ساتھ محشور ہوں گے اسی طرح جو مسلمانوں میں سے ایمان وتقویٰ کی زندگی گزارتے ہوئے مجنون بن گئے تو ان کا حشر مومنین متقین کے ساتھ ہوگا لیکن اب دیوانگی طاری ہونے کے بعد اعمالِ صالحہ کرنے کا تسلسل ختم ہوا، اب جو درجہ قبل ازیں اسے حاصل ہو چکا وہ برقرار رہے گا، جنون زوالِ عقل کا موجب ہے اب جس حالتِ خیر یا حالتِ شر پر وہ تھا اسی پر باور ہوگا، نہ کمی ہوگی اور نہ بیشی، جنون زیادتِ خیر سے اس کے حرمان کا سبب بنا جیسا کہ زیادتِ شر سے بھی لیکن اگر زوالِ عقل کی وجہ کوئی حرام کام ہے مثلاً شراب نوشی، افیون اور ہیروئن تناول کرنا یا ملحن سماع کی محفل میں حاضر تھا کہ یہ حال طاری ہوا یا بدعی عبادات میں لگا ہوا تھا حتی کہ بعض شیاطین اس کے ساتھ نتھی ہو گئے تو اس کی عقل حالت بدل ڈالی یا بھنگ کھاتا تھا کہ عقل زائل ہوئی تو ایسے لوگ ذم وعقاب کے مستحق ہیں کہ کیوں ان حرام وسائل سے اپنی عقول کو زائل کر لیا، ان میں سے کثیر شیطانی حال کا استجلاب کر لیتے ہیں کہ ایسے کام کرنے لگتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں مثلاً ایسے والہانہ انداز سے رقص کہ عقل وشعور نے ساتھ چھوڑ ایا غشی طاری ہوئی، خراٹے مارے اور شیطان نے ذہن وجسم پر تسلط جما لیا ان میں سے کثیر لوگ تولّہ کا قصد کرتے ہیں حتی کہ مولّہ ہو جاتے ہیں تو یہ سب حزبِ شیطان میں سے ہے اس حالت کے شکار ہم نے بہت لوگ دیکھے ہیں

علماء کے ہاں اس ضمن میں اختلافِ آراء ہے کہ آیا زوالِ عقل کے اس حال میں یہ مکلّف ہیں یا نہیں؟ اور اس ضمن میں اصل مسئلہِ سکران ہے، شافعی اور احمد وغیرہما سے منصوص ہے کہ انسان زوالِ عقل کے حال میں مکلّف ہے، کثیر علماء غیر مکلّف قرار دیتے ہیں شافعی اور احمد کے مسالک میں بھی یہ احد القولین ہے، احمد سے منقول دو میں سے ایک قول یہ ہے کہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جائے گی اور یہی اظہر القولین ہے علماء میں سے کسی نے نہیں کہا کہ یہ جن کی عقل زائل ہوئی اس طرح کے سبب کے ساتھ یہ اللہ کے موحد ومقرب ولی اور اس کا مفلح حزب ہیں، علماء نے جن عقلائے مجانین کا خیر کے ساتھ ذکر کیا وہ قسمِ اول سے ہیں جن میں خیر تھی (یعنی نیک لوگ تھے اور غیر محرم سبب کی رو سے) دیوانگی طاری ہوگئی، ان کی ایک نشانی یہ ہے کہ جب اس حالتِ دیوانگی کے دوران صحو (یعنی ہوش) کی ایک نوع ان کے لئے حاصل ہوئی تو وہی ایمان اور عملِ صالح اور تقویٰ ونیکی کی باتیں کیں جو قبل ازیں ان کا وطیرہ تھا بخلاف ان کے کہ جن پر افاقہ آیا تو اول فول بکا اور کفر وبہتان کی باتیں کیں اور ہذیان بکا تو یہ دوسری قسم والے کفار وفجار ہیں، نہ کہ مسلم اور صالح جو اس حالت میں فارسی یا ترکی یا بربری (وغیرہ) میں مہمل اور نہ سمجھ میں آنے والی کلام کہے تو دراصل ان کی زبانوں پر شیطان بول رہے ہوتے ہیں جیسا کہ وہ مصروع کی زبان پر بھی بولتے ہیں

جس نے کہا (پہلے اس قول کے قائل کا نام ذکر ہوا) اللہ نے ان لوگوں کو عقول اور احوال عطا کئے تھے تو ان کے احوال

باقی رکھے اوران کی عقول لے گیا اور جوان پر فرض کیا تھا اسے جوان سے سلب کرلیا، کی رو سے ساقط کردیا تو کہا جائے گا آپ کی بات کہ اللہ نے انہیں احوال عطا کیے مجمل کلام ہے تو احوال دوطرح کے ہوتے ہیں: رحمانی احوال اور شیطانی احوال! جوان حضرات کے لئے از روئے مکاشفہ اورتصرفِ عجیب خرقِ عادت ہے تو کبھی یہ اس کی جنس سے ہوگا جو کاہنوں اور جادوگروں کے لئے ہوتا ہے اور کبھی یہ سب رحمان کی جانب سے ہوگا، اس کی جنس سے جو اہلِ تقویٰ وایمان والوں کیلئے حاصل ہوتا ہے تو اگر ان کے لئے حالتِ شعور میں ایمانی مواہب تھے اور یہ مومن متقی تھے تو بلا شبہ جب ان کی عقل زائل ہوئی تو یہ فرائض بوجہ سلبِ عقل ساقط ہو گئے اور اگر یہ شیطانی احوال ہیں جیسے اہلِ شرک، اہلِ کتاب اور اہلِ نفاق کو بھی دئے جاتے ہیں تو ایسے جب زوالِ شعور وعقل کا شکار ہوں تو جس حالتِ کفر و فسق پر قبل ازیں تھے اس سے خارج نہ ہوں گے بلکہ اسی پر باور کئے جائیں گے جیسے سابق الذکر اسی حالتِ ایمانی پر برقرار باور کئے گئے جس پر وہ اس حالت کے طاری ہونے سے قبل تھے جیسے دونوں گروہوں میں سے کسی کی نیند، وفات یا غشی طاری ہونے سے سابقہ حالت کالعدم اور زائل نہیں ہوجاتی، اس کی غایت یہ ہے کہ اب یہ شرعی لحاظ سے مکلّف نہیں رہے اور مرفوع القلم بنے

اور رفعِ قلم موجبِ تعریف وثواب نہیں اور اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ اب سے ولایت کا درجہ مل گیا یا اللہ کے اولیاء کو عطا شدہ مواہب میں سے کوئی موہبت مل گئی اور نہ ان کی کرامات میں سے کوئی کرامت بلکہ (زیادہ سے زیادہ) یہ ہوا کہ اس سے قلم مرفوع ہوا جیسے سوئے ہوئے شخص اور میت سے اور بے ہوشی طاری ہونے کی وجہ سے قلم مرفوع ہوجاتا ہے تو نہ اس میں مدح کا کوئی پہلو ہے اور نہ ذم کا بلکہ سویا شخص حال میں ان حضرات سے بہتر ہے، اسی لئے انبیاء کرام کو نیند تو آتی تھی مگر ان میں سے کسی پر بھی دیوانگی کی حالت طاری نہیں ہوئی اور نہ کوئی مولّہ بنا، نبی اکرم کی نسبت نیند اور اغماء جائز اور ممکن تھا مگر جنون آپ پر جائز نہ ہوا، ہمارے نبی کی آنکھیں سوتی تھیں اور دل نہیں سوتا تھا، مرض الموت میں آپ پر غشی بھی طاری ہوئی اور جہاں تک جنون تو اللہ نے اپنے انبیاء کو اس سے محفوظ رکھا ہے کیونکہ یہ بہت بڑا نقص ہے کیونکہ انسان کا کمال عقل کے ساتھ ہے لہذا اللہ نے ہر طریق کے ساتھ عقل کا ازالہ کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور ان اشیاء کو بھی جو زوالِ عقل کا ذریعہ بنیں مثلاً شراب نوشی، تو اس کا ایک قطرہ بھی پینا حرام کیا حالانکہ ایک قطرے سے تو نشہ طاری نہیں ہو تا لہذا زوالِ عقل (جو کہ نقص ہے) اللہ کی ولایت یا اس کا مقرب بننے کا سبب یا شرط کیونکر ہوسکتی ہے؟ جیسے اہلِ ضلال کے کثیر لوگ سمجھتے ہیں حتیٰ کہ ان کے ایک قائل نے اس ضمن میں یہ اشعار کہے:

هُمْ مَعْشَرٌ حَلُّوا النِّظَامَ وَ خَرَقُوا السِّرَ اجَ فَلَا فَرْضَ لَدَيْهِمْ وَلَا نَفْلٗ

مَجَانِيْنَ اِلَّا اَنَّ سِرَّ جُنُوْنِهِمْ عَزِيْزٌ عَلىٰ اَبْوَابِهِ يَسْجُدُ الْعَقْل

(یہ ایسا گروہ ہیں جنہوں نے نظام خراب کیا اور چراغ پھاڑ دیا ہے اب ان کے ہاں نہ کوئی فرض ہے اور نہ نفل۔ دیوانے مگر ایسے [فرزانے] کہ عقل ان کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہے اوران کی دیوانگی کا راز جاننا بہت مشکل ہے) تو یہ گمراہ کن بلکہ کافر کلام ہے، جب

خیال کیا کہ مجنون کے لئے ایک سر ہے جس کے باب پر عقل سجدہ ریز ہے اور یہ اس رو سے جو بعض مجانین سے ایک نوعِ مکاشفہ یا خرقِ عادت تصرفِ عجیب دیکھا اور یہ اس سبب کہ شیاطین میں سے کوئی اس کے ساتھ مقترن ہوا جیسے جادوگروں اور کاہنوں کا معاملہ ہوتا ہے تو اس سے یہ ضال سمجھا کہ ہر جو مکاشف ہے یا جسے کوئی خرقِ عادت حاصل ہے وہ اللہ کا ولی ہے! جس نے ایسا اعتقاد رکھا وہ نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ یہود و نصاریٰ کے بالا جماع بھی کافر ہے، اہل کتاب تو ایک طرف کثیر کفار و مشرکین کو بھی بعض مکاشفات اور خرقِ عادات کچھ امور حاصل ہیں اور یہ ان کے ساتھ مقترن شیاطین کی وجہ سے، اور انہیں حاصل یہ امور اہلِ کتاب کے ان جیسوں کو حاصل امور سے کئی گنا زیادہ ہیں اور اس کی وجہ یہ کہ آدمی جتنا زیادہ گمراہ اور اکفر ہوگا اتنا ہی شیطان اس سے اقرب ہوگا لیکن ان حضرات کے تمام مکاشفات میں کذب و بہتان کا وجود لازم امر ہے اور ان کے اعمال میں فجور وطغیان لازمی امر ہے جیسے ان کے ہم نفس جادوگروں اور کاہنوں کے لئے بھی، فرمایا:

(هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ) [الشعراء : ۲۲۱۔۲۲۲] (کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں) تو ہر جس پر شیاطین متنزل ہوتے ہیں ضروری ہے کہ اس میں کذب و فجور ہو، چاہے جس بھی قسم سے ہو! نبی اکرم نے خبر دی ہے کہ اللہ کے اولیاء وہ ہیں جو فرائض (اور پھر نوافل) کے ساتھ اس کی طرف متقرب ہوتے ہیں تو جس نے فرائض ونوافل ادا نہ کرنے والوں بارے اپنی عدمِ عقل یا جہل یا کسی اور وجہ سے اعتقاد رکھا کہ وہ اللہ کے ولی ہیں وہ کافر اور دینِ رب العالمین سے مرتد ہے اور جب کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں تو وہ اس میں کاذبین میں سے ہے جن کے بارہ میں کہا گیا:

(اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ) إلى قوله : (فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ)[المنافقون: ۱۔۳] (جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ یقیناً اس کے رسول ہو لیکن اللہ ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔۔۔پس اب یہ سمجھتے ہی نہیں) صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جس نے بغیر عذر کے از رہِ سستی اور ہلکا لیتے ہوئے تین جمعات کو ترک کیا اللہ نے اس کے دل پر مہر لگا دی تو جب اللہ جمعہ کے تارک پر مہر لگا دیتا ہے اگرچہ (بجائے جمعہ کے) وہ ظہر پڑھ لیتا ہو تو اس کا کیا حال ہو جو نہ ظہر پڑھتا ہے اور نہ جمعہ اور نہ کوئی اور فریضہ و نفل؟ نہ وضوء کرے اور نہ غسل تو یہ اگر قبل ازیں مومن بھی تھا اور اس کے دل پر مہر ثبت کر دی گئی تو یہ بوجہ ترکِ واجبات اور انہیں فرائض نہ سمجھنے کے اعتقاد کے کافر و مرتد ہوا، اگر کوئی ایسوں کو مومن سمجھے تو وہ بھی کافر ہوا چہ جائے کہ انہیں اولیاء اللہ قرار دے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی صفت میں کہا:

(اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ) [المجادلة : ۱۹] (شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے اور اللہ کی یاد

ان کو بھلا دی ہے) یعنی (اِسۡتَوۡلٰی) (متسلط ہوا) کہا جاتا ہے :(حَاذَ الۡاِبِلَ حَوۡذاً اِذَا اسۡتَاقَهَا)(یعنی اونٹوں کو ہانکنا) تو جن پر شیطان مستحوِ ذ ہوا تو وہ انہیں اللہ و رسول کے امر کے برخلاف کی طرف ہانکتے ہیں، فرمایا:

(اَلَمۡ تَرَ اَنَّآ اَرۡسَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ تَؤُزُّهُمۡ اَزًّا) [مریم : ۸۳](ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے کہ وہ ان کو بھڑکاتے رہتے ہیں) تو یہ وہ ہیں کہ جن پر شیاطین کا استحواذ ہوا، سنن میں حضرت ابودرداء راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا کسی بستی وغیرہ میں اگر تین مسلمان موجود ہوں اور وہ اذان اور جماعت کا اہتمام نہ کریں تو شیطان ان پر مستحوِذ ہو جاتا ہے تو اگر ایسا نہ کریں تو یہ حزبِ شیطان سے ہوئے نہ کہ اولیائے رحمان سے ! جنہیں اس نے مکرّم کیا تو اگرچہ یہ عباد و زہاد ہوں اور بھوک، بیداری، خاموشی اور خلوت جیسی ریاضتیں کرتے ہوں جیسے بیابانوں، غاروں اور خانقاہوں میں مقیم راہب ہیں جیسے جبلِ لبنان، جبالِ فتح جو کہ باسون ہے اور جبلِ لیسون اور جبلِ قاسیون میں خونی غار والے اور دیگر پہاڑ اور کھائیاں جن کا جہال وضلال رخ کرتے ہیں اور وہاں مذکورہ بالا طرح کی ریاضتیں (اور بزعمِ خود مجاہدے) کرتے ہیں (اور چلے کاٹتے ہیں) لیکن نہ اذان کا اہتمام اور نہ اقامتِ جماعت کرتے ہیں بلکہ ایسی عبادات کے ساتھ متعبد ہوتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے مشروع نہیں کیا جو ان کے اذواق اور مواجید کے بحسب ہیں بغیر اس کے کہ اپنے ان احوال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھیں اور بغیر اس کے کہ رسول اکرم کی متابعت کا قصد کریں جن کی بابت کہا:

(قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰهُ وَ یَغۡفِرۡلَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ) [آل عمران : ۳۱](کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا) تو یہ اہلِ بدعت وضلال اور شیطان کا حزب ہیں نہ کہ اولیائے رحمٰن ہیں تو جو انہیں ولی سمجھے وہ شاہدِ زور اور کاذب اور طریقِ صواب سے ہٹا ہوا ہے

پھر اگر یہ امر معروف ہو کہ یہ رسول کے مخالفین ہیں اس کے باوجود انہیں اللہ کا ولی باور کرے تو دینِ اسلام سے مرتد شمار ہوگا، یا تو رسول کا مکذِب یا آپ کی تعلیمات میں شک اور ارتیاب کا شکار اور یا غیر مطیع بلکہ مخالف، از رہِ جحود یا عناد یا خواہش پرستی کی رو سے اور یہ سب کافر ہیں اور یا پھر رسول کی تعلیمات سے نابلد اور جاہل ہے اور اس کے ساتھ معتقد ہے کہ آپ ظاہری اور باطنی امور میں ہر ایک کی طرف رسول ہیں اور اللہ کی طرف کوئی طریق نہیں مگر آپ کی متابعت کے ساتھ، لیکن ظن کیا کہ یہ بدعی عبادات اور شیطانی حقائق انہی میں سے ہیں جو رسول لے کر آئے اور ان کا شیطان کی جانب سے ہونا اسے معلوم نہ ہوا سنت، شریعت، منہاج، طریقت اور حقیقت سے جہل کی وجہ سے، نہ کہ آپ کی مخالفت کے قصد سے اور وہ آپ کی متابعت کے سوا ہدایت کی امید نہیں رکھتا تو ایسے کے لئے صواب کی تبیین کی جائے اور کتاب وسنت کے احکام ومسائل سے اسے آگہی دی جائے، اگر توبہ وانابت کرے تو ٹھیک وگرنہ سابق الذکر صنف میں ہی شمار ہوگا اور کافر و مرتد قرار پائے گا اور اس کی عبادت و زہادت اسے اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکے گی

جیسے وہ رُہبان، عبادِ صلبان، عبادِ نیران اور عبادِ اوثان بھی اس سے نجات نہ پائیں گے حالانکہ ان سے بکثرت خارقِ عادات اشیاء کا ظہور ہوتا ہے جو شیطانی خوارق اور شیطانی مکاشفات ہیں، فرمایا:

(قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا)[الکھف: ۱۰۳-۱۰۴] (کہہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں) سعد بن ابی وقاص وغیرہ سلف نے کہا کہ اس آیت کا نزول اصحابِ صوامع و دیارات بارے ہوا، حضرت علی وغیرہ بارے مروی ہے کہ وہ اس کا مصداق خوارج ونحوہم اہلِ بدعت وضلال کو بھی قرار دیتے تھے، فرمایا:

(هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ)(ابھی گزری) تو افاک کذاب اور اثیم فاجر ہے جیسے کہا:

(لَنَسْفَعَنْ بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ)[العلق: ۱۵-۱۶] (تو ہم پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ یعنی اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی کے بال) جو بلا علم دین میں کلام کرے وہ کاذب ہے اگرچہ کذب کا وہ متعمد نہ ہو، جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم سے سبیعہ اسلمیہ نے کہا جن کے شوہر سعد بن خولہ حج وداع کے دوران فوت ہو گئے تھے اور وہ تب حمل سے تھیں اور چند ہی دن بعد وضعِ حمل ہو گیا تھا اور ابو سنابل نے ان سے کہا تھا تم نئی شادی نہیں کر سکتی حتی کہ آخر الاجلین نہ گزر رے (یعنی اگر عدت اور وضعِ حمل میں سے جو بعد میں گزرے) انہوں نے آپ سے آکر مسئلہ پوچھا تو فرمایا: (كَذَبَ اَبُو السَّنَابِلِ بَلْ حَلَلْتِ فَانْكِحِيْ) (یعنی کذب کا لفظ غلط کہنے کے معنی میں استعمال کیا، فرمایا بلکہ تم حلال ہو چکی ہو، نیا نکاح کر سکتی ہو) اسی طرح سلمہ بن اکوع نے جب آپ کو بتلایا کہ لوگ کہتے ہیں عامر بن اکوع نے خود اپنے آپ کو قتل کر لیا ہے لہذا ان کے سارے اعمال ضائع ہو چکے تو آپ نے فرمایا: (كَذَبَ مَنْ قَالَهَا اِنَّهٗ لَجَاهِدٌ مُجَاهِدٌ) تو یہ بات کہنے والوں نے تعمدِ کذب نہ کیا تھا، وہ تو صحابہ تھے (لیکن اپنی دانست میں یہی درست سمجھے) اور منقول ہے کہ یہ بات کہنے والے اسید بن حضیر تھے (جو کبار اور اصحابِ فضائل صحابہ میں سے ہیں) لیکن جب بلا علم تکلم کیا تو آپ نے کذب (کے لفظ) کا ان پر اطلاق کیا، ابوبکر، ابن مسعود اور دیگر صحابہ کرام جب اپنے اجتہاد سے کوئی فتوی دیتے یا مسئلہ بتلاتے تو ساتھ ہی کہتے اگر یہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا ہے تو مجھ سے اور شیطان سے ہے اللہ اور رسول اس سے بری ہیں تو جب مجتہد کی خطا مغفور لہ ہے حالانکہ وہ شیطان سے ہے تو اس کا کیا حال ہو جو بلا اجتہاد بات کرے؟ (بلکہ اجتہاد کرنے کا اہل ہی نہ ہو) کیا ایسے کو دین پر بات کرنی چاہئے؟ تو اگر توبہ نہ کی تو اسے عقوبت بھگتنا ہو گی البتہ مجتہد کی خطا جو اگرچہ شیطان سے ہے مگر مغفور لہ ہے (اور یہ حدیث کی رو سے) جیسے احتلام ہو جانا اور بھول

چوک وغیرہ بھی شیطان سے ہے اور مغفور ہے بخلاف اس کے جو بلا اجتہاد کلام کرے تو یہ کاذب اور آثم ہے اگر چہ نیک اور حسنات والا آدمی ہو، شیطان ہر انسان پر نازل ہوتا اور اس کے قلب و دماغ میں فاسد اور غلط وسواسات ڈالنے کی سعی کرتا رہتا ہے، اس کا طرد بندے کے اللہ کے لئے اخلاص اور اطاعت کے بحسب ہوتا ہے، فرمایا:

(اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ) [الحجر : ۴۲] (جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں) اللہ کے عابد بندے وہ ہیں جو واجبات و مستحبات کو اس طریقہ پر ادا کریں جس کا نبی اکرم نے حکم دیا اور انہیں مشروع کیا اور جس نے غیر مشروع طریقوں سے عبادت کی وہ شیطان کے عباد سے ہے نہ کہ رحمان کے، فرمایا:

(اَ لَمْ اَعْهَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا اَفَلَمْ تَکُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ) [یٰس : ۶۰۔۶۲] (اے آدم کی اولاد! ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے۔ اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے؟) جو شیطان کی عبادت کرتے ہیں ان کے اکثر تو یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ شیطان کے عابد بنے ہوئے ہیں بلکہ وہ کبھی ظن کرتے ہیں کہ ملائکہ یا صالحین کی عبادت کر رہے ہیں جیسے وہ جن کے ساتھ وہ استغاثہ کرتے اور جنہیں سجدہ کرتے ہیں تو فی الحقیقت وہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں اگر چہ خیال کریں کہ اللہ کے صالح بندوں کے ساتھ وہ توسل اور استشفاع کر رہے ہیں، فرمایا:

(وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَکْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ) [سبأ : ۴۰۔۴۱] (اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے فرمائے گا کیا یہ لوگ تم کو پوجا کرتے تھے؟۔ وہ کہیں گے تو پاک ہے تو ہی ہمارا دوست ہے نہ یہ بکہ یہ جنات کو پوجا کرتے تھے اور اکثر انہی کو مانتے تھے) اسی لئے نبی اکرم نے سورج کے طلوع اور غروب ہوتے وقت نماز (یعنی نوافل) پڑھنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس وقت شیطان سورج کے مقارن ہوتا ہے تا کہ سورج کے عباد کا سجدہ حقیقت میں اسے ہو اور وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ سورج کو سجدہ کر رہے ہیں، اسی طرح ستاروں کو پکارنے والے جو کسی ستارے کے سامنے ماتھا ٹیکتے، اسے سجدہ کرتے اور اس سے مناجات اور دعا کرتے ہیں اور طعام، لباس، بخور اور تبرکات کی اسے نیاز پیش کرتے ہیں جیسا کہ مولف (اَلسِّرُّ الْمَکْتُوْمُ) مشرقی اور مولف (اَلشُّعْلَةُ النُّوْرَانِیَّةُ) بونی مغربی وغیرہما نے ذکر کیا تو ان پر ارواح نازل ہوتی تھیں جو انہیں مخاطب کرتیں اور بعض غیبی امور کی انہیں خبر دیتیں اور ان کی بعض حاجات کو پورا کر دیتی تھیں، اسے یہ کواکب کی روحانیت قرار دیتے تھے، ان میں سے کئی انہیں ملائکہ خیال کرتے ہیں جبکہ دراصل یہ شیاطین ہیں جو ان پر نازل ہوتے ہیں، فرمایا:

(وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ) [الزخرف : ۳۶] (اور جوکوئی اللہ کی یاد سے آنکھیں بند کر لے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے) اور ذکر رحمٰن وہ جسے اس نے نازل کیا اور یہ کتاب وسنت جن کے بارہ میں کہا:

(وَّاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ) [البقرة : ۲۳۱] (اور اللہ نے تمہیں جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے) فرمایا:

(لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) [آل عمران : ۱۶۴] (اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُن میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک کرتا اور کتاب اور دانائی سکھاتا ہے)

(هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ) [الجمعة : ۲] (وہی تو ہے جس نے بے کتاب قوم میں انہی میں سے رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں) اور یہ ذکر ہے جس کی بابت کہا:

(اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) [الحجر : ۹] (بے شک یہ "ذِکر" ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں) تو جس نے اس ذکر سے اعراض کیا جو کہ کتاب وسنت ہے اس کے لئے شیاطین میں سے ایک قرین (ساتھی) مقیض (مقرر) کر دیا جاتا ہے تو وہ اس کی متابعت کے بحسب شیطان کے اولیاء میں سے ہو جاتا ہے، اگر کبھی رحمٰن اور کبھی شیطان کا موالی ہے تو اسی حساب سے جو اس میں رحمٰن کی موالات ہے اس میں ایمان اور ولایت ہیں اور جس قدر اس میں شیطان کی موالات ہے اسی بقدر اس میں اللہ کی عداوت اور نفاق ہے جیسے حضرت حذیفہ بن یمان کا قول ہے کہ دل چار طرح کے ہیں: اول، قلبِ اجرد (یعنی آلائشوں سے خالی دل) اس میں چراغ آب وتاب سے جل رہا ہے، یہ مومن کا دل ہے! دوم، قلبِ اغلف یہ کافر کا دل ہے، اغلف جس کے گرد غلاف لپٹا ہوا ہے (کہ اب حق کی کوئی بات اس کے اندر سرایت نہیں کر سکتی) جیسے قرآن نے کہا:

(وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ) [البقرة : ۸۸] (اور کہا کہ ہمارے دل پردے میں ہیں! بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے) اور نبی اکرم کی ایک حدیث گزری جس میں تھا جس نے (متواتر) تین جمع چھوڑے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور سوم، قلبِ منکوس یہ منافق کا دل ہے، چہارم، وہ دل جس میں دو مادے ہیں ایک جو ایمان کے لئے اسے بڑھاوا دیتا ہے اور دوسرا جو نفاق کے لئے مددگار ہے تو جو مادہ غالب ہوا سی کے لئے حکم ہوگا، یہ مسند احمد میں مرفوعاً بھی مروی ہے! صحیحین میں عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا چار خصلتیں ہیں جس کسی میں وہ ہوں وہ خالص سرتاپا منافق

ہو گا اور جس میں ایک یا دو خصلتیں ہیں تو اس میں اسی قدر نفاق ہے حتیٰ کہ اسے چھوڑ دے: امین بنایا جائے تو خیانت کرے (یعنی کرپشن کرے اور صحیح طور سے اپنے فرائضِ منصبی ادا نہ کرے) جھوٹ بولنے کا عادی ہو، وعدہ کی خلاف ورزی کرے اور تو تکار میں غلط زبان استعمال کرنے کا خوگر ہو! تو نبی اکرم نے بیان کیا کہ دل میں نفاق کا ایک شعبہ (یا دو یا زیادہ) ہونا بھی ممکن ہے اسی طرح ایمان کا بھی، اسی لئے ایسوں کے ہاتھوں جو خوارق امور ظاہر ہوں وہ اللہ پر ان کے ایمان کی جہت سے بھی ہو سکتے ہیں تب یہ اولیاء کی کرامات سے ہوں گے اور جو خوارق اس کے نفاق کی جہت سے صادر ہوں وہ شیطانی احوال قرار پائیں گے اسی لئے ہمیں حکم دیا گیا کہ ہر رکعت میں کہیں:

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآ لِّيْنُ) مغضوب علیہم وہ ہیں جنہیں حق کا علم ہوا مگر اس کے برخلاف کے عامل بنے جبکہ ضالین وہ جنہوں نے بغیر علم اللہ کی عبادت کی (یعنی غیر شرعی طریقوں سے) تو جس نے اپنے ذوق، ہویٰ اور وجد کی اتباع کی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ کتاب وسنت کے مخالف ہیں وہ مغضوب علیہ ہے اور اگر یہ بات نہیں جانتا تب وہ ضال ہے! ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے۔

قائل کے اس قول بارے سوال ہوا کہ اللہ کی طرف طرق کی تعداد اتنی ہے جتنی خلائق کے انفاس کی تعداد ہے؟ آیا اس کی یہ بات درست ہے؟

جواب: اگر اس سے اس کی مراد کتاب وسنت کے موافق مشروع اعمال ہیں مثلاً نماز، صدقہ، جہاد، ذکر اور تلاوت وغیرہ تو یہ صحیح ہے اور اگر کتاب وسنت کے مخالف کوئی طریق مراد لیا ہے تو یہ باطل ہے۔

شیخ کی ایک تحریر:

الحمد للہ الخ واشہد ان ۔۔الخ

الشیخ ابو محمد عبد القادر (جیلانی) اپنی کتاب (فتوح الغیب) میں رقم طراز ہیں کہ ہر مومن کے لئے اس کے تمام احوال میں تین اشیاء ضروری ہیں:

۱۔امر جس کا امتثال کرے ۲۔نہی جس سے اجتناب کرے ۳۔تقدیر جس پر راضی ہو

تو کم از کم حالت کہ مومن جس سے خالی نہیں ہوسکتا ہے یہ ہے کہ ان تین امور سے اس میں کم از کم ایک تو ہو تو چاہئے کہ اس کے ساتھ اپنے دل کو لازم کرے اور دل میں اس بارے سوچے اور اپنے سب احوال میں اسے اپنے جوارح پر بروئے کار لائے، میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں یہ کلام عمدہ اور جامع ہے ہر ایک اس کا محتاج ہے اور یہ اس کی تفصیل ہے بندہ جس کا محتاج ہے اور یہ اس فرمانِ خداوندی کے مطابق ہے:

(اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف : ۹۰] (جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ

نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئًا) [آل عمران : ۱۲۰] (اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا)

(وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ)[آل عمران : ۱۸۶] (تو اگر صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں) تقویٰ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کو متضمن ہے جبکہ صبر مقدور پر صبر کو تو یہ تینوں چیزیں ان دونوں اصل کی طرف راجع ہیں اور فی الحقیقت یہ تینوں امتثالِ امر کی طرف راجع ہیں اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت، تو حقیقتِ امر یہ ہے کہ ہر بندہ ہر وقت اللہ ورسول کی طاعت کا محتاج ہے یعنی اپنے اوقات میں سے کوئی وقت اس طریقہ سے گزارے جس کا امر ہے! طاعت اللہ کی عبادت کا نام ہے جس کے لئے اس نے جن وانس کو پیدا کیا ہے جیسے کہا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) [الذاریات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں)

(وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ) [الحجر : ۹۸] (اور اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ موت آ جائے)

(یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ) [البقرة : ۲۱] (اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم متقی بنو) تمام رسل نے اپنی اپنی قوم کو حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، فرمایا:

(وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) [النحل : ۳۶] (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں سے اجتناب کرو)

(وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ) [الزخرف : ۴۵] (اور جو اپنے رسل ہم نے تم سے پہلے بھیجے ہیں ان سے دریافت کر لو کیا ہم نے الرحمٰن کے سوا اَور معبود بنائے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے؟) جب تینوں ان امور کا مرجع امتثالِ امر ہے کیونکہ جس وقت فرائض میں سے جس فعل کے کرنے کا حکم ہو مثلاً نمازِ پنجگانہ، حج اور رمضان کے روزے) وغیرہ تو بندہ اس مامور کے فعل کا محتاج ہے اور جس وقت میں معصیت کے اسباب حادث ہوں تو اسے ضرورت ہے کہ ان سے باز رہے اور اسے یہ برا لگے اور یہ اس وقت میں شرعی امر ہو گا جس کا یہ امتثال کر رہا ہے لیکن ایسا شخص جس کے دل میں معصیت بارے کوئی کھٹک نہ ہوئی تو اس نے ایسا فعل نہیں کیا جس پر اسے اجر ملے البتہ ملوث ہونے سے بچنا عقوبت سے اس کی سلامتی کا ضامن بنے گا، محض جاری عدم غیر مامور بہ ہے، مامور تو وہ امر ہے جس پر بندہ قادر ہو اور یہ نہ ہو گا مگر حادث

چاہے یہ ایجادِ امر کا احداث ہو یا اس کے اعدام کا، اور جہاں تک تقدیر جس پر یہ راضی ہو تو جب کسی مرض یا فقر یا خوف میں یہ مبتلا ہو تو اسے حکم ہے کہ صبر کرے، یہ امرِ ایجاب ہے اور انسان کو رضا بتقدیر کا امر ہے یا تو امرِ ایجاب یا امرِ استحباب، ہمارے اصحاب وغیرہم کے علماء کے اس بابت دو اقوال ہیں، مصائب پر نفسِ رضا وصبر اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہے تو یہ (بھی اصل میں) امتثالِ امر ہی ہے جو کہ اللہ کی عبادت ہے اگر چہ عند الاطلاق یہ تینوں امتثالِ امر میں داخل ہیں لیکن تفصیل اور اقتران کے وقت یا تو انہیں خاص بالذکر کیا جائے گا اور یا کہا جائے گا اس سے وہ کچھ مراد ہے جو اس سے مراد نہیں جیسے اس آیت میں:

(فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [هود : ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو)

(فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ) [طٰه : ۱۴] (پس میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو) تو یہ بھی عبادت میں داخل ہے جب اسمِ عبادت کا مطلقاً ذکر ہو اور اقتران کے وقت، یا تو کہا جائے گا ان کا ذکر عموماً اور خصوصاً ہے اور یا کہا جائے گا کہ خصوصاً اس کا ذکر اس کے عام میں دخول سے مغنی ہے اور اس کا مثل یہ قولہ: **(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الخ)** اور:

(وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا) [المزمل : ۸۔۹] (اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، س کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ) کبھی کہا جا سکتا ہے کہ تبتیل ان معطوف امور کو شامل نہیں جس طرح عبادت اور طاعت کا لفظ انہیں شامل ہے اور بالجملہ فرق ہے اس کے مابین جس کا انسان کو ابتداءً امر ہو اور اس کے مابین جس کا اسے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کی طرف اس کی حاجت کے وقت ہو یا کسی شئ کی حب اور بغض کے وقت، شیخ قدّس اللہ رُوحہ کی کلام اسی قطب پر دائر ہے اور وہ یہ کہ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کرے اور ان کے ماسوا میں ارادہ سے خالی ہوتا کہ اس کے لئے کوئی مراد نہ ہو بجز اس کے فعل کے جس کا اللہ نے امر دیا اور جس کا بندے کو امر نہیں دیا بلکہ رب عزوجل نے اسے عبد کے واسطہ کے بغیر کیا یا بندوں کے ذریعہ، بلا اس کی چاہت کے تو یہ تقدیر ہے اور بندے پر لازم ہے کہ اس پر راضی ہو، شیخ کی کلام سے ہی اس کی مراد کی تبیین ہوتی ہے اور یہ کہ بندے پر ہر حال میں ضروری ہے کہ مامور کا فعل اور منہی عنہ کا ترک کرے لیکن اگر کوئی ایسا کام ہو گیا جس کا بندے کو مامور سے تعلق نہیں تو رب جو بھی کرے ہمارے ذمہ سرِ تسلیم خم کرنا ہے، یہی شیخ اور ان کے امثال کی حقیقت ہے، اس مقام میں حقیقتِ شرعیہ کی تفصیل یہ ہے کہ دو انواع ہیں: ایک کہ بندہ مامور ہے ان میں جو رب کرے کہ یا تو اس سے حب اور اس پر اعانت کا اور یا اس سے بغض اور اس کے دفع کا، دوم کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بندہ مامور نہیں

تو اول مثلاً برّ وتقویٰ جسے اس کا غیر کرے تو وہ اس کی حب اور اس پر اس کی اعانت کرنے کا مامور ہے جیسے جہاد پر اللہ کی راہ کے مجاہدین کی اعانت اور دیگر افعالِ حسنات پر ان کے فاعلین سے حسبِ امکان تعاون کرنے کا اور ان اچھے کاموں سے

محبت کرنے اور ان پر رضا کا، اسی طرح کسی غیر پر مصیبت کے وقت وہ مامور ہے یا تو مظلوم کی مدد کرنے کا، یا مصیبت زدہ سے تعزیت (یعنی اسے تسلی اور دلاسہ دینے) کا اور یا محتاج وفقیر کی دادرسی وغیرہ کرنے کا، جہاں تک وہ کہ جس کے بغض اور دفع کا وہ مامور ہے تو مثلاً جب کوئی کفر، فسوق اور عصیان کا اظہار کرے تو وہ اس سے بغض کرنے اور حسبِ استطاعت اس کے دفع کرنے اور انکار کا مامور ہے جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو تم میں سے برائی کو دیکھے وہ اپنے ہاتھ سے اسے روکے، اگر اس کی طاقت نہیں تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی طاقت نہیں تو اپنے دل سے (اسے برا جانے) اور یہ اضعف الایمان ہے! جہاں تک وہ جن کی بابت وہ ان دونوں میں سے کسی کا مامور نہیں تو مثلاً جو کوئی ایسے مباح افعال پر اقدام کرے جن کا نہ طاعت سے تعلق ہے اور نہ معصیت سے تو اب نہ وہ ان سے حب اور نہ بغض کا مامور ہے، اسی طرح اس کے اپنے مباحاتِ محضہ وہ جن کے ساتھ نہ طاعت اور نہ معصیت پر استعانت کا وہ قصد کرے البتہ یہ اس سے نقص ضرور ہے کیونکہ مباحات میں سے وہی کچھ کرنا چاہئے (یعنی اولی یہی ہے) کہ جو طاعت پر مددگار ثابت ہوں اور یہی اس کا قصد ہونا چاہیے تو یہ مقربین سابقین کا سبیل ہے جو فرائض کے بعد نوافل کے ذریعہ تقربِ الٰہی کے جویا ہوتے ہیں اور (جیسا کہ حدیث گزری) وہ مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں حتی کہ مقامِ محبوبیت پر فائز ہو جاتے ہیں پھر رب تعالی ان کی سمع، بصر اور ید وقدم بن جاتا ہے۔۔الخ (کہ ان کا کوئی کام بھی اس کی رضا کے خلاف نہیں ہوتا) لیکن جو غفلت کے ساتھ مباحات کا فعل کرے یا فضول مباح کوئی کام کرے جو ظاہراً اور باطناً ادائے فرائض اور اجتنابِ محارم پر بقصدِ استعانت نہیں تو یہ مقتصدین اصحابِ یمین کی روش اور ان کا طریق ہے

بالجملہ وہ افعال جن کا امر و نہی کے تحت دخول ممکن ہے اور جو ہر وجہ سے باہم مستوی نہیں ہوتے بلکہ اگر علی الوجہ المحبوب کیے جائیں تو اس کا وجود بندے کے لئے خیر ہے وگرنہ ان کا ترک ہی بہتر ہے البتہ کرنے پر وہ سزاوارِ عقاب نہ ہوگا، تو فضول المباح جو طاعت پر مددگار نہ ہوں تو ان کا عدم تب ان کے وجود سے بہتر ہے کہ اگر وہ یہ کام نہ کرے تو اس وقت میں اللہ کی طاعت میں مشغول ہوتو اس مباح لیکن فضول نے (گویا) طاعت کے کام سے اسے مشغول کر لیا لیکن اگر بالفرض انہوں نے غیرِ طاعت افعال سے اسے مشغول کیا اور روک رکھا ہے تب یہ دیگر کی نسبت اس کے لئے بہتر ہیں اور اگر اللہ کی معصیت سے روک رکھا تو یہ اس کے حق میں رحمت ہیں اگرچہ ان دونوں قسم کے مباح افعال سے اللہ کی طاعت کے ساتھ اشتغال بہتر ہے اسی طرح غفلت اور شہوت کے افعال کہ جن کے ساتھ طاعت پر استعانت ممکن ہے مثلا سو جانا کہ جس کے ساتھ قصدِ عبادت پر استعانت ہو (کہ تازہ دم ہو کر اٹھوں گا اور تہجد پڑھوں گا یا فجر کی نماز جماعت کے ساتھ) مثلا اکل وشرب، لباس اور مباشرت وغیرہ جن کے ساتھ عبادت پر استعانت ممکن ہے لیکن ان کے کرنے سے اگر ایسا کوئی قصد نہ کیا جائے تو یہ بندے کا نقص اور حسنہ کا فوات ہے اور اس خیر کا جو اللہ کو پسند ہے، صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے حضرت سعد (بن ابو وقاص) سے کہا تم کوئی ایسا خرچ نہ کرو گے کہ جس کے

ساتھ اللہ کی رضا کا قصد کرو مگر اس کی رو سے درجہ بڑھے گا حتی کہ وہ لقمہ بھی جو تم اپنی بیوی (اور دیگر اہل وعیال) کے منہ میں رکھو، صحیح کی ایک حدیث میں ہے کہ آدمی کا بقصدِ ثواب اپنے اہلِ خانہ پر خرچ کرنا صدقہ ہے تو مباحات میں سے جن کی اسے ضرورت نہیں یا ضرورت تو ہے لیکن ایمان کا اسے حصہ نہیں کیا کہ اس طرح وہ حسنہ بن جائے تو ان کا عدم ان کے وجود سے بہتر ہے جب وہ ان کے عدم کی صورت میں ان افعال میں مشغول ہوسکتا ہے جو ان سے بہتر ہیں، نبی اکرم نے فرمایا تمہارا اپنی بیوی سے جماع کرنا بھی صدقہ ہے، پوچھا یا رسول ہمارا کوئی تو اپنی شہوت پوری کرے اور یہ اس کے لئے صدقہ بن جائے؟ فرمایا کیا خیال ہے اگر یہ کام وہ حرام طریقہ سے کرے تو اس پر گناہ لازم نہ آئے گا؟ عرض کی کیوں نہیں، فرمایا تو اسی طرح جب حلال طریقہ سے کرے تو ثواب ملنا چاہیے، تم کیوں حرام تو شمار کرو اور حلال نہ کرو؟

اس لیے کہ بندہِ مومن شہوتِ جماع پوری کرنے سے اس بات کا قصد کرتا ہوتا ہے کہ حرام کاری سے بچ جائے اور یہ فعلِ مباح اس نیت سے کرتا ہے کہ اللہ نے اسے مباح کیا ہے اور اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول نہ کیا جائے جیسے یہ امر اسے ناپسند ہے کہ اس کے ناپسندیدہ کاموں کو اختیار کیا جائے جیسا کہ امام احمد نے مسند میں اور دیگر نے اسے نقل کیا اسی لئے اللہ کو (حالتِ سفر میں) قصر (نماز) ادا کرنا اور (رمضان کے) روزے چھوڑ نا پسند ہے تو مومن کا رہبانیت، تشدید اور تعذیبِ نفس سے اجتناب حسنات سے ہے جس پر اللہ ثواب دے گا کیونکہ یہ امور اسے ناپسند ہیں اور اپنی عطا کردہ رخصتیں اسے پسند ہیں، اگر فعلِ مباح کے ساتھ نیکی اور عبادت پر تقویت و استعانت کا قصد مقترن ہوجائے تو یہ فعلِ مباح بھی اللہ کی طاعت شمار ہوگا کیونکہ اعمال کا مدار نیات پر ہے اور ہر ایک کے لئے وہی جس کی اس نے نیت کی، نیز بندہ ضروری مباحات کے فعل کا مامور ہے، اسے حکم ہے کہ بھوک لگے تو کھانا کھائے اور پیاس لگے تو پانی پئے اسی لیے اضطراری حالت میں مردار کھانا لینا واجب ہے (یعنی بجائے اس کے کہ بھوک سے جان چلی جائے) اگر نہ کھایا اور جان چلی گئی تو وہ وعید کا مستوجب بنے گا جیسا کہ یہ ائمہ اربعہ وغیرہم کے اصحاب جماہیر علماء کا قول ہے، اسی طرح جب شہوت ہوتو وطی کرنے کا وہ مامور ہے بلکہ اس سے قبل شادی کرنے کا جب اس پر قادر ہو اور اس کی اسے ضرورت بھی ہوتو نبی اکرم کے فرمانِ مذکور کہ تمہارا جماع کرنا بھی صدقہ ہے کی حکمت یہی ہے کہ اسے اور اس کی بیوی کو اس کی حاجت ہے تو ضرورت وحاجت کو مباح طریقہ سے پورا کرنا صدقہ ہے

سلوک دو طرح کے ہیں: ایک، سلوکِ ابرار جو اہلِ یمین ہیں اور یہ ظاہری اور باطنی ادائے واجبات اور ترکِ محرمات، دوم، مقربین سابقین کا سلوک اور یہ حسبِ امکان واجبات کے ساتھ ساتھ مستحبات کا بھی فعل اور محرمات کے ساتھ ساتھ مکروہات (اور خلافِ اَولی) کا بھی ترک جیسے ایک حدیث میں ہے آپ نے فرمایا جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو بقدرِ استطاعت اسے بجالایا کرو اور جب کسی شئ سے منع کروں تو (اس سے کلی) اجتناب کرو، کبار شیوخ مثلا الشیخ عبدالقادر (جیلانی) وغیرہ کی کلام

اس سلوک کی طرف اشارت کناں ہے اسی لئے وہ مستحب کا بھی حکم دیتے تھے جو غیر واجب ہے اور اس مکروہ سے بھی منع کرتے تھے جو غیر محرم ہے تو وہ خواص پر خاصہ کا مسلک لاگو کرتے تھے اور عوام پر عامہ کا، خواص کا طریق مقربین کا طریق ہے کہ انسان بس وہی کام کرے جن کا وہ مامور ہے اور ارادہ نہ کرے مگر اسی کا جس کا اللہ و رسول نے ارادہ کیا اور یہ جو اللہ کو محبوب اور اس کے ہاں وہ پسندیدہ ہے اور ان کا وہ دینی شرعی ارادہ کرے وگرنہ تو خلقاً اور تکویناً سبھی حوادث ہی مراد ہیں، مطلقاً خلقی قدری ارادہ کے ساتھ وقوف عقلاً غیر مقدور ہے (یعنی کسی کے بس میں نہیں) اور شرعاً یہ مامور بھی نہیں اس لیے کہ حوادث میں سے بعض ایسے ہیں جن کا دفع کرنا واجب ہے اور ان کا مرید ہونا جائز نہیں جیسے کوئی کسی شخص یا اس کے اہل کی تکفیر کا ارادہ کرے یا اس کے یا اس کے اہل کے ساتھ فجور کا یا نبی کے قتل کا اور وہ اس کے دفع پر قادر ہے یا خلقِ خدا کو گمراہ کرنے اور ان کے دین و دنیا کے اِفساد کا تو ان امور کا دفع (یعنی روکنا) اور ان سے کراہت کرنا واجب ہے، ان کا صاحبِ ارادہ ہونا جائز نہیں

اور جہاں تک عقلاً امتناع تو اس لیے کہ انسان کی جبلت میں اپنے لئے ملائم (سازگار و مناسب) سے محبت اور اس سے بغض ہے جو اس کے نفس کا منافر ہے، بھوک کے وقت جبلی طور سے اسے وہ کچھ پسند ہے جو اس کی بھوک کا مداوا کرے مثلا طعام اور تب اسے وہ پسند نہ ہوگا جو اس کی اس غرض کو پورا نہ کرے مثلا مٹی لہذا ممکن نہیں کہ ان دونوں کے لئے اس کی ارادت ایک برابر ہو، اسی طرح وہ ایمان اور اپنے لئے نافع عملِ صالح کو پسند اور اپنے لئے ضار کفر و فسق کو ناپسند کرتا ہے بلکہ اللہ کو اور اس کی وحدہ عبادت کرنے کو پسند اور اس کے ماسوا کی عبادت کو ناپسند کرتا ہے جیسے حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا:

(اَفَرَءَ يْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُ كُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ) [الشعراء : ۷۵۔۷۷] (کہ تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو؟۔ تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی۔ وہ میرے دشمن ہیں لیکن اللہ رب العالمین) اور اللہ نے کہا:

(قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ) [الممتحنة : ۴] (تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے رفقاء میں اسوہ حسنہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں تمہارے قائل نہیں اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ) اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم حضرت ابراہیم اور ان کے ہمراہیوں کا اسوہ اختیار کریں جب انہوں نے مشرکین سے اور ان سے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے براءت کا اظہار کیا حضرت خلیل نے کہا تھا:

(وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ) [الزخرف :

۲۶۔۲۷](اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھے سیدھا راستہ دکھائے گا) براءت ضدِ ولایت ہے،اصلِ براءت بغض اور اصلِ ولایت حب ہے اور یہ اس لیے کہ حقیقتِ توحید یہ ہے کہ محبت نہ کرے مگر اللہ سے اور اس سے جو اللہ کو محبوب ہے،اور یہ کہ اس کی محبت اور اس کا بغض اللہ کی ہی خاطر ہو،فرمایا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة : ۱۶۵](اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اللہ کی خاطر اور اللہ کے ساتھ محبت کرنے کے مابین فرق ثابت ہے تو اہلِ توحید و اخلاص غیر اللہ سے اللہ کی خاطر محبت کرتے ہیں جبکہ مشرکین اللہ کے ساتھ ساتھ غیر اللہ سے (بھی) محبت کرتے ہیں جیسے مشرکین کی (اللہ کے ساتھ ساتھ) اپنے آلہہ،نصاریٰ کی حضرت مسیح اور اہلِ اہواء کی اپنے رؤساء سے محبت تو جب یہ معروف ہوا کہ آدمی کی فطرت میں اپنے لئے نافع سے محبت اور ضار سے نفرت وبغض ہے تو ممکن نہیں کہ تمام فطری وخلقی حوادث کے لیے اس کی ارادت ایک جیسی ہو اور نہ وہ شرع کی جہت سے مامور ہے کہ تمام حوادث کا مرید ہو بلکہ اللہ نے اسے حکم دیا ہے کہ کئی امور کی ارادت کرے اور کئی سے نفور وکراہت کرے !رسل صلوات اللہ علیہم وسلامہ اسی فطرت کی تکمیل وتثبیت کے لیے مبعوث کیے گئے نہ کہ اس کی تحویل وتغییر کے لئے، نبی اکرم نے فرمایا ہر نومولود فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے تو اس کے والدین اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں کہ یہودی،عیسائی اور مجوسی (وغیرہ) بنا لیتے ہیں،فرمایا:

(فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) [الروم : ۳۰](پس تم ایک طرف کے ہو کر دین پر سیدھا منہ کئے چلے جاؤ،اللہ کی فطرت کو جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) ایک صحیح حدیثِ قدسی میں ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو حنفاء (یعنی دینِ فطرت،اللہ کی وحدانیت پر) پیدا کیا تو شیاطین نے ان پر تسلط جما لیا اور جن امور کو میں نے حلال کیا تھا انہیں انہوں نے ان پر حرام کر دیا اور انہیں شرک پر لگا دیا،حنیفیت اللہ کے لئے اخلاصِ دین کے ساتھ استقامت کا نام ہے اور یہ اللہ سے حب اور اس کے لئے ذُل کو متضمن ہے کہ نہ حب میں کسی شئ کو اس کا شریک بنائے اور نہ ذل میں تو عبادت غایتِ حب اور غایتِ ذل کو متضمن ہے اور اس کا مستحق اللہ وحدہ ہی ہے،اسی طرح خشیت اورتقویٰ بھی اللہ وحدہ کے لئے ہو اور توکل بھی اسی ایک پر، رسول کی طاعت کی جاتی ہے اور ان سے محبت تو حلال وہی جو اس نے حلال کیا اور حرام وہی جسے اس نے حرام ٹھہرایا اور دین وہی جسے اس نے مشروع کیا،فرمایا:

(وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ) [النور: ۵۲] (اور جو شخص اللہ اور اس کے

رسول کی فرمانبرداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں)

(وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ)[التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ہمیں دے دیں گے اور ہمیں تو اللہ ہی کی خواہش ہے) اور یہ ہے دینِ اسلام کی حقیقت ! رسل کو اسی کے ساتھ مبعوث کیا گیا جیسے کہا:

(شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ) [الشوری : ۱۳] (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا) اور کہا:

(يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ [المؤمنون : ۵۱- ۵۲] (اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو جو عمل تم کرتے ہو میں ان سے واقف ہوں- اور یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرو) تو یہ وہ اصل ہے جس کے ساتھ تمسک اور اعتصام ہر ایک پر واجب ہے تو لازم ہے کہ انسان اس کا مرید ومحبّ ہو جس کی ارادت اور حب کا اللہ نے امر دیا اور اس کے لئے کارِہ اور مبغض ہو اللہ نے جس سے کراہت اور بغض کرنے کا حکم دیا، لوگ اس باب میں چار انواع ہیں، ان میں سے اکمل وہ جو انہیں پسند کریں جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہیں اور ان سے بغض کریں جو انہیں مبغوض ہوں، ان کے مرید بنیں جن کی اللہ اور اس کے رسول نے ارادت کا حکم دیا اور ہر وہ کام انہیں مکروہ ہو اللہ اور اس کے رسول نے جسے مکروہ سمجھنے کا حکم دیا ہے، اس کے غیر کے لئے نہ ان کے پاس محبت کا جذبہ ہو اور نہ بغض کا تو اللہ و رسول کے ماموراتہی کا حکم دیں، یہ اللہ کے دونوں خلیلوں: افضل البریہ حضرت محمد اور حضرت ابراہیم کا حال تھا، صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ نے حضرت ابراہیم کی طرح مجھے بھی اپنا خلیل بنا لیا ہے، ایک اور صحیح حدیث میں ہے بخدا میں اپنی طرف سے نہ کسی کو عطا کرتا ہو اور نہ محروم، میں تو قاسم ہوں، وہی کرتا ہوں جو اللہ مجھے حکم دے، ایک دفعہ ذکر کیا کہ اللہ نے مجھے کو اختیار دیا کہ بادشاہ نبی بننا پسند کروں جیسے حضرات داؤد وسلیمان تھے یا عبد رسول، تو آپ نے عبد رسول ہونا اختیار کیا، اللہ نے حضرت سلیمان سے کہا تھا:

(هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ)[ص : ۳۹] (یہ ہماری عطا ہے، احسان کرو یا روک رکھو، کچھ حساب نہیں ہے) مفسرین کہتے ہیں اس کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو ہم کوئی محاسبہ نہ کریں گے تو

بادشاہ نبی اپنے ارادہ کے بحسب عطا کرتا ہے اس پر ان کا معاقبہ نہیں ہوتا تھا جیسے کوئی اپنے ارادہ سے فعلِ مباحات کر لے لیکن جو عبد رسول ہیں تو وہ اپنے رب کے حکم کے تحت ہی عطاء اور منع کرتے رہے اور یہ محبت و رضا اور دینی ارادہ ہے، سابقین مقربین عبد رسول کے اتباع جبکہ مقتصدین اہلِ یمین بادشاہ نبی کے اتباع ہیں، انسان کبھی اپنے بعض احوال میں دونوں طرح کے ارادوں سے خالی ہوتا ہے، دینی ارادہ سے بھی جس کا وہ مامور ہے اور نفسانی (ذاتی) ارادہ سے بھی، چاہے وہ اس سے منہی ہو یا نہ ہو بلکہ امرِ واقع ہی اس کے لئے ہوتا ہے اور جو اس کی نسبت ہو وہ اس کے لئے مراد ہوگا بغیر اس کے کہ وہ اس میں شرعاً مامور بہ کا فعل کرے اور یہ اس کے بمنزلہ جس کے لئے اموال ہیں جنہیں وہ عطا کرتا ہے اور اس کے لئے کسی معین کے اعطاء میں کوئی ارادہ نہیں، نہ شرعی ارادہ اور نہ مذموم ارادہ بلکہ وہ سبھی کو دیتا ہے تو اس کی نسبت اگر فرض کیا جائے کہ وہ حسبِ امکان اپنے ذمہ واجب کا قیام کرتا ہے لیکن اپنے افعال کی تفصیل میں اس پر شرعی ارادہ مخفی ہے تو اس کے فعل پر اس کی نہ ذم کی جائے گی اور نہ مطلقاً مدح کی جائے گی بلکہ عدم ہوئ کی رو سے یہ قابلِ مدح ہے، اگر یہ مامور بہ کی تفصیل جان لے اور اس کا شرعی ارادہ کرے تو اکمل ہوگا بلکہ یہ مع القدرت یا تو واجب ہے اور یا مستحب اور اِس کا حال اُس کے حال سے بہتر ہے جو اپنی ہوئ ونفس کے حکم سے ارادہ کرتا ہے اگرچہ یہ اس کے لئے مباح ہو اور یہ اس سے کمتر ہے جو اپنی ہوئ سے نہیں اور نہ تقدیرِ محض سے بلکہ اپنے رب کے امر کا ارادہ کرتا ہے

تو اس مقام کا مضمون یہ ہے کہ **ملک و مال وغیرہ مباحات کے ضمن میں لوگ تین اقسام پر ہیں**: ایک جو ان میں تصرف نہیں کرتے مگر امرِ شرعی کی رو سے اور یہ ہمارے نبی اکرم کا حال تھا اور ہر عبد رسول کا اور آپ کے متبعین کا، دوم جو ان میں اپنے ارادہ وخواہش - جو حرام نہیں - کی رو سے تصرف کرتے ہیں، یہ بادشاہ نبی اور ابرار اہلِ یمین کا حال ہے اور سوم جو نہ اِس کی اور نہ اُس کی رو سے متصرف ہیں، جہاں تک اول تو اپنے اس کی بابت عدم علم کی وجہ سے اور جہاں تک ثانی تو اس میں اپنے زہد کی وجہ سے بلکہ وہ تقدیرِ محض کے حکم کی رو سے تصرف کرتے ہیں اللہ کے خلقی قدری ارادہ کی اتباع کرتے ہوئے شرعی امری ارادہ کی معرفت کے تعذُّر کے وقت اور یہ جیسے قرعہ اندازی کے ذریعہ کوئی کام کیا جائے جب معلوم شرعی سببِ ترجیح کا علم متعذر ہو اور کبھی یہ اس مقام میں اس الہام کی رو سے تصرف کرتے ہیں جو ان کے قلوب میں واقع ہوتا ہے اور خطاب کی رو سے

الشیخ عبدالقادر - قدس اللہ روحہ - کی کلام زیادہ تر اسی مقام میں واقع ہے تو وہ نفس کے ارادہ و ہوئ میں زہد کا حکم دیتے ہیں تاکہ ارادہ ونفس کے حکم کی رو سے تصرف نہ کیا جائے اور یہ اس کے لئے ابرار اہلِ یمین اور مطلقاً ملوک کے حال سے ارتفاع ہے، جس نے یہ حاصل کر لیا اور شرعی محمدی قرآنی امر کی رو سے تصرف کیا وہ اکمل الخلق ہے لیکن یہ کبھی اس پر مخفی ہوسکتا ہے، بالتفصیل اس کی معرفت کثیر مواضع میں ناممکن یا مشکل ہو جاتی ہے، تم دیکھتے نہیں کہ نبی اکرم نے جب بنی قریظہ کے بارہ میں (ان کے مطالبہ پر)

حضرت سعد بن معاذ کو ثالث مقرر کیا جنہوں نے فیصلہ دیا کہ ان کے لڑنے کے قابل افراد کو قتل کر دیا جائے اور دیگر کو غلام ولونڈی بنا لیا جائے اور ان کے اموال کو غنیمت کرلیا جائے تو آپ نے فرمایا تھا: (لَقَدْ حَكَمْتَ فِيهِمْ بِحُكْمِ اللّٰهِ مِنْ فَوْقِ سَبْعَةِ اَرْقِعَةٍ) (تم نے ان کے بارہ وہ فیصلہ کیا ہے جو ساتوں آسمانوں کے اوپر اللہ کا فیصلہ ہے) اور یہ اس لیے کہ ولی الامر کو قتل و استرقاق اور منّ وفداء کے مابین تخییر دینا تخییرِ شہوت نہیں (یعنی اپنی مرضی وخواہش سے نہیں) بلکہ تخییرِ رائے ومصلحت ہے تو اس پر لازم ہے کہ اصلح کو اختیار کرے تو اگر اسے اختیار کرلیا تو وہ اللہ کے حکم (فیصلہ) کے موافق ہوا وگرنہ نہیں

اور جب یہ امر کثیر اوقات مخفی رہ جاتا ہے تو اس کے مدِ نظر نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث کے مطابق (امرائے لشکر کو) ہدایت جاری فرمائی کہ جب کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور وہ مطالبہ کریں کہ انہیں اللہ کے حکم اور فیصلہ پر اترنے دیا جائے تو ایسا نہ کرو کیونکہ تمہیں کیا علم کہ ان کے بارہ میں اللہ کا حکم کیا ہے لیکن انہیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حکم (یعنی فیصلہ کی شرط) پر آنے کا کہو اور جو امیر ایسا کرے وہ اب اپنے اجتہاد کی رو سے فیصلہ کرے گا تو جب حضرت سعد نے وہ فیصلہ جاری کیا جو اللہ کو زیادہ پسند تھا تو یہ مذکورہ بات کہی کیونکہ آپ کو بحیثیت رسول پتہ چل گیا تھا کہ اللہ کا بھی یہی فیصلہ ہوتا (اگر دشمن کو اس پر اتارا جاتا) اگر (بالفرض) وہ کوئی اور فیصلہ کرتے تو وہ بھی نافذ العمل ہونا تھا اگر چہ فی الباطن وہ حکمِ الٰہی شمار نہ ہوتا تو اس قسم کے حال میں جہاں کسی معین واقع بارے امرِ شرعی متبین نہ ہوتا ہو شیخ عبد القادر اور ان کے امثال شیوخ کبھی امرِ باطن اور الہام کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے ہیں اگر اس کا امکان ہو اور کبھی قدرِ محض کی طرف رجوع کا، جہتِ شرع سے مرجح اسباب کے تعذر کی بناء پر، جیسے شارع نے قرعہ اندازی کو جائز کہا ہے، تو یہ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ مجرد ذاتی ارادہ وہویٰ کی رو سے کوئی فیصلہ نہ کیا جائے کہ یہ یا محرم ہوگا یا مکروہ اور یا پھر ناقص تو یہ اس نہی کے ذیل میں فضول مباحات سے نہی کی مانند ہیں پھر اگر کسی کے لئے شرعی امر متبین ہو تو اس کی ترجیح واجب ہے وگرنہ یا تو وہ باطنی سبب یعنی الہام وذوق کی بناء پر راجح کوئی فیصلہ وفعل کریں اور یا قضاء وقدر سے جو ان کی طرف مضاف نہیں اور جو اس قسم کے احوال میں اللہ سے استخارہ کر نے کو ترجیح دے جیسا کہ نبی اکرم تمام امور میں صحابہ کرام کو استخارہ کرنے کی اس طرح تعلیم دیتے تھے (یعنی دعائے استخارہ سکھلاتے تھے) جیسے قرآن کی کسی سورۃ کی تعلیم دیتے ہوں تو یہ روش نہایت درست ہے اور جیسے کسی ناظر مجتہد کے لئے کسی شرعی مسئلہ کی ادلہ باہم متعارض ہوں تو اب وہ کسی شئی کو ترجیح نہ دے گا بلکہ جو تقدیر کی رو سے ہوا سے ہی مقرر کرے گا اور اس کا انکار نہ کرے گا اور کبھی کسی ایک کو ترجیح دے گا یا تو کسی القاء والہام کی رو سے یا کسی ناصح مشیر کی رائے سے اور یا کسی ایک میں کوئی مصلحت خیال کرتے ہوئے

اور جہاں تک مجرد اختیار کی رو سے ترجیح اس طور کہ اس کی نظر میں ادلہ باہم متکافئ (ایک جیسی) ہیں تو اب مجرد اپنے ارادہ واختیار سے ترجیح دے تو یہ ائمہِ اسلام میں سے کسی کا بھی قول نہیں بلکہ یہ اہلِ کلام کے ایک گروہ کا قول ہے البتہ فقہاء کی ایک جماعت نے عامی مستفتی بارے کہا کہ اسے دو مختلف مفتیوں کے درمیان (کسی بھی ایک کے پاس جانے اور اس کے فتوی کو قبول

کرنے کا) اختیار ہے اور یہ جیسے سالکین کے ایک گروہ کے ہاں شریعت کے دو امور باہم مستوی ہوں تو وہ مجرد اپنے ذوق وارادہ کے ساتھ کسی ایک کو ترجیح دے تو مجرد ارادہ کی رو سے ترجیح جو کسی باطنی اور ظاہری علمی امر کی طرف مستند نہ ہو ائمہِ علم وزہد میں سے کسی کا بھی قول نہیں، ائمہ فقہاء وصوفیہ بھی اس کے قائل نہیں لیکن جس نے مجتہد یا مقلد کے لئے مجرد اس کے اختیار وارادہ کی رو سے مجوز کیا وہ اسی کی نظیر ہے جس نے سالک کے لئے مجرد اپنے ارادہ وذوق کی رو سے ترجیح کو مشروع کیا

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ تقوی کے ساتھ معمور دل جب اپنے ارادہ کی رو سے کسی شئ کو ترجیح دے تو یہ شرعی ترجیح ہوگی اور اس تقدیر پر یہ اس سے نہیں تو جس کے دل پر اس کی ارادت غالب ہوئی جو اللہ کو محبوب ہے اور اس کا بغض جو اسے ناپسند ہے جب وہ کسی معین امر کو جان نہ پائے کہ آیا اللہ کو محبوب ہے یا مکروہ؟ اور اپنے دل کو دیکھے کہ اس کی طرف مائل ہے یا اس سے بدک رہا ہے تو یہی اس کے ہاں وجہِ ترجیح ہوگی، جیسے اسے کوئی ایسا خبر دے جس کا صدق اس کے کذب پر اغلب ہے تو وجوہِ ترجیح کے انسداد کے وقت اس کی خبر کی رو سے ترجیح دلیلِ شرعی کی رو سے ترجیح ہے، تو خلاصہِ کلام یہ ہوا جب ایسا کچھ حاصل ہوا جس کی رو سے گمان کیا جا سکے کہ کوئی دو میں سے ایک امر اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ پسند ہے تو اسے شرعی دلیل کی رو سے ہی ترجیح سمجھا جائے، جنہوں نے علی الاطلاق الہام کے طریق ہونے کا انکار کیا انہوں نے غلطی کی ہے جیسا کہ انہوں نے بھی جو علی الاطلاق اسے شرعی طریق قرار دیتے ہیں لیکن جب سالک ظاہر شرعی ادلہ میں خوب نظر واجتہاد کرے تو ان میں ترجیح نہ دیکھے اور تب یکے از فعلین کی طرف میلان ورجحان ملہم کیا جائے حسنِ قصد اور تقوی کے ساتھ دل کے معمور ہونے کی رو سے تو یہ الہام اس کے حق میں دلیل ہے جو کبھی کثیر ضعیف قیاسات، ضعیف احادیث، ضعیف ظواہر اور ان ضعیف استصحابات سے قوی ہوگا جن کے ساتھ اہلِ مسالک اور فروعی اختلافات اور اصولِ فقہ کے باحثین میں سے کثیر حضرات احتجاج کرتے ہیں، ترمذی میں ابوسعید راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے پھر یہ آیت پڑھی:

(اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِیۡنَ)[الحجر : ۷۵] (بے شک اس میں اہلِ فراست کیلئے نشانی ہے) حضرت عمر کہا کرتے تھے اہلِ اطاعت کی باتوں پر کان لگاؤ کہ ان کے لئے امورِ صادقہ متجلی ہوتے ہیں، صحیح کی حدیثِ قدسی کا ذکر ہوا کہ بندہ فرائض کے بعد نوافل کے ساتھ میرا تقرب پاتا رہتا ہے حتی کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر میں اس کا کان ۔۔ الخ نیز اللہ تعالی نے انسانوں کی فطرت میں حنیفیت رکھی ہے اور یہ بھلائی کی محبت اور برائی سے نفرت تو اگر فطرت کو خراب اور تبدیل نہ کیا جائے تو قلوب حق پر مفطور ہیں تو جب فطرت حقیقتِ ایمان کے ساتھ مقوم اور نورِ قرآن کے ساتھ منور ہے تو سمعی ظاہری ادلہ کے خفی ہونے کی صورت میں اپنے دل کو دیکھے کہ دو میں سے کس امر کی طرف مائل ہے تو یہ اس طرح کے بندہ مومن کے پاس قوی ترین اَمارات میں سے ہے کیونکہ اللہ نے قرآن اور ایمان کی تعلیم دی ہے، فرمایا:

(وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ) [الشوری : ۵۱] (اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر الہام سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہے القا کرے) الآیۃ، پھر کہا:

(وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا) [الشوری : ۵۲] (اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری طرف روح القدس کے ذریعے سے بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نُور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں) جندب بن عبداللہ اور ابن عمر کہا کرتے تھے ہم نے ایمان سیکھا پھر قرآن کا تعلم کیا تو ایمان میں مزداد ہوئے، صحیحین میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا بے شک اللہ نے امانت کو لوگوں کے قلوب کی جڑ میں نازل کیا ہے تو قرآن وسنت سے جانکاری حاصل کرو، ترمذی وغیرہ کی حضرت نواس کے حوالے سے حدیث میں ہے کہ نبی پاک نے فرمایا اللہ نے صراطِ مستقیم کی مثال بیان کی ہے اور اس کے دونوں جانب دو دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور ایک داعی صراط کے سرے پر صدا لگا رہا ہے اور ایک صراط کے اوپر سے صدا دے رہا ہے تو صراطِ مستقیم اسلام ہے، پردے اللہ کی حدود ہیں اور کھلے دروازے اللہ کے محارم ہیں، بندہ جب ارادہ کرتا ہے کہ ان دروازوں میں سے کسی دروازے کو کھولے (تاکہ داخل ہو) تو منادی کہتا ہے اے اللہ کے بندے اسے مت کھولو کہ اگر کھولا تو اس میں داخل ہو جاؤ گے اور جو داعی صراط کے کنارے پر ہے وہ اللہ کی کتاب ہے اور جو صراط کے اوپر ہے وہ ہر مومن کے دل میں اللہ کا واعظ ہے (یعنی اس کا ضمیر)

تو واضح کیا کہ ہر مومن کے دل میں ایک واعظ ہے اور واعظ ترغیب وترہیب کے ساتھ امر اور نہی ہے اور یہ امر ونہی جو مومن کے دل میں واقع ہوتا ہے قرآن کے مطابق ہے اسی لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تقویت حاصل کرتے ہیں جیسے کہا: (نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ)[النور: ۳۵] بعض سلف نے اس آیت کی بابت کہا یہ مومن ہے جو حکمت کے ساتھ ناطق ہوتا ہے اگرچہ اس بارے کوئی اثر نہ سنا ہو، تو اگر اثر بھی سن لے تو یہ نور علی نور ہوا (یعنی سونے پر سہاگہ) ایک ایمان کا نور جو اس کے دل میں ہے اور جو قرآن کے نور کے مطابق ہے جیسا کہ عقلی میزان بھی منزل کتاب کے مطابق ہوتی ہے تو اللہ نے کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ عدل کے ساتھ قائم ہوں، کبھی بندے کو ایک عطا ہوتا ہے دوسرا نہیں، جیسے صحیحین میں ابوموسی اشعری راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا اس مومن کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے لیمون کی سی ہے جس کا ذائقہ بھی عمدہ ہے اور خوشبو بھی اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے جس کا ذائقہ تو خوب ہے مگر خوشبو کوئی نہیں اور وہ منافق جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال پھول کی سی ہے جس کی خوشبو تو عمدہ ہے مگر ذائقہ کڑوا ہے اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن کی سی ہے جس کی نہ کوئی خوشبو

ہے اور اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہے، دل میں الہام کبھی قول وعلم اور ظن واعتقاد کی جنس سے ہوگا اور کبھی عمل وحب اور ارادت وطلب کی جنس ہے، کبھی اس کے دل میں واقع ہوگا کہ یہ قول ارجح، اظہر اور اصوب ہے اور کبھی اس کا دل دو میں سے ایک امر کی طرف مائل ہوگا، صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا سابقہ امتوں میں محدَّث ہوا کرتے تھے اگر میری امت میں بھی ایسے ہیں تو عمر بھی ہیں (یعنی اور بھی ہیں اور حضرت عمران میں ایک سے ہیں) محدث کا مطلب ملہَم اور مخاطَب، اسی طرح حضرت وابصہ کی حدیث میں آپ کا یہ قول کہ نیکی وہ ہے جس پر دل میں اطمینان حاصل ہو اور روحانی مسرت وشادمانی ملے اور گناہ جو تمہارے سینے میں کھٹکے چاہے لوگ تم سے کیا کچھ بھی کہیں، یہ سنن میں ہے، مسلم میں حضرت نواس کے حوالے سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا نیکی حسنِ خلق ہے اور گناہ جو سینے میں کھٹکے اور تمہیں برا لگے کہ لوگوں کو اس کا پتہ چلے، ابن مسعود کا قول ہے کہ گناہ دلوں کو میلا کرنے والا ہے نیز جب کوئی امور کا کبھی ظناً یا یقیناً بندہ مومن کے لئے کشف ہوتا ہے تو دینی امور کا تو بطریقِ اولی یہی معاملہ ہوگا، ان کے کشف کی تو زیادہ ضرورت ہے لیکن فی الغالب لازم ہے کہ یہ کشف دلیل کے ساتھ ہو اور کبھی یہ ایسی دلیل کے ساتھ ہوگا جو مومن کے دل میں کھٹکتی ہے اور اس سے تعبیر کرنا ممکن نہ ہوگا اور یہ استحسان کے معنی کی منجملہ میں سے ایک تفسیر ہے

اس میں بعض طعن کرنے والوں مثلا ابو حامد (غزالی) اور ابو محمد کا قول ہے کہ جس سے تعبیر نہ کیا جا سکے وہ (کشف نہیں بلکہ) ہوس ہے لیکن ایسا نہیں کیونکہ ہر ایک کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دل کے ساتھ قائم معانی کی اِبانت (یعنی کھل کر بیان) کر سکے! کثیر لوگ ان کا ناقص بیان کرتے ہیں، کثیر اہلِ کشف کے دل میں (مثلا) القاء ہوتا ہے کہ یہ طعام حرام (یا مشکوک) ہے یا یہ آدمی کافر یا فاسق ہے بغیر کسی ظاہری دلیل کے اور بالعکس کبھی اس کے دل میں (مثلا) کسی کی محبت کا القاء ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کا ولی ہے یا یہ مال حلال ہے، یہاں مقصود اس امر کا بیان نہیں کہ اکیلا یہی شرعی حکم پر دلیل ہے لیکن یہ کہ اس کا مثل کبھی طالبِ حق کے لئے وجہِ ترجیح بن سکتا ہے جب اس کے ہاں ظاہری سمعی ادلہ باہم ایک جیسی ہوں تو اس کی رو سے دو باہم متناقض امور کے مابین ترجیح قطعاً بہتر ہے کہ دونوں کے مابین تسویہ قطعاً باطل ہے جیسا کہ ہم نے کہا ظاہر یا قیاس سے ناشئ ظن کی رو سے عمل اس کے نقیض کی رو سے عمل سے بہتر ہے جب لامحالہ دونوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا ہو، صواب جس پر سلف اور جمہور تھے یہ کہ لازم ہے کہ ہر حادثہ (یعنی پیش آمدہ مسئلہ) میں شرعی دلیل کا ہونا، تو فی نفس الامر ادلہ کا ہم وزن ہونا جائز نہیں لیکن کبھی ناظر کے نزدیک اس کے لئے عدم ظہورِ ترجیح کے سبب یہ ہم وزن اور ایک جیسی ہو سکتی ہیں اور جو حضرات قائل ہیں کہ نفس الامر میں کوئی معین حق نہیں بلکہ ہر مجتہد مسئلہ میں باطن حق کا عالم ہے اور علم وعمل میں کسی کے لئے دوسرے پر امتیاز حاصل نہیں تو یہ یا ان کے بعض کبھی ادلہ کے ہم وزن ہونے کو مجوز کر سکتے ہیں اور دو اقوال کے مابین تخییر کو واجب قرار دے سکتے ہیں، یہ قائل ہیں کہ فی نفس الامر ظن پر (مبنی) کوئی دلیل نہیں اور دو میں سے ایک قول کا راجح ہونا دراصل (ذاتی) میلان وارادہ کی رو سے رجحان کے باب

سے ہے جیسے غصیلی طبیعت والا انتقام کو اور حلیم الطبع انسان درگزر کرنے کو ترجیح دیتا ہے

یہ قول غلط ہے، تو فی نفس الامر معین حق (کا وجود) ضروری ہے جس تک مستدل کبھی پہنچ پائے اور کبھی نہ پہنچ سکے جیسے کعبہ اس شخص کے حق میں جس پر قبلہ (کی سمت) مشتبہ ہوا اور مجتہد نے اپنے اجتہاد کو بروئے کار لا کر جس بھی جہت کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر لی تو اس سے فرض اب ساقط ہوا اور وہ اس معنی میں مصیب ہے کہ اللہ کے لئے مطیع ہے اور اس پر وہ ماجور ہے مگر بایں معنی مصیب نہیں کہ اس نے معین حق کو جان لیا ہے کہ یہ تو ایک ہی جہت میں ہوگا اور جسے (حقیقت میں) اس کی جہت مل گئی اس کے لئے (حدیثِ نبوی کی رو سے) دو اجر ہیں اور یہ ان انواع کے کشف میں جن پر شرعی دلیل موجود ہو لیکن کبھی یہ انسان پر مخفی رہ سکتی ہے کیونکہ شارع نے احکامِ کلیہ کی تبیین کر دی ہے

اور جہاں تک معین احکام جنہیں تخقیح مناط کا نام دیا جاتا ہے مثلاً شخصِ معین کا عدل یا فاسق یا مومن یا منافق یا اللہ کا ولی یا اس کا دشمن ہونا اور اس معین کا مسلمانوں کا دشمن ہونا، قتل کئے جانے کا مستحق اور اس عقار (جائیداد) کا یتیم یا فقیر کے لئے ہونا کہ مستحقِ احسان ہے اور اس مال کی نسبت ظالم کی زیادتی کا خوف ہونا تو اگر ظالم اس سے بے رغبتی کرے تو اس کے اہل اس کے ساتھ متنفع ہوں تو ضروری نہیں کہ یہ امور شرعی ادلہ عامہ کلیہ کی رو سے جانے جائیں بلکہ ان کا علم ادلہ خاصہ کی رو سے ہوگا جو ان پر دال ہوگی اور اس کے طرق میں سے الہام بھی ہے تو اللہ تعالی اپنے بعض بندوں کو اس مال اور اس شخصِ معین کا حال ملہم کر سکتا ہے اگر چہ وہاں کوئی ظاہری ایسی دلیل نہ ہو جس میں کوئی اور اس کا مشارک ہو، حضرت موسی کا حضرت خضر کے ساتھ قصہ اسی باب سے ہے، اس میں اللہ تعالی کی شرع کی مخالفت نہیں کہ کبھی کسی کے لئے جائز نہیں - نہ کسی نبی اور نہ کسی ولی کے لئے - کہ اللہ کی شرع کی مخالفت کرے لیکن اس میں اس معین کے حال کا کسی باطنی سبب کی رو سے علم ہے جو اس بارے اس شرع کا موجب ہے جو حضرت خضر نے کیا جیسے کوئی کسی گھر میں داخل ہوا اور اس میں موجود مال اپنے قبضہ میں کر لے اس وجہ سے کہ صاحبِ مال نے اسے اس کی اذن دی تھی اور اس اذن کا دوسروں کو علم نہ ہو (تو وہ سمجھیں یہ چوری کر رہا ہے) جیسے کسی نے کوئی گمشدہ چیز اٹھالی اور اس کا پتہ نہ چل سکا (کہ کس کی ہے) تو جانا کہ یہ اللہ کی طرف سے اس کے لئے تحفہ ہے اور نحو ذلک، صحیح الہام کے اہل حضرات کے ہاں اس کا مثل کثیر ہے، دوسری نوع اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں، نہ کہ اللہ کے امر کی اور اسی کا یہ حکم دیتے ہیں اور اگر کسی شئ کا ترک کریں یا کسی بات سے نہی کریں تو بھی اس کا مرجع و مصدر ان کی ہوائے نفس ہوتی ہے تو یہ بدترین مخلوق ہیں، فرمایا:

(اَ فَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً) [الجاثیة : ۲۳] (بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے کے اللہ نے اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا) حسن کہتے ہیں یہ منافق جو کسی شئ سے اس کی ہویٰ

متعلق نہیں ہوتی مگر اسے اختیار کر لیتا ہے،فرمایا:

(وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ) [القصص : ۵۰] (اوراس سے بڑا گمراہ کون ہے جواللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے لگے) عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے ان میں سے نہ ہو جانا کہ جوحق کو تبھی مانیں جب وہ ان کی ہویٰ کے موافق ہو اور اگر اس کے مخالف ہو تو وہ اس کے مخالف ہو جائیں، تمہیں ثواب تبھی ملے گا جب مطلقاً حق کی اتباع کرو اور اگر مخالفت کی تو اس پر عقاب کے حقدار بنو گے، معاملہ یہی ہے جیسے انہوں نے کہا، اس لئے کہ اس کا اصل قصد اپنی ہویٰ کی اتباع ہے، اللہ کی خاطر عمل نہیں کیا، تم دیکھتے نہیں کہ ابوطالب نے (دل و جان سے) نبی اکرم کی حمایت اور نصرت کی اور آپ کا دفاع کیا لیکن یہ سب بوجہ قرابتداری کیا، نہ کہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے لہذا اللہ کے ہاں یہ شرفِ قبولیت نہ پا سکا اور وہ ثواب کے حقدار نہ بنے جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اللہ کی خاطر اپنے نفس و مال سے آپ کی مدد کی تو ان کے بارہ میں ارشاد ہوا:

(وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى) [والليل : ۱۷ ۲۱] (اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس سے بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو۔ اور نہیں اس پر کسی کا احسان جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے رب الاعلیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے۔ اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا) تیسری قسم جو کبھی تو ایسا ارادہ کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے اور کبھی ایسا جو اسے مبغوض ہے! عوام المسلمین کی یہی روش ہے تو یہ طاعت اور معصیت کے درمیان زندگی گزارتے ہیں، چوتھی قسم ان لوگوں کی جو دونوں قسم کے ارادوں سے خالی ہیں تو ان کا ارادہ نہ اللہ کے لئے ہوتا ہے اور نہ ذاتی ہویٰ وخواہش کے لئے، یہ کثیر لوگوں کے لئے بعض اشیاء میں واقع ہوتا ہے اور کثیر زہاد و نساک کے لئے بعض امور میں، جہاں تک انسان کا مطلقاً ہی (کسی بھی طرح کے) ارادہ سے خلو تو یہ ممتنع (یعنی ناممکن) ہے کیونکہ اس کی فطرت و جبلت میں اپنے لئے ضروری چیزوں کی ارادت اور ضار و موذی کی کراہت ہے، زاہد و ناسک اگر مسلمان ہے تو ضروری ہے کہ ان اشیاء کا ارادہ رکھے جو اللہ کو محبوب ہیں مثلاً ادائے فرائض اور ترکِ محارم بلکہ یہ عوام اہلِ ایمان کے لئے بھی لازم امر ہے وگرنہ جس نے اللہ سے محبت نہ کی اور نہ اللہ کی خاطر کسی شئی سے محبت کی تو گویا اس نے طاعات میں سے کسی شئی سے محبت نہ کی، نہ کلمہ سے اور نہ کسی اور سے اور نہ اس کے ہاں ان کی ارادت ہے تو یہ مومن نہیں ہوسکتا تو ہر مومن کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم اللہ کے بعض محبوبات کی اس کے پاس ارادت ہو اور جہاں تک بندے کی اس کے لئے ارادت جو اس کے نفس کو مرغوب ہے اور ان امور کی جو اللہ کو پسند نہیں تو یہ ہر اللہ کے عاصیوں کا خاصہ و لازمہ ہے تو یہ معصیت کی ارادت کا حامل ہے اور یہ اللہ کے ہاں غیر محبوب و غیر مرضی ہے، جہاں تک دونوں طرح کی ارادت سے خلو، محمود سے بھی اور مذموم سے بھی تو یہ دو وجہ پر واقع ہے:

ا۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی طاعت سے اعراض اگرچہ اس بارے اس کے پاس علم ہو، انسان کثیر امور بارے جانتا

ہوتا ہے کہ وہ ان کا مامور ہے مگر ان کی اس میں ارادت نہیں ہوتی اور نہ اسے دوسروں کا نہ کرنا برا لگتا ہے، اگر (بالفرض) مسلمانوں اور کفار کے درمیان معرکہ گرم ہو تو اس کے دل میں یہ ارادت نہ ہوگی کہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہو جو کہ اللہ کو پسند ہے اور نہ ان کفار کی فتح کی ارادت جو کہ اللہ کو مبغوض ہے (بلکہ وہ غیر جانبدار ہے)

۲۔ کثیر زہاد وعباد اللہ کے اوامر ونواہی کا التزام کرتے ہیں اور کچھ اور امور کے جن کی بابت نہیں جانتے کہ یہ مامور بہا اور منہی عنہا ہیں تو یہ بوجہ عدمِ علم ان کی ارادت اور ان کی کراہت نہیں رکھتے اور کبھی اس جہت سے کہ یہ مخلوق ومقدر ہیں ان پر راضی ہیں اور کبھی تو ان پر تعاون بھی کرتے ہیں اور اسے یہ اللہ کے لئے موافقت سمجھتے ہیں اور یہ جب ہوائے نفس سے خالی ہیں تو ہر پیش آمدہ کے ساتھ رضا کے یہ مامور ہیں بلکہ اس پر معاونت کے بھی اور یہی جگہ ہے جہاں غلطی کا وقوع ہو جاتا ہے تو جو کچھ اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے ہمارے ذمہ واجب ہے کہ ہم بھی اسے پسند کریں اور جو انہیں ناپسند ہے ہم بھی اسے ناپسند کریں اور جو امور اللہ و رسول کو نہ محبوب اور نہ مبغوض ہیں مثلاً وہ افعال جو دائرۂ تکلیف میں نہیں جیسے سوئے ہوئے اور مجنون اور نابالغ کے افعال تو اگر اللہ انہیں نہ پسند کرتا ہے اور نہ راضی ہے اور نہ انہیں برا سمجھتا ہے اور نہ ان کی ذم کرتا ہے تو مومن بھی ان کی نسبت یہی روش اختیار کرے گا اور جہاں تک ان کا اللہ کے لئے مخلوق ومقدور ہونا تو یہ انہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ یہ تو تمام مخلوقات کو شامل ہے، اللہ نے مخلوقات کو اپنی مشیت کی رو سے حکمت کے تحت پیدا کیا اور ہر شئ کی خلقت کو عمدہ بنایا ہے، **رضا بالقضاء کی تین انواع ہیں:**

اول، رضا بالطاعات تو یہ مامور بہ طاعت ہے

دوم، رضا بالمصائب یہ بھی مامور بہ ہے یا تو مستحب اور یا واجب

سوم، کفر فسوق اور عصیان تو ان پر راضی ہونا مامور بہ نہیں بلکہ انہیں مبغوض ومسخوط رکھنے کا حکم ہے کہ اللہ کو یہ پسند نہیں اور نہ وہ ان پر راضی ہے جیسے کہا:

(اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَالَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ) [النساء : ۱۰۸] (جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا)

(وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ) [الزمر : ۷] (اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا)

(وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ) [البقرۃ : ۲۰۵] (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا)

(فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ) [آل عمران : ۳۲] (تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا)

(اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ) [البقرۃ : ۱۹۰] (بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) تو اگرچہ اس نے اپنی کسی حکمت کے تحت ان کی تخلیق کی ہے لیکن ممتنع نہیں کہ ایسی مخلوقات خلق کرے جو اسے محبوب نہیں ان کے کسی ایسی حکمت

کی طرف مفضی ہونے کی وجہ سے جو اسے محبوب ہو جیسے اس نے شیاطین کو پیدا کیا ہے تو ہم اللہ سے راضی ہیں اس امر میں کہ جسے چاہے پیدا کرے اور وہ اس پر محمود ہے، جہاں تک خود یہ مذموم فعل اور اس کا فاعل تو ہم اس پر راضی نہیں اور نہ اس کی تعریف کرتے ہیں ،لنفسہٖ محبوب ہونے کے اور جو محبوب کی طرف مفضی ہونے کی رو سے مراد ہو، کے درمیان فرق ہے، اس امر کے باوصف کہ کسی اور جہت سے یہ مبغوض ہوسکتا ہے تو کئی دفعہ امرِ واحد ایک وجہ سے مراد اور کسی اور وجہ سے مکروہ ہوتا ہے اس مریض کی مانند جو نا مرغوب دوا تناول کرتا ہے تو وہ دوا اس کی نظر میں کر یہ و مبغوض ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے استعمال کا مرید ہے محبوب (یعنی صحت یابی) کی طرف اس کے افضاء (یعنی اس کا باعث ہونے) کی وجہ سے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ دوا فی نفسہ محبوب ہے، ایک صحیح حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں کسی شئی میں جسے میں کرنے والا ہوں تردد نہیں کرتا جیسا تردد میں اپنے بندۂ مومن کی روح کے قبض کے وقت کرتا ہوں، اسے مرنا ناگوار لگتا ہے اور مجھے اس کی یہ مساءت بری لگتی ہے اور اس کے لئے اس کے سوا چارہ بھی نہیں

تو وہ سبحانہ جب اپنے مومن بندے کی مساءت کو برا گردانتا ہے جسے مرنا ناگوار لگتا ہے تو یہ اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ اس کی اِماتت کو برا جانے حالانکہ وہ اس کی اِماتت کا مرید ہے اس وجہ سے جو اس میں حکمت مضمر ہے تو جو امور اللہ کو ناپسند ہیں اور وہ ان سے منع کرتا ہے ان سے محبت نہیں کی جاسکتی اور نہ ان پر راضی ہوا جاسکتا ہے لیکن ہماری ان کی نسبت رضا اس جہت سے ہے کہ یہ اللہ کی مخلوق ہیں اس میں مضمر کسی حکمت کے پیشِ نظر تو اسی طرح وہ افعال جو نہ اللہ کو پسند اور نہ مبغوض ہیں ہماری روش یہی ہونی چاہئے، ثابت بالنص رضا یہ ہے کہ اللہ کے رب، اسلام کے دین اور حضرت محمدؐ کے نبی ہونے پر راضی ہوا جائے، صحیح میں ہے آپ نے فرمایا جو اللہ کے رب الخ راضی ہوا اللہ پر حق ہے کہ اب اسے بھی راضی کرے اور جہاں تک تقدیر کا معاملہ تو انسان کو اللہ سے ہر حال میں راضی ہونا چاہیے کہ ہر حال میں اس کے لئے حمد ہے اور اس حکمت پر راضی ہو جس کی رو سے تخلیق کی جن کی تخلیق کی ہے اگرچہ اس کے ہاں مبغوضہ مخلوقات ہمارے ہاں بھی مبغوض ہیں تو جب امرِ شرعی منتفی ہو یا مخفی ہو تو امتثال، رضا اور محبت نہ ہوگی جیسا کہ امر شرعی میں ہوتی ہے اگرچہ یہ سب تقدیر کا حصہ ہیں

اس جگہ میں کثیر خواص سالکین اور ان کے شیوخ سے بھی غلطی ہوئی ہے، ان کے عوام کا تو ذکر ہی کیا، وہ اس میں امرِ شرعی کی اپنی معرفت اور اس کے لئے اپنی طاعت کے بحسب باہم متفاوت ہیں تو ان میں سے بعض اوروں سے بڑھ کر امرِ شرعی کے عارف اور اس کے لئے اطوع ہیں تو ان کا حال ان سے اسی کے بحسب احسن ہوگا اور ان میں سے کئی امرِ شرعی سے بعید اور اس معاملہ میں استرسال پسند ہیں (یعنی ڈھیلا ڈھالا انداز) حتیٰ کہ ایک مرحلہ آتا ہے کہ بالکلیہ ہی اسلام سے نکل جاتے ہیں اور اپنی ہوائے نفس اور تقدیر پر ٹھہرے رہتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حالتِ کفر میں موت واقع ہوتی ہے جبکہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جنہیں توبہ نصیب ہو جاتی ہے، کئی حالتِ فسق میں مرتے ہیں، یہ حضرات تقدیری حقیقت کو مدِ نظر رکھتے اور امرِ شرعی سے اعراض

کی خو اختیار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری امر ہے کہ غیر شرعی امر و نہی کی اتباع سے بچا جائے جو یا تو خود ان کی طرف سے ہے یا اللہ و رسول کے کسی بھی غیر کی طرف سے، تقدیر کے ساتھ مطلقاً استرسال لذاتہ ممتنع ہے اس وجہ سے جس کا ذکر گزرا کہ انسان کی فطرت میں کئی اشیاء کی محبت اور کئی سے بغض و دیعت کیا گیا ہے، بعض نے جو کہا کہ بندے کو اللہ کے ساتھ یوں ہونا چاہیے جیسے غسال کے سامنے میت ہو، درست نہیں اور نہ یہ مسلمانوں میں سے کسی سے بھی علی الاطلاق سائغ ہے، یہ دراصل بعض مواضع میں کہا جا سکتا ہے اس کے باوصف یہ دراصل اس پر اللہ کے امر کے مخفی ہونے کی رو سے ہے وگرنہ جب اسے اللہ کے امر کا علم ہو اور اس سے اسے محبت ہو تو ضروری ہے کہ اللہ کے محبوبات سے محبت اور اس کے مبغوضات سے بغض کرے۔

فصل

جیسے علمی طریقہ ادلہ و اسباب میں صحتِ نظر علم کو موجب ہے مثلاً قرآن و حدیث پر تدبر تو عملی طریقہ عمل کے لئے موجبِ صحت ارادہ و اسباب کے ساتھ ہے اسی لیے اس ضمن میں یہ سالک کو مرید کا نام دیتے ہیں جیسے وہ اسے طالب بھی کہتے ہیں، نظر ایک جنس ہے جس کے تحت حق و باطل اور محمود و مذموم دونوں انواع ہیں اور اسی طرح ارادہ ہے تو جیسے طریقِ علم میں نبوی شرعی علم کا ہونا ضروری امر ہے اس طور کہ تمہارا ماخذ دینی و نبوی معلومات ہوں اور ان کی بابت تمہارا علم رسل کی اخبار کے مطابق ہو وگرنہ تمہیں حاصل کسی علم کا کوئی نفع نہ ہوگا اور رسل کے اخبار بارے تمہارے اعتقاد کی کوئی شئ بلکہ اللہ، فرشتوں، کتب، رسل اور یومِ آخرت پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ارادہ میں تعیینِ مراد ضروری ہے اور یہ اللہ ہے اور اس تک وصول کا طریق وہی جس کا رسل نے امر دیا تو لازم ہے کہ تم اس طرح سے اللہ کی عبادت کرو جو اس نے اس نے اپنے رسل کی زبانوں پر مشروع کیا کیونکہ رسل کی ان کی تمام اخبار میں علماً تصدیق ضروری ہے اور جو انہوں نے اوامر دئے عملاً انہیں ماننا بھی لہذا ایمان سنت کی موافقت کے ساتھ قول و عمل کا نام ہے تو علمِ حق وہ جو اللہ کے علم کے موافق ہوا اور ارادہِ صالحہ وہ جو اللہ کی محبت اور اس کی رضا کے موافق ہو اور یہ اس کا حکمِ شرعی

تو خبری امور کے ضمن میں ضروری ہے کہ وہ اللہ کے علم اور خبر کے مطابق ہوں، عملی امور کے ذیل میں لازم ہے کہ وہ اللہ کی حب اور اس کے امر کے مطابق ہوں تو یہ اس کا حکم اور وہ اس کا علم ہے اور جس نے اس کے حکم کو مجرد تقدیر باور کیا جیسے مصنف (منازل السالکین) نے کہا اور عارف کے مشاہدہِ حکم کو اس امر کا مانع قرار دیا کہ وہ کسی نیکی کو بنظرِ استحسان یا کسی برائی کو بنظرِ استقباح دیکھے تو یہ عظیم غلطی ہے جس کی ہم کئی جگہ نشاندہی کر چکے ہیں تو مریدِ قاصد کے لئے نافع نہیں کہ جس معبود کی چاہے عبادت کرے اور نہ یہ کہ اللہ کی جیسے چاہے عبادت کرے بلکہ یہ مبتدِع مشرکین کا طریقہ ہے جنہوں نے ایسے شرکاء بنا لئے جنہوں نے اپنی طرف سے ان کے لئے طریقے گھڑے جنہیں دین قرار دے لیا جیسے نصاریٰ اور اہل بدعت میں سے ان کے مشابہ جو بغیر اللہ کے امر و اذن کے غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے ! جہاں تک اہلِ اسلام و سنت تو وہ ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور عبادت

بھی مشروع طریقہ پر ہی کرتے ہیں، نہ کہ ان بدعات کے ساتھ جو ان میں سے بعض کا اختراع ہیں، طریقِ ارادت کے سالکین کبھی مراد (کی تعیین اور فہم) میں غلطی کر جاتے ہیں اور کبھی اس کی طرف لے جانے والے طریق میں اور کبھی یہ غیر اللہ کی بندگی کرتے ہیں اس سے خوف اس سے امید اور اس کے لئے تعظیم، محبت اور سوال و رغبت کے جذبات لئے ہونے کی صورت میں تو یہ محرم شرک کی حقیقت ہے، توحید کی حقیقت یہ ہے کہ بجز اللہ کے کسی کی عبادت نہ کی جائے، عبادت کمالِ حب، تعظیم، رجا، خشیت اور اجلال و اکرام کو متضمن ہے اور اس توحید میں فناء مرسلین اور ان کے اَتباع کا فناء ہے اور وہ یہ کہ اس کی عبادت کے ساتھ اس کے ما سوا کی عبادت، اس کی طاعت کے ساتھ اس کے ما سوا کی طاعت، اس سے سوال ودعاء کے ساتھ اس کے ما سوا سے سوال ودعاء، اس سے رجا کے ساتھ اس کے ما سوا سے رجا اور اس کی محبت کے ساتھ اس کے ما سوا کی محبت سے فنا ہوا جائے، طریق میں غلطی کرنے والے کبھی اللہ کی ارادت کے حامل ہوتے ہیں لیکن اس ارادت میں وہ امرِ شرعی کی اتباع نہیں کرتے لیکن کبھی ان کے بعض اپنے حسبِ ظن اور اپنی مرضی سے (خود ساختہ طریقوں سے) اس کی عبادت کرتے ہیں تو اس قدر میں فنا ہو جاتے ہیں جس میں اس طریقہ سے عبادت کرتے ہیں جو ان کے خیال میں اس کی رضا جوئی کا باعث ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا اور کبھی یہ تقدیر کو مدِ نظر رکھتے ہیں اس کے اس کی مراد ہونے کے باعث تو اس میں فنا ہو جاتے ہیں جس میں ان کے لیے کوئی غرض نہیں ہوتی! جہاں تک فنائے مطلق تو یہ ممتنع ہے، یہ امرِ شرعی کے مخالف اپنے وجد و ذوق کی اتباع کرتے ہوئے یا تقدیر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فنا ہونا، ان کے کثیر خواص اس میں مبتلا ہیں

الشیخ عبد القادر اور ان جیسے شرع اور امر و نہی کے التزام کا حکم دینے والے اپنے زمانہ کے کبار مشائخ میں سے ہیں اور یہ کہ **ذوق و وجد پر اسے مقدم رکھا جائے**، نیز وہ ہویٰ اور نفسانی ارادہ کے ترک کا امر دیتے تھے، ارادت میں غلطی اس طور کہ یہ ارادت ہے اسی جہت سے ہوتی ہے، سالکین کو ان کا حکم تھا کہ اصلاً ہی ان کی ہویٰ کی جہت سے ان کے ہاں ارادت نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس کے وہ مرید ہوں جو رب تعالیٰ کی مراد ہے یا تو ارادۂ شرعیہ، اگر یہ اس کے لئے متبین ہو جائے وگرنہ ارادۂ قدریہ کے ساتھ جاری ہو تو وہ یا تو رب تعالیٰ کے امر کے ساتھ ہوں یا پھر اس کی خلق کے ساتھ اور اسی کے لئے خلق وامر ہے (اَلَا لَـهُ الْـخَلْقُ وَ الْأَمْرُ) یہ شرعی صحیح طریقہ ہے، اندیشہ اس بات کا ہوتا ہے کہ لاعلمی میں کوئی سالک اس کا ترک کر دے یا قدری ارادہ کو شرعی ارادہ پر مقدم کر دے کیونکہ جب اسے اس کے شرعی ہونے کا علم ہی نہ ہوگا تو کبھی اس کا تارک بن سکتا ہے اور کبھی اس کی ضد کا مرید تو یوں ماموں کا تارک اور محظور کا فاعل بن جائے اور اسے اس بات کا علم و شعور ہی نہ ہو، طریقتِ ارادت کے سالک سے ضعفِ علم کا خدشہ ہے اور اس عمل کے ضعف کا جو علم کے ساتھ مقترن ہوتا ہے اور گمراہی میں وقوع کا جیسا کہ طریقتِ علم کے سالک کی نسبت ضعفِ عمل اور عمل کے ساتھ مقترن علم کے ضعف کا اندیشہ ہے البتہ اللہ کسی نفس کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، نہ اس سے اور نہ اس سے، فرمایا:

(فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) [التغابن : ۱۶] (پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو) جب سالک تفقہ حاصل کر لے اور اپنے حسبِ اجتہاد امر و نہی کے بارے میں جان لے اور اس کا علم و ارادت اسی کے بحسب ہو تو یہی اس کی مستطاع ہے اور جب طالب ادائے مامور اور ترکِ منہی کر لے اور اس کا علم اس کے عمل کے مطابق ہو تو یہی اس کی مستطاع ہے۔

فصل

الشیخ عبدالقادر -قدس اللہ روحہ- کا قول ہے اللہ کے حکم کے ساتھ خلق سے اور اس کے امر کے ساتھ اپنی ہویٰ سے اور اس کے فعل کے ساتھ اپنے ارادہ سے فنا ہو جاؤ، تب تم اس بات کے اہل ہو گے کہ اللہ کے علم کے لئے ظرف بن سکو، میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں اس کا حکم اس کی خلق اور امر کو متناول ہے یعنی خلق کی عبادت اور ان پر توکل کرنے سے اللہ کی عبادت اور اس پر توکل کرنے کے ساتھ فانی ہو جاؤ تو اللہ کی معصیت میں ان کی طاعت نہ کرو اور جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت میں ان سے تعلق نہ رکھو! جہاں تک امر کے ساتھ ھویٰ اور فعل کے ساتھ ارادہ سے فنا تو یہ اس طور کہ اس کا فعل امرِ شرعی کے موافق ہو، نہ کہ اپنی ہوائے نفس کے اور یہ کہ اس کی خلق کے لئے اس کی ارادت اللہ کے فعل کے تابع ہو، نہ کہ ارادۂ نفس کے تو ارادت کبھی نفس کے فعل اور کبھی مخلوقات سے متعلق ہوتی ہے تو اول امر کے ساتھ ہو گی اور ثانی کے لئے ارادت نہ ہو گی اور اس ذیل میں لازم ہے کہ اسے اس امر کے ساتھ مقید کیا جائے کہ اس کے لئے کوئی غیر مامور ارادت نہ ہو، وگرنہ جب مامور یہ ہے کہ بعض مقدورات سے ارادت ہو اور بعض سے نہ ہو تو اسے چاہیے کہ انہی کی ارادت رکھے جن کی ارادت کا حکم دیا ہے، چاہے یہ قدر کے موافق ہو یا نہ ہو، اس جگہ کئی سالکین کو ٹھوکر لگی ہے، ان میں سے صادقین پر غالب یہ ہے کہ انہیں اس معین بارے ارادۂ شرعیہ کی معرفت ہی نہیں ہوتی اور خود ان کے لئے نفسانی ارادت نہیں ہوتی تو یوں غیر مقدور کے لئے اپنی ارادت کا ترک کر بیٹھتے ہیں، الشیخ کا کہنا ہے کہ اللہ کی خلق سے تمہارے فنا کی علامت تمہارا ان سے اور ان کی طرف تردد سے انقطاع اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس سے مکمل ناامیدی

بات یہی ہے تو جب دل کو ان سے کوئی امید نہ ہو اور نہ وہ ان سے خائف ہو تو ان سے کسی شیٔ کی طلب کا تردُّد نہ کرے گا اور یہ مشبہ ہے اس سے جو ان کی طرف جانا مامور ہو سکتا ہے اس غرض سے کہ ان تک اللہ کے اوامر اور نواہی پہنچائے جائیں جیسے رُسل کا آنا اور ان کے اَتباع کا ان تک جانا جنہیں اللہ کے احکامات کی تبلیغ مقصود ہو، توکل اسی وقت صحیح ہو گا جب بندہ مامورات کو بجالاتا ہو کہ متوکل ساتھ ساتھ عابد بھی ہو، اگر توکل کا مدعی تو ہے مگر فعلِ مامورات نہیں کرتا تو جن مامورات کا ضیاع کیا ہے تو توکل کی نسبت ان کا بجالانا اَولیٰ تھا یا اس کی مثل یا پھر اس سے کمتر جیسے کوئی کسی امر کو تو بجالائے مگر توکل نہ کیا اور نہ استعانت کی تو گویا اس نے قیام بالواجب نہ کیا بلکہ عین ممکن ہے کہ جس توکل اور استعانت کا ترک کیا ہے وہ اس کے قیام بالواجب سے اولی ہو یا اس کی مثل ہو یا پھر اس سے کمتر ہو

شیخ کا قول کہ تمہارے اپنے آپ سے اور اپنی ہویٰ سے فنا کی علامت ترکِ تکسّب اور جلبِ نفع اور دفعِ ضرر میں اسباب کا سہارا لینا ہے تو تجھ میں اپنے آپ کے ساتھ کوئی تحرُّک نہ ہو اور نہ خود پر اعتماد ہو اور نہ اپنے آپ کی نصرت کرو اور نہ اپنا دفاع کرو لیکن اس سب کو اس کے سپرد کرو جو اولاً اس کا متولی ہے تو آخراً بھی وہی ہوگا، جیسے یہ سب اس نے سنبھالا ہوا تھا جب تم اپنی ماں کے پیٹ میں تھے یا جب تم حالتِ شیر خواری میں تھے (تو اب بھی سنبھال لے گا) میں کہتا ہوں یہ اس لیے کیونکہ نفس اس شیٔ کا وجود پسند کرتا ہے جو اسے بھلی لگے اور جو اسے نفع دے اور وہ مبغوض اور ضار کی دوری کو پسند کرتا ہے تو جب اس سے امر کے ساتھ فانی ہو جائے تو وہی کچھ کرے گا جو اللہ کو پسند ہے اور ہر اس کا ترک کرے گا جو اسے مبغوض ہے تو اپنے محبوب کو اللہ کے ہاں محبوب کے فعل اور اسے مبغوض کے ترک کے ساتھ بدل لیتا ہے، نفس کے لئے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت لازم امر ہے تو اس میں وہ متوکل علی اللہ ہوگا، شیخ رحمہ اللہ نے یہاں طاعت چھوڑ کر توکل کا ذکر کیا ہے کیونکہ نفس کے لئے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت ضروری امر ہے تو اگر اس ضمن میں نفس کا اللہ پر توکل اور وثوق نہیں ہے تو ممکن نہ ہوگا کہ اس سے منصرف ہو تو مطلقاً امتثالِ امر کرے بلکہ لازم ہے کہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت میں عصیانِ امر کرے تب توکل کے بغیر اللہ کے لئے اس کی عبادت اور اس کے امر کی طاعت درست نہ ہوگی جیسا کہ بغیر عبادت اور طاعت کے توکل (کا دعوی) بھی صحیح نہیں، فرمایا:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ [هود: ۱۲۳] (تو اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسا رکھو)

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق: ۲۔۳] پھر (اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لئے مخلصی پیدا کر دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کافی ہوگا)

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾ [المزمل: ۸۔۹] (پس اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، س کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ) مقصود یہ ہے کہ علی الاطلاق امتثالِ امر بغیر توکل اور استعانت کے درست نہیں اور جسے اللہ پر وثوق ہے کہ وہ اس کے لئے منفعت کا جالب اور اس سے مضرت کا دافع بنے گا اس کی نسبت ممکن ہے کہ اپنی ہویٰ کو چھوڑے اور اس کے امر کی طاعت کرے وگرنہ اس کا نفس اسے نہ چھوڑے گا، اس کا ترک کرے جس کی بابت کہے کہ وہ اس میں اس کے غیر کا محتاج ہے

شیخ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اللہ کے فعل کے ساتھ تمہارے ارادہ کے فنا کی علامت یہ ہے کہ تم کبھی بھی کسی مراد کا ارادہ نہ کرو، تو تمہارے لئے کوئی غرض نہ ہو اور نہ کوئی مفاد و مرام ہو کیونکہ تم اللہ کے ارادہ کے ساتھ اس کے سوا کے مرید ہی نہیں ہو، بلکہ اسی کا فعل تجھ میں جاری وساری ہے تو تم ساکن جوارح، مطمئن دل، مشروح سینے، روشن چہرے اور آباد باطن والے اور اللہ کے

ارادہ وفعل کے ساتھ اور اشیاء سے ان کے خالق کے ساتھ غنی ہو،تمہیں دستِ قدرت نے سنبھالا ہوا ہے، لسانِ ازل تمہیں بلاتی ہے، ربِ کائنات تمہیں سکھلاتا اور اپنی جناب سے تمہیں نور وحلل پہناتا ہے اور گزر چکے اولی العلم کی منازل میں تمہیں لا اتارتا ہے، تو تم ہمیشہ منکسر رہو گے، کوئی شہوت وارادہ تم میں قرار نہیں پکڑنا چاہیے، بے پیندے برتن کی مانند جس میں کوئی سیال شیٔ نہ ٹھہر سکے اور نہ میل کچیل تو تم بشری اخلاق (ومعمولات) سے فنا ہو جاؤ کہ تمہارا باطن اللہ کے ارادہ کا غیر کوئی ساکن قبول نہ کرے، تب تمہاری طرف تکوین اور خرقِ عادات امور مضاف (یعنی عطا) کئے جائیں گے تو ظاہرِ عقل وحکم میں ان کی تجھ میں رؤیت ہوگی اور یہ بجا طور پر اللہ تبارک وتعالی کا فعل فی العلم ہے تب تم (اَلْمُنْکَسِرَۃُ قُلُوْبُھُمْ) (یعنی اللہ کی ذات میں شکستہ دلوں) کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گے وہ جن کی بشری ارادت مکسور ہو چکی اور طبعی شہوات زائل ہو چکیں اور ان کے لئے ربانی ارادات اور اضافی شہوات قرار پکڑ چکیں جیسے ایک حدیث میں ہے: تمہاری اس دنیا سے میرے لئے عورتیں اور خوشبو محبّب کی گئی ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی ہے تو ان کی آپ کی طرف اضافت اس وقت کی گئی جب وہ کچھ آپ سے خارج اور زائل ہوا جس کی طرف اشارہ کیا گیا، ایک حدیثِ قدسی میں ہے: میں ان کے پاس ہوں جو میری خاطر شکستہ دل ہوئے، آگے ہے: میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے۔۔الخ

میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں یہ آخری مقام وہ ہے جس کی طرف الشیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی شیٔ کا ہونا نہیں چاہتا مگر یہ کہ وہ اس کے ارادہ کی مامور ہو تو ان کا قول: اللہ کے فعل کے ساتھ تمہارے ارادہ کی فنا یہ ہے کہ تم کبھی کسی مراد کا ارادہ نہ کرو، یعنی تمہاری کوئی ایسی مراد نہیں ہونی چاہیے جو (شرعی لحاظ سے) مامور نہ ہو، بس وہی جس کی ارادت کا اللہ و رسول نے حکم دیا تو اس کی ارادت یا تو واجب ہے اور یا مستحب اور اس کے ارادہ کا ترک یا معصیت ہوگی اور یا پھر نقص، یہ مقام کثیر سالکین پر ملتبس ہوا ہے تو وہ ظن کرتے ہیں کہ کامل طریقت یہ ہے کہ اصلاً ہی بندے کے لئے کوئی ارادت نہ ہو اور ابو یزید کا قول: (أُرِیْدُ اَنْ لَا أُرِیْدَ) (میں چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں[میرا ذاتی کوئی ارادہ نہ ہو، سب کچھ اللہ پر چھوڑ دوں]) یہ جب ان سے کہا گیا تھا آپ کیا ارادہ کرتے ہیں؟ نقص اور تناقض ہے اس لئے کہ انہوں نے ارادہ تو کیا ہے (کیونکہ کہا: أُرِیْدُ--- الخ) ان مشائخ کی کلام کو جن کی ترکِ ارادت کی رو سے تعریف کی جاتی ہے مطلقاً ترکِ ارادہ پر محمول کرتے ہیں اور یہ ان کی ان صاحبِ استقامت شیوخ کی نسبت غلطی ہے، اگر کسی شیخ کی نسبت منقول ہے کہ وہ مطلقاً ترکِ ارادہ کا حکم دیتے تھے تو یہ اس کی غلطی ہے جس نے یہ بات کہی کہ یہ نہ مقدور ہے اور نہ مامور ہے! ہر ذی حیات کے لئے ارادت کے بغیر چارہ نہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ زندہ کے لئے کوئی ارادہ نہ ہو تو جسے اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں اور ان کا حکم دیتے ہیں، امرِ ایجاب یا امرِ استحباب، اگر واجب ہے تو اس کا تارک کافر یا فاسق یا عاصی ہے اور اگر مستحب ہے تو اس کا تارک اس چیز کا تارک ہے جو اس کے لئے خیر ہے، اللہ تعالی نے انبیاء اور صدیقین کا اس ارادت کے ساتھ وصف کیا چنانچہ کہا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ [الأنعام : ۵۲] (اور جولوگ صبح وشام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو دھتکارو مت)

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾[والليل: ۱۹۔۲۰] (اورنہیں اس پر کسی کا احسان جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے رب الاعلیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے)

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾[الدهر : ۹] (ہم تم کو خالص اللہ کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض چاہتے ہیں اور نہ شکر گزار ہونا)

﴿وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب : ۲۹] (اور اگر تم اللہ اور اُس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر کی طلبگار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں اُن کیلئے اللہ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے)

﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ﴾ [الزمر : ۱۴] (کہہ دو کہ میں اپنے دین کو خالص کر کے اللہ کی عبادت کرتا ہوں)

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا﴾ [النساء : ۳۶](اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ)

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾[والذاريات: ۵۶] اللہ اور اس کے مامورات کی ارادت کے بغیر کوئی عبادت نہیں، فرمایا:

﴿بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾[البقرة : ۱۱۲](کیوں نہیں ! جوشخص اللہ کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اُس کا صلہ اُس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے) یعنی اللہ کے لئے اخلاصِ قصد کیا، فرمایا:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [البينة : ۵] (اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں) اس کے لئے اخلاص دین عبادت کے ساتھ اس اکیلے کی ارادت ہے، فرمایا:

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ [المائدة : ۵۴](جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں)

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾[البقرة : ۱۶۵](لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں)

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران : ۳۱](کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا) ہر محبوب ہے وہ مرید ہے! حضرت خلیل نے کہا تھا:

﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾[الأنعام : ۷۶](مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں) پھر کہا:

(اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ)[الأنعام : ۷۹] (میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے آپ کو اُسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) قرآن میں اس کا مثل کثیر ہے اللہ اپنی اور اپنے ماموروات کی ارادت کا حکم دیتا اور اپنے غیر کی ارادت سے منع کرتا ہے، نبی اکرم کا فرمان ہے:(اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ إِلَى إِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ) تو یہ دوطرح کی ارادت ہے ایک اللہ کو محبوب اور وہ اس پر راضی ہے، دوسری اسے محبوب نہیں اور وہ اس پر راضی نہیں بلکہ یا تو اس سے منع کیا ہے یا اس کا حکم نہیں دیا اور نہ اس سے منع کرتا ہے، ارادت کے ضمن میں لوگ تین اقسام ہیں: اول قسم جو اس کی ارادت رکھتے ہیں جو ان کی نفسانی خواہش ہے تو یہ اپنے نفوس اور شیطان کے غلام ہیں، دوم جو زعم کرتے ہیں کہ وہ مطلقاً ارادت سے فارغ ہیں اور ان کے لئے کوئی مراد باقی نہیں مگر وہی جو رب نے مقدر کی ہے اور یہ مقام اکمل المقامات ہے، ان کا زعم ہے کہ جو اس کے ساتھ قائم ہوا وہ حقیقت کے ساتھ قائم ہوا اور یہ قدری کونی حقیقت ہے اور ایسا شخص قیومیتِ عامہ کا شاہد ہے، یہ فناء کو توحیدِ ربوبیت کے شہود میں باور کرتے ہیں جو کہ غایت ہے، کبھی یہ اسے جمع فناء اور اصطلام (بیگانگی کی کیفیت) وغیرہ کے نام سے ذکر کرتے ہیں

کثیر شیوخ کے اس جگہ قدم ڈگمگائے ہیں، **اس مقام بارے جنید بن محمد اور ان کے صوفی اصحاب کی ایک جماعت کے مابین نزاع ہوا** تو وہ توحیدِ ربوبیت کے شہود پر متفق تھے اور یہ کہ اللہ ہر شیٔ کا خالق، رب اور ملیک ہے تو یہ شہودِ قدر ہے، اسے مقامِ جمع کا نام دیا، تو اس کے ساتھ فرق اول سے خارج ہوئے اور وہ اس کی ارادت اور اس کی کراہت اور اس کے فعل کی رویت اور اس کے ترک کے ساتھ طبیعی فرق، انسان اس توحید کا شاہد ہونے سے قبل خلق کے لئے ایسے فعل کو دیکھتا ہے جس کی رو سے اس کا دل افعالِ مخلوقات کے شہود میں متفرق ہوتا ہے اور وہ اپنی ارادت میں اپنی ہویٰ کے تابع ہو جاتا ہے تو جب حق کی ارادت رکھے تو اس کے ساتھ وہ ہویٰ و طمع کی ارادت سے نکل آتا ہے پھر اس امر کا شاہد ہوتا ہے کہ وہ ہر شیٔ کا خالق ہے تو اس جمع کے شہود کے ساتھ اس فرق سے نکل آتا ہے، تو جب اس پر متفق ہوئے تو جنیدؒ نے ان کے لئے فرقِ ثانی کا ذکر کیا اور وہ اس جمع کے بعد اور یہ فرقِ شرعی! تم دیکھتے نہیں کہ تم اس کا ارادہ کرتے ہو جس کا تمہیں امر دیا گیا اور اس کا نہیں جس سے منع کیا گیا اور شاہد ہوتے ہو کہ اللہ اپنے ماسوا کو چھوڑ کر عبادت کا مستحق ہے اور اس کی عبادت اس کے رسل کی طاعت کے ساتھ ہے تو یوں تم مامور و محظور اور اس کے اولیاء اور اس کے اعداء کے درمیان تفریق کرتے ہو اور توحیدِ الوہیت کے شاہد بنتے ہو تو ان صوفیہ نے اس فرق میں جنید سے منازعت کی

ان میں سے بعض نے تو اس کا انکار کیا اور بعض اس کی فہم نہ کر سکے اور بعض نے ادعاء کیا کہ اس بارے تکلم کرنے والا اس تک پہنچ نہیں پایا، پھر تم کثیر شیوخ کو پاؤ گے کہ یہ جمع ان کا منتہائے مقصود ہوتا ہے اور یہ توحیدِ ربوبیت اور اس میں فنا جیسا کہ

مصنف (منازل السائرین) کی کلام میں ہے، ان کی جلالتِ قدر کے باوصف حالانکہ قطعاً وہ معروف امر و نہی کے ساتھ قائم تھے لیکن کبھی ادعاء کرتے ہیں کہ یہ عوام الناس کی خاطر ہے، ان میں سے بعض تضاد کا شکار ہیں اور بعض عوام کی مصلحت کی رو سے وقوف مع الامر کے قائل ہیں، کبھی ان (یعنی عوام) کی نسبت (أھلُ الـمَارستان) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، بعض اسے مقامِ تلبیس کا نام دیتے ہیں اور بعض قائل ہیں کہ تحقیق یہ ہے کہ جمع تیرے دل میں شہود ہو اور فرق تمہاری زبان پر موجود ہو تو اپنے دل کے ماموراور محظور کے باہم مستوی ہونے کا شاہد بنے، دونوں کے مابین تفریق کے ساتھ

اور بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ حقیقت ہے جو سلوکِ عارفین کا منتہا اور اولیاء صدیقین کی منازل کی غایت ہے، ان میں سے بعض کا ظن ہے کہ امر و نہی کے ارادہ کے ساتھ وقوف سلوک و بدایت میں ہوتا ہے، جہاں تک نہایت تو یہاں صرف ارادۂ قدریہ ہی باقی رہتا ہے، یہ فی الحقیقت عبادت و طاعت کے سقوط کا قول ہے کہ اللہ کے لئے عبادت اور اس کی اور اس کے رسول کی طاعت امرِ شرعی کے امتثال ہی میں ہوگی، نہ کہ تقدیر کے ساتھ چلنے میں، چاہے وہ کفر ہو یا فسوق یا عصیان، یہیں سے کثیر اہلِ سلوک کفار اور فجار کے مددگار اور خفراء (پشتیبان) بن گئے (کہ انہوں نے ظن کیا کہ یہی تقدیر ہے) اس طور کہ تقدیر کے پلڑے کا جھکاؤ ان کے حق میں دیکھا اور شرعی امر و نہی کو مدِ نظر نہ رکھا، ان میں سے بعض کہتے تھے جو تقدیر کا شاہد بنا ملامت اس سے ساقط ہوئی اور قائل تھے کہ حضرت خضر اس لئے ساقط الملامت ہوئے کیونکہ شاہدِ تقدیر بن چکے تھے

اصحابِ شہودِ قدر میں کوئی کبھی کشف وتصرف کے ساتھ خرقِ عادت کی جہت سے بادشاہی اور امارت دیا جاتا ہے تو اسے وہ ولایت میں کمال خیال کرتا ہے جبکہ ان خوارق کا حصول دراصل شیطانی اسباب اور نفسانی اہواء کے ساتھ ہوا ہوتا ہے، کمال فی الولایت یہ ہے کہ خرقِ عادات کو وہ شرعی امر و نہی کی اقامت میں استعمال کرے، فعلِ ماموراور ترکِ محظور کے ساتھ ان کے حصول کی رو سے، جب یہ شرعی اسباب کے بغیر حاصل ہوں تو یہ مذموم ہیں اور اگر ان کا حصول تو شرعی اسباب کی رو سے ہوا ہے لیکن محرمات تک توصُّل کی غرض سے ان کا ستعمال کیا گیا تو بھی یہ مذموم ہوئیں، اور اگر مباح امور تک توصل میں مستعمل ہوئے نہ کہ طاعات پر ان کے ساتھ استعانت لی گئی تو یہ ابرار کے لئے ہوئیں نہ کہ مقربین کے لئے، ہاں اگر حصول بھی شرعی اسباب کے ساتھ ہوا اور استعمال بھی امرِ شرعی کے فعل میں ہوا تو یہ اب سابقین مقربین کے خوارق ہیں

لہذا ضروری ہے کہ **خوارق کے اسباب وغایات میں نظر کی جائے** کہ کہاں سے یہ حاصل ہوئے اور کہاں تک انہوں نے پہنچایا؟ جیسے اموال کے مستخرج اور مصرف میں نظر کی جاتی ہے، جس نے ان خوارق کو اپنے طبعی ارادہ میں استعمال کیا تو وہ مذموم ہوا اور جو طبعی وشرعی دونوں قسم کی ارادت سے خالی ہوا تو گمان ہے کہ اسے عفو نصیب ہوگی کیونکہ شرعی ارادت کی اسے معرفت نہ ہو سکی لیکن اگر معرفت پائی مگر اعراض کیا تو یہ مذموم اور مستحقِ عقاب ہے، اگر اسے عفو نصیب نہ ہوئی، یہ اس لحاظ سے قابلِ مدح ہے کہ اس کا ارادہ اس کی ہویٰ نہ ہوا لیکن بہر

حال ضروری تھا کہ اس کا ارادہ اللہ ورسول کے امر کے موافق ہوتا، یہ کافی نہیں کہ نہ اس سے ہو اور نہ اُس سے پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ کلی طور سے ارادت سے خلو ممکن نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی ارادت لازم ہے تو اگر اس کی ارادت نہ کی جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے تو (بدیہی بات ہے کہ) اس کا مرید بنے گا جو اللہ ورسول کو محبوب نہیں، لیکن اگر ہوائے نفس کے ترک پر نفس سے مجاہدہ کیا تو اس کے لئے مرید باقی رہے گا جسے مامور بہ گمان کرے تو یوں گمراہ ہو جائے گا، یہ نصاری کے ضالین کے حال سے مشابہ ہے جن کی بابت کہا:

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآ لِّيْنَ) نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ یہود مغضوب علیہم اور نصاری ضالین ہیں تو یہود کے لئے فاسد ارادات تھے جن سے نہی ہے جیسا کہ ان کے بارہ میں خبر دی کہ:

(ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ)[المائدة : ٧٨] (یہ اس لئے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے) انہیں حق کی معرفت حاصل تھی مگر عمل نہ کیا تو یہ بے عمل عالم تھے اور یہ مذموم ومحرم ارادہ میں اپنی اہواء کی اتباع کرتے تھے، مامور بہ محمود ارادہ کے حامل نہ تھے اور یہ اس کا ارادہ جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے، ادھر نصاری کے لئے قصد وعبادت اور زہد تھا مگر وہ راہِ حق سے بھٹکے ہوئے تھے اور بغیر علم کے عمل کرتے تھے تو انہیں اللہ ورسول کے ہاں محبوبات کی ارادت کی معرفت ہی نہ تھی بلکہ ان کے رُہبان کی غایت نفس کی ارادات سے کلی تجرید تھی، اب یہ اللہ ورسول کے ماموروات کی ارادت کے حامل نہ تھے البتہ ان کی منہیات میں سے کثیر کی ارادت بھی نہ رکھتے تھے، یہ اپنے مقصود سے بھٹکے ہوئے تھے کہ مقصود تو اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہے لہذا یہ ملعون قرار پائے یعنی اس رحمت سے بعید جس کا نیل اللہ کی طاعت سے ہوتا ہے، فاجر عالم یہودیوں سے اور جاہل (صوفی و) عابد نصاریٰ سے مشابہ ہے، اہل علم میں یہودیوں کی صفات وخصال میں سے کچھ اور اہلِ عبادت میں نصاری کے خصال وعادات میں سے کچھ ہوتا ہے

اس مقام میں بنی آدم باہم متفرق ہوئے اور ان کے مابین عظیم تباین ہوا جس کا احاطہ صرف اللہ ہی کو ہے، ان میں ایسا بھی ہے جو اللہ کی تمام مخلوق میں اس کے ہاں اکرم ہے (یعنی حضرت محمدؐ) اور وہ خیر البریہ ہیں، دوسری طرف ایسے بھی ہیں جنہیں شر البریہ قرار دیا گیا، اس ضمن میں افضل الاحوال (اللہ کے) دونوں خلیلوں کا حال ہے: حضرت ابراہیم اور حضرت محمد کا حال، محمد کل اولادِ آدم کے سردار، خاتم الرسل اور ان کے امام ہیں جب وہ مجتمع ہوئے (یعنی مسجدِ اقصی میں) اور خطیب الانبیاء ہیں جب لوگ (قیامت کے روز) وفد بنا کر رسل کے پاس جائیں گے اور آپ کو سب انبیاء سے بالا مقام کی طرف معراج کا اعزاز حاصل ہوا، آپ کے بعد سب سے افضل حضرت ابراہیم ہیں جیسا کہ صحیح میں حضرت انس راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا ابراہیم خیر البریہ ہیں اور مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ نبی اکرم خطبہ جمعہ میں کہا کرتے تھے: (خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَ خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ) عبداللہ بن مسعود جمعرات کے اپنے درس میں یہی کلمات پڑھا کرتے تھے جیسا کہ بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا، صحیحین میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم نے زندگی بھر کسی خادم، عورت، سواری اور کسی بھی شئ کو نہیں مارا، الا یہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد میں ہوں، نہ کبھی آ

پ نے اپنی ذات کے لئے انتقام لیا، الا یہ کہ اللہ کی محارم کا انتہاک کیا جائے پھر آپ کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے حتی کہ اللہ کے لئے انتقام نہ لے لیں (یعنی شرعی حدود کو نافذ نہ کردیں) حضرت انس کہتے ہیں میں نے دس برس نبی اکرم کی خدمت کی آپ نے کبھی مجھے اف تک نہ کہا اور نہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہ کیا؟ آپ کے بعض اہلِ خانہ جب کبھی مجھے ڈانٹتے تو آپ کہتے چھوڑو اگر مقدر میں کوئی شئ ہونی ہو تو ہو کر رہتی ہے، نبی اکرم افضل الخلائق تھے، تمام مقامات میں آپ کے لئے مقامِ وسیلہ ہے اور آپ کا حال یہ نہ تھا کہ آپ کسی بھی شئ کا ارادہ نہ کرتے تھے اور نہ یہ تھا کہ آپ اتباعِ ہویٰ کرتے بلکہ آپ ان دونوں سے منزہ تھے، فرمایا:

(وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى)[والنجم: ۳۔۴] (اور رسول اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کرتے۔ یہ تو وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے)

(وَّاَنَّهٗ لَـمَّا قَـامَ عَبْـدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا [۱۹] اور جب اللہ کے بندے اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے تو قریب تھے کہ کافر ان کا گھیراؤ کرلیں)

(وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) [البقرة: ۲۳] (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا، میں کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلالو)

(سُبْحَانَ الَّذِىْ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا) [الإسراء: ۱] (پاک ہے وہ جو ایک رات اپنے بندے کو لے گیا) عبدہ سے مراد اپنے عابد اور اپنے امر کا مطیع، وگرنہ تو تمام مخلوقات ہی عباد ہیں، بایں معنی کہ وہ معبدین مخلوقین اور مدبرین ہیں، اللہ نے اپنے نبی سے کہا:

(وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ) [الحجر: ۹۸] (اور اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ یہاں تک کہ موت آجائے) حسن بصری کہتے ہیں اللہ نے موت سے پہلے بندہ مومن کے عمل کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی، نبی اکرم بارے ارشاد کیا:

(وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ) [القلم: ۴] (اور تم عظیم خلق والے ہو) ابن عباس اور اس میں ان کے موافقین مثلاً ابن عیینہ اور احمد بن حنبل نے کہا یعنی: (عَلٰى دِيْنٍ عَظِيْمٍ) اور دین فعلِ مامور کا نام ہے، حضرت عائشہ کا قول ہے: (كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ) (آپ کا خلق قرآن تھا [چلتا پھرتا قرآن تھے]) اسے مسلم نے روایت کیا اور جیسا کہ انہی کی زبانی گزرا کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کوئی بدلہ وانتقام نہیں لیا، آپ اللہ کے لئے ہی سزا دیتے، جسے دیتے، حضرت انس نے کہا آپ اپنے حظوظ سے عفو کرتے تھے، جہاں تک حدود اللہ تو اس بارے آپ نے برسرِ منبر کہا تھا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں، اسے صحیحین میں نقل کیا اور یہ کمالِ ارادہ ہے تو جو ایمان اور عملِ صالح سے اللہ کو محبوب ہے اس کا آپ ارادہ رکھتے تھے اور جو کفر وفسوق اور عصیان اسے مبغوض تھا اس سے کراہت ونفرت رکھتے

تھے اور اس سے منع کیا جیسا کہ اللہ نے اپنے اس قول کے ساتھ وصف کیا:

(وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ) [الأعراف: ۱۵۶۔۱۵۷] (اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے، میں اس کو ان لوگوں کیلئے لکھ دوں گا جو پرہیز گاری کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جو رسولِ اُمی کی پیروی کرتے ہیں جن کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو اُن کیلئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں اور اُن پر سے بوجھ اور طوق جو اُن پر تھے اتارتے ہیں تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رفاقت کی اور انہیں مدد دی اور جونُور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی، وہی فلاح پانے والے ہیں) اپنے حظِ نفس میں آپ تقدیر کی طرف نظر کرتے تھے اور کہتے تھے اگر کسی شئ کا ہونا مقتضی اور مُقدر ہے تو وہ ہو کر رہتی ہے جبکہ اللہ کے حق میں آپ قیام بالامر کرتے تو اللہ کے ماموارت کو بجالاتے تھے اور ہر ممکن طور سے اس کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرتے، اولاً قرآن کے ساتھ لسانی اور کلامی جہاد کیا اور یہی آپ کو حکم تھا جیسے کہا:

(وَلَوْشِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْرًا فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا) [الفرقان: ۵۱۔۵۲] (اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈرانے والا بھیج دیتے۔ تو تم کافروں کا کہا نہ مانو اور ان سے اس قرآن کے حکم کے مطابق بڑا جہاد کرو) پھر ہجرت کے بعد جب قتال کا اذن ملا تو سیف و ید کے ساتھ جہاد کیا اور یہ اس کے مطابق ہے جو صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہوا اور یہ حضرت عمر کے حوالے سے بھی نبی اکرم سے مروی ہے حضرت آدم اور موسیٰ کے باہمی مکالمہ و مناظرہ بارے جب حضرت موسیٰ نے انہیں ملامت کی کہ کیوں خود کو اور اپنی ذریت کو خلد سے نکلوا دیا اس گناہ کی رو سے جس کا ارتکاب کیا ؟ تو ان کا جواب تھا کہ یہ تو میری تخلیق سے بھی مدتوں قبل میری تقدیر کا حصہ تھا، آپ کا ارشاد ہے: (فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰی) (تو آدم موسیٰ پر غالب آ گئے) اس لئے کہ حضرت موسیٰ کی انہیں یہ ملامت اللہ کے حق کے لئے نہ تھی بلکہ یہ دراصل اس وجہ سے جو ان کی اس لغزش کے سبب ان کی ذریت کو مصیبت لاحق ہوئی تو حضرت آدم نے جواب دیا کہ یہ تو مقدر امر تھا جو ہونا ہی تھا

مصائب میں حکم ہے کہ لوگ صبر کریں، یہی ان کے لئے نافع ہے، جہاں تک ان کا اسے ملامت کرنا جو ان میں سبب بنا ہو تو ان کے لئے اس میں کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح جو فوائد انہیں حاصل ہونے سے رہ گئے ان کی نسبت تقدیر کو مدِ نظر رکھنے کا حکم ہے کہ تاسف اور

حزن کا کوئی فائدہ نہیں، تو جو انسانوں کیلئے منفعت کے فوات یا حصولِ مضرت کے ساتھ تقدیر جاری ہوئی تو اس حقیقت کو نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے لیکن جو ان کے اپنے اعمال کے سبب ہو تو ان پر لازم ہے کہ معاصی سے توبہ میں محنت کریں اور مستقبل میں اصلاح کو کوشاں رہیں کہ یہی ان کے لئے فائدہ مند ہے اور یہ بھی اگر اللہ کی مدد شاملِ حال ہوئی تو ان کا مقدر ہوگا، مسلم میں حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا قوی مومن ضعیف مومن سے بہتر اور اللہ کو زیادہ پسند ہے اور دونوں میں خیر ہے، اپنے لئے نافع کی حرص کرو اور اللہ سے مدد کے طالب بنو اور عجز اختیار نہ کرو، اگر کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہو کہ کاش یہ کیا ہوتا تو یہ ہوتا لیکن کہو جو اللہ کی تقدیر، اور وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، کاش اور اگر شیطان کے عمل کی کنجی ہے، تو نبی اکرم نے حرصِ نافع اور اللہ کے ساتھ استعانت کا امر دیا اور عجز سے منع کیا اور بندے کے لئے انفع ترین شئ تو اللہ و رسول کی طاعت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، یہ دونوں اصول اس قولہ تعالیٰ کی حقیقت ہیں:

(اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) عجز سے منع کیا اور یہ ضیاع، تفریط (کوتاہی) اور سستی ہے جیسے ایک حدیث میں کہا: عاجز وہ ہے جو نفس کی خواہشات کا غلام بنا اور اللہ پر آرزوئیں ہی کرتا رہا (کام کچھ نہ کیا) اسے ترمذی نے روایت کیا، سنن ابو داؤد میں ہے کہ دو اشخاص اپنا کوئی معاملہ لے کر تصفیہ کرانے نبی اکرم کے پاس آئے، آپ نے سن کر ایک کے حق میں فیصلہ کر دیا تو دوسرا بولا: (حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ) اس پر آپ نے فرمایا اللہ عجز پر ملامت کرتا ہے لیکن تم دانائی کی روش تھامے رکھو، اگر کسی معاملہ میں مغلوب ہو جاؤ تو کہو: (حَسْبِیَ اللّٰهُ الخ) تو کیس (یعنی دانائی) عجز کا عکس ہے، ایک حدیث میں ہے ہر شئ مقدر ہے حتیٰ کہ عجز اور کیس بھی، اسے مسلم نے نقل کیا، کلامِ نبوی میں عجز سے مراد وہ نہیں جو قدرت کے مضاد ہے کیونکہ جس کے لئے قدرت نہیں وہ کسی طور بھی قابلِ ملامت نہیں اور کسی کو اس کی قدرت و استطاعت سے ماوراء حکم نہیں دیا جا سکتا، مغلوب الامر ہونے کی صورت میں تقدیر کو مدِ نظر رکھنے کا حکم دیا کہ کہے وہی ہوتا ہے جو مقدر اور مشیتِ الٰہی ہو، تحسُّر، تلہُّف اور حزن کرنے سے روکا اور کہ کہے کاش یہ کرتا تو یہ ہوتا، یہ نہ کرتا تو یہ ہوتا، بعض حضرات نے اس ذیل میں کہا: امر دو طرح کے ہیں: ایک جس میں حیلہ ہو اور دوم جس میں حیلہ نہ ہو تو جس میں حیلہ ہے اس سے عجز اختیار نہ کرے اور جس میں حیلہ نہیں اس میں جزع وفزع نہ کرے، یہ ہے جس کا ذکر ائمہِ دین وتقویٰ الشیخ عبد القادر وغیرہ، کرتے ہیں تو فعلِ مامور اور ترکِ محظور لازم امر ہے، اسی طرح مقدور پر راضی ہونا اور صبر کا دامن تھامے رکھنا، اللہ نے حضرت یوسف کی بات نقل کرتے ہوئے کہا:

(اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف: ۹۰] (میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) تو تقویٰ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کو متضمن ہے اور صبر مقدور پر صبر کو، فرمایا:

(يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا) إلى قوله: (وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا

یَضُرُّکُمْ کَیْدُهُمْ شَیْئًا)[آل عمران : ۱۱۸۔۱۲۰] (اے اہلِ ایمان کسی غیر کو اپنا رازداں نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔۔۔اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا) تو اللہ تعالی نے واضح کیا کہ تقوی اور صبر اگر اختیار کیا جائے تو اہل ایمان کو ان کے دشمن کفار ومنافقین کی ریشہ دوانیاں نقصان نہ دیں گی اور فرمایا:

(بَلٰۤی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ)[آل عمران : ۱۲۵] (ہاں اگر تم دل کو مضبوط رکھواور ڈرتے رہواور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کردیں تو اللہ پانچ ہزار فرشتے جن پر نشان ہوں گے تمہاری مدد کو بھیجے گا) تو صبر وتقوی کی صورت میں تائید غیبی ملتی ہے اور نصرت حاصل ہوتی ہے،فرمایا:

(لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْۤا اَذًی کَثِیْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ)[آل عمران : ۱۸۶] (تمہارے مال وجان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی اور تم اہلِ کتاب سے اور اُن لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے،تو اگر صبر اور پرہیز گاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں) تو خبر دی کہ مشرکین اور اہل کتاب میں سے ان کے دشمن اپنی زبانوں سے تو انہیں ایذاء دے سکیں گے لیکن اگر تقوی اور صبر کی روش اپنائی تو یہ عزمِ امور سے ہے (یعنی ثابت قدمی اور استقلال) تو یہ علانیہ دشمنی کا اظہار کرنے والوں اور چھپ چھپ کر دشمنی کرنے والوں کے شر کا دافع ہے، نبی اکرم کی سیرت بھی یہی تھی اور یہی اکمل الامور ہے،تو جس نے کبھی تو اللہ کے محبوبات کی ارادت کی اور کبھی نہیں کی اور کبھی اس کے مکروہات کی اور کبھی نہ ان کی اور نہ ان کی،تو یہ دونوں نبی اکرم کی روش اور سیرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اگر چہ بعض صورتوں میں گناہ لازم نہ بھی آئے جیسے کوئی اس کا ارادہ کرے جو مباح شہوت،غضب اور مباح انتقام میں سے جائز ہے جیسا کہ بعض انبیاء اور صالحین کا یہ خلق رہا ہے تو یہ اگر چہ جائز ہے اس میں الم نہیں لیکن نبی اکرم کا خلق وسیرت اس سے اکمل ہے،اسی طرح جس نے مباح شہوات کا ارادہ نہ کیا اگر چہ ان کے ساتھ مستحب امر پر استعانت لی جا سکتی ہو اور غضب انتقام اور مجاہدہ کا مرید نہ بنا جب عفو کی گنجائش ہو اگر چہ یہ انتقام اللہ کے لئے اور اسے خوش کرنے والا ہو جیسا کہ یہ بھی بعض انبیاء اور صالحین کا شیوہ رہا ہے تو یہ اگر چہ جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں لیکن بہر حال نبی اکرم کا کردار اور سیرت اس سے اکمل ہے، یہ اور سابق الذکر جب کسی نبی کے لئے شریعت ہو تب اللہ نے جو اپنے کسی نبی کے لئے مشروع کیا تو اس میں عیب والی کوئی بات نہیں لیکن اللہ نے بعض انبیاء کو بعض اور بعض رسل کو بعض پر فضیلت دی ہے اور جس شریعت کے ساتھ حضرت محمد کو مبعوث کیا وہ افضل الشرائع ہے کیونکہ آپ افضل الانبیاء والمرسلین ہیں اور آپ کی امت خیر الامم ہے جو منصہ ظہور میں آئی،ابو ہریرہ قولہ:

(کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) [آل عمران : ۱۱۰] (جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم اُن سب سے بہتر ہو)

بارے کہتے ہیں :تم خیر الناس ہو کہ اقیاد و سلاسل میں انہیں لے کر آ ؤ گے اور جنت میں لا داخل کرو گے، اپنے اموال و انفس کو میا دینِ جہاد میں استعمال کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو نفع ہو (تا کہ اللہ کے دین کی طرف آ جائیں) تو یہ خلقت کے لئے خیر الامم ہیں اور خلقت اللہ کا عیال ہے تو اللہ کو محبوب ترین وہ ہے جو اس کے عیال کے لئے انفع ہو اور جہاں تک غیر انبیاء تو ان میں سے ایسے ہوں گے جو اس نبی کی اتباع میں اس روش پر چلیں لیکن جو شریعتِ محمدی کے اہل میں سے ہے تو اگر اس نے ترکِ واجب اور فعلِ محرم کیا تو یہ ذم وعقاب کا مستحق بنے گا الا یہ کہ متأوِل اور مخطئ ہو (خطا کار) تو اللہ نے اس امت سے خطا اور نسیان کا وضع کر دیا ہے (یعنی اس کا محاسبہ نہ ہوگا) نیز گناہوں سے عفو کے متعدد اسباب ہیں جن کی رو سے انسان سزا سے بچ سکتا ہے (ان کا بیان گزرا) اس انحراف کے اسباب میں سے یہ ہے کہ بعض حضرات جن پر اپنے ارادۂ نفس میں طریقۂ زہد کا غلبہ ہوا تو یہ شہوت وغضب میں زاہد بنے جیسے مشرکین کے عباد اور اہلِ کتاب کے رُہبان اور ان کے اَشباہ اس روش کے سالک ہیں، یہ جہاد کو نقص خیال کرتے ہیں اس وجہ سے جو اس میں قتلِ نفوس، سبیِ ذریت (یعنی ان کی اولاد کو غلام ولونڈی بنالینا) اور اخذِ اموال ہے، ان کا خیال ہے کہ اللہ نے حضرت داؤد کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر اس لئے نہ کروائی کہ ان کے ہاتھوں کافی خون بہا تھا (یعنی میدانِ جہاد میں) ان میں سے بعض تو کسی جانور کو بھی ذبح کرنا درست نہیں سمجھتے مثلا براہمہ (برہمن، ہندو جوگی) بعض اسے حرام تو نہیں سمجھتے لیکن تقرُّب الی اللہ اس امر میں سمجھتے ہیں کہ کسی جانور کو ذبح نہ کریں، گوشت نہ کھائیں اور عورتوں کی قربت نہ کریں، ان کے مادحین فخر یہ کہتے ہیں :(فَلَا نَكَحَ وَلَا ذَبَحَ) (ساری عمر نہ ذبح کیا [یعنی گوشت نہیں کھایا] اور نہ نکاح کیا)

نبی اکرم نے اس طرح کی روش کا انکار کیا تھا جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ **صحابہ کرام کی ایک جماعت نے (جن میں حضرات ابو بکر، علی اور عثمان بن مظعون بھی تھے) ازواج مطہرات سے اندرون خانہ نبی اکرم کے عمل بارے استفسار کیا** پھر آپس میں عہد کرتے ہوئے ایک نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا، ایک نے کہا میں گوشت نہ کھاؤں گا، ایک نے کہا میں بستر پر سونا چھوڑ دوں گا، آنجناب تک یہ معاملہ پہنچا تو اللہ کی حمد وثنا کے بعد کہا: (مَا بَالُ اَقْوَامٍ قَالُوْا) (ان حضرات کو کیا ہوا جنہوں نے یہ یہ باتیں کی ہیں) جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نمازِ شب بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، نفلی روزے بھی رکھتا ہوں اور کئی کئی دن نہیں بھی رکھتا، شادیاں بھی کی ہوئیں ہیں اور گوشت سے بھی پرہیز نہیں تو (یہ ہے میری سنت اور سیرت) جس نے میری سیرت وروش سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں، قرآن میں ہے :

(يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ) [المائدة : ٨٧] (اے مومنو جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اُن کو حرام نہ کرو) اس کا نزول عثمان بن مظعون اور ان کے چند ہمراہی صحابہ بارے ہوا جنہوں نے تبتُّل (تجرُّد) اور راہبانہ زندگی گزارنے کا عزم کرلیا تھا، صحیحین میں حضرت سعد سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے عثمان بن مظعون کا

یہ عزم چھڑوا دیا اگر آپ انہیں اذن دے دیتے تو ہم خصی ہو جاتے، نافع اور مشروع زہد وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے اور یہ ان امور و اشیاء سے زہد (یعنی بے رغبتی) جن کا آخرت میں کوئی نفع اور فائدہ نہیں لیکن آخرت میں نافع الامور اور جن کے ساتھ عبادت وطاعت پر استعانت حاصل کی جا سکے تو ان سے زہد کا مطلب اللہ کی عبادت و طاعت سے زہد (بے رغبتی) ہے تو نافع شیٔ اور امر میں زہد جہل و ضلال ہے، بندے کے لئے نافع اللہ کی عبادت اور اس کی اور اس کے رسول کی طاعت ہے اور جو بھی اس سے اسے روکے وہ ضار اور غیر نافع ہے! پھر انسان کے لئے انفع یہ ہے کہ اس کے تمام اعمال اللہ کے لئے عبادت اور طاعت ہوں اگر فرائض ادا کئے اور ایسے مباح افعال کیے جو طاعت پر مددگار نہیں تو اس نے فعلِ نافع کیا اور وہ فعل بھی جس کا نہ نفع ہے اور نہ نقصان

اسی طرح مشروع ورع ان اشیاء سے ورع ہے جن کی عاقبت سے ڈر ہو اور جن کی تحریم معلوم ہو اور جن کی تحریم میں شک ہو اور ان کے ترک میں ان کے کرنے سے اعظم مفسدت نہ ہو مثلاً کوئی معین محرم مثلاً جواز رہِ ورع اخذ شبہ کا ترک کرے باوجود اس کی طرف اپنی حاجت کے اور اس کے بدلہ میں ایسے محرم کا اخذ کر لے جس کا حرام ہونا واضح ہے یا کسی ایسے واجب کا ترک کرے جس کا ترک مع الشبہ اس کے کرنے سے فساد کی رو سے اعظم ہے، اس شخص کی مانند جس کے والد یا خود اس کے ذمہ قرض ہو جس کے چکانے کا وقت آ گیا ہے مگر اس کے پاس ایسا مال ہے جس میں شک وشبہ ہے تو وہ اس سے تورع کرے اور اپنے یا اپنے والد کے ذمہ کو رہن باقی رہنے دے، اسی طرح ورع سے ہے کہ ایسے امر کے کرنے سے احتیاط کرے جس کے وجوب میں شک ہے لیکن اس وجہ پر، ورع کی تمامیت یہ ہے کہ انسان خیر کی طلب کرے اور شر سے بچے اور جان لے کہ شریعت کی بناء مصالح کی تحصیل وتکمیل اور مفاسد کی تعطیل وتقلیل پر ہے وگرنہ جس نے کسی فعل اور ترک میں موجود شرعی مصلحت اور شرعی مفسدت کے مابین پرکھ نہ کی اس سے متوقع ہے کہ کئی واجبات کا ترک اور کئی محرمات کا فعل کر لے اور اسے ورع خیال کرے جیسے کوئی شخص اسے ورع سمجھتے ہوئے ظالم حکمرانوں کے خلاف جہاد اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا ترک کر دے اور ان ائمہ اور خطیبوں کے پیچھے جماعت و جمعہ چھوڑ دے جن میں بدعت و فجور ہو اور اسے وہ تقوی اور ورع خیال کرے اور جیسے کوئی صادق کی گواہی قبول کرنے اور عالم سے علم کے اخذ سے ممتنع ہو اس وجہ سے جو اس میں کوئی مخفی بدعت دیکھی، اسی طرح مقوی کھانوں مثلاً چربی سے جو اللہ کی عبادت و طاعت پر معین اور تقویت کا باعث ہیں زہد و رغبت، اسے ورع خیال کرتے ہوئے حتی کہ اس کی عقل میں خرابی در آئی اور قوت میں ضعف ہوا اور اللہ کے واجبات وحقوق یا اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی سے قاصر ہوا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا تارک بنا یہ سوچ کر کہ اس سے لوگوں کی دل آزاری اور خون وخرابہ ہوگا حتی کہ کفار و فجار اہلِ اسلام پر چڑھ آئے تو بھی دفاع میں نہ اٹھا اور اسے رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا، قرآن میں ہے:

(يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ

الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ) [البقرة : ۲۱۷] (لوگ تم سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں لڑنا بڑا ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اہلِ مسجد کو اُس میں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑی بات ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے) یعنی اگرچہ حرمت والے مہینوں میں جنگ و جدل کرنے میں شر ہے لیکن کفر اور اہلِ کفر کے ظہور وغلبہ میں حاصل جو فتنہ ہے وہ اس کے مقابلہ میں اعظم ہے تو بڑی برائی کا ازالہ اور دفع کرنے کے لئے اگر چھوٹی برائی کو اختیار کرلیا تو حرج نہیں بلکہ یہی وقت کا تقاضہ ہے، اسی طرح جو جانور کو ذبح کرنا ظلم سمجھے تو یہ جہالت ہے کہ اس حیوان نے آخر مرنا تو ہے ہی تو اگر بنی نوعِ انسان کی منفعت اور غذائی ضرورت پورا کرنے میں اسے ذبح کرلیا تو یہ اس امر سے بہتر ہے کہ وہ ایسی موت مرے جس کا کسی کو فائدہ نہ ہو، آدمی تو اشرف المخلوقات ہے اور اکل ورکوب کی اسے ضرورت حیوانات کے استعمال سے ہی پوری ہوتی ہے البتہ بلاضرورت اللہ کی کسی مخلوق کو تعذیب دینا روا نہیں، مثلاً کہ جانور کو باندھ کر یا حلق ولُبہ سے دیگر جگہ سے ذبح کرنا، اللہ نے حسبِ امکان مخلوقات کے ساتھ اچھائی کرنے کو واجب کیا ہے حتی کہ قتل و ذبح میں بھی جیسا کہ مسلم میں شداد بن اوس سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ نے ہر شئ کے ساتھ اچھائی کرنا تم پر واجب کیا ہے لہذا قتل کرو تو اچھے طریقہ سے کرو، ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے کرو اور چھری تیز کرلیا کرو اور ذبیحہ کو آرام دو

یہ حضرات جنہوں نے ارادات میں اپنے تئیں زہد سے کام لیا حتی کہ ان امور میں بھی جو اللہ ورسول کو پسند ہیں دو طرح کے ہیں: ایک وہ گروہ جس نے اللہ ورسول کے ہاں مکروہات میں ایسی رغبت کی جس میں کفر یا فسوق اور عصیان ہے، دوسرے گروہ نے اللہ ورسول کے مامورات میں رغبت ظاہر کی لیکن یہ اپنے نفوس کی ہویٰ کے لیے نہ کہ اللہ تعالی کی عبادت کی خاطر، یہی وہ لوگ ہیں جو صورِ طاعات سمیت تو آئیں گے لیکن فسادِ نیات کے ساتھ جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جب آپ سے سوال ہوا کہ آدمی بہادری دکھلانے کے لئے لڑتا ہے اور قبائلی حمیت میں اور ازرہِ ریاء بھی تو ان میں سے اللہ کی راہ کا مقاتل کون شمار ہوگا؟ تو کہا جو اس لئے لڑا تا کہ اللہ کے کلمہ کا بول وبالا ہو، وہی اللہ کی راہ میں ہے، فرمایا:

(اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا) [النساء : ۱۴۲] (منافق (اپنے تئیں) اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، وہ انہیں دھوکے میں ڈالنے والا ہے اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر لوگوں کو دکھانے کیلئے اور اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے مگر بہت کم) فاسد و مذموم ارادات والے ہیں، ترکِ واجب کے ساتھ ساتھ یہ فعلِ محرم کے مرتکب بھی ہیں، یہ یہود سے جبکہ وہ نصاری سے مشابہ ہیں، فرمایا:

(ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ) [آل عمران : ۱۱۲] (یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت اُن سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور لوگوں کی پناہ میں آ جائیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری اُن سے لپٹ رہی ہے یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے، اور اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے) اور کہا:

(سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا) [الأعراف : ۱۴۶] (جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں اُن کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی اُن پر ایمان نہ لائیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے راستہ بنالیں)

(وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا--- لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ)[الأعراف : ۱۷۵۔۱۷۶] (اور ان کو اُس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں تو وہ ان سے پیچھے ہٹ گیا پھر شیطان اُس کے پیچھے لگا تو وہ گمراہوں میں ہو گیا- اور اگر ہم چاہتے تو اُن آیتوں سے اس کو بلند کر دیتے ---تا کہ وہ غور وفکر کریں) تو یہ حق جاننے کے باوجود غی کی روش اپناتے ہوئے ہوائے نفس کے پیروکار ہیں جبکہ وہ ضلال اور جہل بالحق کے ساتھ اپنی اہواء کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جیسے کہا:

(وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ)[المائدة : ۷۷] (اور ایسے لوگوں کی خواہش کے پیچھے نہ چلو جو پہلے گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی اکثر گمراہ کر گئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے) دونوں گروہ اللہ و رسول کی مامور ارادات اور اعمالِ صالحہ کے تارک اور ان کی نہی کردہ ارادات اور اعمالِ فاسدہ کے مرتکب ہیں۔

فصل

تو الشیخ عبدالقادر اور ان کے شیخ حماد دباس اور دیگر اہلِ استقامت مشائخ۔رضی اللہ عنہم۔نے حکم دیا ہے کہ سالک کبھی بھی کسی مراد کا مرید نہ بنے اور اللہ کی ارادت کے سوا کسی کی ارادت نہ کرے بلکہ اس کا ہر فعل اسی میں جاری ہو تو یہی مرادِ حق ہے، اس کے ساتھ ان کا قصد ان امور میں جن کی بابت بندہ اللہ و رسول کے امر کو نہیں جانتا لیکن اگر جان لیا کہ یہ اللہ کا مامور ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس کی ارادت کرے اور عمل کرے، انہوں نے کئی جگہ اس کی تصریح کی ہے اگرچہ ان کے غیر کئی غالطین ارادتِ خلقیہ کے ساتھ قیام کو کمال خیال کرتے ہیں اور اسے توحیدِ ربوبیت میں فناء قرار دیتے ہیں اور یہ کہ سلوک جب اس حد تک پہنچ

جائے تو اس کا صاحب قائم بالامر ہوتو اس کے غیر کی وجہ سے ہوگا یا وہ اب محتاج نہیں کہ قائم بالامر ہوتو یہ فاسد اقوال وطرائق ہیں، ایک جگہ ان پر بات کی ہے! جہاں تک اہلِ استقامت سالکین جیسے جمہور مشائخِ سلف مثلاً فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابو سلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی، جنید بن محمد اور دیگر متقدمین اور مثلاً الشیخ عبد القادر، الشیخ حماد، الشیخ ابو البیان اور دیگر متاخرین تو یہ سالک کے لئے سائغ نہیں سمجھتے اگر چہ (اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو چکی ہو کہ) ہوا میں اڑے یا پانی پر چلے کہ شرعی امر ونہی سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھنے لگ جائے، بلکہ موت تک وہ فعلِ ما مور اور ترکِ محظور کا پابند ہے اور یہی وہ حق ہے جس پر کتاب وسنت اور اجماعِ سلف کی دلالت ہے، یہ ان کی کلام میں کثیر ہے جیسے فتوح الغیب میں الشیخ عبد القادر نے لکھا: اپنے نفس (یعنی اپنے خول) سے باہر نکل آؤ اور اس سے الگ ہو جاؤ اور اپنی مِلک سے علیحدہ ہو جاؤ اور سب کچھ اللہ کے سپرد کردو اور اپنے دل کے دروازے پر اس کا دربان بن جاؤ اور اس کے مکمل تابعدار ہو جاؤ، جسے وہ دل میں داخل کرنے کا حکم دے اسی کو داخل کرو اور جسے روکنے کا کہے اسے روک دو، دل سے ہوائے نفس نکل جانے کے بعد دوبارہ اسے داخل نہ کرو، دل سے ہوائے نفس کا اخراج یہ ہے کہ تمام احوال میں اس کی مخالفت اور ترکِ متابعت کرو اور دل میں اسے جگہ دینے کا مطلب اس کی متابعت اور موافقت ہے، پس سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ارادت کے کوئی ارادت نہ کرو، اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ غیر ہے اور وادیِ حمقاء (حماقت کی وادی) ہے اگر اس کا رخ کیا تو یقینی بربادی اور ہلاکت ہے اور اللہ کی آنکھ سے سقوط اور اس سے تمہارا احجاب ہے، ہمیشہ اس کے امر کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کی نہی سے دور رہو اور ہمیشہ اس کے مقدور کو اسی کے سپرد کرو، اس کی خلق سے کسی شیٔ کو اس کا شریک نہ بناؤ، تمہاری ارادت، تمہاری ھویٰ اور تمہاری شہوت اس کی خلق ہے لہذا ان سے کنارا کرو تا کہ شرک کا ارتکاب نہ ہو جائے، قرآن میں فرمایا:

(فَمَنْ كَا نَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَا لِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَا دَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا) [الکھف: ۱۱۰] (تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے چاہئیے کہ عملِ نیک کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے) شرک صرف بتوں کی پوجا کرنے کا ہی نام نہیں بلکہ تمہارا اپنی خواہشات کی متابعت کرنا بھی شرک ہے، اگر تم اپنے رب کے ساتھ دنیا و مافیہا اور آخرت و مافیہا کی کوئی بھی شیٔ اختیار کرو گے تو یہ سب اس کا غیر ہے تو اگر اس کے غیر کی طرف میلان ظاہر کیا تو گویا اس کے غیر کو اس کا شریک کرلیا لہذا احتیاط کرو میلان نہ کرو، ڈر جاؤ بے خوف نہ رہو، متلاشی رہو غافل مت بنو کہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ، اپنے نفس کی طرف کسی حال ومقام کو مضاف نہ کرو اور اس سے کسی شیٔ کا ترک نہ کرو، مزید لکھا: یہاں اللہ ہے اور تیرا نفس ہے! تمہی مخاطب ہو، نفس اللہ کی ضد اور اس کا دشمن ہے، تمام اشیاء اللہ کے تابع ہیں، جب تم نے نفس کی مخالفت وعداوت میں حق کی موافقت کی تو تم اپنے نفس کے خلاف اس کے لئے خصم (یعنی مدعی اور فریق) بن گئے، آگے کہا: پس عبادت تمہاری اپنے نفس وھویٰ کی مخالفت میں ہے، فرمایا:

(وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) [ص: ۲۶] (اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا

دے گی) آ گے لکھا ابو یزید بسطامی رحمتہ اللہ تعالی علیہ کی مشہور حکایت ہے کہ خواب میں اللہ تعالی کی زیارت ہوئی تو عرض کی تجھ تک پہنچنے کا طریق کیا ہے؟ ارشاد ہوا اپنے نفس کا تارک بن کر میری طرف آ جاؤ، ابو یزید کہتے ہیں تو میں اپنے نفس کے خول سے اس طرح منسلخ ہو گیا (یعنی نکل گیا) جیسے سانپ اپنی جلد سے ہوتا ہے تو جب ثابت ہوا کہ خیر کلی طور پر نفس کی معادات کرنے میں ہے، فی الجملہ تمام احوال میں، تو اگر تم حالِ تقوی میں ہو تو نفس کی مخالفت کر و یا بایں طور کہ خلق کی اجرام (قالب) ان کی شباہت اور ان کی منت (احسان) سے نکل آ ؤ اور ان پر بھروسہ اور اعتماد کرنا اور ڈرنا اور ان سے امیدیں لگانا چھوڑ دو اور حطامِ دنیا سے جو کچھ ان کے پاس ہے اس کی طمع نہ کرو، ان سے کسی ہدیہ، زکاۃ یا صدقہ یا کفارہ ونذر کے بطور مال حاصل ہونے کی امید اور لالچ نہ کرو، تمام وجوہ واسباب سے اپنا خیال وارادہ ان سے قطع کر لو تو سنجیدگی سے خلقت سے باہر آ جاؤ اور انہیں اس باب کی طرح سمجھو جو کھلتا اور بند ہوتا ہے اور اس درخت کی طرح جس میں کبھی پھل ہوتا ہے اور کبھی وہ بے ثمر ہوتا ہے! یہ سب فعلِ فاعل اور تدبیرِ مدبر سے ہے اور وہ اللہ تعالی کی ذات ہے

اس سب پر عمل کرنے سے ہی اس کے موحد بنو گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے کسب کو مت بھولو تا کہ جبریہ کے مذہب سے خلاصی پاؤ اور اعتقاد یہ رکھو کہ اللہ تبارک کی مدد کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا، یہ نہ ہو کہ اہلِ دنیا کے غلام بن جاؤ اور اللہ کو بھول جاؤ، اللہ کے سوا ان کے فعل کو قبول نہ کرو کہ کفر کے مرتکب بنو اور قدری ہو جاؤ لیکن کہو (عقیدہ رکھو) کہ یہ خلقاً اللہ کے لئے ہے اور کسباً بندوں کے لئے ہے (یعنی بندوں کو ان افعال کے صدور کا ذریعہ اور سبب بنایا ہے) خود حاکم نہ بنو بلکہ اللہ کے حکم کو مانو، تمہارا اہلِ جہاں کے ساتھ ہونا تقدیر ہے اور تقدیر ظلمت اور تاریکی ہے تو اس تاریکی میں چراغ لے کر داخل ہو جاؤ اور یہ حکم ہے یعنی اللہ کی کتاب اور نبی اکرم کی سنت، ان سے کسی طور خارج مت ہونا، اگر کوئی خیال آئے یا الہام پاؤ تو اسے کتاب وسنت پر پیش کرو، اگر ان اس کی تحریم پاؤ مثلا زنا، سود یا اہلِ فسوق و فجور کی مخالطت کا الہام آئے اور دیگر معاصی کا تو اسے دفع دور کرو، قبول نہ کرو اور اس پر عمل نہ کرو اور یقین رکھو کہ یہ شیطانِ لعین سے ہے اور اگر ان میں اس کی اباحت پاؤ مثلا اکل وشرب اور لبس ونکاح وغیرہ مباح شہوات تو بھی چھوڑ دو اور قبول نہ کرو اور جانو کہ یہ نفس کے الہام اور اس کی شہوات سے ہے اور تم نے بہر صورت نفس کی مخالفت اور عداوت کرنی ہے

میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں **مباحات کے ترک سے ان کی مراد** یہ کہ اگر وہ ان کا مامور نہ ہو جیسا کہ ایک اور جگہ اس کلام کی مراد واضح کی ہے تو مامور بہ مباح کو اگر بحکم الامر کیا تو یہ اس پر اللہ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے اور یہ اس پر واجب ہے! میں نے قبل ازیں ذکر کیا کہ شیخ سابقین مقربین کی طریقت کے داعی تھے (جو اللہ کی خاطر مباح شہوات کے بھی تارک تھے) اصحاب الیمین ابرار کے طریقہ پر وقوف نہ کرتے تھے

مزید کہا: اگر کتاب وسنت میں نہ اس کی تحریم پاؤ اور نہ اباحت بلکہ وہ ایسا امر ہے کہ تمہیں اس کی سمجھ نہیں آ رہی، بطورِ مثال الہام ہوا کہ فلاں جگہ کا رخ کرو یا فلاں صالح سے جا کر ملو اور تمہارے لئے اس جگہ جانے اور اس مردِ صالح سے ملنے میں کوئی حاجت

نہیں اس لیے کہ تمہیں جو اللہ نے علم ومعرفت عطا کی ہوئی ہے اس کی رو سے تم اس سے مستغنی ہو (یعنی مزید کوئی شئ ملنے کی امید نہیں) تو ذرا توقف کرو، جلد بازی نہ کرو، سوچو کیا یہ الہام حق سے ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونا ہے؟ بلکہ اس میں خیر کے منتظر رہو اور فعلِ حق کے، کہ یہ الہام متکرر ہو اور تمہیں جلدی کرنے کا امر ملے یا کوئی ایسی علامت ظاہر ہو جو علم باللہ والوں کے لئے ظاہر ہوتی ہے جس پر اللہ کے اولیاء میں سے عقلاء اور ابدال میں سے مؤیدین عمل کرتے ہیں! جلد بازی نہ کرنے کا اس لئے کہا ہے کہ تمہیں اس کی عاقبت کا علم نہیں کہ معاملہ کیا رخ اختیار کرے گا، ہوسکتا ہے اس میں فتنہ و ہلاکت ہو اور اللہ کی طرف سے مکر و آزمائش لہذا توجہ کرو حتی کہ اللہ تعالی تقدیر کو کس رخ پھیرتا ہے پھر جب فعل متجرد ہوا اور تمہیں وہاں لے جایا گیا اور کسی فتنہ نے آلیا تو تم اس میں محمول و محفوظ ہو گے اس لئے کہ اللہ تعالی اپنے فعل پر تمہارا معاقبہ نہ کرے گا، عقوبات تمہاری طرف اس وجہ سے متطرق ہوتی ہیں کہ خود سے ان کا اقدام کرتے ہو

میں کہتا ہوں شیخ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا ہے کہ جو شرع میں محظور ہے اس کا ترک واجب اور ضروری ہے اور جس کا بعینہ مباح ہونا معلوم ہے کہ اسے بحکمِ ہویٰ کرے نہ کہ بحکمِ شرع تو اسے بھی ترک کر دے لیکن جس کی بابت نہیں جانتا کہ کیا وہ بعینہ مباح ہے جس میں مضرت ہے یا کہ نہیں ہے؟ مثلاً کسی معین جگہ یا معین شخص کی طرف سفر تو یہ جنسِ عمل حرام نہیں اور نہ ہی ایسا ہے کہ اس کے کل افراد (یعنی جزئیات) مباح ہو، ں انسان کے لئے کسی ایسی جگہ کا رخ کرنا حرام ہے جہاں اس کے دین میں ضرر واضح ہونے کا اندیشہ ہو، تو جب تک معاملہ روزِ روشن کی طرح واضح نہ ہو جائے کہ ادھر جانے میں یہ مصلحت ہے سفر کرنے سے روکا ہے کیونکہ اگر یہ واضح نہ ہو کہ ادھر جانا واجب ہے یا مستحب ہے تو ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا اور اگر ضرر کا خوف ہو تب تو اس کا ترک ہی مناسب ہے اگر جانے پر مجبور کیا گیا تب اس پر حرج نہیں تو اس کی پاداش میں مواخذہ نہ ہوگا

ہاں اگر واضح ہو کہ جانے میں کوئی راجح مصلحت ہے تب جانا حسن اور صائب ہے، اس ضمن میں کئی شواہد سنت میں وارد ہیں کہ جو بغیر اپنی جانب سے کدو کاوش کئے (کسی عہدہ و منصب یا کسی بھی معاملہ میں) مبتلا کیا گیا اس کی مدد کی جائے گی (یعنی منجانب اللہ) اور جو خود آگے بڑھ کر متعرض ہوا اس کی بابت خوف و اندیشہ ہے (یعنی اب اپنے کئے کا بھگتے گا، اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوئی) نبی اکرم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ سے کہا تھا امارت مانگ کر حاصل نہ کرنا کہ اگر مانگ کر لی تو تم اس کے سپرد کئے گئے لیکن اگر بغیر مانگے کوئی ذمہ داری دی گئی تو اس (کی بجا آوری میں) تمہاری (منجانب اللہ) مدد کی جائے گی، اسی سے آپ کا یہ فرمان: دشمن سے مڈھ بھیڑ ہونے کی آرزو مت کرو اور اللہ سے عافیت کا سوال کرو اور جب ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو صبر و ہمت سے کام لو، سنن میں ہے جس نے عہدہ قضاء سفارشوں سے حاصل کیا وہ اس کے سپرد کر دیا گیا اور جس نے اس کی طلب نہ کی تھی (مگر دے دیا گیا) تو اللہ تعالی ایک فرشتہ اس پر لگا دے گا جو اس کی رہنمائی کرتا رہے گا، ایک روایت میں ہے اگر یہ عہدہ لینے پر مجبور کیا گیا، صحیحین میں ہے کہ طاعون بارے فرمایا اگر کسی علاقہ میں اس کا وقوع سنو تو ادھر کا رخ نہ کرو اور اگر وہاں واقع ہو جائے جہاں تم ہو تو اس سے

فرار ہوکر وہاں سے مت نکلو، ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے نذر ماننے سے منع فرمایا، اسی سے آپ کا یہ قول ہے کہ جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں مجھے چھوڑو، تم سے پہلے کی اقوام کثرتِ سوال اور اپنے انبیاء پر اپنے اختلاف کی بنا پر ہلاک ہوئیں تو جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو باز آجایا کرو اور جب کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت کرلیا کرو۔

فصل

الشیخ عبدالقادر لکھتے ہیں اگر تم حالِ حقیقت میں ہو اور یہ حالِ ولایت ہے تو اپنی ہویٰ کی مخالفت کرو اور مجموعی لحاظ سے اتباعِ امر کرو، اتباعِ امر دو قسم کا ہے: ایک کہ دنیا سے اسی بقدر لو جس سے گزارا چل سکے جو کہ حقِ نفس ہے اور ترکِ حظ کرو (یعنی عیش اور لذات میں مت پڑو) فرائض ادا کرتے رہو اور ظاہر و باطن ذنوب کا ترک کرو، دوم باطنی امر کے ساتھ ہو اور یہ حق تبارک وتعالیٰ کا امر جو بندوں کو امر و نہی کرتا ہے، یہ امر دراصل اس مباح میں ہوتا ہے جو شرع میں حکم (کے درجہ میں) نہیں، بایں معنی کہ نہ نہی اور نہ واجب امر کے قبیل سے ہے بلکہ مہمل ہے، بندے کو اختیار ہے کہ ترک کرلے تو اسے مباح کا نام دیا گیا، بندہ اس میں اپنے پاس سے کوئی اِحداث نہیں کرتا بلکہ امر کا انتظار کرتا ہے، جب امر ملے تو امتثال کرے تو یوں اس کی تمام حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہیں، جس کا شرع میں حکم ہے تو یہ از روئے شرع ہے اور جس کا شرع میں حکم نہیں تو امرِ باطن کے ساتھ تب وہ اہلِ حقیقت سے محقق ہوگا اور جس میں امرِ باطن بھی نہیں وہ حالتِ تسلیم مجرد فعل ہے، اور اگر تم حق الحق کی حالت میں ہو اور یہ حالتِ محق اور فناء حق کی خاطر منکسر قلوب والے موحد و عارف اربابِ علوم وفعلِ سادات امراءِ نخی حق کے لئے خفراء (مددگار/ پشتیبان) رحمٰن کے خلفاء، اجلاء اعیان اور احباب علیہم السلام اَبدال کی حالت ہے، تو ان میں اتباعِ امر تمہارا خود کی حول وقوت سے تبری کے ساتھ نفس کی مخالفت کرکے اور یہ کہ تمہارے لئے کسی بھی شئی میں ارادت و خواہش نہ ہو، نہ دنیا کی اور نہ آخرت کی، عبدالملک نہ کہ عندالملک اور حکم کا بندہ نہ کہ خواہش کا غلام، جیسے شیرخوار کی اپنی دایہ کے ساتھ حالت ہوتی ہے اور میت کی غاسل کے سامنے اور بیمار کی طبیب کے پاس اور یہ امر و نہی کے ماسوا میں

نیز کہا: تمام پیش آمدہ امور میں شرع کی اتباع کرو، اگر تم حالتِ تقویٰ میں ہو جو کہ پہلا قدم ہے اور حالتِ ولایت اور وجودِ ہویٰ میں امر کی اتباع کرو اس سے تجاوز مت کرو اور یہ (راہِ سلوک میں) دوسرا قدم ہے اور حالتِ بدلیت وعینیت اور صدیقیت میں فعل کے ساتھ راضی اور موافق اور فناء ہو جاؤ اور یہ منتہا ہے، قذر (یعنی گندے) راستہ سے الگ ہوجاؤ، اپنے نفس و ہویٰ کو واپس لے آؤ، شکوہ سے اپنی زبان کو بچائے رکھو! جب یہ کرلیا اگر یہ خیر ہے تو مولیٰ تمہارے لذت وسرور اور پاکیزگی میں اضافہ کرے گا اور اگر شر ہے تو اپنی اس میں طاعت میں تمہاری حفاظت کرے گا اور ملامت کو تم سے دور کرے گا اور تمہیں اس میں بٹھلائے رکھے گا حتی یہ (یعنی شر) آگے بڑھ جائے اور انقضائے اجل کے وقت راحت عطا کرے گا جیسے رات ختم ہونے سپیدہ سحر نمودار ہوجائے اور سردی ختم ہونے پر گرمی کا موسم آجائے، یہ تمہارے ہاں نموذج (مثال) ہے، اس کے ساتھ عبرت پکڑو پھر

مختلف النوع معاصی اور خطایا کے ساتھ تلویث ذنوب اور آ ثام و اجرام ہیں، کریم الطبع کی ہم نشینی کا حقدار وہی ہو گا جو ذنوب و زلات کی نجاستوں سے محفوظ اور پاک ہے اور اس کی شدت پر وہی متوجہ ہو گا جو حقیقۃً طیب ہے خالی خولی دعوی نہیں جیسے بادشاہوں کی مجالس میں بیٹھنے کا حقدار وہی ہوتا ہے جو صاف ستھرا اور میل کچیل سے دور اور پاک ہو، آ زمائشیں اور بلا یا مکفِرات ہیں، نبی اکرم نے فرمایا ایک دن کا بخار ایک سال کا کفارہ ہے

بقول ابن تیمیہ الشیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ امر و نہی کا التزام کرنا ہر مقام میں ضروری ہے (سالکین کے لئے) تین احوال ذکر کئے ہیں: صاحبِ تقوی کا حال، حالِ حقیقت اور حالِ حق الحق، اپنے مقصود کی وضاحت کی کہ ہر حال میں بندے کے لئے ضروری ہے کہ شرع کے امر اور نہی کا مرید ہو اور یہ کہ بندے کو جب اپنے ارادہ کے ترک کا حکم ملے تو یہ ان امور میں ہے جن میں نہ وہ مامور ہے اور نہ منہی ہے اور یہ حق ہے تو نہ اسے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ اس کے وجود میں اس کے لئے ارادت ہو اور نہ نہی کی گئی ہے کہ اس کے عدم میں اس کے لئے ارادت ہو تو اس طرح امور میں وہ نقیضین کی ارادت سے خالی ہو گا

واضح کیا کہ صاحبِ حقیقت کے ذمہ ہے کہ ہمیشہ ظاہری امرِ شرعی کو لازم پکڑے رکھے، اگر اس کا شناور ہو جائے یا پھر امرِ باطن کو اور بیان کیا کہ امرِ باطن ان امور میں ہو گا جو شرع میں نہ واجب ہیں اور نہ حرام اور اس کے مثل میں وہ امرِ خاص کا انتظار کرے حتی کہ بحکم الامر بجا لائے، اگر کہو اس کے اور سابق الذکر صاحبِ تقوی کے مابین کیا فرق ہے اور صاحب الحق کے جس کا آ گے ذکر آ رہا ہے؟ تو کہا جائے گا آ گے جن کا ذکر ہے انہیں ابدال کا نام دیا گیا ہے تو یہ وہ جن کا کوئی فعل امرِ حق کے بغیر نہیں ہوتا، وہ طاعت کے افعال میں سے اپنے آپ کے لئے کسی بھی فعل کے شاہد نہیں بنتے بلکہ اس امر کے شاہد ہوتے ہیں کہ وہی ان کی نسبت فاعل ہے جو ان کے ہاتھوں اپنے امر کی طاعت کرا رہا ہے، اسی لیے کہا ان میں اتباعِ امر تمہارا خود کی مخالفت کرنے کے ساتھ ہے اپنی حول وقوت سے تبرّی کرتے ہوئے

تو یہ توحیدِ الوہیت کے ساتھ ساتھ توحیدِ ربوبیت کے بھی شاہد ہیں، تو شاہد ہیں کہ اللہ ہی اس فعل کا خالق ہے جو بر و خیر کے افعال میں سے ان کے ساتھ قائم ہوا تو خود کو کسی تعریف و مدح کے قابل نہیں سمجھتے اور نہ اپنا کسی پر احسان باور کرتے ہیں اور نہ اپنے آپ کے لئے کسی پر کوئی حق سمجھتے ہیں اس لئے کہ شاہد ہیں کہ بندوں کے افعال وغیرہ میں سے ہر شیٔ کا خالق اللہ ہی ہے اور جانتے ہیں کہ بندے اپنے آپ سے اور اپنے آپ کے ساتھ اللہ کے سامنے کسی شیٔ کے حقدار نہیں، بلکہ اسی نے اپنے آپ پر رحمت کو لازم کیا اور شاہد ہیں کہ وہ عبادت کیے جانے کا حقدار ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے اور وہ حقدار ہے کہ اس سے اس طرح ڈرا جائے جیسے ڈرنے کا حق ہے اور یہ مقتضی ہے کہ اس کی ہمیشہ طاعت کی جائے، کبھی بھی معصیت نہ کی جائے، یاد رکھا جائے کبھی بھولا نہ جائے، اس کا شکران کیا جائے کبھی کفران نہ کیا جائے، تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں جو بھی عملِ صالح سرزد ہوا وہ اس کے جود و فضل اور کرم کا شاخسانہ ہے اور ہر حال میں وہی حمد کا مستوجب اور مستحق ہے

اور اس امر کے شاہد ہیں کہ کوئی حول اور قوت نہیں مگر اللہ کے ساتھ اور بندوں کی طرف سے انہیں جو ایذاء ملی وہ اس کی

خلق ہے اور اس کے عدل سے ہے اور لوگوں نے ان کے جن حقوق کا ترک کیا ہے تو انہیں وہ معرضِ خلق ہی میں نہیں لایا ہے! ہر حال میں اس کے لئے حمد ہے، اس پر جو اس نے کیا اور اس پر بھی جو اس نے نہیں کیا، اسی لیے ان کے دل منکسر (یعنی شکستہ) ہیں اس کے وجودِ کامل اور اپنے عدم محض کے شاہد ہونے کی وجہ سے، اس سے بڑی شکستگی کیا ہوگی کہ انسان اپنے آپ کے لئے سوائے عدم کے کسی شئ کو نہ دیکھے اور خود کو کسی قابل نہ سمجھے جبکہ صاحبِ حقیقت جو کہ اس سے کمتر ہے اللہ کے لئے اخلاصِ دین میں اس کا مشارک ہے اور یہ کہ وہ نہیں کرتا مگر جس کا وہ مامور ہو تو اس کا ہر فعل اللہ ہی کے لئے اور اسی کی خاطر ہے لیکن یہ توحیدِ ربوبیت اور اس کی رؤیت میں اس سے قاصر ہے اور یہ کہ کوئی حول اور قوت نہیں مگر اللہ کے ساتھ اور اس کے لئے فی الحقیقت کوئی شئ نہیں بلکہ ہر شئ کا جو اس کے ساتھ قائم ہوئی، خالق و فاعل اللہ ہے اور اس شہود کا کمال عجب اور کبر ونحوہما میں سے کسی شئ کو باقی نہ رہنے دے گا تو دونوں اللہ کے لئے مطیع اور قائم بالامر ہیں لیکن یہ شاہد ہے کہ اللہ ہی نے اسے مسلم اور نمازی بنایا اور فی الحقیقت اس نے کسی بھی شئ کا اِحداث نہیں کیا جبکہ اس کا اگرچہ اس پر ایمان تو ہے اور اس کا مصدِق ہے کیونکہ مقر ہے کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے لیکن کبھی اس طرح کے شہود کا شاہد نہیں بنتا کہ جو اسے اس میں معدوم کے بمنزلہ کردے

نیز ایک اور جہت سے بھی دونوں کے مابین فرق ہے اور وہ یہ کہ اول کے لئے امور میں ارادت اور ہمت ہے مگر ان کا ترک کیا تو وہ اپنی مرادات میں ان کے مابین جن کا وہ مامور ہوا اور جن سے اسے منع کیا گیا اور ان کے مابین کہ جن کے بارہ میں نہ امر ہے اور نہ نہی ہے فرق اور تمییز روا رکھتا ہے لہذا اس کے لئے اصلاً ہی کوئی مراد باقی نہیں مگر وہی جو رب کی مراد ہے، یا تو اس کا امر تو وہ اللہ کے ساتھ اسے بجالاتا ہے اور یا اس میں فعل تو اللہ اسے اس کے ذریعہ کرتا ہے، اسی لئے شیر خوار کی اپنی دایہ کے ساتھ تشبیہ دی غیرِ امر و نہی میں، جہاں تک اول جو کہ تقویٰ عامہ کے مقام میں ہے تو اس کے لئے محرمات کی شہوات بھی ہیں اور خلق کی طرف التفات بھی اور خود اپنی رؤیت بھی تو وہ تقوی کے ساتھ مجاہدے کا محتاج ہے تاکہ محرمات اور بغیر امر شہوات اختیار کرنے سے باز رہے تو یہ محتاج ہے کہ اپنے افعال اور غیر افعال کے مابین تمییز کرے اور یہ تقوی ہے! جبکہ صاحب الحقیقت کے لئے اس کے افعال سے کچھ باقی نہیں مگر وہی جن کا وہ مامور کیا گیا تو وہ وہی فعل کرتا ہے جس کا شرع میں اسے امر ملا اور جو مباح ہے اس کے ضمن میں بھی وہی کرتا ہے جس کا امر ملا اور جو ثالث ہے تو اس کا شہود اس بارے تام ہے کہ وہ نہیں کرتا مگر اللہ کے لئے اور اللہ کے ساتھ، تو وہ نہیں کرتا مگر جس کا اللہ نے امر دیا اور اللہ کے لئے کرتا ہے اور شاہد ہے کہ فی الحقیقت اللہ ہی اس کے فعل کا فاعل ہے اور اس کے لئے نہ ارادت ہوتی ہے اور نہ ہمت کہ اپنے نفس کے لئے کرے اور نہ غیر اللہ کے لئے اور نہ اپنے نفس کے ساتھ کرے اور نہ غیر اللہ کے ساتھ

یہ تینوں طریق میں مشترک ہیں اس امر میں کہ ان میں سے ہر ایک سوائے فعلِ طاعت کے کوئی فعل نہیں کرتا البتہ کمالِ معرفت وشہادت اور صفائے نیت وارادت کے ضمن میں باہم متفاوت ہیں، اگر کہا جائے شیخ کی ساری کلام اس بات کے گرد گھومتی

ہے کہ امر کی اتباع کی جائے جس طور بھی باطناً اور ظاہراً اس کی معرفت ممکن ہو اور جس میں باطناً اور ظاہراً امر نہ ہو اس میں وہ فعلِ رب کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہو اس طور کہ اس کے لئے کوئی اختیار نہ ہو، نہ اِس میں اور نہ اُس میں، بلکہ اگر امر کی معرفت پا لے تو اس کے ساتھ ہو جائے اور اگر اس کی معرفت نہ ہو تو پھر تقدیر کے ساتھ ہو جائے تو وہ امرِ رب کے ساتھ ہے اگر معرفت مل گئی وگرنہ اس کی خلق کے ساتھ کہ اسی سبحانہ کے لئے خلق و امر ہے اور یہ مقتضی ہے کہ وہ حوادث جن میں نہ امر اور نہ نہی ہے تو اللہ کی طرف سے ان میں کوئی حکم نہیں، نہ استحباب کا اور نہ کراہت کا، اس کی الشیخ نے اور شیخ حماد دباس نے تصریح کی ہے اور یہ کہ سالک کئی ایسے امور کی طرف واصل ہوتا ہے جن میں حکمِ شرعی نہیں ہوتا، نہ امر اور نہ نہی کے ساتھ، بلکہ بندہ تقدیر کے ساتھ وقوف کرتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جس میں سالک ان کے نزدیک حقیقتِ قدریہ محضہ کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ اب یہاں حقیقتِ شرعیہ تو ہے نہیں اور یہ ان امور سے ہے جن میں شریعت کے اہلِ علم نے ان سے منازعت کی ہے اور وہ قائل ہیں کہ یا تو شرع کی نسبت سے فعل کا وجود اس کے عدم پر راجح ہوگا اور یہ واجب اور مستحب اور یا اس کا عدم اس کے وجود پر راجح ہوگا اور یہ محرم اور مکروہ اور یا پھر دونوں امر ایک برابر ہوں گے اور یہ مباح، یہ تقسیم امرِ مطلق کے بحسب ہے

پھر معین فعل جس کی بابت کہا جائے کہ مباح ہے یا تو بندے کے لئے اس میں مصلحت راجح ہوگی اس وجہ سے کہ وہ طاعت پر معین ہے اور اس کے حسنِ نیت کی وجہ سے تو یہ بھی اس اعتبار سے محبوب اور راجح الوجود ہوگا اور یا پھر بندے کے لئے افضل فعل کا مفوت (اور مضیع) ہوگا مثلاً وہ مباح جو مستحب سے اسے مشغول کر دے تو ایسے کا عدم اس کے لئے بہتر ہے، اللہ کی طرف فرائض کے بعد نوافل کے ذریعہ تقرب کی سعی کرنے والے سالک کے حق میں معین مباح مستوی الطرفین نہ ہوگا تو اس نے اگر اس کے ساتھ طاعت پر استعانت نہ کی تو اس کا ترک اور اس کی جگہ کوئی طاعت کا فعل بہتر ہے، اس کا وجود اور عدم وجود ایک برابر تب باور کیا گیا جب اس کے عدم کی صورت میں اس کے مثل مباح کے ساتھ مشغول ہوتا ہو، تو کہا جائے گا اس کے اور اس کے مابین کوئی فرق نہیں تو یہ اہلِ یمین ابرار کے حسبِ شان جو فرائض مثلاً ادائے واجبات اور ترکِ محرمات کے ساتھ متقرب الی اللہ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مباحات سے بھی مستفید ہوتے اور حظ اٹھاتے ہیں

تو ان کی نسبت کبھی کسی معین مباح کا وجود اور عدم ایک برابر ہوگا جب وہ اس کے عدم کی صورت میں (کسی مستحب فعلِ طاعت کی بجائے) اس جیسے کسی اور مباح فعل کے ساتھ مشغول ہوتے ہوں اور کوئی سبیل نہیں کہ نفس فعل کا ترک کرے اگر وہ کسی اور فعل کے ساتھ مشغول نہ ہو جو اول کا مضاد ہو کیونکہ (عموماً) ایسا تو نہیں ہوتا کہ تمام حرکات وسکنات سے وہ معطل ہو، اسی سے کعبی نے شریعت میں مباح کے وجود کا انکار کیا اس لئے کہ ہر مباح کے ساتھ وہ محرم سے مشغول ہوتا ہے اور ترکِ محرم واجب ہے اور اس کا ترک ممکن نہیں مگر جب اس کی ضد کے ساتھ مشغول ہو اور یہ مباح اس کی ضد ہے (اس جہت سے کہ اگر یہ کرنے میں لگا

ہوتا تو متوقع طور پر اس حرام فعل میں لگ جاتا) اور کسی شیٔ کے کرنے کا امر اس کی ضد سے نہی ہے اور اس سے نہی اس کی ضد کا امر ہے جب اس کے لئے ایک ہی ضد ہو وگرنہ وہ اس کی یکے از اضداد کا امر ہے، تو جس بھی ضد کے ساتھ وہ مشغول ہوا وہ واجب ہوا، واجب مخیرّ کے باب سے (گویا اس توجیہہ کے مدنظر کعبی نے انکار کیا کہ از روئے شرع کوئی فعل مباح ہو) کعبی کی اس توجیہہ نے کثیر نظار کے لئے اشکال پیدا کیا، ان میں سے بعض نے تو اس کے جواب سے عجز کا اعتراف کر لیا جیسے ابوالحسن آمدی، ایک گروہ نے اسے قوی قرار دیا اس امر پر بناء کرتے ہوئے کہ کسی شیٔ سے نہی اس کی ضد کا امر ہوتا ہے جیسے ابوالمعالی، بعض نے کہا یہ اس میں تب جب اس کی اضداد محصور ہوں لیکن جن کی اضداد محصور نہ ہوں تو اس سے نہی اس کی اضداد میں سے کسی ضد کا امر نہ ہو گا جیسے واجب مطلق اور واجب مخیرّ کے مابین فرق کیا جاتا ہے تو مخیرّ بارے کہا جاتا ہے یہ تین امور میں سے ایک کا امر ہے اور مطلق بارے کہا جاتا ہے کہ قدرِ مشترک کا امر ہے ! ہم نے ابوالبرکات کو دیکھا ہے کہ اس طرف میلان رکھتے ہیں، کعبی کو ان حضرات نے یہ الزامی جواب دیا کہ اگر کوئی حرام کا ترک کسی اور حرام کے ساتھ مشغولیت سے کرے؟ وہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پر ہے کہ تمام محرمات کا ترک کر کے وہ کچھ کرے جو محرم نہیں، یا تو مباح یا مستحب اور یا واجب

تحقیق الامر یہ ہے کہ ہمارا قول کہ کسی شیٔ کا امر اس کی ضد یا اضداد سے نہی ہے اور اس سے نہی اس کی ضد یا یکے از اضداد کا امر ہے ہمارے اس قول کی جنس سے ہے کہ کسی شیٔ کا امر اس کے لوازم کا (بھی) امر ہے اور جس کے بغیر واجب پورا نہ ہو تا ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے اور کسی شیٔ سے نہی اس سب سے نہی ہے کہ اس شیٔ سے اجتناب پورا نہ ہوتا ہو مگر ان سے باز رہ کر بلکہ ہر شیٔ کا وجود اسی طرح ہی اس کے وجود کو اور اس کے اضداد کے انتفاء کو مستلزم ہوتا ہے اور اس سے عدم نہی بلکہ ہر شیٔ کا عدم اس کے ملزومات کے عدم کو مستلزم ہوتا ہے اور جب وہ معدوم نہ ہوتا ہو مگر ضد کے ساتھ جسے وہ خلق کرے جیسے اکوان تو اس کے عدم کے وقت اس کے بعض اضداد کا وجود لازم ہے تو یہ فی نفسہ حق ہے لیکن یہ لوازم ضرورتِ وجود سے آئے ہیں اگرچہ اس کا مقصود امر نہیں، قصداً جس کے کرنے کا امر کیا جائے، کے مابین اور جو وجود میں اسے لازم آتا ہے، کے مابین فرق ثابت ہے

تو اول مذموم اور ترک پر قابلِ عقاب ہو گا بخلاف ثانی کے تو مثلاً جسے حج یا جمعہ کا حکم دیا گیا اور اس کی جائے سکونت بعید ہے تو اس پر ہے کہ مکانِ بعید سے سعی کرے اور جو قریب ہے اس کی سعی مکانِ قریب سے ہے (قولہ تعالیٰ: فَاسْعَوْا إِلىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ کی طرف اشارہ ہے) تو مسافت کا طے کرنا مامور بہ کے لوازم سے ہے اس کے باوجود اگر ان دونوں نے جمعہ اور حج کا ترک کیا تو دور والے کی عقوبت مکانِ قریب والے کی عقوبت سے زیادہ نہ ہو گی بلکہ بالعکس یہ اولی ہے کیونکہ دور والے کا ثواب اعظم ہے تو اگر لوازم امر کے لئے مقصود ہوں تو ان کے ترک پر عقوبت کا سزاوار بنے تو یوں بعید مکان والے کی عقوبت زیادہ ہوتی اور یہ قطعاً باطل ہے، اسی طرح اگر مامور بہ کو بجا لایا تو اس کے اضداد کا ترک ضروری ہے لیکن ترکِ اضداد جو مامور بہ کے فعل کے لوازم

سے ہے مقصود للا مر نہیں اس طور کہ اگر مامور بہ کا ترک کرے تو اس کے ترک پر عقوبت دی جائے نہ کہ فعلِ اضداد پر جن کے ساتھ مشغول ہوا اور اسی طرح منہی عنہ ہے، نا ہی کا مقصود اس (منہی عنہ) کا عدم ہے، اس کا مقصود اس کے اضداد میں سے کسی شئ کا کرنا نہیں، اگر اس کی کسی ضد کے ساتھ متلبس ومشغول ہوتے ہوئے اس کا ترک کیا تو یہ ضرورتِ ترک سے ہوگا

اس پر اگر ایک حرام کا ترک کسی اور حرام کے ساتھ اشتغال کے ساتھ کیا تو اس ثانی پر یہ عقوبت دیا جائے گا اور یہ نہ کہا جائے گا کہ فعلِ واجب کیا ہے اور یہ اول کا ترک، اس لئے کہ مقصود اول کا عدم ہے تو وہ مباح جس کے ساتھ کسی حرام سے مشغول ہوا وہ مامور بہ نہ تھا اور نہ اس کے امتثال کے ساتھ وہ امر مقصود کے لحاظ مامور تھا لیکن حرام سے نہی کیا گیا اور منہی عنہ کے ترک کی ضرورت سے ہے کہ اس کی اضداد میں سے کسی ضد کے ساتھ مشغول ہو تو منہی عنہ کے ترک کی وجہ سے یہ لازماً واقع ہوگا لیکن یہ واجب محدود نہیں ہمارے اس قول کی رو سے کہ واجب وہ جس کا تارک ذم اور عقاب کا مستحق ٹھہرے، یا بالفاظِ دیگر اس کا ترک ذم وعقاب کے لئے سبب ہو، تو ہمارا قول کہ جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے یا (بالفاظِ دیگر) واجب تک توصُّل اس کے ساتھ جو واجب نہیں ایجابِ لوازم کو متضمن ہے اور اول وثانی واجب کے مابین فرق ثابت ہے تو اول کا تارک مذموم ومعاقَب ہے جبکہ ثانی وقوع کے اعتبار سے واجب ہے یعنی اس کے بغیر اس کا حصول نہیں ہوتا اور اس کا امر امر بالوسائل ہے اور اس پر یہ مُثاب ہے (یعنی ثواب کا حقدار) لیکن بہرحال اس کے ترک پر کوئی عقوبت نہیں، اسی باب سے یہ کہ اگر مردار جانور ذبیحہ کے ساتھ مشتبہ ہوا تو محرم جس کے فعل پر عقوبت ہے ان دونوں میں سے ایک ہے کہ اگر مثلاً دونوں کو اکٹھے کھالے تو اس کی عقوبت اس شخص کی سی عقوبت نہیں جس نے دو مردار کھائے بلکہ اس کی سی جس نے ایک مردار کھایا، دوسرے کا ترک واجب ہے وجوبِ وسائل کی طرح کا وجوب، تو جس نے کہا دونوں محرم ہیں اس اعتبار سے اس کا قول صحیح ہے اور جس نے کہا نفس الامر میں دونوں میں سے ایک محرم ہے اس کا قول بھی اس اعتبار سے درست ہے اور یہ قائل کے اس قول کی نظیر ہے کہ واجب تک توصل اس کے ساتھ واجب ہے جو (خود) واجب نہیں

ابو حامد غزالی اور ابو محمد مقدسی کا اس قول کے قائل پر انکار اور اس کے جس نے کہا محرم دونوں میں سے ایک ہے فقہاء کے طریقہ کے مناسب نہیں ہے اور اس کا حاصل لفظی نزاع کی طرف راجع ہے تو ایک کے لئے جو وجوب وحرمت ثابت ہے وہ دوسرے کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک اور نوع ہے حتی کہ اگر مثلاً کسی کی لونڈی رات کے وقت کسی اور لونڈی کے ساتھ مشتبہ ہوگئی اور اس نے اجنبیہ (کو اپنی لونڈی سمجھ کر اس) سے وطی کر لی، ایک سے وطی کو حلال اور دوسری سے وطی کو حرام کا اعتقاد رکھتے ہوئے تو اس کی مملوکہ سے اس کا ولد اگر ہوا تو وہ ثابت النسب ہوگا بخلاف دوسری کے، اگر بالفرض وہ کسی اجنبیہ کے ساتھ مشتبہ ہوئی اور دونوں میں سے ایک سے اس نے شادی کر لی تو مثلاً اگر حد لگائی گئی پھر دوسری سے شادی کی تو دو حدیں نہ ماری جائیں گی، پھر یہ امر ملحوظ رہے کہ اس میں حد نہیں ہے اس امکان کے پیشِ نظر کہ منکوحہ اجنبیہ ہو، اس کے ساتھ کعبی کا وارد کردہ اعتراض ختم ہو جاتا

ہے تو محرم کا ترک مقصود ہے اور اس کی اضداد میں سے کسی ضد کے ساتھ مشغولیت وسیلہ ہے! تو جب کہا گیا مباح واجب ہے تو یہ وسائل کے وجوب کے معنی میں ہے یعنی اس کے ساتھ کبھی فعلِ واجب اور ترکِ محرم کی طرف توسل کیا جا سکتا ہے، تو یہ حق ہے

پھر اس میں قصد کا اعتبار ہے تو اگر انسان قصد کرے کہ کسی مباح فعل کے ساتھ مشغول ہو تا کہ محرم کا ترک کر دے مثلاً جو (بتقضائے شہوت) اپنی بیوی کی طرف نظر اور وطی کے ساتھ مشغول ہو کہ تا کہ اس ذریعہ سے اجنبیہ کی طرف نظر اور وطی سے بچ جائے یا کوئی حلال طعام کھا لے کہ تا کہ اس کے ساتھ مشغول ہو کر حرام طعام سے بچ جائے تو اسے اس نیت و فعل پر ثواب ملے گا جیسا کہ ایک حدیث میں یہی بات کہی کہ: (فِیْ بِضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ) (یعنی تمہارا جماع کرنا بھی صدقہ۔ یعنی قابلِ ثواب۔ ہے) عرض کی یا رسول اللہ ہم تو اپنی شہوت پوری کریں اور ہمیں اس پر اجر ملے؟ فرمایا اگر یہی کام حرام طریقہ سے کرو تو گناہ نہ ملے؟ عرض کی جی ہاں، فرمایا تو حلال طریقہ سے شہوت پوری کرنے پر اجر ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ حرام فعل تو قابلِ حساب بنے حلال نہیں، اسی سے آپ کا یہ فرمان کہ اللہ کو پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں اور سہولتوں سے مستفید ہوا جائے جیسے اسے یہ امر ناپسند ہے کہ اس کی معصیت کی جائے، اسے احمد نے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا

کہا جا سکتا ہے کہ مباح اس اعتبار سے کبھی واجب بن سکتا ہے اگر اسی کے ذریعہ سے ہی واجب فعل کی ادائیگی متعین ہو تو وہ معین واجب ہوا وگرنہ مخیّر واجب، لیکن اس قصد کے ساتھ لیکن اگر یہ قصد نہیں تھا تب وہ اصلاً واجب نہ ہو گا مگر ترک کی نسبت وجوبِ وسائل کی مثل، ترکِ محرم میں قصد مشترک نہیں ہوتا تو اسی طرح اس میں بھی جس کے ساتھ اس کی طرف توسل کیا جائے، تو جب کہا گیا یہ اس کے نفس کی جہت سے مباح ہے اور مخیّرات کبھی وسیلہ کی جہت سے واجب ہو جاتے ہیں تو یہ کہنا منع نہیں، تو اس باب میں نزاع لفظی و اعتباری ہے وگرنہ معانی صحیحہ کی فہم میں کوئی منازعت نہیں کرتا، یہاں مقصود یہ ہے کہ ابرار اور اصحاب الیمین کبھی ایک مباح کے ساتھ دوسرے مباح سے مشغول ہو جاتے ہیں تو ان کے حق میں ان دونوں مباح کاموں کا وجود اور عدم ایک برابر ہوتا ہے لیکن جو سابقین مقربین ہیں تو وہ مباحات کا اسی صورت استعمال کرتے ہیں جب وہ طاعات ہوں، ان میں حسنِ قصد کی رو سے اور اللہ کی طاعت پر استعانت کرتے ہوئے اور تب ان کی مباحات بھی طاعات بن جاتی ہیں اور جب معاملہ اس طرح ہے تو ان کے حق میں افعال وہی ہوں گے جن کا وجود مترجح ہو تو شرعاً بطور امرِ استحباب یہ مامور ہوں گے یا جن کا عدم مترجح ہو تو ان کے لئے افضل یہ ہو گا کہ انہیں نہ کریں اگر چہ کرنے سے کوئی گناہ لازم نہیں آتا، شریعت نے تمام افعال کے احکام بیان کر دئے ہیں تو یہ ایک سوال ہے

دوسرا سوال یہ ہے اگر بالفرض افعال میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن میں نہ امر ہے اور نہ نہی، جیسا کہ ابرار کے حق میں ہے تو یہ فعل نہ قابلِ مدح اور نہ قابلِ ذم ہے، نہ محبوب اور نہ مبغوض ہے اور اس میں پیشِ نظر صرف تقدیر کا وجود اور عدم ہوتا ہے بلکہ اگر کریں تو ان کی تعریف نہ کی جائے گی اور نہ کریں تو بھی، تو ایسے افعال کو ان میں سے باور نہ کیا جائے جن کے کرنے پر ان کی تعریف کی جائے

کہ وہ اس فعل میں غسال کے سامنے میت کی مانند ہوں اس امر کے باوجود کہ یہ فعل ان کے اختیار وارادہ سے صادر ہوا ہے کہ کلام اسی بارے ہے ! جہاں تک غیر اختیاری افعال اور یہ جو کسی کے ساتھ کر دئے بالجبر جائیں جیسے کسی کو اغوا کر لیا جائے اور وہ امتناع کی استطاعت نہیں رکھتا تو یہ خارج از تکلیف ہے حالانکہ اس کے مثل میں بندہ مامور ہے کہ اگر وہ حسنہ ہے تو اس سے محبت کرے اور اگر سیئہ ہے تو اس سے بغض رکھے اور اگر نہ حسنہ ہے اور نہ سیئہ تو دونوں جذبوں سے خالی ہو تو جس نے اختیاری قدری افعال میں انسان کو غسال کے آگے میت کے لاشہ سے تشبیہ دی اس نے گویا اختیاری افعال میں اس سے امر ونہی کو رفع کر دیا اور یہ باطل ہے، تیسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قول کی حقیقت بندے سے ان احوال میں امر اور نہی کی بساط لپیٹ لینے کے مترادف ہے اس کے افعال کے اختیاری ہونے کے باوجود اور فرض کرو کہ اس کے لئے ہویٰ نہیں ہے تو ہر جس کے لئے ہویٰ نہ ہو اس سے اس میں امر اور نہی ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر واجب ہے کہ اللہ ورسول کے محبوبات سے حب اور ان کے مبغوضات سے بغض رکھے

فصلِ خطاب یہ ہے کہ کبھی سالک پر امر اور نہی کا معاملہ مخفی رہ سکتا ہے اس طور کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ کیا یہ فعل شرعاً مامور ہے یا منہی عنہ ہے کہ اس کی ہویٰ باقی رہے تا کہ اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض وہویٰ نہ ہو پھر اس میں وہ تقدیر کے لئے مستسلِم ہو جائے گا اور یہ فعل میں، یہ صورتحال کثیر ائمہ عباد اور ائمہ علماء کو پیش آئی تو کبھی ان کے ہاں ایسے افعال واقوال ہوتے ہیں جن میں انہیں اللہ کے حکمِ شرعی کی معرفت نہیں ہوتی بلکہ ان کے ہاں ادلہ باہم متعارض ہوتی ہیں یا بالکلیہ ہی نہیں ہوتیں تو شرع مخفی ہونے کی وجہ سے وہ معذور باور ہوں گے، حکمِ شرع دراصل بندے کے حق میں تب ثابت ہوگا جب وہ اس کی معرفت سے متمکن ہو لیکن جو اس تک نہ پہنچ سکا اور اس کی معرفت سے متمکن نہ ہو سکا تو وہ اس کا مطالَب نہیں، اس کے ذمہ بس یہ ہے کہ حسبِ استطاعت اللہ سے ڈرے اور یہ خطا فی العلم ہے خطا فی العمل نہیں، وہ مخطئ مجتہد کی طرح ہے جسے اس کے قصد واجتہاد پر اجر ہوگا اور اس کی یہ خطا اس سے مرفوع ہے (جیسا کہ ایک حدیث میں یہ بیان ہوا)

اگر کہا جائے جب معاملہ یہ ہے تو بندے پر واجب یہ ہے کہ اس طرح کے حال میں توقف کرے، جب اس کے لئے یہ واضح نہ ہو سکے کہ یہ فعل مامور بہ ہے یا منہی عنہ اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا کام کرے جس میں نہ مدح ہو اور نہ ذم تو ٹھہر جائے، تقدیر کے لئے مستسلم نہ بنے اور اپنے میں مستعمل افعال کے لئے محل بنے الا یہ کہ اس کا غیر کوئی فعل کرے تو وہ نہ اس کی مدح کرے اور نہ ذم، نہ اس پر راضی ہو اور نہ ناراض جب اس کے لئے اس کا حکم متبین نہ ہو، جہاں تک اس کا اس کے اختیاری افعال سے ہونا کہ تقدیر کے اس میں استعمال کردہ کے لئے مستسلم بنے جیسے طفل دایہ اور میت غسال کے ساتھ ہو تو اس کا نہ اللہ نے حکم دیا ہے اور نہ اس کے رسول نے بلکہ یہ محرم ہے اگر چہ اس کے صاحب سے درگزر کر دیا جائے اور وہ گمان کرے کہ اسے اس کے اجتہاد اور حسنِ قصد کے مدِ نظر معاف کر دیا گیا ہے، جہاں تک اس پر اس کا محمود ہونا اور اسے افضل المقامات قرار دیا جانا تو معاملہ ایسا نہیں، اس کا اپنی ہویٰ سے مجرد ہونا اس کے لئے اس امر کو مسوِغ نہیں کہ ہر جو اس کے ساتھ کیا جائے، وہ اس کے لئے مستسلم ہو! پھر کہا جائے گا اس کے ساتھ معاملہ کے دو پہلو ہیں :

ایک کہ بغیر اس کے اختیار کے اس کے ساتھ کیا جائے جیسے کسی کو اٹھایا جائے اور اس کے پاس بچنے کی طاقت نہ ہو اور جیسے کسی خاتون سے زبردستی کی جائے تو اس میں علماء کے بالاتفاق اس کے ذمہ گناہ نہیں اور یا کہ شرعی اکراہ کے ساتھ اسے مجبور کیا جائے کہ فلاں کام کرے تو جمہور کے نزدیک افعال میں یہ بھی قابلِ درگزر ہے، احمد سے اصح الروایتین بھی یہی ہے، اس قولہ تعالیٰ کے مدِنظر:

(وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَإِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) [النور : ۳۳] (اور جو ان کو مجبور کرے گا تو ان کے مجبور کئے جانے کے بعد اللہ بخشنے والا مہربان ہے) لیکن اگر شرعی اکراہ کا وجود نہ تھا تو اس فعلِ مطلق کے لئے استسلام مامور بہ نہیں جس کی بابت اسے پتہ نہیں کہ وہ خیر ہے یا شر؟ اگر چہ اس کے ہاتھوں کسی خرقِ عادت کا ظہور ہو یا نہ ہو، بہرحال انسان اسی کے کرنے کا مامور ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے ہاں خیر کا فعل ہے! کہا گیا یہ سوال صحیح ہے اور حقیقتِ امر یہ ہے کہ سالکین جب اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں تو رب تعالیٰ کے لئے ان کا قصدِ تسلیم اور خضوع حسن ہوتا ہے اور اس سے ان کی یہ طلب کہ ان کے لئے وہ کچھ اختیار کرے جو ان کے لئے اصلح ہے جب یہ ایسے مامور میں استعمال کئے جائیں جن کی بابت شرعی حکم سے یہ نابلد ہیں تو انہیں امید ہوتی ہے کہ یہ خیر ہو، اس لئے کہ حکم کی معرفت کبھی ان کے لئے متعذر رہو گی، انسان کو ہر وقت پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے دین میں اس کے لئے کیا اصلح اور اللہ و رسول کے لئے کیا اَرضیٰ ہے تو ان کا حال اللہ سے استخارہ (یعنی طلبِ خیر) کرنے والے کی مثل ہے ان امور میں جن کی عاقبت سے اسے آگہی نہیں جب وہ کہے: (اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ الخ) تو جس کام کے لئے اسے شرحِ صدر حاصل ہو اور امور میں سے جو اس کے لئے میسر ہو وہی اللہ نے اس کے لئے اختیار کیا ہو گا جب اس کے ساتھ کوئی شرعی دلیل نہ ہو کہ عین اسی فعل کا اس حال میں وہ مامور ہے، شرعی ادلہ دراصل عام و مطلق فعل کا امر دیتی ہیں، نہ کہ ہر فاعل سے ہر فعل کی عین کا، کہ یہ ممتنع ہے اور اگر چہ اس معین فعل کا شارع کے بعض خطابِ عام کے تحت اندراج ممکن ہو جب معین افراد (یعنی جزئیات) کلی امرِ عام کے تحت داخل ہوں لیکن ہر ایک تو اس کے استحضار پر قادر نہیں ہوتا اور نہ انواعِ خطاب کے استحضار پر، اسی لئے فقہاء اس کے اپنے پر مخفی ہونے کی صورت میں قیاس کی طرف عدول کرتے تھے

پھر قیاس بھی تو ہر واقعہ میں حاصل نہیں ہوتا، یہ تو کبھی مجتہد صحابہ کرام اور تابعین عظام پر بھی کسی معین واقعہ کا خطابِ عام کے تحت دخول کا معاملہ مخفی رہ جاتا تھا یا ان کے لئے نظیر کے ساتھ ان کے اعتبار کا، تو ان کے لئے اصل اور نظیر کی معرفت ہی نہ ہو سکے، یہ باوجود ان کی شارع کے خطاب اور اس کے معانی کی معرفت اور احکام پر اس کی دلالت میں کثرتِ نظر کے تو اس کا کیا حال ہو جو ایسا نہیں! پھر سالک کا قصد حلال و حرام کی معرفت نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ معین فعل اس سے اور وہ اس سے بہتر ہے اور یہ کہ اس حال میں اس کے حق میں کون سا امر زیادہ پسندیدہ ہے، یہ ایک وسیع باب ہے جس کا احاطہ اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا اور ہر سالک کے لئے اسی کے ساتھ خاص حال ہے، کبھی اسے وہ حکم دیا جاتا ہے جس سے اس کے غیر کو منع کیا جاتا ہے اور

کبھی کسی حال میں اسے اس فعل سے منع کیا جاتا ہے جس کا اس کے غیر کو حکم دیا جاتا ہے، تو ان کا کہنا کہ ہم حسبِ امکان فعلِ خیر کرتے ہیں اور یہ اس کا فعل جو ہم نے جان لیا کہ ہم اس کے مامور کئے گئے ہیں اور ہم اصلِ شر کے تارک ہیں اور یہ ہوائے نفس ہے اور اس کے ماسوا میں ہم اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ ان افعال کی توفیق دے جو اسے زیادہ سے زیادہ پسند اور زیادہ اس کی رضا کا باعث ہیں تو ہم سے جو افعال سرزد ہوئے ہم امید کرتے ہیں کہ اسی باب سے ہوں گے، پھر اگر ہم درستگی کو پہنچے تو ہمارے دو اجر ہیں، بصورتِ دیگر ایک اجر، اور ہماری خطا ہم سے محطوط (یعنی معفو) ہے اور تب جس نے اندازہ لگایا کہ اس نے مشروع کو جان لیا اور اس پر عمل بھی کیا وہ اس سے افضل ہے لیکن کثیر لوگ مشروع کو جان لینے کے باوجود عمل پیرا نہیں ہوتے اور اللہ کی طرف احب الامور کا قصد نہیں کرتے اور کثیر ایسے بھی ہیں جو اسے ہوائے نفس کے حسب کرتے ہیں تو یہ مشروع فعل ہویٰ کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے اور یہ اس کا ترک جس کی بابت معلوم نہ کیا جا سکے کہ وہ مشروع بلا ھوی ہے تو یہ نقص فی العلم اور وہ نقص فی العمل ہے کیونکہ ہوائے نفس کی رو سے عمل نقص فی العمل ہے اگرچہ مفعول واجب ہی ہو، تو کہا جائے گا اگر صاحبِ ہویٰ اپنی ہویٰ سے تائب ہو جائے تو یہ اس کیلئے رفعتِ علم کا سبب ہوگا لیکن اگر توبہ نہ کی تو اس کے لئے عالمِ سوء سے حظ ونصیب ہے، متقدمین میں سے عام الحکمین اس کے مثل میں دو افراد باہم متشاجر ہوئے تو ایک نے دوسرے سے کہا تمہاری مثال کتے کی مثال ہے کہ اگر:

(اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ) [الأعراف : ۱۷۶] (اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے) اس پر دوسرے نے کہا تمہاری مثال: (كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا) [الجمعة : ۵] (گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں) ہو تو یہ قصد کے لحاظ سے احسن اور علماً اقوی ہے اسی لئے تم حسنِ قصد والوں کو پاؤ گے کہ انہیں خواہش پرستی اور حبِ جاہ و مال کے ساتھ معیب کرتے ہیں جبکہ اہلِ علم انہیں شرع بارے نقصِ علم اور امر ونہی سے ان کے عدول کے ساتھ معیب کرتے ہیں، فہذا ھذا، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے، ان کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کا اور ان کی رفاقت عمدہ اور خوب ہے

بعض اہلِ فقہ و زہد کا قول ہے کہ لوگوں میں سے بعض شریعت کے اور بعض حقیقت کے سالک ہوتے ہیں! شائد ان کا اشارہ انہی فریقین کی طرف ہے تو یہ اسے ترجیح دیتے ہیں جو اللہ نے آسان کیا ہو حسنِ قصد اور انہیں معلوم اتباعِ امر ونہی کے ساتھ اپنے لئے اس متیسر میں ادلہ شرعیہ کے خفاء کے باوجود جبکہ وہ ظواہر، قیاسات، اخبارِ آحاد اور اقوالِ علماء کو ادلہ شرعیہ کی رو سے ترجیح دیتے ہیں اپنے لئے متیسر امر کے خفاء کے باوجود، نیز یہ کبھی اس فعلِ مقدر میں جو مصلحت و خیر ہوتی ہے اس کے شاہد ہوتے ہیں تو بحکم الایمان اسے ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اس کے حسن ہونے پر نص سے دلیل کے عارف نہ ہوں جبکہ وہ نصوص اور ان سے مستنبط (معانی وافکار) کو ترجیح دیتے ہیں تو ان کے لئے قرآن اور ان کے لئے ایمان ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں پر

وہ حق مخفی ہوا جو دوسرے گروہ کے ساتھ ہے اور دونوں کی طریقت میں حق بھی موجود ہے اور باطل بھی، جہاں تک بغیر شرعی امر و نہی کی مراعات کئے حقیقت کے مدعی حضرات تو وہ گمراہ ہیں، ان کی مانند جو امر و نہی کی معرفت ہونے کے باوجود اپنے حسبِ خواہش کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں، تو یہ فساق ہیں انہی کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ فاجر عالم اور جاہل عابد کے فتنہ سے ڈرو کہ ان کا فتنہ ہر مفتون کے لئے فتنہ ہے، حقیقت کبھی قدری اور کبھی ذوقی ہوتی ہے اور کبھی شرعی، لفظِ شرع منزّ ل، مؤ ول اور مبدّ ل کو متناول ہے یہاں مقصود دونوں گروہوں اور اہلِ کلام کے اہلِ استقامت کا ذکر ہے اہلِ عبادت و ارادت کے حال پر جو ہوائے نفس سے نکل آئے اور یہ طبعی فرق ہے اور اس کے ساتھ قائم ہوئے جو شرعی فرق سے انہوں نے جان لیا

باقی رہی قسمِ ثالث تو ان کے لئے اس میں نہ فرقِ طبعی اور نہ فرقِ شرعی ہے تو یہ جس میں وہ فعل وقدر کے ساتھ جاری ہوئے لیکن جو فرقِ طبعی کے ساتھ چلے یا تو جانتے ہیں کہ وہ گناہ گار ہیں اور یہ فاجر عالم یا قدر اور اپنے ذوق و وجد کے ساتھ احتجاج اور کتاب و سنت سے اعراض کرتے ہوئے اور یہ جاہل عابد تو یہ صراطِ مستقیم سے خارج ہیں اور اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا کمالِ حال ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اس امت کے خیر القرون ہیں کہ وہ خلافتِ نبوت (کے ایام) میں جلیل و دقیق امور میں اتساعِ امر کے باوجود فروقِ شرعیہ کے ساتھ قائم ہوتے تھے اور متاخرین سے بعض ان امور میں جو انہیں خاص ہیں شرعی فروق کی معرفت سے عاجز رہ جاتے ہیں جیسا کہ ان میں سے کوئی امرِ قلیل میں اپنی ہوی کی اتباع کرتا ہے تو وہ حضرات امر و نہی میں سے جس میں داخل ہوئے اس کے عظیم ہونے کے باوصف ایسے علم کے حامل ہیں جس کے ساتھ وہ حسنات اور سیآت کے درمیان پرکھ کر سکتے ہیں اور ایسے قصدِ حسن کے مالک ہیں جس کے ساتھ فعلِ حسنات کرتے ہیں جبکہ کثیر متاخرین اہلِ علم اور اہلِ عبادت کثیر حسنات و سیآت میں علم سے محرومی کا شکار ہیں حتی کہ سیئہ کو حسنہ اور حسنہ کو سیئہ خیال کر لیتے ہیں اور جن مسائل میں ان کے لئے امر و نہی واضح بھی ہو ان میں بھی خواہش کی پیروی کرتے ہیں تو ہماری اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے

بخدا جب عالم کے پاس وہ کچھ ہو جو شارع کا امر اور نہی ہے تو یہی حقیقت ہے اور عابد کے پاس خالی از ہویٰ حسنِ قصد ہو تو یہی حقیقت ہے لیکن جنہوں نے شرعِ منزل کو مبدل اور مؤ ول کے ساتھ خلط کر لیا اور قصدِ حسن کو اتباعِ ہویٰ کے ساتھ تو یہ دونوں فریق اپنے علم و عمل میں مخلط ہیں (یعنی حق اور باطل کی آمیزش کرنے والے) اور ان کی علم میں تخلیط اُن کی عمل میں تخلیط کے برابر ہے اور ان کے غیر کی اور ان کی قصد میں تخلیط ان کی اور ان کے غیر کی علم میں تخلیط کے برابر ہے تو جس نے اس پر عمل کیا جو جان لیا اللہ اسے اس کا علم بھی عطا کرے گا جو ہنوز نہیں جانا اور حسنِ قصد علم کے حصول و نیل میں مددگار ترین اشیاء میں سے ہے جبکہ شرعی علم حسنِ قصد اور عملِ صالح پر مددگار ترین اشیاء میں سے ہے تو علم قائد اور عمل سائق ہے اور نفس حرون (یعنی ٹھیک ٹھیک دام لگاتا ہے) ہے تو اگر اس کا قائد سست و کمزور ہے تو نفس اپنے سائق کے لئے مستقیم نہ ہوگا اور اگر

اس کا سائق سست وکمزور ہے تو یہ اپنے قائد کے لئے مستقیم نہ ہوگا تو اگر علم کمزور پڑا تو سالک حیرت میں گم ہو جائے گا اور اسے پتہ نہ ہوگا کہ کیسے سلوک کی منازل طے کرے تو اس کی غایت یہ ہے کہ تقدیر کے لئے مستطرح ہو (یعنی اس کے آسرے رہے کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا) اگر سالک عمل چھوڑ بیٹھا تو راہ سے ہٹ جائے گا اور ان جانی راہوں کا راہی بن جائے گا، اپنے اس علم کے ساتھ کہ تارک بنا ہے تو یہ حائر وسرگرداں سالک ہے، نہیں جانتا کہ کیسے چلے باوجود کثرتِ سیر کے منزل نہ ملے گی اور جانتے بوجھتے راہ سے ہٹا ہوا ہے اور لغزش کھایا ہوا ہے، فرمایا:

(فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ) [الصف : ۵] (تو جب ان لوگوں نے کجروی کی اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے) یہ جاہل اور وہ ظالم ہے، فرمایا:

(وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا) [الأحزاب : ۷۲] (اور انسان نے اس کو اٹھالیا بے شک وہ ناعاقبت اندیش اور لاپرواہ تھا) یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جہل اور ظلم باہم متقارب ہیں لیکن جاہل نہیں جانتا کہ وہ ظالم ہے اور ظالم علم سے مانع حقیقت سے جاہل ہے، فرمایا:

(اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ) [النساء : ۱۷] (اللہ انہیں لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں) ابوالعالیہ کہتے ہیں میں نے اصحابِ محمد سے (اس آیت کے معنی بارے) سوال کیا تو انہوں نے کہا ہر جس نے اللہ کی نافرمانی کی وہ جاہل ہے اور ہر جس نے مرنے سے قبل توبہ کر لی اس نے (مِنْ قَرِيْبٍ) توبہ کر لی (یعنی ابھی وقت تھا) خلال نے ابوحیان تیمی سے نقل کیا کہ علماء تین طرح کے ہیں: ایک عالم باللہ، جو اللہ کے امر کا عالم نہیں ہے، دوم اللہ کے امر کا عالم مگر وہ عالم باللہ نہیں اور سوم عالم باللہ اور عالم بامر اللہ تو عالم باللہ جو اس کی خشیت کا حامل ہے اور اللہ کے امر کا عالم جو اس کے امر اور نہی کا عارف ہے، بقول ابن تیمیہ خشیت خواہش کی اتباع سے مانع ہے، فرمایا:

(وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى) [والنازعات : ۴۰-۴۱] (اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور نفس کو خواہشوں سے روکتا رہا۔اس کا ٹھکانہ بہشت ہے) عدم ہوی میں اور علم میں کمال جناب خاتم الرسل کے لئے تھا جن کے بارہ میں کہا:

(وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى) [والنجم: ۱-۴] (تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارا ساتھی نہ راستہ بھولا نہ بھٹکا ہے۔اور نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔یہ تو وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے) تو آپ سے ضلال اور غی کی نفی کی اور اس امر کے ساتھ آپ کو موصوف کیا کہ آپ اپنی ہویٰ سے بولتے ہی نہیں تو ھویٰ کی نفی کی اور علمِ کامل کا اثبات کیا اور یہ وحی تو یہ کمالِ علم اور وہ کمالِ قصد ہے اور آپ

کے اعداء کو ان دونوں کی ضد کے ساتھ موصوف کیا چنانچہ کہا:

(اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى) [والنجم : ۲۳] (یہ لوگ محض ظن اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے) تو انسان کے لئے کمالِ مطلق اللہ کے لئے علماً اور قصداً عبودیت کی تکمیل ہے، فرمایا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ)[والذاریات : ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں)

(وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا) [الجن : ۱۹] (اور جب اللہ کا بندہ اس کی عبادت کو کھڑا ہوا تو قریب تھے کہ کافر اس کا گھیراؤ کرلیں) ابلیس کی بات نقل کرتے ہوئے کہا:

(فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ) [ص: ۸۲-۸۳] (مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوائے ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں) تو جواباً کہا:

(اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ) [الحجر : ۴۲](جو میرے بندے ہیں اُن پر تجھے کچھ قدرت نہیں) اور فرمایا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[یوسف : ۲۴] (یہ تاکہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں)

(اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ)[النحل :۹۹-۱۰۰] (کہ جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں اُن پر اُس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور اُنہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں اور اس کے سبب شریک مقرر کرتے ہیں) اور اس کی عبادت اس کے امر کی طاعت ہے اور ہمارے لئے اس کا امر وہی جو رسول اکرم نے ہم تک پہنچایا تو کمال اللہ اور اس کے رسول کی باطن وظاہر طاعت کے کمال میں ہے اور جسے اللہ کے امر کی معرفت نہ ہوسکی اور اپنی ہویٰ کا ترک کر کے تقدیر کے لئے استسلام کیا یا طاعت میں اجتہاد ومحنت کی اور خطا کا مرتکب ہوکر ما مور بہ کے فعل کے بجائے کسی اور کو ما مور بہ سمجھ کر عمل کرلیا، یا اس کے ہاں ادلہ باہم متعارض تھیں تو نفس الامر میں جو طاعت کا فعل تھا اس سے توقف کرلیا تو یہ سب اللہ کے مطیع شمار ہوں گے اور ثواب کے حقدار ہیں اس حسنِ قصد پر جو اللہ کے لئے روا رکھا اور اپنی بساط کے مطابق اللہ کی طاعت میں سرگرداں ہوئے اور جس کے علم سے عاجز ہوئے تو غلطی سے اس کے غیر کی طرف چلے گئے تو یہ مغفورلہم ہیں

اور یہ فتن کے اسباب سے ہے جو اس امت میں واقع ہوں گے تو کئی لوگوں سے ایسے اقوال وافعال کا صدور ہوگا جو ان کے اجتہاد اور کوشش کے غماز ہوں گے مگر ان میں وہ غلطی کے مرتکب ہوئے ہوں گے تو ان کی خبر جب کئی حضرات کو ہوگی تو وہ

خیال کریں گے کہ جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب کیا ہے یا یہ خیال کہ بوجہ خطا کے انہیں عذر کا فائدہ نہ ملے گا اور یہ بھی خطا کار مجتہد ہی ہوں، اول اپنے فعل میں خطا کار مجتہد ہیں جبکہ یہ اپنے اس انکار وظن میں اور سبھی مغفور لہم ہیں، کبھی ایک مذنب بھی ہوسکتا ہے اور کبھی دونوں بھی مذنب ہو سکتے ہیں، خیر الکلام اللہ کی کلام اور خیر الہدی حضرت محمد کی ہدی ہے اور شر الامور محدثات (یعنی بدعات) ہیں اور ہر بدعت ضلالت ہے، ان میں سے کوئی کبھی امر و نہی کا بعض اختیار دیا جاتا ہے تو والی بنا تا، معزول کرتا اور عطا ومنع کرتا ہے تو گمان کرنے والا گمان کرتا ہے کہ یہ کمال ہے! کمال تبھی ہوگا جب امر کے لئے موافق ہوگا تو اللہ کے لئے طاعت گزار ہوگا وگرنہ تو وہ بادشاہت اور بادشاہوں کے افعال کی جنس سے ہے، گناہ یا عفو اور یا طاعت، تو خلفائے راشدین کے افعال طاعت اور عبادت ہیں اور وہ العبد الرسول کے اتباع تھے اور یہ سابقین مقربین کا طریقہ ہے اور جہاں تک عادل بادشاہوں کا طریقہ تو یہ یا طاعت ہے اور یا عفو اور یہ ملوک انبیاء (مثلاً حضرات داؤد وسلیمان) کا طریقہ ہے اور ابرار اصحاب الیمین کا طریقہ! جہاں تک ظالم بادشاہوں کا طریقہ تو وہ معاصی کو متضمن ہے اور اپنے آپ پر ظلم کرنے والوں کا طریقہ ہے، فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَالْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ [الفاطر : ۳۲] (پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تو کچھ تو ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رَو ہیں اور کچھ اللہ کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں یہی بڑا فضل ہے) تو کوئی مومن اس امر سے خارج نہیں ہوتا کہ ان اصناف میں سے کسی سے شمار نہ ہو: یا تو لنفسہ ظالم یا مقتصد اور یا سابق بالخیرات، خوارق العادات یا تو مکاشفہ ہے اور یہ علمِ خارق کی جنس سے ہے اور یا تصرف ہے اور یہ قدرتِ خارقہ کی جنس سے ہے اور اس کے اصحاب (یعنی اہلِ مکاشفت) ان تینوں اقسام سے خارج نہیں ہوتے۔

فصل

شیخ الاسلام لکھتے ہیں کہ مجھے والد صاحب نے محی الدین بن نحاس سے بیان کیا اور میرا خیال ہے کہ میں نے خود بھی اسے ان سے سنا تھا کہ انہوں نے **خواب میں الشیخ عبدالقادر (جیلانی) کو دیکھا** وہ حق تعالی سے خبر دیتے ہوئے کہہ رہے تھے: جو ہماری طرف آئے ہم دُوا اور سے اسے لے لیں گے اور جو ہمارے حول کے ساتھ تصرف کرے ہم لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیں گے اور جس نے ہماری مراد کی اتباع کی ہم اس کی چاہت کو پورا کریں گے اور جس نے ہماری خاطر ترک کر دیا تو ہم اسے مزید سے بھی زیادہ عطا کریں گے، میں کہتا ہوں یہ رب تعالی کی جہت سے ہے، پہلی دو عبادت اور استعانت اور دیگر دو طاعت اور معصیت ہیں، اللہ کی طرف جانا (یعنی سلوک) اس اکیلے کی عبادت ہے جیسے (حدیثِ قدسی میں) کہا جو میری طرف بالشت بھر قریب ہوا میں اس کی طرف گز بھر متقرب ہوا اور جو میری طرف گز بھر قریب ہوا میں اس کی طرف دو گز بھر

قریب ہوا، جو میری چلتا ہوا آیا میں اس کی طرف بھاگتا ہوا آیا، اس کی حول کے ساتھ تقرب استعانت اور اس پر توکل ہے تو کوئی حول اور قوت نہیں مگر اللہ کے ساتھ، ایک اثر میں ہے جسے اچھا لگے کہ وہ اقوی الناس ہو جائے وہ اللہ پر توکل کرے، سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ توکل ایمان کا لبِ لباب ہے، اللہ تعالی نے کہا:

(وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ) [الطلاق : ۳](اور جو اللہ پر بھروسا رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا)

(اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَكُمۡ) [الأنفال : ۹] (جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کر لی) یہ اصح القولین کے مطابق اس پر توکل بارے ہے اور یہ اصح القولین کی رو سے دعا کے بمنزلہ ہے، جلبِ منافع اور دفعِ مضار کا سبب ہے تو یہ بندے کو قوت اور تصریفِ کون کا افادہ دیتا ہے لہذا متشرع اور غیر متشرع اصحابِ احوال پر یہی غالب ہے، اسی کے ساتھ وہ متصرف و مؤثر ہوتے ہیں، کبھی اس کے ساتھ جو امر کے موافق ہو اور کبھی اس کے ساتھ جو اس کے مخالف ہو، قولہ :(وَمَنِ اتَّبَعَ مُرَادَنَا) (یعنی جس نے ہماری مراد کی اتباع کی) یعنی مرادِ شرعی جیسے اللہ تعالی کا قول ہے:

(يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَ لَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ) [البقرة : ۱۸۵](اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا)

(يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّخَفِّفَ عَنۡكُمۡ) [النساء : ۲۸](اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے)

(مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ) [المائدة : ۶](اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا) یہ ہے اس کے امر کی طاعت، ایک حدیث میں ہے: (وَ اَنۡتَ يَا عُمَرُ لَوۡ اَطَعۡتَ اللّٰهَ لَاَطَاعَكَ) (اور تم نے اے عمر اگر اللہ کی مانی تو اللہ تمہاری مانے گا) ایک صحیح حدیث (قدسی) میں ہے اگر مجھ سے مانگے تو عطا کروں گا، میری پناہ میں آنا چاہے تو پناہ دوں گا، قرآن میں کہا:

(وَيَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ) [الشوری : ۲۶] (اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کی (دعا) قبول فرماتا اور ان کو اپنا فضلِ مزید عطا کرتا ہے) اور قولہ:(وَ مَنۡ تَرَكَ مِنۡ اَجۡلِنَا اَعۡطَيۡنَاهُ فَوۡقَ الۡمَزِيۡدِ) (جس نے ہماری خاطر ترک کیا ہم اسے مزید سے بھی زیادہ عطا کریں گے) یعنی اللہ کے محرمات اور مکروہات کا اللہ کی خاطر ترک امید، محبت اور خشیت کے جذبات کے ساتھ اس لئے کہ یہ مقامِ صبر ہے، فرمایا:

(اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ) [الزمر: ۱۰](جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا)۔

سوال

شیخ سے (غزالی کی کتاب) احیاء علوم الدین اور ابو طالب کی کتاب قوت القلوب بارے سوال ہوا تو جواب میں کہا:

جہاں تک کتاب قوت القلوب اور احیاء اس کے لئے تبع ہے اس امر میں جو وہ اعمالِ قلوب مثلا صبر و شکر، حب، توکل اور توحید ونحو ہا میں سے ذکر کرتے ہیں، ابو طالب حدیث واثر اور صوفیہ وغیر ہم سے اہلِ علومِ قلوب کی کلام کے غزالی کی

نسبت اعلم ہیں اور ان کی کلام زیادہ سدید اور تحقیق کے لحاظ سے اجود اور بدعت سے ابعد ہے البتہ قوت میں ضعیف اور موضوع احادیث بھی ہیں اس کے علاوہ اور بھی کثیر مردود اشیاء ہیں، احیاء میں مہلکات مثلاً تکبر، خود پسندی، ریا کاری اور حسد ونحو ہا بارے جو کچھ درج ہے اس کا اکثر حصہ حارث محاسبی کی (الرعایۃ) میں کلام سے منقول ہے اور اس میں سے کچھ مقبول اور کچھ مردود ہے اور بعض ایسی کلام بھی ہے جو متنازع فیہ ہے، احیاء میں کثیر فوائد ہیں لیکن اس میں مذموم مواد بھی ہے اس میں فلاسفہ کی کلام سے فاسد مواد ہے جو توحید، نبوت اور معاد سے متعلق ہے، جب وہ صوفیہ کے معارف کا ذکر کرتے ہیں تو بمنزلہ اس شخص کے ہوتے ہیں جو ہے تو مسلمانوں کا دشمن مگر ان کی بود و باش اختیار کئے ہوئے ہے، ائمہ دین نے غزالی پر ان کی کتب میں اس فاسد مواد کی رو سے تنقید کی ہے، ان کا قول ہے: (مَرَضُهُ الشِّفَاء) (اس کی مرض الشفاء ہے) یعنی ابن سینا کی فلسفہ میں کتاب (الشفاء) علاوہ ازیں اس میں کثیر ضعیف احادیث وآثار ہیں بلکہ موضوعات بھی اور صوفیہ کی اغالیط اور ترہات (یعنی بظاہر غلط سلط باتیں جو ان کے منہ سے نکلتی ہیں) سے کئی اشیاء بھی، اس کے ساتھ ساتھ اہلِ معرفت و استقامت مشائخ صوفیہ کی اعمالِ قلوب بارے کتاب وسنت کے موافق کلام ہے اسی طرح عبادات و ادب میں بھی کتاب وسنت کے موافق کلام موجود ہے اور یہ حصہ بنسبت مردود حصہ کے اکثر ہے اسی لئے اس کے بارہ میں لوگوں کی آراء باہم مختلف ہوئیں اور تنازع کیا۔

فصل

کتاب وسنت اور سلفِ امت کے آثار اللہ کے ذکر ودعا میں مشروع ومستحب کی جنس پر دال ہیں جیسے دیگر عبادات ہیں، **نبی اکرم نے اذکار کے مراتب بیان کئے ہیں** جیسے مسلم وغیرہ کی حضرت سمرہ بن جندب سے نقل کردہ روایت میں آپ کا فرمان: قرآن کے بعد افضل کلام چار جملے ہیں اور یہ قرآن سے (ماخوذ) ہیں: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر! صحیح میں حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ نبی اکرم سے سوال ہوا کہ کون سی کلام افضل ہے؟ فرمایا جو اللہ نے اپنے ملائکہ کے لئے چن لی (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ) ابن ابوالدنیا وغیرہ کی کتاب الذکر میں نبی اکرم سے مرفوعاً مذکور ہے کہ افضل ذکر (لا الہ الا اللہ) اور افضل دعا (الحمد للہ) ہے، موطا وغیرہ میں حضرت طلحہ بن عبداللہ بن کریز نبی اکرم سے راوی ہیں کہ فرمایا افضل ترین کلام جو میں نے اور مجھ سے قبل کے انبیاء نے کہی یہ ہے: (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) سنن میں ہے کہ ایک شخص نے کہا یارسول اللہ مجھ میں قرآن سے اخذ وحفظ کرنے کی استطاعت نہیں لہذا مجھے کوئی ایسی شئی سکھلا دیں جو نماز میں قرآن سے مجھے کفایت کرے فرمایا کہو: (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ) اس لئے فقہاء نے کہا جو نماز میں قراءت سے عاجز ہو وہ ان کلمات صالحات کی طرف منتقل ہو جائے، ان اور ان جیسے کلمات کے فضائل کثیر ہیں جن کے ذکر کا یہ مقام نہیں، غرض اس ذکر و دعا کی نشاندہی ہے جو مشروع جنس کے ساتھ نہ ہو یا ایسا ہو کہ اس سے یا اس کی صفت سے نہی ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے کہا:

(اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ)[الأعراف: ۵۵] (اپنے رب سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو، وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

(وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا) [الأعراف: ۸۰] (اور اللہ کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اُس کو اُس کے ناموں سے پکارا کرو) تو اللہ کو اس کے اسمائے حسنی کے ساتھ ہی پکارنا چاہیے، منہی عنہ وہ جو عرب جاہلیت میں اپنے تلبیہ میں کہا کرتے تھے: (لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكاً هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ) (تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ جسے تو نے خود اپنا شریک بنایا، مالک تو ہی ہے وہ کسی چیز کا مالک نہیں) اور جیسے بعض اعراب نے نبی اکرم سے کہا تھا: (إِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ) (ہم آپ کے سامنے اللہ کی سفارش ڈالتے ہیں) اس پر آپ نے کہا تھا اللہ کی شان اس سے اعظم ہے اللہ کو اس کی کسی مخلوق کے سامنے بطور سفارشی پیش نہیں کیا جا سکتا اور جیسے ابتدائے اسلام (نماز کے تشہد میں) کہتے تھے: (اَلسَّلَامُ عَلَى اللّٰهِ قِبَلَ عِبَادِهٖ) (اللہ کو اس کے بندوں کی طرف سے سلام) تو نبی اکرم نے فرمایا اللہ تو خود (السَّلَام) ہے بلکہ جب نماز میں بیٹھو تو یوں کہو: (اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ) اس کے ساتھ آپ نے اس طرف توجہ مبذول کرائی کہ سلام تو اس کے لئے ہوتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے جسے اس کی ضرورت ہو جبکہ اللہ تو خود سلام (اور اس کا مصدر و منبع) ہے لہذا اس کی بجائے اس کی ثناء کی جائے، اللہ سے طلب کیا جاتا ہے نہ کہ اس کے لئے، یہ تو مخلوق کا خاصہ ہے تو مثلا کہا جاتا ہے: (اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ) فرمایا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ) [والذاريات: ۵۶۔ ۵۷] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں۔ میں ان سے طالبِ رزق نہیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا دیں) رزق ہر اسے عام ہے جس کے ساتھ مرتزق منتفع ہوتا ہے تو انسان طعام، شراب، لباس اور جس کے ساتھ بھی اپنی سمع و بصر اور قوتِ شامہ کے ساتھ منتفع ہو، کا محتاج ہے اسی طرح اس کا بھی جس کے ساتھ وہ باطنی طور سے منتفع ہو (یعنی روحانی غذا) مثلا ایمان، علم، فرحت و سرور، قوت و نور اور تائید الٰہی وغیرہ، اللہ اپنی خلق سے رزق کا طالب و مرید نہیں، ان کی یہ حیثیت کہاں کہ اسے کوئی نفع و ضرر پہنچا سکیں بلکہ وہ غنی اور سب ما سوا اس کے محتاج و فقیر ہیں اور اسی طرح مکروہ دعا مثلا معصیت یا قطع رحمی یا انبیاء کی منازل کی دعا یا مثلا اس اعرابی کی سی دعا جس نے کہا تھا اے اللہ اگر تو مجھے آخرت میں عذاب دینا چاہتا ہے تو وہ مجھے دنیا ہی میں دیدے اور جیسے نبی کریم کا ایک میت کے لواحقین سے گزر ہوا جو چیخ و پکار (یعنی نوحہ) کر رہے تھے تو فرمایا اپنے آپ کے لئے خیر کے کلمات ہی منہ سے نکالا کرو کیونکہ فرشتے تمہارے کہے پر آمین کہتے ہیں، اللہ تعالی نے کہا:

(وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ) [يونس: ۱۱] (اور اگر اللہ لوگوں کی بُرائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلبِ خیر میں جلدی کرتے ہیں تو اُن کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی) اور:

(وَيَدۡعُ الۡاِنۡسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالۡخَيۡرِ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا)[الإسراء : 11](اور جس طرح بھلائی مانگتا ہے اسی طرح برائی مانگتا ہے اور انسان جلد باز ہے) یہ ایک وسیع باب ہے یہاں مقصد اس کا استیعاب نہیں، صرف جنسِ مکروہ کی نشاندہی کرنا مقصود تھا، یہاں غرض یہ ہے کہ شرع کے ہاں وہی ذکر مستحب ہے جو تام ومفید کلام ہو مثلا :(لَا إلٰـهَ إلَّا اللّٰـهُ، اَللّٰهُ اَكۡبَرُ، سُبۡحَانَ اللّٰهِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ، لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ إلَّا بِاللّٰهِ، تَبَارَكَ اسۡمُ رَبِّكَ [یہ قرآنی آیت کا جزو ہے] تَبَارَكَ الَّذِیۡ بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ، سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ، تَبَارَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ) جہاں تک مفرد اسمِ ظاہر جیسے :(اَللّٰـه ـ اَللّٰـه) یا مضمر مثلا :(هُـو ـ هُو) تو یہ مشروع نہیں، نہ کتاب میں نہ سنت میں اور نہ امت کے سلف اور مقتدا اعیان میں سے کسی سے اس کا ورد منقول ہے

یہ دراصل متاخرین اہلِ ضلال میں سے بعض اس پر شیفتہ ہوئے، ممکن ہے اس ضمن میں کسی شیخِ مغلوب کی اتباع کی ہو جیسے شبلی بارے منقول ہے کہ وہ (اَللّٰه ـ اَللّٰه) کہتے رہتے تھے، کسی نے پوچھا آپ (لا الہ الا اللہ) کیوں نہیں کہتے؟ تو بولے مجھے ڈر ہے کہ کہیں نفی اور اثبات کے درمیان میں ہی فوت نہ ہو جاؤں، یہ شبلی کی زلات (یعنی سبقتِ لسانی) میں سے ہے ان کے صدقِ ایمان، قوتِ وجد اور ان پر غلبہِ حال کے مدنظر یہ مغفور لہ ہے، ان پر بسا اوقات دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور انہیں مارستان لے جایا جاتا تھا اور (بغرضِ علاج) ان کی داڑھی مونڈھ دی جاتی تھی، اس نمط وطرز کی ان سے کئی اشیاء منقول ہیں جن میں ان کی اقتداء کا کوئی جواز نہیں، وہ تو معذور یا ماجور تھے کیونکہ اگر کوئی (لا الہ الا اللہ) کہنے کا ارادہ ونیت کر لے پھر مکمل کرنے سے قبل ہی مر جائے تو اس کا اسے کوئی ضرر نہیں ہوگا کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے بلکہ جس کی کسی نے نیت اور ارادہ کیا تھا وہ سب اس کے کھاتہ میں لکھا جائے گا، اس ضمن میں کئی اتنا غلو کرتے ہیں کہ اسمِ مفرد کا ذکر خواص کا ورد جبکہ پورے کلمہ کا ذکر عوام کا ذکر قرار دیتے ہیں، بعض نے کہا (لا الہ الا اللہ) مومنین کا (اللہ) عارفین کا اور (ھو) محققین کا ذکر ہے، کئی اپنی خلوت یا جلوت میں اللہ اللہ اللہ یا ھو یا یا ھو یا (لَا هُـــو إلَّا هُـــوَ) پر اقتصار کرتے ہیں (یہ غلو اتنا بڑھا کہ ایک بریلوی مسلک کے ساتھی پروفیسر نے عقیدت بھرے انداز میں بتلایا کہ ایک مسجد میں ایک بزرگ کو سنا یہ ذکر کر رہے تھے :[ہَ ـ ہُـ ـہِ] پھر تشریح کی کہ ہَ لا الہ کی آخری ہا ہے، ہُ الا اللہ کی اور ہ ِ محمد رسول اللہ کی) طریقت بارے لکھنے والے بعض مصنفین نے اس کی تعظیم بارے لکھا اور کبھی وجد، کبھی رائے اور کبھی نقلِ مکذوب کے ساتھ استدلال کیا جیسے ان کے بعض روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم نے حضرت علی کو تلقین کی کہ (اللہ ـ اللہ ـ اللہ) کا ورد کیا کرو، نبی اکرم نے تین مرتبہ کہا پھر حضرت علی نے بھی تین مرتبہ کہا، فنِ حدیث کے اہلِ علم کے بالاتفاق یہ حدیث موضوع (یعنی من گھڑت) ہے، نبی اکرم صرف ذکرِ ماثور کی تلقین کیا کرتے تھے اور سرِ فہرست (لا الہ الا اللہ) ہے، یہی وہ کلمہ ہے جسے اپنے چچا پر جب وہ مر رہے تھے پیش کیا اور کہا اے چچا کہو (لا الہ الا اللہ) وہ کلمہ کہ جس کے ساتھ اللہ سے آپ کے لئے میں کچھ منوا سکوں،

ایک حدیث میں کہا میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جسے مرتا ہوا شخص نہ کہے گا مگر اس کی راحت پائے گا، ایک حدیث میں کہا جس کی دنیا میں آخری کلام (لا الہ الا اللہ) ہوئی وہ جنت میں داخل ہوا، فرمایا جو اس حال میں مرا کہ جانتا ہے اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوا، فرمایا مجھے حکم ہے کہ جہاد کرتا رہوں حتی کہ لوگ گواہی دیں کہ (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ) جب یہ کر لیں تو اپنی جان و مال مجھ سے بچا لیں گے مگر ان کا حق ادا کر کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے، اس معنی میں کثیر احادیث ہیں! پیچھے قواعد کے ضمن میں اس عظیم، جامع اور فارق کلمہ سے متعلق کچھ باتیں ذکر کی تھیں، بہر حال اسمِ مفرد کا ذکر و وِرد کسی صورت مشروع نہیں اور اس کے استحباب (اور جواز) پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں جہاں تک وہ توھم جو بعض غالط متعبدین کو قولہ تعالی:

(قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ)[الأنعام : ۹۱] (کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں) بارے لگا کہ توھم کیا کہ مراد اس اسم کا کہنا (ورد کرنا) ہے تو یہ واضح خطا ہے، اگر یہ قبل ازیں کے کلمات پر تدبر کر لیتے تو آیت کی مراد واضح ہو جاتی تو اللہ تعالی نے کہا:

(وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ قُلِ اللّٰهُ) (اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر جیسی جاننی چاہئیے تھے نہ جانی جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے انسان پر کچھ بھی نازل نہیں کیا، کہو کہ جو کتاب موسیٰ لے کر آئے تھے اُسے کس نے نازل کیا تھا؟ جو لوگوں کیلئے نور اور ہدایت تھی اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق پہ کر رکھا ہے اُن کو تو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو اور تمہیں وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، کہہ دو اللہ ہی نے) یعنی کہو کہ اللہ ہے وہ جس نے وہ کتاب نازل کی جو حضرت موسی لے کر آئے تو یہ کلام تام ہے اور مبتدا اور خبر سے مرکب جملہ اسمیہ ہے، سوال کے جواب پر دلالت کے مدِ نظر خبر محذوف کی گئی، عربوں کی کلام ولغت میں اس کے مثل میں یہ مطرد قیاس ہے جیسے اس کا قول:

(وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ الخ) [الزمر: ۳۸] (اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو کہہ دیں کہ اللہ نے۔۔۔) الآیۃ، اور قولہ:

(اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ) [النمل: ۶۰] (بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم ہی نے اُس سے سرسبز باغ اُگائے تو تمہارا کام تو نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگاتے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟) اسی طرح آگے کی آیات اور قولہ:

(قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ) [المؤمنون: ۸۶۔۸۷] (پوچھو کہ سات آسمانوں کا اورعرش عظیم کا مالک کون ہے؟۔ کہہ دیں گے کہ یہ اللہ ہی کی ہیں) ابوعمرو کی قراءت پر، عام کلام میں تم کہتے ہو: کون آیا؟ جواب ملتا ہے: زید، کس کا اکرام کیا؟ جواب: عمر، کس سے گزرا؟ زید، تو(مَنْ) کے جواب میں اسمِ مفرد کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس کا کا جواب ہے اور متصل ہے یعنی پورے جملہ کو بوجہ سوال میں اس کے مذکور ہونے کے حذف کر دیتے ہیں کیونکہ عرب بلا فائدہ تکرار کرنے کو ناپسند کرتے تھے تا کہ تطویل نہ ہو، اس سے بھی اغرب جوان حضرات میں سے اس شخص نے مجھے بتلایا کہ قولہ:

(وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ) [آل عمران : ۷] (اوراس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) کہ اس کا معنی یہ ہے کہ (ہٗ) کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے اور مراد (ھُوْ ۔ ھُوْ) جو یہ لوگ بآوازِ بلند بطورِ ذکر کہتے ہیں، اس نے گویا: (تَأْوِیْلَ ھُو) پڑھا اور سمجھا، ابن عربی نے تو (اَلْھُوْ) کے نام سے ایک کتاب لکھ ماری، میں اس وقت صغیر السن تھا لیکن میں نے اس سے کہا اگر یہ معنی جو تم کہہ رہے ہو درست ہے تو قرآن میں (تَأْوِیْلَ ھُو) لکھا ہوتا، ضمیر کو ساتھ ملا کر نہ لکھا ہوتا؟ یہ کلام جو اس نے کہی بالاضطرار معلوم الفساد ہے، غالط صوفیاء کے ہاں کتاب وسنت بارے اس طرح کی باطل متعدد تاویلات موجود ہیں، کبھی جس معنی کو یہ مراد لیتے ہیں صحیح ہوسکتا ہے (یعنی معنوی اعتبار سے) لیکن کلام کی اس پر دلالت نہیں ہوتی اور نہ یہ متکلم کی مراد ہوتی ہے اور کبھی یہ صحیح نہیں ہوتا تو غلطی کا وقوع کبھی حکم اور کبھی دلیل میں ہوتا ہے جیسے ان کے بعض نے آیت:

(اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی) [العلق : ۷] (کہ اپنے آپ کو غنی دیکھتا ہے) میں (ہ) ضمیر کا مرجع رب تعالی کو قرار دیا کہ: (رَآی رَبَّہٗ فَاسْتَغْنٰی) حالانکہ معنی یہ ہے کہ اس نے خود کو مستغنی اور مالدار دیکھا تو سرکشی اختیار کی ہے اور جیسے بعض نے حدیثِ جبریل کے الفاظ: (فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ) کا معنی یہ کیا کہ اگر تم اپنے آپ سے فانی ہو گئے تو اپنے رب کو دیکھ لو گے! معنائے حدیث یہ نہیں کہ اگر یہ معنی مراد ہوتا تو یوں کہتے: (فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَہُ) جبکہ آپ نے (تَرَاہُ) کہا ہے پھر جوابِ شرط کے ساتھ کیا کرے گا جو یہ ہے :(فَاِنَّہٗ یَرَاکَ) پھر یہ ان کے اس باطل قول پر (کَانَ) تامہ ہوگا تو ان کے مطابق تقدیرِ کلام ہے: (فَاِنْ لَمْ تَکُنْ، اَیْ لَمْ تَقَعْ وَلَمْ تَحْصُلْ) (یعنی واقع اور حاصل نہیں ہوئی) اور یہ تقدیر محال ہے کیونکہ بندہ تو کائن موجود ہے نہ کہ معدوم اور اگر اپنی خواہشات یا اخیار کے شہود سے اس کا فنا مراد ہے تو اس کے ہونے کی نفی کے ساتھ تعبیر نہ کیا جاتا تو یہ محال ہے اور جب معنی تو درست ہو اور دلالت مراد نہ ہو تو اسے اشارات کا نام دیا جاتا ہے، الشیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حقائق التفسیر میں اس سے ایک قطعہ ذکر کیا ہے لیکن اب اس پر کلام کرنا مقصود نہیں، یہ ایک الگ باب ہے! غرض دراصل بغیر تام کلام کے اسمِ مفرد کا ذکر و ورد کرنے کے حکم کا بیان ہے اور ادلہ شرعیہ سے ثابت ہو چکا کہ یہ غیر مستحب ہے، اسی طرح عقلی وذوقی ادلہ کی رو سے بھی کہ اکیلا اسم (یعنی لفظِ اللہ) نہ ایمان اور نہ کفر کا معطی ہے (یعنی کوئی کافر فقط اللہ کہنے سے مسلمان متصور نہ ہوگا) اور نہ ہدایت اور نہ گمراہی، نہ علم اور نہ

جہل کا، کبھی کوئی ذاکر انبیاء میں سے کسی نبی کا نام یا فراعنہ میں سے کسی فرعون یا اصنام میں سے کسی صنم کا نام ذکر کرتا ہے تو مجرد نام کے ذکر کرنے سے کسی قسم کا حکم مقترن نہ ہوگا الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی اور ایسا (لفظ، عبارت) مقرون ہو جو نفی یا اثبات یا حب یا بغض پر دال ہو، کبھی وہ موجود اور معدوم کا ذکر کرے گا لہٰذا ماہرینِ عربی زبان اور دیگر کا اتفاق ہے کہ اکیلے اسم پر سکوت حسن نہیں اور نہ اکیلا اسم جملہ تامہ ہے اور نہ کلام مفید ہے اسی لئے ایک موذن نے اذان دیتے ہوئے جب (غلطی سے) (اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلَ اللّٰہِ) رسول کی لام پر زبر پڑھ دی تو ایک بدوی نے کہا (فَعَلَ مَا ذَا؟) (یعنی آپؐ نے کیا کیا؟، کیونکہ زبر پڑھنے سے جملہ نا مکمل تھا) کیونکہ لام پر زبر دینے سے وہ صفت ہوا اور صفت اسمِ موصوف کے تکملہ سے ہے (اور یوں جملہ مکمل نہیں ہوتا) تو اس بدوی نے اپنی صحتِ طبع کی رو سے خبرِ مفید کی طلب کی (جیسے ہمارے بریلوی بھائی یا رسول اللہ اور یا محمد کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں، آگے کچھ نہیں کہتے) اور یہ جیسے کسی کو ندا دیں، مثلاً: اے عمر، اور آگے کچھ نہ کہیں، تو اگر کوئی ہزار مرتبہ بھی (اللہ، اللہ) کا تکرار اور ورد کرے تو اس کے ساتھ وہ مومن نہیں ہو سکتا اور نہ اللہ کے ثواب اور اس کی جنت کا حقدار، تمام امم کے کفار اسمِ مفرد (یعنی اللہ) کا ذکر تو کرتے ہیں، چاہے اس کی وحدانیت کے مقر ہوں یا نہیں حتیٰ کہ اللہ نے جب ہمیں اپنے اسم کے ذکر کا حکم دیا مثلاً اس کا قول:

(فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ) [المائدة : ۴] (تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں اُس کو کھا لیا کرو اور اس پر اللہ کا نام لیا کرو) اور:

(وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) [الأنعام : ۱۲۱] (جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اُسے مت کھاؤ)

(سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى) [الأعلى : ۱] (اپنے ربِ جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو)

(فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ) [الحاقة : ۵۲] (پس تم اپنے عظیم رب کے نام کے ساتھ تسبیح کرو) وغیرہ تو اس کے اسم کا یہ ذکر تام کلام کے ساتھ ہے مثلاً ذبح کرتے وقت صرف اللہ اور کھانا شروع کرتے ہوئے صرف اللہ نہ کہیں گے بلکہ (بِسْمِ اللّٰہِ) یا (جیسے سجدہ و رکوع کی تسبیح) (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم) (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی) ونحوہا، کبھی اسمِ مفرد کا ذکر مشروع نہیں کیا گیا اور نہ اس کے ساتھ امتثالِ امر، شکار اور ذبیحہ حلال نہ ہوگا، تو اگر کہا جائے ذاکر یا سامع اسمِ مجرد کے لئے کبھی وجد، محبت اور تعظیم کا جذبہ حاصل ہو جاتا ہے تو جواب یہ ہے کہ ہاں ایسا ہی ہے، وجدِ مشروع اور حالِ ایمانی پر قابلِ ثواب تو ہے لیکن اس وجہ سے نہیں کہ مجرد اسم کا ذکر مستحب ہے البتہ اس کے سماع سے ساکن القلب ضرور متحرک ہو جاتا ہے اور وہ تو کبھی ذکرِ محرم یا مکروہ کے سماع (مثلاً قوالی وغیرہ) سے بھی ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کبھی مسلمان کسی مشرک کو سنتا ہے یا (معاذ اللہ) کسی کو گستاخی کے الفاظ بولتا سنے تو بھی اس کے دل میں حالِ وجد اور اللہ کی خاطر اس سے نفرت کی قوت اور اس کے ان نازیبا الفاظ سے بغض کی رو سے متحرک اور ثائر ہو جاتا ہے، ایک دفعہ صحابہ کرام نے عرض کی تھی یا رسول اللہ کبھی ہمارا کوئی اپنے نفس میں ایسا وجد پاتا ہے کہ اس کے ساتھ تکلم کرنے سے اسے یہ زیادہ

پسند ہوتا ہے کہ جل کر کوئلہ بن جائے یا آسمان سے گر پڑے، فرمایا کیا واقعی ایسا پاتے ہو؟ عرض کی جی ہاں، فرمایا یہی تو صریحِ ایمان ہے، ایک روایت میں ہے کہ کہا: (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ کَیْدَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ) (یعنی اللہ کا شکر ہے بات وسوسہ تک ہی محدود رہی) تو شیطان نے جب ان کے دلوں میں مذموم وسوسہ ڈالا تو اس کی کراہت کے سبب ان کے قلوب میں موجود ایمان متحرک ہوا اور اسے بہت بوجھ خیال کیا تو یہ صریحِ ایمان ہے اور یہ مقتضی نہیں کہ سبب جو کہ وسوسہ ہے مامور بہ ہو، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی داعی کفر یا معصیت کی طرف بلاتا ہے (تحریک دیتا ہے) تو وہ اس سے بچاؤ اور امتناع کرتا ہے اور یہ اسے ایمان و تقوی کا وارث بناتا ہے (اور اس میں ازدیاد پیدا کرتا ہے) اور سبب مامور بہ نہیں (بلکہ وہ تو ناگوار سبب ہے) فرمایا:

(اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ) [آل عمران: ۱۷۳۔۱۷۴] (اُن سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے لئے جمع کیا ہے تو اُن سے ڈرو تو اُن کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ اللہ کی نعمتوں اور اُس کے فضل کے ساتھ واپس آئے اُن کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچا اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے) تو یہ ایمانِ زائد اور توکل ہے جس کا سبب لوگوں کا انہیں دشمن سے خوف دلانا بنا اور یہ مشروع نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اسے توبہ کا وارث بنا دیتا ہے جس سے اسے اللہ کی محبت نصیب ہوتی ہے اور یہ گناہ مامور بہ نہیں (یعنی کوئی یہ نہ کہے کہ یہ مقام پانے کے لئے کوئی گناہ کرنا پڑے گا) یہ نہایت وسیع باب ہے، تو فرق ہے اس امر کے مابین کہ نفسِ سبب خیر کا موجب اور مقتضی ہو اور اس امر کے مابین کہ ایسا نہ ہو، خیر دراصل محل سے ناشئ ہوتی ہے تو مامور بہ کلمات طیبات اور اعمالِ صالحات ہیں اور یہی خیر، رحمت اور ثواب کا موجب ہیں اور جب اس کے ساتھ بندے کی ایمانی قوت اور ایمانی حلاوت مل جائے تو خیر و رحمت اور برکت متضاعف ہو جاتی ہے اور جو مامور بہ نہیں یا تو فعلِ عبد سے، محرم، مکروہ اور مباح اور یا اس کے غیر کسی انس و جان کے اس کے ساتھ فعل سے اور یا آسمانی حوادث جو منجانب اللہ اسے پہنچیں جب یہ اس سے ایمان و یقین کو مصادف ہوں تو یہ ایمان و یقین کو تحریک دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایمان میں اضافہ (تازگی) اور بڑھوتی ہو جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ بندہ اب ان اسباب سے محبت کرے یا یہ قابلِ تعریف ٹھہریں یا انہیں مامور بہ کر لیا جائے، وہ اس حاصل خیر کو مقتضی نہیں، ان کا مقتضا دراصل تحریکِ ساکن ہے جو بعض میں واقع ہوگا (یعنی یہ کوئی کلیہ عامہ یا ضابطہ نہیں)

اسی باب سے مشابہ **حبِ مطلق، شوقِ مطلق اور وجلِ مطلق کا ذکر** اور جو یہ نظم ونثر کو متضمن ہوئے! تو یہ بھی مجمل سے ہے اس میں مومن و کافر اور برو فاجر مشترک ہیں اسی لیے اللہ اور اس کے رسول نے انہیں مشروع نہیں کیا اور نہ ان کا امر دیا ہے، اللہ تو خیر، عملِ

صالح اور برکا آمر ہے اور یہ اس باب سے نہیں محبین کے اشعار (عارفانہ کلام) محبِ ایمان، محبِ اوثان، محبِ نسوان، محبِ مُردان، محبِ اوطان اور محبِ اَخدان (خِدن کی جمع، دوست اور بیلی) کے درمیان مشترک ہیں (مسلمان میں یہ ایمان کو جبکہ مشرک میں بت پرستی کو تحریک دیں گے) تو جو ہم نے ذکر کیا وہ ثابت ہوا کہ مجرد اسم کا ذکر کرنا مستحب نہیں چہ جائے کہ اسے خواص کا ذکر قرار دیا جائے

اور اس سے بھی ابعد اسمِ مضمر یعنی (ہُ، ہُ) کا ذکر تو یہ بنفسہ کسی معین پر دال نہیں، یہ تو اس کے بحسب ہے جو مذکور یا معلوم سے اس کی تفسیر کرے تو اس کا معنی متکلم کے قصد و نیت کے بحسب ہوگا، اس لیے کبھی اس کے ساتھ وہ ذکر کرتا ہے جس کا اعتقاد ہے کہ حق وجودِ مطلق ہے اور کبھی یہ جملہ بولتا ہے: (لَا هُـــو إِلَّا هُـــو) اور اس کا دل وحدت الوجود، فرعون، اسماعیلیہ، زنادقہ اور متاخرین صوفیہ کے مذہب میں ساری ہوتا ہے اس طور کہ اس کا قول (هُـــو) اس کے قول (وُجُــوْدُہٗ) کی مانند ہے اور کبھی وہ اپنے قول (لَا هُو إِلَّا هُو) کے ساتھ یہ معنی مراد لیتا ہے کہ وہی موجود ہے اور یہاں اصلاً ہی خلق کا کوئی سلسلہ نہیں اور رب وعبد اور حق و خلق ایک ہی شئ ہے جیسا کہ ایک جگہ اتحاد یہ کے مذہب کی تبیین کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے، ان فاسد اعتقادات واحوال کے اسباب میں سے اس شرعت ومنہاج سے دوری اور خروج ہے جس کے ساتھ ہمارے رسول اکرم کو ہماری طرف مبعوث کیا گیا تو بدعات کفر کے مبادیٔ اور مظان ہیں جیسا کہ سنن مشروع ایمان کے مظاہر اور اس کے لئے مقوی ہیں، ایمان طاعات کے ساتھ بڑھتا اور معاصی کے ساتھ اس میں کمی آتی ہے جیسا کہ قرآن نے کہا: (**اَلَّـذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا**) (گزری)

(**اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَاناً**) [التوبة : ۱۲۴] (اس سورۃ نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے؟)

(**هُوَالَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ**) [الفتح : ۴] (وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھے) وغیرہا، اگر کہا جائے جب یہ ذکر مشروع نہیں تو پھر اسے مکروہ کہیں؟ میں کہتا ہوں مغلوب الحال کے حق میں اسے کراہت کے ساتھ موصوف نہ کیا جائے گا کہ کبھی دل کے لئے ایسے احوال عارض ہوتے ہیں کہ ان میں زبان کا نطق دل کے ایمانی احوال کے ساتھ مملوء ہونے کے باوصف مشکل ہو جاتا ہے اور کئی دفعہ ایسے شخص پر اسمِ مجرد کا آسان ہوتا ہے بنسبت کلمہ تامہ کے ذکر کے، یہ حضرات (یعنی مغلوب الحال) اس پر آتے ہیں جو ان کے قلوب میں ایمانی احوال اور زبان کے نطق سے جس پر وہ قادر ہیں، ذکر کے معاملہ میں لوگ چار طبقات ہیں: دل اور زبان کے ساتھ ذکر، یہ مامور بہ ہے! دوم، فقط دل کے ساتھ ذکر، تو اگر یہ زبان کے عجز کے ساتھ ہے تو پھر حسن ہے لیکن اگر زبان کو ہلانے کی قدرت تھی تب یہ افضل حالت کا ترک ہوا، سوم، فقط زبان سے اور یہ ہمشہ اس کی زبان کا اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہنا، ایک حدیثِ قدسی کے الفاظ ہیں: (اَنَـا مَـعَ عَبْدِيْ مَا ذَكَـرَنِيْ

وَ تَحرَّکَت بِیٰ شَفَتَاهُ) (میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب تک وہ کیرا ذکر کرتا رہے اور اس کے ہونٹ ہلتے رہیں) اور چہارم دونوں کا عدم اور یہ خاسرین کا حال ہے! جہاں تک تام کلمہ متیسر (اور اس پر قدرت ہونے) کے باوجود اسمِ مفرد پر اقتصار اور بار بار اسے ہی کہتے رہنا تو یہ بدعت ہے اور بدعات میں اصل کراہت ہے، اور جو ابو یزید اور نوری اور شبلی وغیرہ بارے منقول ہے کہ اسمِ مفرد کا ذکر کرتے رہتے تھے تو یہ محمول ہے کہ وہ مغلوب الحال تھے، ان کے احوال اسی کے شاہد ہیں، ان مشائخ نے جو ان سے اصح اور اکمل تھے ہمیشہ کلمہِ تامہ کا ہی ذکر اور ورد کیا ہے اور تنازع کے وقت ہمارا مرجع اللہ اور رسول ہیں، کسی غیرِ رسول کا فعل علی الاطلاق حجت نہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل

زہد، عبادت اور ورع وتقوی میں صراطِ مستقیم ترکِ محرمات وشہوات میں ہے اور اقتصاد فی العبادت میں (یعنی اعتدال اور میانہ روی لیکن ہیشگی) اور سنت کو لازم پکڑنا نفس اور شیطان کے شر سے حفاظت کرتا ہے، مبتدع طرق یہ نہیں کر سکتے! بدعات کے خوگر حضرات آصار واغلال میں وقوع سے بچ نہیں سکتے اگر چہ وہ متأ ولین ہوں، ان کا اتباعِ ہویٰ لازمہ ہے اسی لئے اہلِ بدعات کا ایک نام اہلِ اہواء بھی ہے طریقِ سنت علم، عدل اور ہدایت ہے جبکہ بدعت میں جہل اور ظلم ہے اور اس میں ظن اور ہوائے نفس کی اتباع ہے اور رسول (کا وصف قرآن نے یہ کیا کہ وہ)(مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی) [والنجم: ۲] (کہ تمہارا ساتھی نہ راستہ بھولا اور نہ بھٹکا ہے)ضلال غی کے ساتھ مقرون ہے تو ہر غاوی ضال ہے، رشد ضدِ غی اور ہدیٰ ضدِ ضلال ہے اور یہ فجار اور اہلِ بدعت کے طریق سے مجانبت (یعنی بچنا) جیسا کہ سلف ان دونوں اصناف سے منع کیا کرتے تھے، فرمایا:

(فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا) [مریم: ۵۹] (پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے لگ گئے، سوعنقریب یہ غی کو جا ملیں گے) غی اصل میں (غَوٰی يَغْوِیٰ) کا مصدر ہے جیسے (لَوٰی يَلْوِیٰ لَيًّا) ہے اور یہ ضدِ رشد جیسے کہا:

(وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا) [الأعراف: ۱۴۶] (اور اگر رشد و ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس راہ پر گامزن نہیں ہوتے) رشد وہ عمل جو عامل کو نفع پہنچائے اور غی وہ عمل جو اس کے لئے ضار ثابت ہو تو عمل خیر رشد اور عملِ شر غی ہے اسی لئے جنوں نے کہا تھا:

(وَ اَنَّا لَا نَدْرِیْ اَ شَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا) [الجن: ۱۰] (اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے اہل زمین کی حق میں بُرائی مقصود ہے یا ان کے رب نے ان کی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے) تو شر اور رشد کے مابین تقابل کیا، سورۃ کے آخر میں ہے:

(قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا) [الجن : ۲۱] (کہہ دو کہ میں تمہارے حق میں نقصان اور نفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا) اور اسی سے (الرشید) ہے جس کے سپرد اس کا مال کر دیا جائے اور یہ وہ جو اپنے مال کو نافع میں نہ کہ ضار میں خرچ کرے، شیطان نے کہا تھا:

(لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ) [ص : ۸۲۔۸۳] (میں ان سب کو بہکا تا رہوں گا۔سوائے ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں) تو وہ انہیں شر کا امر کرتا ہے جو انہیں ضرر پہنچا تا ہے تو وہ اس کی طاعت کرتے ہیں جیسے کہا:

(وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ) [إبراهيم : ۲۲] (اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا ہاں میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میرا کہا مان لیا) اور کہا:

(وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ) إلى قوله : (فَكُبْكِبُوْا فِیْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ) [والصافات: ۹۱۔۹۴] (اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی۔۔۔تو وہ اور گمراہ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے) اور کہا:

(قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَغْوَیْنَا اَغْوَیْنٰهُمْ كَمَا غَوَیْنَا) [القصص : ۶۳] (جن لوگوں پر حکم ثابت ہو چکا ہوگا وہ کہیں گے کہ ہمارے رب یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا اور جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ان کو گمراہ کیا تھا) اور کہا:

(مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی) پھر غی جب عمل شر کا اسم ہے جو اپنے کرنے والے کے لئے ضار ہے تو اس عمل کی عاقبت بھی غی کہلائے گی جیسے عملِ خیر کی عاقبت رشد کہلاتی ہے اور جیسے شر کی عاقبت کو بھی شر کہہ دیتے ہیں اور خیر کی عاقبت کو خیر اور حسنات کی عاقبت کو حسنات اور سیآت کی عاقبت کو سیآت، تو کتاب اللہ میں حسنات اور سیآت سے مراد اعمالِ خیر اور اعمالِ شر ہیں جیسا کہ ان کے ساتھ نعمتیں اور مصائب بھی مراد لئے جاتے ہیں اور جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے تو جس نے عملِ خیر وحسنات کیا وہ خیر وحسنات سے مل جائے گا اور جس نے شر وسیآت کا عمل کیا وہ شر اور سیآت سے جا ملے گا، اسی طرح جس نے عملِ غی کیا وہ غی سے جا ملا، ترکِ نماز اور اتباعِ شہوات غی ہے جو ایسا کرنے والے کو غی میں لا ڈالے گی اسی لئے زمخشری نے کہا عربوں کے نزدیک ہر شر غی اور ہر خیر رشاد ہے جیسا کہ کہا گیا:(فَمَنْ یَلْقَ خَیْراً یَحْمَدُ النَّاسُ اَمْرَهٗ وَمَنْ یَغْوِ لَا یَعْدِمُ عَلَی الْغَیِّ لَائِماً) زجاج نے قولہ تعالیٰ:(یَلْقَ اَثَاماً)[الفرقان: ۶۸] کے معنی میں کہا:(جَزَاؤُهٗ غَیٌّ اَیْ مُجَازَاتُ آثَام) (یعنی ان کے گناہوں کا بدلہ غی ہے) ایک حدیث میں ہے کہ غی جہنم میں ایک وادی ہے جس سے اس کی دیگر وادیاں بھی پناہ مانگتی ہیں اور یہ ملاقاتِ شر سے تعبیر ہے، فرمایا:(اَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ) تو نماز میں اللہ کی رضا جوئی ہے جیسے کہا:

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ) [الأنعام : ۵۲] (اور جو لوگ صبح وشام اپنے رب

سے دعا کرتے ہیں اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو دور مت کرو) یعنی فجر وعصر کی نماز پڑھتے ہیں داعی اپنے رب کا قصد وارادہ کرتا ہے تو ان اشیاء میں قلوب رب کے مرید ہوتے ہیں اس کی محبت کی خاطر، اتباعِ شہوات سے مرادنفس کی خواہشات کی اتباع، یہ شھوۃ کی جمع ہے اور یہ فی الاصل مصدر ہے، مشتہا کو بھی شہوت کہا جاتا ہے، مفعول کے اسمِ مصدر کے ساتھ تسمیہ کے باب سے، فرمایا:

(وَيُرِيدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا) [النساء : ۲۷] (اور جولوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے سے بھٹک کر دُور جا پڑو) تو توبہ کو اتباعِ شہوات کے مقابلہ میں کیا تو وہ چاہتا ہے کہ ہماری توبہ قبول کرے، اللہ کو ہم سے یہ پسند ہے اور وہ اس پر راضی ہے اور اس کا امر دیتا ہے جبکہ شہوات کی اتباع کرنے والے اور غاوون خواہاں ہیں کہ (اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا) کہ تم صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر شہوات کی پیروی کرنے لگو، اصلِ میل عدول ہے (یعنی روگردانی) شہوات کے پجاریوں کا یہ خاصہ ہے جیسے آنجناب نے فرمایا: (اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا) (استقامت اختیار کرو، یعنی حسبِ استطاعت دین کے تقاضے پورے کرتے رہو، تم ہرگز حق ادا نہیں کر سکتے) اور جان لو کہ تمہارا بہترین عمل نماز ہے اور وضو کی محافظت نہیں کرتا مگر مومن ہی، اسے احمد اور ابن ماجہ نے حدیثِ ثوبان سے نقل کیا، تو خبر دی کہ ہم میں استقامت یا اس کے ثواب کی طاقت نہیں (بس یہ ہے کہ کوشش کرتے رہیں) فرمایا:

(وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ) [النساء : ۱۲۹] (اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہیں کرسکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی کی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو چھوڑ دو کہ گویا ادھڑ میں لٹک رہی ہے) تو قولہ: (كُلَّ الْمَيْلِ) تو نہایتِ میل مراد ہے اور مراد طریق سے ہٹ جانا اور سواء الصراط سے نہایتِ شر کی طرف عدول کرنا بلکہ جب یہ مشکل آن پڑے تو توسط اختیار کرو اور توبہ کے ذریعہ طریق کی طرف پلٹ آؤ جیسے ایک حدیث میں کہا مومن اس طرح پلٹ آتا ہے جیسے گھوڑا (گلے میں باندھی رسی کی حد تک) گھومتا پھرتا ہے پھر آخر کار اپنے دائرہ میں واپس ہو لیتا ہے اسی طرح مومن (چھوٹے موٹے گناہوں میں) گھوم پھر کر جلد ہی رب کی طرف پلٹ آتا ہے، فرمایا:

(وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ) إلى قوله : (وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ) [آل عمران : ۱۳۳-۱۳۶] (اور اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے -- اور (اچھے) اعمال کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے) تو یہ نہیں کہا کہ وہ ظلم نہیں کرتے اور گناہ نہیں کرتے بلکہ کہا:

(وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ) [آل عمران : ۱۳۵] (اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور بُرائی کر بیٹھتے ہیں) یعنی غیر فاحشہ کوئی گناہ یعنی ظلم نہیں کرتے اور گناہ نہیں کرتے بلکہ کہا: (وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ) یعنی غیرِ فاحشہ کوئی گناہ (یعنی ظلموا الخ سے یہ مراد ہے) تو عام کا خاص پر عطف ڈالا جیسے حضرت موسیٰ نے کہا تھا:

(رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ)[القصص : ۱۶] (الٰہی! میں اپنے آپ پر ظلم کیا) ملکہ بلقیس نے کہا تھا:
(رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ) [النمل: ۴۴] (الٰہی! میں اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی) اللہ تعالی نے عمومی لحاظ سے ہلاک کئے گئے اہلِ قریٰ بارے کہا:
(وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ) [هود: ۱۰۱] (اور ہم نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا) تو منہیات کا ارتکاب اور اپنے انبیاء کی معصیت اور توبہ کا ترک کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا اور قولہ تعالی:
(ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ)[آل عمران : ۱۳۵] (اللہ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں) اسی لئے کہا:
(وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ يَّتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ) [النساء : ۲۷] (اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے) پھر کہا:
(يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّخَفِّفَ عَنۡكُمۡ وَخُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا)[النساء : ۲۸] (اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے) مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ (يَتَّبِعُوۡنَ الشَّهَوَاتِ) یعنی زنا کرتے ہیں، ابن زید نے کہا یہ اہلِ باطل، سدی کے بقول یہ یہود اور نصاری، سب کے اقوال حق ہیں تو انہوں نے کفر کرنے کے ساتھ ساتھ شہوات کی اتباع کی اور یہ اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ معصیت ہیں، پھر ذکر کیا کہ اس نے انسان کو ضعیف پیدا کیا ہے لہٰذا اس کے لئے مباح شہوت ضروری ہے کہ جس کے ساتھ وہ حرام سے مستغنی ہو، اسی لئے طاؤس اور مقاتل نے کہا: (ضَعِيۡفٌ فِيۡ قِلَّةِ الصَّبۡرِ عَنِ النِّسَاءِ) (یعنی عورتوں سے قلتِ صبر کے لحاظ سے کمزور) زجاج اور ابن کیسان نے کہا: (ضَعِيۡفُ الۡعَزۡمِ عَنۡ قَهۡرِ الۡهَوىٰ) (خواہش کے غلبہ سے بچنے میں کمزور) ایک قول ہے کہ اصلِ خلقت کے لحاظ سے ضعیف، اس لئے کہ حقیر پانی (یعنی منی) سے وہ پیدا کیا گیا ہے، یہ حسن سے منقول ہے لیکن لازم ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ وہ صبر سے بھی ضعیف ہے تا کہ آیت میں جو ذکر ہوا اس کے مناسب ہو کیونکہ کہا: (يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّخَفِّفَ عَنۡكُمۡ) اور یہ تسہیلِ تکلیف کہ وہ کچھ انسانوں کے لیے مباح کیا ہے جن کے وہ محتاج ہیں اور ان سے صبر نہیں کر سکتے جیسے مومن لونڈیوں سے شادی کرنا مباح کیا اور قبل ازیں کہہ چکا: (ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِيَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ) [النساء : ۲۵] (یہ اس کے لئے جسے گناہ کا اندیشہ ہو) تو اللہ سبحانہ نے عدم طول اور خشیۃ العنت کے وقت اور لونڈیوں سے نکاح کر لینے کی اباحت کرنے کے باوجود یہ بھی کہا: (وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ) [سابقہ] (اور اگر صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے) تو یہ دال ہے کہ خشیۃ العنت کے باوجود صبر کرنا ممکن ہے اور نکاح حالتِ اضطرار میں مردار کھا لینے کی اباحت کی مثل نہیں ہے کیونکہ اس سے صبر تو ناممکن ہے (کیونکہ جان کی تلفی کا خطرہ ہے) اسی طرح جس نے ضرورت کے وقت استمناء (یعنی مشت زنی) کو مباح قرار دیا تو اس سے صبر

بہر حال افضل ہے، ابن عباس سے منقول ہے کہ کہا استمناء سے تو لونڈیوں سے نکاح کر لینا بہتر ہے اور یہ زنا سے بہتر ہے تو جب لونڈیوں سے نکاح سے صبر افضل ہے تو استمناء سے صبر تو بطریقِ اَولی افضل ہوا، بالخصوص کثیر یا اکثر علماء مطلقاً اس (یعنی استمناء) کی تحریم پر جزم کرتے ہیں، یہی احمد کے مذہب میں یکے از اقوال ہے، المفردات میں ابن عقیل نے یہی اختیار کیا، ان ۔یعنی احمد ۔سے مشہور یہ ہے کہ یہ حرام ہے الا یہ کہ اگر عفت متاثر ہونے کا خدشہ ہو، تیسرا قول یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے الا یہ کہ عنت کا خدشہ ہو تو جب اللہ نے نکاحِ اماء کے ضمن میں کہا: (وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ) تو اس میں تو یہ اولی ہے اور یہ دال ہے کہ دونوں سے صبر ممکن (اور انسانی بس میں) ہے تو جب وہ کچھ مباح کیا جس سے صبر ممکن ہے تو یہ تسہیلِ تکلیف کرتے ہوئے جیسے کہا: (يُـرِيْـدُ اللّٰـهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا)

سلف وخلف اکثر علماء کے نزدیک استمناء مباح نہیں چاہے عنت کا اندیشہ ہو یا نہ ہو، ابن عباس کی کلام اور جو احمد سے منقول ہوا اس کی بابت ہے جو عنت ہے اور یہ کہ زنا اور لواطت کا شدید خدشہ محسوس کرے تو اس کی عنت اور شہوت کی تکسیر کے لئے یہ اس کے لئے مباح قرار دیا گیا لیکن جو تلذُّذاً یا تذکُّراً یا عادۃً کرے، تذکر یعنی اس حالتِ استمناء میں صورتِ جماع کا ذہن میں تخیل کرے تو یہ سب محرم ہے، کوئی بھی ۔نہ احمد اور نہ ان کا غیر ۔اس کا قائل نہیں، بعض نے تو اس پر حد (یعنی کوئی تعزیری سزا) واجب قرار دی ہے اور اس سے صبر [واجبات سے ہے نہ کہ] مستحبات سے ہے (بریکٹ کا اضافہ کتاب میں موجود ہے، شائد مرتب نے کیا) جہاں تک محرمات سے صبر تو یہ واجب ہے اگرچہ نفس کو ان کی اشتہاء اور ہویٰ ہو، فرمایا:

(وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ) [النور: ۳۳] (اور جن کو بیاہ کا مقدور نہ ہو وہ پاکدامنی کو اختیار کئے رہیں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے) استعفاف منہی عنہ کا ترک ہے جیسے حدیث میں ہے ابو سعید راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا: (مَـنْ يَسْتَـعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يصبره اللّٰهُ وَمَـا اُعْـطِـيَ اَحَـدٌ عَـطَـاءً خَيْـراً وَ اَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ) (جو عافیت کوش بنے اللہ اسے عافیت سے نوازے گا، جو استغناء کا مظاہرہ کرے اللہ اسے مستغنی بنا دے گا، جو جیسے تیسے صبر کرے اللہ اسے اس کی توفیق دے گا، صبر سے بہتر اور اوسع کسی کو عطیہ نہیں ملا) مستغنی کے دل میں طمع اور لالچ نہ ہوگی اور مستعفف جو زبان کے ساتھ لوگوں سے سوال نہیں کرتا (اگر کوئی حالت کا اندازہ کر کے خود ہی دیدے تو قبول کرتا ہے) اور متصبّر جو بتکلف صبر کرتا ہے، تو یا یہ فاقہ پر صبر کرنے کے سیاق میں ہے کہ کوئی شکوہ وشکایت زبان پر نہ لائے اور تنگی وترشی پر صبر کرے اور برداشت کرے اور یہ باساء اور ضراء میں صبر، فرمایا:

(وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ) [البقرۃ: ۱۷۷] (اور تکلیف میں اور کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں) ضراء بیماری اور وسیع مفہوم میں بیماری کے ساتھ ساتھ حاجت اور خوف اور دیگر آزمائشوں پر صبر سے کام لینا، اسی طرح جو اپنے اختیار

سے میدانِ جہاد میں سرگرمِ عمل ہوا تو اس (کی مشقتوں اور دیگر لوازم) پر صبر کرنا مرض پر صبر کرنے سے افضل ہے جس کے ساتھ اپنے اختیار کے بغیر ابتلاء میں ڈالا گیا ہے، اسی لئے جب جہاد میں عنت کے ساتھ مبتلا ہوا تو وہاں اس پر صبر اپنے مسکن میں اس پر صبر کرنے سے افضل ہے اسی طرح دورانِ جہاد بھوک اور مرض پر صبر کرنا بھی جیسا کہ کئی مواضع میں ان نکات پر سیر حاصل بحث کی ہے، اسی طرح فعلِ طاعات مثلاً نماز، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور طلبِ علم میں جو مصائب پیش آئیں ان پر صبر اور حوصلہ سے کام لینا دیگر پر صبر اور حوصلہ سے کام لینے سے افضل ہے، اسی طرح اگر کسی خاندانی مالدار حسینہ نے دعوتِ گناہ دی تو صبر سے کام لیا تو نیکی کے اعمال جس قدر عظیم ہوں ان پر صبر سے جمے رہنا ان سے کمتر پر صبر کرنے سے افضل ہے، طاعات کے افعال میں کئی طرح کے نفسانی فتنے اور آزمائشیں عارض ہوتی ہیں اور رکاوٹیں اور دل پسند راحتیں راستہ کاٹنے کو موجود ہوتی ہیں بالخصوص جب یہ دسترس میں بھی ہوں کیونکہ اگر کسی شئ پر نفس کو دسترس نہیں ہوتی تو وہ اس کی طمع بھی نہیں کرتا جو تب کرتا ہے جب ان پر دسترس ہو اور وہ اس کے بس میں ہوں تو قدرت ہونے کے ساتھ صبر کرنا جہاد ہے بلکہ یہ جہاد سے تین وجوہ سے افضل اور اکمل ہے:

۱- کہ محرمات سے صبر کرنا مصائب پر صبر کرنے سے افضل ہے

۲- قدرت کے باوجود ترکِ محرمات اور نفس کا ان کی طلب کا ترک عدم قدرت میں ان کے ترک سے افضل ہے

۳- نفس کا ان کی طلب کرنا اگر کسی دینی امر کے سبب ہے جیسے نماز یا علم کی طلب یا جہاد کے لئے نکلا تو ایسی شئ/اشیاء کے ساتھ ابتلاء میں ڈالا گیا جن کی طرف نفس مائل ہوتا ہے تو اب ان سے اس کا صبر فعلِ ماموراور ترکِ محظور کو متضمن ہے بخلاف اس کے کہ اس کا نفس بغیر عملِ صالح کے اس کی طرف مائل ہو، اسی لئے یونس بن عبید اپنے مریدوں کو تین نصیحتیں کیا کرتے تھے، اول: حاکموں کے پاس نہ جانا اگر چہ کہو میں اسی صورت ان کی طاعت کروں گا اگر اللہ کو پسند کاموں کا حکم دیں گے، دوم: کسی عورت کے پاس نہ جاؤ اگر چہ کہو میں اسے قرآن پڑھانے جاتا ہوں، سوم: بدعتی کی باتوں پر کان نہ لگاؤ اگر چہ کہو یہ اس لئے تا کہ اسے جواب دوں

تو اسبابِ فتنہ سے احتراز کا حکم دیا کیونکہ انسان جب اس کے لئے متعرض ہو جائے تو امکان ہوتا ہے کہ بچ نہ پائے، اگر بالفرض بغیر اپنے اختیار اور مرضی کے ان کے ساتھ ابتلاء میں ہوا یا اپنے اختیار سے داخل ہوا اور پھر آزمائش میں پڑا تو اب ضروری ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور صبر سے کام لے اور اخلاص اور مجاہدے کا مظاہرہ کرے اب اس کا صبر سے کام لینا اور فرائضِ منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ آلودگیوں سے محفوظ رہنا افضل اعمال میں سے ہے جیسے کسی کو کوئی منصب ملا تو عدل سے کام لیا یا اہلِ بدعات کا خالص سنت کے ساتھ رد کیا اور وہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے یا فتنہ سے بچنے کے ساتھ خواتین کو وجہِ مشروع پر دین کی تعلیم دی لیکن اگر اللہ تعالیٰ بندے کو ابتلاء میں ڈالے اور ان افعال اور عہدوں کو اس پر مقدر کرے تو اب وہ اس کی مدد اس کے شاملِ حال ہوگی لیکن جب بندہ خود آ بیل مجھے مار کی روش اختیار کرے تو اب اللہ اسے اس کے سپرد کر دیتا ہے جیسے نبی اکرم نے عبدالرحمٰن

بن سمرہ سے کہا تھا کہ امارت کا سوال (اور طلب یعنی کوئی سرکاری عہدہ لینے کے لئے بھاگ دوڑ) نہ کرو اور اگر بغیر سوال کے تمہیں کوئی ذمہ داری مل جائے تو تائید غیبی تمہارے شاملِ حال ہوگی، طاعون بارے بھی یہی کہا کہ جب کسی علاقہ میں اس کا وقوع ہو اور تم وہیں ہو تو اس سے فرار کی غرض سے وہاں سے مت نکلو اور اگر کسی جگہ بارے سنو کہ وہاں طاعون واقع ہوا ہے تو ادھر کا رخ نہ کرو، تو جس نے کوئی ایسا فعل کیا جس کا اللہ نے حکم دیا ہے پھر اس دوران بغیر اس کے اختیار کے کوئی فتنہ لاحق ہوا تو اسے اللہ کی مدد حاصل ہوگی بخلاف اس کے جو خود اس کے لئے متعرض ہو لیکن توبہ کا در کھلا ہوا ہے، آدمی عہدہ کی طلب کرتا ہے تو اسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے پھر وہ نادم ہوتا ہے تو اپنی طلب پر اللہ سے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر کے اب اس کی اعانت کرے گا یا تو اقامت واجب پر یا اس سے خلاصی پانے پر اور اسی طرح دیگر تمام فتنوں کا معاملہ ہے جیسے کہا:

(قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا) [الزمر: ۵۳] (کہہ دو اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے) یہ امور تفصیل کے محتاج ہیں جس کے لئے یہ مقام متسع نہیں! مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہمارے لئے تبیین کرے اور ہمیں ہم سے پہلے کے ان لوگوں کی سنت اور روش کی طرف ہدایت دے جن کے بارہ میں کہا:

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ) [الأنعام: ۹۰] (یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی تو تم انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو) ہمیں حکم دیا کہ ان کی راستہ کی اس سے ہدایت مانگیں **(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ)** اسے پسند ہے کہ ان کے راستہ کی پیروی کی جائے، اس کا لوگوں کو حکم دیا ہے اور کہا:

(يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ) [النساء: ۲۶] (اللہ چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تمہیں اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے) تو یہاں تین امور ذکر کئے ہیں بیان، ہدایت اور توبہ اور کہا گیا یہاں سنن سے مراد اہلِ حق و باطل کی سنن ہیں! یعنی وہ چاہتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کی سنن کی ہمارے لئے نشاندھی اور تبیین کرے تو اپنے مومن بندوں کی حق کی طرف رہنمائی کرے اور دوسروں کو گمراہ کرے تو ہدایت اور گمراہی بیان کے بعد ہی ہوتے ہیں جیسے کہا:

(وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ) [إبراهيم: ۴] (اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تا کہ انہیں کھول کھول کر بتا دے پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے)

(وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ) [التوبة: ۱۱۵] (اور اللہ ایسا نہیں

کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے جب تک اُن کے لئے وہ سب واضح نہ کر دے جس کی رو سے وہ متقی بنیں)

تو (آیت میں) سنن (یُبَیّنُ) سے متعلق ہے نہ کہ (یَھْدِیَکُمْ) سے یعنی سنن اہلِ باطل اور اہلِ حق ، اس کے قول : (وَ یَھْدِیَکُمْ) کا متعلق ہے بقول زجاج سنن طرق ہیں تو معنی یہ کہ تمہاری اپنی طاعت پر رہنمائی کرے جیسے انبیاء اور ان کے تابعین کی فرمائی اور یہ اولی ہے اس لئے کہ کبھی (کلام وعبارت میں) دو فعل مذکور ہوتے ہیں تو اکیلے اول فعل کو ہی عامل نہیں کیا جاتا بلکہ یا تو اکیلا ثانی عامل ہوتا ہے یا پھر دونوں ، جیسے یہ آیت :

(اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا) [الکھف : ۹۶] (میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر پگھلا کر ڈال دوں) یا جب یہ تقدیر مراد لی جائے : (یُبَیِّنَ لَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَناً) تو اس امر پر دلالت ملی کہ ہمیں اس کی سنن ہدایت دے گا اور یہاں مراد اہلِ حق کی سنن بخلاف اس قولہ کے :

(قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ) [آل عمران : ۱۳۷] لو (تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سی سنن [یعنی واقعات] گزر چکے ہیں) کہ اس کے بعد کہا:

(فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ) (تو تم زمین میں چل پھر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا) تو اس نے چاہا کہ ظالمین کی عقوبت کی بالعیان پہچان کرائے اور یہاں ہم پر قرآن سے وہ کچھ نازل کیا جس کے ساتھ ہمیں ان لوگوں کی سنن کی ہدایت دے جو ہم سے قبل تھے اور یہ وہ جن پر اللہ نے انعام کیا، تین امور ذکر کئے : تبیین، ہدیٰ اور توبہ اس لئے کہ اولاً انسان خیر وشر اور ماموارت ومنہیات کی معرفت کا محتاج ہوتا ہے پھر اس کے بعد ہدایت دئے جانے کا تا کہ حق کا قصد کرے اور باطل کو چھوڑ کر اس پر عمل کرے اور یہ انبیاء وصالحین کی سنن ، پھر اس کے بعد چھوٹے بڑے گناہوں کا ہو جانا لازم امر ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ان کی توبہ کے ذریعہ تطہیر کی جائے تو انسان علم اور اس پر عمل کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ توبہ کا محتاج ہے کیونکہ ان سنن پر عمل پیرا ہونے میں تقصیر یا غفلت سرزد ہو جانا لازم امر ہے تو ہر طرح کی تقصیر وتفریط ہونے پر توبہ کی صورت میں تلافی ہو جائے گی، اور ان سنن میں واجبات اور مستحبات داخل ہیں اور لازم امر ہے کہ ان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سالک سے کوئی کمی وکوتاہی ہو لہذا استغفار اور توبہ کرنا ہو گی کیونکہ انسان جتنی بھی محنت کرے اللہ نے جو حق اس پر واجب کیا ہے اس کا کما حقہ قیام ممکن ہی نہیں ہے لہذا ہر طاعت کے بعد استغفار وتوبہ کرنا ہی مناسب ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہدایت سے مراد بیان وتعریف ہے یعنی تمہیں گزر چکے اہلِ سعادت وشقاوت کی سنن کا تعارف کرائے تا کہ تم ان کی پیروی کرو اور ان سے بچو جیسے کہا:

(وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ) [البلد: ۱۰] (اور اس کو دونوں راستے بھی دکھا دئے) علی اور ابن مسعود کا قول ہے کہ (نجدین سے مراد) خیر اور شر کا سبیل ہے یعنی ہم نے اس پر انسان کو فطر کیا ہے اور اسے خوب اس کی پہچان کرا دی ہے، سبھی اقوال کا لبِ لباب

واحد ہے، نجدین دو واضح طرق، نجد (یعنی سطحِ مرتفع، بالائی علاقہ) کو کہتے ہیں تو معنی یہ کہ کیا ہم نے انہیں دونوں راہوں کی اچھی طرح پہچان نہیں کرا دی؟ اور دونوں کو واضح نہیں کر دیا؟ لیکن اس آیت میں ہدایت، تبیین اور تعریف میں تمام بنی آدم مشترک ہیں اور انہیں اپنی عقول کی رو سے اس کی معرفت حاصل ہے اور جہاں تک گزر چکے انبیاء کرام کا طریق تو ضروری ہے کہ اس کی بابت اللہ کی جانب سے اِخبار ہو جیسے کہا:

(تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا) [هود: ۴۹] (یہ منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم) لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ معنی مراد ہوتا تو کہتا: (يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ) اور ہدایت کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ جب معنی واحد ہے؟ تو جب ذکر کیا کہ وہ تبیین اور ہدایت کا ارادہ کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اس سے دیگر ہے اور یہ خیر کی طرف دعوت جیسے کہا:

(وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ)[الرعد: ۷](اور ہر ایک قوم کیلئے رہنما ہوا کرتا ہے) یعنی خیر کی طرف داعی، جیسے کہا:

(وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ) [الشورى : ۵۲] (اور بے شک تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو) یعنی اس کی طرف دعوت تعلیم کرنے والے اور یہاں (ھدی) بنفسہ متعدی ہے اس لئے کہ تقدیر ہے: (وَ يُلْزِمَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ فَلَا تَعْدِلُوْنَ عَنْهَا) یہاں ہدی سے مراد الہام نہیں جیسے اس آیت میں ہے: (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) اس لئے کہ اگر اس کا ارادہ کرتا تو اس کا وقوع ہوتا اور کوئی ایک بھی گمراہ نہ ہوتا بلکہ یہ شرعی امری ارادہ ہے محبت اور رضا کے معنی میں، اسی لئے زجاج نے (اس کی تفسیر میں) کہا: (يُرِيْدُ اَنْ يَدُلَّكُمْ عَلٰى مَا يَكُوْنُ سَبَباً لِتَوْبَتِكُمْ) (وہ چاہتا ہے کہ تمہیں ایسی بات کی رہنمائی دے جو تمہاری توبہ کا سبب بنے) تو ارادہ کو اپنے نفس کے فعل کے ساتھ معلق کیا، تو زجاج نے ظن کیا کہ قرآن میں (سب جگہ) ارادہ اسی طرح ہی ہے مگر ان کا ظن درست نہیں بلکہ اس کے فعل کے ساتھ متعلق ارادہ کی مراد اسی طرح ہوگی کیونکہ جو وہ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہ چاہے نہیں ہوتا اور جہاں تک اس کے امر و شرع میں موجود ارادہ تو وہ اس کے اس قول کی طرح ہے:

(مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ) [المائدة : ۶] (اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے) الآیہ اور قولہ:

(اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ) [الأحزاب : ۳۳] (اے اہلِ بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دُور کر دے) ونحوہ تو یہ اس کے لئے اس کا ارادہ ہے جس کا امر دیا بایں معنی کہ یہ اس کے ہاں محبوب و مرضی ہے اور اس کے فاعل کو ثواب دے گا نہ کہ اس معنی میں کہ ارادہ کیا کہ اس کی خلق کرے تو یہ ایسے ہو جیسے کہا:

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا) [الأنعام : ۱۲۵] (تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اُس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے) الآیۃ، اور جیسے حضرت نوح نے کہا تھا:

(وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ)[هود: ۳۴] (اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے تو میری خیر خواہی تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتی وہی تمہارا رب ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) تو یہ اس کا خلقی وتکوینی ارادہ ہے جیسے مسلمان کہتے ہیں: جو اللہ نے چاہا ہوا اور جو اس نے نہ چاہا نہ ہوا اور یہ ارادہ ہر حادث و واقع سے متعلق ہے جبکہ شرعی وامری ارادہ صرف طاعات سے ہی متعلق ہوتا ہے جیسے لوگ کوئی قبیح فعل کرنے والے کی نسبت کہتے ہیں: وہ ایسا کام کر رہا ہے جس کا اللہ نے ارادہ نہیں کیا (یعنی جو اسے پسند نہیں) حالانکہ دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو اس نے چاہا وہی ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا، تو یہ ارادہ دو نوع کا ہے جیسا کہ ایک جگہ اس پر مفصل بحث ہوئی، کبھی ہدی کے ساتھ الہام مراد ہوتا ہے اور تب خطاب ان مطیع اہلِ ایمان کے لئے ہوگا جنہیں اللہ نے اپنی طاعت کی طرف ہدایت دی ہے تو اللہ تعالی نے ارادہ کیا کہ ان کی توبہ قبول کرے اور انہیں ہدایت سے نوازے تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر اس کا ان کے لئے یہ ارادہ نہ ہوتا تو ہدایت یافتہ نہ بنتے جیسے وہ کہیں گے:

(اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ) [الأعراف : ۴۳] (اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں کا راستہ دکھایا اور اگر اللہ ہم کو راستہ نہ دکھاتا تو ہم راستہ نہ پا سکتے، بے شک ہمارے رب کے رسول حق بات لے کر آئے تھے) لیکن آیت میں خطاب تمام اہلِ اسلام کے لئے ہے جیسے آیت الوضوء کے ساتھ خطاب ہے جبکہ اس آیت میں خطاب اہلِ بیت کے لئے ہے: (اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ الخ) اسی لئے اسے تہدید کی جو اس کی طاعت نہ کرے اور جیسے روزوں بارے ہے: (يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ) [البقرة : ۱۸۵] تو یہ شرعی امری ارادہ ہے محبت و رضا کے معنی میں نہ کہ ارادۂ خلق جو مراد کے لئے مستلزم ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر ایسا ہوتو آیت میں خطاب نہ ہو مگر اس کے لئے جو اخذ بالیسر کرے اور اس کے لئے جو مامور بہ کا فعل کرے اور جو اس سے پیچھے رہ جائے وہ اس امر و نہی کے تحت داخل نہ ہوتا جو آیت میں ہے جبکہ ایسا نہیں بلکہ یہ حکم شرعی تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے تو جو طاعت کرے ثواب پائے گا اور جس نے نافرمانی کی وہ سزا کا مستوجب ہوگا اور جنہوں نے اس کی اطاعت کی ہے وہ اس کی ان کے لئے ہدایت کے بموجب کی ہے ہدایتِ الہام اور اس کی اعانت سے کہ انہیں مہتدی بنایا جیسا کہ وہی ہے جو نمازی کو نمازی اور مسلمان کو مسلمان بناتا ہے اور اگر یہاں انسان سے ارادہ وقوعِ مراد کے لئے مستلزم ہوتا تو یہ نہ کہتا:

(وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا) (گزری) کہ تب ان لوگوں کے ارادہ کی کوئی تاثیر نہ ہو بلکہ اس کا وجود اور عدم ایک برابر ہے جیسے حضرت نوح کے اس قول میں ہے:

(وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ الخ) کیونکہ ہر کام اللہ کی مشیت پر موقوف ہے چاہے لوگوں کی مشیت جو کوئی بھی ہو، آیت سے مقصود شہوت پرستی کرنے والوں کی متابعت سے ان کی تحذیر ہے اور معنی ہے میں تمہارے لئے وہ خیر چاہتا ہوں جو تمہیں نفع دے گی اور یہ تمہارے لئے شر کے خواہاں ہیں جو تمہارے لئے ضار ہے جیسے شیطان تمہارا اغواء چاہتا ہے، اس کے اَتباع یہی اہلِ شہوات ہیں پس تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی ذریت کو دوست مت بناؤ بلکہ ہدی و رشاد کے طرق کے سالک بنو اور غی اور فساد کے طرق سے بچو جیسے کہا:

(فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى) [طٰه : ۱۲۳] (تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا) الآیۃ، قولہ: (يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ) (دونوں جگہوں میں) تو اتباعِ شہوت اتباعِ ہویٰ کی جنس سے ہے جیسے کہا:

(اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَ هُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ) [القصص : ۵۰] (پھر اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے اور اس سے بڑا گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے لگے) اور کہا:

(وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ) [المؤمنون: ۷۱] (اور اگر حق ان کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب درہم برہم ہو جائیں)

(وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ) [المائدة : ۷۷] (اور ایسے لوگوں کی خواہش کے پیچھے نہ چلو جو پہلے گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی اکثر گمراہ کر گئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے)

(اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَ هُمْ) [محمد : ۱۴] (بھلا جو شخص اپنے رب سے کھلے راستے پر ہو وہ ان کی طرح ہے جن کے اعمالِ بد انہیں اچھے کر کے دکھائے جائیں اور جو اپنی خواہشوں کی پیروی کریں)

(وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ) [الجاثية : ۱۸] (اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی مت کرنا) اور یہ قرآن میں کثیر ہے، ہویٰ (هَوِيَ يَهْوٰى) کا مصدر ہے تو اس کی اتباع ایسے ہی جیسے اتباعِ سبیل ہوتی ہے (یعنی کسی راہ پر چلنا) جیسے کہا:

(وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ) اور جیسا کہ لفظِ شہوت میں ہے تو اتباعِ ہویٰ سے مراد نفس مسمی المصدر لیا جاتا ہے یعنی اپنے ارادہ و محبت کی اتباع جو کہ اس کی ہویٰ ہے اور ارادہ کی اتباع (سے مراد) وہ کچھ کرنا نفس جس کی خواہش کرے جیسے کہا:

(وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ) [لقمان : ۱۵] (اور جو شخص میری طرف رجوع کرے اُس کے راستے پر چلنا)

(وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ) [الأنعام : ۱۵۳] (اور یہ کہ

میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور دوسرے راستوں پر نہ چلنا کہ اللہ کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے)

(وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ) [الأعراف : ۳] (اور اُس کے سوا اور مددگاروں کے پیچھے مت جاؤ) (بقول مرتب اس کے بعد ایک نسخہ میں یہ عبارت ہے: تو اول انسان کے لئے، ثانی للقول اور ثالث للفعل ہے) تو لفظِ اتباع آمر و ناہی، امر و نہی اور مامور بہ اور منہی عنہ کے لئے ہوتا ہے اور یہ صراطِ مستقیم ہے اسی طرح ہویٰ کے لئے امر و نہی ہے اور یہ نفس کا امر اور اس کا نہی کرنا جیسے کہا:

(اِنَّ النَّفْسَ لَاَ مَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ)[یوسف : ۵۳] (بے شک نفسِ امارہ بُرائی ہی سکھاتا رہتا ہے الا یہ کہ میرا رب رحم کرے بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے) لیکن افعالِ مذمومہ سے جن کا وہ امر دیتا ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کو مستلزم ہوتا ہے تو اتباعِ امر فعلِ مامور ہے اور امرِ نفس کی اتباع وہ فعل کرنا جو وہ چاہے (جس کی طرف نفس کا میلان ہو) تو اس سے معلوم ہوا کہ شہوات اور اہوا کی اتباع نفس کی شہوت اور اس کی ہوی کی اتباع ہے اور یہ اس کے حسبِ ہوی و اشتہاء افعال بجالا کر، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی اتباعِ شہوات و اھواء کے لفظ میں متعین ہے اس لئے کہ جس کی اشتہاء و ہوی کی جاتی ہے وہ بعد از اشتہاء و ہوی ہی موجود ہوتا ہے اور وجود کے وقت ہی انسان کی ذم کی جاتی ہے اور اس نے تب حسبِ ہویٰ و اشتہاء کر لیا ہوتا ہے اور بعد از وجود اس سے نہی نہیں کی جاتی اور نہ اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو (کیونکہ اب تو کر چکا)

نیز مراد مشتہیٰ فعل جس کی انسان ہوی کرے اس کی شہوت اور ہوی کے تابع ہوتا ہے، شہوت اور ہوی اس کے تابع نہیں تو اتباعِ شہوات شہوتِ نفس کی اتباع ہے اور جب شہوت کو مشتہیٰ کے معنی میں کیا جائے تو اصل کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہو گی کہ خارج میں کسی کی اشتہا کی جائے اور انسان اس کے پیچھے لگے جیسے مطلوبہ عورت یا طعام اور اگرچہ عورت اور طعام کو بھی شہوت کا نام دیا گیا ہے جیسا کہ اس فرمانِ نبوی میں: (کُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَہٗ اِلَّا الصَّوْمُ فَاِنَّہٗ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ یَدَعُ طَعَامَہٗ وَ شَرَابَہٗ وَ شَھْوَتَہٗ مِنْ اَجْلِیْ) ای یَتْرُکُ شَھْوَتَہٗ (یعنی روزہ میں انسان دراصل اپنی شہوت کا ترک کرتا ہے) اور وہ اس کا دراصل تارک بنتا ہے جس کی اشتہا کرتا ہے جیسے طعام کا ترک کرنا، ایسا نہیں کہ اپنے نفس میں موجود شہوت کے ترک کے ساتھ اپنے طعام کا ترک کرتا ہے کیونکہ یہ تو اس میں مخلوق اور اس کی جبلت ہے، ثواب کا حقدار تب بنے گا جب اس کا ترک کرے گا جس کی طلب اس شہوت نے کی

حقیقتِ امر یہ ہے کہ یہ دونوں باہم متلازم ہیں تو جس نے اپنے نفس کے ساتھ قائم نفسِ شہوت کی اتباع کی اس نے اس کی پیروی کی جس کا اس نے اشتہاء کیا، اسی طرح جس نے اپنے نفس کے ساتھ قائم ہویٰ کی اتباع کی اس نے اس کی پیروی کی جس کی ہوی کی (جسے پسند کیا) کہ یہ ارادہ کے آثار سے ہے اور ارادہ کی اتباع نفس کے امر کا امتثال اور اس کے حسبِ طلب فعل بجالانا ہے، اس مامور کی مانند جو اپنے امیر کے امر کی اتباع کرے اور لازم ہے کہ اپنی مراد کا تصور کرے جس کی اپنے نفس میں ہوی اور اشتہاء کی اور فعل سے قبل اس کا تخیل کرے تو یہ مثال اس کے آگے باقی ہے جیسے مقتدی کے آگے امام ہوتا ہے اور وہ اس

کے افعال وحرکات کی پیروی اور اقتداء کرتا ہے اور فی الظاہر اس کا فعل فی الباطن کی اتباع کے لئے تبع ہے تو مراد مطلوب اور مشتہیٰ کی وہ صورت جو نفس میں ہے انسان کے لئے محرک اور آمر کی حیثیت میں باقی رہ جاتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے علتِ غائیہ علتِ فاعلیہ ہے اور نفس میں متصور یہ مراد صورت ہی فاعل کو فاعل بناتی ہے تو انسان اس کا متبع ہو جاتا ہے اور شیطان غی میں اسے اور بڑھاتا ہے وہ اس صورتِ متخیلہ کو قوی کرتا اور اس میں رنگ بھرتا اور لوگوں کے لئے اس کی اتباع کرنا مزین کرتا ہے

اور یہ صورت آنکھ کی مطلوبہ صورت کو متناول ہوتی ہے شکلوں، طعام اور شراب سے محبوبات کے مانند، شیطان اور نفس اسے پسند کرتے ہیں اور جوں جوں اور جب جب وہ اپنے نفس میں اس محبوب کا تصور کرے گا چاہے گا کہ خارج میں اس کا وجود ہو، کیونکہ اول فکر (یعنی تصور) اور آخر عمل ہے اور اول بغیت (چاہت) اور آخر درک (یعنی حصول) ہے لہذا انسان اپنی شہوت اور ہوی کا اسیر اور سلطانِ ہوی کے تحت مقہور بن کر رہ جاتا ہے اور اس کا قہر ہر قاہر کے قہر سے اعظم ہے تو یہ ہوائی قاہر اس کے نفس کے ساتھ قائم صفت ہے کسی صورت اس سے جدائی ممکن نہیں، نفس کو ذہنی صورت کی طلب ہوتی ہے، نفس چاہتا ہے کہ محبوب کو پالے، وہ اپنے نفس میں اسے ممثل کرتا ہے تو وہ ارادہ کا متبع ہے، خارج میں موجود مشتہیٰ کے لئے دو محرک ہوتے ہیں: تصور اور مشتہی، یہ اسے تحریک طلب وامر دیتا ہے اور یہ اسے حکم دیتا ہے کہ اس کی طلب اور امر کی پیروی کرے تو اتباعِ شہوات واہواء اس سب کو متناول ہے، بخلاف انسان سے منفصل ہر قاہر کے تو اس کے لئے اس کی مفارقت ممکن ہے اس کے نفس کی اپنے حال پر بقاء کے ساتھ جبکہ یہ اس کے نفس کی صفت کے تغیر کے ساتھ اس سے مفارق ہوتا ہے اسی لئے نبی اکرم نے فرمایا تین مہلک چیزیں ہیں: (شُحٌّ مُطَاعٌ وَ هَوىً مُتَّبَعٌ وَ إِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهِ) (اسی کے ص:۱۷۹ میں ترجمہ مذکور ہے) اور تین نجات کا سبب بننے والے امور واشیاء کا ذکر کیا جو یہ ہیں: سر وعلن میں اللہ کا ڈر ہونا اور فقر وغنا میں اعتدال سے خرچ کرنا اور غضب ورضا میں حق کی بات منہ سے نکالنا، (هَوىً مُتَّبَع) میں دلیل ہے کہ متبع وہ ہے جو نفس میں قائم ہوا، جیسے آنجناب کا شح کو مطاع کہنا اس لئے کہ وہ آمر ہے اور ہوی کو آپ نے متبع کہا اس لئے کہ متبع کبھی امام ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے اور وہ آمر نہیں ہوتا، صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا **شح سے بچو کہ اس کی وجہ سے سابقہ امم کی ہلاکت ہوئی**، انہیں اس نے بخل کا حکم دیا تو انہوں نے بخل کیا، ظلم کا کہا تو ظلم کیا، قطع رحمی پر لگا دیا تو ایسا ہی کیا، تو بیان کیا کہ شح بخل، ظلم اور قطع رحمی کا آمر ہے، بخل لوگوں کو اپنے نفس (اور اس کی صلاحیتوں) اور اپنے مال کے ساتھ انتفاع سے روکنا اور ان پر ظلم واعتداء (اور زیادتی) کرنا، تو اول تفریط ہے اس شیٔ میں جو واجب ہے یعنی اپنے ذمہ واجب امور میں کوتاہی کی اور فعلِ محرم کیا یعنی ان پر اعتداء، قطع رحمی کو خاص بالذکر اس کے لئے اِعظام کے بطور کیا اس لئے کہ یہ اپنے سے قبل کے دونوں امور میں داخل ہے، مفسرین نے قولہ:

(وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ) [الحشر : ۹] (اور جو شخص حرصِ نفس سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں) کی تفسیر میں کہا وہ یہ کہ اللہ کی منہیات میں سے کسی شیٔ کا اخذ نہ کرے اور کسی ایسی شیٔ کا منع نہ کرے اللہ

نے جسے ادا کرنے کا حکم دیا ہے، تو شح اللہ و رسول کے امر کے برخلاف کا حکم دیتا ہے تو اللہ ظلم سے منع کرتا اور حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے جبکہ شح ظلم کا امر دیتا اور حسنِ سلوک سے روکتا ہے، عبدالرحمٰن بن عوف بارے منقول ہے کہ طواف کے اور وقوفِ عرفہ کے دوران کثرت سے یہ دعا مانگا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ قِنِيْ شُحَّ نَفْسِيْ) (اے اللہ مجھے اپنے نفس کے لالچ سے بچا) پوچھنے پر کہا اگر میں اپنے نفس کی شح سے بچالیا گیا تو ظلم، بخل اور قطع رحمی سے محفوظ ہو جاؤں گا، ان سے ایک روایت میں ہے کہ کہا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہلاک نہ ہو جاؤں، کہا گیا وہ کیوں؟ کہا میں نے اللہ کو کہتے سنا ہے: ((وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ الخ) اور میں شحیح آدمی ہوں، نہیں قریب کہ میرے ہاتھ سے کوئی شئ نکلے، کہا یہ وہ شح نہیں جس کا اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے بلکہ اس سے مراد وہ شح کہ تم ظلماً اپنے بھائی کا مال کھاؤ اور یہ بوجہ بخل ہوتا ہے اور بخل بری شئ ہے، اللہ نے شح کا ذکر اس آیت میں حسد اور ایثار کے ذکر کے سیاق میں کیا ہے چنانچہ کہا:

(وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ) (اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش و خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو) پھر کہا: (وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ الخ) تو جو شحِ نفس سے بچالیا گیا وہ حاسد اور محسود پر زیادتی کرنے والا نہ بنے گا، حسد کی اصل محسود سے بغض ہے، آدمی میں شح حرص اور مال میں شدتِ رغبت اور غیر سے بغض اور اس پر ظلم کے ساتھ ہوتا ہے جیسے کہا:

(قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ) إلى قوله: (اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ) [الأحزاب: ۱۸۔۱۹] (اللہ تم میں سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو منع کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ اور لڑائی میں نہیں آتے مگر کم۔ تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔۔اور مال میں بخل کریں یہ لوگ ایمان لائے ہی نہ تھے تو اللہ نے اُن کے اعمال برباد کر دیئے) تو اہلِ ایمان اور خیر پر ان کی شح اس کی کراہت اور بغض کو متضمن ہے، خیر سے بغض شر کا آمر (اور محرک) ہے جیسے آدم کے دو بیٹوں (یعنی ہابیل اور قابیل) اور برادرانِ یوسف کا معاملہ ہوا، تو حسد اور شح بغض و کراہت کو متضمن ہیں تو منعِ واجب اور اس شخص سے بغض اور اس پر ظلم روا رکھنے کی تحریک دیتے ہیں تو اس میں فعل کا صدور بغض کے جذبہ سے ہوتا ہے بخلاف ہویٰ کے کہ اس میں فعل کا صدور کسی شئ سے محبت کی رو سے ہے تو فعل کو اس کے تابع کرتا ہے اور یہ اس کا مقصود امرِ عدمی ہے اور عدم غیر نافع ہے لیکن یہ قصد وجودی امر کا امر ہے تو اس امر کی اطاعت کی گئی، ابن مسعود نے بخل کو شح سے خارج کیا اور نبی اکرم نے شح کو بخل کا آمر (اور محرک) بنایا، بعض کہتے ہیں کہ شح و بخل ایک برابر ہیں جیسے ابن جریر نے کہا کہ کلامِ عرب میں شح بخل ہے اور فاضل مال کو روکے رکھنا، مگر ایسا نہیں جو انہوں نے کہا، بلکہ یہ بات نبی اکرم نے اور ابن مسعود نے کہی اور وہ مانی جانے کے زیادہ حقدار ہے تو بخیل کبھی اس کی محبت کی رو سے مال میں بخل کرتا ہے جو اس کے ساتھ اس کے لئے لذت اور تنعُّم کا حصول ہوتا ہے اور کبھی وہ اس کے ساتھ متلذذ اور متنعم

نہیں ہوتا بلکہ اس کا نفس اس کے انفاق سے تنگ پڑتا اور یہ اسے ناگوار لگتا ہے حتیٰ کہ کئی دفعہ معاملہ اس حد تک بھی جا پہنچتا ہے کہ خود کو بھی اس کے ساتھ حظ و تنعّم سے روک رکھتا ہے (یعنی اپنی ذات پر بھی خرچ نہیں کرتا) باوجود کثرتِ مال کے! بس اپنے مال کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے (اور گنتا رہتا ہے) اور کبھی اصلاً ہی ادھر کوئی لذت نہیں ہوتی بلکہ اسے ناگوار لگتا ہے کہ کسی کے ساتھ احسان کرے بلکہ اگر کوئی اور دینا چاہے تو بھی اسے برا لگتا ہے (یعنی دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرتا ہے) اور یہ خیر سے اپنے بغض کی وجہ سے نہ کہ معطیٰ یا معطی لہ سے بغض کی رو سے اور کبھی بغض کے ساتھ ساتھ حسد کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے اور یہی شح ہے اور قطعاً یہی بخل کا آمر اور محرک ہے لیکن ہر بخل شح سے ہوتا ہے تو ہر شحیح بخیل ہے البتہ ہر بخیل شحیح نہیں ہوتا

بقول خطابی شح منع میں بخل سے ابلغ ہے اور بخل دراصل امور کی جزئیات اور خواص الاشیاء سے ہے جبکہ شح عام ہے تو وہ انسان کے لئے لازم وصف کی طرح ہے طبع اور جبلت کی رو سے، خطابی نے بعض سے نقل کیا کہ بخل یہ ہے کہ انسان اپنے مال کے ساتھ بخل کرے جبکہ شح یہ ہے کہ مال کے ساتھ بھی اور بھلائی کے ساتھ بھی بخل کرے، ایک قول ہے کہ شح یہ ہے کہ اسے اچھا نہ لگے کہ کوئی کسی کے ساتھ بھلائی کرے اور بخل یہ کہ خود کسی کے ساتھ احسان اور تعاون کرنے سے باز رہے، شہوات اور اہواء کے متبعین کو یہ پسند ہوتا ہے اور وہ یہی وطیرہ اختیار کئے رکھتے ہیں تو بغیر علم کے اپنی محبت وارادت کی پیروی میں لگے رہتے ہیں، انہیں اس بات کا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ یہ انجام کے لحاظ سے ان کے لئے نافع ہے یا ضار؟ اسی لئے کہا: (فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَ هُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ) (ابھی گزری) اتباعِ ہوی کے کئی درجے ہیں، تو ان میں سے مشرکین ہیں جو بلاعلم اللہ کے سوا اس کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں اچھا لگتا ہے اور بغیر دلیل و برہان کے جیسے کہا:

(اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ) [الفرقان: ۴۳] (کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا؟) یعنی جتنے الٰہ بنا کر پوجا میں لگا ہوا ہے، یہ ان آلہہ میں سے جن کے ساتھ اس کی ہویٰ متعلق ہوئی، یہ نہیں کہا کہ اسی کی ہوی اس کا نفسِ الٰہ ہے کہ ہر جسے وہ پسند کرے اس کی عبادت نہیں کرتا کیونکہ ہوی کی کئی اقسام ہیں! بلکہ مراد یہ ہے کہ اس نے جسے اپنا معبود بنا رکھا ہے یہ وہ جسے اس کی ہوائے نفس نے اختیار کیا تو اس کی عبادت ہوائے نفس کے تابع ہے تو اس نے اس کی عبادت نہیں کی جس کی عبادت کرنا واجب ہے اور جس کی عبادت کرنے کا حکم ہے، یہ اہلِ بدعت کا حال ہے تو انہوں نے غیر اللہ کی عبادت کی اور کئی قسم کی عبادات کا ابتداع کیا، یہ زعم کرتے ہوئے کہ ان کے ساتھ وہ اللہ کی عبادت کر رہے ہیں تو وہ دراصل اپنی ہوائے نفس کی اتباع کر رہے ہیں تو وہ اپنے نفس کی محبت، ذوق، وجد اور اس کی ہویٰ کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں اور انہیں اس کا علم وشعور ہی نہیں اور نہ ہدایت ان کی قسمت میں ہے اور نہ کتابِ منیر ان کی مصاحب ہے، اگر یہ علم اور کتابِ منیر کی اتباع کرتے تو سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرتے اور اللہ کے بتلائے طریقوں کے ساتھ عبادت

کرتے نہ کہ حوادث اور بدعات کے ساتھ، مقصود یہ ہے کہ آلہہ کثیر ہیں اوران کے لئے عبادات متنوع ہیں

خلاصہ کلام یہ کہ ہر جس کا انسان مرید اور محبّ ہے **ضروری ہے کہ اپنے نفس میں اس کا تصور کرے** تو یہ صورتِ علمیہ اس کے لئے اس کے محبوب اور لوازمِ محبت کی طرف سے تحریک دیتی ہے تو جس نے اس کی عبادت کی اس نے غیر اللہ کی عبادت کی اور شیاطین اس کے معبودانِ باطلہ کی صورت میں اس کے لئے متمثل ہوتے ہیں، یہ کثیر الوقوع ہے! ہمیشہ ہوتا رہا اور اب تک ہورہا ہے لہذا ہر جو غیر اللہ کا پجاری ہے وہ دراصل شیطان کا پجاری ہے اور اسی لئے شیطان طلوع اور غروب کے وقت سورج کا مقارن اور اس کے برابر ہوتا ہے تا کہ سورج کی عبادت کرنے والوں کا سجدہ اس کے لئے ہو، اسی طرح شیاطین بتوں کے اندر سے ان کے پجاریوں سے کلام کرتے تھے، ہمارے دور میں بھی اسلام کی طرف اپنا انتساب کرنے والوں میں سے خلقِ کثیر، اسی طرح نصاریٰ اور مشرکین میں سے کئی ان کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، زندہ اور مردہ مشائخ میں سے جن کی وہ تعظیم کے داعی ہیں (یعنی شرک کی حد تک تعظیم کرتے ہیں) تو ان سے طلبِ حاجات کرتے اور انہیں اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں، ان کی حیات میں بھی اور بعد از موت بھی تو کئی دفعہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے آکر ان سے کلام کی اور حاجت پوری کی ہے تو یہ دراصل شیطان ہوتا ہے جو انہیں اس شرک پر لگائے رکھنے کے لئے اس شیخ کی صورت (یا کسی بھی بزرگ کی شکل) دھار کر آتا ہے اور دادرسی کرتا ہے

عشق میں مبتلا عاشقوں کے سامنے کئی دفعہ شیطان ان کے معشوق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا عاشق اس کی صورت کا تصور کرلیتا ہے اور یہ معاملہ اس کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے تو یہ شیطان ہے جس نے اس کے دل میں اپنا نقش ثبت کر رکھا ہے، اسی لیے جب بندہ اللہ کا ذکر کرے وہ ذکر جو وسواس کا دافع ہے تو یہ مثالِ شیطانی غائب ہو جاتی ہے، کئی دفعہ محبّ پر محبوب کی صورت یوں مستولی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر دم اسے ہی دیکھتا اور تکتا رہتا ہے، کوئی اس کا غیر اسے نظر ہی نہیں آتا اور نہ اس کے کان اس کی کلام کا غیر سنتے ہیں تو اس کا نفس ہر لحظہ اسی کے ساتھ مشغول رہتا ہے، جن حضرات کا اللہ کی طرف سلوک ناقص ہوتا ہے ان میں سے بھی کسی کے لئے اس کی ایک نوع کا حصول ہوتا ہے، اسے اصطلام اور فناء کا نام دیا جاتا ہے (جب یہ حالت طاری ہوتی ہے) تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنی محبت، اس کے معروف کے ساتھ اپنی معرفت اور مذکور کے ساتھ اپنے ذکر سے غائب ہو جاتا ہے حتی کہ اسے اللہ کے اسمائے وصفات، اس کی کلام اور اس کے امر و نہی میں سے کسی شئ کا شعور نہیں رہتا، ان میں سے کئی اتحادِ ذات کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں: (اَنَـا هُـوَ وَ هُـوَ اَنَـا وَ اَنَا اللّٰهُ) (میں وہ اور وہ میں ہوں اور [نتیجہ یہ نکلا کہ] میں اللہ ہوں) کثیر اہلِ سلوک خیال کرتے ہیں کہ یہی سالکین کی غایت ہے اور یہی وہ توحید ہے جو ہر سالک کا منتہائے مقصود ہے اور وہ اس میں غالط ہیں بلکہ یہ نصاریٰ کے قول کی جنس سے ہے بلکہ یہ گمراہ ہیں کیونکہ اللہ کی خبر وامر میں یہ فی الباطن شرعی طریق کے سالک نہیں بنے، اس پر ایک جگہ تفصیل سے بات کی ہے

مقصود یہ ہے کہ صورتوں، طعام، شراب اور لباس سے اپنی شہوات کے متبعین کے دلوں پر اس اشتہاء کا ایسا غلبہ اور زور

ہوتا ہے کہ وہ ان کا مالک اور آقا بن جاتا ہے اور وہ اس کا اسیر اور بے دام بندہ اور مطلوب کے ہاتھ کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے، اسی لئے بعض سلف کا قول ہے کہ میں ایک نو جوان ناسک (یعنی عابد) کے پاس کسی لڑکے کا آنا جانا اور اس کے ساتھ اس کی مجالست کو خونخوار درندے کے حملہ کرنے سے بڑھ کر مضر اور مخیف سمجھتا ہوں اور یہ اس لئے کہ نفسِ صافیہ جس میں رقتِ ریاضت ہے مگر (ابھی) اللہ کی محبت وعبادت کی طرف اس کا تام انجذ اب عمل میں نہیں آیا اور نہ ابھی دل میں اللہ کی تام خشیت قائم ہوئی ہے جو اس کی ہوائے نفس کے آگے بند باندھے جب وہ صورتوں میں سے کسی صورت کے تحت ہو کر اس کے حواس پر چھا جائے جیسے درندہ اپنے شکار پر چھا جاتا ہے تو درندہ اپنے شکار کو بالقہر پکڑتا ہے اور اس کے پاس بچنے کی تاب نہیں ہوتی تو اسی طرح محبوب صورتوں میں سے جسے انسان اپنے دل میں ممثل کر لے وہ اس کے دل کو نگل لیتی اور اس پر اپنا تسلط جما لیتی ہے تو اس کا دل اس کی مٹھی میں پنجرے میں بند پرندے کی مانند ہو جاتا ہے اور ہمہ وقت اس کے خیالوں میں گم رہتا ہے جیسے کوئی شکار درندے کے پیٹ میں پہنچ جائے اس لئے کہ محبوب ومراد غایتِ نفس ہے جسے اس پر سلطانِ قاہر حاصل ہے، دل اسی میں غرق رہتا ہے جو اس پر مستولی ہو یا محبوب یا پھر مخوف جیسے جاہ و مال اور صورتوں کی محبت کا وجود ہوتا ہے اور اپنے غیر سے خائف کا دل و دماغ ہمیشہ اسی میں مستغرق رہتا ہے جیسے کوئی پانی میں غرق ہو جائے، لازم ہے کہ نفس پر ان کا غلبہ ہو جو اجسام سے اسے محیط ہیں اور قلوب پر ان کا استیلاء ہوتا ہے جو مخاوف اور محبوبات ومکروہات میں سے ان کے لیے متمثل ہوں، محبوب اسے طلب کرتا اور مکروہ اسے دور ہٹاتا ہے، امید محبوب جبکہ خوف مکروہ سے متعلق ہے اور نیکیوں کو اللہ ہی لے کر آتا ہے (یعنی اس کی توفیق سے ہوتی ہیں) اور برائیوں کو بھی اللہ ہی لے کر جائے تو جائے، فرمایا:

(وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ) [یونس : ۱۰۷] (اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اُس کے سوا اس کا کوئی دُور کرنے والا نہیں اور اگر تم سے بھلائی کرنی چاہے تو اُس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے وہ بخشنے والا مہربان ہے)

(وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ) [النحل : ۵۳] (اور جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اُسی کے آگے چلاتے) جب بندہ رب تعالی سے اعطائے مطلوب اور دفعِ مرہوب کی دعا کرے تو وہ اس کے لئے اپنے ساتھ ایمان، اپنی محبت، معرفت، توحید، رجا، حیاتِ قلب اور نورِ ایمان کے ساتھ اس کی استنارت میں سے وہ کچھ کر دیتا ہے جو اس مطلوب سے بڑھ کر اس کے لئے نافع ہوتا ہے اگر وہ متاعِ دنیا کا کوئی ساماں ہے لیکن اگر اس امر کا اس سے طالب بنے کہ اپنے ذکر، شکر، حسنِ عبادت اور اس کے لوازم پر اس کا معین و مددگار بنے تو یہاں مطلوب کبھی طلب سے انفع ہوتا ہے اور یہ دعا اور مطلوب ذکر وشکر اور بطریقِ احسن عبادت کا قیام وغیرہ، اس کے بسط کے لیے ایک دیگر مقام ہے!

مقصود یہ کہ دل پر کبھی چھا جاتا اور مستولی ہو جاتا ہے وہ جو انسان کی مراد و محبوب یا مخیف و محذور ہو، جو بھی وہ ہو اسی لیے کہا:

(بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ) [المؤمنون: ۶۳] (مگران کے دل ان کی طرف سے غفلت میں ہیں اور ان کے سوا اور اعمال بھی ہیں جو یہ کرتے رہتے ہیں) تو ان امور کے غمر جن سے انہیں انذار کیا گیا تھا، نے انہیں اللہ کے ذکر اور دارِ آخرت کے بارے فکر کرنے سے مشغول کر دیا اور اس سے جو اس میں نعیمِ مقیم اور عذابِ الیم ہے، فرمایا:

(فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنَ) [المؤمنون : ۵۴] (تو ان کو ایک مدت تک ان کی غفلت ہی میں رہنے دو) یہاں حبِ مال و بنین کا غمر (یعنی غفلت اور نشہ) مراد ہے جو خیرات اور اعمالِ صالحہ میں مسارعت سے مانع بنا، فرمایا:

(قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ) [والذاریات: ۱۰-۱۱] (اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں۔ جو بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں) کئی آیات، یعنی امرِ آخرت سے ساہی بن گئے غافل تو وہ اس سے غمرت میں ہیں یعنی مال و جاہ کی ایسی محبت ان پر چھائی کہ فکرِ آخرت کی مہلت ہی نہ دی، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مشابہ ہے:

(وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا) [الکھف: ۲۸] (اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا) تو غمرہ اتباعِ ہویٰ سے اور سہو غفلت کی جنس سے ہے اسی لئے بعض نے کہا سہو کسی شئ سے غفلت اور دل سے اس کا ذہاب، اور یہ شر کا جامع ہے، شہوت اور اللہ اور دارِ آخرت سے غفلت خیر کے باب کو مسدود کر دیتی ہے جو ذکر اور بیدار مغزی ہے اور شر، سہو اور خوف کا دروازہ کھولتی ہے، تو دل اسی میں مغمور رہ جاتا ہے جس کی ہوی کرے اور جس سے ڈرے، اللہ سے غافل اللہ کے غیر کا مرید، اس کے ذکر سے ساہی اور غیر اللہ کے ساتھ مشغول کا معاملہ منفرط ہوا (یعنی حد سے متجاوز) دنیا کی محبت نے اس کے دل پر زنگ لگا دیا جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو، مال و متاع کا بندہ ہلاک ہو، کوئی اس کا پرسانِ حال نہ ہو، کانٹا چبھ جائے تو اس کا پتہ نہ چلے، اگر عطا کیا جائے تو خوش وگرنہ ناراض، تو اسے اس کا بندہ قرار دیا جو اسے خوش رکھے اور محرومی و فقدان اسے ناخوش رکھے، قطیفہ جس پر وہ بیٹھا ہے (دری اور گدی وغیرہ) تو وہ اس کا خادم بن چکا، جیسے بعض سلف نے کہا تھا: وہ لباس پہنو جو تمہاری خدمت کرے نہ کہ وہ جس کی تم خدمت کرو، خمیصہ جس کے ساتھ اپنا تن ڈھانپے اور یہ معمولی مال ہے! گویا قلیل سی متاعِ دنیا کا بھی وہ بندہ بنا ہوا ہے قیمتی چیزوں کا تو کیا کہنے، مل جائے تو خوش، نہ ملے تو ناخوش، گویا یہی اس کی کل متاع اور یہی اس کا ملجا و ماوی ہے لیکن مومن کا حال اس سے مختلف ہے، اس نے اپنا معبود اس حق باری تعالیٰ کو بنایا ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں، جب مومن اس کی عبادت اور اس سے محبت کرے گا تو اس کے دل میں اس کی رو سے ایمان، توحید، ذکر اور عبادت کے جذبات واقع ہوں گے تو وہ اس کے ساتھ خوش اور راضی ہوگا اور اس میں پیش آ

نے والی رکاوٹیں اسے ناخوش کریں گی، اسی طرح جو بھی کسی شیٔ سے محبت کرتا ہے تو لازم ہے کہ اس کے دل میں اس کا تصور ہو اور حسبِ امکان اس کے ساتھ اتصال کا مرید ہو، جنید کہتے ہیں عبد عبد نہ ہوگا حتیٰ کہ وہ اللہ کے کل ماسوا سے آزاد ہو جائے، یہ اسی حدیث کے مطابق ہے تو انسان اللہ کے لئے خالص عبد اور اس کے لئے کل دین کا اخلاص کرنے والا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس کے ماسوا ہر شیٔ کی بندگی کو ترک نہ کردے اور اس سے اس کا کچھ بھی ناطہ نہ ہو اور نہ اس میں ماسوا اللہ کی عبودیت کا ادنی سا بھی جزو ہو، جب حالت یہ ہو کہ غیر اللہ اسے خوش یا ناخوش کرے تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ اس غیر کا عبد ہے تو اس کی محبت وعبادت کے بقدر اس میں اس غیر کے لئے شرک کی ملاوٹ ہوگی، فضیل بن عیاض کا قول ہے بخدا اللہ کی عبودیت میں وہ شخص سچا نہیں کہ مخلوقین میں سے کسی کے لئے اس پر ربانیت (یعنی رب جیسی مولائیت) ہو، زید بن عمرو بن نفیل کا شعر ہے (ان کے بیٹے سعید حضرت عمر کے بہنوئی، سابق الی الاسلام اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، زید نے نبوت کے ظہور سے قبل وفات پائی، مشرکینِ مکہ کے دین پر نہ تھے):

اَ رَبًّا وَاحِداً اَمْ اَلفَ رَبٍّ   اَ دِیْنٌ اِذَا انْقَسَمَتِ الْأُمُوْرُ

(کیا ایک رب یا ہزار رب؟ کیا ایک دین جب امور منقسم ہوئے؟) احمد ترمذی اور طبرانی نے اسماء بنت عمیس کی حدیث سے نقل کیا کہ نبی اکرم نے فرمایا: (بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَخَیَّلَ وَ اخْتَالَ وَ نَسِیَ الْکَبِیْرَ الْمُتَعَالِ بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ تَجَبَّرَ وَ اعْتَدٰی وَ نَسِیَ الْکَبِیْرَ الْمُتَعَالِ) برا ہے وہ بندہ جس نے تعلّی وتکبر کیا اور اللہ کی کبیر ومتعال ذات کو بھول گیا، برا ہے وہ بندہ جس نے تجبر کیا اور حد سے تجاوز کیا واعتداء کیا اور اللہ کی کبیر ومتعال ذات کو بھول گیا، برا ہے وہ بندہ جو سہو ولہو میں پڑا اور اسے قبر اور موت یاد نہ رہی، برا ہے وہ بندہ جس نے سرکشی، ظلم اور زیادتی کی اور اپنے مبدا ومنتہا اور انجام وآغاز کو فراموش کر بیٹھا، برا ہے وہ بندہ جس نے دنیا کو دین اور دین کو شبہات کے ساتھ خراب کیا اور برا ہے وہ بندہ جسے دنیا کی کشش نے حق سے دور کر دیا، برا ہے وہ بندہ لالچ جس کا قائد بنا، برا ہے وہ بندہ جو ہوائے نفس کے شکنجہ میں پڑ کر گمراہ ہوا، بقول ترمذی یہ غریب ہے سابق الذکر صحیح حدیث سے اس کی تقویت ہوتی ہے، اس معنی میں کثیر احادیث وآثار مروی ہیں، قرآن میں ہے:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَہُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ) [البقرۃ: ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) طالبِ ریاست خواہ اس کے لئے باطل طریقے اختیار کرنے پڑیں تو خوشامد اچھی لگی ہے اگر چہ وہ باطل ہو اور ایسی بات کڑوی لگتی ہے جس میں اس کی ذم (اور اس پر تنقید) ہو اگر چہ وہ حق ہو جبکہ مردِ مومن کو حق بات اچھی لگتی ہے چاہے اس کے حق میں ہو یا اس کے خلاف ہو اس لیے کہ اللہ تعالی حق، صدق اور عدل کو پسند اور کذب اور ظلم کو ناپسند کرتا ہے تو حق، صدق اور عدل جو اللہ کو پسند ہے بندے کو بھی پسند ہو اگر چہ اس میں اس کی ہوی کی مخالفت ہو اس لئے کہ اس کی ہویٰ رسول کی تعلیمات کی تابع ہوگئی ہے، اسی طرح ظلم وکذب جو اللہ کے ہاں مبغوض ہیں مومن کو بھی ان سے بغض ہے اگر چہ یہ

اس کی ہوائے نفس کے موافق ہو،اسی طرح مال کا طالب اگر چہ اس کے حصول میں باطل اور ناجائز ذرائع استعمال کرے جیسے کہا:
(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ) [التـوبة : ۵۸] (اوران میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر ان کو اس میں سے مل جائے تو خوش رہیں اور اگر نہ ملے تو جھٹ خفا ہو جائیں) تو یہی سابق الذکر حدیث کا مصداق ہیں، یہ تو ابھی درہم و دینار کی محبت ہے تو ان شہوات واہواء کا معاملہ کیا ہو جو درہم و دینار سے بڑھ کر اس کے ہاں اہمیت کی حامل ہیں اور وہ محبوبات جو دل کو اللہ کے لئے کمالِ محبت اور کمالِ عبادت سے روک لیتی ہیں کہ اس کے دل میں ہمہ وقت کشمکش رہتی ہے، ان محبوبات میں سے ہر ایک اسے اللہ کی کمالِ عبادت ومحبت سے کھینچ کر اپنی طرف راغب کرتی ہے، یہی معاملہ اس کے ہاں مکروہات کا ہے تو وہ بھی اس کے لئے اللہ کی عبادت اور محبت سے شاغل ہیں، مسند میں احمد اور کئی اور نے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے اپنے صحابہ سے فرمایا کیا تم فقر سے ڈرتے ہو؟ مجھے تمہاری نسبت اس کا کوئی اندیشہ نہیں، میں تو تم پر دنیا سے ڈرتا ہوں، یہ دنیا ہی ہے جو دل کو (دین اور اللہ سے) دور کرے گی

اور اسی طرح انسان کے دوست اور دشمن، دوست اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اگر یہ محبت اللہ کے لئے نہیں تو یہ اسے اللہ سے کاٹ کر رکھ دے گی جبکہ اس کے دشمن اسے اللہ سے مشغول رکھیں گے (یعنی دشمنی میں پڑ کر اللہ سے غافل ہو جائے گا) **جو دوستی اور دشمنی دین وطاعت سے غافل کرے دین میں اس کی گنجائش نہیں**، فتنہ تبھی دور ہوگا جب انسان کا کل دین اللہ عزوجل کے لئے ہو تو اس کی محبت اللہ کے لئے اور اس کے لئے ہو جو اللہ کو پسند ہے اور اس کا بغض اللہ کی خاطر اور ان سے ہو جو اللہ کو مبغوض ہیں، اسی طرح اس کی موالات اور معادات، مخلوق کی محبت بھی جاذب ہے اور خالق کی محبت بھی تو جو ان دو میں سے اقوی ہوگی وہ اس پر غالب رہے گی، کمال یہ ہے کہ انسان کی تمام محبتیں، خواہشیں اور رغبتیں اللہ کے تابع ہوں اور اس کی عبادت ومحبت میں کسی کو رکاوٹ نہ بننے دے، یہ تبھی ہوگا جب اس کے دل میں اللہ کی خشیت اور اِنابت ہوگی اور جہاں تک لوگوں کی اس سے محبت تو وہ اس امر کی موجب ہوسکتی ہے کہ اسے اپنی طرف جذب کر لے تو اگر اس میں ایسی مدافعانہ قوت نہ ہوگی جو انہیں اللہ کی محبت اور خشیت میں رکاوٹ بننے سے باز رکھے تو وہ اسے غافل کر ڈالے گی جیسے عزیزِ مصر کی زوجہ کی حضرت یوسف سے حب تھی تو حضرت یوسف میں جو تقوی، للّٰہیت اور اللہ کے لئے محبت واخلاص تھا وہ اس کی ان کے لئے محبت کے جذبہ اور اس کے حسن و جمال سے سے اقوی تھا، اسی لئے بچ گئے تو یہ انہیں اللہ کی طرف سے حاصل عصمت تھی وگرنہ اس طرح کے معاملات میں تھوڑا بہت ضرر ضرور لاحق ہو جاتا ہے اسی لئے نبی اکرم نے فرمایا کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ ہوگا مگر ان کا تیسرا شیطان ہوگا (جو برائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا) کبھی لوگ کسی سے اس کے علم یا دین یا احسانات وغیرہ کے باعث محبت کریں گے تو اس میں بڑا فتنہ ہے الا یہ کہ اس میں ایمانی قوت، خشیت اور توحید تام ہو تو علم، جاہ اور صورتوں کا فتنہ ہر مفتون کے لئے ہے اور اس کے ساتھ

ساتھ اس سے وہ اپنے مقاصد کے بھی طالب ہوں گے، اگر پورے کئے تو ٹھیک وگرنہ محبت میں نقص در آئے گا یا ایک نوعِ بغض کا وقوع ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ محبت کا یہ تعلق بالکلیہ ہی ختم ہو جائے تو بعد اس کے کہ ان نظروں میں محبوب تھا اب مبغوض بن کر رہ جائے تو انسان کے اصدقاء واحباب اپنی اغراض ومقاصد میں اس کا استعمال چاہتے ہیں حتیٰ کہ ان کے لئے عبد بن جائے جبکہ اس کے اعداء اس کی ایذاء رسانی اور اضرار میں سعی وکوشش کریں گے تو دونوں طریق میں سے اسے دینی لحاظ سے کوئی مضرت ومفسدت حاصل ہوسکتی ہے مگر وہ اس بارے نہیں سوچتے! وَقَلِيْلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْر (اور میرے شکرگزار بندے تو کم ہی ہیں)

تو یہ دونوں گروہ (یعنی اس کے اصدقاء اور اس کے اعداء) فی الحقیقت اس کے نفع اور اس کے ضرر کے دفع کے قاصد نہیں، ان کے سامنے تو ان کی ذاتی اغراض ومقاصد ہیں تو اگر انسان اللہ کے لئے عابد، اس پر متوکل، اس کا مُوالی اور اس کے دشمنوں کا مُعادی نہ ہو تو یہ تو اسے کھا جائیں اور دنیا وآخرت میں اس کی تباہی وبربادی کا سبب بنیں گے، یہی بنی آدم کے احوال سے معروف ہے اور جو ان کے مابین دوستیاں، دشمنیاں، اختلافات اور فتنے واقع ہوتے ہیں، ایک قوم مثلاً زید سے موالات اور عمرو سے معادات کی حامل ہے جبکہ دوسرے بالعکس ہیں اور ان سب کے پیشِ نظر خود ان کی ذاتی اغراض ہیں، اگر زید سے ان کے مطالب واغراض پورے ہو چکے (اور مزید کی گنجائش نہ رہی) تو اب عمرو کی طرف منقلب ہو جائیں گے، اس دنیا میں یہی ہوتا ہے اور یہی اس کے طور واطوار ہیں تو اگر یہ موالات اللہ کی خاطر نہ ہو تو نہایت ضرررساں ہے، دنیا داروں کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کی دنیا سلامت ہے تو انہیں دین میں لاحق فساد اور ضرر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی جبکہ اللہ والوں کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے، اس کے اعداء اس کی دنیا خراب کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس کے اصدقاء اس کا دین خراب کرتے ہیں، اپنی اغراض کے حصول پر اس کی معاونت کے خواہاں ہو کر جو اگر پوری نہ ہوں تو دوستی کو دشمنی سے بدل لیں گے، اس لئے کہ ان کی دوستی کی اساس دین نہ تھا لہذا دونوں جہت سے اذیٰ اور ضرر لاحق ہے، ان کی رفاقت کی جہت سے بھی اور ان کی عداوت کی جہت سے بھی

اصدقاء اگر اعداء بن جائیں تو ان کی دشمنی اس کے دشمنوں سے شدید ہوگی کیونکہ انہوں نے اس سے وہ کچھ جان لیا ہے جو اس کے دشمنوں کو معلوم نہیں تو ان کا ضرر ان سے زیادہ ہوسکتا ہے اور اگر اسے ان کی جدائی اور دوری ناپسند ہو تو یہ مداہنت سے کام لے گا اور ان کے ارادوں کے حصول میں ان کا معاون بنے گا چاہے اس میں اس کے دین کی خرابی ہو، اگر اس کی مساعدت اور مدد وسفارش سے انہیں کوئی دنیوی منصب حاصل ہوا اور اس کے استعمال میں ظلم وزیادتی سے کام لیا تو یہ بھی ان کے جرم میں شریک بنا، اگر ان کی ایک ناجائز غرض اور خواہش پوری کرنے میں حصہ دار اور معاون بنا تو یہ سلسلہ تھمے گا نہیں بلکہ انسان کی خواہشات واغراض کی تو کوئی انتہا نہیں تو ایسی دلدل میں دھنس جائے گا جس سے نکلنا کارِ دارد ہوگا اور دین کا نقصان الگ، لہذا اگر دوستی ودشمنی کی اساس دین نہیں تو دین ودنیا کے لحاظ سے بےشمار اضرار اور خرابیاں ہیں، دنیا داروں کی نظروں میں ان کے دوست وہی

ہیں جو دنیوی اغراض ومطالب میں ان کے مدد گار بنیں لہذا نہ ان کی دوستی اچھی اور نہ دشمنی، یہ معاملہ وحال ہر اس کا ہے جس نے اللہ کے ماسوا کسی شیٔ سے دل لگایا اور اسے اپنا مطمحِ نظر بنایا، اسی طرح کسی بدعتی سے دوستی رکھنے والا تو خدشہ ہے کہ وہ اسے بھی اپنی بدعت پر لگالے گا اور اگر ساتھ نہ دیا تو اس کا دشمن بن جائے گا اور ہم دیکھتے ہیں کہ جانتے بوجھتے کہ یہ باطل ہے ایسے حضرات کفار اور اہلِ بدعات کے مصاحب اور مناصر بنے ہوئے ہیں اور یہ اتباع اور مریدین کی وجہ سے اور اہلِ حق سے دشمنی پر اترے ہوئے ہیں (تا کہ ان کی پیری مریدی چلتی رہے جبکہ جانتے ہیں کہ یہ اہلِ حق ہیں)

تو جس نے بھی اللہ کے غیر سے محبت وموالات کی اسے اب اللہ کے محبین اور اس کے اولیاء سے کراہت ونفرت ہوگی اور جس نے اللہ کے غیر کی خاطر کسی سے محبت کی تو اس پر اس کے اصدقاء کا ضرر اس کے اعداء کے ضرر سے اعظم ہوگا کیونکہ اس کے اعداء کی غایت تو بس یہی ہوگی کہ وہ اس کے اور اس کے دنیوی محبوب کے مابین حائل ہو جائیں اور اس کے اور اس کے مابین یہ حیلولت اس کے حق میں رحمت ہے جبکہ اس کے اصدقاء اس رحمت کی اس سے نفی اور ذہاب پر معاون ہوں گے تو یہ کیسی دوستی ہوئی؟ اور انہیں اس محبوب کی بقاء پسند ہوگی تا کہ اپنی اغراض میں اسے استعمال کرنے کا سلسلہ جاری رہے اور یہ دونوں اس کے لئے ضرر ہیں، فرمایا:

(اِذْ تَبَرَّاَ الَّـذِیْـنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ)[البقرة : ۱۶۶] (اُس دن ان کے پیشوا اپنے پیروی کرنے والوں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور (دونوں) عذابِ (الٰہی) دیکھ لیں گے اور اُن کے آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے) فضیل بن عیاض نے لیث عن مجاہد سے اس کی تفسیر میں نقل کیا کہ یہ وہ یارانے جو غیر اللہ کی خاطر تھے اور وہ رابطے اور تعلقات جو دنیا میں ان کے مابین تھے، فرمایا:

(وَقَالَ الَّذِینَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ کَمَا تَبَرَّءُ وْا مِنَّا کَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ) [البقرة : ۱۶۷] (پیروی کرنے والے کہیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی اُن سے بیزار ہوں، اس طرح اللہ اُن کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے) تو جن اعمال کو اللہ انہیں حسرت بنا کر انہیں دکھلائے گا یہ وہ جو دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے رہے جو غیر اللہ کے لئے تھے اور انہی سے موالات، صحبت اور غیر اللہ کے لئے محبت تو خیر سب کی سب اس امر میں ہے کہ اللہ وحدہ کی عبادت کی جائے اور کسی بھی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے۔ ولا حول ولا قوۃ اِلا باللہ۔

فصل

ان امور کی تحقیق کرنے والے اسباب میں سے یہ بھی کہ محبّ بھی جاذب ہے اور محبوب بھی، تو جس نے کسی شیٔ سے محبت کی وہ اسے اپنی طرف اپنی قوت کے بحسب کھینچے گی تو **محبّ کی علت فاعلیت اور محبوب کی علت غائیت** ہے اور دونوں میں سے ہر ایک کی معلول

کے وجود میں تاثیر ہے، محبّ اپنے دل میں متمثّل صورتِ محبوب کی رو سے جاذب ہے تو یہ صورت اس کے لئے جاذب ہے اس معنی میں کہ وہ اس کی طرف منجذب ہے، نہ کہ اس وجہ سے کہ یہ فی نفسہا قصد وفعل ہے تو محبوب میں ایسا مناسب معنی ہے جو محبّ کے اس کی طرف انجذاب کو مقتضی ہے جیسے انسان طعام کی طرف منجذب (یعنی کھینچا چلا) جاتا ہے تاکہ اسے تناول کرے اور بیوی کی طرف تاکہ اس سے مباشرت کرے اور اپنے دوست کی طرف تاکہ اس سے معاشرت کرے اور جیسے اللہ ورسول کے محبین کے قلوب اللہ ورسول کی طرف منجذب ہوتے ہیں اور اللہ کے بندوں میں سے صالحین کی طرف، اس وجہ سے جو اللہ سبحانہ ان صفات کے ساتھ متصف ہے جن کی رو سے وہ محبت اور عبادت کئے جانے کا حقدار ہے بلکہ جائز ہی نہیں کہ موجودات میں سے کسی شئ سے لذاتہ محبت کی جائے ماسوائے اللہ سبحانہ کے! تو جہان میں ہر محبوب کی نسبت ضروری ہے کہ لغیرہ اس سے محبت کی جائے نہ کہ لذاتہ، صرف ایک رب تعالی کی ذات ہے، جس کی نسبت واجب ہے کہ لنفسہ اس سے محبت کی جائے اور یہ اس کی الوہیت کے معانی میں سے ہے، فرمایا:

(لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ) [الأنبياء : ٢٢] (اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین وآسمان درہم برہم ہو جاتے جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں اللہ مالکِ عرش ان سے پاک ہے) تو کسی شئ سے لذاتہ محبت کرنا شرک ہے، لذاتہ محبت کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے، اللہ کے سوا جس کسی کو بھی محبوب بنایا جائے اسے اس کی خاطر بنایا جائے وگرنہ یہ محبت فاسد ہوگی، اللہ نے نفوس میں غذاء اور نساء کی محبت خلق کی ہے اس وجہ سے جو اس میں حفظِ ابدان اور بقائے نسلِ انسانی ہے کہ اگر غذا تناول نہ کی جائے تو ابدان میں فساد اور خرابی درآئے اور اگر عورتوں کی طرف میلان اور رغبت نہ ہو تو ازدواجی سلسلے نہ ہوں تو نسل کا انقطاع ہو جائے اور بنی نوعِ انسان کے وجود کا بقاء مقصود ہے تاکہ وہ اللہ وحدہ کی عبودیت کا مظہر بنیں اور لذاتہ محبوب ومعبود صرف اللہ تعالی ہی کی ذات ہو، انبیاء اور صالحین سے محبت اسی کی محبت کی تبع ہے کیونکہ اس سے محبت کی تمامیت سے ہے کہ ہر اس سے بھی محبت کی جائے جو اسے محبوب ہے اور انبیاء وصالحین اس کے محبوب ہیں، اسی طرح وہ صالح اعمال کو پسند کرتا ہے تو ان سے محبت اسی کی محبت کی تبع ہے لیکن جہاں تک اس کی محبت کے ساتھ ساتھ کسی اور سے (لذاتہٖ) محبت کرنا تو یہ مشرکین کی محبت ہے جو اپنے انداد سے اللہ کی حب کی مانند محبت کرتے ہیں

تو اگر کسی مخلوق سے اللہ کی خاطر محبت کی جائے تو یہ محبت اللہ کی حب کی طرف جاذب ہوگی اور جب دو اللہ کی خاطر باہم محبت وتعلق رکھنے والے ہوں گے جن کا ملنا اور جدا ہونا اسی پر ہوگا تو دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو اللہ کی حب کی طرف جاذب ہوگا جیسے (ایک حدیث قدسی میں) فرمایا: میری ان کے لئے محبت واجب ہوئی جو میری خاطر باہم محبت کریں اور میری خاطر باہم مل بیٹھیں اور میری خاطر ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے اور اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو نہ انبیاء اور نہ شہداء ہیں مگر اللہ سے ان کے قرب پر انبیاء وشہداء بھی رشک کریں گے اور یہ ایسے لوگ جنہوں نے فقط اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے تعلق

جوڑا، کوئی مالی مفاد وابستہ نہ تھا اور نہ باہم قرابت داری تھی، ان کے چہرے پُر نور ہوں گے، نور کی کرسیوں پر بیٹھے ہوں گے، یہ ایسے ہیں کہ جب لوگوں کو خوف ہوگا تو وہ امن میں ہوں گے اور جب وہ غم وحزن میں ہوں گے تو انہیں ایسی کوئی فکر نہ ہوگی، اگر تم اللہ کی خاطر کسی سے محبت وتعلق کا سلسلہ جوڑو تو اصل محبوب لذاتہ اللہ تعالیٰ ہوا، تو جب بھی اپنے دل میں اس کا تصور کرو تو محبوبِ حق کا تصور کرو گے اور یوں اللہ سے محبت بڑھتی رہے گی جیسے اگر نبی اکرم اور سابقہ انبیاء ومرسلین کا اور ان کے اصحاب کا ذکر کرو اور دل میں ان کا تصور کرو تو یہ تمہارے دل کے لئے اللہ کی محبت کی طرف جاذب ہوگا، اگر تم اللہ کی خاطر ان سے محبت کرتے ہو، اللہ کا محبّ جب اللہ کی خاطر اور اللہ کی وجہ سے کسی سے محبت کرے (یعنی ظاہر ہے اسی سے کرے گا جو اللہ والا ہے اور جو اللہ کو محبوب ہے) تو گویا اس نے اللہ سے محبت کی اور اللہ اس کا محبوب ہے تو اسے پسند ہے کہ وہ اللہ کی طرف اسے جذب کرے (اسی سے مجذوب کی اصطلاح ہے) اللہ کا محبّ ہو یا اللہ کو محبوب ہو، یہ اللہ کی طرف جاذب ہوتا ہے

اسی طرح اگر کسی کی حب غیر اللہ کے لئے ہے جیسے دو افراد میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے کسی مادی فائدہ کی خاطر محبت کرے جیسے عورت مرد کے ساتھ، تو محبّ محبوبہ کا اور محبوبہ محبّ کی طالب ہوتی ہے، محبوب کے انجذاب کے ساتھ تو جب دونوں متحاب ہوں تو دونوں وجہوں سے دونوں میں سے ہر ایک جاذب بھی ہوا اور مجذوب بھی تو اتصال واجب ہے اور اگر محبت یک طرفہ ہے تو محبّ جاذبِ محبوب اور محبوب جاذبِ محبّ تو ہوگا لیکن محبوب اس کے جذب کا قاصد نہ ہوگا جبکہ محبّ اس کے جذب کا قاصد بھی ہے اور اس کی طرف منجذب بھی اور یہ محبوب میں تاثیر کا سبب ہے، یا تو اس کی صورت جو اس کے دل میں جلوہ گر رہے تو منجذب ہو جائے اور یا پھر بلا محبت منجذب ہوگا جیسے آدمی کھانا تناول کرتا ہے، لباس پہنتا ہے اور گھر میں رہتا ہے اور دیگر اس طرح کے محبوبات جن کے لئے اسے ارادت نہیں اور جہاں تک ذی حیات تو ان کے بعض بعض سے حب کرتے ہیں اس کے اس پر احسان کے سبب اور نفوس کی جبلت میں اپنے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کرنے والوں سے محبت ہے لیکن یہ فی الحقیقت (ان کی ذوات سے نہیں بلکہ) احسان سے محبت ہے، نہ کہ محسن کے نفس اور ذات سے، اگر احسان کا یہ سلسلہ تھم جائے تو یہ محبت بھی مضمحل ہو جائے گی اور کئی دفعہ تو بغض میں بدل جائے گی کیونکہ یہ اللہ کی خاطر نہ تھی تو جو کسی انسان سے اس لئے محبت کرے کہ وہ اسے عطا کرتا ہے تو گویا اس نے اس عطا سے محبت کی اور جس نے کہا کہ وہ اس سے (اس لئے) محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اسے اللہ کی خاطر عطا کرتا ہے تو یہ کذب ومحال اور زُور من القول ہے اسی طرح جس نے کسی سے اس وجہ سے محبت کی کہ وہ اس کی حمایت اور مدد کرتا ہے تو اس نے اس حمایت اور مدد سے محبت کی (نہ کہ اس کی ذات سے) اور یہ دراصل ہوائے نفس کی اتباع سے ہے کیونکہ درحقیقت اس نے محبت نہ کی مگر اس سے جو جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت کی طرف واصل ہوا تو یہ محبت مفادات سے محبت ہے، نہ کہ ذوات سے اس لئے کہ وہ محبوبات اور مرغوبات تک اس کے پہنچنے کا وسیلہ بنا، یہ اللہ کی خاطر محبت نہیں اور نہ اس کی ذات سے محبت ہے، عوام الخلق کی ایک دوسرے سے محبت اور تعلق اسی پر جاری وساری ہے لہذا اس

کی رو سے آخرت میں انہیں ثواب عطا نہ ہوگا اور نہ یہ ان کے لئے نافع ثابت ہوگی بلکہ بسا اوقات یہ نفاق اور مداہنت کا باعث بن سکتی ہے تو آخرت میں یہ ان اَخلاء میں سے ہوں گے جو ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے جیسے کہا:

(اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ) [الزخرف : ٦٧] (دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار) آخرت میں نافع محبت وہی جس کی اساس اللہ کی رضا اور جو اللہ کی خاطر تھی، جو اللہ کے بارے میں اور اس وحدہ کے لئے تھی لیکن جو کسی نفع اور فائدہ کی امید اور طمع رکھے پھر زعم کرے کہ اللہ کی خاطر اس سے محبت کر رہا ہے تو یہ نفوس کے دسائس (میل کچیل) اور نفاق الاقوال سے ہے، بندے کے لئے نافع اللہ کے لئے وہ محبت جو اس کی خلق سے اور اس کے محبوبات سے ہو مثلاً انبیاء و صالحین (اور اعمالِ صالحہ اور شریعت کے احکام) اس لئے کہ ان کی محبت اسے اللہ کے قریب لے جائے گی، ہمارے نبی اکرم مؤلفۃ القلوب کو عطا کرتے تھے اور کئی ایسوں کو آپ نہ دیتے تھے جو ان سے بڑھ کر آپ کو محبوب ہوتے (ایک دفعہ استفسار پر بتلایا کہ) آپ انہیں ان کے دلوں میں موجود ایمان کے سپرد کرتے ہیں اور مؤلفۃ القلوب کو اس لئے عطا کرتے ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں (ابھی ایمان راسخ نہیں اور) ہلع اور جزع ہے (مضطرب اور جزع فزع کرنے والا) اور عطا کرنے کی غرض و غایت یہ ہوتی تھی کہ اسلام و ایمان کی محبت راسخ ہو جائے جس کا نتیجہ اللہ سے محبت کی صورت میں نکلے گا تو اس سے آپ کا مقصود قلوب کو اللہ کی محبت پر لگانا اور اس کی ضد سے پھیر دینا تھا، اس ڈر سے کئی حضرات کو عطا کرتے کہ کہیں اللہ انہیں منہ کے بل آگ میں نہ ڈال دے لہٰذا آپ کا یہ عطا کرنا بھی اللہ کی خاطر تھا اور جسے نہ دیا یہ بھی اللہ کی خاطر تھا، فرمایا جس نے اللہ کے لئے محبت کی، اسی کے لئے نفرت کی، اسی کے لئے عطا کیا اور اسی کی خاطر عطا نہ کیا تو اس نے ایمان کا استکمال کر لیا، بخاری میں ہے کہ فرمایا واللہ میں تو صرف قاسم ہوں، اپنی مرضی سے کسی کو عطا یا محروم نہیں کرتا، میں تو اللہ کا مال وہیں خرچ کرتا ہوں جہاں خرچ کرنے کا حکم ملتا ہے

محبّ اپنے نفس میں متمثل صورتِ محبوب کے لئے متحرک ہوتا اور اس کے لئے مرید ہوتا ہے اور حب و بغض اور ابتہاج و انشراح کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، جب بھی اس کا اس کے سامنے تذکرہ ہو چاہے یہ صورت جس بھی جنس سے ہو تو اس کی نسبت اس کی حیثیت آمر اور ناہی کی سی ہوگی اور اپنے نفس میں پاتا ہے کہ گویا وہ صورت امر و نہی وغیرہ کے ساتھ اسے مخاطب کرتی ہے جیسے کثیر لوگوں کو خوابوں میں ان کے محبوب و معظم نظر آتے ہیں جو انہیں امر و نہی کرتے اور کئی امور کی انہیں خبر دیتے ہیں، مشرکین کے لئے شیاطین ان کے معبودانِ باطلہ کی صورت میں متمثل ہو جاتے ہیں جو انہیں کئی طرح کا امر اور نہی کرتے ہیں، کئی شاہد کے قائل اور سلوک کی طرف منتسب قائل ہیں کہ شاہد کی زبان سے ان کے باطن میں انہیں مخاطب کیا جاتا ہے تو کئی ان میں سے راتوں کو نمازیں پڑھتے ہیں اور یہ ان کے سامنے ہوتے ہیں تاکہ روشنی میں اس کے مشاہد بنیں، کئی حالِ سماع وغیرہ میں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے مرید میں وجد کی کیفیت پیدا کرتے اور ان سے مخاطب ہوتے ہیں

کئی دفعہ شیطان ان کے اندر متمثّل ہو کر ان کی صورت میں یہ کام کرتا ہے تو یہ اس صورتِ متمثّلہ سے اپنے نفس میں کوئی خطاب پاتے ہیں پھر کہتے پھرتے ہیں کہ اس کی جہت سے مجھے مخاطب کیا گیا ہے (اندر سے آواز آئی) یہ کیفیت اگرچہ مخاطَب میں موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مخاطِب کون ہے؟ فرق یہاں ہے تو یہ مخاطب شیطان اور نفس کا وسواس ہے! کبھی شیطان کی جانب سے رشوت (یہی لفظ استعمال کیا) کے بطور اچھی اشیاء کے ساتھ مخاطب کئے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ مخاطب نہیں کئے جاتے جن کا باطل ہونا وہ جانتے ہیں تا کہ بدک نہ جائیں بلکہ شیطان ہر ایک سے اس کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے جسے وہ حق سمجھتا ہے مثلا راہب جب اپنے تصور میں ڈوبتا ہے تو کبھی اپنے نفس میں تثلیث کی صورت دیکھتا ہے اور بسا اوقات اس سے مخاطب کیا جائے گا اس لئے کہ قبل ازیں اسے ممثّل کر چکا ہوتا ہے تو جب ریاضت کے ساتھ اس کا نفس صیقل ہوتا ہے تو یہ صورتِ ممثّلہ اس کے لئے ظاہر ہوتی ہے، مومن جو اللہ ورسول سے محبت کرتا ہے اپنے ایمان کے بحسب خواب میں رسول کو دیکھتا ہے (یعنی جتنا کوئی صالحیت کے جس درجہ میں ہے اگر اسے نبی اکرم خواب نظر آئیں تو اس کی صالحیت کے بحسب نظر آئیں گے، یہ امکان بھی ہے کہ مکمل جاہ وجلال میں نظر آجائیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا خواب میں دیدار بھی اس کے ایمان کے بحسب ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک جگہ اس پر بسط سے بات کی ہے

اسی لئے کثیر اہلِ زہد وعبادت کفار کے اعوان بن جاتے ہیں اور زعم کرتے ہیں کہ وہ اس کے مامور ہیں اور اس کے ساتھ مخاطب کئے گئے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے (یعنی اندر سے آنے والی آواز کو حکمِ ربانی سمجھتے ہیں) اور اللہ اس سے منزہ ہے، یہ آمر اور مخاطب دراصل نفس (یعنی نفسِ امارۃ) اور شیطان ہوتا ہے اور جو اس کے نفس میں شرک ہے، اگر اللہ کے لئے اخلاصِ دین والا ہوتا تو اس قسم کی کوئی شئ اس کے لئے عارض نہ ہوتی، یہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جس میں شرک فی العبادت ہو یا وہ بدعتی ہو، سنت کے ساتھ متمسک مخلص کے لئے کبھی ایسا نہیں ہوسکتا، چونکہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: حدیثِ نفس سے اور شیطان سے اور اللہ کی جانب سے، اسی طرح عالم بیداری میں جو انسان کے دل میں القاء کیا جاتا ہے وہ بھی انہی تین اقسام پر مشتمل ہے لہذا **احوال بھی تین طرح کے ہیں: رحمانی، نفسانی اور شیطانی**، جو نوعِ مکاشفہ اور تصرف حاصل ہوتا ہے وہ بھی تین قسم کا ہے: مَلَکی، نفسی اور شیطانی تو فرشتہ کے لئے اور نفس وشیطان کے لئے بھی قوت ہے اور قلبِ مومن کے لئے بھی قوت ہے تو جو قلبِ مومن سے اور فرشتہ سے ہے وہ برحق ہے اور جو شیطان اور وسوسہِ نفس سے ہے وہ باطل ہے! کثیر حضرات پر اِس کا اُس کے ساتھ اشتباہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کے اولیاء اور اس کے اعداء کے مابین تفرقہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ جنسِ مشرکین اور کفار اور اہل کتاب سے کسی کو کثیر وجوہ سے اللہ کے اولیاء میں سے خیال کرنے لگتے ہیں، اس پر ایک جگہ مبسوط کلام ہے اسی لیے ان میں سے بعض (بد بخت) ایسے ہیں جو انبیاء کے قتل کو بھی جائز سمجھتے ہیں

بعض اپنے آپ کو انبیاء سے افضل قرار دیتے ہیں اور کئی اور انواع، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لئے شیطانی ونفسانی

انواع سے وہ کچھ حاصل ہوا جسے انہوں نے کراماتِ اولیاء میں سے خیال کیا تو سمجھے کہ وہ انہی میں سے ہیں حالانکہ معاملہ اس کے بر عکس تھا، اس کی اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس طریقہ سے تعبُّد کیا جوان کے نفوس کا پسندیدہ (اور خودساختہ) تھا، جہاں تک اللہ کے پسندیدہ طریقوں سے عبادت تو یہ انہیں پسند نہ آئی اور اس وحدہ کے مرید نہ بنے اور خیال کیا کہ یہ ان کے مرتبہِ ولایت کے منافی اور کسرِ شان ہے کہ اللہ اور اس کے رسل کے اوامر کے مطابق اللہ کی عبادت کریں تو یوں اپنے تئیں ایک قوی محبت، تألّہ، عبادت، شوق اور زہد کے مُحدِث بنے البتہ اس سب میں شرک و بدعت کی ملاوٹ تھی، محبتِ توحید اللہ وحدہ کے لئے ہوتی ہے، اس کے رسول کی متابعت پر جیسے کہا:

(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ) [آل عمران : ۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا) اسی لئے اہلِ اتباع کی محبت میں جہاد اور قصد و نیت ہوتی ہے وہ اللہ کے لئے محبت اور اسی کے لیے بغض کرتے ہیں اور وہ حضرت ابراہیم اور ان کی ملت پر ہیں جو ان کے ساتھ تھے جب اعلان کر دیا تھا کہ:

(اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ) [الممتحنة : ۴] (ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں، تمہارے قائل نہیں اور ہمارے تمہارے درمیان عداوت رہے گی حتیٰ کہ تم اللہ وحدہ پر ایمان لاؤ) جبکہ ان کی محبت میں شرک ہے اور یہ رسول کے متابع نہیں اور نہ اللہ کی راہ میں مجاہد ہیں تو یہ اخلاصِ محبت نہیں کہ وہ توحید کے ساتھ مقرون ہوتی ہے اسی لیے ابوطالب مکی نے اپنی کتاب کو یہ نام دیا: (قُوْتُ الْقُلُوْبِ فِيْ مَعَامَلَةِ الْمَحْبُوْبِ وَ وَصْفُ طَرِيْقِ الْمُرِيْدِ إِلٰى مَقَامِ التَّوْحِيْدِ) واللہ سبحانہ اعلم۔

فصل

میں نے حوادثات کی کراسہ (یعنی کاپی اور رجسٹر) میں ایک فصل زہد و ورع کے مغز اور لبِ لباب بارے لکھی اور یہ کہ زہد ہر اس سے بے رغبتی ہے جو غیر نافع ہے، یا تو اپنے نفع کے انتفاء کی رو سے یا اپنے مرجوح ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ یہ اپنے سے انفع کا مفوِت یا اس شیٔ کا محصل ہے جس کا ضرر اس کے نفع پر حاوی ہے! جہاں تک خالص یا راجح منفعت تو ان میں زہد کی روش اختیار کرنا حماقت ہے اور جو ورع ہے تو یہ اس سے اِمساک جو کبھی ضار ہو سکتا ہے تو اس میں محرمات اور شبہات داخل ہیں، اس لیے کہ یہ ضار ثابت ہو سکتے ہیں، جو شبہات سے محتاط رہا اور بچا اس نے اپنے دین وعصمت کو بچا لیا اور جو شبہات میں واقع ہوا حرام میں واقع ہوا، اس چرواہے کی مثل جو ممنوعہ علاقہ کے ارد گرد ریوڑ چراتا ہے اور بہت امکان ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہو جائے، جہاں تک ان اشیاء سے ورع جن میں مضرت نہیں، یا ہے تو سہی مگر مرجوح ہے اس وجہ سے جو ان کے ساتھ راجح منفعت کا حصول مقترن ہے یا کسی اور مضرت کا راجح دفع تو یہ جہل وظلم ہے اور یہ تین اقسام کو متضمن ہے جن سے تورُّع نہیں کیا

جاتا: مکافات، راجح اور خالص منفعت جیسے مباحِ محض یا مستحب یا واجب تو ان سے ورع گمراہی ہے، میں اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے کہتا ہوں زہد خلافِ رغبت ہے، کہا جاتا ہے فلان (زَهَدَ فِيْ كَذَا) (یعنی اس سے بے رغبتی اختیار کی) اور (فُلَان رَغِبَ فِيْهِ) (فلاں کو اس میں رغبت پیدا ہوئی) اور رغبت ارادت کی جنس سے ہے تو کسی شئ میں زہد اس کے لئے ارادہ کا انتقاء ہے یا تو اس کی کراہت کے وجود کے ساتھ اور یا عدم ارادت و کراہت کے ساتھ اس طور کہ نہ وہ اس کے لیے مرید ہو اور نہ کارہ، ہر جو کسی شئ میں راغب اور اس کا مرید نہیں وہ اس میں زاہد ہے اور جیسے اللہ کی راہ کے ضمن میں ان امور و اشیاء میں زہد محمود ہے فضولیاتِ دنیا میں سے جن سے اللہ نے تزہید دلائی ہے تو ان میں رغبت اور ان کے لئے ارادت کا ہونا کہ جن کے لئے ارادت و رغبت کی اللہ نے تعریف کی قابلِ حمد و مدح ہے، اسی لئے طریقت کی اساس ارادت ہے جیسے کہا:

(وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ)[الأنعام : ۵۲] (اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اُس کی ذات کے طالب ہیں اُن کو دور مت کرو)

(وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا) [الإسراء : ۱۹](اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو، ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوتی ہے) اس کی نظائر متعدد ہیں جیسے اس نے زہد میں ترغیب دلائی اور اس کی ضد کی اپنے اس قول میں ذم کی ہے:

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ)[هود: ۱۵۔۱۶] (جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دیدیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش کے سوا اور کچھ نہیں)

(اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ) [التكاثر: ۱](تمہیں کثرت کی طلب نے غافل کر دیا) السورة

(وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا) [والفجر: ۱۹۔۲۰] (اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو)

(اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ) [والعاديات: ۶۔۸] (بے شک انسان اپنے رب کا احسان ناشناس ہے۔اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے)

(اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ) [الحديد: ۲۰] (جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت اور تمہارے آپس میں فخر اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب

(وخواہش) ہے) الآیۃ، یہ وسیع باب ہے، یہاں مقصود شرعی زہد کا اس کے غیر سے تمیز ہے اور یہ محمود زہد ہے اور شرعی رغبت کی اس کے غیر سے تمییز اور یہ محمود رغبت ہے! کثیر اوقات زہد کا کسل (یعنی سستی اور تن آسانی) عجز اور شرعی اوامر سے بے کاری اور سستی کے ساتھ اشتباہ ہو جاتا ہے اور کثیر اوقات شرعی رغبت کا حرص، طمع اور اس عمل کے ساتھ اشتباہ ہو جاتا ہے جس کے عامل کی ساری سعی وکوشش رائیگاں گئی، جہاں تک ورع تو یہ فعل سے اجتناب، اتقاء، کف وامساک اور اس سے حذر اور یہ کسی شئ کی کراہت اور اس سے نفرت اور اس کے لیے بغض کی طرف عائد ہے اور یہ بھی وجودی امر ہے اگر چہ مطلوب میں نہی کے ساتھ مختلف ہوا کہ آیا یہ عدم منہی عنہ ہے یا اس کی ضد کا فعل ہے؟ اکثر اہلِ اثبات ثانی کے قائل ہیں تو بلا شبہ یہ صاحبِ ورع متورع اور متقی نہ کہلائے گا الا یہ کہ اس سے وہ امتناع وامساک نہ پایا جائے جو منہی عنہ کی ضد کا فعل ہے اور تحقیق یہ ہے کہ عدم منہی عنہ کے باوجود کبھی اس کے لئے منہی عنہ فعل کی مضرت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ اس کا ذم اور عقاب ونحوہ اور امتناع، اتقاء اور اجتناب کے باوجود کبھی اس سے عملِ صالح، طاعت اور تقوی پایا جاتا ہے تو اس عمل کی منفعت اس کے لئے حاصل ہوگی مثلاً اس کی تعریف اور ثواب وغیرہ تو عدم سیآت کی وجہ سے عدم مضرت اور وجودِ حسنات کی رو سے وجودِ منفعت ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ زہد مزہود فیہ میں عدم رغبت وارادہ کے باب سے جبکہ ورع متورَع عنہ کے لئے نفرت و کراہت کے وجود کے باب سے ہے اور انتفائے ارادہ دراصل ان امور میں ٹھیک ہو جاتا ہے جن میں خالص یا راجح منفعت نہ ہو، جہاں تک وجودِ کراہت تو یہ ان میں موزوں ہے جن میں ہر لحاظ سے خالص یا راجح مضرت ہو، برو برابر! تو یہ مراد اور مکروہ ہونے کے قابل نہیں، تو اس میں زہد موزوں ہے مگر ورع موزوں نہیں تو اس سے ظاہر ہوا کہ ہر جس میں ورع موزوں ہے اس میں زہد بھی موزوں ہے، عکس نہیں اور یہ واضح ہے تو جو اس امر کے لئے موزوں ہوا کہ اس سے کراہت اور نفرت کی جائے تو مناسب ہے کہ اس کی ارادت نہ کی جائے اور اس میں رغبت نہ کی جائے کہ عدم ارادت وجودِ کراہت سے اولی ہے اور وجودِ کراہت عدم ارادت کے لئے مستلزم ہے، عکس درست نہیں اور ہر جو موزوں ہو کہ اس کی ارادت نہ کی جائے اس امر کے لئے موزوں نہیں کہ اس سے کراہت کی جائے بلکہ کبھی ایسے امور عارض ہوتے ہیں جن کی نہ ارادت کرنا ٹھیک ہے اور نہ ان سے کراہت کرنا، نہ حب اور نہ بغض کرنا، نہ ان کا امر دینا اور نہ ان سے نہی کرنا، اس سے واضح ہوا کہ واجبات اور مستحبات میں نہ زہد موزوں ہے اور نہ ورع اور جہاں تک محرمات اور مکروہات تو ان میں زہد اور ورع دونوں ٹھیک ہیں، رہے مباحات تو ان میں زہد موزوں ہے ورع نہیں اور یہ قدر ظاہر ہے، ادنی تامل سے تم اس کی معرفت پا سکتے ہو، مقامِ تامل دراصل جب فعل میں تعارض ہوا کہ کیا وہ مامور بہ ہے یا منہی عنہ ہے یا مباح ہے؟ اور اس میں کہ جب اس سے وہ مقترن ہوں جن کی جنس مباح ہے جو اسے مامور بہ یا منہی عنہ بنا دے، یا مامور بہ کے ساتھ وہ کچھ مقترن ہو جو اسے منہی عنہ کر دے اور بالعکس، تو مصالح و مفاسد اور منافع ومضار کے باہم اجتماع اور تعارض کے وقت فرقان کی ضرورت ہوتی ہے۔

فصل

بعض حضرات کا کہنا کہ ثواب بقدرِ مشقت ہوتا ہے علی الاطلاق درست اور مستقیم قول نہیں جیسا کہ اس کے ساتھ کئی گروہ رہبانیت اور مبتدع عبادات کی کئی انواع پر استدلال کر سکتے ہیں وہ جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے مشروع نہیں کیا، مشرکین وغیرہم کی تحریمات کی جنس سے ان اشیاء کو جنہیں اللہ نے حلال کیا تھا اور اس تعمق اور تنطّع کی مثل جس کی نبی اکرم نے ذم کی جب فرمایا تھا:(هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ) (یعنی عبادت میں غلو کرنے والے ہلاک ہوئے[کیونکہ ایک وقت آئے گا کہ اکتا جائیں گے اور پورا نہ اتر سکیں گے]) اور کہا مہینہ اگر جاری رہتا تو میں مسلسل وصالِ صوم کرتا رہتا حتی کہ متعمقین اپنے تعمق کا ترک کر دیتے، مثلا (عمدا) بھوک یا مبالغہ کی حدتک پیاس برداشت کرنا (یعنی خود اختیاری سے) جس سے عقل وجسم کو ضرر لاحق ہو اور واجبات ومستحبات کی ادائیگی سے عاجز آ جائے، اسی طرح ننگے پاؤں اور ننگے بدن پھرنا اور سوار نہ ہونا جو بلا فائدہ اور انسان کے لئے ضار ہیں جیسے حدیث میں ابو اسرائیل کا ذکر ہوا جس نے نذر مانی تھی کہ روزانہ روزہ رکھے گا اور ہمیشہ کھڑا رہے گا، کبھی نہ بیٹھے گا اور سایہ میں نہ جائے گا اور کلام نہ کرے گا، آپ کو پتہ چلا تو فرمایا اسے حکم دو کہ بیٹھے، سایہ میں جائے اور بات بھی کرے اور روزہ (جو آج کا رکھا ہوا ہے اسے) مکمل کر لے، اسے بخاری نے روایت کیا اور یہ ایک وسیع باب ہے، اجر دراصل بقدرِ طاعت ملتا ہے تو کبھی اللہ ورسول کی طاعت کسی آسان اور میسر عمل میں ہوگی جیسے اللہ نے اہلِ ایمان کے لئے دو کلموں کو میسر (اور سہل) کیا اور یہ افضل الاعمال ہیں اور اس بارے حدیثِ نبوی ہے:(كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ) (دو کلمے ایسے ہیں جو زباں پہ بہت ہلکے، میزان میں بہت وزن والے اور رحمٰن کو بہت پسند ہیں، سبحان اللہ الخ) اسے صحیحین میں نقل کیا، اگر کہا جائے اجرِ عمل کی منفعت اور اس کے فائدہ کے بقدر ملے گا تو یہ بھی صحیح ہے، اول کا اتصاف اس کے امر کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے اور ثانی کا فی نفسہ اس کی صفت کے اعتبار سے ہے

اور عمل کی منفعت اور فائدہ کبھی فقط امر کی جہت سے ہوتا ہے اور کبھی فی نفسہ اس کی صفت کی جہت سے اور کبھی دونوں امور سے تو اول کے اعتبار سے وہ طاعت اور معصیت کی طرف منقسم ہے جبکہ ثانی کے اعتبار سے حسنہ اور سیئہ کی طرف، طاعت اور معصیت اس کے لئے امر کی جہت سے اسم ہیں اور حسنہ اور سیئہ اس کے نفس کی جہت سے (بقول مرتب یہاں مسودہ میں ایک تہائی سطر کے بقدر خرم [پھٹا ہوا] ہے) اگر چہ کثیر لوگ صرف دل کا ہی اثبات کرتے ہیں جیسا کہ اشعریہ اور ہمارے اصحاب و دیگر سے فقہاء کی ایک جماعت اس کی قائل ہے اور بعض حضرات ثانی کا ہی اثبات کرتے ہیں، معتزلہ اور ہمارے اصحاب و دیگر سے ایک گروہِ فقہاء اسی کا قائل ہے اور صواب دونوں اعتبار کا اثبات ہے جیسا کہ اس پر ائمہ کی نصوص اور سلف اور ہمارے اصحاب وغیرہم کے جمہور کی کلام دال ہے، عمل کا مشقت والا ہونا اس کے فضل و راجح ہونے کا سبب نہیں

ہوتا، ہاں البتہ کبھی کوئی فاضل عمل جیسے حج، پر از مشقت ہوتا ہے لیکن اس کی فضیلت اس میں مشقت کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور معنی کی رو سے ہوتی ہے، مشقت کے باوصف اس پر صبر کرنا (یعنی ثابت قدمی سے جمے رہنا) اس کے اجر وثواب میں اضافہ کر دیتا ہے تو مشقت کے ساتھ ثواب بڑھ جاتا ہے جیسے مثلاً وہ شخص جو بہت دور سے آ کر حج یا عمرہ کرے تو اس کا اجر قریب سے آنے والے کی نسبت زیادہ ہوگا، جیسے نبی اکرم نے حضرت عائشہ سے (تنعیم سے احرام باندھ کر) ان کے عمرہ بارے کہا تھا تمہارا اجر تمہاری تھکاوٹ کے بقدر ہوگا اس لئے کہ اجر قدرِ عمل پر بُعدِ مسافت میں ہے اور بوجہ بعد چونکہ تھکاوٹ زیادہ ہوتی ہے لہذا اجر بھی کثیر ہو جاتا ہے اور اسی طرح جہاد ہے، ایک حدیث میں ہے: (اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَأُ يَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ اَجْرَانِ) (قرآن کا ماہر۔ قاری۔ معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو تتلاہٹ اور اٹک اٹک کے پڑھتا ہے۔ باوجود عدم مہارت کے ترک نہیں کیا اس کے لئے دہرا اجر ہے) تو کثیر مشقت اور تھکاوٹ بذات خود اس عمل میں مقصود ہیں مگر اس وجہ سے کہ عمل مشقت اور تھکاوٹ کے لئے مستلزم ہوا ہے

یہ ہماری شرع میں، وہ جس میں ہم سے آصار واغلال رفع کر لئے گئے اور اس میں ہمارے لئے کوئی حرج نہیں کیا گیا (یہ قرآنی الفاظ ہیں) اور نہ کسی مشکل کا ہم سے ارادہ کیا گیا البتہ ہم سے قبل کی شریعتوں میں کبھی مشقت بذاتِ خود ان اہلِ شرائع سے مطلوب ہوتی تھی، کثیر اہلِ عبادت مشقت، الم اور تھکاوٹ کی جنس مطلوب اور اللہ کے تقرُّب کا سبب خیال کرتے ہیں اس وجہ سے جو اس میں نفس کی لذات اور دنیا کی طرف میلان سے نفرت اور جسد کے علائق سے دل کا انقطاع ہے اور یہ صابئہ اور ہند (کے سنیاسی باباؤں) کے زہد کی جنس سے ہے لہذا تم انہیں پاؤ گے کہ جو ان میں رُہبان سے مشابہ ہوئے ہیں وہ کئی طرح کی عبادات وزہادات سے تھکا دینے والے اور شدید پر از مشقت اعمال کرتے ہیں جبکہ نہ ان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ثمرہ اور نہ کوئی منفعت، کوئی یسیر عمل اگر مشقت والا بھی ہو مضائقہ نہیں، مگر یہ تو عمر بھر کا عذابِ الیم ہے جو یہ بھگت رہے ہیں اس فاسد اصل کی نظیر بعض جہال کا مدح کے انداز میں کہنا کہ فلاں نے نہ شادی کی اور نہ کبھی کوئی جانور ذبح کیا، یہ تو رُہبان کا شیوہ اور خود ساختہ رہبانیت تھی (جو اپنی مرضی سے اختیار کر لی تھی، اللہ نے انہیں اس کا حکم نہ دیا تھا) کہ نہ وہ شادیاں کرتے تھے اور نہ ذبح کرتے تھے، جہاں تک حنفاء تو ہمارے نبی اکرم نے فرمایا تھا: جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں روزے رکھتا بھی ہوں اور کبھی کئی کئی دن نہیں بھی رکھتا، شادیاں بھی کر رکھی ہیں اور گوشت بھی کھاتا ہوں تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں، تو یہ اشیاء دینِ فاسد سے ہیں اور یہ مذموم ہے جیسا کہ دنیوی زندگی کی طرف طمانیت بھی مذموم ہے، لوگوں کی کئی اقسام ہیں: ایک خالص دنیادار، یہ آخرت سے اعراض اور غفلت کئے ہوئے ہیں، دوم دینِ فاسد والے اور یہ کفار اور اہلِ بدعت جو انواعِ عبادات وزہادات سے اس طور واطوار کے ساتھ متدین ہیں جسے اللہ نے مشروع نہیں کیا اور سوم دینِ صحیح کے اہلِ اسلام، کتاب وسنت اور جماعت کے ساتھ متمسک، تو اللہ کی حمد ہے جس نے ہمیں ہدایت سے نوازا اور اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو ہم اس سے محروم ہی ہوتے۔

فصل

تزکیہ نفس بارے کہ کیسے ترکِ محرمات اور ادائے ماموارت کے ساتھ اس کا تزکیہ ہوتا ہے، اللہ نے فرمایا:

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا) [والشمس: ۹] (کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک رکھا)

(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى) [الأعلىٰ: ۱۴] (بے شک وہ کامیاب ہوا جو پاک ہو) قتادہ اور ابن عیینہ وغیرہما کہتے ہیں کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اللہ کی طاعت اور صالح اعمال کے ساتھ اپنے نفس کا تزکیہ کیا، فراء اور زجاج نے (اس آیت کا معنی کرتے ہوئے) کہا کامیاب ہوا وہ نفس جسے اللہ نے پاک کیا اور ناکام وخائب ہوا وہ نفس جسے اللہ نے آلودہ اور میلا کیا، والبی نے ابن عباس سے بھی یہی ذکر کیا اور یہ منقطع ہے لیکن آیت سے یہ مراد نہیں بلکہ قطعاً لفظاً ومعناً اول مراد ہے! جہاں تک لفظ تو قولہ **(مَنْ زَكّٰهَا)** اسم موصول ہے اور اس میں کسی عائد کا ہونا ضروری ہے تو جب کہا جائے: کامیاب ہوا وہ شخص جس نے اسے پاک رکھا تو (زَكَّاهَا) کے شخص (یعنی فاعل) کی ضمیر (مَنْ) پر عائد ہوگی، یہ وجہِ کلام ہے جس کی صحت میں کوئی شک نہیں جیسے کہا جاتا ہے: (قَدْ اَفْلَحَ مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَقَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَطَاعَ رَبَّهٗ) (کامیاب ہوا وہ جو اللہ سے ڈرا اور اس کی طاعت کی) لیکن اگر معنی یہ کیا جائے کہ کامیاب ہوا وہ شخص جسے اللہ نے پاک کیا تو جملہ میں کوئی ضمیر باقی نہ رہے گی جو (مَنْ) پر عائد ہو کیونکہ اس پر ضمیر اللہ پر عائد ہوگی اور وہ (مَنْ) نہیں اور مفعول کی ضمیر (یعنی زکاھا کی ھا) سابق الذکر نفس پر لوٹے گی تو (مَنْ) پر کوئی ضمیر عائد نہ ہوئی، نہ ضمیرِ فاعل اور نہ ضمیرِ مفعول، تو یوں صلہ عائد سے خالی رہ جائے گا اور یہ غیر جائز ہے، ہاں اگر تقدیرِ کلام یہ ہو: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّى اللّٰهُ نَفْسَهٗ) یا: (مَنْ زَكَّاهَا اللّٰهُ لَهٗ) اور اس طرح کی کوئی اور تقدیر تو کلام صحیح ہوگی، جن نحاۃ نے یہ مذکورہ بالا بات کہی ان پر اس کا مخفی ہونا باعثِ تعجب ہے، اللہ نے یہ نہیں کہا: (قَدْ اَفْلَحَتْ نَفْسٌ زَكَّاهَا) کیونکہ تب (زَكَّاهَا) نفس کی صفت ہوگی، نہ کہ صلہ، بلکہ کہا: **(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا)** تو جملہ (مَنْ) کے لئے صلہ ہے نہ کہ صفت اور نہ یہ کہا: (قَدْ اَفْلَحَتِ النَفْسُ الَّتِيْ زَكَّاهَا) کہ اگر یہ کہا جاتا اور (زَكَّاهَا) میں ضمیر کو اسمِ اللہ پر عائد کیا جاتا تو یہ بھی درست ہوتا تو جب تکلف کیا اور کہا: **(قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا)** کی تقدیر وہ نفس ہے جسے اس نے پاک کیا (زکی) میں ضمیرِ مفعول (مَنْ) پر عائد ہے اور یہ (یعنی من) مذکر ومونث اور واحد اور اکثر کے لئے ٹھیک ہے تو ضمیر اس (یعنی مَنْ) کے معنائے مونث پر عائد ہے اور تانیث غیر حقیقی ہے اسی لئے (اَفْلَحَ) کہا: (اَفْلَحَتْ) نہیں کہا، تو ان سے کہا گیا یہ اس کے ساتھ ساتھ کہ خارج از لغتِ فصیحہ ہے تب صحیح ہو جب کلام اس پر دال ہو (فی مثل ومن ۔۔ بقول مرتب آگے خالی جگہ ہے) [جس سے جملہ بظاہر مکمل نہیں ہوا] اسی طرح قولہ:

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ) [یونس: ۴۲] (اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں) اور اس کا نحو، اور یہاں (مَنْ) کے لفظ اور مابعد میں ایسا کچھ نہیں جو دال ہو کہ اس سے نفسِ مؤنثہ مراد ہے لہذا جائز نہیں کہ کلام کے ساتھ وہ

کچھ مراد لیا جائے جس کے مراد ہونے پر اس میں دلیل نہ ہو، اس کے مثل سے اللہ کی کلام مصون ہے تو اگر (زَکّٰاھَا) کی ضمیر کا نفس اور (مَنْ) کی طرف عود کا احتمال فرض کیا جائے جبکہ (مَنْ) پر اس کے عود کی موجب کوئی دلیل نہیں تو مونث نفس کی طرف اس کا عود اولی ہے بنسبت اس کی طرف اس کے عود کے جو تذکیر و تانیث دونوں کو محتمل ہے اور وہ تذکیر میں اظہر ہے، تانیث پر اپنے عدم دلالت کی وجہ سے تو کلام جب دو معانی کو محتمل ہو تو ان دو میں سے اظہر پر اسے محمول کرنا واجب ہوتا ہے اور جس نے اس کے غیر کا تکلف کیا وہ عربوں کی معروف کلام سے خارج ہوا اور قرآن اس سے منزہ ہے اور بلا دلیل اس سے عدول کرنا جس پر ظاہر کلام دال ہے اس کی طرف جس پر وہ دال نہیں، قطعاً جائز نہیں اور یہاں تو معنی کی جہت سے نص کی شکل میں ہے پھر کیسے جبکہ اللہ نے تو خبر دی ہے کہ وہ تقویٰ اور فجور کا ملہم ہے، اس کے بسط کے لئے ایک اور مقام ہے

یہاں مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو تزکیہ نفوس کا امر اور ان کے تدسیہ (یعنی گناہوں کے ساتھ آلودہ کرنے) سے تحذیر جیسے قولہ: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی) تو اگر فرض کیا جائے کہ معنی یہ ہے کہ کامیاب ہوا وہ شخص جس کے نفس کا اللہ نے تزکیہ کیا تو اس میں اس کے لئے نہ امر ہے اور نہ نہی اور نہ ترغیب اور نہ ترہیب (صرف امرِ واقع کا بیان ہے) جبکہ قرآن (کا اسلوب ہے کہ وہ) جب امر یا نہی صادر کرتا ہے تو مجرد القدر (یعنی امرِ مقدر) ذکر نہیں کرتا تو یہ نہیں کہتا: (مَنْ جَعَلَهُ اللّٰهُ مُؤْمِناً) بلکہ کہتا ہے: (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ) (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی) اگر اس ضمن میں مجرد قدر کا ذکر ہو تو یہ مقصود کے مناقض ہے! یہ تو عقل کے لحاظ سے اضعف الناس کے بھی لائق نہیں چہ جائے کہ کلام اللہ! کیا دیکھتے نہیں کہ وہ امر و نہی اور ترغیب و ترہیب کے مقام میں اس کے مناسبِ حال وعد و وعید اور مدح و ذم کا ذکر کرتا ہے، قدر کا ذکر تو ان پر نعمتوں کے بیان کے وقت کرتا ہے یا تو ان کے ساتھ جو ان کے افعال میں سے نہیں اور یا ایمان اور عملِ صالح کی توفیق کے ان پر انعام کرنے کے ساتھ اور اسے اپنی قدرت و مشیت کے سیاق میں ذکر کرتا ہے، معرضِ امر میں تبھی ذکر کرتا ہے جب نعمتوں کا بیان مراد ہو جیسے اس کا قول:

(وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا) [النور: ۲۱] (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہوسکتا) الآیۃ، تو یہ مناسب ہے اور قولہ: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی) اور یہ آیت دوسری کی جنس سے ہے نہ کہ پہلی کی اور مقصود ذکرِ تزکیہ ہے، فرمایا:

(قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ) [النور: ۳۰] (مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں) الآیۃ اور کہا:

(ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ) [النور: ۲۸] (لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے)

(الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ) [حم فصلت: ۷] (جو زکاۃ نہیں دیتے)

(وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى) [عبس : ۷] (حالانکہ اگر وہ راہِ راست پہ نہ آئے تو تم پر کچھ دوش نہیں) زکاۃ کی اصل خیر میں زیادت (یعنی بڑھوتی) ہے، اسی سے کہا جاتا ہے: (زَكَا الزَّرْعُ، زَكَا الْمَالُ إِذَا نَمَا) (جب مال میں اضافہ ہو تو [زَكَا] کا لفظ بولتے ہیں) اور خیر میں ہرگز نمو نہ ہوگا مگر ترکِ شر کے ساتھ اور زراعت میں نمو نہ ہوگی حتی کہ اس سے جھاڑ جھنکاڑ کا ازالہ کیا جائے تو اسی طرح نفس اور اعمال کی زکاۃ نہیں حتی کہ ان سے ہر اس شئ کا ازالہ کیا جائے جو ان کے مناقض ہے اور انسان تبھی متزکی ہوگا جب شرک کا ترک کرے گا کہ یہ نفس کو (روحانی لحاظ سے) آلودہ اور میلا کرتا ہے، زجاج کے بقول (دَسَّاهَا) یعنی اسے ذلیل، حقیر اور خسیس بنا دیا، فراء نے کہا: (دَسَّاهَا) اس لئے کہ بخیل اپنے آپ کو اور اپنے مال و منزل کو چھپاتا ہے بقول ابن قتیبہ فجور اور معصیت کے ساتھ اسے چھپاتا ہے تو فاجر اپنے نفس کو میلا اور آلودہ کرتا ہے جبکہ بھلائی کا صانع اپنے نفس کی تشہیر و رفع کرتا ہے کیونکہ اس کے پاس چھپائے رکھنے کی کوئی علت نہیں، عربوں کے مشہور سخی لوگ جب کہیں سفر میں جاتے تو ٹیلوں (یعنی اونچی جگہوں) پر اپنے آپ کو نمایاں رکھتے تھے (تاکہ لوگ بآسانی ان تک دادرسی کے لئے پہنچ سکیں) جبکہ کمینہ صفت لوگ اطراف اور نشیبی علاقوں میں پڑاؤ ڈالتے تھے، تو بر و تقوی نفس میں بسط اور شرحِ صدر کا موجب بنتا ہے، اس طور کہ انسان اپنے آپ سے اتساع اور کشادہ ظرفی پاتا ہے اس حالت کی نسبت جو قبل ازیں تھی کیونکہ جب کوئی نیکی، تقوی اور احسان کے ساتھ متمتع ہوتا ہے تو اللہ تعالی اسے بسطِ نفس و صدر سے نوازتا ہے اور فجور و بخل نفس کو میلا اور حقیر و مہین کر دیتے ہیں اس طور کہ بخیل اپنے آپ کو تنگ نظر پاتا ہے، نبی اکرم نے ایک صحیح حدیث میں اس کی یوں تبیین کی کہ بخیل اور متصدق کی مثال دو آدمیوں کی سی ہے جنہوں نے لوہے سے بنی دو قمیصیں زیب تن کی ہوں اور ان کے ہاتھ (ان کے تنگ ہونے کی وجہ سے) سینے کے ساتھ لگے ہوئے ہیں تو متصدق جب بھی صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہ قمیص کھل جاتی اور اس میں فراخی ہوتی ہے حتی کہ بآسانی ہاتھوں کو استعمال کر لیتا ہے جبکہ بخیل جب صدقہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ نہایت مضبوطی سے جکڑے رکھتی ہے، راوی کہتے ہیں یہ کہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نبی اکرم اپنی جیب کی طرف انگلیاں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں (بخیل کی حالتِ زار کا وصف کرتے ہوئے) اور وہ ڈالی نہیں جا رہیں، صحیحین میں اسے نقل کیا، مقام و منزل کا اخفاء اور اظہار اسی کے تبع ہے، فرمایا:

(يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ) [النحل : ۵۹] (اور اس خبرِ بد کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے) الآیۃ، تو اسی طرح بخیل اور فاجر نفس کا معاملہ ہے کہ اس کے صاحب نے اسے چھپا رکھا ہے، نمایاں نہیں ہونے دے رہا، اسی لئے بوقتِ نزع یہ اس کے بدن سے اس طرح کھینچا تانی کر کے نکالی جائے گی جیسے بھیگی ہوئی اون میں پھنسے کانٹوں کو کھینچا جائے اور نیک و متقی نفس جس کے صاحب نے اسے آلودہ ہونے سے بچائے رکھا تو وہ مرتفع، متسع اور نمایاں ہوا تو بوقتِ موت بدن سے یہ اس طرح بسہولت نکل آئے گی جیسے مشک کا منہ کھول دیں تو پانی نکل آتا ہے اور جیسے (گندھے ہوئے) آٹے سے بال نکالا جاتا ہے، ابن عباس کا قول ہے کہ نیکی کا دل میں نور، چہرے میں رونق، بدن میں قوت، رزق میں کشائش اور خلق کے دلوں میں اس کے لئے

محبت ہوتی ہے جبکہ برائی کے لئے دل میں ظلمت، چہرہ پر سیاہی، بدن میں ضعف، رزق میں تنگی (یعنی عدم برکت) اور خلق کے دلوں میں اس کے لئے بغض اور نفرت ہوتی ہے (لوگ برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں) فرمایا:

(وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِىْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا) [الأعراف : ۵۸] (جو زمین پاکیزہ اُس میں سے سبزہ بھی رب کے حکم سے نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے) یہ بخیل کی اور راہِ خدا میں خرچ کرنے والے کی مثال ہے، فرمایا:

(فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ) [الأنعام : ۱۲۵] (تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اُس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے) الآیۃ

(اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ) [البقرة : ۲۵۷] (جو لوگ ایمان لائے ہیں اُن کا دوست اللہ تعالیٰ ہے) الآیۃ، رمی بالفاحشہ کے سیاق میں اور اس کی ذم میں جو اہل ایمان میں اس کا اظہار چاہے اور جہالت پر مبنی باتیں کرنے والوں کی نسبت سے، فرمایا:

(وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ)[النور: ۲۱] (اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہوسکتا) الآیۃ، تو واضح کیا کہ پاکیزگی (زکاۃ) ترکِ فاحشہ کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اسی لئے کہا: (قُــــــلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا الخ) کیونکہ ترکِ سیآت نفس کے اعمال سے ہے، نفس جانتا ہے کہ سیآت کا ارتکاب کرنا مذموم اور مکروہ ہے، مومن کا نفس اگر برائی کی طرف دعوت دے تو وہ اس کے خلاف مجاہدہ کرتا ہے جو اس کے ہاں کتاب وایمان کی تصدیق اور نبی اکرم کی تعلیمات کا اقرار اور ایمان ہے تو اس کے بموجب اعمال ہیں جن کی مزکاۃ نفس بجا آوری کرتا ہے تو اس کی زکاۃ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بخلاف اس نفس کے جو سیآت کا ارتکاب کرے تو یہ میلا، آلودہ اور خوار ہو جاتا ہے اس کھیتی کی طرح جس کی جھاڑ جھنکار سے صفائی نہ کی گئی، ثواب تو موجود عمل پر ہی ہوتا ہے اسی طرح عقاب بھی جبکہ عدم محض پر نہ ثواب ہے اور نہ عقاب، تو اس میں عدم ثواب وعقاب ہے، اللہ تعالیٰ خیر کا آمر اور شر کا ناہی ہے، لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ مطلوب بالامر موجود فعل ہے البتہ نہی میں اختلاف کیا کہ آیا مطلوب وجودی امر ہے یا عدمی امر؟ تو کہا گیا وجودی اور یہ ترک، یہ اکثر کا قول ہے، بعض نے کہا مطلوب عدم شر ہے (یعنی کم ازکم یہ کہ شر نہ پھیلائے چاہے خیر کرے یا نہ کرے)

تحقیق یہ ہے کہ مومن کو جب منکر سے نہی کی جائے تو ضروری ہے کہ اس کے قریب بھی نہ جائے اور یہ کہ اس کے ترک کا عزم کرے اور اس کے کرنے کو برا جانے اور یہ بلا ریب وجودی امر ہے تو متصور نہیں کہ مومن جانتا ہے کہ وہ۔۔۔ (آگے خالی جگہ ہے) وجودی ہے لیکن کبھی وہ اس کے لئے مرید نہیں بھی ہوگا جیسے طبعًا وہ مردار کھانے سے نفرت کرتا ہے اس کے باوجود شارع کی طاعت کرتے ہوئے اسے اس کی تحریم کا اعتقاد اور اس کے ترک کا عزم رکھنا ضروری ہے اور یہ طبعی کراہت پر زائد قدر ہے اور

یہ امرِ وجودی ہے جس پر وہ ثواب کا حقدار ہوگا لیکن یہ اس شخص کے ثواب کی مثل نہ ہوگا جس نے اپنے نفس کو روکا اور طلبِ حرام کے ضمن میں اس کا مجاہدہ کیا اور جس کی محرمات کے لئے کراہت ایمانی کراہت ہے اور اس کا ایمان حکمِ طبع کے ساتھ مغمور ہے، تو یہ شخص تینوں اقسام میں اعلیٰ ترین ہے اور یہ نفسِ مطمئنہ والا ہے اور یہ نفسِ لوامہ والے سے ارفع ہے، وہ جو گناہ کر لیتا ہے اور پھر اس کا ضمیر اس پر اسے ملامت کرتا ہے یا کرنے اور نہ کرنے کے درمیان متردد رہتا ہے

لیکن جس کے دل میں یہ خیال ہی نہ آئے کہ اللہ نے اسے حرام کیا ہے اور نہ ہی وہ اس کے لئے ارادت والا ہو بلکہ اسے نہیں کیا (یعنی اس وجہ سے نہیں کہ وہ حرام ہے بلکہ طبعی کراہت کے سبب یا موقع نہ ملنے کے سبب) تو یہ نہ معاقَب ہے اور نہ مُثاب کیونکہ اس سے امرِ وجودی حاصل نہیں ہوا جس پر ثواب کا حقدار یا عقاب کا سزاوار بنتا تو جس نے کہا مطلوب یہ ہے کہ نہ کرے، اگر اس کی مراد یہ ہے کہ یہ مطلوب عدم عقاب میں کافی ہے تب تو ٹھیک اور اس نے بجا کہا ہے لیکن اگر اس کی مراد یہ ہے کہ وہ اس عدم پر ثواب عطا کیا جائے گا تو ایسا نہیں، کافر اگر اللہ ورسول پر ایمان کا حامل نہیں تو لازم اور بدیہی بات ہے کہ اس کے نفس کے لئے ایسے اعمال ہوں گے جن کے ساتھ وہ ایمان سے منشغل ہوگا اور ترکِ اعمال کفر ہے جس پر وہ معاقب ہوگا، اسی لئے اللہ نے جب کفار کی نار میں عقوبت کا ذکر کیا تو کئی وجودی امور کا ذکر کیا جو نفس کو آلودہ کرتے ہیں، اسی لئے توحید و ایمان نفس کی زکاۃ کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں جبکہ شرک نفس کی تدسیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اعمالِ صالحہ اور صدقہ بھی تزکیہِ نفس کے اہم وسائل میں سے ہیں، سلف نے قولہ: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى) کی تشریح میں یہ سب ذکر کیا ہے، کہا: شرک سے اور معصیت سے توبہ کرنے کے ساتھ جو متطہر ہوا ابوسعید، عطاء اور قتادہ سے منقول ہے کہ فطرانہ نکالا، ان کی مراد یہ نہیں کہ آیت بس اسی کو متناول ہے بلکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ جس نے فطرانہ دیا اور نمازِ عید ادا کی تو اسے بھی یہ آیت متناول ہے اور مابعد مذکور اعمال کو بھی، اسی لئے یزید بن حبیب جب بھی نماز کے لئے نکلتے تو کچھ نہ کچھ صدقہ کرتے اور خاص طور پر نماز ادا کرنے سے قبل، اگر کچھ نہ ہوتا تو پیاز (اور اس جیسی کوئی اور معمولی چیز) ہی کو صدقہ کر دیتے، حسن نے اس کی تفسیر میں کہا: جس کا عمل زاکی (یعنی پاکیزہ) تھا، ابواحوص نے کہا تمام امور کی زکاۃ (یعنی صرف مال کی ہی نہیں) بقول زجاج اللہ کی طاعت کرنے کے ساتھ متزکی ہوا، زاکی کا معنی کثیر بڑھوتی کی صلاحیت والا ہے اسی طرح قولہ:

(وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ) [حم فصلت : ۶-۷] (اور مشرکوں کے لئے ہلاکت ہے۔ جو زکاۃ نہیں دیتے) بقول ابن عباس اس امر کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں، مجاہد نے کہا: (لا يُزَكُّوْنَ اَعْمَالَهُمْ اَيْ لَيْسَتْ زَاكِيَةً) (یعنی پاکیزہ اعمال نہیں کرتے) بعض نے کیا یعنی اخلاص کے ساتھ اعمال کی تطہیر نہیں کرتے، گویا۔ واللہ اعلم ۔ان کی مراد ریا کار لوگ ہیں تو یہ شرک ہے! حسن سے منقول ہے کہ (لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالزَّكَاةِ) یعنی زکاۃ کے مقر نہیں، ضحاک نے

(لَا یَتَصَدَّقُوْنَ) کہا اور یہ کہ طاعت کے کاموں میں خرچ نہیں کرتے، ابن سائب کے بقول اپنے اموال کی زکاۃ ادا نہیں کرتے، کہتے ہیں حج وعمرہ تو کرتے ہیں مگر زکاۃ نہیں دیتے، تحقیق یہ ہے کہ آیت توحید اور صالح اعمال سے ہر اس عمل کو متناول ہے جس کے ساتھ انسان متزکی ہو، جیسے کہا:

(هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى) [والنازعات: ۱۸] (کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے؟) اور: (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى) اس کے نزول کے وقت (معروف) زکاۃ تو ابھی فرض ہی نہ ہوئی تھی، اگر کہا جائے (یُؤْتِیْ) متعدی فعل ہے تو کہا جائے گا یہ اس آیت کی طرح ہے:

(ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا) [الأحزاب: ۱۴] (پھر اُن سے فتنہ بازی کا کہا جائے تو کر گزریں) اور قبل ازیں ذکر ہوا کہ رسول نے انہیں بلایا اور یہ آپ سے طلب ہے تو یہ رسل کے ساتھ ان پر اتمامِ حجت کو متضمن ہے، رسل نے دراصل انہیں اس کی طرف دعوت دی تھی جس کے ساتھ ان کے نفوس کا تزکیہ ہو، پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ زکاۃ طہارت کو مستلزم ہے اس لئے کہ اس کا معنی رضائے طہارت ہے، قولہ:

(خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ) [التوبة: ۱۰۳] (اُن کے مال میں سے زکاۃ قبول کرلو کہ اس سے تم اُن کو پاک کرتے ہو) یعنی شر سے ان کی تطہیر کریں، نبی اکرم کی ایک دعا کے الفاظ ہیں: (اَللّٰهُمَّ طَهِّرْنِیْ بِالْمَاءِ وَ الْبَرَدِ وَالثَّلَجِ) (اے اللہ مجھے پانی، اولوں اور برف کے ساتھ صاف کردے) آپ (عموماً) استفتاحِ نماز اور قومہ میں اور غسل کرتے وقت یہ دعا کیا کرتے تھے، تو یہ امور مغسول بہا کی تبرید کے موجب ہیں، ٹھنڈک قوت اور صلابت عطا کرتی ہے، خوش کن شئ کا برد اور قرۃ العین کے ساتھ وصف کیا جاتا ہے (یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک) اسی لئے خوشی کے آنسو ٹھنڈے جبکہ غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں کیونکہ جو نفس کو برا لگے وہ اس کے حزن اور غم کا موجب ہے اور جو اسے خوش لگے وہ اس کی فرحت وسرور کا باعث ہے اور یہ باطن کو ٹھنڈک دیتا ہے تو نبی اکرم نے (اللہ سے) طلب کیا کہ وہ گناہوں کو اس وجہ پر دھو ڈالے جو قلوب کو ٹھنڈک پہنچائے، بڑی ٹھنڈک اس امر کے ساتھ جس میں فرحت وسرور ہو جس سے وہ سب کچھ زائل ہو جائے جو گناہوں میں سے نفس کو برا لگے، قولہ: (بِالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ) (وَالْمَاء الْبَارِد) یہ ایک تمثیلی اسلوبِ بیان ہے وگرنہ نفسِ ذنوب تو ان اشیاء کے ساتھ دھوئے نہیں جاتے جیسے کہا جاتا ہے: (اَذِقْنَا بَرْدَ عَفْوِكَ وَ حَلَاوَةَ مَغْفِرَتِكَ) (ہمیں اپنی عفو کی ٹھنڈک اور مغفرت کی حلاوت چکھا) ابوقتادہ نے جب ایک قرضدار کا قرض چکا دیا تو آپ نے کہا تھا: (اَلْآنَ بَرَّدْتَ جِلْدَتَهٗ) (یعنی اب تم نے اس کی جلد۔جسم۔کو ٹھنڈا کیا) اور کہا جاتا ہے: (بَرْدُ الْيَقِيْنِ وَ حَرَارَةُ الشَّكِّ) (یقین کی ٹھنڈک اور شک کی گرمی) اور: (وَ هٰذ الْأَمْرُ يَثْلُجُ لَهُ الصَّدْرُ) (یعنی سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی) جب وہ حق ہو، دل کو اس کی معرفت اور فرحت اور طمانیت ملے، نفس کی مرض یا تو شبہ ہے یا شہوت یا غضب اور تینوں نخوت

(حرارت/گرمی) کی موجب ہیں، نیلِ مطلوب کی نسبت کہا جاتا ہے: (بَـرَدَ قَـلْبُـہٗ) (اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی) کیونکہ طالب میں طلب کی حرارت (یعنی گرم جوشی) ہوتی ہے (اور مطلوب پا لینے سے یہ گرم جوشی اور تڑپ ختم ہوئی اور سکون اور ٹھنڈک ملی) قولہ: (خُـذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ الخ) دلیل ہے کہ حسنات سے دلوں کی تطہیر اور گزشتہ گناہوں سے اس کا تزکیہ ہے کیونکہ بعدازاں کہا:

(وَاٰخَـرُوْنَ اعْتَـرَفُـوْا بِـذُنُـوْبِهِـمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا) [التوبة : ۱۰۲] (اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں انہوں نے اچھے اور بُرے عملوں کو ملا جلا دیا تھا) تو توبہ اور عمل صالح کے ساتھ تطہیر و تزکیہ کا حصول ہوتا ہے اسی لئے قولہ: (قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا) الآیات کے سیاق میں کہا:

(وَتُـوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا) [النور : ۳۱] (اور تم سب اللہ کے آگے توبہ کرو) الآیۃ، تو سب کو سیاقِ مذکور میں توبہ کا حکم دیا اس لئے کہ کوئی بھی ماسوائے انبیاء کے اس جنس سے سالم نہیں جیسا کہ صحیح میں ہے بے شک اللہ نے ابن آدم پر زنا سے اس کا حظ لکھ دیا ہے (تو کوئی آنکھ کا اور کوئی کان کا زنا کر رہا ہے الخ) صحیح کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آیت: (اِنَّ الْـحَسَـنٰـتِ يُـذْهِبْنَ السَّيِّـاٰتِ) [هـود: ۱۱۴] (بے شک نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں) کا نزول ایک آدمی کے سبب ہوا جس نے ایک عورت سے زنا کے سوا سب کچھ کیا تھا پھر نادم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، اس ضمن میں مسلمان اس امر کا محتاج ہے کہ اللہ سے ڈرے اور نفس کو ہویٰ سے روکے، نفس کا ہویٰ اور شہوت پر معاقبہ نہیں بلکہ جب ان کے پیچھے لگا اور عمل کیا، اگر نفس ہوی کرے اور انسان اسے روکے تو یہ روکنا اور پیچھے نہ لگنا عبادت اور عمل صالح ہے، ایک حدیث میں ہے مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی ذات میں اپنے نفس سے جہاد کیا تو اس سے اس جہاد کرنے کا بھی اسی طرح حکم ہے جس طرح امر بالمعاصی اور ان کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جہاد کا حکم ہے، انسان کو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ یہ فرضِ عین اور وہ فرضِ کفایہ ہے اور اس میں صبر کرنا افضل اعمال سے ہے اور یہی تو حقیقتِ جہاد ہے، جس نے اِس میدان میں صبر سے کام لیا وہ اُس جہاد کے میدان میں بھی بخوبی صبر سے کام لے گا جیسے کہا مہاجر وہ ہے جس نے سیآت کا ہجران کیا پھر اس میں قابلِ تعریف تبھی ہوگا جب نفس پر غالب آ جائے بخلاف دوسرے جہاد کے کیونکہ وہاں تو اگر قتل یا مغلوب ہو جائے تو بھی اللہ اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا

اسی لئے نبی اکرم نے فرمایا پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے الخ (پہلوان تو وہ ہے جو غصہ میں خود پر قابو رکھے) اس لئے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ انسان نفس کو ہویٰ سے روکے اور رب کے سامنے (جوابدہی کے لئے) کھڑا ہونے (کا سوچ کر خوف) سے لرزہ براندام رہے تو ایمان سے اس کے لئے وہ کچھ حاصل ہو جو جہاد پر اس کی مدد کرے، اگر (جہادِ نفس میں) مغلوب رہا تو یہ اس کے ضعفِ ایمان کے سبب ہوگا تو وہ ترکِ مامور کے ساتھ افراط کرنے والا ہوگا بخلاف کافر دشمن کے کہ اس کا بدن اقوی ہو سکتا ہے تو گناہوں کا وقوع تبھی ہوتا ہے جب نفس امتثالِ مامور کا خوگر نہ ہو، اس کا اگر وہ خوگر ہو گیا تو فعلِ محظور سے بچے گا کہ دونوں ضدین ہیں، فرمایا:

(كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ)[یوسف : ۲۴](یوں اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں) اور کہا:

(اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ)[الحجر : ۴۲] (میرے بندوں پر تجھے کچھ قدرت نہیں) شیطان اللہ کے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکتا، غی خلافِ رُشد ہے اور یہ اتباعِ ہویٰ ہے تو جس کا نفس حرام کی طرف مائل ہوا اسے چاہیے کہ اب (تلافیِ مافات کی خاطر) اللہ کے لئے اخلاصِ دین کرتے ہوئے کوئی عبادت کا فعل کرے کہ یہ اس سے اس میلانِ سوء وفحشاء کو پھیر دے گا، اللہ کی خشیت، محبت اور اس وحدہ کی عبادت کرنے کا جذبہ وعزم سیآت سے مانع بنے گا، اگر تائب ہے تو اگر وہ ناقص تھا تو اس سے سیآت کا وقوع ہوگا، تو یہ وقوع کے بعد ان کا محو کر دے گی، تو یہ تریاق کی مثل ہے جو زہر کا اثر ختم کر ڈالتا ہے اور حصول کے بعد اسے رفع کر دیتا ہے اور جیسے طعام وشراب سے کوئی غذا ہو اور جیسے حلال کے ساتھ استمتاع جو نفس کو حرام کی طلب سے باز رکھتا ہے تو جب یہ اس کے لئے حاصل ہو تو اب اس کے ازالہ کی طلب کرے اور جیسے علم جو شک کا مزیل ہے اور ہو جانے کے بعد اس کا رفع کرتا ہے اور جیسے طبی ہدایات، معالجہ اور حفظانِ صحت کے اصول جو صحت کی بقاء اور سلامتی کے لئے از حد ضروری ہیں اور مرض اگر لاحق ہو جائے تو اس کا ازالہ کرتے ہیں، اسی طرح دل میں موجود ایمان اپنے اَشباہ ولوازم کے ساتھ اسے لاحق ہونے والے عوارض اور شبہات کا دفع اور مداوا کرتا ہے اور شبہات وشہوات کی رو سے حاصل ہونے والی بیماریوں کا ازالہ کرتا ہے، مرض تبھی لاحق ہوتا ہے جب اسبابِ صحت میں کوئی نقص در آیا ہو، اسی طرح دل بھی نقصِ ایمان کے سبب ہی مریض ہو جاتا ہے، ایمان اور کفر ایک دوسرے کے ضد ہیں تو ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، ایک آئے گی تو دوسری کو جانا پڑے گا جیسے روشنی پھیلے تو تاریکی چھٹ جاتی ہے اسی طرح ہی حسنات اور سیآت کا معاملہ ہے، حسنات سیآت کا احباط کر ڈالتی ہیں، معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ کبیرہ گناہ حسنات کا حبوط کر دیتا ہے حتی کہ ایمان کا بھی اور جو اسی یعنی کبیرہ گناہ پر مر گیا (آگے خالی جگہ ہے مگر قبل ازیں گزرا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ کے لئے جہنم میں جائے گا) جبائی اور اس کا بیٹا اگرچہ اعمال کے کا وزن ہونے کے معتقد نہ تھے لیکن وہ قائل ہیں کہ جس کی سیآت کا پلڑا بھاری ہوا وہ اب ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہے گا (اہلِ سنت کے نزدیک) کئی گناہ ایسے ہیں جو تمام حسنات کا حبط کر ڈالتے ہیں، مثلاً مرتد ہو جانا جیسے کہا:

(وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ الخ) [البقرة : ۲۱۷] (اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا -) الآیۃ، اور قولہ:

(وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ) [المائدة : ۵] (اور جو شخص ایمان سے منکر ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے) الآیۃ

(وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)[الأنعام : ۸۸] (اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے) اور:

(لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ) [الزمر: ۶۵] (اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے) الآیۃ، معتزلہ

نے جو ادعاء کیا وہ سلف کے اقوال کے مخالف ہے تو اللہ تعالی نے زانی کی حد کا ذکر کیا اور دیگر بڑے جرائم کی حدود کا بھی لیکن انہیں محبوط الاعمال کفار قرار نہیں دیا اور نہ انہیں قتل کرنے کا حکم دیا جیسے مرتدین کے قتل کا حکم دیا ہے، منافقین اپنے کفر کا اظہار نہ کرتے تھے، نبی اکرم نے ایک خیانت کرنے والے کی جنازہ پڑھنے کا حکم دیا تھا اور خودکشی کرنے والے کا بھی اور اگر ان گناہوں کی وجہ سے یہ کفار اور منافقین بن چکے ہوتے تو ان کی نماز جنازہ پڑھنا صحیح نہ ہوتا، تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا کلی ایمان اس وجہ سے محبوط نہ ہوا، ایک شراب کے جرم میں لائے جانے والے کی بابت کہا: اسے ملعون مت کہو کیونکہ یہ اللہ و رسول کا محبّ ہے اور یہ حب عظیم ترین شعبِ ایمان میں سے ہے تو ظاہر ہوا کہ اس کے اِدمان (یعنی شراب نوشی پر مداومت) سے تمام ایمانی شعب کا ضیاع اور ذہاب نہ ہوا اور کثیر طرق کے ساتھ ثابت ہے کہ دوزخ سے ہر اسے نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو، لہٰذا اگر حبوطِ کلی کا معتزلہ کا نظریہ درست ہوتا تو ان کے دلوں میں یہ ایمان باقی نہ ہوتا، فرمایا:

(ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا) [الفاطر : ۳۲] (پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا) الآیۃ، تو مصطفین سے بنایا، جب سیآت تمام حسنات کا حبط نہیں کرتیں تو کیا پھر وہ اپنی قدر کے مطابق کرتی ہیں؟ اور کیا کفر سے کمتر کسی گناہ کی وجہ سے بعض حسنات کا حبط ہو جاتا ہے؟ اس میں اہلِ سنت کے دو اقوال ہیں، بعض اس کا انکار اور بعض اس کا اثبات کرتے ہیں جیسا کہ اس پر نصوص کی دلالت ہے جیسے اس کا قول:

(لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی)[البقرۃ : ۲۶۴] (اپنے صدقات احسان جتلانے اور ایذا دینے سے برباد نہ کر دینا) الآیۃ، یہ دال ہے کہ یہ سیئہ صدقہ کا ابطال کر دے گی اور اس کی مثال ریاکار کے ساتھ دی گئی، حضرت عائشہ نے کہا تھا زید کو یہ بات پہنچا دو کہ اس کا جہاد باطل ہوا، الحدیث! جہاں تک اس کا قولہ: (اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ) [الحجرات : ۲] (کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں) اور نمازِ عصر والی حدیث تو اس میں نزاع ہے، فرمایا: (وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ) [محمد : ۳۳] (اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو) حسن نے کہا یعنی معاصی اور کبائر کے ساتھ، عطا نے کہا شرک اور نفاق کے ساتھ، ابن سائب نے کہا ریا اور سُمعہ (شہرت کے حصول کی غرض سے) کے ساتھ، مقاتل نے کہا احسان کر کے جتلانے کے ساتھ کیونکہ کچھ لوگوں نے اپنے قبولِ اسلام کے ساتھ احسان جتلایا (جیسا کہ سورۃ الحجرات میں ذکر ہے) حسن سے جو مذکور ہوا وہ دال ہے کہ معاصی اور کبائر اعمال کا حبط کر ڈالتے ہیں، اگر کہا جائے ان کی مراد کفر کے ساتھ ان کا ابطال ہے تو کہا جائے گا یہ فی نفسہ منہی عنہ ہے اور دائمی خلود کا موجب ہے تو اس سے نہی کو اس کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ بطورِ تغلیظ اس کا ذکر ہوگا جیسے اس کا قول: (وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ الخ) ونحوہا، اللہ سبحانہ نے اس آیت اور آیت المنّ میں اسے ابطال کا نام دیا احباط کا نہیں، اسی لیے اس کے بعد اپنے اس قول میں کفر کا ذکر کیا:

(اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتُوْا وَھُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ) [محمد : ۳۴] (جولوگ کافر ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکتے رہے پھر کافر ہی مر گئے اللہ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا) اگر کہا جائے مراد یہ کہ جب تم اس کی شروعات کرو تو اس کا اتمام کرو (بیچ میں نہ چھوڑ دو) اسی کے ساتھ ان حضرات کا احتجاج ہے جو قائل ہیں کہ نفلی عبادت میں شروع ہو جائیں تو اس کا اب پورا کرنا لازم ہوتا ہے، کہا گیا اگر بالفرض آیت دال ہے کہ بعض عمل کے ابطال سے وہ منہی ہے تو کلی ابطال تو اولی ہوا اپنے اس میں دخول کے ساتھ، کیسے جبکہ فراغت سے قبل تو اسے نماز یا روزہ نہ کہا جائے گا، پھر کہا جائے گا ابطال فراغت سے قبل اور بعد پایا جا سکتا ہے اور جو انہوں نے ذکر کیا وہ اتمام کا امر ہے اور ابطال (سے مراد) ثواب کا ابطال ہے اور ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ جس نے عبادت (یعنی کوئی نفلی جس میں وہ شروع ہوا) کا اتمام نہ کیا اس کا پورا ثواب باطل ہو جائے گا بلکہ کہا جائے گا جتنا کر لیا اتنے کا ثواب تو ملے گا، صحیح کی مفلس والی حدیث میں ہے جو پہاڑوں کی مثل نیکیاں لے کر آئے گا۔

سوال

شیخ الاسلام سے ایک شخص بارے سوال ہوا جس نے تفقہ حاصل کیا اور اللہ کے مامورات اور منہیات کا علم **پھر زاہدانہ بود و باش اختیار کر لی** اور دنیا اور اہل و مال اور اولاد کا ترک کیا، کسبِ حرام اور شبہات سے ڈرتے ہوئے اور آخرت کے بعث اور اللہ و رسول کی رضا جوئی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور قریہ قریہ ملک ملک گھومتا پھرتا رہا تو کیا یہ روش اس کے لئے جائز ہے کہ تمام رشتہ داروں سے قطع کر لے اور درویش و سیاح بن کر زندگی گزار دے؟

جواب

الحمدللہ وحدہ! مشروع زہد اس شئ کا ترک ہے جو دارِ آخرت میں نفع نہ دے اور دل کو اللہ کے پاس جو ہے پر کامل ثقہ اور بھروسہ ہو جیسا کہ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے دنیا میں زہد تحریمِ حلال اور اضاعتِ مال کے ساتھ نہیں بلکہ زہد یہ ہے کہ تمہیں اللہ کے ہاتھ میں جو ہے اس پر اپنے ہاتھ میں جو ہے، سے زیادہ بھروسہ ہو اور یہ کہ تم اس مصیبت کے ثواب میں جو تمہیں پہنچی زیادہ رغبت کرنے والے بنو اس صورت سے کہ وہ تمہارے لئے باقی رہے اس لئے کہ اللہ تعالی کہتا ہے:

(لِكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ) [الحدید : ۲۳] (تا کہ جو تم سے فوت ہو گیا ہے اس کا غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اتراؤ نہیں) تو یہ دل کی صفت ہے! جہاں تک فی الظاہر تو ہر طرح طعام، لباس اور مال وغیرہ کی فضولیات کا ترک جن کے ساتھ اللہ کی طاعات کی ادائیگی پر استعانت نہیں کی جاتی جیسا کہ امام احمد نے کہا تھا کہ گزارے لائق کھنا پینا اور لباس اور چند دنوں کی محنت اور اس کا لبِ لباب نبی اکرم کی روش و سیرت ہے جیسا کہ صحیح میں ہے کہ آپ کہا کرتے تھے: بہتریں کلام اللہ کی کلام ہے اور بہترین ہدی حضرت محمد کی ہدی ہے اور بدترین امور محدثات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے، طعام

بارے آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جو بھی حاضر کیا جاتا اسے رد نہ کرتے اور جو نہ ہوتا اس کی خواہش نہ کرتے اور جو بھی روئی اور اون وغیرہ سے بنا ہوا لباس میسر ہوتا پہن لیتے، روئی آپ کو زیادہ پسند تھی

جب آپ کو پتہ چلا کہ آپ کا کوئی صحابی اعتداء کرنا چاہ رہا ہے کہ زہد یا عبادت میں مشروع پر مزید آگے بڑھے اور کہے کہ ہم میں سے کون رسول اکرم کی مثل ہے؟ (لہٰذا ہمیں نیکیوں میں آپ سے بھی زیادہ محنت و کوشش کرنی چاہیے کیونکہ آپ تو رسول اللہ ہیں یعنی بخشے بخشوائے اور معصوم ہیں، آپ کو تو زیادہ نیکیوں کی ضرورت ہی نہیں جبکہ ہمارا معاملہ مختلف ہے) تو آپ غصہ کرتے اور فرماتے واللہ میں تم سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت رکھنے والا اور اللہ کی حدود کا اعلم ہوں مگر اس کے باوجود میں حلال نعمتوں سے متمتع ہوتا ہوں، آپ کو پتہ چلا کہ آپ کے صحابہ میں سے ایک نے کہا ہے کہ میں روزانہ روزہ رکھوں گا کبھی افطار نہ کروں گا، دوسرے نے کہا میں شب بھر تہجد پڑھتا رہوں گا کبھی نہ سوؤں گا، ایک نے کہا میں عمر بھر شادی نہ کروں گا، ایک نے کہا میں کبھی گوشت نہ کھاؤں گا تو آپ نے فرمایا تھا میں روزے بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، شادیاں بھی کی ہوئی ہیں اور میں گوشت بھی کھاتا ہوں تو جس نے میری روش و سیرت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں، جہاں تک اہل و اولاد سے اعراض اور بے پرواہی تو یہ اللہ اور رسول کو پسند نہیں اور نہ یہ انبیاء کرام کا دین ہے بلکہ اللہ نے کہا:

(وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً)[الرعد : ۳۸] (اور ہم نے تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے تھے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھی) عیال پر انفاق اور ان کے لئے کسب کبھی واجب اور کبھی مستحب ہے تو ترکِ واجب یا ترکِ مستحب کیونکر دین سے ہوسکتا ہے؟ اسی طرح علاقوں اور ملکوں ملکوں بغیر مشروع مقصود کے گھومنا پھرنا جیسا کہ بعض نساک اسے اختیار کئے ہوئے ہیں منہی عنہ امر ہے، امام احمد کا قول ہے سیاحت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ نبیوں اور صالحین کا فعل ہے، قرآن میں جس سیاحت کا ذکر ہے اور یہ ان آیات میں:

(اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الخ) [التوبة : ۱۱۲] (توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، سیاحت کرنے والے۔۔۔) اور کہا:

(مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا) [التحريم : ۵] (مسلمان صاحبِ ایمان فرمانبردار توبہ کرنے والیاں عبادت گزار روزہ رکھنے والیاں بن شوہر اور کنواریاں) تو اس سے مراد یہ مبتدع سیاحت نہیں کیونکہ اللہ نے ان خواتین کا یہ وصف کیا ہے جن کی رسول اکرم سے شادی ہوئی اور شادی شدہ عورت کے لئے تو صحراؤں (اور راستوں میں باغات وغیرہ) میں بطور سیاح جانا مشروع ہی نہیں بلکہ اس سیاحت سے مراد دو اشیاء ہیں: ایک روزہ رکھنا جیسا کہ عمرو بن دینار نے یحیی بن جعدہ عن النبی صلعم سے روایت نقل کی کہ فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور

ہیں جنہیں کثیر لوگ نہیں جانتے تو جس نے شبہات کا ترک کیا اس نے اپنے دین وعصمت کو بچا لیا اور جو شبہات میں واقع ہوا وہ حرام میں واقع ہوا اس چرواہے کی طرح جو ممنوعہ چراہگاہ کے اردگرد اپنا ریوڑ چرائے تو پورا امکان ہے کہ ممنوعہ علاقہ میں اس کا ریوڑ یا اس کا کچھ حصہ چلا جائے، آگاہ رہو کہ ہر بادشاہ کی خاص چراہ گاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراہ گاہ اس کے محرمات ہیں اور سنو جسم میں ایک لوتھڑا ہے جو اگر درست اور ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک اور درست ہے اور اگر وہ خراب و فاسد ہے تو سارا جسم خراب اور فاسد ہو جائے گا اور وہ دل ہے! متفق علیہ، لیکن جب انسان حرام یا شبہ کا ترک کسی واجب یا مستحب کے ترک کے ساتھ کرے تو جو اثم و نقص اس ترک کی صورت میں اس کے ذمہ لگا وہ اس اثم سے اعظم ہے جو فعل کی صورت میں ہوتا تو یہ مشروع نہیں جیسا کہ ابو طالب مکی اور ابو حامد غزالی نے نقل کیا کہ امام احمد سے اس شخص بارے سوال ہوا جس نے ایسا کر کے چھوڑا جس میں کچھ شبہ ہے اور وہ مقروض تھا؟ تو اس کے بیٹے نے کہا کیا میں اس مشکوک مال سے والد صاحب کا قرض ادا نہ کروں؟ تو کہنے لگے: (اَ تَـــــدَعُ) بقول مرتب آگے جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے)

سوال

شیخ سے قولہ تعالیٰ: (حَقُّ الْيَقِيْن، عَيْنُ الْيَقِيْن عِلْمُ الْيَقِيْن) بارے سوال ہوا کہ یہ کس طرح کے مقامات ہیں اور ان میں سے کون سا مقام اعلیٰ ہے؟

جواب

الحمد للہ ربِّ العالمین! علماء کے ان اصطلاحات بارے معروف اقوال ہیں، مثلاً کہ کہا جائے علم الیقین وہ جو سماع، خبر، قیاس اور نظر کے ساتھ جانا اور عین الیقین جس کا آنکھوں سے معاینہ ومشاہدہ کرے اور حق الیقین جس کا مباشر ہوا (یعنی خود پہ جو گزرا) وجد و ذوق کے ساتھ محسوس کیا اور اعتبار کے ساتھ پہچانا، اول مثلاً کسی نے خبر دی کہ یہاں شہد ہے تو اس نے مخبر کو سچ مانا یا شہد کے آثار دیکھے تو اس کے وجود پر استدلال کیا، دوم کسی نے خود شہد دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا، یہ اعلیٰ ہے جیسے ایک حدیث میں فرمایا: (لَيْسَ الْـمُخْبَرُ كَالْمَعَايِنِ) (جسے خبر دی جائے وہ مشاہدہ کرنے والے کی مانند نہیں) سوم جیسے کسی نے شہد کو چکھا اور اس کا ذائقہ خود پایا اور حلاوت محسوس کی اور معلوم امر ہے کہ یہ سابق الذکر سے اعلیٰ ہے، اسی لئے اہلِ معرفت اپنے پاس موجود وجد و ذوق کی طرف اشارت کرتے ہیں جیسے ایک صحیح حدیث میں آپ نے فرمایا جس میں تین خصال ہوں وہ ایمان کی حلاوت کو پا لے گا، ایک کہ اللہ و رسول اسے ہر ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوم کہ کسی سے اگر محبت کرے تو اللہ کی خاطر کرے اور سوم کہ کفر کی طرف پلٹ جانا اس طرح برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا، ایک حدیث میں ارشاد ہوا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمدؐ کے رسول ہونے پر راضی ہوا، اہلِ ایمان اس ایمانی حلاوت کے وجد و ذوق کے ضمن میں تین درجات پر ہیں: اول جسے

اس کا علم ہوا کہ اس کے کسی شیخ نے اس کی خبر دی اور اس نے تصدیق کی یا اہلِ معرفت نے اپنے تجربہ کی روشنی میں اسے آگاہ کیا یا اس نے ان کے ایسے آثار دیکھے جو اس پر دال تھے! ثانی جس نے اس کا ذاتی مشاہدہ کیا مثلاً اہلِ معرفت اور اہلِ صدق و یقین کے احوال کا معاینہ کیا اور ان کے مواجید واذواق پر مطلع ہوا اگرچہ بذات خود ان جیسے تجربہ سے نہ گزرا لیکن اس کا مشاہدہ ہوا جو اس پر دال ہوا لیکن یہ مخبر سے ابلغ اور ان کے آثار کے ساتھ مستدل ہے

اور سوم کہ خود اس کے نفس میں ذوق اور وجد کا حصول ہوا تو ایسا ہی محسوس کیا جیسا سنا تھا جیسے بعض شیوخ کا قول ہے کہ کئی دفعہ میں ایسے حال میں ہوتا ہوں کہ بے اختیار منہ سے نکلتا ہے کہ اگر اہلِ جنت اس حال میں ہوں گے تو وہ تو بڑی خوشگوار زندگی گزارتے ہوں گے، ایک اور شیخ کا قول ہے میرے دل پر ایسے اوقات کا گزر ہوتا ہے کہ وہ شدتِ طرب سے رقصاں ہو جاتا ہے، ایک نے کہا سب بیداروں کے لئے ان کی شب بیداری میں ایسی لذت ہوتی ہے جو اہلِ لہو کی ان کے لہو ولعب میں حاصل لذت سے زیادہ ہوتی ہے، امرِ آخرت بارے جو لوگوں کو خبر دی گئی اس ضمن میں وہ تین درجات پر ہیں: اول اس بارے عالم ہیں اس وجہ سے جو رسل نے انہیں خبر دی اور جو اس کے وجود پر ادلہ قائم ہوئیں، دوم جب انہیں ثواب وعقاب اور جنت و دوزخ بارے کئے گئے وعدوں کا معاینہ ہوا، سوم جب بذات خود اس مرحلہ سے گزریں گے، تو اہلِ جنت جنت میں داخل ہوں گے اور جو انہیں اس کی نعمتوں بارے بتلایا جاتا رہا ان کو ذاتی طور پر محسوس کریں گے اور ان کے ساتھ متنعم ہوں گے اور اسی طرح جب اہلِ نار نار میں داخل ہوں گے اور اس کے آلام جن کی انہیں خبر دی گئی تھی کو چکھیں گے تو لوگ اس میں جو قلوب اور جو ان سے خارج میں پایا جاتا ہے ان تین درجات پر ہیں، اسی طرح امورِ دنیا میں جسے عشق یا شادی کی خبر دی گئی اور اس بارے باتیں سنیں مگر خود اس تجربہ سے نہیں گزرا اس کے پاس اس بابت علم تو ہوا لیکن اگر مشاہدہ کیا مگر چکھا نہیں تو گویا معاینہ حاصل ہوا اور اگر خود اس مرحلہ سے گزرا تو اس کے پاس ذوق بھی ہوا اور تجربہ بھی اور جو کسی شئ کو نہ چکھے وہ اس کی حقیقت کا شناور نہ ہوگا، باتوں سے تو صرف تمثیل و تقریب کا ہی افادہ ملتا ہے، مجرد الفاظ وعبارات سے حقیقت کی معرفت نہیں ہوتی یہ تو اسے ہی حاصل ہوگی جس نے اس شئ کا ذائقہ چکھ لیا جس کی بابت اسے بتلایا جاتا رہا اب اسے اچھی طرح جان لیا اور چکھ لیا، اسی لئے اہلِ معرفت کی اصطلاح معرضِ وجود میں آئی اس لیے کہ انہوں نے تجربہ و ذوق سے جان لیا، حدیثِ ہرقل میں ہے کہ اس نے ابوسفیان سے یہ بھی پوچھا تھا آیا اس نبی کے دین کو قبول کر کے کوئی بوجہ ناراضی اور ناپسندیدگی کے واپس ہوا ہے؟ ان کا جواب تھا نہیں، تو کہا ایمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ جب اس کی بشاشت دل میں رچ بس جائے تو کوئی ناراض نہیں ہوتا

تو اس نے بجا کہا، ایمانی بشاشت دل میں رچ بس جانے کے بعد پھر وہ کوفت محسوس نہیں کرتا اور نہ اسے تنگی ہوتی ہے جبکہ حب و رضا اور شادمانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، دل میں ایسی حلاوت، لذت، سرور، طمانیت اور سکون حاصل ہوتا ہے جسے

بیان نہیں کیا جا سکتا اور اسے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا جو اس ایمانی حالت میں نہیں (نمازی آدمی کو نماز کا وقت ہونے پر جو بے چینی لگ جاتی ہے اور پڑھ کر جو اطمنان وسکون ملتا ہے اس کی بے نماز کو کیا خبر؟) لوگ اس ذوق وفرحت میں باہم متفاوت ہیں، ہر ایک کے دل میں ایمانی بشاشت اسی کے بحسب ہوگی، دل میں اس کے رچ بس جانے کے بعد کوفت اور تنگی نہ ہوگی، فرمایا:

(قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ)[یونس : ۵۸] (کہہ دو کہ اللہ کے فضل اور اُس کی مہربانی سے تو چاہئیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں، یہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں)

(وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ) [الرعد: ۳۶] (اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس سے جو تم پر نازل ہوئی ہے خوش ہوتے ہیں اور بعض فرقے اس کی بعض باتیں نہیں مانتے)

(وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ) [التوبة : ۱۲۴] (اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو بعض منافق پوچھتے ہیں کہ اس سورۃ نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے؟ پس جو ایمان والے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں) تو خبر دی کہ اہلِ ایمان کسی نئی سورۃ کے نازل ہونے پر متبشر ہوتے ہیں، استبشار فرحت وسرور ہے اور اس وجہ سے جو وہ اپنے قلوب میں حلاوت، لذت اور بہجت پاتے ہیں اس کی نسبت جو اللہ نے نازل کیا، لذت ہمیشہ محبت کے تابع ہوتی ہے تو جس نے کسی شئی سے محبت کی اور محبوب کا نیل کیا وہ اس کے ساتھ حاصل لذت کا واجد ہوگا، ذوق محبوب کا ادراک ہے، ظاہری لذت مثلاً اکل وشرب، کے ضمن میں انسان کا حال یہ ہے کہ اسے طعام کی اشتہاء اور محبت ہے پھر جب اسے چکھتا اور تناول کرتا ہے تو اس کی لذت وحلاوت کا واجد ہوتا ہے، اسی طرح نکاح وغیرہ امور ومعاملات، خلق کی کوئی محبت اہل ایمان کی اپنے رب کے ساتھ محبت سے اعظم، اکمل اور اتم نہیں اور عالم وجود میں ما سوائے اللہ تعالی کے کوئی ایسا نہیں جو اس امر کا مستحق ہو کہ ہر وجہ سے لذاتہ اس سے محبت کی جائے، اس کے ما سوا جس سے بھی محبت کی جاتی ہے تو یہ محبت اس کی محبت کے لئے تبع ہے، رسول اکرم سے بھی محبت اللہ کی وجہ سے کی جاتی ہے اور اللہ کی خاطر اور اس کی وجہ سے آپ کی طاعت اور اتباع کی جاتی ہے جیسے کہا:

(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) [آل عمران : ۳۱] (کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا) ایک حدیث میں ہے اللہ سے محبت کرو اس وجہ سے جو اس نے اپنی نعمتیں تمہیں عطا کیں اور مجھ سے محبت اللہ کی محبت کی وجہ سے کرو اور میرے اہلِ بیت سے میری محبت کی وجہ سے محبت کرو، فرمایا:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ الخ) [التوبة : ۲۴] (کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی۔۔۔) حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا حتی

کہ میں اسے اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں، ترمذی وغیرہ کی حدیث میں ہے جس نے اللہ کی خاطر محبت کی، اللہ کی خاطر نفرت کی، اللہ کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر روک لیا تو اس کا ایمان کامل ہوا، فرمایا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة : ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) تو اہلِ ایمان کی اللہ سے محبت ہر محبّ کی اپنے محبوب سے محبت سے اشد ہے، اس نکتہ پر کئی جگہ تفصیل سے بات کی ہے! یہاں مقصود یہ ہے کہ اہلِ ایمان اللہ و رسول سے اپنی محبت کے بحسب ایسی ایمانی حلاوت کے واجد ہیں جو اس محبت کے مناسبِ حال ہے، اسی لئے نبی اکرم نے اس وجد کو تین خصال پر معلق کیا (جیسا کہ یہ حدیث گزری) اور اسی سے جو اہلِ ایمان ثمرہِ توحید و اخلاص پاتے ہیں اور توکل کا اور اللہ وحدہ کے سامنے دامن پھیلانے کا، اس باب میں لوگ تین درجات پر ہیں: اول جنہیں اس کا علم سماعاً اور استدلالاً ہوا، دوم جس نے اپنے لئے جو حاصل ہوا اس کا ذاتی معاینہ و مشاہدہ کیا، سوم جو اخلاص، اللہ پر توکل، اس کی طرف التجاء اور اس کے ساتھ استعانت اور اس کے ماسوا سے قطع تعلقی کا واجد ہوا اور ذاتی تجربہ کیا کہ جب اس نے مخلوقین سے تعلق جوڑا اور ان سے امیدیں وابستہ کیں اور ان سے یہ طمع رکھی کہ اس کے لئے جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت کریں تو اسے ان کی جہت سے ناکامی اور رسوائی کا ہی سامنا کرنا پڑا اور اس کا مقصود حاصل نہ ہوا بلکہ اس امید سے کہ وقتِ ضرورت اس کے کام آئیں گے ان پر مال خرچ کرتا رہا اور ان کے کام آتا رہا مگر وہ اسے وقت آنے پر کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے، یا تو اپنے عجز کے سبب اور یا اپنے قلوب کے اس سے پھر جانے کی وجہ سے

لیکن جب وہ صدقِ دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوا اور اخلاصِ دین کرتے ہوئے اس سے استغاثہ کیا تو اللہ نے اس کی دعا قبول کی، اس کا ضرر دور کیا، اس کی حاجت براری کی اور اس کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دئے تو اس جیسے مسلم نے توکل اور دعاء للہ کی حقیقت کا ایسا مزہ چکھا جو اس کے غیر نے نہیں چکھا اسی طرح جس نے سب ماسوا کو چھوڑ کر اللہ کے لئے اخلاصِ دین اور اس کی رضا جوئی کی ارادت کا مزہ چکھا تو وہ ایسے احوال، نتائج اور فوائد کا واجد بنے گا جو وہ شخص نہ بنے گا جو اس تجربہ سے نہیں گزرا بلکہ جس نے طلبِ ریاست و علو میں اپنی ہوی کی اتباع کی اور حسین صورتوں یا مال جمع کرنے سے تعلق قائم کیا وہ اس دوران ایسے ہموم و غموم، احزان و آلام اور سینے کی تنگی پائے گا کہ جس کا بیان نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا دل ترکِ ہوی پر اس کا مطاوِع نہ بنے (یعنی ساتھ نہ دے) اور اس کے لئے وہ کچھ حاصل نہ ہو سکے جو اسے مسرت دے بلکہ وہ دائمی بے سکونی اور خوف و حزن میں رہے گا، اگر طالبِ ہوی ہے تو اس کے ادراک و نیل سے قبل بے چینی اور اضطراب کا شکار رہے گا اور اگر پالیا تو اب اس کے زوال و فراق (اور چوری ہو جانے اور چھن جانے) کے ڈر سے خائف و پریشان رہے گا، اللہ نے اپنے

اولیاء کی صفت یہ بتلائی ہے کہ نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ وہ حزین ہوتے ہیں

تو جب یہ یا کوئی اس کا غیر اللہ کے لئے اخلاص، اس کی عبادت، اس کے ذکر ومناجات کی حلاوت اور اس کی کتاب کی فہم کا مزہ چکھ لے اور اس کا واجد بن جائے اور نیک عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جھکا لیا اس طور کہ اس کا ہر عمل صالح ہو اور وہ اللہ کے لئے مخلص ہو تو وہ ایسے سرور اور لذت وفرحت کا واجد ہو گا جو اس سے کہیں بڑھ کر ہو گا جو کسی داعی ومتوکل کو اپنی دعاء وتوکل کے ساتھ دنیا پا لینے یا ضرر اس سے دور ہو جانے کی خوشی ولذت ملتی ہے تو اس کی حلاوت اس کے بحسب ہے جو اس کے لئے منفعت سے حاصل ہوا اور مضرت سے مندفع ہوا، دل کے لئے توحید واخلاص سے بڑھ کر کوئی شئ انفع نہیں اور شرک سے بڑھ کر کوئی شئ اضر نہیں تو جب حقیقتِ اخلاص پالی جو کہ (إِيَّاكَ نَعْبُدُ) کی حقیقت ہے مع حقیقتِ توکل کے جو (إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) کی حقیقت ہے تو یہ وجد ہر واجد کے وجد سے بالاتر اور الذ ہے، اس کا کوئی مثیل نہیں۔

ابوالقاسم مغربی کا سوال (بقول مرتب اسے وصیتِ صغریٰ کا نام دیا جاتا ہے)

شیخ سے القاب وآداب ذکر کر کے گزارش کی (ان القاب میں یہ بھی کہا کہ مشرق ومغرب کے جن علماء سے اب تک میری ملاقات ہوئی آپ سب سے اعلم ہیں) کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جس سے میرے دین ودنیا کی صلاح ہو اور علمِ حدیث میں ایسی کسی کتاب کا پتہ چلائیں جس پر میں اعتماد کروں اور دیگر علوم شرعیہ میں بھی اور وہ واجبات کے بعد افضل اعمالِ صالحہ پر میری رہنمائی کرے! والسلام الکریم علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جواباً لکھا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ! جہاں تک وصیت کی بات تو میرے علم میں اللہ ورسول کی وصیت سے اعظم کوئی وصیت نہیں، اس کے لئے جو اسے سمجھے اور اس پر عمل کرے، فرمایا:

(وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ) [النساء : ۱۳۱] (اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اُن کو بھی اور تمہیں بھی ہم نے حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو) نبی کریم نے حضرت معاذ کو یمن روانہ کرتے وقت ان الفاظ سے وصیت فرمائی: اے معاذ جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو اور برائی ہو جائے تو اس کے عقب میں کوئی نیکی کرو وہ اس کا محو کر دے گی اور لوگوں سے حسنِ خلق سے پیش آؤ، حضرت معاذ کا نبی اکرم کی نگاہِ مبارک میں بلند رتبہ تھا، آپ نے ایک دفعہ ان سے کہا تھا اے معاذ بخدا میں تم سے محبت کرتا ہوں، کئی دفعہ کہیں جانا ہوتا تو انہیں اپنا ردیف بنا لیتے، ان کے بارہ میں مروی ہے کہ اس امت میں حلال وحرام کے وہ سب سے بڑے عالم ہیں اور امام العلماء کے بطور ان کا حشر ہو گا، آنجناب نے اہلِ یمن کی طرف انہیں مبلغ، داعی، مفقہ، مفتی اور حاکم بنا کر بھیجا، یہ بھی ان کے فضل ورتبہ کی دلیل ہے، وہ حضرت ابراہیمؑ سے مشابہ

تھے اور حضرت ابراہیم امام الناس ہیں، ابن مسعود کہا کرتے تھے، معاذ (أُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيْفاً فَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ) ہیں، یہ حضرت ابراہیم سے انہیں تشبیہ دیتے ہوئے (یہ الفاظ قرآن نے حضرت ابراہیم بارے استعمال کئے، یعنی پیشوا، اللہ کے لئے مطیع اور سیدھی راہ پر) چونکہ یہ مذکورہ بالا وصیت نبی اکرم نے انہیں کی لہذا معلوم ہوا کہ یہ جامع وصیت ہے اور یہ قرآنی وصیت کی تفسیر ہے، اس کی جامعیت کا بیان یہ ہے کہ بندے پر دو قسم کے حق ہیں: ایک اللہ کا اس پر حق اور دوم بندوں کا اس پر حق، پھر ملحوظ رہے کہ لازم ہے کہ اس حق جو کہ بندے پر ہے کی بجا آوری میں بسا اوقات کوتاہی و تقصیر ہو یا تو ترکِ مامور کے ساتھ یا منہی عنہ کے فعل کے ساتھ تو آپ نے فرمایا: جہاں اور جس حال میں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، یہ ایک جامع کلمہ ہے پھر کہا: برائی ہو جائے تو اب نیکی کر کے اس کا اثر ختم کرو، طبیب کئی دفعہ مریض کو کوئی کڑوی دوا پلا کر اس کی کڑواہٹ دور کرنے کے لئے اسے کوئی میٹھی شئ کھلاتا ہے، انسان کی نسبت چھوٹی موٹی کوتاہیاں حتمی امر ہیں، دانا وہ ہے جو ان کے اثرات دور کرنے کے لئے نیکیاں اور اچھائیاں کرتا رہے جن سے اس کی سیآت کا محو ہو جاتا ہے، حدیث میں (السیئة) کا لفظ مقدم ہے: (أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا) حالانکہ یہ مفعول ہے اس لئے کہ مقصود اس کا محو ہے نہ کہ فعلِ حسنہ

تو یہ اس اعرابی کے بارے میں (جس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا) آپ کے اس قول کی مانند ہوا: (صُبُّوْا عَلَيْهِ ذَنُوْباً مِنْ مَاءٍ) (اس پر پانی کے چند ڈول بہا دو) یہاں یہ بھی مناسب رہے گا کہ حسنات اسی جنس سے ہوں جس سے سیآت متعلق ہیں کہ یہ محو میں ابلغ ہوگا (یعنی اگر کسی سے درشتی کا مظاہرہ کر بیٹھا تو اب تلافی کے لئے اس سے یا کسی سے بھی نرم روی سے بات کرے) گناہوں کا موجب کئی اشیاء کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے، ایک توبہ، دوم بغیر توبہ کے استغفار تو اللہ تعالی مستغفر کی دعا قبول کر سکتا ہے اگر چہ (آئندہ کے لئے) توبہ نہ بھی کی ہو لیکن اگر استغفار اور توبہ مجتمع ہوں تو یہ کمال ہے، سوم اعمالِ صالحہ جو سیآت کی تکفیر، محو اور حبط کر ڈالتے ہیں یا تو مقرر شدہ کفارات (جن کی تفصیل شرع نے دی ہے) جیسے رمضان کے روزہ کی حالت میں جماع کرنے والے کا کفارہ اور ظہار کرنے یا حج کے بعض محظورات کا ارتکاب یا اس کے بعض واجبات کا ترک کرنے والے اور (حالتِ احرام میں) شکار کرنے والے پر عائد کفارات اور یہ چار اجناس ہیں: ہدی (حج کی قربانی) عتق (گلام ولونڈی آزاد کرنا) صدقہ اور روزے رکھنا، جہاں تک مطلق کفارات جیسے حضرت حذیفہ نے حضرت عمر سے کہا تھا کہ آدمی کے اپنے اہل و مال اور اولاد میں فتنہ (یعنی پریشانی اور بیماری وغیرہ) کی تکفیر نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہو جاتی ہے! نمازِ پنجگانہ، جمعہ، روزوں، حج اور دیگر صالح اعمال کے مکفر ہونے پر قرآن اور صحیح احادیث دال ہیں، فضائلِ اعمال بارے مصنفات اور سنن میں انہیں دیکھا جا سکتا ہے، ملحوظ رہے کہ مسلمان کو اس کا اہتمام کرنے کی اشد ضرورت ہے بالخصوص ہمارے ان زمانوں میں جو بعض جہات سے زمانۂ جاہلیت سے مشابہ ہیں اور مسلمان کئی قسم کی خرافات اور امورِ جاہلیت کے ساتھ متلوث ہو چکے ہیں حالانکہ دینی تربیت یا

فتۃ اور نماز وروزہ کے بھی پابند ہیں اور جو متدین نہیں ان کی حالت تو اور بھی بدتر ہے، صحیحین میں ابوسعید سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا تم سابقہ امم کی روش وعادات کی ہو بہو پیروی کروگے حتی کہ (بطورِ مثال کہا) اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی گھسوگے، عرض کی یارسول اللہ آپ کا اشارہ یہود ونصاریٰ کی طرف ہے؟ فرمایا پھر اور کون؟ اس کی تصدیق یہ آیت بھی کرتی ہے:

(فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا) [التوبة : ٦٩] (تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم باطل میں ڈوبے رہے) اور صحاح اور حسن درجہ کی احادیث میں اس کے کئی شواہد موجود ہیں، یہ حالت (جیسا کہ عرض کیا) خواص اہلِ تدین لوگوں کی بھی ہوچکی ہے جیسے متعدد سلف جن میں ابن عیینہ بھی ہیں، نے کہا کئی اپنے آپ کو اہلِ علم میں شمار کرنے والے یہود کے احوال میں سے کثیر کے ساتھ مبتلا ہوچکے ہیں اور متدین کہلانے والے بے شمار کثیر احوالِ نصاریٰ میں مبتلا ہوچکے ہیں اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی، دینِ اسلام کی فہم والوں پر یہ امر مخفی نہیں ہے جب معاملہ یہ ہے تو جس کا سینہ رب تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے، وہ میت کی مثل تھا تو اللہ نے اسے مسلمان ہونے کی توفیق دے کر حیاتِ نو بخشی اور اسے نور فراہم کیا جس کی ضیاء میں زندگی گزارتا ہے، ہم پر لازم ہے کہ جاہلیت کے احوال اور مغضوب علیہم اور ضالین امم کے احوال کو ملحوظ رکھیں تاکہ ان کے ساتھ مشابہت اور ان کی علتوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہوں، تو اس سلسلہ میں سب سے انفع چیز ان امور کا علم ہے جو نفوس کی ان گھڑوں سے خلاصی کرائیں وہ یہ کہ سیآت کا اگر ارتکاب ہوجائے تو اب ان کے پیچھے نیکی کے اعمال بجالائیں اور نیکی کے اعمال وہی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد خاتم الرسل کی زبانِ نبوت سے نشاندھی کرائی اعمال، اخلاق اور صفات

گناہوں کے موجب کا ازالہ کرنے والے امور میں سے مصائبِ مکفرۃ بھی ہیں اور یہ ہر وہ پریشانی، غم، تکلیف، مال میں ہو یا عزت یا جسم میں یا کسی بھی متعلقہ امر میں جو انسان کی الم واذیٰ اور دکھ کا باعث بنے لیکن ظاہر ہے یہ انسان کے فعل سے نہیں (بلکہ منجانب اللہ ہیں) تو ان دونوں کلموں کے ساتھ اللہ کے حق جو کہ عملِ صالح اور اصلاحِ فاسد ہے کی طرف بھی توجہ کرائی اور لوگوں کے حقوق کی طرف بھی جب کہا: (خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ) خلق کا جماع (مغز) لوگوں سے حسنِ سلوک سے پیش آنا، ان سے بھی جو قطع تعلقی کی روش پر ہوں راہ ورسم اور سلام ودعا رکھی جائے اور ان کا اکرام کیا جائے اور انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھے اور ان کے لئے تعریفی کلمات کہے (یعنی اچھے انداز سے ذکر کرے) گاہے بگاہے ملاقات کو جائے اور جو ان کے لئے کرسکتا ہے کرے مثلاً تعلیم وتربیت، اچھی نصیحت یا کسی طرح کی کوئی خدمت یا مدد واعانت اور ہر ممکن کوشش کرے کہ اس کی زبان اور ہاتھوں سے کسی کو دکھ یا نقصان نہ پہنچے، اس کا بعض واجب اور بعض مستحب ہے

جہاں تک خلقِ عظیم جس کے ساتھ اللہ نے حضرت محمد کا وصف کیا تو وہ دین ہے جو مطلقاً اللہ کے سب اوامر کا جامع

ہے، یہی مجاہد وغیرہ نے کہا اور یہی (تاویل القرآن) ہے جس کا ذکر حضرت عائشہ نے کیا تھا جب کہا: (كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ) اس کی حقیقت طیبِ نفس اور انشراحِ صدر کے ساتھ اللہ کو محبوبات کا امتثال، جہاں تک یہ بیان کہ یہ سب اللہ کی وصیت میں ہے تو (اس کی تفصیل یہ ہے کہ) اللہ کے تقوی کا اسم ایجاباً اور استحباباً اللہ کے اوامر کے بجالانے اور تحریماً اور تنزیہاً اس کی جملہ منہیات سے بچنے کو جامع ہے اور یہ حقوق اللہ اور حقوق الناس دونوں کا جامع ہے لیکن جو تقوی کے ساتھ محارم سے اجتناب کو مقتضی خشیتِ عذاب ہے تو حدیثِ معاذ میں اسی کے ساتھ مفسراً وارد ہوا، اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں جسے ترمذی نے نقل کیا اور صحیح قرار دیا کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ لوگوں کو جنت کا زیادہ (یعنی دیگر اعمال سے زیادہ) حقدار بنانے والی شیٔ کیا ہے ؟ فرمایا اللہ کا تقوی اور حسنِ خلق، عرض کی گئی اور دوزخ میں لے جانے کا زیادہ تر سبب کون سی شیٔ ہے ؟ فرمایا :(اَلْأَجْوَفَانِ اَلْفَمُ وَ الْفَرَجُ) (دو چیزیں: منہ [یعنی زبان] اور شرمگاہ)

صحیح میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ایمان کے لحاظ سے اکمل مومن وہ جو حسنِ خلق میں ممتاز ہے تو یوں آپ نے ایمان کا کمال کمال درجہ کے حسنِ خلق کو قرار دیا اور معلوم امر ہے کہ ایمان کلی طور پر اللہ کا تقوی ہے، اس کے اصول و فروع کی تفصیل ذکر کرنے کا یہ محل نہیں کہ یہ تو سارا دین ہے لیکن خیر کا سرچشمہ اور اس کی اصل بندے کا اپنے رب کے لئے اخلاص ہے، عبادت میں بھی اور اس سے استعانت میں بھی جیسے ان آیات میں کہا: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) اور: (فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ) [ھود: ۱۲۳] (عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ أُنِيْبُ) [ھود: ۸۸] (فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ) [العنکبوت: ۱۷] اس طور کہ انسان مخلوقین سے اپنے دل کا تعلق قطع کر لے، ان کے ساتھ انتفاع میں اور ان کی خاطر عمل کرنے میں اور اپنی ساری کوششوں اور جد و جہد کا محور اللہ تعالی کی ذات کو بنا لے اور یہ کیفیت تبھی ہو گی جب ہر حاجت وضرورت، فاقہ و تنگی اور خوف وغیرہ الغرض ہر حال میں اسی کے سامنے دستِ دعا دراز کرے اور اس کا سارا عمل ہر محبوب کے ساتھ اسی کے لئے ہو جو اس خصلت کا خوگر ہوا اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں اور جو آپ نے فرائض کے بعد افضل الاعمال بارے سوال کیا تو یہ لوگوں کے باہم مختلف ہونے کے بحسب مختلف ہو گا، یہ دیکھنا پڑے گا کہ کس میں کس عمل کی مقدرت ہے اور اس کے اوقات کے کیا مناسبِ حال ہے، لہذا کوئی ایسا جامع جواب ممکن نہیں جو سب پر یکساں لاگو ہو لیکن ایک عمل ایسا ہے جو ان امور میں سے ہے جن پر اہل اللہ کے مابین نیم اجماع ہوا ہے، وہ ہمیشہ اللہ کے ذکر کو لازم رکھنا، یہ انسان کی (فرائض کے بعد) افضل ترین مشغولیت ہے کہ اپنی زبان کو ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رکھے، اس پر مسلم کی حضرت ابو ہریرہ سے نقل کردہ روایت دال ہے جس میں ہے کہ فرمایا مفردین سبقت لے گئے ! عرض کی یا رسول اللہ مفردین کون؟ فرمایا اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور خواتین، ابو داؤد نے حضرت ابو درداء سے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے فرمایا کیا میں تمہیں تمہارے خیرِ اعمال اور تمہارے ملیک کے ہاں

ازکیٰ عمل کی خبر نہ دوں اور جس کا تمہارے درجات بلند کرنے میں بہت کردار ہوگا اور سونا چاندی (اللہ کی راہ میں) دینے سے بھی بہتر اور اس امر سے بھی کہ تمہاری دشمن سے مڈھ بھیڑ ہو تو تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ! فرمایا اللہ کا ذکر، اس پر بصراً، خبراً اور نظراً قرآنی اور ایمانی کثیر دلائل ہیں

اس کا کم از کم یہ کہ بندہ آنجناب جو کہ معلمِ خیر اور امامِ متقین ہیں، سے ماثور اذکار اور جو مقید اذکار ہیں مثلاً اکل وشرب اور جماع کے وقت اور لباس پہنتے ہوئے اور گھر، مسجد اور بیت الخلاء میں داخل اور خارج ہوتے وقت، نیز بارش اور کڑک وغیرہ کے وقت، اس ضمن میں (عَمَلُ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ) کے نام سے کئی مصنفات اور رسائل موجود ہیں، اس کے علاوہ مطلقاً ذکر کا التزام اور افضل ترین ذکر (لا الہ الا اللہ) ہے، کبھی ایسے احوال عارض ہوتے ہیں کہ بقیہ ذکر مثلاً (سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، لاحول و لاقوۃ الا باللہ) اس سے افضل ہوتا ہے پھر معلوم ہو کہ انسان ہر نوع کا ذکر کرے اور اس کا دل ان امور کا تصور کرے جو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں، علم کے تعلم اور تعلیم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو وہ بھی اللہ کا ذکر ہی ہے لہذا جو ادائے فرائض کے بعد طلبِ علم کے ساتھ مشغول ہوا یا ایسی مجلس میں بیٹھا جس میں اسے تفقہ حاصل ہو یعنی اس فقہ کی سمجھ بوجھ جسے اللہ اور رسول نے فقہ کا نام دیا ہے تو یہ بھی افضل ذکر اللہ میں سے ہے، اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب آپ غور کرو تو افضل اعمال بارے متقدمین کے (بظاہر مختلف) الفاظ واقوال کے ما بین کوئی بڑا اختلاف نہ پاؤ گے، جس بھی امر اور معاملہ کا حال بندے پر مشتبہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس میں استخارہ کرے، پس وہ شخص نادم نہ ہوا جس نے اللہ سے استخارہ کیا، اسے اور (عام) دعا کو بکثرت استعمال میں لانا چاہئے کہ یہ ہر خیر کی چابی ہے، جلد بازی نہ کرے کہ کہے میں نے دعا کی مگر وہ قبول نہ ہوئی، اس سلسلہ میں اوقاتِ فاضلہ کی رعایت کرے (جن کا احادیث میں ذکر آیا ہے) مثلاً رات کا آخری پہر، فرض نمازوں کے بعد، اذان کے وقت اور بارش کے نزول کے وقت اور دیگر

جہاں تک تمام مکاسب میں سے راجح ترین تو یہ اللہ پر توکل اور اس کے کافی ہونے پر کامل بھروسہ اور اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ہے، اس کی تفصیل یہ کہ **رزق کے معاملہ میں جد و جہد کرنے والے کو چاہیے کہ** اس ضمن میں وہ اللہ کے سامنے ملتجی ہو اور دعا کرے، جیسے ایک حدیثِ قدسی میں ہے فرمایا تم میں سے ہر ایک بھوکا ہے مگر جسے میں کھلاؤں، پس مجھ سے طعام کی طلب کرو، اے میرے بندو تم سب ننگے ہو مگر جسے میں پہناؤں لہذا مجھ سے لباس کی طلب کرو، عطا کر دوں گا ترمذی نے حضرت انس سے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے فرمایا تمہیں چاہیے کہ تمام حاجات کی طلب اللہ ہی سے کیا کرو حتی کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی کیونکہ اگر اس کی طرف سے آسانی اور تیسیر نہ ہو تو کوئی معاملہ آسان نہیں ہوتا، قرآن میں ہے:

(وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ) [النساء : ۳۲] (اور اللہ سے اُس کا فضل مانگتے رہو)

(فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ) [الجمعة : ۱۰] (پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی

اپنی راہ لو اور اللہ کا فضل تلاش کرو) یہ اگر چہ بطورِ خاص جمعہ بارے ہے لیکن اس کا معنی تمام نمازوں میں قائم ہے اسی لئے۔ واللہ اعلم۔ نبی اکرم نے حکم دیا کہ جب مسجد میں داخل ہوں تو کہو: (اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ) (اے اللہ میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور جب نکلو تو کہو: (اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ) (اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل مانگتا ہوں) حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا:

(فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ)[العنکبوت: ۱۷] (پس اللہ ہی کے ہاں سے رزق طلب کرو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُسی کا شکر ادا کرو) یہ امر ہے اور امر ایجاب کا مقتضی ہوتا ہے تو رزق اور دیگر سب معاملات میں اللہ کے ساتھ استعانت اور اس کی طرف لجوء اصلِ عظیم ہے پھر انسان کو چاہئے کہ سخاوتِ نفس کے ساتھ اخذِ مال کرے تا کہ حصولِ برکت ہو، اِشراف اور ہلع (یعنی طمع وحرص) کے ساتھ اس کا آخذ نہ بنے بلکہ مال کی اس کی نظر میں حیثیت خلاء (یعنی بیت الخلاء جانے) کی سی ہونی چاہیے کہ یہ انسان کی ضرورت تو ہے مگر دل میں اس کا کوئی مقام ومرتبہ نہیں اور اس بارے اس کی کوشش وسعی ویسی ہی ہونا چاہیے جیسے بیت الخلاء کی اصلاح (وصفائی وغیرہ) کے ضمن میں ہوتی ہے، ترمذی وغیرہ کی نقل کردہ ایک مرفوع حدیث میں ہے جس نے اس حال میں صبح کی کہ دنیا اس کی اکبرِ ھم ہے (یعنی مرکزی سوچوں کا محور) اللہ اسے بدحال اور بے نوا کر دے گا اور دنیا سے اسے حاصل تو وہی کچھ ہونا ہے جو مکتوب ومقدر ہے اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ آخرت اس کی اکبرِ ھم تھی (فکرِ آخرت تھی) تو اللہ اسے بھاگ لگائے گا اور اس کے دل کو مستغنی کر دے گا اور دنیا راغم (یعنی مجبور) ہو کر اس کے پاس آئے گی، بعض سلف کا قول ہے تم دنیا کی طرف محتاج تو ہو لیکن آخرت سے اپنے نصیب کے تم احوج ہو تو اگر آخرت سے اپنے نصیب کے ساتھ ابتدا کرو تو دنیا سے اپنا نصیب بھی ملے گا، فرمایا:

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ)[والذاريات: ۵۶] (اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری بندگی میں زندگی گزاریں) جہاں تک مکسب کی تعیین کہ صناعت ہو یا تجارت یا بنایت یا حراثت یا کوئی دیگر؟ تو یہ بھی لوگوں کے اختلافِ احوال کے مدِ نظر مختلف ہے، میں اس ضمن میں کوئی عمومی ضابطہ نہیں جانتا البتہ یہ ہے کہ جب انسان کے لئے کوئی جہت ظاہر ہو (یعنی کوئی موقع ملے) تو اس میں استخارہ کر لے، وہ جس کی نبی اکرم نے تلقین وتعلیم فرمائی تو اس کی رو سے ایسی برکت کا حصول ہوگا جو بیان وشمار سے باہر ہے پھر جو اس کے لئے متیسر ہو اس کے غیر کا تکلف نہ کرے الا یہ کہ اس سے کوئی شرعی کراہت ہو رہی ہو

جہاں تک مختلف علوم وفنون کی معتمد علیہ کتب بارے استفسار تو یہ ایک وسیع باب ہے اس میں بھی لوگوں کے اختلافِ احوال کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ کن علاقوں میں وہ پلے بڑھے ہیں تو بعض علاقوں میں کوئی خاص علم یا علوم یا طریقہ ومذہب عام ہوتا ہے اور دیگر میں کوئی اور لیکن خیر کا جماع یہ ہے کہ نبی اکرم سے موروث علم کی تلقی واخذ میں اللہ سے استعانت کرے تو یہی مستحق

ہے کہ علم کہلائے اور اگر کوئی علمِ نافع ہے تو ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد کی میراث میں ایسی شئ ہو، اس کی مثل یا اس سے بہتر جو اس سے مستغنی کر دے، مسلمان کی ہمت و کوشش نبی اکرم کے مقاصد کے فہم میں صرف ہونی چاہئے، آپ کے امر و نہی اور تمام کلام میں جب اس کا دل مطمئن ہو کہ یہی رسولِ اکرم کی مراد ہے تو اب اس سے بالکل عدول و اعراض نہ کرے ان امور میں جو اس کے اور اللہ کے مابین ہیں اور نہ لوگوں کے ساتھ، جس قدر بھی اس کے لیے یہ ممکن ہو، اسے چاہیے کہ ابوابِ علم میں سے ہر باب میں نبی اکرم سے اصلِ ماثور کے ساتھ ہی اعتصام کرے، جب لوگوں کے اختلافِ رائے کے وقت کوئی معاملہ اس پر مشتبہ ہو تو وہ دعا کرے جو مسلم نے حضرت عائشہ کے حوالے سے نقل کی ہے، کہتی ہیں جب نبی اکرم قیامِ شب کے لئے اٹھتے تو یہ کلمات کہتے : (اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ إِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ) (اے جبریل۔۔۔ کے خالق، ارض و سماوات کے بنانے والے غیب و حاضر کے عالم تو ہی اپنے بندوں کے درمیان ان کے باہمی اختلافات کا اپنی اذن سے فیصلہ کرے گا، بے شک تو جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے) ایک حدیثِ قدسی میں ہے اے میرے بندو تم سب کے سب گمراہ ہو مگر جسے میں نے ہدایت سے نواز دیا پس مجھ سے ہدایت کے طالب بنو میں تمہیں ہدایت عطا کروں گا

جہاں تک کتب اور مصنفین کا وصف تو اثنائے مذاکرہ جو اللہ سبحانہ نے آسان کیا ہم سے وہ مسموع ہوا، مبوب (یعنی جس میں مسائل کو ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے) **مصنفات میں سے محمد بن اسماعیل بخاری کی صحیح سے زیادہ نافع کوئی کتاب موجود نہیں لیکن** وہ تنہا ہی اصولِ علم کے ساتھ قائم نہیں اور نہ ابوابِ علم میں تبحر کے لئے تمام مقصود کے ساتھ تنہا قائم ہے کیونکہ دیگر احادیث (یعنی جو صحیح بخاری میں مذکور نہیں ہوئیں) کی معرفت بھی ضروری ہے، اسی طرح اہلِ فقہ اور ان امور میں اہلِ علم کی کلام جن کے علم کے ساتھ بعض علماء مختص ہیں، علمائے امت نے مختلف فنونِ علم میں سے ہر فن میں سیر حاصل اور جامعیت سے پر بحثیں کی ہیں تو جس کے دل کو اللہ نے منور کیا اسے اس کے ساتھ ہدایت سے نوازا ہے جو اس میں سے اس تک پہنچایا اور جسے یہ روشنی نصیب نہ ہوئی، کثرتِ کتب نے سوائے حیرت و ضلال کے کسی شئ میں اضافہ نہیں کیا جیسے نبی اکرم نے ابولبید انصاری سے فرمایا تھا کیا یہود و نصاریٰ کے پاس توراۃ اور انجیل موجود نہیں ہیں؟ تو ان کے یہ کیا کام آئی ہیں؟ لہٰذا ہماری اللہ بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت و سداد سے نوازے اور رشد کا ہمیں ملہَم بنائے اور ہمیں اپنے نفس کے شر سے بچائے اور ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں میں زیغ (یعنی کجروی) نہ کرے اور ہمیں اپنی جناب سے رحمت کا حقدار بنا دے، بے شک وہی وہاب ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَوَاتُهٗ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ

شیخ سے صبرِ جمیل، صفحِ جمیل اور ھجرِ جمیل بارے سوال ہوا، تو تقوی کی کیا اقسام ہیں اور صبر کی جس پر لوگ ہیں؟

جواب

الحمد للہ، اما بعد! اللہ نے اپنے نبی کو ہجرِ جمیل، صفحِ جمیل اور صبرِ جمیل کا حکم دیا ہے تو ہجرِ جمیل بلا اذی ہجر (ترک ومقاطعہ) ہے اور صفحِ جمیل بلاعتاب درگزر (یعنی یہ نہیں کہ پہلے اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر لی اور نشانہِ ملامت بنا لیا پھر کہا جا تجھے معاف کیا) اور صبرِ جمیل ایسا صبر جس میں شکوہ نہ ہو، حضرت یعقوب نے کہا تھا:

(**اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ**) [یوسف: ۸۶] (میں تو اپنے رنج وغم کا اظہار اللہ ہی سے کرتا ہوں) اور قبل ازیں یہ بھی کہا تھا:

(**فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ**)[یوسف : ۱۸] (پس صبرِ جمیل ہی کرتا ہوں اور جو تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے) تو اللہ کے سامنے اظہارِ شکوہ کرنا صبرِ جمیل کے منافی نہیں، حضرت موسی بارے مروی ہے کہ کہا کرتے تھے: (اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ إِلَيْكَ الْمُشْتَكٰى وَ أَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَبِكَ الْمُسْتَغَاثُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ) نبی اکرم کی ایک دعائے ماثور ہے:(اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ اَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَ هَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَ اَنْتَ رَبِّيْ اَللّٰهُمَّ إِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَمْ إِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ ؟ اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ غَضَبٌ عَلَيَّ فَلَا اُبَالِيْ غَيْرَ اَنَّ عَافِيَّتَكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَ صَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ اَنْ يَنْزِلَ بِيْ سَخَطُكَ اَوْ يَحِلُّ عَلَيَّ غَضَبُكَ لَكَ الْعُتْبٰى حَيْثُ تَرْضٰى) (ص:۱۲۱ میں مع ترجمہ گزری ہے) حضرت عمرعموما نمازِ فجر میں (**اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ**) پڑھا کرتے تھے اور اتنا روتے کہ ان کی ہچکیوں کی آواز آخری صف تک جاتی بخلاف مخلوق کے سامنے شکوہ کرنے کے، امام احمد کو ان کی مرض الموت میں بتلایا گیا کہ طاؤس مریض کا ہائے ہائے کرنا برا گردانتے تھے اور کہتے تھے یہ بھی ایک طرح سے شکوہ ہے تو انہوں نے پھر وفات تک ہائے ہائے نہیں کی، دراصل بات یہ ہے کہ مشتکی زبانِ حال کے ساتھ اپنے کو ضار کے ازالہ کا یا اپنے لئے نافع کے حصول کا طالب ہوتا ہے اور بندہ مامور ہے کہ اپنے رب سے ہی طلبِ حاجات کرے، نہ کہ کسی مخلوق سے جیسے کہا:

(**فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ**)[الانشراح : ۷۔۸] (پس جب فارغ ہوا کرو تو محنت کیا کرو۔ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو) نبی اکرم نے ابن عباس کو نصیحت کی تھی کہ جب مانگو اللہ سے مانگو جب استعانت کرو تو اللہ سے کرو، انسان کے لئے دو اشیاء نہایت ضروری ہیں: ایک فعلِ مامور اور ترکِ محظور کے ساتھ اس کی طاعت اور دوم پیش آمدہ مقدر مصائب اور پریشانیوں پر صبر کرنا، تو اول تقوی اور ثانی صبر ہے، فرمایا:

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا) إلى قوله : (وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ)[آل عمران : ۱۱۸۔۱۲۰](اے مومنو! کسی غیر کو اپنا رازداں نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔۔۔ اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اُس پر احاطہ کئے ہوئے ہے) اور کہا:

(بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ)[آل عمران : ۱۲۵] (ہاں اگر تم دل کو مضبوط رکھو اور ڈرتے رہو اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کر دیں تو اللہ پانچ ہزار فرشتے جن پر نشان ہوں گے تمہاری مدد کو بھیجے گا)

(لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ)[آل عمران : ۱۸۶] (تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی اور تم اہلِ کتاب سے اور اُن لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے، تو اگر صبر اور پرہیز گاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں) حضرت یوسف نے کہا:

(اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف : ۹۰] (میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) اسی لئے الشیخ عبد القادر اور ان جیسے اہلِ استقامت مشائخ اپنی اکثر تقاریر میں ان دو اصول کی وصیت کیا کرتے تھے، اول: فعلِ ما مور کی طرف مسارعت اور فعلِ محظور سے تقاعد، اور دوم: مقدر پر رضا وصبر، اس مقام پر کثیر عوام الناس غلط فہمی کا شکار ہیں بلکہ کئی اہلِ سلوک بھی تو ان میں سے بعض فقط قدر اور کونی حقیقت کے شاہد ہیں نہ کہ دینی حقیقت کے تو یہ تو ان کے مدِ نظر ہے کہ اللہ ہر شیٔ کا خالق اور رب ہے مگر اللہ کے محبوبات و مرضیات اور اس کی مسخوطات و مبغوضات کے مابین تفریق نہیں کرتے اگر چہ یہ بھی اس کی قضاء وقدر سے ہیں اور توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کے مابین تمیز روا نہیں رکھتے، تو یہ حضرات اس جمع کے شاہد ہیں جس میں تمام مخلوقات۔ نیک بھی اور بد بھی۔ مشترک ہیں، اس جمع کا مشہد جس میں مومن و کافر، بر و فاجر، نبیِ صادق اور متنبیٔ کاذب، اہلِ جنت اور اہلِ نار، اللہ کے اولیاء اور اس کے اعداء اور ملائکہ مقربین اور سرکش شیاطین، سب مشترک ہیں تو یہ تمام اس جمع میں مشترک ہیں اور یہی کونی حقیقت ہے اور وہ یہ کہ اللہ ان کا رب، خالق اور ملیک ہے اس کے سوا ان کا کوئی رب نہیں، یہ اس فرق کے شاہد نہیں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے

اولیاء اور اعداء، مومنین اور کافرین، ابرار اور فجار اور اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان تفرقہ کیا ہے اور یہ توحیدِ الوہیت ہے اور یہ بغیر اس کے لئے شریک بنائے اس اکیلے کی عبادت کرنا اور اس کی اور اس کے رسول کی طاعت کرنا اور وہ افعال کرنا جو اسے پسند ہیں اور جن پر وہ راضی ہے اور یہ وہی جن کا اس نے اور اس کے رسول نے امر دیا ہے، امرِ ایجاب یا امرِ استحباب اور ہر اس کا ترک جس سے اللہ نے اور اس کے رسول نے منع کیا اور اس کے اولیاء سے موالات کرنا اور اس کے اعداء سے معادات کرنا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے نہی کرنا، کفار اور منافقین کے خلاف دل، ہاتھ اور زبان سے جہاد کرنا تو جو اس فرق کرنے والی ان کے اور ان کے درمیان دینی حقیقت کا شاہد نہ بنا تو وہ مشرکین کی جنس سے ہوا جو یہود و نصاری سے بھی بدتر ہے، مشرکین کونی حقیقت کے تو مقر ہیں کیونکہ وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہی ہر شئ کا رب ہے جیسے قرآن میں کہا:

(وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) [الروم : ۲۱]

(قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ) [المؤمنون : ۸۴] **(متعدد آیات)** اسی لئے کہا:

(وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ)[یوسف : ۱۰۶] (اور ان کے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ مشرک ہیں) بعض سلف کا کہنا ہے کہ ان سے پوچھو کہ ارض و سماوات کا خالق کون ہے؟ کہیں گے اللہ ہے اس کے باوجود اس کے غیر کی عبادت کرتے ہیں تو جو قضا و قدر کا تو مقر ہوا مگر شرعی امر اور نہی کا نہیں وہ یہود و نصاری سے بھی اکفر ہے کیونکہ یہ ملائکہ اور رسل کے مقر تھے جو شرعی امر و نہی لے کر آئے لیکن ان کی بعض باتوں پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا جیسے اللہ نے کہا:

(اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا) [النساء : ۱۵۰۔۱۵۱] (جو لوگ اللہ سے اور اُس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایمان اور کفر کے بیچ میں ایک راہ نکالنی چاہتے ہیں۔ وہ بلا شبہ کافر ہیں) لیکن جو کونی حقیقت اور توحیدِ ربوبیت کے شاہد ہیں جو خلقیت کو شامل ہے اور اقرار کرتے ہیں کہ بندے سب کے سب قضاء و قدر کے تحت ہیں اور اس حقیقت کے وہ سالک ہیں تو ان مومنین و متقین جو اللہ کے اس امر کی طاعت کرتے ہیں جس کے ساتھ اس نے رسل کو مبعوث کیا، کے مابین اور عصاۃ، کفار اور فجار کے مابین فرق روا نہیں رکھتے تو یہ یہود و نصاری سے بھی اکفر ہیں لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے بعض امور میں فرق کو مدنظر رکھا اور بعض میں نہیں، اس طور کہ مومن اور کافر کے مابین تو تفرقہ کے روادار ہیں مگر نیک اور بد کے درمیان نہیں، یا بعض ابرار اور بعض فجار کے مابین فرق روا رکھتے ہیں اور دوسروں کے مابین نہیں اور یہ اپنے ظن و ھویٰ کی اتباع کرتے ہوئے تو ابرار و فجار کے مابین اپنے اس تسویہ کے سبب یہ ناقص الایمان ہیں اور اللہ کے اولیاء اور اس کے اعداء کے مابین جو ان کے ذہن میں تفریق

موجود ہے اس کے بحسب ان کے ساتھ اللہ تعالی کے فارق دین پر ایمان موجود ہے اور جس نے دینی امر اور نہی کا تو اقرار کیا مگر قضاء و قدر کا نہیں تو وہ قدر یہ میں سے ہوا، معتزلہ وغیرہم کی طرح جو اس امت کے مجوسی ہیں تو یہ مجوسیوں سے جبکہ وہ مشرکوں سے مشابہ ہیں جو مجوس سے بھی بدتر ہیں اور جس نے ان دونوں کا اقرار کیا اور رب کو متناقض باور کیا تو وہ ابلیس کے اتباع میں سے ہوا جس نے رب تعالی پر اعتراض کیا تھا اور اس سے مخاصمت مول لی تھی جیسا کہ اس کے بارے یہ منقول ہے، یہ تقسیم قول اور اعتقاد میں ہے

اسی طرح وہ احوال و افعال میں ہیں تو ان میں سے درست مومن کی حالت ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے اور نتیجۂ فعلِ مامور اور ترکِ محظور کا خوگر ہے اور مقدر مصائب پر صبر کا دامن تھامے رکھتا ہے تو وہ امر، نہی، دین اور شریعت کے پاس ہے اور اس پر اللہ سے استعانت کرتا ہے جیسے کہا: (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) اگر گناہ کا ارتکاب کرے تو استغفار و توبہ کرتا ہے، سیآت کے فعل پر تقدیر کا سہارا نہیں لیتا اور اس کا عذر پیش نہیں کرتا اور نہ وہ مخلوق کے لئے ربِ کائنات پر حجت روا سمجھتا ہے بلکہ (اس کی روش یہ ہے کہ) تقدیر کا مومن تو ہے مگر اسے بطورِ حجت پیش نہیں کرتا اور اس کا سہارا نہیں لیتا جیسے ایک حدیث میں ہے: سید الاستغفار یہ ہے کہ کہے: (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الخ) تو یوں حسنات میں اپنے پہ اللہ کی نعمتوں کا اقرار کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اسی نے اسے ہدایت دی ہے اور نیکی کرنا اس کے لئے میسر کیا ہے، اپنے ذنوب کا مقر ہے اور ان سے تائب ہوتا ہے جیسے کسی کا قول ہے: میں نے تیرے فضل کے ساتھ تیری طاعت کی اور یہ تیرا ہی احسان ہے اور تیرے علم کے ساتھ تیری نا فرمانی کی اور تیرے ہی لئے (نہ کہ تیرے خلاف) حجت ہے تو میں تیری محبت کے اپنے پر وجوب اور اپنی حجت کے انقطاع کی رو سے تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تو میری مغفرت فرما دے، ایک صحیح قدسی (الٰہی کا لفظ استعمال کیا) حدیث میں ہے: اے میرے بندو یہ تمہارے اعمال، میں ان کا احصاء کروں گا پھر تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا، تو جو خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو اس کا غیر پائے تو وہ ملامت نہ کرے مگر خود کو، اس نکتہ پر ایک جگہ مبسوط تحقیق کی ہے

دیگر حضرات فقط امر کے شاہد ہیں، تم انہیں پاؤ گے کہ حسبِ استطاعت طاعت میں محنت کرتے ہیں لیکن ان کے پاس مشاہدہِ قدر نہیں ہے جو ان کے لئے حقیقتِ استعانت و توکل وصبر کا موجب بنے، کئی اور فقط قدر کے شاہد ہیں تو ان کے پاس استعانت، صبر اور توکل سے وہ کچھ ہے جو ان کے پاس نہیں لیکن یہ اللہ و رسول کے امر کا التزام اور اس کی شریعت کا اتباع نہیں کرتے، نہ کتاب وسنت کے اور دین کے جو رسل لے کر آئے ملازم ہیں تو یہ اللہ سے استعانت تو کرتے ہیں لیکن اس کی عبادت نہیں کرتے جبکہ سابق الذکر اس کی عبادت کی ارادت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ استعانت نہیں کرتے جبکہ مومن وہ ہے جو اس کی عبادت بھی کرتا ہے اور اس سے استعانت بھی اور چوتھی قسم بدترین قسم ہے جو نہ اس کی عبادت کرتے ہیں اور نہ اس سے استعانت کرتے ہیں تو نہ یہ امری شریعت کے ساتھ ہیں اور نہ کونی تقدیر کے ساتھ، ان اقسام میں ان کا منقسم ہونا ان امور میں سے ہے جو

مقدور کے وقوع سے قبل ہوں، توکل اور استعانت ونحوہ سے اوران سے جو بعدازاں ہوں صبر اور رضا ونحوہ تو یہ تقوی جو کہ امرِ دینی کی طاعت ہے اور صبر میں اس پر جو قدرِ کونی سے ہے، چار اقسام ہیں:

اول: اہلِ تقوی وصبر، یہی وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا، دنیا وآخرت کے اہلِ سعادت میں سے

دوم: جن کے لئے تقوی کی ایک نوع تو حاصل ہے مگر یہ بلاصبر ہیں، ایسے لوگ جو نماز روزہ وغیرہ اعمال وفرائض تو بجالاتے ہیں اور محرمات کا بھی ترک کرتے ہیں لیکن جب انہیں بدنی، مالی یا اہل وعیال کی کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے یا دشمن کا خوف لاحق ہوتو سخت جزع وفزع (ہائے وائے) سے کام لیتے ہیں

سوم: ایسے حضرات جن کے لئے ایک نوع کا صبر تو ہے مگر یہ بلاتقوی ہیں، یہ ان فجار کی مثل جو پیش آمدہ مصائب پر صبر سے کام لیتے ہیں مثلا چوری چکاری اور دیگر پریشانیاں اور آلام جنہیں یہ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور آہ وبکاء سے کام نہیں لیتے، اسی طرح وہ چور اور ڈاکو جو اسے اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور اس راہ میں پیش آمدہ آلام اور تکالیف پر صبر کرتے اور برداشت سے کام لیتے ہیں، اسی طرح عہدے دار اور سرکاری عمال جو مالِ حرام اور رشوت کے اخذ کرنے میں جب مصائب اور رسوائی کا شکار بنتے (اور جیل جاتے) ہیں تو مقدر سمجھ کر خاموش رہتے اور صبر سے کام لیتے ہیں، اسی طرح طالبانِ ریاست (سیاستدان وغیرہ) جو اس راہ کی سختیاں جھیلتے اور مشکلات اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور ایسی مشقتیں اور تھکاوٹیں اور جگ رتے سہتے ہیں جو اکثر لوگوں کے بس کی بات نہیں (یعنی یہ سب وہ دنیا کے حصول کے لئے جیسے قرآن نے کہا: ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا) اسی طرح حرام صورتوں کے اہلِ عشق جو اس راہ کی مشقتیں اور رسوائیاں برداشت کرتے ہیں تو ان سب کے دنیوی مقاصد ہیں، کوئی زمین میں علو اور اقتدار کا خواہاں ہے، کوئی دوسروں کے اموال میں اپنا ناحق طور سے حصہ بٹورنا چاہتا ہے، کوئی شہوت پرستی اور کوئی پیٹ پوجا اور کوئی تعیش وآرام کے حصول میں لگا ہوا ہے اور اس کے لئے ہر طرح کے آلام ومشقات جھیل رہا ہے لیکن تقوی کا ان کے پاس سے بھی گزر نہیں ہوا، جو بھی یہ ترکِ مامور اور فعلِ محظور کرتے ہیں سب میں ان کا مطمحِ نظر دنیا ہے، آخرت کی ذرا سی بھی فکر نہیں، اسی طرح کئی مریض وبیمار جو صبر سے تو کام لیتے ہیں لیکن متقین میں ان کا شمار نہیں ہوتا، اور جہاں تک چوتھی قسم تو یہ ان سب میں بدترین لوگ ہیں، یہ جب قادر ہوں تو تقوی کو اپنا شعار نہیں بناتے اور جب ابتلا میں ہوں تو صبر کا دامن نہیں تھامتے بلکہ یہ جیسے اللہ تعالی نے کہا:

(اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا) [المعارج: ۱۹-۲۱] (بے شک انسان کم حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے) انہیں ان کی حالتِ قدرت میں تم ظالم اور جابرترین پاؤ گے اور اگر قہر وجبر کا شکار ہوں تو لگے گا کہ ان سے بڑھ کر ذلیل وعاجز کوئی نہیں، اگر تمہارے ماتحت ہوں تو عاجزی کی حد تک تابعداری اور وفاداری کا اظہار کریں گے اور ہر طرح کے کذب، جھوٹی تعظیم

اور مسکنت و ذلت کا نمونہ بنے رہیں گے لیکن اگر بدقسمتی سے یہ تمہارے پاس ہوں تو پھر ان کا ظلم وقہر، طیش وغضب، زور آوری، دل کی قساوت اور درشت مزاجی ہر حد سے متجاوز ہوگی، گو یا نرمی، حسنِ سلوک اور درگزر کرنے کے جذبات تو انہیں چھو کر بھی نہیں گزرے جیسا کہ اہلِ اسلام کا ان کی بابت یہی مشاہدہ اور تجربہ ہے جو حقائقِ ایمان سے ابعد ہیں، مثلا تا تاری جن سے شام کے نواح میں اہلِ اسلام کو جنگیں کرنا پڑی ہیں (ابن تیمیہ بھی ان جنگوں میں شریک رہے تھے) اور جو کثیر امور میں ان سے مشابہ ہیں اگر چہ مسلمانوں، ان کے علماء زہاد اور دیگر اہلِ حرفت کے لباس کے ساتھ متظاہر ہوں، حدیث میں ہے کہ اللہ تمہاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا اور نہ تمہارے اموال کی طرف بلکہ تمہارے قلوب اور تمہارے اعمال کی طرف تو اگر اس کا دل اور عمل تا تاریوں اور ان کے اعمال کی جنس سے ہے تو اس وجہ سے وہ انہی سے مشابہ اور انہی میں شمار ہوگا اور جو اس کے ساتھ اسلام سے ہے یا اس سے جس کا اظہار کرتا ہے وہ اسی کے بمنزلہ جو ان کے ساتھ اسلام سے ہے یا جس کا وہ اظہار کرتے ہیں بلکہ غیرِ تا تار میں اسلام ظاہر کرنے والے ایسے جنگجو ہیں جو رِدت میں اعظم اور جاہلیت کی عادات واطوار کے اولی ہیں اور تا تاریوں سے بڑھ کر اسلامی اخلاق سے ابعد ہیں

صحیح میں نبی اکرم سے مروی ہے کہ اثنائے خطبہ یہ کلمات کہا کرتے تھے: (خَیْرُ الْکَلَامِ کَلَامُ اللّٰہِ وَ خَیْرُ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ وَ شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَ کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ) تو جب بہترین کلام اللہ کی کلام ہے اور بہترین ہدی حضرت محمد کی ہدی ہے تو جو اس سے اقرب ہوگا وہ اسی کے ساتھ اشبہ اور کمال کی طرف اقرب ہوگا اور وہی اس کا احق ہوگا اور جو اس سے ابعد اور جس کی شباہت اس سے اضعف ہوگی اسی قدر وہ کمال سے ابعد اور باطل کا احق ہوگا اور جو جتنا اللہ و رسول کے امر کا اتبع ہوگا اس کی اللہ سے اس کے ہاں محبوبات و مرضیات میں موافقت اعظم ہوگی اور اس کی قدر پر صبر بھی اتنا ہی عظیم ہوگا اور اسی لحاظ سے وہ اکمل و افضل ہوگا اور اس اعتبار سے جتنی جس میں کمی اور کوتاہی ہوگی اسی کے بحسب وہ ناقص ہوگا، اللہ نے اپنی کتاب کے کئی مقامات میں صبر اور تقوی کا اکٹھے ذکر کیا ہے اور بیان کیا کہ اسی کے ساتھ بندہ کفار محاربین اور معاند منافقین میں سے اپنے دشمن اور مسلمانوں میں سے جو اسے ظلم کا نشانہ بنائے، پر غالب آتا ہے اور اچھا انجام اسی کا ہوتا ہے، فرمایا:

(بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَ) [آل عمران: ۱۲۵] (کیوں نہیں اگر تم دل کو مضبوط رکھو اور ڈرتے رہو اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعۃً حملہ کر دیں تو اللہ پانچ ہزار فرشتے جن پر نشان ہوں گے تمہاری مدد کو بھیجے گا)

(لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ) [آل عمران: ۱۸۶] (تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی اور تم اہلِ کتاب سے اور اُن لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے، تو اگر صبر اور پرہیزگاری

کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں)

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا) إلى قوله : (وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ)[آل عمران :١١٨- ١٢٠] (اے اہلِ ایمان کسی غیر کو اپنا راز داں نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ۔۔اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اُس پر احاطہ کئے ہوئے ہے) برادرانِ یوسف نے ان سے کہا تھا:

(ءَ إِنَّكَ لَأَنْتَ يُوْسُفُ) تو کہا:(اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)(کچھ قبل گزری) عموما اور خصوصا صبر کو اعمالِ صالحہ کے ساتھ مقرون کیا چنانچہ کہا:

(وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ)[یونس : ١٠٩] (اور تمہیں جو حکم بھیجا جاتا ہے اُس کی پیروی کئے جاؤ اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے) تقوی سب کا سب آپ کی طرف منزل وحی کی اتباع میں ہے اللہ کی خبر کی تصدیق اور اس کے امر کی طاعت کرتے ہوئے) اور فرمایا:

(فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ) [الغافر : ٥٥] (تو صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرو اور صبح وشام اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو)

(فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ) [طٰه : ١٣٠] (پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کرو اور رات کی ساعات میں بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور دن کے مختلف حصوں میں)

(اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ)[البقرة : ١٥٣](صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) تو ان مواضع میں صبر کو نماز کے ساتھ مقرون کیا، کئی آیات میں اسے رحمت کے ساتھ مقرون کیا مثلا:

(وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ) [البلد : ١٧] (اور ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کرنے کی نصیحت کرتے رہے) رحمت میں خلق کے ساتھ احسان ہے زکاۃ وغیرہ کے ساتھ تو یہاں بھی رباعی تقسیم ہے، کئی لوگ صبر تو کرتے ہیں مگر رحم نہیں کرتے جیسے اہلِ قوت وقسوت کا یہی شیوہ ہے، کئی رحم اور ترس کھاتے ہیں مگر ان میں صبر کا مادہ نہیں، اہلِ ضعف ولین کی یہی روش ہوتی ہے، کثیر خواتین کی یہی مثل ہے اور جو (مردوں میں سے) ان کے مشابہ ہیں، کئی ایسے ہیں جو نہ صبر کرتے ہیں اور نہ ان میں جذبہ ترحم ہے جیسے اہلِ قسوت وہلع (یعنی سنگدل اور درشت خو) محمود صنف وہ ہے جو صبر بھی کریں اور رحم وہمدردی کے جذبہ سے بھی معمور ہوں جیسے فقہاء نے حاکم کے بارہ میں کہا کہ اسے قوی ہونا چاہیے لیکن درشت مزاج نہ ہو، نرم ہو مگر کمزور نہ ہو تو اس کا صابر ہونا اسے قوی بناتا

ہے اوراس کا نرم ہونا جذبِ ترحم ابھارے گا،صبر انسان کا اہم مددگار ہے اور جو رحم کرے اللہ اس پر رحم کرتا ہے جیسے نبی اکرم نے فرمایا: (إِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ) اورفرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا اور فرمایا رحم کا جذبہ بد بخت ہی سے معدوم ہوتا ہے اور فرمایا رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے! تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ واللہ اعلم اھ۔

شیخ سے الاستاذ قشیری نے جو باب (الرضا) میں الشیخ ابوسلیمان سے ذکر کیا، بارے سوال ہوا کہ انہوں نے کہا رضا یہ ہے کہ اللہ سے نہ جنت کا سوال کیا جائے اور نہ جہنم سے پناہ مانگی جائے تو کیا یہ بات درست ہے؟

جواب

الحمد للہ رب العالمین! اس قول پر دو وجہ سے بات ہوگی: اول شیخِ مذکور سے اس کے ثبوت کی جہت سے اور دوم فی نفسہ اس قول کی صحت اور فساد کی جہت سے، جہاں تک اول جہت تو یہ جاننا چاہئے کہ الاستاذ ابوالقاسم (قشیری) نے الشیخ ابوسلیمان سے ان کا یہ قول اسناد کے ساتھ نقل نہیں کیا بلکہ مرسلاً کیا ہے اور اپنے رسالہ میں جو ابو قاسم نبی اکرم صحابہ، تابعین اور مشائخ وغیرہم سے ذکر کرتے ہیں تو کبھی تو اسناد کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور کبھی مرسلاً، کثیر اوقات اس قسم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں: کہا گیا ہے کہ۔۔الخ پھر جو باتیں وہ اسناد کے ساتھ بھی ذکر کرتے ہیں تو کئی دفعہ سند صحیح ہوتی ہے اور کئی دفعہ ضعیف بلکہ موضوع (یعنی من گھڑت) اور جو وہ مرسلاً ذکر کرتے ہیں اور محذوف القائل اولی ہے جیسا کہ فقہاء کی مصنفات میں یہ موجود ہے تو ان میں صحیح آثار واحادیث بھی ہیں اور ضعیف بھی اور موضوع بھی، یہی انداز واسلوب اور صفت کتبِ رقائق (یعنی رقت آمیز موضوعات بیان کئے جاتے ہیں) اور کتبِ تصوف کی ہے تو ان میں بھی صحیح،ضعیف اور موضوع اسانید کے ساتھ مشائخ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، یہ امر تمام اہلِ اسلام کے ہاں متفق علیہ ہے، کسی کی اس بابت اختلافی رائے نہیں بلکہ تفسیری کتب کا بھی یہی حال ہے حالانکہ اہل الحدیث منقولات کی معرفت کا زیادہ ملکہ رکھتے ہیں،تو ان کی کتب میں بھی صحیح،ضعیف اور موضوع روایات پائی جاتی ہیں تو دوسروں کا تو ذکر ہی کیا

مصنفین میں فقہ،تصوف یا حدیث کے ائمہ بھی ہیں اور کبھی یہ ایسی باتیں نقل کر جاتے ہیں جن کی بابت نہیں جانتے ہوتے کہ یہ کذب ہیں اور یہی اہلِ دین پر غالب ہے (یعنی جنھوں نے کتب تالیف کی ہیں) لیکن جن کی بابت جان لیں کہ کذب ہیں انہیں وہ معرضِ احتجاج میں پیش نہیں کرتے، کبھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ کذب ہے بیاں کر دیتے ہیں کیونکہ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہر اس بات کو ذکر کر دیں جو اس باب میں (جس پر قلم اٹھایا ہے) مروی اور منقول ہے، مکذوب احادیث کا ذکر یہ واضح کر کے کہ یہ مکذوب ہیں جائز ہے لیکن بطور روایتِ عمل کے مکذوب روایت کو ذکر کرنا علماء کے نزدیک حرام ہے جیسے صحیح میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جس نے مجھ سے منسوب مکذوب حدیث بیان کی اور وہ جانتا ہے کہ یہ مکذوب ہے تو وہ بھی دو میں سے ایک کاذب ہے، کثیر علماء نے یہ تاویل کرتے ہوئے ایسی روایات ذکر کر دی ہیں کہ انہوں نے تو کذب کا ارتکاب نہیں کیا، انہوں نے تو اپنے

غیر کی روایت کونقل کیا ہے اور ان کا مقصد لوگوں کو آ گہی اور شعور دینا تھا کہ فلاں مسئلہ میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے یعنی اس کی نشاندہی کرنا مقصود تھا، نہ کہ یہ غرض کہ اس پر عمل کیا جائے یا اسے معتمد اور حجت سمجھا جائے

مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ قشیری کے اس رسالہ اور اس کی مثل رسائل اور مصنفات میں جو نبی اکرم اور دیگر سلف سے منقولات مذکور ہیں ان میں صحیح روایات بھی ہیں اور ضعیف وموضوع بھی تو صحیح وہ جس کے صدق پر ادلہ قائم ہیں اور موضوع وہ جس کے کذب پر ادلہ قائم ہوئیں اور ضعیف وہ جس کے راوی کا صدق معلوم نہ ہوسکا، یا تو اس کے سوئے حفظ کی وجہ سے یا اس کے متہم ہونے کی وجہ سے لیکن امکان ہوتا ہے کہ خاص طور سے اس روایت میں اس نے صدق سے کام لیا ہو کیونکہ فاسق بھی کبھی سچ بول دیتا ہے اور غالط بھی کبھی یاد رکھ سکتا ہے، اس رسالہ کے اکثر ابواب میں یہ تینوں اقسام پائی جاتی ہیں، انہی میں سے باب الرضا بھی ہے تو اس میں جہاں اس طرح کی صحیح روایات موجود ہیں کہ نبی اکرم نے فرمایا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب، محمد کے رسول اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا، اسے مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اگر چہ استاذ نے مسلم کا حوالہ نہیں دیا لیکن اسے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہاں ضعیف اور موضوع روایات بھی ذکر کی ہیں مثلا بابِ ہٰذا کے شروع میں ایک ضعیف بلکہ مو ضوع روایت ذکر کردی، یہ جابر الطّویل کی روایت جو انہوں نے فضل بن عیسی رقاشی عن محمد بن المنکدر عن جابر سے نقل کی، اگر چہ یہ اس باب میں ان کی ذکر کردہ پہلی حدیث ہے لیکن فضل مذکور کی احادیث واہی اور ساقط احادیث میں سے ہیں، ائمہ ان کے نا قابلِ اعتماد واحتجاج ہونے پر متفق ہیں کہ ان پر ضعف ظاہر ہے اگر چہ یہ خود تعمدِ کذب نہیں کرتے لیکن اکثر فقہاء کے سیّئ الحفظ ہونے کی وجہ سے، نہ کہ اس وجہ سے کہ کذب پر اعتماد کرتے ہیں ان کی حدیث کے ساتھ احتجاج نہیں کیا جاتا، رقاشی کے ضعیف ہونے پر ان کا اتفاق ہے جیسا کہ یہ بات ائمہِ فن کے ہاں معروف ہے حتی کہ ایوب سختیانی کا قول ہے اگر یہ گونگے پیدا ہوتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا، سفیان بن عیینہ نے انہیں (لَا شَـــیْءَ) قرار دیا (یعنی کوئی شئ نہیں، مراد غیر ثقہ) امام احمد اور نسائی نے ضعیف کہا، یحی بن معین نے (رَجُلُ سُوْءٍ) کی ترکیب استعمال کی جبکہ ابوحاتم اور ابوزرعہ نے منکر الحدیث قرار دیا

اسی طرح ان آثار کا معاملہ ہے جو انہوں نے ذکر کیے تو ان میں کئی آثار حسن اسانید کے ساتھ ہیں مثلا جو الشیخ ابوسلیمان دارانی سے نقل کیا کہ بندہ اگر اپنی شہوات کو فراموش کردے تو راضی رہے گا، تو اسے انہوں نے اپنے شیخ ابوعبد الرحمٰن سلمی سے ان کی اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے الشیخ عبد الرحمٰن نے ان مشائخ کی کلام اور واقعات کے جمع کرنے کا خاصہ اہتمام کیا تھا، الا سماء میں کتاب طبقات الصوفیۃ اور کتاب الزہاد وغیرہ تالیف کی ہیں جبکہ ابواب میں کتاب مقامات الأ ولیاء وغیرہ، ان کی مصنفات بھی مذکورہ بالا تینوں اصناف پر مشتمل ہیں، الشیخ ابوعبد الرحمٰن سے نقل کیا کہ میں نے نصر آبادی کو کہتے سنا جو چاہتا ہے کہ مقامِ رضا کو پہنچے تو وہ اسے لازم پکڑے جس میں اللہ نے اپنی رضا رکھی ہے تو یہ کلام غایتِ حسن میں ہے کیونکہ جس نے اللہ کی مرضیات اور محبو

بات کا التزام کیا اور اس کے اوامر کا امتثال اور اس کی نواہی سے اجتناب کیا بالخصوص اگر واجبات کے ساتھ ساتھ مستحبات کا بھی عامل ہوا تو اسے اللہ تعالی کی رضا حاصل ہو گی جیسے جس نے حق تعالی کے محبوبات کو لازم پکڑا تو اللہ اس سے محبت کرنے لگے گا جیسے بخاری کی صحیح حدیث میں ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے معادات رکھی تو اس نے مجھے للکارا اور میرا بندہ فرائض کی بجا آوری کے ساتھ نیل تقرب کی مثل میری طرف متقرب نہیں ہوا اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ (ایک مرحلہ ومقام آتا ہے کہ) میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔۔الخ تفصیل یہ ہے کہ رضا کی دو انواع ہیں: ایک اس کے مامور کے فعل اور اس کے منہی عنہ کے ترک کے ساتھ رضا اور یہ اللہ کے مباحات کو متناول ہے محظور کی طرف تعدی کے بغیر جیسے کہا:

(وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ) [التوبة : ۶۲] (تو اللہ اور اس کا رسول خوش کئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں)

(وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ) [التوبة : ۵۹] (اور اگر وہ اس پر خوش رہتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور اللہ اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ہمیں دے دیں گے اور ہمیں تو اللہ ہی کی خواہش ہے) یہ رضا واجب ہے اسی لئے اس کے تارک کی ذم کی ہے جب کہا:

(وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ)[التوبة : ۵۸] (اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ صدقات میں تم پر طعنہ زنی کرتے ہیں اگر ان کو اس میں سے مل جائے تو خوش رہیں اور اگر نہ ملے تو جھٹ خفا ہو جائیں) اور دوم، مصائب پر رضا مثلا فقر، مرض اور ذل پر، تو علماء کے دو میں سے ایک قول پر یہ رضا مستحب ہے واجب نہیں، بعض نے واجب کہا، صحیح یہ ہے کہ صبر واجب ہے جیسے حسن نے کہا رضا غریزہ (یعنی فطری صلاحیت) ہے لیکن صبر مومن کا سہارا ہے، ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے (انہیں مخاطب کر کے) فرمایا اگر کر سکو کہ رضا مع الیقین کے عامل بنو تو ضرور کرو، اگر یہ نہ کر سکو تو مکروہات پر صبر کرنے میں خیر کثیر ہے! جہاں تک کفر، فسوق اور عصیان پر رضا تو اس بارے ائمہ دین کا موقف یہ ہے کہ اس پر راضی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اللہ ان پر راضی نہیں ہے جیسے کہا:

(وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ) [الزمر: ۷] (اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا)

(وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ)[البقرة : ۲۰۵] (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا)

(فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ)[التوبة : ۹۶] (پس اگر تم اُن سے خوش ہو جاؤ گے تو اللہ تو نافرمان لوگوں سے خوش نہیں ہوتا)

(فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا)[النساء : ۹۳] (تو اس کی سزا دوزخ

ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کیلئے اُس نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)
(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ) [محمد : ۲۸] (یہ اس لئے کہ جس چیز سے اللہ ناخوش ہے یہ اس کے پیچھے چلے اور اس کی خوشنودی کو اچھا نہ سمجھے تو اس نے بھی ان کے اعمال کو برباد کردیا)
(وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا) [التوبة : ۶۸] (اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے آتشِ جہنم کا وعدہ کیا ہے)
(لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِى الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ)[المائدة : ۸۰] (بُرا ہے جو کچھ انہوں نے اپنے واسطے آگے بھیجا ہے کہ اللہ ان سے ناخوش ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے)
(فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ) [الزخرف : ۵۵] (جب انہوں نے ہم کو خفا کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا) تو جب اللہ سبحانہ ان کے اعمال پر راضی نہیں بلکہ ان پر ناراض اور غاضب ہے تو مومن کے لئے کیونکر مشروع ہوسکتا ہے کہ ان پر ناراض و غاضب نہ ہو جن پر اللہ ناراض و غاضب ہے، یہاں لوگوں کے دو گروہوں نے لغزش کھائی ہے: ایک سنت کی طرف اپنا انتساب کرنے والے اہلِ کلام نے قدریہ کے خلاف مناظرہ میں، انہوں نے ظن کیا کہ حق تعالی کی محبت، رضا، غضب اور ناراضی اس کے ارادہ کی طرف راجع ہے، ان کے علم میں ہوا کہ اللہ تمام کائنات کے لئے ذی ارادہ ہے، قدریہ کا اس میں اختلاف ہے اور کہا وہ ان کے لئے محبّ اور مرید بھی ہے پھر کلم کی ان کے مواضع سے تحریف کرنا شروع ہوئے اور کہا: (لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ) کا مطلب ہے کہ (لَا يُرِيْدُ الْفَسَادَ) یعنی مومنین کے لئے وہ اس کا ذی ارادہ نہیں اور نہ وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی ہے یعنی اپنے مومن بندوں کے لئے اس کا ارادہ کرنے والا نہیں، یہ عظیم غلطی ہے، ان کے ہاں یہ اس کہے جانے کے بمنزلہ ہے کہ وہ ایمان سے محبت نہیں کرتا اور وہ اپنے بندوں کے لئے ایمان پر راضی نہیں یعنی کافرین کے لئے اس کا ذی ارادہ نہیں اور نہ ان کے لئے اس پر راضی ہے، اہلِ اسلام متفق ہیں کہ اللہ نے جو اوامر دئے ہیں وہ کبھی مستحب ہوتے ہیں جو اسے پسند ہیں اور کبھی واجب، اس پر ایک جگہ تفصیل سے کلام کی ہے

دوسرا فریق غالط صوفیہ کا ہے جو اسی چشمہ سے سیراب ہوئے ہیں تو اس امر کے شاہد بنے کہ اللہ تمام کائنات کا رب ہے اور جانا کہ وہ ہر شئ پر قادر اور اس کا شائی (یعنی مشیت کرنے والا) ہے اور ظن کیا کہ وہ مقامِ رضا پر نہ ہوں گے حتی کہ ہر اس پر راضی ہو ں جو اللہ کی قضاء وقدر ہے کفر، فسق اور عصیان سے حتی کہ ان کے بعض نے کہا محبت ایک آگ ہے جو سوائے مرادِ محبوب کے دل سے ہر شئ کو جلا دیتی ہے، یہ قائل ہوئے کہ ساری کائنات مراد محبوب ہے، یہ عظیم گمراہی کا شکار ہوئے جب دینی ارادہ اور کونی ارادہ کے مابین تفرقہ نہ کیا اور کونی اور دینی اذن اور کونی اور دینی امر اور کونی اور دینی بعث کے درمیان فرق ملحوظ نہ رکھا، اسی طرح کونی اور دینی ارسال کے درمیان جیسا کہ ایک جگہ اس پر بسط سے بات کی ہے، مآل کار ان کا معاملہ یہ بنا کہ مامور ومحظور، اولیاء واعداء اور انبیاء اور عام متقین

کے مابین فرق روا نہ رکھا اور ایمان اور عملِ صالح والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں کی مانند کیا اور متقین کو فجار اور مسلمین کو مجرمین اور امر ونہی اور وعدو وعید اور شرائع کو معطل کر دیا، بسا اوقات یہ اسے حقیقت کا نام دیتے ہیں، حق یہ ہے کہ یہ کونی حقیقت ہے لیکن اس کونی حقیقت کے تو بت پرست بھی شناور ہیں جیسے کہا:

(وَلَـئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ) [العنکبوت: ۶۱] (اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے زیرِ فرماں کیا؟ تو کہہ دیں گے اللہ نے)

(قُـلْ لِّـمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ)[المؤمنون: ۸۴] (کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کا ہے؟) متعدد آیات، تو مشرک جو بتوں کے پجاری تھے اس بات کے مقر تھے کہ اللہ ہر شئ کا خالق، رب اور ملیک ہے تو جس کی منتہائے تحقیق یہ ہے وہ انہی بت پرستوں کے مثل ہونے کے اقرب ہے، مومن دراصل اللہ ورسول پر ایمان اور ان کے اخبار کی تصدیق، اوامر کی طاعت اور اللہ کی مرضیات کی اتباع کے ساتھ کفر کا مفارق ہے اور ان کا وہ محبّ ہے نہ کہ جو اللہ نے کفر، فسوق اور عصیان کو مقدر و مقضی کیا لیکن وہ پیش آمدہ مصائب پر رضا وتسلیم کا نمونہ بنتا ہے ان مصائب پر نہیں جو خود اس کے ہاتھوں سرزد ہوں، وہ گناہوں پر استغفار اور مصائب پر صبر کرتا ہے، وہ جیسا کہ اللہ نے کہا:

(فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْـبِكَ) (گزری) تو امر کی طاعت اور مصائب پر صبر کا وہ جامع ہے جیسے کہا:

(وَاِنْ تَـصْبِـرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُ هُمْ شَيْئًا) [آل عمران : ۱۲۰] (اور اگر رنج پہنچے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا) اور کہا:

(وَاِنْ تَـصْبِـرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ) [آل عمران : ۱۸۶] (تو اگر صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں) حضرت یوسف نے کہا تھا:

(اِنَّـهٗ مَـنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ)[یوسف : ۹۰] (جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا) یہاں مقصود یہ ہے کہ قشیری نے جو نصر آبادی سے عمدہ کلام ذکر کی ہے جب کہا جو چاہے کہ محلِ رضا تک پہنچے وہ اسے لازم پکڑے جس میں اللہ نے اپنی رضا رکھی ہے، اسی طرح الشیخ ابوسلیمان کا قول کہ بندہ اگر شہوات کو بھول جائے تو وہ مقامِ رضا پر فائز ہو جائے گا کیونکہ رضا اور قناعت سے بندے کے لئے مانع اس کے نفس کا فضول شہوات کو طلب کرنا ہے جب یہ حاصل نہ ہوں تو وہ ناراض ہو جاتا ہے لہذا جب نفسانی شہوات کو بھول جائے گا تو اللہ نے جو اس کی قسمت میں رزق لکھا ہے اسی پر وہ راضی ہو گا، اسی طرح جو انہوں نے ذکر کیا کہ فضیل بن عیاض نے بشر حافی سے کہا تھا رضا دنیا میں زہد سے افضل ہے اسی لیے راضی اپنی منزلت (جو اسے حاصل ہو چکی ہے) سے ما فوق کا متمنی نہیں ہوتا، یہ حسن کلام ہے لیکن مجھے بشر حافی کے فضیل سے سماع میں

شک ہے، اسی طرح جو انہوں نے معلقاً ذکر کیا کہ شبلی نے جنید کی موجودگی میں (لَا حَـوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ) کہا تو جنید بولے تمہارا قول ضیقِ صدر والا ہے اور ضیق صدر رضا بالقضاء کے ترک کی رو سے ہے تو یہ عمدہ کلام ہے، جنید رضی اللہ عنہ سید طائفہ اور تعلیمی، تا دیبی اور تقویمی لحاظ سے ان کے احسن حضرات میں سے ہیں

تفصیل یہ ہے کہ یہ کلمہ استعانت ہے، نہ کہ کلمہ استر جاع (یعنی جسے کسی دکھ اور پریشانی کے وقت پڑھا جانا سمجھا جائے) جبکہ کثیر لوگ اسے مصائب کے وقت بمنزلہ استر جاع کے بولتے ہیں اور پھر جزعاً اسے بولتے ہیں نہ کہ صبراً تو جنید نے شبلی پر ان کے یہ کلمہ بولنے کے سبب سے ان کے حال کا انکار کیا کیونکہ یہ حالِ رضا کے منافی تھا، اگر انہوں نے وجہِ مشروع پر اسے کہا ہوتا تب انکار نہ کرتے، ان کے اس رسالہ میں مزید ضعیف آثار بھی موجود ہیں، مثلا جو معلقاً ذکر کیا کہ کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے الٰہ ! مجھے کوئی ایسا عمل بتلا اگر میں اسے کروں تو تیری رضا مجھے حاصل ہو جائے، فرمایا تجھ میں اس کی طاقت نہیں، حضرت موسیٰ سجدہ میں گر پڑے اور گریہ زاری کرنے لگے تو اللہ نے ان کی طرف وحی کی اے ابن عمران: (رِضَـائِـیْ فِیْ رِضَـاكَ عَـنِّـیْ) (میری رضا یہ ہے کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے) تو یہ اسرائیلی حکایت ہے جو محلِ نظر ہے کیونکہ کہا جا سکتا ہے اس جیسی حکایت حضرت موسیٰ کے شایانِ شان نہیں اور معلوم ہے کہ اسرائیلی روایات و حکایات بلا اسناد ذکر و بیان کی جاتی ہیں، ہمارے دین کی کسی شئ میں ان کے ساتھ حجت قائم نہیں ہو سکتی الا یہ کہ ہم تک نقلِ صحیح کے بطور پہنچی ہوں، مثلا ہمارے نبی نے بیان کی ہوں لہذا اکثر اسرائیلی حکایات محلِ نظر ہیں جن میں یہ مذکورہ بالا بھی ہے، حضرت موسیٰ تو اولوالعزم رسل اور اکابر مسلمین میں سے ہیں تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان میں طاقت اور تاب نہ تھی کہ ایسے اعمال کریں جو اللہ کو ان سے راضی کر دیں جبکہ اللہ تعالی نے سابقین اولین مہاجرین و انصار بارے کہا کہ میں ان سے راضی ہوا تو اپنے کلیم کو اس کی رضا حاصل نہ ہوئی ہو گی؟ فرمایا:

(اِنَّ الَّـذِیْـنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ جَـزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَـحْتِهَـا الْاَنْهٰـرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ) [البینة : ۷ ـ ۸] (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ہمیشہ ان میں رہیں گے اللہ ان سے خوش اور وہ اس سے خوش) اور موسیٰ تو ان کے افاضل میں سے تھے پھر اللہ نے تو رضا سے فائق مزیت کے ساتھ حضرت موسیٰ کو خاص کیا تھا جب کہا:

(وَاَلْـقَیْـتُ عَـلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ) [طٰه : ۳۹] (اور میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی اور اس لئے کہ تم میری آنکھ کے سامنے پرورش پاؤ) پھر (یَا ابْنَ عِمْرَان) کہہ کر انہیں مخاطب کرنا اس اندازِ تخاطب کے برخلاف ہے جو قرآن میں ان کی نسبت مذکور ہوا جو عموما (یَا مُـوْسیٰ) ہے تو یہ ایک نوعِ عتاب ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور جیسے ذکر کیا گیا کہ حضرت عمر

نے ابوموسی اشعری کو خط میں لکھا: اما بعد! خیر سب کی سب رضا میں ہے اگر اس کی استطاعت رکھوتو ضرور کرو بصورتِ دیگر صبر کروتو یہ حسن کلام ہے اگر چہ اس کی سند معلوم نہیں، جب واضح ہوا کہ جو کچھ قشیری نے اس رسالہ میں مسنداً، مرسلاً اور معلقاً ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ صحیح اور کچھ غیر صحیح ہےتو ابوسلیمان سے یہ مذکورہ بالا قول مرسلاً ذکر کیا ہے، بالاتفاق ابوسلیمان سے اس طرح کا منقول ثابت نہ سمجھا جائے گا تو اگر چہ بعض حضرات کا قول ہے کہ مرسل حجت ہے لیکن اس کی بابت یہ معلوم نہیں کہ یہ ضعیف کی مثل ہے یا غیر ضعیف کی مثل تو جب اس کا علم ہو جائے تو علماء کے بالاتفاق یہ حجت کے بطور باقی نہ رہے گا، اس کی مانند جس کے بارہ میں علم ہوا کہ کبھی تو وہ اسناد کو یاد رکھتا ہے اور کبھی اس میں غلطی کر جاتا ہے

ان مشائخ کی اخبار وکلام بارے مسند کتب مثلا ابونعیم کی (حلیۃ الاولیاء) ابوعبدالرحمٰن کی (طبقات الصوفیۃ) اور ابن جوزی کی (صفوۃ الصفوۃ) اور ان کے امثال تو ان میں یہ مقولہ ابوسلیمان ہذا سے نقل نہیں کیا گیا، تم دیکھتے نہیں کہ جو ان سے مسنداً روایت کیا ہے جب کہا انہوں نے احمد بن ابوالحواری سے کہا اے احمد مجھے رضا سے ایسا حظ ونصیب عطا ہوا ہے کہ اگر مجھے آگ میں بھی ڈال دے تو میں اس پر بھی راضی رہوں تو یہ کلام ابوسلیمان سے اسناد کے ساتھ ماثور ہے، قشیری نے اپنے شیخ ابوعبدالرحمٰن سے اسے مسند کیا ہے بخلاف اس مقولہ کے تو اسے ان سے مسند نہیں کیا، لہذا ابوسلیمان سے اس کی کوئی اصل نہیں پھر قشیری نے ابوسلیمان سے اس کلمہ ثانیہ کو اس سے احسن کلام کے ساتھ مقرون کیا ہے تو اس کی روایت کرنے سے قبل لکھتے ہیں: ابوعثمان حیری نیشاپوری سے نبی اکرم کے قول: (اَسْأَلُکَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ) بارے سوال ہوا تو کہنے لگے اس لئے کہ بعد از قضاء رضا ہی تو اصل رضا ہے، تو یہ جو ابوعثمان نے کہا حسن اور سدید کلام ہے پھر اس کے بعد ابوسلیمان سے مسند کیا کہ کہا مجھے امید ہے کہ مجھے رضا سے ایک چیز کی معرفت حاصل ہو چکی ہے کہ اگر مجھے آگ میں بھی ڈال دے تو اس پر بھی راضی رہوں، تو اس سے واضح ہوا کہ ابوسلیمان نے جو کہا وہ رضا نہیں ہے بلکہ وہ رضا کا عزم ہے، رضا دراصل بعد از قضاء ہوتی ہے اور اگر یہ عزم ہے تو عزم کبھی دائم رہتا ہے اور کبھی منفسخ ہو جاتا ہے اور عزائم کا انفساخ کس قدر کثیر ہے، بالخصوص صوفیہ کے عزائم، اسی لئے ان کے بعض سے کہا گیا آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ تو کہا ارادوں کے ٹوٹ جانے اور عزائم منفسخ ہونے سے، اللہ تعالی نے ان سے مخاطب ہوکر کہا جو ان مشائخ سے افضل تھے:

(وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ)[آل عمران: ۱۴۳](اور تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے پس تم نے اُس کو آنکھوں سے دیکھ لیا) اور کہا:

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ) [الصف: ۲-۴] (مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟۔ اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں پرے جما

کرلڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں) ترمذی میں ہے کہ بعض صحابہ نے نبی اکرم سے کہا اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ اللہ کو کون سا عمل محبوب ترین ہے تو ہم وہ عمل کریں تو اللہ نے یہ آیت نازل کی اور وہ کہہ چکا ہے:

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ) [النساء : ۷۷] (بھلا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہو پھر جب اُن پر جہاد فرض کر دیا گیا تو بعض لوگ اُن میں سے لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بڑبڑانے لگے کہ اے اللہ! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا تھوڑی مدت اور ہمیں کیوں مہلت نہ دی) الآیۃ، تو ان لوگوں نے عزم جہا کیا ہوا تھا اور اس بارہ میں جوش و جذبہ کا اظہار کرتے رہتے تھے لیکن جب اس کے ساتھ آزمائے گئے تو ناپسند لگا اور راہِ فرار اختیار کر لی اور جہاد کی الم کا نار کی الم سے کیا نسبت؟ اللہ کے عذاب کی سہنے کی کس میں تاب ہے؟ اس کا مثل سمنون عاشق کی بابت نقل کرتے ہیں کہ وہ لہک لہک کر یہ شعر پڑھتا رہتا تھا:

وَلَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ فَكَيْفَمَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِيْ

(ص:۱۵۶ میں گزرا) تو ایک دفعہ یہی کہتا جا رہا تھا کہ اسے عسرِ بول نے آ پکڑا (یعنی اس کا پیشاب بند ہو گیا) تو وہ مکتب مکتب گھومتا اور بچوں میں اخروٹ تقسیم کرتا اور کہتا اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو، ابونعم اصفہانی نے ابوبکر واسطی کے حوالے سے بیان کیا کہ سمنون نے کہا اے رب تو جس بھی شیٔ سے مجھے آزمالے میں ہر حال میں راضی برضا ہوں، تو چودہ دن اس کا پیشاب بند رہا، وہ اس طرح تکلیف سے بل کھاتا تھا جیسے سانپ کھاتا ہے، آخر پیشاب آیا تو کہا اے رب میری توبہ، ابونعیم لکھتے ہیں تو جس رضا کا سمنون نے ادعاء کیا ایک ادنی سی آزمائش سے اس کا پول کھل گیا حالانکہ سمنون وہ شخص ہے کہ اس کی شخصیت عشقِ الٰہی میں ضرب المثل ہے، محبت میں اس کا مقام مشہور ہے حتی کہ ابراہیم بن فاتک راوی ہیں کہ میں نے سمنون کو حرم میں وعظ کرتے دیکھا تو اس دوران ایک چھوٹا سا پرندہ قریب ہوتا ہوتا اس کے ہاتھ پر آ کر بیٹھا پھر مسلسل زمین میں ٹھونگے مارتا رہا حتی کہ خون بہنے لگا اور اس کی موت واقع ہو گئی، کہتے ہیں ایک دفعہ محبتِ الٰہی پر اسے تقریر کرتے دیکھا تو حالت یہ ہوئی کہ مسجد کے چراغ لہرائے اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے (یعنی زبان میں اتنی تاثیر تھی)

قشیری نے باب الرضا میں سمنون کے رفیق رویم المقریٔ بارے ایک حکایت ذکر کی ہے جو اس کے مناسب ہے، لکھتے ہیں رویم نے کہا اگر مقامِ رضا پر فائز کے داہنی جانب جہنم کر دی جائے تو وہ اللہ سے یہ دعا نہ کرے گا کہ اسے اس کی بائیں طرف کر دیا جائے تو یہ سمنون کے اس قول سے مشابہ ہے کہ جیسے چاہے میرا امتحان لے لے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بندشِ بول پر صبر کی طاقت نہ رکھ سکا تو جہنم کی آگ کے اپنی داہنی جانب ہونے کو کیا سہہ سکے گا؟ فضیل بن عیاض ان سے اعلیٰ طبقہ کے تھے، انہیں بندشِ بول کی شکایت ہوئی تو

اتنی تکلیف غالب ہوئی کہ چیخ اٹھے اے اللہ تمہیں میری محبت کا واسطہ اسے دور کر، تو اللہ نے اسے دور کر دیا، رویم اگر چہ جنید کے رفقاء میں سے تھے مگر ان کے نزدیک وہ اس طبقہ کے نہیں بلکہ صوفیہ کہتے ہیں انہوں نے تصوف چھوڑ کر دنیا سے رجوع کر لیا تھا حتی کہ جنید کے تلمیذ جعفر خلدی سے منقول ہے کہ کہا جو چاہے کہ راز کو چھپائے رکھے وہ ضرور وہ کرے جو رویم نے کیا کہ اس نے چالیس سال دنیا کی محبت چھپائے رکھی، کہا گیا یہ کیونکر متصور ہو؟ بولے اسماعیل بن اسحاق نے بغداد کا منصبِ قضاء سنبھالا اور دونوں کے مابین گہری دوستی تھی تو اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اپنا سیکرٹری بنا لیا تو انہوں نے تصوف ترک کیا، ریشمی اور فاخرانہ ملبوسات پہنے اور مرغن غذائیں کھانے لگے اور اپنے لئے ایک محل بنالیا، دراصل اس نے دنیا کی محبت کا کتمان کیا تھا کیونکہ انہیں وہ ملی ہی نہ تھی لیکن جب ملی تو اپنی اصل دکھلا دی اور یہ اس امر کے باوصف کہ وہ۔رحمہ اللہ۔عبادات کے ساتھ معروف تھے اور وہ داؤد کے مذہب (یعنی طریقت) پر تھے

یہ کلمات جو ایک صاحبِ حال سے صادر ہوئے ان کے اقوال کے لوازم اور عواقب بارے تفکیر نہیں کی گئی، اسے طریقت اور سبیل نہ بنایا جائے البتہ ان کے ساتھ اس رضا و محبت پر استدلال ہوسکتا ہے جو اس صاحبِ کلمات کے حظ ونصیب میں ہے اور اس تقصیر پر بھی جو طریقت کے حقوق کی معرفت میں ان سے ہوئی اور جو تقوی وصبر ان پر مقدر ہوا اور جو نہ ہوا، رسل کرام اللہ کی سبیل کے طریق کے اعلم، اہدیٰ اور انصح تھے تو جو ان کی سنت وسبیل سے خارج ہوا وہ منقوص، خطا کار اور محروم ہے اگر چہ عاصی یا فاسق یا کافر نہ بھی ہو، اس سے مشابہ وہ اعرابی صحابی جس کے پاس نبی اکرم گئے اور وہ بوجہِ مرض پرندے کا بوٹ بنے ہوئے تھے، آپ نے پوچھا کیا تم اللہ سے کوئی خاص دعا کیا کرتے تھے؟ عرض کی میں کہتا تھا اے اللہ جو تو نے مجھے آخرت میں عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے لے، فرمایا سبحان اللہ! بھلا تم میں اسے سہنے کی تاب ہے؟ کیوں نہ یہ کہا: (رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ) [البقرة : ۲۰۱] تو ان کی اس دعا کا باعث بھی عذابِ نار سے ان کا خوف بنا اور اپنی عاقبت کی سلامتی سے محبت نے انہیں آمادہ کیا کہ دنیا ہی میں اس کی تعجیل چاہ لیں اور وہ یہ مذکورہ دعا کرنے میں غلطی پر تھے

حسنِ قصد اور سلامتِ قصد، آدمی کی صلاح اور اس کے اہلِ فضل ودین وزہد اور صاحبِ ورع وکرامات ہونے کے باوجود اس قسم کی غلطی کا صدور بکثرت ہوا ہے، **ولی اللہ ہونے کی شروط سے نہیں** کہ وہ خطا اور غلطی سے خالی ہو بلکہ نہ یہ کہ گنا ہوں سے خالی ہو، رسل کے بعد افضل الاولیاء جنابِ صدیق اکبر ہیں اور ان کی بابت منقول ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم کے سامنے ایک خواب کی تعبیر کی تو آپ نے فرمایا کچھ تعبیر درست اور کچھ غلط کی ہے، لگتا۔ واللہ اعلم ۔ یہ ہے کہ ابوسلیمان نے جب یہ بات کہی کہ اگر مجھے آگ میں ۔۔ الخ تو کچھ حضرات نے اپنے حسبِ فہم اسے آگے نقل و بیان کر دیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ سے جنت کا سوال (اور دعا) نہ کرو اور نہ دوزخ سے اس کی پناہ چاہو، یہ کلمہ جو ابوسلیمان نے کہا اگر چہ یہ ان کی اس پر رضا پر دلالت نہیں کرتا لیکن اس کے ساتھ رضا کے عزم پر دال ہے تو ہمیں علم ہے کہ یہ عزم دائمی اور مستمر نہیں بلکہ منفسخ ہو جاتا ہے! بہر حال اس کلمہ کا ترک

بنسبت اس کے کہنے کے احسن ہے اور یہ کلمہ متدرکہ ہے جیسے سمنون اور رویم وغیرہما کا دعوی متدرک ہے کہ اس اور اس کلمہ کے ما بین عظیم فرق ہے، تو اس کلمہ کا مضمون یہ ہے کہ جس نے اللہ سے جنت کا سوال کیا اور دوزخ سے پناہ مانگی وہ راضی برضا نہیں اور یہ کہنے کے مابین فرق ہے کہ اگر یہ ہوتو میں اس پر راضی ہوں اور اس کے مابین کہ کہے وہ راضی نہ ہوگا مگر جو طالبِ خیر اور شر سے ہا رب نہ ہو، اس اور اس کے غیر کے ساتھ معلوم ہوا کہ الشیخ ابوسلیمان کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اس قسم کی بات کریں، وہ جلیل القدر مشائخ، ان کے سادات اور شریعت کے اتبع حضرات میں سے تھے

حتی کہ ان کا قول ہے کہ لوگوں کے نکات میں سے کسی نکتہ کا جب میرے دل سے گزر ہوتا ہے تو میں اسے قبول نہیں کرتا مگر دو گواہوں کے ساتھ، یعنی کتاب وسنت، تو بھلا ایسا شخص یہ بات کہہ سکتا ہے؟ ان کا یہ بھی قول ہے کہ جس کے دل میں کوئی الہامِ خیر ہوا تو یہ نہیں کہ فی الفور کر گزرے حتی کہ اس بارے کوئی اثر سن لے، اگر ایسا ہو تو یہ نور علی نور ہے، ان کے شاگرد احمد بن ابوالحواری سنت کے متبع ترین لوگوں سے تھے تو ان کا کیا کہنا؟ ابوسلیمان کی اس کلام سے تزکیہ کی تمامیت مقامِ ثانی بارے کلام سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ کسی قائل۔ جو بھی یہ ہے۔ کا قول کہ رضا یہ ہے کہ تم اللہ سے نہ جنت کا سوال کرو اور نہ دوزخ سے اس کی پناہ مانگو، اس سے قبل ہم ایک مقدمہ پیش کرتے ہیں جس سے اس اشتباہ واضطراب کی اصل واضح ہوگی جس کا اس قسم کے کلمات میں وقوع ہوا

وہ یہ کہ **متفقہہ ،صوفیہ اور متکلمہ وغیرہم میں سے کثیر حضرات نے ظن کیا** کہ جنت مخلوق ہے اور یہ اکل وشرب، نکاح ولباس، اصوات طیبہ اور پاکیزہ خوشبوئیں سونگھنے کے ساتھ تنعُّم کا نام ہے، انہیں مسمیٰ جنت میں ان کے علاوہ کسی اور نعمت کا دخل دکھائی نہیں دیتا پھر یہ دو گروہوں میں تقسیم ہوئے، ایک گروہ نے انکار کیا کہ مومنوں کو رب تعالی کا دیدار عطا ہوگا جیسا کہ معتزلہ وغیرہم سے جہمیہ کا یہ موقف ہے، بعض نے دیدار کا اقرار کیا، یا تو وہ دیدار جس کی نبی اکرم نے خبر دی ہے جو کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے یا ایسا دیدار جسے یہ زیادتِ کشف یا علم کے ساتھ مفسر کرتے ہیں یا اسے چھٹی حس کے ساتھ قرار دیتے ہیں اور اس طرح کے اقوال جنہیں ضرار بن عمرو اور رؤیتِ باری تعالی کے مسئلہ میں اہلِ سنت کی حمایت کرنے کے مدعی اہلِ کلام نے اختیار کیا اگرچہ یہ جس کا اثبات کر رہے ہیں یہ اسی جنس سے ہے جس کی معتزلہ اور ضراریہ نے نفی کی ہے اور نزاع ان کے مابین لفظی ہے جبکہ اہلِ سنت کے ساتھ ان کا نزاع معنوی ہے، اسی لئے بشر اور اس کے امثال رؤیت کی انہی حضرات کی تفسیرات میں سے کسی تفسیر کے نحو مفسر کرتے تھے

یہاں مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ان میں سے مثبتینِ رؤیت میں سے بعض نے اس امر کا انکار کیا کہ مومن اپنے رب کی نفسِ رؤیت کے ساتھ سرفراز ہو، ان کا کہنا ہے کہ محدث اور قدیم کے درمیان کوئی مناسبت نہیں جیسا کہ استاذ ابوالمعالی جوینی نے رسالہ نظامیہ میں لکھا اور جیسے ابوالوفاء بن عقیل نے اپنی بعض کتب میں اس کا ذکر کیا، ابن عقیل بارے نقل کیا کہ ایک آدمی کو کہتے سنا : (اَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلٰى وَجْهِكَ) (میں تجھ سے تیرے دیدار کی لذت کا سوالی ہوں) تو کہا اے شخص فرض کر واس کے لئے

چہرہ ہےتو کیا وہ ایسا چہرہ ہے جس کی طرف دیکھنے کے ساتھ تلذُّذ حاصل ہوتا ہے؟ ابو معالی نے ذکر کیا کہ اللہ تعالی ان کے لئے رؤیت کے مقارن بعض مخلوقات کے ساتھ نعیم خلق کرے گا، جہاں تک نفسِ رؤیت کے ساتھ نعیم تو اس کا اس نے انکار کیا اور اسے توحید کے اسرار سے باور کیا، اکثر مثبتین رؤیت اہلِ ایمان کے دیدارِ الٰہی کے ساتھ تنعُّم کا اثبات کرتے ہیں اور یہی امت کے سلف اور ائمہِ دین اور مشائخِ طریقت کا مذہب تھا جیسا کہ نسائی وغیرہ کی حدیث میں نبی اکرم کی ایک دعا کے یہ الفاظ منقول ہیں: (اَللّٰھُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَیْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَی الْخَلْقِ اَحْیِنِیْ اِذَا کَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْراً لِیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْراً لِیْ اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ اَسْأَلُكَ خَشْیَتَكَ فِی الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ وَ اَسْأَلُكَ کَلِمَۃَ الْحَقِّ فِی الْغَضَبِ وَ الرِّضَا وَ اَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنیٰ وَ اَسْأَلُكَ نَعِیماً لَا یَنْفَدُ وَقُرَّۃَ عَیْنٍ لَا تَنْقَطِعُ وَ اَسْأَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَ بَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ اَسْأَلُكَ لَذَّۃَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْھِكَ وَ اَسْأَلُكَ الشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِكَ مِنْ غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّۃٍ وَلَا فِتْنَۃٍ مُضِلَّۃٍ اَللّٰھُمَّ زَیِّنَّا بِزِیْنَۃِ الْإِیْمَانِ وَ اجْعَلْنَا ھُدَاۃً مُّھْتَدِیْنَ) (اسی کے ص: ۲۵ میں مع ترجمہ گزری ہے) صحیح مسلم میں وغیرہ حضرت صہیب کے حوالے سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جب جنتی جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک منادی ندا دے گا اے اہلِ جنت اللہ کے ہاں تمہارے لئے ایک وعدہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اب اسے پورا کردے، وہ کہیں گے اب کیا باقی ہے؟ کیا ہمیں جنت میں داخل کر کے اور آگ سے نجات دے کر مالا مال نہیں کر دیا؟ فرمایا تو حجاب ہٹایا جائے گا تو وہ رب تعالی کا دیدار کریں گے تو لگے گا کہ اس سے پیاری کوئی شئ انہیں عطا نہیں کی تھی

شئ جس قدر محبوب ہو اس کے حاصل ہونے کے ساتھ لذت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، اس پر سلف ائمہ اور مشائخِ طریقت کا اتفاق ہے جیسا کہ حسن بصری سے مروی ہے کہ کہا اگر عابدوں کو پتہ چلے کہ آخرت میں انہیں رب کا دیدار نہ ہوگا تو دنیا میں مارے شوق کے ان کے نفوس گھل جائیں، اس بارے ان کی کلام کثیر ہے، پھر یہ جنہوں نے سلف ائمہ اور مشائخ کی اللہ تعالی کے دیدار کے ساتھ تنعم پر موافقت کی ہے انہوں نے مسئلہِ محبت میں تنازع کیا جو اس کی اصل ہے، تو بعض حضرات کا موقف ہے کہ یہ محبت اللہ کے نفس و ذات سے نہیں بلکہ یہ تو اس کی طاعت اور عبادت سے محبت ہے، یہ بھی کہا کہ اللہ بھی اپنے مومن بندوں کی ذوات سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کی ان کے لئے محبت سے مراد ان پر اس کا ارادہِ احسان اور انہیں ولایت عطا کرنا ہے، اس قول کو ان حضرات نے بھی اختیار کیا جو اہلِ کلام سے سنت کی حمایت کی طرف منتسب ہوئے حتی کہ اس میں مالک، شافعی اور احمد کے اصحاب میں سے بھی کئی واقع ہوئے، مثلا قاضی ابوبکر، قاضی ابویعلی، ابو معالی جوینی اور ان کے امثال

یہ فی الحقیقت تجہُّم اور اعتزال کا ایک شعبہ ہے، اسلام میں محبت کا اولین منکر جعد بن درہم ہے جو جہم بن صفوان کا استاذ تھا، اسی پاداش میں وہ امیرِ عراق خالد بن عبداللہ قسری کے ہاتھوں عین عیدِ قربان کے روز قتل ہوا، اس نے خطبہِ عید میں کہا اے لوگو اللہ

تمہاری قربانیاں قبول کرے، میں تو جعد بن درہم کی قربانی کرنے لگا ہوں کیونکہ اس کا زعم ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہم کو خلیل نہیں بنایا اور نہ حضرت موسی سے تکلیم کی، پھر اترا اور اسے ذبح کر دیا، کتاب وسنت جس پر دال ہے اور جس پر امت کے سلف، ائمہ اور مشائخ طریق کا اتفاق ہوا، یہ ہے کہ اللہ تعالی محبت کرتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے، اس پر ان سے اہلِ کلام کے متصوفین نے موافقت کی مثلا ابوقاسم قشیری، ابو حامد غزالی اور ان کے امثال، احیاء وغیرہ میں ابو حامد نے اس کی حمایت کی، اسی طرح ابو قاسم نے اس کا ذکر (الرسالة) میں کیا صوفیاء کے طریق پر جیسا کہ ابو طالب کی کتاب (قوت القلوب) میں ہے، ابو حامد نے۔ حالانکہ وہ اس میں صوفیاء کے متابع ہیں۔ اسے اپنی دلیل بنایا جسے فلاسفہ کی کتب میں پایا، اس کے نحو کا اثبات کیا، لکھتے ہیں وہ عشق کرتا ہے اور اس سے عشق کیا بھی جاتا ہے، کبار قواعد میں اس عظیم مسئلہ پر ایک جگہ تفصیل سے بات کی ہے، اللہ کا فرمان ہے:

(يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ)(وَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ) (أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ)(تینوں گزریں) صحیحین میں ہے نبی پاک نے فرمایا: تین چیزیں جس میں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پالے گا: جسے اللہ اور اس کا رسول اپنے ہر ما سوا سے بڑھ کر محبوب ہوں اور جو کسی سے اگر محبت کرے تو اللہ کی خاطر کرے اور جسے کفر میں واپس جانا بعد اس کے کہ اللہ نے اس سے نجات دے دی ہے ایسے برا لگے جیسے آگ میں ڈالا جانا، یہاں مقصود یہ ہے کہ معتزلہ کے ان متجہمین اور ان کے موافقین جنہوں نے حقیقتِ محبت کا انکار کیا، کولازم آتا ہے کہ اللہ تعالی کے دیدار کے ساتھ تلذذ کا بھی انکار کریں لہذا ان کے نزدیک حقیقتِ تنعم نہیں مگر اکل وشرب وغیرہ کے ساتھ اور یہ قول کتاب وسنت اور امت کے سلف اور مشائخ کے بالاتفاق باطل ہے، تو یہ دو غالط گروہوں میں سے ایک ہوا

دوسرا گروہ متصوفہ، درویشوں اور زاہدوں کے کئی حضرات پر مشتمل ہے جنہوں نے ان کی اس امر پر موافقت کی ہے کہ جنت نہیں مگر یہی امور جن کے ساتھ مخلوق متنعم ہوگی لیکن انہوں نے سلف اور ائمہ کی رؤیتِ باری تعالی اور اس کے دیدار کے ساتھ تنعم کے اثبات پر موافقت کی ہے اور اس میں یہ صائب ہیں اور وہ اس نعیم کے طالب بنے اور اس کی طرف اپنی ہمت کو منسوب کیا اور اس کے حرمان سے ڈرے، ان کا کوئی یہ مقولہ کہتا ہے: میں نے تیری عبادت تیری جنت کے شوق یا تیرے دوزخ کے خوف سے نہیں کی لیکن اس لئے کہ تیرا دیدار کروں اور تیرے اِجلال کی وجہ سے، اس قسم کے کلمات سے ان کا مقصود اکل وشرب اور تمتع بالمخلوق سے اعلی ہے لیکن اس کے جنت سے اخراج میں انہوں نے غلطی کی اور کبھی اپنے اس ظن میں بھی کہ وہ بلا حظ وارادت اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور ہر جس کی اس سے طلب ہے وہ حظِ نفس ہے، توھُّم کیا کہ بشر بلا ارادہ مطلوب اور بلا محبوب بھی عمل کرتا ہے، یہ ایمان، دین اور آخرت کی حقیقت کی سوئے معرفت ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنے مطلوب، محبوب اور معبود سے متعلق مسلسل سوچ وفکر انہیں اپنے نفس سے فنا کر دیتی ہے حتی کہ اپنے نفس اور اس کے ارادہ کا انہیں شعور ہی نہیں ہوتا تو ظن کرتا ہے کہ وہ اپنی مراد کے غیر کے لئے عمل کرتا ہے اور جسے طلب کیا اور اپنی ھمت کو اس کے ساتھ معلق کیا وہ اس کی مراد، مطلوب اور محبوب کی غایت ہے اور یہ کثیر صالحین، صادقین اور اربابِ

مقامات واحوال کے حال کی مانند کہ جن کے کسی کے لئے وجدِ صحیح اور ذوقِ سلیم ہوتا ہے لیکن اس کے لئے ایسی عبارت نہیں ہوتی جو اس کی کلام کی تبیین کرے تو اس کی کلام اپنے صحتِ مقصود کے باوجود غلطی اور سوئے ادب کا مرقع بن جاتی ہے اگر چہ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کے مراد واعتقاد کے شناور ہوتے ہیں، تو یہ جنہوں نے اس جیسی کلام کہی، جب ان کی اس سے مراد اللہ تعالی کی رؤیت کی طلب ہو تب تو ٹھیک اور صائب ہے لیکن انہوں نے اس جہت سے غلطی کی کہ اسے خارج از جنت کر دیا تو یوں اسمِ جنت کی حرمت کا اسقاط کر دیا اور اس سے کئی منکر امور کا لزوم ہوا، اس کی نظیر جو شبلی بارے منقول ہے کہ ایک شخص کو سنا یہ آیت پڑھ رہا تھا:

(مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ) [آل عمران : ۱۵۲] (بعض تو تم میں سے دنیا کے طلبگار تھے اور بعض آخرت کے طالب) تو چیخا اور کہا: (اَيْنَ مُرِيْدُ اللّٰهِ ؟) (اللہ کا مرید۔ارادہ کرنے والا۔کہاں ہے؟) تو اس سے یہ بات قابلِ حمد ہے کہ اللہ کا ارادہ کیا لیکن اپنے اس ظن میں خطا کا مرتکب ہوا کہ جنہوں نے ارادۂ آخرت کہا انہوں نے اللہ کا ارادہ نہیں کیا جبکہ یہ آیت ان صحابہ کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو احد میں نبی اکرم کے ساتھ تھے اور وہ افضل الخلق ہیں، اگر انہوں نے ہی اللہ کا ارادہ نہیں کیا تو کیا جو ان سے رتبہ میں کمتر ہیں وہ کیا اللہ کے مرید ہوں گے؟ شبلی اور اس کے امثال؟ اسی کا مثل جو میرے علم میں ہے کہ بعض مشائخ سے قولہ تعالی:

(اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ) [التوبة : ۱۱۱] (اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لئے ہیں عوض میں اُن کیلئے جنت ہے، یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں) بارے سوال ہوا تو گویا ہوئے جب نفوس و اموال تو جنت کی قیمت ہیں تو دیدار کا حصول و نیل کس کے ساتھ ہوگا؟ تو ایک جواب دینے والے نے اسی کے مشابہ جواب دیا جو اوپر ذکر کیا، واجب ہے کہ ہر کوئی جان لے کہ اللہ نے جو اپنا دیدار اور دیگر نعمتیں اپنے اولیاء کے لئے تیار کی ہیں وہ سب جنت میں ہیں جیسے ہر جس کی اللہ تعالی نے اپنے اعداء کو وعید کی وہ دوزخ میں ہے، فرمایا:

(فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ) [الم السجدة : ۱۷] (کوئی متنفس نہیں جانتا کہ اُن کیلئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے یہ اُن اعمال کا صِلہ ہے جو وہ کرتے تھے) ایک صحیح حدیث میں ہے نبی اکرم نے فرمایا اللہ فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کیا ہے جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، نہ کسی کان نے ویسا سنا اور نہ کسی بشر کے ذہن وقلب میں اس کا تصور وخیال تک آیا اور معلوم امر ہے کہ یہ سب جنت کا حصہ ہے، اہلِ جنت کے متفاوت درجات ہیں جیسے کہا:

(اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا) [الإسراء : ۲۱] (دیکھو ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور آخرت درجوں میں بہت برتر اور برتری میں کہیں بڑھ کر ہے) بندے کے لئے

دعا یا عبادت وغیرہ کے ساتھ آخرت کے مطالب میں سے ہر مطلوب جنت ہی میں ہے، جنت کی طلب اور آگ سے پناہ چاہنا اللہ کے انبیاء ورسل کا طریق ہے اور اس کے تمام سابقین مقربین اور اصحاب الیمین اولیاء کا، جیسا کہ سنن میں ہے کہ نبی اکرم نے ایک صحابی سے پوچھا تم اپنی دعا میں کیا کہہ رہے ہو؟ وہ بولے میں کہہ رہا ہوں اے اللہ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور آگ سے پناہ مانگتا ہوں، عرض کی بات یہ ہے کہ میں آپ اور معاذ (بن جبل) جیسی حسنِ عبارت اور لفاظی تو نہیں کرسکتا، آپ نے فرمایا ہماری لفاظی اور حسنِ عبارت بھی انہی دو (دعاؤں) کے گرد گھومتی ہے، تو خبر دی کہ آپ اور حضرت معاذ جو کہ مدینہ میں عہدِ نبوی کے افضل ترین امامِ راتب تھے (یعنی با قاعدہ، موجودہ اصطلاح میں راتب تنخواہ دار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) جنت کے لئے متنوع عبارات کے ساتھ طلب اللہ کے سامنے پیش کرتے تھے، کیا کسی کا قول نبی اکرم اور معاذ کے قول سے فائق ہوسکتا ہے اور ان مہاجرین وانصار کے قول سے جو آپ دونوں کے پیچھے نماز پڑھتے تھے؟ اہلِ جنت کی دو انواع ہیں: ایک سابقین مقربین اور دوم ابرار اصحاب الیمین، فرمایا:

(کَلَّآ اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا عِلِّیُّوْنَ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ) [المطففین: ۱۸۔ ۲۱] (سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علّیّن میں ہیں۔ اور تم کو کیا معلوم کہ علّیّن کیا ہے؟۔ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ جس کے پاس مقرب حاضر رہتے ہیں) ابن عباس کا قول ہے کہ اصحابِ یمین کو یہ مذکورہ جام خلیط کر کے دیا جائے گا جبکہ سابقین اسے بغیر خلیط پئیں گے، صحیح میں ثابت ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جب اذان سنو تو جو موذن کہہ رہا ہے تم بھی اس کے پیچھے کہتے رہو، پھر مجھ پر درود پڑھو کہ جس نے ایک دفعہ مجھ پر درود پڑھا اللہ اس پر دس رحمتیں بھیجے گا پھر اللہ سے میرے لئے وسیلہ کا سوال کرو، یہ جنت میں ایک مقام ہے جو کائنات کے صرف ایک بندے کو عطا ہوگا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں گا تو جس نے میرے لئے اللہ سے وسیلہ کی دعا کی روزِ قیامت میری اس کیلئے شفاعت حلال ہوئی، تو اس وسیلہ کے بعد خارج از جنت کوئی اس سے اعلیٰ مقام ہوسکتا ہے جو مخلوقین کو ملنا ہو؟

صحیح کی ان فرشتوں بارے حدیث میں ہے جو زمین میں چل پھر کر ذکر کی مجالس تلاش کرنے پر مامور ہیں کہ رب تعالیٰ سے جا کر کہتے ہیں ہم نے انہیں پایا کہ وہ تیری تسبیح، حمد اور تکبیر کر رہے تھے، فرمایا اللہ پوچھتا ہے وہ کیا مانگ رہے تھے؟ کہتے ہیں جنت مانگ رہے تھے، کہتا ہے کیا اسے دیکھا ہے؟ کہتے ہیں نہیں، فرمایا کیا حال ہوا گر اسے دیکھا ہوا ہو؟ کہتے ہیں پھر ان کی طلب میں شدت ہو، کہتا ہے کس شئ سے پناہ مانگ رہے تھے؟ عرض کرتے ہیں دوزخ سے، کہتا ہے کیا اسے دیکھا ہے؟ عرض کی نہیں، فرمایا کیا حال ہوا گر اسے دیکھا ہو؟ کہتے ہیں پھر ان کی طلبِ پناہ میں اور شدت ہو، اس پر اللہ کہتا ہے گواہ ہو جاؤ میں وہ کچھ انہیں عطا کر دیا جو وہ طلب کرتے تھے اور اس سے انہیں پناہ دے دی جس سے پناہ مانگ رہے تھے، اس پر فرشتے کہتے ہیں ان میں تو فلاں گناہگار بندہ بھی تھا جو کسی کام سے ادھر آ نکلا تھا تو ان کے ساتھ بیٹھ گیا، فرمایا اللہ کہتا ہے یہ وہ اہلِ مجلس ہیں کہ ان کا کوئی ہم نشین بدقسمت نہیں ہوگا، تو یہ لوگ اللہ کے افضل اولیاء میں سے ہیں جن کا مطلوب جنت اور جن کا مہروب (یعنی جس سے خوف

کھائیں) دوزخ ہے، نبی اکرم نے جب شبِ عقبہ انصار سے بیعت لی اور یہ بیعت کرنے والے سابقین اولین تھے جو ان سب مشائخ سے افضل ہیں، انہوں نے اس موقع پر کہا تھا اپنے رب، اپنے آپ اور اپنے اصحاب کے لئے کوئی شئ مشروط کیجیے، آپ نے فرمایا اپنے لئے تو یہ مشروط کرتا ہوں کہ آپ لوگ جیسے اپنے اہل و جان کی حفاظت ونصرت کرتے ہو اسی طرح میری بھی کرو گے اور اپنے اصحاب کی نسبت یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ ان سے مواسات کرو گے، عرض کی اگر ہم اس شرط پر پورا اترے تو ہمارے لئے کیا ہے؟ فرمایا جنت ملے گی، بولے ہاتھ بڑھایئے اللہ کی قسم! نہ ہم یہ پیمان توڑیں گے اور نہ آپ سے اس کے خواہاں ہوں گے) اثنائے بیعت یہ بھی کہا کہ ہمارے اور بعض قبائل کے مابین کچھ معاہدے ہیں اب ہم انہیں ختم کر رہے ہیں تو یہ جنہوں نے یہ بیعت کی سب سے بڑھ کر اللہ ورسول کے محبّ اور اللہ ورسول کی رضا میں سب سے بڑھ کر اپنے مال و جان کو خرچ کرنے والے تھے اس وجہ پر کہ ان متاخرین میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ لاحق نہیں ہوسکتا، انہوں نے جو طلب کی اس کی غایت جنت تھی تو اگر جنت سے اعلیٰ کوئی مطلوب ہوتا تو وہ اسی کی طلب کرتے لیکن انہوں نے جان لیا کہ جنت میں ہر مطلوب ومحبوب ہے بلکہ ایسی نعمتیں بھی جن کی بابت نفوس کو شعور ہی نہیں کہ ان کی طلب کریں کیونکہ طلب، حب اور ارادت تو شعور، احساس اور تصور سے مفرَّع ہے تو جس کا انسان نہ تصور کرے اور نہ اس کے بارہ میں اسے احساس وشعور ہو اس کی وہ طلب وحب اور ارادت بھی نہیں کرتا تو جنت میں یہ بھی ہے اور وہ بھی جیسے کہا:

(لَهُمْ مَّا يَشَآءُ وْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ) [ق : ٣٥] (وہاں وہ جو چاہیں گے ان کے لئے حاضر ہے اور ہمارے ہاں مزید ہے)

(وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ) [الزخرف : ٧١] (اور اس میں ہر وہ شئ ہوگی جو من کو بھائے اور جو آنکھوں کو لذت دے) تو سب کچھ ان کے حسبِ طلب اور حسبِ مشیت بھی ہوگا اور مزید بھی وہ جس تک ان کا شعور وعلم نہیں پہنچا کہ اس کی اشتہاء اور طلب کریں، جیسے ایک حدیث میں ہے: وہاں ایسی نعمتیں ہوں گی جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، کسی کان نے نہیں سنیں اور کسی بشر کے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہوا، یہ ایک وسیع باب ہے

جب تم نے یہ مقدمہ جان لیا تو اب قائل کا قول کہ رضا یہ ہے کہ اللہ سے نہ جنت کا سوال کرو اور نہ اس کا جو شرعی جنت کے مسمیٰ میں داخل ہے تو اس کے دیدار وغیرہ کا سوال نہ کرو، اس میں سے جو تمام انبیاء واولیاء کا مطلوب ہے اور اپنے سے اس کے احتجاب سے اور آگ میں تعذیب سے پناہ کے طالب مت بنو، تو یہ کلام تمام انبیاء اور تمام مومنین کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ فی نفسہ متناقض اور صریحِ معقول کی رو سے باطل بھی ہے، اس لئے کہ جس رضا کا وہ سائل نہیں بن رہا اس کی وجہ یہ باور کرتا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہے اور اس کی اس سے یہ رضا اس کی اس بارے معرفت اور اس کے لئے محبت کے بعد ہے اور جب اس کے ساتھ اللہ سے رضا اور اس کے لئے محبت باقی نہ رہی تو گویا کہا وہ (اس بات پر) راضی ہے کہ راضی نہ ہو اور یہ نقیضین کے مابین جمع ہے اور بلاشبہ یہ اس کی کلام ہے جسے اپنے کہے کا کوئی تصور نہیں اور نہ فہم ہے، اسے مزید واضح یہ امر کرتا ہے کہ راضی کو مکارہ اور آلام کے برداشت کرنے پر وہ شئ آمادہ

کرتی اوراس کی باعث بنتی ہے جو وہ رضا کی لذت اورحلاوت سے پاتا ہےتو جب اس حلاوت ولذت کومفقود پائے تو ممتنع ہے کہ الم اور مرارت کو برداشت کرے تو کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ راضی ہو اور اس کے ساتھ رضا کی ایسی حلاوت ہو جس کی رو سے مکارہ کی مرارت کو برداشت کرے؟ یہ تو اس سکران وفانی (یعنی مدہوش اورخود سے بیگانہ) کی کلام کی جنس سے ہے،جس نے اپنے نفس میں رضا کی حلاوت پائی تو ظن کیا کہ یہ ہرحال میں اس کے ساتھ باقی رہے گی اور یہ اس کی عظیم غلطی ہے،سمنون کی سابق الذکر غلطی کی طرح

اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ تمتع بالمخلوق کا سوال نہ کرے بلکہ اس کا جو اس سے اعلیٰ ہے تو یہ دو وجہ سے اس کی غلطی ہے، ایک اس جہت سے کہ اس نے اس مطلوب کو جنت سے باور نہ کیا حالانکہ یہ اعلیٰ ترین نعیمِ جنت ہے اور دوم اس جہت سے کہ اس نے اپنے راضی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے طالب ہونے کا بھی اثبات کیا تو جب رضا اس طلب کے منافی نہیں تو کسی اور طلب کے بھی منافی نہیں جب وہ اپنے مطلوب کا محتاج ہوگا اور معلوم ہے کہ اس دیدارِ الٰہی کے ساتھ متمتع ہونا آگ سے اس کی سلامتی کے ساتھ ہی تام اور ممکن ہوگا اور جنت کی دیگر نعمتوں کے ساتھ متمتع ہونے کی صورت میں،اور جس کے بغیر مطلوب کا حصول اور وہ تام نہ ہو سکے وہ بھی مطلوب ہوتا ہےتو دیدار کے لئے اس کی طلب اس کے لوازم کی وجہ سے ہے جن میں آگ سے نجات بھی شامل ہےتو اس کی رضا حصولِ منفعت اور اپنے سے دفعِ مضرت کی طلب کے منافی نہ ہوگی اور حصولِ جنت کی طلب اور دفعِ نار کے اور نہ ان کے غیر کے،ان میں سے جو دیدار کے لوازم ہیں تو یوں اس کے قول کا تناقض عیاں ہوا،نیز جب وہ اللہ سے جنت کا سائل نہیں اور نہ اس کے ساتھ آگ سے طالبِ پناہ ہےتو اب یا تو اللہ سے اس سے کمتر کا طالب بنے گا جس کی اسے ضرورت ہے طلبِ منفعت اور دفعِ مضرت سے اور یا پھر طالب نہیں ہوگا تو اگر جواب اثبات میں ہے (یعنی کمتر کا طالب ہے) تو جنت کے لئے اس کی طلب اور آگ سے پناہ کی طلب تو اَولی ہے اور اگر رضا سے یہ مراد لیتا ہے کہ کبھی کسی بھی شیٔ کی طلب نہ کرے چاہے کتنا ہی مجبور ہو اور کسی شیٔ سے طالبِ پناہ نہ بنے چاہے کتنی ہی وہ مضر ہو تو یہ دو باتوں سے خالی نہیں:ایک یا تو وہ اپنے دل کے ساتھ اللہ کی طرف ملتفت ہو،اس میں کہ وہ یہ اس کے ساتھ کرے،دوم کہ اس سے معرض ہو،اگر اول ہےتو لامحالہ وہ زبانِ حال کے ساتھ طالب اور مستعیذ ہے اور طلب بالحال اور طلب بالقال کے مابین کوئی فرق نہیں،وہ ان دونوں کے ساتھ اکمل واتم ہےتو اس سے وہ عدول نہیں کر سکتا اور اگر اس سب سے مُعرض ہےتو معلوم امر ہے کہ وہ زندہ اور باقی نہیں رہ سکتا مگر اس کے ساتھ جو اس کی حیات کو قائم رکھے اور ضار کو اس سے دور کرے اور جن منافع اور دفعِ ضار کے ساتھ اس کی حیات قائم ہے وہ یا تو انہیں پسند کرتا،ان کا طالب بنتا اور کسی سے اس کا ارادہ کرتا ہے یا ایسا نہیں کرتا،اگر کسی سے ان کا ارادہ کرتا ہےتو وہ اگر غیر اللہ ہےتو یہ مشرک و مذموم ہوا،چہ جائے کہ وہ محمود ہو،اور اگر کہے میں محبت نہیں کرتا،طلب نہیں کرتا اور ارادت نہیں کرتا،نہ اللہ سے اور نہ اس کے غیر سے،تو کہا جائے گا یہ ذی حیات کی بابت ممتنع ہے (ایسا ممکن ہی نہیں) تو ذی حیات کی نسبت ناممکن ہے کہ اس سے محبت نہ

کرے جس کے ساتھ اس کی بقاء ہے اور یہ حسی طور سے معلوم امر ہے اور جو اس کیفیت کے ساتھ ہے ممتنع ہے کہ اسے موصوف بالرضا کیا جائے، راضی تو حب اور ارادتِ خاصہ کے ساتھ موصوف ہوتا ہے کہ رضا اس کے لئے مستلزم ہے تو اس سب کا اس سے کیونکر سلب ہوسکتا ہے؟ تو اس اور اس کے امثال سے اس کلام کا فساد واضح ہوتا ہے اور جہاں تک اللہ کی راہ، اس کے طریق اور اس کے دین میں تو متعدد وجوہ سے، اول کہ کہا جائے راضی کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسے افعال کرے جو اللہ کو پسند ہیں وگرنہ جو اللہ کو پسند افعال نہیں کرتا وہ اللہ سے راضی کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ کے مکروہات، مذمومات اور اس کی منہیات پر راضی ہونا کیونکر سائغ ہوسکتا ہے؟ اس کی تفصیل یہ کہ محمود رضا یا تو یہ کہ اللہ اسے پسند کرنے اور اس سے محبت کرنے والا ہو اور یا ایسا نہ ہو، اگر نہیں تو یہ مامور بہ رضا نہیں، نہ امرِ ایجاب اور نہ امرِ استحباب تو کوئی رضا ایسی بھی ہے جو کفر ہے، مثلاً کفار کی شرک پر رضا اور انبیاء کے قتل اور ان کی تکذیب پر ان کی رضا اور اللہ کے مسخوطات ومکروہات سے رضا، فرمایا:

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ)[محمد : ۲۸] (یہ اس لئے کہ جس چیز سے اللہ ناخوش ہے یہ اس کے پیچھے چلے اور اس کی خوشنودی کو اچھا نہ سمجھے تو اس نے بھی ان کے اعمال کو برباد کر دیا) تو جس نے اپنی رضا وعمل سے اللہ کے ناپسندیدہ امور کی اتباع کی اس نے اللہ کو ناراض کیا، نبی اکرم نے فرمایا زمین میں جب کوئی برائی کی جائے تو جو اس سے غائب ہے لیکن اس پر راضی ہے وہ اسی کی مثل ہے جو اسے حاضر ہوا اور اس میں شریک ہوا اور جو اس کا شاہد ہے، لیکن جس نے اسے ناپسند کیا وہ اس کی مثل ہے جو اس سے غائب اور اس کا منکر ہے اور فرمایا میرے بعد ایسے امراء ہوں گے جو معروف اور منکر دونوں قسم کے افعال کریں گے تو جس نے انکار کیا وہ بری ہوا اور جس نے کراہت کا اظہار کیا وہ سالم رہا لیکن وہ جو ان افعال وامور پر راضی ہوا اور متابعت کی وہ ہلاک ہوا، فرمایا:

(يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ) [التوبة : ۹۶] (یہ تمہارے آگے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم اُن سے خوش ہو جاؤ لیکن اگر تم اُن سے خوش ہو جاؤ گے تو اللہ تو نافرمان لوگوں سے خوش نہیں ہوگا) تو فاسق قوم سے ہماری رضامندی اللہ کو محبوب اور مرضی نہیں کیونکہ وہ ان سے راضی نہیں ہے، فرمایا:

(اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ) [التوبة : ۳۸](کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو؟ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں) تو یہ رضا اللہ کے ہاں مذموم ہے، فرمایا:

(اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا)[یونس: ۷] (بے شک وہ جنہیں ہماری ملاقات کی تمنا نہیں اور وہ دنیا کی زندگی سے خوش اور اُسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں) تو یہ بھی مذموم رضا

ہےتو جو اپنے کفر وفسق اور اپنے غیر کے کفر وفسق اور اپنے اور اپنے غیر کے معاصی پر راضی ہوا وہ اللہ کی رضا کا متبع نہیں اور نہ اللہ کے ساتھ مومن ہے بلکہ وہ اس کی ناراضی مول لینے والا بنا، اس کا رب اس پر ناراض، اس پر لعنت کرنے والا، اس کی ذم کرنے والا ہے اور عقاب کا اس کے لئے متوعِد ہے، اللہ کا طریق جس کا مہتدی مشائخ حکم دیتے ہیں اللہ کی طاعت کا امر اور اس کی معصیت سے نہی ہےتو جس نے اس رضا کا امر دیا یا مستحب کہا یا تعریف کی جس سے اللہ کو کراہت ہے اور وہ اس کے ہاں مذموم ہے اور وہ اس کے اصحاب کا معاقب ہےتو وہ اللہ کا دشمن ہے، نہ کہ اس کا ولی اور وہ اللہ کے طریق سے روکنے والا ہے نہ کہ اس کے طریق کا سالک، جب بنی آدم کے ہاں موجود رضا ایسی بھی ہے جو اللہ کو پسند ہے اور ایسی بھی جو اسے ناپسند ہے اور ایسی بھی جو مباح ہے، نہ اس سے ہے اور نہ اس سے، دل کے دیگر تمام اعمال حب وبغض وغیرہ کی طرح تو یہ سب اللہ کے ہاں محبوب، مکروہ اور مباح میں منقسم ہے، تو جب معاملہ یہ ہےتو راضی اسے قرار دینا جو اللہ سے جنت کا سوال نہ کرے اور نہ آگ سے اس کی پناہ طلب کرے! تو اس سے کہا جائے گا اللہ سے جنت کا سوال اور آگ سے اس کی پناہ کی طلب یا تو واجب ہے یا مستحب یا مباح اور یا پھر مکروہ (تو یہی چار قسمیں بنتی ہیں) اور کوئی مسلمان اسے حرام یا مکروہ نہیں کہہ سکتا اور یہ مستوی الطرفین مباح بھی نہیں، اگر کوئی اصرار کرے کہ یہ مستوی الطرفین مباح فعل ہےتو کہا جائے گا ایسا فعل رضا کے منافی نہیں ہوتا کیونکہ راضی کی شرط سے نہیں کہ وہ نہ کھائے، نہ پئے، نہ پہنے اور نہ ان امور کی امثال کرےتو جب جو وہ ان امور سے کرتا ہے وہ اس کی رضا کے منافی نہیں تو کیا دعا اور سوال جو کہ مباح ہیں اس کی رضا کے منافی ہو سکتے ہیں؟ اور جب دعا اور سوال اسی طرح واجب یا مستحب ہیں تو معلوم امر ہے کہ اللہ تعالی واجبات اور مستحبات کے فعل سے راضی ہوتا ہےتو راضی وہ ہے جو اس کے اولیاء میں سے ہے کیونکہ وہ فعل نہ کرنا جو اسے پسند ہے اور وہ فعل کرنا جو اسے ناپسند ہےتو یہ اللہ کے اعداء کی صفت ہے نہ کہ اس کے اولیاء کی

قشیری نے اسے باب الرضا کے اوائل میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: جان لو بندے پر واجب یہ ہے کہ اللہ کی اس قضاء پر راضی ہو جس کے ساتھ رضا کا اس نے حکم دیا ہے کیونکہ اس کی ہر قضاء ایسی نہیں کہ بندے کے لئے اس پر راضی ہونا جائز یا واجب ہو جیسے معاصی اور اہلِ اسلام کے محن پر، یہ بات جو انہوں نے کہی ان سے قبل اور بعد کے متعدد علماء نے کہی ہے مثلا قاضی ابوبکر اور قاضی ابویعلی وغیرہما، جب قدریہ نے ان پر اس امر کے ساتھ احتجاج کیا کہ اللہ کی ہر قضاء کے ساتھ رضا مامور بہ ہےتو اگر معاصی اللہ کی قضاء سے ہیں تو ہم راضی بقضاء کے مامور ہیں اور جس سے اللہ نے منع کیا ہے اس پر راضی ہونا جائز نہیں **تو اہلِ سنت نے اس کے تین جواب دیئے:**

۱- اور یہ ان مذکورین کا اور جماہیر ائمہ کا جواب ہے، کہا یہ عموم صحیح نہیں، ہم مامور نہیں ہیں کہ ہر اس پر راضی ہوں جو اس کی قضاء و قدر ہے، کتاب وسنت میں ایسا کوئی امر وارد نہیں لیکن ہمارے ذمہ یہ ہے کہ اس پر راضی ہوں جس پر راضی ہونے کا ہمیں حکم دیا ہے مثلا اللہ اور اس کے رسول کی طاعت، یہی ہے جو ابوالقاسم (قشیری) نے ذکر کیا

۲- کہ ہم اس قضاء پر راضی ہوں گے جو اللہ کی صفت یا اس کا فعل ہے، نہ کہ مقضی جو کہ اس کا مفعول ہے، اس جواب میں ضعف ہے جس کی ہم نے ایک جگہ تبیین کی ہے

۳- کہ معاصی کی دو وجہیں ہیں: ایک وجہ بندے کی طرف اس طور کہ یہ اس کا فعل، صنع اور کسب ہے اور دوسری وجہ رب کی طرف، اس حیثیت سے کہ اس نے اسے خلق کیا اور اسے مقضی و مقدر کیا تو اس وجہ سے وہ راضی ہوگا جس کے ساتھ اللہ کی طرف اضافت کی جاتی ہے اور اس وجہ سے نہیں جس کے ساتھ بندے کی طرف اس کی اضافت کی جاتی ہے اور یہ اس کے شر، قبیح، محرم اور عذاب و ذم کا سبب ہونے کی وجہ سے اور دیگر اس کا نحو دراصل اس کے بندے کی طرف مضاف ہونے کی جہت سے ہے، اس مقام میں ایسے کشفِ حقائق و اسرار ہیں جس کا کچھ حصہ ہم ایک جگہ ذکر کر چکے، یہ مقام اس کا محتمل نہیں کہ یہ صفات و قدر کے مسائل سے متعلق ہے اور یہ دین کے اعظم مطالب اور اولین و آخرین کے اشرف و ادق علوم سے ہے، اکثر اہل جہان ان حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، یہاں مقصود یہ ہے کہ مشائخ صوفیہ و علماء وغیرہم نے واضح کیا ہے کہ بعض رضا ایسی ہے جو جائز ہے اور کچھ ایسی جو جائز نہیں، چہ جائے کہ وہ مستحب ہو یا مقربین کی صفات سے ہو، ابو قاسم نے الرسالہ میں اس کا بھی ذکر کیا ہے

اگر کہا جائے یہ جو آپ حضرات نے ذکر کیا بین اور واضح امر ہے تو یہ کہنے والا کہاں سے غلط ہے کہ رضا یہ ہے کہ اللہ سے جنت کا سوال نہ کرو اور نہ آگ سے اس کی پناہ مانگو؟ اور وہ کیونکر غلط ہے جو اس قسم کی کلام کا استحسان کرے؟ چاہے جو کوئی بھی ہو تو کہا جائے گا اس میں غلطی یہ کی ہے کہ انہوں نے رائے رکھی کہ کسی امر کے ساتھ راضی اس امر کے غیر کی طلب نہیں کرتا تو بندہ جب احوال میں سے کسی حال میں ہو تو اس کی رضا سے ہے کہ اس حال کے غیر کا سوال وطلب نہ کرے! پھر جب انہوں نے دیکھا کہ اقصی المطالب جنت اور اقصی المکارہ دوزخ ہے تو کہا چاہیے کہ کسی شئ کا طالب نہ بنے، چاہے وہ جنت ہی کیوں نہ ہو اور جو مل جائے اسے برا نہ جانے چاہے وہ دوزخ ہی کیوں نہ ہو، یہ ان کی غلطی کی وجہ ہے، دو جہت سے ان میں گمراہی نے سرایت کیا، ایک ان کا ظن کہ ہر جو چیز ہو جائے اس کے ساتھ رضا ایسا امر ہے جو اللہ کو محبوب اور پسند ہے اور یہ اولیاء اللہ کے اعظم طرق سے ہے تو ہر حادث و کائن اور ہر حال کے ساتھ راضی ہونے کو بندے کے لئے اللہ کی طرف طریق قرار دیا تو یوں واضح گمراہی میں جا واقع ہوئے، اللہ کی طرف طریق صرف اور صرف یہ ہے کہ انسان اللہ کو محبوب و پسند افعال کر کے، اسے راضی کرے، نہ کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے (اللہ کی تقدیر سمجھ کر) اس پر راضی رہے، اللہ نے اس کا امر نہیں دیا اور نہ وہ اس پر راضی ہے اور نہ یہ اسے پسند ہے، بلکہ وہ بے شمار موجود اعیان افعال کو برا سمجھتا اور ان سے ناخوش ہے اور وہ اسے مبغوض ہیں، اللہ کی ولایت کا مطلب اس سے موافقت ہے بایں طور کہ اسے پسند کرے جو اسے پسند ہے، اس سے بغض کرے جو اسے مبغوض ہے، اسے ناگوار جانے جو اسے ناگوار ہے اور اس پر ناخوش ہو جس پر وہ ناخوش ہے، اس سے موالات کرے جس سے وہ موالات کرتا ہے اور اس سے معادات

کرے جس سے وہ معادات کرتا ہےلیکن اگرتم اسے پسند کرو جو اسے ناپسند ہے تب تم اس کے ولی نہیں بلکہ دشمن ہوئے اور جس نے اللہ کے مسخوطات پر رضا مندی ظاہر کی تو ہر ذم کا وہ نائل اور مستحق بنا

اس میں تدبر کرو کہ یہ ایک عظیم اصل پر مبنی ہے جس میں بے شمار۔جن سے اللہ ہی واقف ہے۔ زہاد،صوفیہ،عباد اور عوام گمراہی کا شکار بنے ہیں، دوم کہ وہ اس دعا کے مابین جس کے کرنے کا حکم ہے۔ایجابی یا استحبابی حکم۔اور اس دعا کے مابین فرق نہیں کرتے جس سے انہیں نہی کی ہے یا کم از کم اس کے وہ مامور نہیں اور نہ اس سے انہیں منع کیا گیا ہے، بندے کی اپنے رب سے **دعا اور سوال تین انواع کا ہے**:

اول: بندے کو اس کا امر ہے، امرِ ایجاب یا امرِ استحباب مثلاً قولہ:(**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**) اور مثلاً نماز کے آخر کی وہ دعا جس کا نبی اکرم اپنے صحابہ کو حکم دیا کرتے تھے، فرمایا جب تمہارا کوئی تشہد میں بیٹھے تو چار چیزوں سے اللہ سے استعاذہ کرے: عذابِ جہنم سے، عذابِ قبر سے، محیا اور ممات کے فتنہ سے اور مسیح دجال کے فتنہ سے، امت متفق ہے کہ یہ مشروع ہے جو اللہ کو محبوب ومرضی ہے البتہ اس کے (تشہد کے آخر میں اسے پڑھنے کے) وجوب میں اختلافِ آراء ہے تو طاؤس اور ایک جماعت نے اسے واجب قرار دیا، یہی احمد کے مذہب میں ایک قول ہے، اکثر اس کے استحباب کے قائل ہیں، جو ادعیہ بھی نبی اکرم مانگا کرتے تھے وہ اس امر سے خارج نہیں کہ وہ واجب ہوں یا مستحب اور کوئی بھی شئ واجب ہو یا مستحب اللہ کو پسند اور محبوب ہے اور جو یہ کرے اللہ اس سے راضی ہوگا اور اسے راضی کرے گا

دوم: دعا کی وہ نوع جس سے اس نے منع کیا ہے مثلاً اعتداء کہ کوئی آدمی انبیاء کے خصائص میں سے کسی شئ کی دعا کرے جو غیرِ انبیاء کے لئے ٹھیک ہی نہیں، یا رب کے خصائص میں سے کسی شئ کا یا مثلاً مقامِ وسیلہ کا اپنے آپ کے لئے سوال کرے حالانکہ فرما دیا کہ یہ جنت کا ایک درجہ ہے جو تمام مخلوقین میں سے صرف ایک عبد کو ملنا ہے (اور وہ ہمارے نبی اکرم ہیں) یا دعا کرے کہ اے اللہ مجھے ہر شئ کا علیم بنا دے یا ہر شئ پر قادر بنا دے یا ایسی صلاحیت دے کہ تمام غیوب کا مشاہدہ کر سکے اور اس کی امثال (جیسے ایک میراثی نے رمضان کے پہلے روز مولوی صاحب سے سنا کہ اللہ افطاری کے وقت ہر دعا قبول کرتا ہے تو اس نے یہ دعا کی: اے اللہ کل عید ہو جائے) یا اس کی مثل جو اس سے دعا کرے یہ ظن کرتے ہوئے کہ وہ اپنے بندوں کا محتاج ہے اور وہ اسے نفع وضرر پہنچا سکتے ہیں تو اس سے اس فعل کی طلب کرے اور ذکر کرے کہ اگر یہ نہ کیا تو خلق سے اسے ضرر حاصل ہوگا تو اس قسم کی دعائیں اللہ بارے جہل کا ثبوت اور اعتداء ہیں اگرچہ شیوخ کا ایک گروہ اس میں واقع ہوا، یا مثلاً کہے: اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے معاف فرما دے تو ظن کرے کہ اللہ کئی دفعہ کوئی کام مجبوراً بھی کر لیتا ہے جیسے دنیا کے بادشاہوں کو کئی کام اپنی مرضی کے خلاف کرنا پڑ جاتے ہیں، نبی پاک نے اس سے منع کیا اور کہا کوئی یہ نہ کہے: اے اللہ اگر تو چاہے تو میری مغفرت کر دے اور چاہے تو مجھ پر رحم کر لیکن چاہئے کہ طلب کا انداز اختیار کرے کیونکہ اللہ کو کوئی مجبوری نہیں یا مثلاً دعا میں مسجع ومقفع عبارات بنائے اور لہک لہک کر انہیں کہے تو اس قسم کی ادعیہ منہی عنہا ہیں

سوم: ایسی دعا جو مباح ہے مثلاً فضولیات کی طلب اگرچہ ان میں معصیت نہیں، مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ وہ رضا جو اللہ کے طریق سے ہے ترکِ واجب کو متضمن نہیں اور نہ ترکِ مستحب کو، تو دعا جو کہ واجب یا مستحب ہے اس کا ترک رضا سے نہیں ہوسکتا جیسے دیگر واجبات کا ترک بھی رضائے مشروع سے نہیں اور شرعی محرمات کا فعل تو ان حضرات کی غلطی ان کے اس ظن کی جہت سے متبین ہوئی کہ ہر مقدور پر رضا مشروع ہے اور اس جہت سے کہ انہوں نے ایجاباً اور استحباباً مشروع دعا اور غیر مشروع دعا کے مابین فرق اور تمییز روا نہیں رکھی، دینِ اسلام سے بالاضطرار معلوم ہے کہ اللہ سے جنت کی طلب اور دوزخ سے پناہ تمام مرسلین و انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین کی عظیم ترین مشروع ادعیہ سے ہے اور یہ اس کے واجب یا مستحب ہونے سے خارج نہیں اور وہ طریق جس کے اللہ کے اولیاء سالک ہیں فعلِ واجبات و مستحبات سے خارج نہیں کیونکہ جو کچھ اس کے ماسوا ہے وہ محرم یا مکروہ ہے یا ایسا مباح جس کی دینی لحاظ سے کوئی منفعت نہیں پھر جب اس غلطی میں انہیں اس امر نے واقع کیا کہ انہوں نے کثیر لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اللہ سے جلبِ منافع اور دفعِ مضار کا سوال نہیں کرتے حتیٰ کہ اس سے جنت کی طلب اور آگ سے اس کی پناہ بھی، اس کے عبادت، طاعت اور خیر ہونے کی جہت سے بلکہ اس جہت سے کہ نفس کو اس کی طلب ہے تو یہ رائے اختیار کی کہ طریقت میں یہ بھی ہے کہ اس شئ کا ترک ہو جو نفس کا مختار ہے اور جس کی وہ ارادت کرتا ہے اور یہ کہ ان کے لئے اصلاً ہی کوئی ارادت نہ ہو بلکہ اس کا مطلوب تقدیر کے تحت جریان ہو جو بھی وہ ہو، اسی نے ان کے کثیر لوگوں کو رہبانیت میں داخل کر دیا اور شریعت سے خارج کر دیا حتیٰ کہ اکل و شرب اور لباس و نکاح سے اس کا ترک کر دیا جس کے وہ محتاج ہیں اور جس کے بغیر ان کی دین کی مصلحت تام نہیں ہوتی تھی تو انہوں نے دیکھا کہ عوام الناس ان امور کو طبع و ہویٰ اور معمول کے حکم سے اختیار کرتے ہیں اور معلوم امر ہے کہ جو افعال اس وجہ پر ہوں وہ عبادت، طاعت اور قربت نہیں ہوتے تو انہوں نے ان عبادات اور فطری افعال اور تقاضوں کا ترک اللہ کی طرف طریق خیال کیا تو بھوک، بیداری، خلوت اور سکوت وغیرہ امور کو لازم پکڑا جن میں حظِ نفس کا ترک اور مشقتوں کو برداشت کرنا تھا اور اس چیز نے انہیں ترکِ واجبات و مستحبات اور فعلِ مکروہات و محرمات میں لا واقع کیا اور یہ دونوں امر غیر محمود اور غیر مامور ہیں اور نہ یہ اللہ کی طرف طریق ہیں، اول ان مفرطین کا طریق ہے جنہوں نے ضرورت کے ان افعال کو عبادت اور تقرب الی اللہ کے غیر وجہ پر ادا کیا اور دوم ان معتدین کا طریق جنہوں نے ان افعال کا ترک کر دیا بلکہ مشروع یہ ہے کہ انہیں اللہ کی طرف تقرب کی نیت سے کیا جائے اور اللہ کا شکر ادا کیا جائے، فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ [المؤمنون: ۵۱] (پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو)

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۷۲] (جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں اُن کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو) تو اکل و شرب کا امر دیا تو جس نے یہ کیا مگر شکر ادا نہ کیا وہ مذموم ہے اور جس نے اکل و شرب نہ کیا اور شکر بھی ادا نہ کیا وہ بھی مذموم ہے! صحیح میں مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا بے شک اللہ اس شخص سے خوش ہوتا ہے جو کچھ کھائے تو اس پر الحمد للہ

کہے اور کچھ پیئے تو اس پر الحمد للہ کہے، آپ نے حضرت سعد بن ابو وقاص سے کہا تھا تم کچھ خرچ نہ کرو گے کہ جس کے ساتھ اللہ کی رضا کے طالب ہو مگر اس وجہ سے درجہ میں اضافہ ہو گا حتی کہ وہ لقمہ بھی جسے تم اپنی زوجہ کے منہ میں دو، صحیح کی ایک روایت میں ہے فرمایا مومن کا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا جس کے ثواب کی امید رکھے صدقہ ہے تو یہی معاملہ لوگوں کی دعاؤں کا ہے، جس نے طبعاً اور عادۃً نہ کہ شرعاً اور عبادۃً اللہ سے طلبِ خیر کی اور جلبِ نفع اور دفعِ مضرت کا سوال کیا تو یہ تقصیر اور تفریط تو ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مطلقاً ہی دعا کا ترک کر دیا جائے بلکہ میں اسے شرعاً اور عبادۃً کروں گا، پھر جان لو جو اسے شرعاً اور عبادۃً کرتا ہے وہ اپنے نفس کی مصلحت اور اپنے محمود حظوظ کی طلب میں سعی کرتا ہے گویا اس نے اپنی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت کی مصلحت کی طلب کی بخلاف اس کے جو صرف طبعاً یہ کرتا ہے تو اس نے صرف دنیوی مصلحت کو مدِ نظر رکھا جیسے کہا:

(فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا وَ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ) [البقرۃ : ۲۰۰۔۲۰۲] (پس بعض لوگ ایسے ہیں جو التجا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں دنیا ہی میں عنایت کر اور ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت عطا فرما اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہی لوگ ہیں جن کیلئے ان کے کاموں کا اجر ہے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والا ہے) اور تب جنت کا طالب اور نار سے مستعیذ دراصل آخرت کی حسنہ کا طالب ہے اور یہ محمود ہے، اس کی مزید وضاحت یوں ہوگی اور یہ بات ان کے قول کا رد کرے گی کہ بندہ نماز، روزہ، صدقہ، حج، جہاد اور دیگر قربات میں سے کسی مامور کا فعل اور محظور کا ترک نہیں کرتا مگر ان سب کا اسے فائدہ ثواب کا حصول اور عذاب کا دفع ہے تو اگر کوئی شخص حصولِ ثواب کی طلب نہیں کرتا جو کہ جنت ہے اور نہ دفعِ عذاب کی جو نار ہے تو نہ فعلِ مامور کرتا ہے اور نہ ترکِ محظور اور کہتا ہے میں ہر حال پر راضی ہوں، جو بھی میرے ساتھ کیا جائے اگرچہ میں کفر یا فسق یا عصیان کروں بلکہ کہتا ہے میں کفر وفسق اور عصیان کروں گا تاکہ اللہ میری معاقبت کرے اور میں اس کے عقاب پر راضی ہوں تو اس کی قضاء پر رضا کے درجہ کا نائل بنوں گا تو یہ احمق، اَجہل، اَضل اور اَکفر شخص کا ہی طریق ہوگا

جہاں تک اس کا جہل وحمق تو اس لئے کہ اس کے ساتھ رضا ممتنع ہے کیونکہ یہ جمع بین ضدین کو مستلزم ہے اور جہاں تک اس کا کفر وضلال تو اس لیے کہ یہ اللہ کے دین کی تعطیل کو مستلزم ہے، وہ دین جس کے ساتھ اس نے اپنے رسل کو مبعوث کیا اور کتب کا انزال کیا اور بلا شبہ قضاء وقدر کے ملاحظہ نے کثیر اہلِ ارادت متصوفہ کو اس امر میں لا واقع کیا کہ مامورات کا ترک کیا اور محظورات کا فعل کیا اور اس کی رو سے یا تو ناقص ومحروم بنے اور یا عاصی وفاسق اور یا پھر کافر، میں نے اس کے اصناف واَلوان دیکھے ہیں: (وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ) [النور : ۴۰] (اور جس کو اللہ نے روشنی نہ دی اس کیلئے روشنی نہیں) یہ معتزلہ اور قدریہ سے

ان کے نحو نقیض کے دونوں کنارے ہیں، یہ تقدیر کو ملحوظ رکھتے ہوئے امر سے معرِض ہوئے اور وہ امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقدیر سے معرض بنے، دونوں کا ظن ہے کہ امر وقدر کا ملاحظہ ممتنع ہے جیسا کہ ایک گروہ نے اسے حکمت وعدل کے مخالف بتلایا اور یہ تینوں اصناف ہیں: قدریہ مجوسیہ، قدریہ مشرکیہ اور قدریہ ابلیسیہ، ان کی بابت ایک جگہ بسط سے کلام کی ہے، ہمارے اس زمانہ کے عام لوگ اور سالکین اہلِ ارادت اصلاً قدریہ مشرکیہ کے ساتھ ابتلاء میں ہیں تو وہ تقدیر کے شاہد اور امر سے اعراض کرنے والے ہیں جیسے ان کے بارہ میں طنز کرتے ہوئے کسی اہلِ علم نے کہا تھا طاعت کے وقت تم قدری اور معصیت کے وقت جبری بن جاتے ہو؟ جو بھی مذہب تمہاری خواہشات کے موافق ہو تم اسی کو اختیار کر لیتے ہو جبکہ مشروع اس کے برعکس ہے، وہ یہ کہ طاعت کی صورت میں قبل از فعل اس پر اللہ سے مدد وتوفیق کے طالب بنو اور بعد از فعل اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور کوشش کرو کہ معصیت کا ارتکاب نہ ہونے پائے، اگر ہو جائے تو توبہ اور استغفار کی طرف مبادرت کرو جیسا کہ سید الاستغفار والی حدیث میں یہ الفاظ ہیں: (اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِيْ) اور جیسے ایک صحیح قدسی حدیث میں ہے: اے میرے بندو میں تمہارے اعمال کا پورا پورا حساب رکھ رہا ہوں پھر تمہیں پورا پورا ان کا بدلہ دوں گا الخ

اسی باب سے جو اہلِ ارادت کے بعض لوگ دعاؤں کا ترک کر بیٹھے اور بعض دیگر نے توکل اور محبت کو عوام الناس کے مقامات سے قرار دیا، ایک جگہ ہم نے اس قسم کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے اور اس ضمن کے صواب وخطا کے مابین فرق کیا ہے، اسی لئے ان مشائخ کی کلام میں علم وشریعت کی اتباع کرنے کی وصیت پائی جاتی ہے حتی کہ سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہر وجد جس کے لئے کتاب وسنت شاہد نہیں وہ باطل ہے، جنید بن محمد بغدادی کا قول ہے ہمارا علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے تو جس نے نہ قرآن پڑھا اور نہ حدیث کا تعلم کیا اس کے لئے صحیح نہیں کہ ہمارے علم بارے کلام کرے۔

استفتاء

حضرات علمائے کرام اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں **جس نے کسی حرام فعل مثلاً زنا، چوری اور شراب نوشی کا پکا عزم کیا البتہ اس کے کرنے سے عاجز رہا**، یا تو بوجہ موت یا کسی بھی وجہ سے، کیا یہ مجرد اپنے اس عزم کی رو سے آثم ہے یا نہیں؟ اگر کہو آثم ہے تو عدم آثم قرار دینے والے کی اس حجت کا کیا جواب دیں گے، (اللہ تعالی نے) فرمایا: (إِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ وَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ تُكْتَبْ لَهٗ) (اگر میرا بندہ برائی کا ارادہ کرے مگر عمل نہ کرے تو یہ اس کے کھاتہ میں لکھی نہیں جاتی) اور اس حدیثِ نبوی کا: بے شک اللہ نے میری امت کے دلوں میں در آنے والے خیالات کو نظر انداز کیا ہے جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنائے یا تکلم نہ کرے، اس کے ساتھ دو وجہ سے احتجاج کیا گیا ہے، اول، کہ آپ نے حدیثِ نفس سے عفو کی خبر دی ہے اور عزم عموم میں داخل ہے اور عزم اور ھم واحد ہے، ابن سیدہ (ماہر لغت) نے یہ بات کہی دوم، نظر اندازی کی حد یہ بیان کی کہ کلام یا عمل پا یا جائے اور جو اس سے قبل ہے وہ حدِ تجاوز میں داخل ہے، اس کا زعم ہے کہ نبی اکرم کے فرمان جب دو مسلمان تلوار بدست آمنے

سامنے آئیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں، میں کوئی دلالت نہیں اس لیے کہ مقتول کے آگ میں دخول کا موجب عزم نہیں بلکہ اس کا اپنے بھائی کے سامنے آ جانا اور لڑنے لگنا ہے، تو یہ عمل ہے، نہ کہ مجرد قصد اور نہ ہی اس فرمانِ نبوی میں جو ایسے شخص بارے فرمایا کہ جو کہے اگر میرے پاس بھی مال ہوتو میں بھی فلاں کی طرح یہ یہ نیکی یا بدی کے کام کروں، فرمایا یہ گناہ میں بھی ایک برابر ہیں اور اجر میں بھی، اس لیے کہ اس نے مجرد قصد پر اقتصار نہیں کیا بلکہ تکلم کرلیا اور آپ کا فرمان تھا جب تک عمل نہ کرے یا تکلم نہ کرے اور یہ اس نے تکلم کرلیا، اس مسئلہ میں بہت قیل وقال ہوئی ہے لیکن مزید ایضاح اور تفصیلی جواب کی ضرورت ہے۔

جواب

اس طرح کے مسائل کے حکم بارے کلام کرنے سے پیشتر انہیں اچھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ان مسائل میں عموماً اضطرابِ فکر کا وقوع دو امور سے ہوا ہے ایک قلوب کے احوال اور ان کی صفات کی عدم تحقیق جو کہ موردِ کلام ہے اور دوم شرعی ادلہ کو ان کے حق کا عدم اعطاء، لہذا اس باب میں کثیر لوگ اضطرابِ فکر کا شکار بنے حتی کہ ان کی کلام کا ناظر محسوس کرتا ہے کہ وہ فی الظاہر باہم متناقض اجماعات کا ادعاء کرتے ہیں، تو جاننا چاہیئے کہ ذی حیات کی صفات میں سے ہر ایک جو کہ علم، قدرت اور ارادہ ونحوہا ہیں، کے لئے مراتب سے وہ کچھ ہے کہ جس کے اول وآخر کے مابین وہ کچھ ہے جس کا لوگ ضبط نہیں کرسکتے مثلاً شک پھر ظن پھر علم پھر یقین اور اس کے مراتب، اسی طرح ھم، ارادہ اور عزم وغیرہ لہذا جماہیر اہلِ سنت۔ اور یہی امام احمد کے مذہب کا ظاہر ہے اور ان سے منقول دو میں اصح روایت یہی ہے اور ان کے اکثر اصحاب اسی کے قائل ہیں۔ کے نزدیک علم اور عقل ونحوہما کمی بیشی کے قابل ہیں بلکہ اسی طرح وہ صفات بھی جو غیر ذی حیات کے ساتھ قائم ہیں مثلاً الوان (رنگ) ذائقے اور بُو، تو اولاً ہم کہتے ہیں جازم ارادہ اسی کو کہا جائے گا جس کے ساتھ فعل کا وقوع واجب ہو جب قدرت ہو، تو تام قدرت کے ساتھ جازم ارادہ جب پایا جائے تو فعل کا وجود واجب ہوتا ہے، معارض ومقاوم سے سالم مقتضی کے کمالِ وجود کی رو سے اور جب ارادہ اور تام قدرت پائی جائے مگر فعل واقع نہ ہوتو اس کا مطلب ہے کہ ارادہ جازم نہ تھا اور یہ خلق کے ان افعال کے لئے ارادات جن پر انہیں دسترس ہے مگر انہیں کیا نہیں اور اگرچہ قوت وضعف کے لحاظ سے ان ارادات میں کثیر تفاوت ہے لیکن اس صورت کہ تام قدرت کے باوجود مراد فعل واقع نہیں ہوا تو اس کا مطلب ہوگا کہ ارادہ مکمل جازم نہ تھا

اس مسئلہ میں نزاع کے کثیر ہونے کی وجہ یہ بنی کہ انہوں ے جازم ارادہ کا وجود فرض کرلیا کہ جس کے ساتھ فعل سے کوئی شئ مقترن نہ ہو اور یہ نہیں ہوتا، یہ تو دراصل مستقبل میں کرنے کے عزم میں ہوتا ہے تو انسان کبھی مستقبل میں کسی فعل پر عزم کرتا ہے ایسا فعل کہ فی الحال اس میں سے کوئی شئ نہیں کرتا اور مستقبل میں کسی کام کے کرنے کا عزم وجودِ فعل میں کافی نہیں بلکہ اس کا وجود تبھی ہو سکے گا جب فعل کے لئے مستلزم کلی ارادہ حادث ہوا اور یہی جازم ارادہ ہے، جب جازم ارادہ کے ساتھ انسان وہ کام کرے جس کی اس میں قدرت ہے تو ازروئے شرع وہ تام فاعل کے بمنزلہ ہوا، اس کے لئے تام فاعل کا ثواب اور تام فاعل کا عقاب ہے جس نے وہ سب

مرادفعل کیا ہے جوثواب یا عقاب کا موجب ہے حتی کہ اس پر بھی وہ ثواب وعقاب دیا جاتا ہے جواس کے محلِ قدرت سے خارج ہے مثلاً نیکی کے کاموں میں اشتراک اور تعاون کرنے والے اور انہی میں سے وہ بھی جو انسان کے فعل سے متولد ہوں جیسے ہدایت یا ضلالت کی طرف داعی اور کسی اچھی یا بری روش کو جاری کرنے والا، جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جس نے ہدایت کی طرف بلایا تو اس کے لئے ان سب کے اجور کی مثل اجر ہے جو اس کی پیروی کریں بغیر اس کے کہ ان کے اجور میں کوئی کمی ہو، اسی طرح جس نے کسی گمراہی کی طرف بلایا (محرک اور باعث بنا) تو اس کے لئے ان سب کے وِزر کی مثل وزر ہوگا جنہوں نے اس کی یہ بات مانی بغیر اس کے کہ ان کے وزر میں کوئی کمی ہو، صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے فرمایا جس نے سنتِ حسنہ کا اجراء کیا تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اور ان سب کا اجر بھی جو قیامت تک اس پر عمل پیرا ہوں بغیر اس کے کہ ان کے اجور میں کمی ہو، تو ہدایت اور ضلالت کی طرف داعی کامل الطلب ارادے والا طالب اور مرید ہے جب اس نے اس کی دعوت دی لیکن اس کی قدرت دعوت اور امر دینے تک محدود ہے جبکہ فاعل کی قدرت اتباع وقبول کے ساتھ ہے اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن میں مباشر (یعنی انسان جو براہِ راست کرے) اور متولد (جو اس کے اعمال کے نتیجہ کے بطور ہوں) افعال کو باہم مقرون کیا ہے چنانچہ کہا:

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)[التوبة : ۱۲۰۔۱۲۱] (یہ اس لئے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جو تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی یا محنت کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی چیز لیتے ہیں تو ہر بات پر اُن کیلئے نیک عمل لکھا جاتا ہے کچھ شک نہیں کہ اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور وہ جو خرچ کرتے ہیں تھوڑا یا بہت یا کوئی میدان طے کرتے ہیں تو یہ سب کچھ اُن کیلئے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دے) تو پہلی آیت میں اس کا ذکر کیا جو بغیر ان کی قدرتِ مفردہ کے ان کے افعال سے حادث ہو (یعنی جس کا سبب وہ خود نہیں) اور یہ جو انہیں بھوک پیاس اور تھکاوٹ پہنچی اور کہا: (كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ) تو خبر دی کہ یہ امور جو ان کے فعل سے اور ان سے منفصل ایک اور فعل سے حادث اور متولد ہوتے ہیں ان کی وجہ سے ان کے لئے عملِ صالح لکھ دیا جاتا ہے اور یہ انفاق اور قطعِ مسافت، اسی لئے کہا: (اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ) تو یہ بذاتِ خود بھی عملِ صالح ہے اور دونوں جگہ اپنے مطلوب پر ان کا ارادہ جازم تھا اور وہ یہ کہ دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو اور اس کے کلمہ کا بول بالا ہو تو جو امر بھی اس جازم ارادہ کے ساتھ حاصل ہوا جس میں ان کی قدرت نے کچھ نہ کچھ اعانت کی یہ ان کے لئے صالح عمل ہے اور اسی طرح ہدایت اور گمراہی کا داعی، جب پیروکاروں کی ہدایت اور ان کی گمراہی میں ان کا ارادہ جازم ہے اور اس ضمن میں جو اس کے بس میں تھا وہ

کر لیا تو وہ عاملِ کامل کے بمنزلہ ہے تو اس کے لئے وہی جزا ہے جو اس کی بات ماننے والوں کی جزا ہے، ہادی کے لئے ان سب کے اجور کی مثل ہے جو اس کی دعوت پر ہدایت کی اس راہ پر چلے اور مضل کے لئے تمام ضالین جو اس کی دعوت وتحریک پر اس گمراہی کی راہ پر چلے، کے وِزر کی مثل ہے، اسی طرح کسی بھی اچھے یا برے طور وطریقہ کو رواج دینے والا تو انسان ایسا تبھی کرے گا جب وہ کامل الارادہ ہے اور جو اس کے بس میں تھا وہ کر لیا ہے

اسی سے ایک متفق علیہ حدیث میں آپ کا فرمان، ابن مسعود جس کے راوی ہیں، فرمایا کسی نفس کو ظلماً قتل نہ کیا جائے گا مگر آدم کے اس پہلے بیٹے (یعنی قابیل) پر بھی اس کے خونِ ناحق کا بوجھ ہوگا کیونکہ اسی نے اس کی شروعات کی تھیں، ایک اور حدیث میں کفل کی یہ تفسیر مذکور ہوئی کہ قاتل کے گناہ جیسا گناہ، تو اس ابن آدم نے ایک معصوم کے قتل کی جنس کا آغاز کیا تھا، معصوم نفس کے قتل سے کوئی اس کے لئے مانع نہ ہوا تھا تو قیامت تک ہونے والے ہر نفس کے قتل میں وہ شریک بنا، اسی سے یہ فرمانِ خداوندی ہے:

(مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا) [المائدۃ : ۳۲] (اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے گا بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا) یہ اس امر سے مشابہ ہے کہ جس نے کسی معین رسول کی تکذیب کی وہ جنسِ رسل کی تکذیب کی مثل ہے جیسے اس میں کہا گیا:

(كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِیْنَ) [الشعراء : ۱۰۵] (قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا) **(كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِیْنَ) [الشعراء : ۱۲۳]** (عاد نے بھی رسولوں کی تکذیب کی) ونحوہا (حالانکہ ہر قوم نے اپنی طرف مبعوث ایک رسول کی تکذیب کی تھی مگر مرسلین جمع کا لفظ استعمال کیا) اسی باب سے یہ قولہ تعالیٰ ہے:

(وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَلَیُسْئَلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ) [العنكبوت : ۱۲۔ ۱۳] (اور جو کافر ہیں وہ مومنوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے طریق کی پیروی کرو ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے حالانکہ وہ اُن کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں کچھ شک نہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی اور جو بہتان یہ باندھتے رہے قیامت کے دن اُن کی ان سے ضرور پرسش ہوگی) تو خبر دی کہ ائمہ ضلال اپنے اَتباع کی خطاؤں میں سے کسی شئ کے حامل نہ ہوسکیں گے اور خبر دی کہ وہ اپنے بوجھ کے حامل ہی بنیں گے اور یہ اپنے پیروکاروں کے اوزار بغیر اس کے کہ پیروکاروں کے اوزار میں کسی طرح کی کمی ہو، اس لئے کہ ان کا اس کے ساتھ ارادہ جازم تھا اور اپنے مقدور کو کر لیا تو ان کے لئے ہر عامل کی جزا ہوئی اس لیے کہ عمل پر جزا جازم ارادہ اور فعلِ مقدور کے ساتھ ہی ہوتی ہے اور یہ جیسے صحیحین میں ابن

عباس کی ابوسفیان سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے ہرقل کو خط میں لکھا: اگر تم اعراض کرتے ہو تو تم پر اریسیین (یعنی تمہاری رعایا) کا گناہ ہے تو چونکہ ہرقل ان کے دین میں ان کا متبوع امام (قائد و بادشاہ) تھا تو واضح کیا کہ اگر حق کو نہ مانا تو اس کی رعیت کا گناہ بھی اس کے ذمہ ہوگا، اگر کہا جائے اریسیین کی اصل کا شتکار اور مزارع ہیں جیسے ترکی زبان میں طاء کا لفظ ہے تو یہ لفظ اس کی طرف مقلوب کیا جائے گا جو اس سے اعم ہے اور معلوم ہے کہ جب وہ رسول کی اتباع سے معرض ہوا تو اس پر بھی انہی کے آثام کی مثل ہے، بغیر اس کے کہ ان کے آثام سے کوئی شئ کم ہو، جیسا کہ اس پر کتاب وسنت کی تمام نصوص دال ہیں، اسی سے یہ قولہ تعالی ہے:

(اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ) [النحل : ۲۲۔ ۲۳] (تمہارا معبود تو اکیلا اللہ ہے تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔ یہ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اللہ ضرور اُس کو جانتا ہے) آگے کہا:

(لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ)[۲۵] (یہ قیامت کے دن اپنے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں) تو یہ وہ اوزار جو ان کی گمراہی کا سبب بننے کی وجہ سے حاصل ہوئے، یہ آمر کی جہت سے اور بات ماننے والے مامورین کی جہت سے حاصل ہیں تو اس ضلال کے حصول میں دونوں قدرتیں مشترک ہیں تو اسی لئے اِس پر اِس کا بعض اور اُس پر اُس کا بعض ہے، البتہ ان دونوں میں ہر بعض پر عاملِ کامل کے وزر کی مثل ہے جیسا کہ اس پر نصوص کی دلالت ہے مثلا یہ حدیث جس نے گمراہی کی طرف دعوت دی تو اس پر اس کا وزر اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والے کا وزر ہے، اسی باب سے یہ قولہ تعالی ہے:

(قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ)[الأعراف: ۳۸] (تو اللہ فرمائے گا کہ جنوں اور انسانوں کی جو جماعتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں انہی کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ، جب ایک جماعت داخل ہوگی تو اپنی ساتھ والی پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہو جائیں گے تو پچھلی جماعت پہلی کی نسبت کہے گی اے اللہ انہی لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تو ان کو آتشِ جہنم کا دگنا عذاب دے اللہ فرمائے گا سب کو دگنا، مگر تم نہیں جانتے) تو اللہ سبحانہ نے خبر دی کہ پیروکاروں نے مطالبہ کیا (کریں گے) کہ ائمہ ضلال کو دگنا عذاب دیا جائے جیسے اس آیت میں کہا:

(وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا) [الأحزاب : ۶۷۔۶۸] (اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا تو انہوں

نے ہم کوراستے سے گمراہ کر دیا۔اے ہمارے رب! ان کودگنا عذاب دے اوران پر بڑی لعنت کر) اورخبر دی کہ اتباع اور متبوعین دونوں کے لئے ہی دگنا عذاب ہے لیکن اتباع کے یہ علم میں نہ ہوگا،اسی لئے ائمہِ ہدی کے لئے عظیم مدح وثناء اور ائمہ ضلال کے لئے عظیم ذم ولعنت واقع ہوئی حتی کہ ایک اثر میں مروی ہے۔اس کی اسناد اب ذہن میں نہیں۔کہ آگ میں کوئی عذاب نہیں مگر اس کی ابتداء ابلیس سے کی جائے گی پھر کسی اور حقدار پر اس کا اجراء ہوگا اور جنت کی کوئی نعمت نہیں مگر سب سے پہلے ہمارے نبی اکرم کو اس سے محظوظ کیا جائے گا پھر اوروں تک اس کا حظ پہنچے گا،تو آپ ہی بنی آدم کے اولین وآخرین کے لیے ہدایت میں امامِ مطلق ہیں جیسے کہا میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور میں فخر نہیں کر رہا،آدم اور دیگر تمام روزِ قیامت میرے علم تلے ہوں گے اور میں یہ بات فخر یہ نہیں (بلکہ بحکمِ خداوندی جانکاری دینے اور تحدیثِ نعمت کے بطور) کہہ رہا ہوں،آپ ہی حساب کا آغاز کرانے میں سب اولین وآخرین کے شفیع ہیں اور سب سے قبل آپ ہی جنت کا دروازہ کھٹکٹائیں گے،اس کی تفصیل یہ کہ اللہ نے تمام خلائق سے پختہ وعدہ لیا کہ موقع ملا تو آپ پر ایمان لائیں گے جیسا کہ ہر نبی سے میثاق لیا ہوا تھا کہ اپنے سے سابق نبی پر ایمان لائے گا اور بعد والوں کا مصدق بنے گا،فرمایا:

(وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَآ اٰتَيْتُكُم مِّن كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ) [آل عمران : ۸۱] (اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اُس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اُس کی مدد کرنی ہوگی)الآیۃ،تو کلام کا افتتاح موطیٔ للقسم لام سے کیا(لَتُؤْمِنُنَّ الخ) جسے تب لایا جاتا ہے جب کلام قسم اور شرط پر مشتمل ہواور (مَا) شرطیہ پالام کو داخل کیا تا کہ عموم کو مبین کرے اور معنی ہوا جب بھی تمہاری طرف کوئی کتاب وحکمت بھیجوں تو تمہارے ذمہ ہے کہ جب وہ مصدّق نبی آجائے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی نصرت کرو جیسا کہ ابن عباس نے کہا اللہ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا مگر اس سے عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمدؐ مبعوث ہو جائیں تو آپ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی نصرت کریں گے، اللہ نے آپ کے تذکرہ کی تشہیر کی اور ملاِ اعلیٰ میں آپ کا اعلان کیا جب ابھی آدم کا ڈھانچہ پڑا تھا اور اس میں روح پھونکی جانی تھی جیسا کہ میسرۃ الفجر کی حدیث میں ہے،کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ کب نبی تھے؟ایک روایت کے الفاظ ہیں: (مَتىٰ كُتِبْتَ نَبِيًّا) (آپ کب نبی۔کے بطور۔لکھے گئے؟) تو فرمایا جب آدم ابھی روح وجسد کے درمیان تھے،اسے مسند احمد میں روایت کیا،اسی طرح انہی کی نقل کردہ عرباض بن ساریہ کی حدیث میں ہے۔اور یہ حسن حدیث ہے۔کہ نبی اکرم نے فرمایا بے شک میں اللہ کے ہاں خاتم النبیین ہوں جبکہ آدم کی ابھی مٹی گوندھی جارہی تھی تو اللہ نے اس وقت میں مقدر ومکتوب کر دیا اور اس حال میں آپ کو اولادِ آدم کا سردار مقدر کر دیا جیسا کہ ذریتِ آدم سے حالِ مولود مقدر کیا اور لکھ بھی دیا اور ابھی آدمؑ کا جسد تخلیقی مرحلہ میں تھا کہ روح پھونکی

جانی تھی جیسا کہ یہ صحیحین کی ابن مسعود سے حدیث میں بھی ثابت ہے تو جو بھی اولین وآخرین میں سے آپ پر ایمان لایا وہ اس پر مُثاب ہوا، اگرچہ اس شخص کا ثواب جو آپ پر ایمان لایا اور مفصل شرائع میں آپ کی اطاعت کی اس کے ثواب سے اعظم ہے جو ایمانِ مجمل لایا اس امر پر کہ تمام ذریت کے لئے آپ امامِ مطلق ہیں اور آپ کے لئے اولین وآخرین میں سے ہر مومن کے ایمان سے حصہ ہے جیسے ابلیس کے لئے جن وانس کی ہر بدی وگمراہی سے حصہ ہے، تو یہ اس مروی اثر کو محقق اور اس کی تائید کرتا ہے جو شعیب بن ابوحمزہ کے نسخہ میں زہری کے حوالے سے نبی اکرم سے مرسلاً۔ یا تو زہری کے مراسیل سے یا ان کے اوپر کے تابعین کے مراسیل سے۔ مروی ہے، فرمایا میں داعی بنا کر مبعوث کیا گیا، ہدایت دینا میرا کام نہیں اور ابلیس مزین ومُغوِی بنا کر بھیجا گیا ہے، گمراہی دینا اس کا کام نہیں ہے

بعض وجوہ سے اس باب میں سنن کی ایک حدیث میں آپ کا یہ فرمان بھی داخل ہے کہ تمام امت کے ساتھ میرا وزن کیا گیا تو میرا پلڑا راجح (یعنی بھاری) ہوا **پھر ابوبکر کا بمقابلہ ساری امت وزن ہوا** تو ابوبکر راجح پڑے پھر عمر بمقابلہ ساری امت وزن کئے گئے تو عمر راجح ہوئے پھر ترازو اٹھا لیا گیا (یہ ایک خواب بیان کیا تھا) جہاں تک ساری امت کے مقابلہ میں نبی اکرم کا راجح ہونا تو یہ ظاہر ہے اس لئے کہ آپ کے لئے تمام امت کے اجور کی مثل اجر ہے، جہاں تک ابوبکر وعمر تو اس لئے کہ ان کے لئے تمام امت کے ایمان میں جازم ارادہ کے ساتھ معاونت تھی اور اس ضمن میں حضرت ابوبکر حضرت عمر سے سابق تھے اور ان سے زیادہ قوی ارادہ والے تھے تو یہ دونوں حضرات ایمانِ امت کے سلسلہ میں تمام دقیق وجلیل امور میں نبی اکرم کی معاونت کیا کرتے تھے، حیات میں بھی اور بعد از وفات بھی (جیسے ایک روایت میں کہا کہ ابوبکر وعمر میرے وزیر ہیں) اسی لئے احد کے روز ابو سفیان نے پوچھا کیا ان لوگوں میں محمد موجود ہیں؟ کیا ابن ابوقحافہ موجود ہیں؟ کیا ابن خطاب موجود ہیں؟ آپ نے ہدایت دی ہوئی تھی کہ جواب نہ دینا، جب جواب میں سکوت پایا تو بولا یہ تینوں (جن پر اسلام کا دار ومدار تھا) تو گئے، اب کے حضرت عمر سے صبر نہ ہو سکا، بولے اے دشمنِ خدا تو جھوٹا ہے! جن کے تم نے نام لئے وہ بفضلِ خدا (تیرے سینے میں مونگ دَلنے کو) سب زندہ ہیں، اسے بخاری اور مسلم نے براء بن عازب کی روایت سے نقل کیا، تو ابوسفیان نے جو اس وقت کفر کا سرغنہ تھا انہی تینوں بارے پوچھا اس لئے کہ اہلِ ایمان کی زمامِ کار انہی تینوں کے ہاتھ میں تھی جیسے صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر کا جنازہ لا کر رکھا گیا تو حضرت علی نے کہا اللہ کی قسم زمین کی سطح پر اس چادر سے ڈھانپے ہوئے سے زیادہ کوئی مجھے عزیز نہیں کہ اللہ سے میں اس کے جیسے عمل کے ساتھ ملوں اور واللہ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کو اللہ اپنے دونوں ساتھیوں (یعنی نبی اکرم اور حضرت ابوبکر) کے ساتھ محشور کرے گا کہ بارہا میری سماعتوں میں یہ آوازیں پڑیں کہ نبی اکرم کہتے تھے: میں اور ابوبکر وعمر داخل ہوئے، میں اور ابوبکر وعمر نکلے، میں اور ابوبکر وعمر گئے، اس قسم کی نصوص کثیر ہیں جو ابوبکر وعمر کے اس استحقاق کی تبیین کرتی ہیں کہ ان کے لئے تمام امت کے اعمال کی مثل اجر ہے جازم ارادہ کے وجود کے باعث اس پر قدرت کے تمکّن کے ساتھ بخلاف اس کے جس نے بعض پر

اعانت کی اور بعض پر نہ کی اور اس کے بعض میں اس سے ارادہ پایا گیا اور بعض میں نہ پایا گیا، نیز جازم ارادہ والا مرید فعلِ مقدور کے ساتھ عاملِ کامل کے بمنزلہ ہے اگر چہ وہ امام وداعی نہ بھی ہو جیسے کہا:

(لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۔۔۔دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا)[النساء : ۹۵۔۹۶] (جو مسلمان بیٹھ رہے اور کوئی عذر نہیں رکھتے وہ اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑتے ہیں وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ۔۔۔ اس کی طرف سے درجات میں اور بخشش میں اور رحمت میں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے) تو اللہ تعالی نے مجاہد اور اس قاعد کے مابین نفیِ مساوات کی جو عاجز اور معذور نہیں لیکن عاجز قاعد اور مجاہد کے مابین مساوات کی نفی کی نہیں کی بلکہ کہا جاتا ہے دلیلِ خطاب اس کی اس سے مساوات کو مقتضی ہے اور لفظِ آیت صریح ہے کہ اولی الضرر (یعنی معذورین) کو نفیِ مساوات سے مستثنیٰ کیا تو یہاں استثناء نفی سے ہے اور یہ مقتضی ہے کہ اولی الضرر کبھی قاعدین کے مساوی ہو سکتے ہیں اگر چہ کلی طور سے وہ ان کے مساوی نہ ہوئے، اس کی موافقت اس حدیث سے ملتی ہے جس میں ہے کہ نبی اکرم نے غزوہ تبوک میں کہا مدینہ میں کچھ ایسے افراد ہیں کہ تم کسی راستہ پر نہ چلے اور کوئی وادی قطع نہ کی مگر وہ تمہارے ساتھ تھے، عرض کی مدینہ میں رہتے ہوئے؟ فرمایا ہاں انہیں عذر نے روک لیا، تو خبر دی کہ مدینہ میں قاعد جسے کسی شرعی عذر نے ہمراہ جانے سے روک لیا وہ ان کی مثل ہے جو اس غزوہ میں آپ کے ہمراہ تھے اور معلوم امر ہے کہ اس غزوہ میں جو آپ کے ہمراہ تھے ان میں سے ہر ایک کو اس کی نیت کے بقدر ثواب دیا جائے گا تو اسی طرح ان قاعدین کو بھی جنہیں کسی عذر نے روک لیا، اسی باب سے جو صحیحین میں ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جب بندہ بیمار ہو جائے یا وہ سفر میں ہو تو اس کے لئے وہی عمل لکھا جاتا ہے جو وہ دیگر ایام میں کرتا تھا کیونکہ اب ان کا ترک بوجہِ عجز ومشقت کے ہوا ہے، نہ کہ نیت میں ضعف اور فتور آجانے کے سبب تو اس کے لئے جازم ارادہ ثابت ہے، اس سے فعل متخلف نہیں ہوا مگر ضعفِ قدرت کی وجہ سے مسافر اور بیمار آدمی مشقت کے ساتھ وہی فعل کر سکتا ہوتا ہے مگر شرعی قدرت وہ ہے جس کے ساتھ بغیر راجح مضرت کے فعل کا حصول ہو جیسے اس قولہ تعالی میں کہا:

(فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا) [المجادلة : ۴] (جو نہ پائے تو مجامعت سے پہلے متواتر دو مہینے کے روزے رکھنا ہے تو جسے اس کا بھی مقدور نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے) شرع میں وہ قدرت معتبر نہیں جس کے ساتھ وجودِ فعل ممکن ہوتا ہے جس طور بھی ہو، بلکہ ضروری ہے کہ ممکنہ فعل راجح مضرت سے خالی ہو بلکہ یا مکافیٔ ہو (یعنی دونوں پلڑے ایک برابر ہوں) اسی باب سے جو نبی اکرم سے منقول ہے کہ آپ نے کہا جس نے کسی غازی کو تیار کرایا اس نے گو یا خود جہاد کیا اور جو اس کے گھر والوں کی خیر کے ساتھ نگہداشت کرتا رہا اس نے بھی گو یا جہاد کیا، اور ایک میں فرمایا جس نے کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا اس کے لئے اسی جیسا اجر ہے بغیر اس کے کہ اس کے اجر میں کوئی کمی ہو، جہاد بذلِ نفس اور بذلِ مال کے ساتھ ہوتا ہے تو جب ایک نے بذلِ

بدن کیا اور دوسرے نے بذلِ مال کیا اور دونوں میں سے ہر ایک جازم ارادے کے ساتھ ہے لہذا اپنی مبلغِ قدرت کی رو سے دونوں مجاہد بنے، اسی طرح مجاہد کے اہل وعیال اور متاع کی نگہداشت اور خبرگیری کے لئے کسی کا ہونا ضروری ہے تو اس ذمہ داری کو بطریقِ احسن جس کسی نے ادا کیا تو اس کے لئے بھی مجاہد جیسا اجر ہے، اسی طرح روزوں کے ضمن میں غذا ضروری ہے جس کے ساتھ روزہ تام ہوتا ہے کہ جو روزہ دار کھانے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ روزے سے بھی متمکن نہیں ہوسکتا، اسی طرح ایک صحیح حدیث میں آپ کا فرمان کہ جب خاتون اپنے شوہر کے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے، بغیر اس کے کہ ضیاع اور خراب کرے تو اسے اور اس کے شوہر دونوں کو یکساں اجر ملے گا، ایک دوسرے کے اجر میں کمی کا باعث نہ بنیں گے، اسی طرح ابوموسی کی حدیث میں آپ کا فرمان: وہ امانت دار خازن جو دئے گئے حکم کو خوشدلی سے ہو بہو بجا لائے تو وہ بھی یکے از متصدقین ہے، اسے بخاری اور مسلم نے نقل کیا اس لئے کہ جو خازن کی یہاں صفت مذکور ہوئی وہ جازم ارادے کے وجود کے ساتھ ہی ہوگی جو آمر کے ارادے کے موافق ہوگی اور جو اس کے بس (اور دائرہِ اختیار) میں تھا یعنی حکم کی بجا آوری وہ کرلیا لہذا اس اجر کا مستحق ہوا

اور اسی باب سے ابوکبشہ انماری کی روایت جسے احمد اور ابن ماجہ نے نقل کیا کہ نبی اکرم نے فرمایا **دنیا چار افراد کے لئے ہے**: ایک وہ آدمی جسے اللہ نے علم اور مال دیا تو وہ اللہ کی حکم کی طاعت میں انہیں روبعمل لاتا ہے، تو ایک نے کہا اگر میرے لئے بھی وہ کچھ ہو جو فلاں کے لئے ہے تو میں بھی اسی جیسے عمل کروں، فرمایا دونوں اجر میں ایک برابر ہیں، اسے ترمذی نے مطولاً نقل کیا اور کہا یہ حسن صحیح حدیث ہے تو یہ برابری اجر اور وِزر دونوں میں ہے، یہ اس شخص کے حال کی حکایت میں ہے جس نے یہ بات کہی اور وہ اس میں صادق النیت تھا اور اللہ نے اس سے جازم ارادہ جان لیا کہ اس سے فعل متخلف نہیں ہوا مگر قدرت کے نہ ہونے کی وجہ سے لہذا ثواب وعقاب میں دونوں برابر ہیں، بہ حال ہر یہ بات کہنے والے کے لئے حاصل نہیں مگر اسی صورت کہ جب اس کے لئے جازم ارادہ ہو، ایسا کہ جس کی رو سے وجودِ قدرت کے ساتھ عمل حاصل ہوتا ہے وگرنہ تو کثیر لوگ یہ بات عزم سے کہہ دیتے ہیں لیکن اگر قدرت ملے تو ان کی عزیمت فسخ ہوجاتی ہے جیسے عام لوگ عہد کرتے اور انہیں توڑتے رہتے ہیں، ایسا نہیں کہ ہر جس نے کسی شئ پر قبل از قدرت جازم عزم کیا اور فعل سے عدم موانع کی صورت میں تو موانع کے مقارن قدرت کے وقت اس کا ارادہ قائم اور باقی رہے، جیسے کہا:

(وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ) [آل عمران: ۱۴۳] (اور تم موت کے آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے پس تم نے اُس کو آنکھوں سے دیکھ لیا)

(يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ) [الصف: ۲] (اے مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟)

(وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ

وَتَـوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ)[التوبة : ۷۵۔۷۶] (اوران میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنی مہربانی سے عطا فرمائے گا تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور نیکوکاروں میں ہو جائیں گے ۔لیکن جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور رُوگردانی کر کے پھر بیٹھے) نیتوں بارے ابو کبشہ کی حدیث کلمات حدیثِ بطاقہ کی مثل ہے، یہ جسے ترمذی وغیرہ نے عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا کہ نبی اکرم نے فرمایا امت محمد یہ کا ایک فرد ایسا بھی ہوگا کہ روزِ قیامت اللہ اس کے ننانوے رجسٹر لا پھیلائے گا اور ہر رجسٹر تاحدِ نظر ہوگا، کہے گا کیا اس میں سے تم کسی شئی کا انکار کرتے ہو؟ کیا میں نے تم پر ظلم کیا ؟ کہے گا نہیں اے رب ! کہا جائے گا آج کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا، تو ایک بطاقہ لایا جائے گا جس میں توحید ہوگی، اسے ایک پلڑے میں جبکہ ان تمام رجسٹروں کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا تو بطاقہ والا پلڑا بھاری پڑے گا، تو یہ جب اس کلمۂ توحید کے ساتھ صدق، اخلاص، صفاء اور حسنِ نیت کا اقتران ہوا کہ عبادات اور کلمات اگرچہ ظاہری شکل وصورت میں باہم مشترک ہوں مگر دلوں کے احوال کے بحسب ان میں عظیم تفاوت ہوتا ہے، اسی کی مثل وہ حدیث جس میں ایک طوائف کا کتے کی پیاس کا مداوا کرنے کا ذکر ہے جس کی وجہ سے اللہ نے اس کے عمر بھر کے گناہ معاف کر دئے تو اس کی وجہ سے اس کے دل میں حاصل حسنِ نیت اور رحم کا وہ جذبہ بنا جو کتے کو پیاسا پا کر جاگا اور یہ جیسے آپ نے فرمایا آدمی کئی دفعہ اللہ کی رضوان کا ایسا بول منہ سے نکالتا ہے اور اس کے وہم وگمان میں بھی وہ اجر نہیں جو قیامت کے دن اس بول کی جزا میں اپنے نامہ اعمال میں لکھا پائے گا، اسی طرح اللہ کی ناراضی مول لینے والا بول بھی ۔

فصل

اس سے واضح ہوا کہ وہ احادیث جن کی رو سے **ھامّ (دل میں کسی کام کی بابت سوچنے والا) اور عامل کے مابین تفریق** ہے تو یہ دراصل جازم ارادے سے کمتر میں ہے وہ جس کے ساتھ فعل کا اقتران ضروری ہے جیسے صحیحین کی ابورجاء عطاردی کی ابن عباس سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالی فرماتا ہے بے شک اللہ نے حسنات اور سیآت کی کتابت کر لی ہے، پھر تفصیل یہ بیان کی کہ جس نے نیکی کا ھمّ کیا مگر عمل نہ کر سکا اللہ نے اسے اپنے پاس بطور کامل نیکی کے لکھ لیا اور جس نے ھمّ کے بعد اسے عملی جامہ بھی پہنا دیا اللہ اسے اپنے پاس دس نیکیوں کے بطور لکھے گا اور جس نے برائی کا ھم کیا اور (اللہ کے ڈر سے) عمل نہ کیا تو اللہ نے اپنے پاس اسے بطور ایک کامل نیکی کے لکھا، اگر ھم کے بعد عمل بھی کر ڈالا تو اللہ نے اسے اپنے پاس ایک برائی کے بطور لکھا، صحیحین میں اس کا نحو حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے ہے، تو یہ تقسیم ایسے شخص کے بارہ میں ہے جس کے لئے عمل کرنا ممکن تھا، اسی لئے (فَعَملَهَا) کا لفظ مذکور ہے اور یہ جسے فعل ممکن تھا مگر (خوفِ خدا ذہن میں لا کر) نہ کیا تو اس کا مطلب ہوا کہ کرنے کا جازم ارادہ نہ تھا کہ جازم ارادہ جیسا کہ گزرا قدرت کے ساتھ فعل کو مستلزم ہوتا ہے کیونکہ یہ وجودِ فعل میں کافی اور اس کا موجب ہے کہ اگر کسی اور شئ پر یہ متوقف تھا تو (اس کا مطلب ہوا کہ) ارادہ جازم قدرت کے باوجود وجودِ فعل میں کافی نہ ہوا اور معلوم ومحسوس

ہے کہ معاملہ اس کے برخلاف ہے اور بلا شبہ ھمّ ،عزم اور ارادہ ونحو ہا کبھی جازم ہوتے ہیں اور ان سے فعل متخلف نہیں ہوتا مگر بوجہِ عجز اور کبھی جزم کی اس وجہ پر نہیں ہوتے تو اس دوسری قسم میں مرید اور فاعل کے مابین تفرقہ کیا جائے گا بلکہ ارادے اور ارادے کے مابین بھی فرق کیا جائے گا کیونکہ ارادہ دل کا عمل ہے جو جسم کا بادشاہ ہے، جیسے ابو ہریرہ نے کہا تھا کہ دل جسم کا بادشاہ اور اعضاء اس کے لشکری ہیں، اگر بادشاہ ٹھیک ہے تو لشکری بھی ٹھیک ہوں گے اور اگر وہ خراب ہے تو لشکری بھی ایسے ہی ہوں گے، اسی کی تحقیق جو صحیحین کی نعمان بن بشیر سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جسم میں ایک لوتھڑا ہے جو اگر درست ہو تو سارا جسم درست ہوگا اور اگر وہ خراب و نا درست ہے تو تمام جسم ایسا ہوگا اور یہ دل ہے، تو جب نیکی کا ھمّ کیا مگر کر نہ سکا تو گویا نیکی کر لی اور اس کے لئے وہ نیکی لکھ دی جائے گی کہ یہ طاعت وخیر ہے، عرفِ عام میں بھی اسی طرح ہے، جیسے کہا گیا

لَأَشْکُرَنَّکَ مَعْرُوْفاً هَمَمْتَ بِهٖ　　إِنَّ اهْتِمَامَکَ بِالْمَعْرُوْفِ مَعْرُوْفٗ

وَلَا اَلُوْمُکَ إِنْ لَمْ یُمْضِهٖ قَدَرٌ　　فَالشَّیْءُ بِالْقَدَرِ الْمَحْتُوْمِ مَعْرُوْفٗ

(میں بھلائی بارے تمہاری سوچ پر۔بھی۔تمہارا اشکر گزار ہوں، تمہارا نیکی کا اہتمام [یعنی اس بارے سوچنا] بھی نیکی ہے۔میں تجھے ملامت نہ کروں گا اگر تقدیر نے اس سوچ کو عملی جامہ نہ پہنایا کیونکہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر سے ہے) اگر عمل بھی کر لیا تو اللہ تعالی اس کے لئے دس نیکیاں لکھے گا، اس رحمت کی رو سے جو طے کر دی ہے کہ جو ایک نیکی لایا اس کے لئے اس کا دس گنا ہے، سات سو گنا تک جیسے کہا:

(مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ) [البقرة: ۲۶۱] (جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال اُس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں) اور جیسے ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم نے اونٹنی اللہ کی راہ میں تصدق کے لئے لانے والے سے کہا تھا روزِ قیامت اس کے بدلے تمہارے لئے سات سو مہار بندھی اونٹنیاں ملیں گی، اور بھی اضعاف ہیں، حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعا مروی ہے کہ فرمایا کہ اس کے عوض لاکھ نیکیاں ملیں گی، جہاں تک کسی برائی بارے سوچنے والا جس نے اس پر عمل نہ کیا اور وہ اس پر قادر تھا تو اللہ اس کے نامہِ اعمال میں درج نہیں کرے گا، جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں اس کی خبر دی، چاہے اس کے اس ھمّ کو ارادہ کا نام دیا جائے یا عزم کا، یا یہ نام نہ دیا جائے، جب وہ فعل پر قادر ہو، اگر ھمّ و ارادہ کیا مگر قدرت ہونے کے باوجود عمل نہیں کیا تو گویا اس کا ارادہ جازم نہیں اور یہ ایک صحیح حدیث میں آپ کے اس فرمان کے موافق ہے جسے ابو ہریرہ نے نقل کیا کہ فرمایا بے شک اللہ نے میری امت سے دل میں آنے والے خیالات سے درگزر کر دیا ہے جب تک انہیں زبان پر نہ لائے یا عمل نہ کرے، تو بعض ان امور میں جن کا بندے نے ھمّ کیا کہ جن پر کلام وعمل کے لحاظ سے قادر تھا مگر نہ تکلم کیا اور نہ عمل تو (یہ دلیل ہے کہ) اس کا ارادہ جازم نہ تھا، تو یہ انہی میں سے ہے جو اللہ اس کے خلاف نہیں لکھے گا جیسا کہ اس پر یہ قولہ شاہد ہے: (مَنْ

هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا) (گزری) اور ابن عبد البر وغیرہ جنہوں نے اس مسئلہ میں اس حدیث پر اجماع نقل کیا وہ اس اعتبار سے صحیح ہے، اور یہ سیئہ کا هامّ یا تو اللہ کی خشیت اور خوف کے مدِ نظر اس کا ترک کرے گا یا کسی اور وجہ سے، اگر خشیت کی وجہ سے ترک کیا تو اللہ اپنے پاس اس کے لئے اسے کامل ایک نیکی لکھے گا جیسا کہ حدیث میں اس کی تصریح کی اور جیسے ایک اور حدیث میں ذکر ہوا کہ اسے اس کی نیکی لکھ دو کیونکہ میری خاطر اس کا ترک کیا ہے (مِنْ اَجْلِیْ) یا (مِنْ جَرَّائِیْ) کا لفظ مذکور ہے اور اگر کسی اور وجہ سے ترک کیا ہے تو کم از کم یہ اس کی سیئہ کے بطور نہ لکھی جائے گی، جیسا کہ ایک حدیث میں کہا کہ اگر اس ارادہ پر عمل نہ کرے تو اسے اس کے خلاف نہیں لکھا جاتا تو یوں احادیث کے معانی باہم متفق ہو جاتے ہیں، اور اگر عمل کر لیا تو اب صرف ایک سیئہ لکھی جائے گی، اللہ تعالی سیآت کو مضاعف نہیں کرتا جیسے نیکیوں کو کرتا ہے، آخرت میں انسان کو انہی کی جزا ملے گی جو خود اس نے عمل کئے ہوں گے اور جہنم کو نہ بھرا جائے گا مگر جن وانس کے اَتباع ابلیس سے جیسے کہا:

(لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ) [ص : ۸۵] (کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے سب سے جہنم کو بھر دوں گا) اسی لئے صحیحین میں حضرات انس اور ابو ہریرہ کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا جنت میں فاضل حصہ بچ جائے گا جس کی آبادکاری کے لئے اللہ آخرت میں کئی اقوام کا اِنشاء کرے گا جبکہ دوزخ میں اتنا رش ہوگا کہ اس کا بعض بعض میں پھنسے گا اور وہ ابلیس کے پیروکاروں سے بھرا ہوا ہوگا، اسی لئے ائمہِ عدل مثلا احمد وغیرہ سے صحیح منصوص مشرکین کی اولا د بارے توقف کرنا ہے، ان میں سے کسی معین کے جنتی یا جہنمی ہونے پر جزم نہ کیا جائے گا بلکہ ان کی بابت کہا جائے گا جیسے نبی اکرم نے دو صحیح حدیثوں میں کہا جن کے راوی ابو ہریرہ اور ابن عباس ہیں کہ اللہ ہی کو زیادہ علم ہے کہ وہ کیا عمل کرتے (اگر بڑا ہونا انہیں نصیب ہوتا) ابو ہریرہ کی حدیث متفق علیہ ہے جبکہ ابن عباس کی صرف بخاری میں ہے، بخاری کی سمرہ بن جندب سے روایت میں ہے کہ ان کے کئی جنت میں داخل ہوں گے اور یہ بھی منقول ہوا کہ ان کے کئی دوزخ میں داخل ہوں گے، جیسے مسلم کی اس روایت میں اس لڑکے کا قصہ مذکور ہے جسے حضرت خضر نے قتل کیا تھا اور یہ کئی وجوہ سے اس مروی کی تحقیق کرتا ہے کہ روزِ قیامت ان کا امتحان لیا جائے گا تو ان کے بارہ میں اللہ کا علم ظاہر ہو جائے گا تب ان کی طاعت ومعصیت کی رو سے انہیں بدلہ دے گا، تو یہ وہ موقف ہے جسے اشعری نے اہلِ سنت وحدیث سے نقل کیا اور اپنا مختار بھی یہی لکھا، جہاں تک گمراہی کے پیشوا جن پر ان کی بات ماننے والوں کے وزر ہوں گے اور ان کے نحو تو ہم بیان کر چکے کہ ان کا معاقبہ فعل پر قدرت کے ساتھ ان کے جازم ارادہ کے وجود کی رو سے ہوا جیسے ابو کبشہ کی حدیث میں کہا کہ وہ دونوں وِزر میں ایک برابر ہیں تو اس قدرت فی الفعل کی رو سے وہ فاعل تام کے بمنزلہ ہوئے اور سیئہ کا وہ ھام جس نے باوجود اس پر قادر ہونے کے اس پر عمل نہ کیا تو اس سے جازم ارادہ نہیں پایا گیا ہے، اسی سے ائمہ کا قول ظاہر ہے جیسے امام احمد نے کہا ھم دو طرح کا ہے: ایک

(هَمُّ خَطِرَاتٍ) (یعنی عارضی سوچیں) اور دوم (هَمُّ إِصْرَارٍ) (مسلسل دل میں کوئی خیال جاگزین رہنا) تو اول قادر سے ہے تو اگر اس کا ھم جازم اصرار ہوتا اور وہ قادر ہے تو فعل کا وقوع ہوا ہوتا، اسی باب سے حضرت یوسف کا ھم ہے جب کہا:

(وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰبُرْهَانَ رَبِّهٖ)[یوسف : ۲۴] (اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی نشانی نہ دیکھتے) الآیۃ، جہاں تک اس مراوِد (یعنی ورغلانے والی) خاتون کا ھم تو کہا گیا وہ ھمِ اصرار تھا اس لئے کہ جو اس کے بس میں تھا اس نے وہ کر لیا، اسی طرح جو منافقین بارے اس آیت میں ذکر کیا:

(وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا) [التوبة : ۷۴] (اور ایسی بات کا قصد کیا جس پر قدرت نہیں پا سکے) تو یہ مذکورہ ھم مذموم ھم ہے جیسا کہ اللہ نے اس پر ان کی ذم کی اور اس کا مثل مذموم ہوتا ہے اگر چہ جازم نہ بھی ہو

جیسا کہ اس تحریر کے آخر میں ہم فرق واضح کریں گے اس کے مابین جو ایمان کے منافی ہے اور اس کے مابین جو اس کے منافی نہیں، اسی طرح سیآت پر حریص، ان کے کرنے کے ارادہ کا جازم جب مجرد عجز ہی اس کے لئے مانع ہوا ہو (یعنی عمل کرنے کا موقع نہ ملا) تو ابو کبشہ کی حدیث کی رو سے یہ فاعل کی عقوبت کی مثل معاقَب ہوگا اور جیسے اس حدیث میں وارد ہوا کہ جب دو تلوار بدست مسلمان آمنے سامنے آئیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں، پوچھنے پر مقتول کے بارہ میں کہا کہ وہ بھی تو فریقِ مخالف کے قتل پر حریص تھا، ایک روایت کے الفاظ ہیں: (إِنَّهٗ اَرَادَ قَتْلَ صَاحِبِهٖ) (یعنی اس کا بھی اسے قتل کرنے کا ارادہ تھا) تو یہ ارادہ حرص ہے اور یہ جازم ارادہ اور اس کے ساتھ مقدور پایا گیا ہے اور وہ قتال کرنے اس کے سامنے آنا ولیکن قتل کرنے سے وہ عاجز رہا اور یہ اس ھم سے نہیں جو لکھا نہ جائے گا اور نہ یہ کہا جائے گا کہ وہ اس کا مجرد اپنے قول کی وجہ سے مستحق بنا کہ اگر میرے لئے بھی وہ کچھ ہوتا جو فلاں کے لئے ہے تو میں بھی اس کے جیسے عمل کرتا، تو کبائر کی فقط تمنا پر مجرد تکلم کے ساتھ ان کے فاعل جیسی عقوبت نہیں بلکہ ایک اور امر کا ہونا بھی ضروری ہے اور مذکور نہیں کہ وہ اپنی کلام پر معاقب ہوگا، صرف یہ ذکر کیا کہ وزر میں دونوں ایک برابر ہیں، اس پر قولہ: (إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِيْ الخ) جازم ارادہ پر عقوبت ہونے کے منافی نہیں وہ جو لازم ہے کہ اس کے ساتھ فعل مقترن ہو! تو جازم ارادہ وہ ہے جس کے ساتھ فعل سے مقدور بھر مقترن ہو وگرنہ وہ جازم نہ ہوا تو زنا، چوری اور شراب نوشی کرنے کا مرید جس نے اس پر عزم کیا ہوا ہے اگر اس کا یہ ارادہ وعزم جازم ہے تو ضرور وہ کچھ کرے گا جو اس کے بس میں ہے! چاہے یہ جہتِ معصیت سے اس کی تقریب ہو، مثلاً جس نے چوری کا ارادہ کیا ہو تو (چوری کی نیت سے) مالِ مسروق کی جگہ کے قریب جائے اور مثلاً زنا کے ارادے والے کی نظر بازی اور مزنیٰ بہ (یعنی جس سے زنا کا ارادہ کرنا ہے) کی طرف استماع (یعنی اس کے آگے پیچھے پھرنا) بات کرنا اور جیسے شراب کی طلب والتماس کرنا (کہ کہاں سے اور کیسے ملتی ہے) تو جازم ارادے کے ساتھ فعل کے مقدمات میں سے کسی شئ کا ہونا لازم امر ہے بلکہ فعل کے مقدمات تو بغیر جازم ارادہ کے بھی پائے جا سکتے ہیں

جیسے ایک متفق علیہ حدیث میں کہا آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظر بازی ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اور اس کا زنا (متعلقہ) گفتگو کرنا ہے، ہاتھ بھی زنا کرتا ہے اور اس کا زنا بطش ہے (ناجائز پکڑنا اور غصب کرنا) پاؤں بھی زنا کرتا ہے اور اس کا زنا مشی ہے (یعنی برائی کی جگہوں کی طرف جانا) اور دل تمنا وخواہش کرتا ہے اور فرج اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے، اسی طرح حضرت ابوبکرہ کی متفق علیہ حدیث کہ جب تلوار بدست ۔۔۔ الخ جو قبل ازیں گزری تو دونوں کے ساتھ جازم ارادہ تھا اور ہر ایک نے وہ کچھ کرلیا جو اس کے بس میں تھا اور ایک بوجہ عجز اپنے ساتھی کے قتل سے متمکن نہ ہوسکا، یہ فعلِ مستقبل پر مجرد ھم اور مجرد عزم نہ تھا لہذا آگ کا مستحق ہوا، جازم ارادہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا وہ ہے جس کے ساتھ ممکن مقدور کرلیا تو اس صاحبِ ارادہ کا معاملہ فاعلِ تام کے بمنزلہ ہوگا، تام ارادہ بارے ذکر کیا کہ لازم ہے کہ اس کے ساتھ مقدور یا اس کا کچھ حصہ کیا ہو اور جب مقدور فعل کا ترک کیا ہو تو یہ جازم نہ ہوگا بلکہ کبھی وہ جازم ہوگا اس میں جو اس نے کیا، نہ کہ اس میں جو اس نے قدرت کے باوجود ترک کیا، اس کی مثل جو زنا کے مقدمات اختیار کرے مثلاً لمس، نظر، بوسہ اور فاحشہ کبریٰ (یعنی جماع) سے ممتنع رہے، اسی لئے سابق الذکر حدیثِ ابوہریرہ میں کہا دل تمنا اور خواہش کرتا ہے یعنی وطی کی، (یُــرِیْـدُ) کا لفظ ذکر نہیں کیا اور مجرد تمنا اور شہوت جازم ارادہ نہیں ہوتے اور یہ وجودِ فعل کو مستلزم نہیں لہذا اس پر معاقب نہ ہوگا، عقاب تبھی ہوگا جب جازم ارادہ کیا، قدرت کے ساتھ اور جازم ارادہ وہی کہ فرج جس کی تصدیق کرے، صحیحین کی ابن مسعود سے روایت میں ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے بوسہ بازی کی پھر نبی اکرم کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا تو اللہ نے یہ آیت نازل کی:

(وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ) [هود : ۱۱۴] (اور دن کے دونوں کناروں اور رات کی چند ساعات میں نماز پڑھا کرو، بے شک نیکیاں گناہوں کو لے جاتی ہیں) الآیۃ، وہ بولا کیا یہ صرف میرے لئے ہے؟ فرمایا قیامت تک سب کے لئے، تو اس قسم کے اشخاص کی نسبت عموماً ضروری ہے کہ اس کا ھم کرے جو اس سے اکبر ہے، جیسے کہا دل تمنا اور اشتہاء کرتا ہے اور فرج اس کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے! لیکن بوسہ کے لئے اس کے دل میں جازم ارادہ ہی تھا تو قدرت کے ساتھ بوسہ کا فعل اس کے ساتھ مقترن ہوا، البتہ جماع کے لئے اس کا ارادہ غیر جازم ہوسکتا ہے اور کبھی جازم بھی لیکن وہ قادر نہ تھا، اس شخص کی بابت جس کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، انسب یہ ہے کہ وہ جماع پر متمکن تھا لیکن (اللہ کے ڈر سے) نہ کیا تو احمد وغیرہ کا ھم خطرات اور ھمِ اصرار کے درمیان تفریق کرنے پر ہی جواب کا مدار ہے، تو جسے عملی جامہ پہنانے سے سوائے عجز کے کوئی شئ مانع نہ ہوئی تو ضروری ہے کہ وہ مقدور بھر مقدماتِ فعل کرے اور اگر کیا اور وہ دوبارہ کرنے پر عازم ہے جب وہ قادر ہو تو (اس کا مطلب ہے کہ) وہ مُصر ہے، اسی لئے ابن مبارک نے کہا مصر وہ ہے جو ایک دن مثلاً شراب نوشی کرے پھر مہینہ بھر اس سے مجتنب رہے، ایک روایت میں تیس برس کہا اور اس کی نیت میں ہے کہ جب بھی موقع ملا پئے گا، کبھی اس صورت میں بھی مصر

ہے جب کسی وقت فعل پر عزم کرے اور کسی وقت نہ کرے جیسے وہ شخص جو ماہِ رمضان میں ترکِ معاصی کا عزم کرے دیگر میں نہیں، تو یہ مطلقا تائب نہیں لیکن رمضان میں فعل کا (عارضی طور پر) تارک ہے اور اگر یہ ترک اللہ اور اس کے شعائر کی تعظیم کے لئے ہے تو اس پر وہ ثواب کا حقدار ہے لیکن ان تائبین میں اس کا شمار نہ ہوگا جن کے لئے از روئے تو بہ مطلقاً مغفرت ہے اور نہ وہ مطلقاً مصر ہے لیکن جس شخص کا ابن مبارک نے وصف کیا وہ مصر ہے اگر اس کی نیت میں ہے کہ کسی دن موقع ملا تو پھر شراب نوشی کروں گا

میں (ابن تیمیہ) کہتا ہوں **جس نے ماہِ رمضان میں معاصی کا ترک کیا** اور اس کی نیت میں رمضان کے بعد ان کی طرف عود کا عزم ہے وہ بھی مصر ہے لیکن اس کی نیت کہ جب موقع ملا پئے گا وجودِ قدرت کے ساتھ نیت کا غیر ہے، تو جب موقع ملا تو کبھی اس کی نیت باقی ہوگی اور کبھی نہیں، لیکن جب وہ جازم ارادے والا ہے تو اس کے لئے مانع نہیں مگر عجز ہی تو وہ اس پر معاقَب ہے، جیسا کہ گزرا اور پہلے ذکر کیا کہ اس کے مثل کی نسبت لازم ہے کہ اس کے ارادہ کے ساتھ اتنا فعل مقترن ہو جس پر وہ متمکن ہے، اسی سے ظاہر ہوتا ہے جو حارث محاسبی سے مذکور ہوا کہ انہوں نے اس امر پر اجماع نقل کیا ہے کہ کسی فعل کا ناوی (یعنی نیت کرنے والا) اس کے فاعل کی مانند نہیں تو مع القدرت یہ اجماع صحیح ہے کیونکہ کسی فعل کا صاحبِ قدرت ناوی فاعل کے بمنزلہ نہیں اور جہاں تک جازم ناوی جو ممکن اقدام کرتا ہے تو وہ فاعل تام کے بمنزلہ ہے جیسا کہ گزرا، اسے یہ امر مزید واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن میں ثواب اور عقاب کو مجرد ارادہ پر بھی مرتب کیا ہے جیسے کہا:

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا) [الإسراء : ۱۸] (جو شخص دنیا کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر اُس کیلئے جہنم کو مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ بُرے حال میں رانندہ ہو کر داخل ہوگا)

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)[هود : ۱۵۔۱۶] (جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دیدیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں)

(مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ) [الشوری : ۲۰] (جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیدیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیدیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا) سورۃ ہود کی آیت میں کہا تھا: (نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ) تو دلالت ملی کہ ان کے لئے ایسے اعمال ہیں جو باطل ہوئے اور کئی اور اعمال پر ان

کی معاقبت ہوئی جوانہوں نے کہا اور یہاں ان آیات میں یہ ارادہ عمل کے لئے مستلزم ہے اور جب ارادہِ آخرت کا ذکر کیا تو کہا:

(وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا) [الإسراء : ۱۹] (اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو، ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوتی ہے) اس لئے کہ ارادہِ آخرت اگرچہ اس کے عمل کو مستلزم ہے تو ثواب دراصل مامور بہ عمل پر ہے، نہ کہ ہر سعی پر اور اس کے ساتھ ایمان کا وجود بھی لازم امر ہے، اسی سے یہ قولہ ہے:

(يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا) الآية [الأحزاب : ۲۸] (اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت وآرائش کی طلبگار ہو)

(وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ) [۲۹] (اور اگر تم اللہ اور اُس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر کی طلبگار ہو) تو یہ سورۃ ھود والی آیت کی نظیر ہے اور یہ اس حدیث کے مطابق ہے کہ جب دو تلوار بدست ۔۔الخ تو قتل پر حرص اور ارادے کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ فعل کا اقتران لازم ہے اور یہ اس میں سے نہیں جو مذکورہ حدیثِ عفو میں داخل ہیں، اس پر اہلِ سنت اور اکثر علماء اور بعض قدریہ کے درمیان ایک معروف مسئلہ مبنی ہے اور یہ فعل سے عاجز کی توبہ کا مسئلہ مثلاً مجبوب (یعنی جس کا آلہِ تناسل مقطوع ہے) کی زنا سے اور ٹُنڈے اور عاجز کی چوری سے توبہ اور ان کے نحو تو جماہیر علمائے اہل سنت وغیرہم کے نزدیک یہ توبہ صحیح ہے، بعض قدریہ نے اس میں ان کی مخالفت کی، اس امر پر بناء کرتے ہوئے کہ فعل سے عاجز کی نسبت صحیح نہیں کہ اسے ترکِ فعل پر ثواب ملے بلکہ اس کے ترک پر عقوبت کا سزاوار ہو اور ایسا نہیں بلکہ عاجز کے ارادہ پر بھی ثواب اور عقاب ہے جیسا کہ ہم نے تبیین کی اور واضح کیا کہ جازم ارادہ مع القدرت فاعلِ تام کے مجریٰ پر جاری ہے تو یہ عاجز اگر اپنے حسبِ مقدور اپنے قول وعمل اور ہجر ان وترک کے ساتھ اسبابِ معصیت سے دور رہے تو یہ اس پر قادر تائب کی مثل ہے تو کمالِ فعل سے اس عاجز کی توبہ کمالِ فعل سے عاجز کے اصرار کی مانند ہے، اسی طرح اسی پر طلاق کے ضمن میں مشہور مسئلہ بھی مبنی ہے، وہ یہ کہ اگر اپنے دل میں طلاق دے دی اور اس کے ساتھ جزم کیا البتہ تکلم نہیں کیا (زبان سے طلاق دینے کے الفاظ نہیں بولے) تو جمہور علماء کے نزدیک یہ طلاق واقع نہ ہوگی، مالک سے منقول دو میں سے ایک قول کے مطابق واقع ہو جائے گی، احمد وغیرہ ائمہ نے عدم وقوع پر حدیث: (إِنَّ اللّٰـهَ تَجَاوَزَ الخ) سے استدلال کیا، اس پر منازع نے کہا یہ جو متجاوز عنہ ہے وہ حدیثِ نفس ہے اور نفس میں اس کے ساتھ جازم ارادہ حدیثِ نفس نہیں تو منازع نے ان سے کہا نبی اکرم نے کہا ہے: (مَا لَمْ تَتَكَلَّمْ بِهِ اَوْ تَعْمَلُ بِهِ) تو خبر دی کہ حدیثِ نفس سے تجاوز کا امتداد اس غایت تک ہے، یعنی اس کے ساتھ کلام کرنا یا اس پر عمل کرنا جیسا کہ سوال کے شروع میں بعض لوگوں کے استدلال کا حوالہ دیا اور یہ عمدہ استدلال ہے، تو اگر حدیثِ نفس عزم بن جائے اور اس کے ساتھ تکلم یا عمل نہ کیا ہو تو اس کی رو سے

قابلِ مواخذہ قرار دینا خلافِ نص ہے لیکن کہا جائے گا یہ مامور میں وہ صاحبِ مقدرت ہے جس میں کلام وعمل ممکن ہے وہ جب تکلم اور عمل نہ کرے، اور جہاں تک جازم ارادہ جس میں حسبِ مقدور کرلیا ہے تو اس کا اجراء اس ارادہ کے مجری پر ہوگا جس کے ساتھ کمالِ عمل لایا ہے گونگے کی مثل جب وہ کلام سے عاجز ہوا ہے اور کبھی وہ ہاتھوں کے ساتھ عمل ونحوہما سے بھی عاجز ہوسکتا ہے لیکن جب اپنی حسبِ طاقت اشارہ وغیرہ سے کام چلایا تو یہ اس کے غیر سے کلام کے صدور کے مجری پر جاری ہے

جہاں تک دوسری وجہ جس کے ساتھ احتجاج کیا گیا وہ یہ کہ عزم اور ھم معفو عنہ حدیثِ نفس میں مطلقا داخل ہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ جب کہا گیا کہ جازم ارادہ وجودِ فعل کے لئے مستلزم ہے جس کے ساتھ ذم اور عقاب وغیرہ متعلق ہیں تو یہ صحیح ہے کہ مراد یہ ہے کہ اگر جازم ارادے کے ساتھ مقدور تھا تو اس کا وجود واجب ہوا اور اگر ممتنع تھا تو لازم ہے کہ جازم ارادے کے ساتھ اس کے بعض مقدمات کا فعل ہو، اور جہاں اصلاً ہی کوئی فعل نہیں پایا گیا تو وہ ھم ہے اور حدیثِ نفس جازم ارادہ نہیں لہذا نصوص میں مسمیٰ ارادہ، حب، بغض، حسد، کبر، عُجب اور دیگر اعمالِ قلوب سے عفو وارد نہیں تو یہ اعمال جب ان پر ذم وعقاب کا وقوع ہوا تو یہ اس وجہ سے کہ یہ تام ہوئے ہیں حتی کہ قول وفعل بنے اور تب فرمانِ نبوی کہ اللہ نے میری امت کے لئے ۔۔الخ حق ہے اور جوارح کے اعمال کو مستلزم ارادات کی رو سے قابلِ مواخذہ ہونا حق ہے البتہ بعض حضرات قائل ہوئے کہ جازم ارادہ بھی کبھی فعل یا قول سے خالی ہوسکتا ہے پھر اس پر عقاب کے ضمن میں باہم تنازع کیا تو قاضی ابوبکر اور ان کے اتباع مثلا ابوحامد اور ابوالفرج ابن جوزی کی رائے میں اس پر عقوبت ہے، ان کے ساتھ اس امر پر دلیل نہیں کہ اس کا مواخذہ ہوگا جب وہاں قول یا عمل نہیں ہے

قاضی نے اسے ایمان میں اپنی اصل پر مبنی کیا، وہ جس میں انہوں نے جہم اور صالحی کی پیروی کی اور یہ ابوالحسن اشعری سے بھی مشہور ہے اور وہ یہ کہ ایمان مجرد دل کی تصدیق ہے اگرچہ زبان سے اس کی تکذیب کرے اور اگرچہ زبان سے اللہ ورسول کو گالی دے اور یہ دراصل بظاہر کفر ہے، اور جسے فی نفس الامر کفر باور کریں تو اس کی نسبت ممتنع ہے کہ اس کے ساتھ دل کی تصدیق سے کوئی شئ ہو، یہ شرع وعقل میں فاسد اصل ہے حتی کہ ائمہ مثلا وکیع بن جراح، احمد بن حنبل اور ابوعبیدہ وغیرہم نے ایسے شخص کو کافر قرار دیا جو ایمان کے ضمن میں اس قول کا قائل ہو بخلاف مرجئہ فقہاء کے جو قائل ہیں کہ یہ دل اور زبان کی تصدیق ہے تو ائمہ میں سے کسی نے انہیں کافر قرار نہیں دیا البتہ بدعتی کہا ہے، ایمان اور اس کے متعلقات بارے ایک جگہ تفصیل سے بات کی اور بیان کیا ہے کہ بعض حضرات جو اشیاء کے ان کے لوازم کے بغیر وجود کا اعتقاد رکھتے ہیں تو اس کی رو سے یہ ایسے امور واشیاء کو بھی فرض کرتے ہیں جن کے لئے وجود نہیں، **ایمان بارے جہم کی یہ اصل درجِ ذیل کئی وجوہ سے غلطی کی متضمن ہے :**

۱-اس کا ظن کہ یہ مجرد دل کی تصدیق اور اس کی معرفت ہے، بغیر دل کے اعمال مثلا اللہ کی حب اور خشیت ونحوہا کے

۲-اس کا ظن کہ دل میں ایمان ثابت ہوسکتا ہے جبکہ اقوال اور اعمال میں سے اس کے ساتھ کوئی شئ بھی نہ ہو

۳-اس کا ظن کہ شرع نے جس کے کفر اور دوزخ میں خلود کا حکم لگایا ہے اس کی نسبت ممتنع ہے کہ اس کے دل میں تصدیق سے کوئی شئ ہو اور جزم کیا کہ ابلیس، فرعون اور یہود ونحو ہم کے دلوں میں اس سے کوئی شئ نہ تھی اور یہی ارادہ، کراہت اور حب وبغض ونحو ہا بارے ان کی کلام ہے تو یہ امور اگر ھم اور حدیثِ نفس ہیں تو یہ معفو عنہا ہیں اور اگر جازم ارادہ اور حب وبغض ہیں تو فعل کا وجود اور وقوع لازم ہے اور تب کسی کے لئے حق نہیں کہ مجرد ان کا وجود فرض کرے پھر کہے ان میں اثم نہیں، اس سے سائل کی حجت کا جواب ظاہر ہوتا ہے تو امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ اپنے سے اور اپنے رسول سے محبت کرنے پر ثواب سے نوازے گا اور اپنی خاطر محبت اور بغض کرنے پر بھی اور اپنے سے اور اپنے رسول اور اپنے اولیاء سے بغض اور اپنے ما سوا أنداد سے محبت کرنے کی پاداش میں سزا دے گا اور جو اس محبت میں ارادات اور عزوم سے داخل ہے تو محبت چاہے ارادہ سے ایک نوع ہو یا ارادہ کو مستلزم کوئی اور نوع ہو اس کے ساتھ ارادہ وعزم کا ہونا لازم ہے تو اسے معفو عنہ حدیثِ نفس سے قرار نہ دیا جائے بلکہ جیسا کہ ترمذی کی نقل کردہ حدیث میں ذکر ہوا کہ ایمان کی مضبوط ترین کڑی اللہ کی خاطر محبت اور بغض کرنا ہے، صحیحین کی حضرت انس سے روایت میں ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مومن نہیں حتی کہ میں اسے اس کی اولاد، اس کے والدین اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں، بخاری میں عبداللہ بن ہشام سے مروی ہے کہ ہم نبی اکرم کے ہمراہ تھے اور آپ نے حضرت عمر کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا کہ وہ گویا ہوئے آپ یارسول اللہ ہر شئ سے بڑھ کر مجھے محبوب ہیں ماسوائے میری جان کے، آپ نے کہا نہیں، اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے حتی کہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں، تو حضرت عمر بولے اب آپ اے اللہ کے رسول میری جان سے بھی زیادہ مجھے محبوب ہیں، آپ نے کہا ہاں اب اے عمر، اللہ تعالی نے کہا:

(قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا الخ) [التوبة : ۲۴] اس شدید وعید کو دیکھو جس کا ان لوگوں سے تو عد کیا گیا جنہیں ان کے اہل و مال اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے بڑھ کر محبوب اور عزیز ہوں تو معلوم ہوا کہ مومن کو اللہ، اس کا رسول اور اس کی راہ میں جہاد اپنے اہل و مال اور گھر بار اور احباب واخوان سے بڑھ کر پیارے ہوتے ہیں وگرنہ وہ مومنِ حق نہ ہوں گے، اس کا مثل جو صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہتے ہیں نبی اکرم نے فرمایا کوئی ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا حتی کہ اللہ کی خاطر محبت کرے اور حتی کہ آگ میں ڈالا جانا اسے اس امر سے زیادہ پسند ہو کہ کفر کی طرف واپس ہو اور حتی کہ اللہ اور اس کا رسول اپنے ہر ماسوا سے بڑھ کر محبوب ہوں تو ان تین محبات کے ساتھ ہی ایمانی حلاوت کا واجد ہوگا اور یہ تینوں خصال ایمان کے وہ اصول ہیں جن کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوگا اور اسی طرح گناہوں سے تائب، تو یہ میں اس کے صدق کی اقوی علامات میں سے یہ مذکورہ خصال ہیں، اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی خاطر اہلِ ایمان سے محبت اگر چہ اعیان سے متعلق ہے، ہمارے افعال سے نہیں، ہمارے افعال سے متعلق ارادہ کی مانند تو یہ

اسے مستلزم ہے،تو جسے اللہ اور اس کا رسول اس کی جان، مال اور اہل سے بڑھ کر محبوب ہوں تو لازم ہے کہ اب ان اعمال کا مرید ہو جن کی یہ محبت مقتضی ہے مثلا اللہ ورسول اور اس کے دین کی نصرت اور اللہ ورسول کی طرف تقریب اور مثلا اللہ و رسول سے معادات کرنے والوں سے بغض، اسی باب سے جو صحاح میں ابن مسعود، ابوموسی اور اور حضرت انس کے حوالے سے نبی اکرم سے مروی ہے کہ فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت تھی، ایک روایت میں ہے آپ سے پوچھا گیا آدمی ایک قوم سے محبت کرتا ہے مگر ان سے ملحق نہیں یعنی ان جیسے اعمال نہیں کرتا، تو جواب میں یہ ارشاد کیا، انس کہتے ہیں اسلام کے بعد جتنی خوشی اہلِ اسلام کو یہ سن کر ملی کسی اور شئی سے نہیں ملی، تو میں نبی اکرم سے محبت کرتا ہوں اور ابوبکر سے اور عمر سے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالی مجھے ان کے ساتھ کرے گا اگرچہ ان جیسے اعمال میرے نامہ اعمال میں نہیں ہیں، یہ حدیث حق ہے تو محبّ کا محبوب کے ساتھ ہونا فطری امر ہے، اس کا غیر نہیں ہوسکتا اور اس کا محبوب کے ساتھ ہونا اس کی اس سے محبت پر ہوگا تو اگر یہ محبت متوسط یا اس سے قریب ہے تو یہ معیت بھی اسی کے بحسب ہوگی اور اگر کامل ہے تو معیت بھی کامل ہوگی، کامل محبت میں محبوب کو پسند امور و افعال میں اس کی موافقت ضروری ہے، جب محبّ ان پر قادر ہو تو اگر قدرت کے باوجود موافقت متخلف ہوئی تو اسی کے بقدر محبت میں نقص ہوگا اگرچہ موجود ہو، کسی بھی شئ سے محبت اور اس کی ارادت علم بالتضاد کے باوصف اس کے نقیض اور ضد سے بغض و کراہت کو مستلزم ہوتی ہے، اسی لئے اللہ نے ارشاد کیا:

(لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ) [المجادلة : ٢٢] (جولوگ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے) اور موادّت دل کے اعمال سے ہے تو اللہ پر ایمان اس کی اور رسول کی موادت کو مستلزم ہے اور اللہ اور اس کے رسول سے محادّت کرنے والوں کے ہاں موادت کے مناقض ہے اور جو ایمان کے مناقض ہے وہ بوجہ عدم ایمان عقاب کو مستلزم ہے تو جو بھی ایمان کے مناقض ہے مثلا شک، اعراض، دل کی رِدت (یعنی بدل جانے) اور اللہ ورسول سے بغض وہ ذم اور عقاب کو مستلزم ہے، اس کے اللہ و رسول کے ماموارت کے ترک کو متضمن ہونے کی رو سے، تو اس کا تارک ذم وعقاب کا مستحق ہے، اعظم الواجبات دل کا ایمان ہے تو جو بھی اس واجب کا تارک ہے وہ ذم وعقاب کا مستلزم ہے بخلاف اس کے جو ذم کا مستحق ہوا اس کے منہی عنہ ہونے کی وجہ سے، جیسے فواحش اور ظلم ہیں تو یہی ہے کہ جس کے ساتھ ھم وقصد بارے کلام کی جائے گی، جب یہ اصلِ ایمان کے مناقض نہیں اگرچہ اس کے کمال کے مناقض ضرور ہے بلکہ نفسِ فعلِ طاعات ترکِ معاصی اور نفسِ ترکِ معاصی فعلِ طاعات کو متضمن ہے اسی لئے کہا کہ نماز بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے تو نماز دو اشیاء کو متضمن ہوئی ایک گناہوں سے نہی کو اور دوم اللہ کے ذکر کو اور یہ اکبر الامرین ہے تو جو نماز میں اللہ کا ذکر ہے وہ اس کے فحشاء ومنکر سے ناہی ہونے سے اکبر ہے، اس کے بسط کے لئے ایک دیگر مقام ہے

یہاں مقصود یہ ہے کہ اللہ و رسول کے لئے تام محبت اس کے محبوبات کے وجود کو مستلزم ہے، اسی لئے ترمذی کی نقل کردہ ایک حدیث میں ہے جس نے اللہ کے لئے محبت کی اور اسی کی خاطر بغض کیا اور اسی کی خاطر عطاء و منع کیا اس نے ایمان کا استکمال کر لیا تو جب بندے کی حب اور بغض اللہ کے لئے ہے اور یہ اس کے دل کے اعمال میں سے ہیں اور اس کا عطاء و منع بھی اور یہ اس کے بدنی اعمال سے ہیں تو یہ اس کی اللہ کے لئے کمالِ محبت اور کمالِ ایمان پر دال ہے کیونکہ ایمان کا کمال یہ ہے کہ دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو (یعنی اس کی مکمل تابعداری کرے) اور اللہ کی وحدہ لاشریک عبادت کرے اور عبادت کمالِ حب اور کمالِ ذل کو متضمن ہے اور محبت تمام ارادی حرکات کا مبدا ہے اور ہر ذی حیات کے لئے حب اور بغض کا مادہ ہونا لازمی امر ہے تو جب اس کی محبت اللہ کے محبوبات اور اس کا بغض اللہ کے مبغو ضات کے لئے ہو تو یہ اس کے دل میں موجود ایمان کی صحت کی دلیل ہوئی لیکن کبھی یہ قوی اور کبھی ضعیف ہوتا ہے اس وجہ سے جو نفس کی شہوات اور اہواء اس کے معارض ہوئیں جو بذلِ مال میں ظاہر ہوتا ہے جو مادہ نفس ہے تو جب اس کی حب، اس کی عطاء اور اس کا منع اللہ کے لئے ہو تو یہ باطناً اور ظاہراً کمالِ ایمان پر دال ہے، مشرکین جنہوں نے اپنے دین میں فرقہ بندی کی اور گروہوں میں بٹ گئے، میں شرک کی اصل دراصل اَنداد کا اتخاذ ہے جن سے اللہ کی حب کی مثل محبت کرتے ہیں جیسے کہا:

(وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) [البقرة : ۱۶۵] (اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اور جس کی حب اور بغض، عطاء اور منع اللہ کے لئے ہے وہ اللہ کی خاطر ہی محبت اور بغض کرے گا تو یہ اللہ کے اولیاء میں سے سابقین اولین کا حال ہے جیسا کہ بخاری نے ابو ہریرہ سے روایت نقل کی کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ تعالی فرماتا ہے جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اس نے مجھے دعوتِ مبارزت دی ۔ ۔ ۔ الخ تو یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے کامل محبت کی اور فرائض کے ساتھ اپنے تقرب کے بعد اس کے محبوبات نوافل کے ذریعہ اس کے متقرب ہوئے، اللہ نے بھی ان سے کامل محبت کی حتی کہ مقامِ محبوبیت تک پہنچے اور یہ حال ہوا کہ اللہ کے ساتھ مدرک اور اسی کے ساتھ متحرک ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ اب اللہ ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اور جن سے وہ پناہ مانگیں ان سے پناہ دیتا ہے، اللہ نے اپنی کتاب میں اپنے سوا انداد سے محبت کرنے والوں کی ذم کی ہے، فرمایا: (وَاُشۡرِبُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡ) [البقرة : ۹۳] (اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا ان کے دلوں میں رچ گیا تھا) اور ان کی جنہوں نے اپنا الہ اپنی ہویٰ کو بنا لیا اور اسی کے پیچھے لگے رہے اور یہ کبھی فقط دل کا فعل ہوتا ہے، قرآن نے متعدد مقامات میں محبت، ارادت، بغض، سخط، فرح اور غم اور دیگر قلبی افعال پر مدح اور ذم کی ہے جیسے کہا: (وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) اور قولہ:

(كَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَةَ وَ تَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَةَ) [القيامة : ۲۰ ـ ۲۱] (مگر تم دنیا کو دوست رکھتے ہو۔ اور آخرت کو ترک کئے

دیتے ہو) اور کہا:

(يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَ هُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا)[الدهر: ۲۷] (یہ دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور بھاری دن کو پس پشت چھوڑے دیتے ہیں) اور:

(اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُواْ بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ)[آل عمران : ۱۲۰] (اگر تمہیں آسودگی حاصل ہو تو اُن کو بُری لگتی ہے اور اگر رنج پہنچے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور کنارا کشی کرتے رہو گے تو اُن کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اُس پر احاطہ کئے ہوئے ہے)

(وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ) [الزمر : ۴۵] (اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب ان کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں)

(وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا) [الحج : ۷۲] (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تم ان کے چہروں میں صاف طور پر ناخوشی دیکھتے ہو، قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ اُن کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اُن پر حملہ کر دیں)

(وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ) [آل عمران : ۶۹] بعض اہل کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں مگر یہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں)

(ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ) [محمد : ۹] (یہ اس لئے کہ اللہ نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اس کو ناپسند کیا تو اللہ نے بھی ان کے اعمال اکارت کر دیئے)

(وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا) [التوبة : ۱۲۴] (اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو بعض منافق پوچھتے ہیں کہ اس سورۃ نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے؟)

(قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ)[یونس : ۵۸] (کہہ دو کہ اللہ کے فضل اور اُس کی مہربانی سے تو چاہئیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں، یہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں) (دیگر کثیر آیات بھی ذکر کیں جن میں محبت وبغض اور فرح وغیرہ اعمالِ قلب کا ذکر ہے) لکھتے ہیں اس کا مثل کتاب وسنت اور اتفاق المسلمین میں کثیر ہے، اللہ تعالی قلوب کی مساعی پر مدح بھی کرتا ہے اور ذم بھی جیسے ایک متفق علیہ حدیث میں کہا ایک دوسرے سے بغض اور حسد نہ کرو، اور آپ کا قول: تم میں

سے کوئی مومن نہیں حتی کہ اپنے بھائی کے لئے خیر سے وہ کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے کرتا ہے اور آپ کا فرمان کہ اہلِ ایمان کی باہمی مودت اور رواداری کی مثال جسدِ واحد کی طرح ہے کہ جب اس کے کسی عضو میں کوئی چوٹ یا عارضہ لاحق تو سارا جسم بخار اور بیداری کے ساتھ اس کی غمخواری (اور یکجہتی کا اظہار) کرتا ہے اور آپ کا قول جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہے اور آگ میں ہمیشہ کے لئے داخل نہ ہوگا وہ جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہے اور فرمایا تم عنب (انگور) کو کرم مت کہا کرو کہ کرم تو قلبِ مومن ہے، اس کی امثال کثیر ہیں بلکہ دل کا قول اور عمل ہی اصل ہے مثلا اس کی تصدیق وتکذیب اور اس کی حب و بغض اس سے وہ جس کے ساتھ مدح و ذم اور ثواب وعقاب کا حصول ہوتا ہے بغیر ظاہری اعضاء کے فعل کے اور ان میں سے ایسے بھی کہ جن کے ساتھ یہ (یعنی مدح و ذم اور ثواب وعقاب) مقترن نہیں ہوتا مگر تب جب ظاہری اعضاء کا فعل بھی ساتھ ہو اگر وہ مقدور ہوں، لیکن وہ جن میں بوجہ عجز ظاہری اعضاء کا فعل متروک کیا گیا تو اس کے صاحب کا حکم فاعل کے حکم کی مثل ہے تو دل کے اقوال اور افعال تین اقسام پر ہیں: اول، جو بذاتِ خود حسن اور سیئ ہیں، دوم، جو ایسے نہیں حتی کہ فعل کرے اور یہ مقدور سیئہ جیسا کہ گزرا، سوم، جو مع العجز کی گئی حسنہ اور سیئہ کی طرح ہیں اور یہ مع القدرت حسنہ اور کی گئی سیئہ کی طرح نہیں، جیسے گزرا

تو اول قسم وہ جو اصولِ ایمان سے متعلق ہے تصدیق، تکذیب، حب اور بغض اور اس کے توابع سے تو ان امور میں ثواب و عقاب، علوِ درجہ اور سفلِ درجہ کا حصول ہے اس رو سے جو دلوں میں ان امور سے موجود ہو، اگر چہ جوارح پر ان کا ظہور نہ ہو بلکہ منافقین اپنے جوارح کے ساتھ اقوال اور صالح اعمال کا اظہار کرتے تھے، ان کا عقاب اور ان کا دوزخ کے درکِ اسفل میں ہونا ان امراض کے سبب ہے جو ان کے دلوں میں ہیں اگر چہ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے موافق قول وعمل بھی مقترن ہو، لیکن بہر حال ان کی عقوبت اس قول وعمل پر مقصور نہیں، یہ تو دراصل (ان کے دل کی امراض پر) دلالت (اور علامت) ہے جیسے کہا:

(وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ) [محمد: ۳۰] (اور اگر ہم چاہتے تو وہ لوگ تم کو دکھا بھی دیتے اور تم ان کو ان کے چہروں ہی سے پہچان لیتے اور تم انہیں اندازِ گفتگو ہی سے پہچان لو گے) تو خبر دی کہ ان کے لحنِ قول سے ان کی شناخت اور معرفت ہوسکتی ہے اور جہاں تک ثانی اور ثالث قسم تو یہ ان افعال کا مظنہ ہیں جو اصولِ ایمان کے منافی نہ ہوں مثلا فطری معاصی مثلا زنا، چوری اور شراب نوشی جیسا کہ صحاح میں مروی ہے کہ آنجناب نے فرمایا جو اس حال میں فوت ہوا کہ گواہی دیتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں وہ جنت میں داخل ہوگا اگر چہ زنا کیا، چوری کی اور شراب پی (یعنی ان کی سزا بھگت کر، اگر بغیر توبہ کے مرا) اور جیسے آپ نے اس شخص کے ایمان اور اللہ ورسول سے اس کی محبت کی گواہی دی تھی جو بار بار جرمِ شراب نوشی میں آپ کے پاس لایا جاتا تھا، ایک دفعہ ایک نے اسے ملعون کہہ دیا تو آپ نے منع کیا اور فرمایا اسے ملعون مت کہو کیونکہ یہ اللہ ورسول کا محبّ ہے اور کہا تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو، اسے بخاری نے حضرت ابو ہریرہ

سے روایت کیا، اسی لیے کہا بے شک اللہ نے میری امت کے خواطرِ قلوب سے درگزر کیا ہے جب تک انہیں نوکِ زبان پر نہ لائے یا عمل نہ کرے! حدیثِ نفس سے یہ درگزر امتِ محمدیہ کے ان افراد کے لئے واقع ہوئی جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتب، رسل اور یومِ آخرت پر ایمان والے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ درگزر ان امور سے متعلق ہے جو ایمان میں قادح نہیں (یعنی جن سے ایمان وعقیدہ متاثر نہ ہوتا ہو) لیکن جو ایمان کے منافی ہوں تو انہیں لفظِ حدیث متناول نہیں اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو ان کا صاحب فی الحقیقت امتِ محمدیہ سے ہے ہی نہیں

وہ دراصل منافقین کے بمنزلہ ہے تو اس کے دل میں موجود کلام یا عمل سے درگزر واجب نہیں اور یہ واضح فرق ہے جس پر حدیث دال ہے، اسی سے شرعی ادلہ باہم مؤتلف ہوتی ہیں اور یہ جیسے اللہ نے اس امت سے خطا اور نسیان صادر ہونے پر درگزر فرما دیا ہے جیسا کہ اس پر کتاب وسنت دال ہیں تو جو صحیح الایمان والعقیدہ ہے اسی کی خطا ونسیان اور حدیثِ نفس قابلِ درگزر ہے جیسا کہ یہی (آخر کار سزا بھگت کر) دوزخ سے نکالے جائیں گے، نہ کہ وہ جن کے ساتھ ایمان ہے ہی نہیں، تو ایسوں کے دلی خیالات، خطا اور نسیان قابلِ درگزر ہونے پر نصوص نے دلالت نہیں کی اسی لئے وارد ہوا کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، اس اثر کو ابوالشیخ اصفہانی نے کتاب الامثال میں ثابت بنانی کے مراسیل سے ذکر کیا ہے، ابن قیم (بقول مرتب شائد ابن قیم کا لفظ یہاں کاتب کی تصحیف ہے کیونکہ اس رسالہ کا تو ابن تیمیہ کی مؤلفات میں ابن قیم نے ذکر کیا ہے) نے (النیۃ) میں متعدد طرق سے نبی اکرم سے اسے نقل کیا پھر ان سب طریق کو ضعیف قرار دیا

مجرد نیت پر مومن مُثاب ہے اور یہ عمل کے مجریٰ پر جاری ہے جب اس پر عمل کرنے سے بجز عجز کچھ مانع نہ ہوا ہو، عام افعالِ خیر میں اسے یہ ممکن ہے، جہاں تک بدن کا عمل تو یہ قدرت کے ساتھ مقید ہے اور یہ نہیں ہوتا مگر کم ہی، اسی لئے بعض سلف نے کہا مومن کی قوت اس کے دل میں اور اس کا ضعف اس کے بدن میں ہوتا ہے جبکہ منافق کی قوت اس کے بدن میں (یعنی خوب ہٹا کٹا ہوتا ہے) اور اس کا ضعف اس کے دل میں ہوتا ہے، اس اصل پر یہ قولہ دال ہے:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ﴾ [البقرۃ: ۲۸۴] (اور تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے اُس کا حساب لے گا پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے) الآیۃ، اس آیت کو اگرچہ بعض سلف نے منسوخ کہا ہے جیسا کہ بخاری نے یہ بات اپنی صحیح میں مروان اصغر عن رجل من اصحاب النبیؐ سے نقل کی اور یہ ابن عمر ہیں، تو سلف کی زبان میں نسخ کا لفظ اس سے اعم تھا جو متأخرین کی زبان میں تھا، ان کی اس سے مراد مطلقاً رفعِ دلالت ہوتی تھی اگرچہ یہ عام کے لئے تخصیص یا مطلق کے لئے تقیید ہو جیسا کہ یہ ان کے عرف میں معروف ہے، دیگر نے اس کے منسوخ ہونے کا انکار کیا اس کی عدم دلیل کی وجہ سے، بعض حضرات زعم کیا کہ یہ خبر ہے اور خبر منسوخ نہیں ہوتی، دوسروں نے یہ کہہ کر رد کیا کہ یہ ایک شرعی حکم بارے خبر ہے، اس خبر کی مثل جو امر اور نہی کے معنی میں ہو، نسخ کے قائلین

اس سے بعد والی آیت کو اس کا ناسخ بتلاتے ہیں اور یہ قولہ: (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت انس سے اس آیت بارے نقل کیا تو ان سے مرفوع (القلم) وہ ہوتا ہے جس کی احادیث نے تفسیر کی اور یہ جو مقدور امور ان کے دل میں پیدا ہوئے اور ان کے نفوس نے ان کی بابت سوچا جب تک ان کے ساتھ تکلم یا عمل نہ کریں اور ان کا خطاو نسیان اور جس پر انہیں مجبور کیا گیا مرفوع (القلم) ہے جیسا کہ ابن ماجہ وغیرہ نے حسن سند کے ساتھ نقل کیا کہ اللہ نے میری امت سے خطاو نسیان اور جن پر انہیں مجبور کیا گیا، کو معاف کر دیا ہے

حقیقتِ امر یہ ہے کہ قولہ: (وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ) اس کے قابلِ مواخذہ ہونے پر دال نہیں ہے بلکہ یہ اس امر پر دال ہے کہ ان کا محاسبہ ہوگا اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معاقب ہوگا، اسی لیے کہا: (فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ الخ) یہ مستلزم نہیں کہ بلا سبب بخش دیا جائے اور عذاب دیا جائے اس علم کے باوصف کہ اللہ مومنین کو عذاب نہ دے گا اور اس بات کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے مگر اس صورت کہ توبہ کر لی تھی، اصل یہ ہے کہ اس کے درمیان فرق کیا جائے جو اصلِ ایمان کے لئے مجامع ہے اور اس کے جو اس کے منافی ہے اور مقدور علیہ مگر کیا نہیں، کے درمیان اور اس کے درمیان جس کا بوجہ عجز ترک کیا، تو یہ دونوں فروق ان مشتبہات مواضع میں فصل ہیں، اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ اس مسئلہ میں نزاع اس لئے واقع ہوا کہ انہوں نے عزمِ جازم کو دیکھا کہ جس کے ساتھ کبھی فعل مقترن نہیں ہوا اور ایسا نہ ہوگا مگر جب فعل عزم کے مقارن ہو، اور اگر عجز ارادے کا مقارن ہے تو مراد کا وجود ممتنع ہوا لیکن یہ جازم ارادہ نہ ہوگا کیونکہ جازم ارادے کا وجود اس کی نسبت جس سے وہ عاجز ہوا، بھی ممتنع ہے تو جازم ارادہ وہی ہوگا جس کے ساتھ فعل کے مقدمات اور لوازم میں سے وہ کچھ مقترن ہو جس پر اسے قدرت حاصل تھی اگرچہ نفسِ فعل موجود نہ ہو، انسان اپنے آپ سے پاتا ہے کہ فعل پر اس کی قدرت کے ساتھ اس کی طلب، طمع اور اس کا ارادہ بڑھتا ہے جبکہ عجز کی شکل میں یہ طمع وطلب کمزور پڑ جاتی ہے، وہ اپنے قول اور فعل سے علی السواء عاجز نہیں ہوتا اور نہ اس سے جو اس کے چہرہ کے صفحات پر ظاہر ہو (یعنی چہرے کے تاثرات) اور زبان کے فلتات (یعنی سبقتِ لسانی) مثلاً چہرے کی بشاشت اور اس کا شئ پر اقبال اور اس سے اعراض تو یہ اور ان سے مشابہ جوارح کے اعمال میں سے ایسے افعال ہیں جن پر ذم اور عقاب مترتب ہوگا جیسا کہ ان پر حمد وثواب کا بھی ترتُّب ہے، بعض حضرات ایسے جازم عزم کو فرض کر لیتے ہیں جس کے ساتھ کبھی فعل مقترن نہیں ہوتا اور یہ نہ ہوگا مگر عجز کی رو سے جو بعد ازاں حادث ہو، مثلاً موت یا اس کا غیر، تو مستقبل میں فعل کے مصمم ارادے کو جازم عزم کا نام دیا، الفاظ کے اطلاق میں کوئی نزاع نہیں، تو بعض حضرات عزم اور قصد کے مابین تفرقہ کرتے ہیں اور قائل ہیں کہ جو فعل کے مقارن ہو وہ قصد ہے اور جو اس سے قبل ہو وہ عزم ہے، بعض دونوں کو ایک برابر قرار دیتے ہیں، کبھی یہ تنازع کیا کہ آیا اللہ کے اس فعل کے ارادہ کو جسے وہ مستقبل میں کرے گا، عزم کا نام دیا جائے؟ تب وقتِ فعل ارادے کا تجدُّد

ضروری ہے،اس سابق الذکر عزم کا غیر اور یہ مع القدرت وجودِ فعل کے لئے مستلزم ارادہ

اس امر میں بھی تنازع کیا کہ آیا **قدرت اور داعیہ کے ساتھ وجودِ فعل واجب ہے؟** اس سلسلہ میں دو قول ذکر کئے گئے، اظہر یہ ہے کہ قدرت کا وجود مع تام داعی کے وجودِ مقدور کو مستلزم ہے اور ارادہ مع القدرت وجودِ مراد کو مستلزم ہے، ان متنازعین میں سے ایک فریق مستقبل کے فعل بارے ہر عزم پر مطلقاً اثباتِ عقاب مراد لیتا ہے اگرچہ فعل اس کے ساتھ مقترن نہ ہو جبکہ دوسرا فریق مطلقاً ہر اس سے رفعِ عقاب مراد لیتا ہے جو نفس میں جازم ارادات ونحوہا ہیں، دونوں کے اس ظن کے باوصف کہ یہ قول کے ساتھ ظاہر نہیں ہوا اور نہ عمل کے ساتھ اور یہ فریقین کا امرِ وسط سے انحراف ہے، جب معروف ہو چکا کہ اگر قدرت ہو تو جازم ارادے سے فعل متخلف نہیں ہوتا مگر کسی عجز کی بناء پر ہی جو اس کے صاحب کو ثواب وعقاب میں فاعلِ تام کے مجریٰ پر جاری کرے گا لیکن جب ان سے متخلف ہوا وہ جس پر اسے قدرت حاصل تھی تو یہ متخلف جازم ارادہ کے ساتھ مراد باور نہ ہوگا بلکہ یہ وہ ھمّ ہے جس سے درگزر واقع ہے،اسی سے نصوص واصول باہم مؤتلف ہوں گی! پھر یہاں کثیر مسائل ہیں،ان میں جو دل میں متعارض ارادات مجتمع ہوں مثلاً متعارض اعتقادات اور شئ اور اس کی ضد کا ارادہ مثلاً نفس کی کسی معصیت کے لئے شہوت اور دل کا اس کے لئے بغض اور اس سے تعوُّذ مقارن ہو جیسا کہ صحابہ کرام نے آپ سے شکایت کی اور کہا کئی دفعہ ہمارا کوئی اپنے نفس میں ایسا خیال اور سوچ پاتا ہے کہ جل کر کوئلہ بن جانا یا آسمان سے زمین پر گر جانا اس کے مقابلہ میں زیادہ اچھا لگتا ہے کہ اسے نوکِ زبان پر لایا جائے،آپ نے فرمایا کیا واقعی ایسا کچھ پاتے ہو؟ عرض کی جی ہاں،فرمایا یہی تو صریح ایمان ہے،اسے مسلم نے ابن مسعود اور ابو ہریرہ سے نقل کیا،اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ کی حمد کہ اس نے اس (یعنی شیطان) کی کید کو وسوسہ کی طرف پلٹا دیا (یعنی عمل کی نوبت نہیں آنے دی)

میں نے جب یہ جواب لکھا تو میرے پاس ایسی کتب نہ تھیں جن سے جواب پر مدد لی جاسکتی کہ اس کے لئے وسیع موارد ہیں،تو یہاں جب وساوس کے ساتھ یہ بغض اور کراہت مقترن ہوئی تو یہ صریح یعنی خالص ایمان (کی نشانی) ہے اس لئے کہ منافق اور کافر اس بغض کا واجد نہیں اور یہ کراہت وسوسہ کی نسبت ہے بلکہ اگر وہ کفرِ بسیط میں ہے۔اور یہ اس سے اعراض جو رسول لے کر آئے اور اس پر ایمان کا ترک۔تو اگرچہ رسول کی تکذیب کا اعتقاد نہ بھی رکھے تو ایسے کے لئے کبھی شیطان وسواس نہیں ڈالتا کیونکہ ایمان کے معارض ومنافی وسوسہ کی تبھی ضرورت پڑتی ہے جب اس کے مقتضی کا وجود ہو تو جب اس کے ساتھ وہ کچھ نہیں ہے جو ایمان کو مقتضی ہو تو اس کے دافع معارض کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کوئی کفرِ مرکب میں ہے۔اور یہ تکذیب۔تو وسوسہ کی کیا ضرورت؟ کہ کفر وسوسہ سے بڑی چیز ہے اور اس کے پاس ایمان نامی کوئی شئ ہی نہیں کہ جس کی رو سے اسے برا لگے،اسی لئے یہ وسوسہ عامۃ المؤمنین کے لئے ہی عارض ہے جیسے کہا:

(اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌ ۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ) [الرعد: ۱۷] (اُسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے

بہہ نکلے پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کیلئے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے) الآیات، تو اللہ نے اس کی جو وہ ایمان اور قرآن سے نازل کرتا ہے اس پانی کے ساتھ مثال بیان کی جسے وہ وادیوں میں اتارتا ہے، دلوں کو وادیوں سے تشبیہ دی، ان میں کبیر بھی ہیں اور صغیر بھی جیسا کہ صحیحین میں ابوموسی سے مروی ہے کہ نبی اکرم نے فرمایا اللہ نے جس ہدایت وعلم کے ساتھ مجھے مبعوث کیا اس کی مثال بارش کی سی ہے جو کسی زمین پر برسی تو اس کے بعض حصوں نے پانی جذب کرلیا اور کثیر گھاس اور پودے وسبزہ اگایا، بعض حصوں نے (پانی جذب کرنے کی بجائے) اس کا ذخیرہ کیا جس سے لوگ اور جانور وغیرہ سیراب ہوئے جبکہ کچھ حصے ایسے تھے کہ جو میدانی علاقے تھے جن میں نہ جذب کی اور نہ ذخیرہ کرنے کی صلا حیت تھی تو یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کے دین کی فقہ وفہم حاصل کی اور اللہ نے اس کے ساتھ اوروں کو نفع پہنچایا اور اس کی جس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہ کیا، یہ ایک مثال! دوسری مثال سونے، چاندی اور لوہے وغیرہ کی کانوں میں سے حاصل شدہ مواد پر آگ جلائی جائے، زیور اور متاع کی طلب میں، نیز (قرآن نے) خبر دی کہ سیلابی پانی اپنی سطح پر جھاگ اٹھائے ہوتا ہے اور اس میں سے بھی جس پر لوگ آگ جلاتے ہیں اس کی مثل جھاگ ہوتی ہے پھر کہا:

(كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ) (اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، تو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے) یعنی وہ جو پانی کی سطح اور آگ پر رکھی گئی شئی (مثلاً دودھ) پر نمودار ہوتا ہے تو یہ مومنوں کے قلوب میں واقع ہونے والے شکوک اور عقائد میں شبہات اور فاسدارادات کی نظیر ہے جیسا کہ صحابہ کرام نے نبی اکرم سے اس کی شکایت کی تھی تو اس کی بابت فرمایا: (فَيَذْهَبُ جُفَآءً) (کہ زائل ہو جاتا ہے) یعنی دل اسے کھرچ ڈالتا، پھینک دیتا اور نکال باہر کرتا ہے جیسے پانی جھاگ وغیرہ کو نکال باہر کرتا ہے (وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ)) اور یہ اس کی مثال جو دلوں میں یقین وایمان سے ثابت رہے، جیسے کہا:

(اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ) إلى قوله: (وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ)[إبراهيم: ۲۴۔۲۷] (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے جیسے پاکیزہ درخت ۔۔۔ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے) تو قلبِ مومن میں جو بھی کفر اور نفاق کے خواطر سے واقع ہوا جسے اس نے برا گردانا اور اسے نکال باہر کیا تو ایمان ویقین مزداد ہوئے جیسے ہر وہ شخص جس کے نفس نے گناہ کے ساتھ اس سے بات کی (یعنی اس بارے سوچا) تو اسے ناگوار لگا اور اپنے نفس سے اسے دور کیا اور اللہ کی خاطر اس کا ترک کیا تو اس کے لئے صلاح، نیکی اور تقوی میں اضافہ ہوگا لیکن جو منافق ہے تو جب اس کے لئے اہواء اور نفاق سے متعلقہ آراء کا وقوع ہوتا ہے تو اسے یہ برا نہیں لگتا اور نہ وہ انہیں دور کرتا ہے تو اس کی رو سے اس میں سیئۃ الکفر موجود ہوتی ہے بغیر حسنۃ الایمان کے جو اسے دور کرے یا اس کا محو کرے اور قلوب کے لئے ایمان اور نفاق دونوں

عارض ہوتے ہیں، گاہے اِس کا اور گاہے اُس کا غلبہ ہوتا ہے اور فرمانِ نبوی کہ اللہ نے میری امت کے وسواس اور دل میں درآنے والی سوچوں سے درگزر کر دیا ہے تو جیسا کہ صحیح کی بعض روایات میں الفاظ ہیں کہ یہ خالص اہلِ ایمان کے ساتھ مقید ہے نہ کہ وہ جو صرف بظاہر مسلمان ہوئے جبکہ اندر سے وہ منافق ہیں اور ایسوں کی قدیم و جدید زمانے میں کمی نہیں بلکہ ان ازمانِ متاخرہ میں بعض علاقوں میں بنسبت قدیم کے زیادہ ہیں، تو جس نے صدقِ دل سے ایمان ظاہر کیا اور اس کے مضاد اور اسے کمزور کرنے والے امور سے مجتنب رہا تو اس سے ہی درگزر کیا جائے گا اس سے کہ جس کے ساتھ تکلم اور عمل کرنا اسے ممکن تھا، نہ کہ ایسے سے جو اس طرح نہیں، جیسا کہ اس پر لفظِ حدیث کی دلالت ہے تو وہ دونوں قسمیں جن کی بابت ہم نے بیان کیا کہ بندے کو ان پر ثواب ملے گا اور جن اعمالِ قلوب پر اس کا معاقبہ ہوگا وہ اس حدیث سے خارج ہیں، اسی طرح قولہ: (مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ) اور: (مَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ) کا تعلق بھی اس مومن سے ہے جو ایسی حسنہ اور سیئہ کا ھم کرے جس کا فعل اس کے لئے ممکن ہو تو کئی دفعہ کر لے اور کئی دفعہ ترک کرے، اس لئے کہ خبر دی ہے کہ حسنہ (کا ثواب) سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ مل سکتا ہے اور یہ اسی کے لئے جو اللہ کی خاطر نیکیاں کرتا ہے جیسے کہا:

(مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ) الآیۃ، [البقرة : ۲۶۱] (جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال اُس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں) اور قید یہ لگائی: **(ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ)** [البقرة : ۲۰۷] (اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے)

(وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ) [البقرة : ۲۷۲] (اور تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کیلئے) اور یہ اہلِ ایمان کے لئے جبکہ کافر کو اگرچہ اللہ اس کی حسنات ۔ اگر ہوں ۔ کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ آخرت میں ان کی وجہ سے اس سے کچھ تخفیف ہو جائے جیسے ابو طالب بارے منقول ہوا کیونکہ اس نے ہمیشہ نبی اکرم سے حسنِ سلوک کیا اور نبی اکرم کی شفاعت کی رو سے، تو کافر سے یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اسے اس کی بھلائیوں کا سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ ثواب مل سکتا ہے، ایک اور حدیث میں یہ اس تقیید کے ساتھ وارد ہے کہ یہ اس مسلمان کے لئے ہے جو حسن الاسلام ہے۔

وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ اَعْلَمُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

(یہاں اللہ کے فضل وکرم سے دسویں جلد ختم ہوئی)

فہرستِ مندرجات